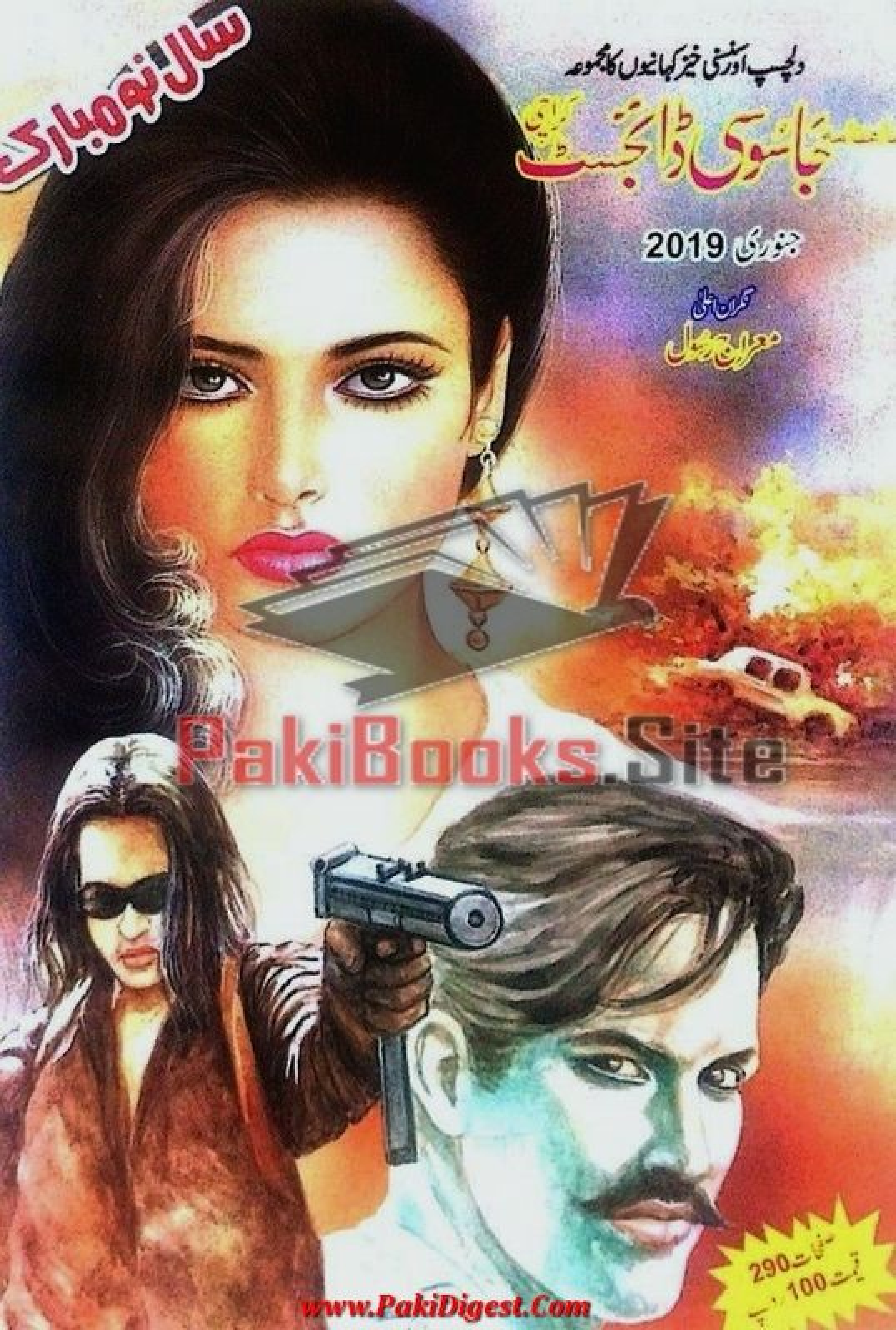

سال نو مبارک

دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ

جاسوسی ڈائجسٹ

جنوری 2019

نگران اعلیٰ

معراج رسول

صفحات 290

قیمت 100 روپے

PakiBooks.Site

جاسوسی ڈائجسٹ

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

مدیر : لبنیٰ جمیل
نائب مدیر : ڈاکٹر نعیم اختر

منیجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین
0333-3285269

چینی نکتہ چینی
مدیر اعلیٰ 07
قارئین کی کرم فرمائیاں اور کج ادائیاں
نامہ و پیام، محبتیں عنایتیں اور شکایتیں

لہروں کا فریب
زویا اعجاز 14
سیاست... بغاوت... عداوت اور عشق و محبت
کی لہروں میں ڈولتی ابھرتی سنسنی خیز داستان

وقت کی جکڑ
سلیم انور 63
مغربی خواتین کے درمیان
ہونے والی ملاقات کا احوال

پائپ کی گواہی
تنویر ریاض 67
تمباکو نوشی کی لت میں مبتلا
جج کی پُراسرار موت کا معما

خطاکار
ماہ رخ ارباب 77
حسد و رقابت کے سرکش جذبات
جو اپنی ہر حد پار کر چکے تھے

خوش قسمت
جمال دستی 87
اس بُرے شخص کی کہانی
جو قسمت کا دھنی تھا

انگارے
طاہر جاوید مغل 98
سطر سطر رنگ بدلتی...
ایک لہو رنگ اور دل گداز داستان

دوہرا جرم
تمکین رضا 135
اس مجرم کی تلاش کا قصہ
جو دوہرے جرم کا مرتکب تھا

جلد 49 • شمارہ 01 • جنوری 2019 • زرِ سالانہ 1200 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 100 روپے •
خط وکتابت کا پتا: پوسٹ بکس [illegible] E-mail:jdpgroup@hotm[illegible]

UrduBooks.pk

بنے بھائی
147
منظر امام
لبوں پر تبسم بکھیر دینے والے بنے بھائی کی دلچسپ حکمتِ عملی کا فسانہ

ٹیڑھی انگلی
151
محمد فاروق انجم
تلخ حقائق کا مقابلہ کرنے والے معاملے فہم کا پیشگی اقدام

آوارہ گرد
162
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

غلط فہمی
195
اعتزاز سلیم وصلی
نظریۂ زندگی کی جنگ میں الجھی...... مہم جوئی سے بھرپور کہانی کے پیچ و خم......

بردہ فروش
212
عکس نائلہ
ایک معصوم بچی کی گمشدگی کا معاملہ جس میں اپنے ہی خاندان کے لوگ ملوث تھے......

راہِ گم کردہ
223
روبینہ رشید
دل و دماغ میں ہلچل مچا دینے والے واقعے کی بازگشت

5

حیا فروش
262
اسنا قادری
پرل گروپ کا ایک اور شاندار کارنامہ سالگرہ نمبر پر بطورِ خاص

تراش خراش
000
ادارہ و قارئین
اقتباسات گدگدیاں سرگرمیاں اور قہقہے سب کچھ آپ کی تفریحِ طبع اور تواضع کے لیے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • [illegible] کی اسٹیڈیم کراچی

بارہ جڑی بوٹیوں کا کمال

بارہ مہینے رکھے خیال

Hashmi
Joshanda
Instant Herbal Tea
For Flu, Cold, Cough, Fever and Sore Throat
Pure اجزاء
Cure بہتر
ہاشمی
جوشاندہ

برسوں سے آزمودہ اور سند یافتہ ہاشمی کی صحت بخش مصنوعات میں ایک اور قابل اعتماد اضافہ ہاشمی جوشاندہ۔ جدید ترین تحقیق و تجربے کا حامل قدرتی جڑی بوٹیوں کا خالص مرکب ہاشمی جوشاندہ نزلہ، زکام، فلو، بخار، گلے کی خراش وغیرہ میں گھر کے ہر فرد کیلئے موثر جو رکھے پوری فیملی کو صحت مند۔ بہتر نتائج کے لئے ایک چمچ ہاشمی شہد کے ساتھ استعمال کریں۔

ہاشمی®

جوشاندہ

اجزاء Pure بہتر Cure

www.hashmisurma.com HashmiSince1794

www.PakiDigest.Com

عزیزانِ من...... السلام علیکم!

قارئین کو نیا عیسوی سال مبارک ہو۔ جنوری 2019ء کا شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ دسمبر کی 25 تاریخ پاکستان کے بانی اور محسن کا یومِ پیدائش ہے جسے اہتمام اور احترام کے ساتھ منانا ہر پاکستانی پر لازم ہے۔ قائداعظم کی بے مثال جدوجہد کا ثمر ہم آج آزاد اور خودمختار پاکستان کی صورت میں دیکھ رہے ہیں...... ورنہ بھارت میں گئو رکھشا کے وحشیوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا جو حال کیا جارہا ہے، وہ سامنے ہے۔ اللہ ہم سب کو امن و سلامتی عطا فرمائے۔ اور اسی تاریخ کو عیسائی تہوار یعنی کرسمس بھی ہے، سو عیسائی قارئین کو مبارکباد۔ اس کے بعد آتے ہیں اپنے مسائل کی جانب...... بجلی، گیس اور پانی آج کے دور میں معاشرتی اور معاشی زندگی کی شہ رگیں ہیں۔ گھر سے بازار اور پھر دفاتر تک میں کاروبارِ حیات انہی کے سہارے رواں دواں رہتا ہے۔ گئے وقتوں میں لوگ لیمپ، چراغ اور لالٹین کے سہارے نہایت آرام اور سکون سے زندگی گزار لیتے تھے، خواتین گھروں میں باریک ترشیدہ کاری اور سلائی کڑھائی بھی ان ہی دھیمی روشنیوں میں کر لیتی تھیں لیکن برقی وسائل دستیاب ہونے کے ساتھ عادات بھی تبدیل ہوگئیں۔ لالٹین استعارہ بن گئی۔ لکڑی، کوئلے اور برادے کے چولہے ناپید ہوگئے، محلے اور کمیٹی کے سدابہار نلکے گھروں میں منتقل ہوگئے۔ ان سہولتوں میں ذرا بھی تعطل آتا ہے تو روزمرہ زندگی گویا درہم برہم ہوکر رہ جاتی ہے۔ پھر ہم نے ہی لوگوں کو اپنی سواریوں میں پیٹرول کی جگہ گیس کے استعمال کی طرف راغب کیا۔ ہر شخص نے کفایت اور ماحول دوستی کے نام پر ادھر کا رخ کیا لیکن منصوبہ بندی کے فقدان نے ان شعبوں میں عوام و خواص کے چھکے چھڑا دیے۔ کہیں بجلی بند ہے، کہیں گیس غائب ہے اور پانی تو خیر اب ایک سنگین مسئلہ بنتا جارہا ہے۔ نیچے سے اوپر تک ہر شخص کو تشویش ہے کہ آنے والے سالوں میں ہمارا کیا بنے گا۔ دوسری طرف ان توانائیوں کے بحران سے ہماری صنعتی پیداوار سخت متاثر ہورہی ہے۔ اعلیٰ ترین سرکاری سطح پر ان سہولتوں کی فراہمی کا اعلان نہایت خوش آئند ہے لیکن اس اعلان یا وعدے کو بہت تیزی سے وفا بھی ہونا چاہیے تاکہ ترقی کا سفر جاری رہے، ملکی پیداوار اور برآمد میں اضافہ ہو، سنگین مالی خسارے میں بہتری کی صورت نمودار ہو اور عوام یعنی آپ اور ہم سکھ کا سانس لے سکیں۔ ہمارے ملک میں دل خوش کن وعدوں کی روایت بہت پرانی ہے لیکن ان کو پورا کرنے میں ہمیشہ بخل سے کام لیا گیا ہے۔ کاش اس بار ایسا نہ ہو...... ہم صرف امید ہی کرسکتے ہیں۔ اسی خوش امیدی کے ساتھ چلتے ہیں محفلِ دوستاں میں......

وہاڑی سے منشی محمد عزیز کے قلم سے جاری کردہ جاسوسی کی سالانہ کارکردگی کی تفصیل " سال بھر کے بارہ شمارے کُل 3376 صفحات پر مشتمل تھے جن میں سے 179 صفحات اشتہارات کے لیے مختص رہے۔ چٹھی محفل کے کُل اسّی صفحات پر چھپنے والے 180 خطوط میں سے انچاس مرد حضرات کے 131 خطوط اور سولہ خواتین کے 49 خطوط شائع ہوئے۔ عاصم شہزاد کے... پانچ خطوط شائع ہوئے اور چھ خطوط کے ساتھ تیسری پوزیشن حاصل کی۔ جناب اشفاق شاہین نے سات خطوط کے ساتھ دوسری پوزیشن حاصل کی۔ ہردلعزیز تبصرہ نگار طلعت مسعود نے۔ پہلی پوزیشن فی کس آٹھ خطوط کے ساتھ چار تبصرہ نگاروں نے مشترکہ طور پر حاصل کی۔ ان کے نام یہ ہیں۔ سیف خان کوئٹہ، عبدالجبار رومی انصاری بورے والا، ساگر کھوکھر میانوالی اور محمد اقبال کراچی۔ خواتین تبصرہ نگاروں میں۔ چھ خطوط کے ساتھ تیسری پوزیشن مشترکہ طور پر حاصل کی۔ ملیحہ رمشا اور سعدیہ قادری صاحبہ نے۔ دوسری پوزیشن آٹھ خطوط کے ساتھ حاصل کی نٹ کھٹ سی ایمانے زارا شاہ نے اور جناب نو خطوط کے ساتھ پہلی پوزیشن پر تشریف فرما ہیں عائشہ مرزا صاحبہ۔ جی جناب یہ تھی تبصرہ نگاروں کی کارکردگی۔ اب ملاحظہ فرمائیے مصنفین کی کارکردگی۔ سال 2018ء میں کُل 141 کہانیاں شائع ہوئیں۔ جنہیں لکھنے والوں میں 32 مرد مصنفین اور نو خواتین لکھاری شامل ہیں۔ جبکہ مرد حضرات کی 106 کہانیاں جبکہ نو خواتین کی 35 کہانیاں شائع ہوئیں۔ سب سے پہلے حسبِ معمول ان مصنفین کے نام جن کی صرف ایک ہی تحریر جاسوسی میں شائع ہوئی۔ کاشف زبیر کی جادوگر کے عنوان سے شائع ہوئی۔ ایچ اقبال کی کاغذی پیرہن کے عنوان سے شائع ہوئی۔ ہمایوں بلگرامی کی اکلوتی تحریر کانٹا شائع ہوئی۔ جام مظہر سلیم کی واحد تحریر دوسرا رنگ کے طور پر ضمیر فروش کے عنوان سے شائع ہوئی۔ انجم فاروق ساحلی، احمد سلیم سلیمی، مجید لطیف، ناصر ملک، ساحر انور اور احمد جعفری کی ایک ایک تحریر درمیانی صفحات پر چھپنے میں کامیاب ہوئی۔ سید شکیل کاظمی کی واحد تحریر عذر شناس کے عنوان سے پہلے رنگ کے طور پر شائع ہوئی اور طلحہ تراہی کی اکلوتی تحریر بھی نومبر میں پہلے رنگ کے طور پر الف بریدہ کے عنوان سے شائع ہوئی۔ محمد یاسر اعوان کی دو تحریروں میں سے ایک درمیانی صفحات پر جبکہ دوسری تحریر زخمی سرورق پر آئی۔ امجد جاوید کی تین کہانیاں بطور سرورق شائع ہوئیں۔ کبیر عباسی کی تین کہانیاں بطور دوسرا رنگ شائع ہوئیں۔ محمد فاروق انجم کی چار تحریروں میں سے ایک اپریل میں بطور پہلا رنگ، دوسری ستمبر میں بطور دوسرا رنگ جبکہ دیگر دو درمیانی صفحات پر شائع ہوئیں۔ سلیم انور، شاکر لطیف، عمران قریشی کی پانچ پانچ کہانیاں درمیانے صفحات پر شائع ہوئیں۔ امجد رئیس کی پانچ کہانیاں بطور خصوصی کہانی جنوری، اپریل، جون، ستمبر اور نومبر کے شماروں میں شائع ہوئیں۔ اعتزاز سلیم وصلی کی آٹھ تحریروں میں سے ایک بطور پہلا رنگ شائع ہوئی۔ منظر امام صاحب کی گیارہ تحریروں میں سے صرف ایک دسمبر میں بطور پہلا رنگ شائع ہوئی، جبکہ دس کہانیاں درمیانی صفحات پر شائع ہوئیں۔ تنویر ریاض کی بارہ کہانیاں درمیانی صفحات پر شائع ہوئیں۔ خواتین لکھاریوں میں زویا اعجاز کی دو تحریریں شائع ہوئیں۔ جن میں سے ایک درمیانی صفحات پر جبکہ دوسری ستمبر میں بطور پہلا رنگ شائع ہوئی۔ روبینہ رشید کی چار کہانیوں میں سے ایک فروری میں بطور دوسرا رنگ، دوسری تحریر اپریل میں بطور دوسرا رنگ، تیسری مئی میں ابتدائی صفحات پر بطور خصوصی تحریر اور چوتھی تحریر جولائی میں بطور پہلا رنگ شائع ہوئی۔ اسما قادری کی... چار کہانیاں سرورق پر آئیں اور پانچویں ابتدائی صفحات پر شائع ہوئی۔ لیجیے جناب سال 2018ء کی سالانہ رپورٹ مکمل ہوئی مگر لیٹ کرنے کو ہم

بھول گئے۔ لیٹ کرز میں تریپن مرد حضرات، چھبیس نام خواتین کے جبکہ دو مشترکہ خطوط یعنی نام شامل ہیں۔ انشاء اللہ بشرط زندگی 2019ء کی سالانہ رپورٹ اس سے بھی بہتر انداز میں لکھنے کی کوشش کریں گے۔" (جگہ کی کمی کی وجہ سے خط ایڈیٹ کیا جارہا ہے...... معذرت)

فیصل آباد سے عائشہ مرزا کے جواب و مشورے "وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے 2018ء بھی بیت گیا اور بے شمار اچھی بری یادیں چھوڑ گیا۔ دسمبر کا شمارہ ہاتھ میں ہے اور ٹائٹل پہلی نظر میں ہی دل میں اتر گیا۔ اداریہ پڑھا، بے شک ہم سب کو اپنے اپنے رویوں پر غور کرنا چاہیے۔ خالد شیخ صاحب چیکی کی محفل میں پہلے نمبر پر آنے پر مبارک باد۔ ارے محمد رمشا خدا کا خوف کرو کیسی باتیں کررہی ہو۔ بھاگیں عائشہ مرزا کے دشمن...... تبصرہ تمہارا پسند آیا مجھے۔ طلعت مسعود صاحب اپنے نالائق شاگردوں کو مفت مشوروں سے نواز رہے تھے۔ (آپ بھی شامل ہوسکتی ہیں) پرویز لانگو صاحب کے تیکھے کلام نے کافی محظوظ کیا۔ فضل کریم صاحب مختصر تبصرے کے ساتھ موجود تھے۔ موسٹ ویلکم۔ سب سے پہلی کہانی اسما قادری کے قلم سے روپ بہروپ پڑھی۔ دلچسپ اور سبق آموز تحریر پڑھ کر اچھا لگا کیونکہ سب بہروپیے اپنے انجام کو پہنچ گئے اور فیصل بھی جرم کی دنیا سے ہمیشہ کے لیے نکل آیا۔ نائس اسٹوری۔ اس دفعہ منظر امام کو پہلے رنگ میں دیکھ کر ہی سمجھ گئی کہ کہانی شاندار ہوگی اور وہی ہوا۔ کیا کمال اسٹوری تھی شاید ہی ذہن سے نکل سکے۔ چار دوستوں کی دوستی پر رشک آیا لیکن دکھ ہوا کہ ظالم معاشرے نے ان کو بھی جرم کی دنیا میں گھسیٹ لیا۔ دوسرا رنگ امجد جاوید کا شاہکار۔ مزے کی اسٹوری تھی لیکن فرحانہ کے باپ پر حیرت ہوئی کہ وہ معذور آدمی کمرے میں بیٹھ کر اپنے لوگوں کی نگرانی کرواتا رہا اور جس شخص کو اس کی بیٹی پسند کرتی تھی، وہ بوڑھا خود اس شخص کو کبھی روزی اور کبھی مسرت بیگم کے پاس بھیج دیتا ہے۔ واہ اور پھر اسی شخص سے بیٹی کی شادی بھی کردیتا ہے عجیب بات ہے۔ دستی صاحب اس دفعہ ویرا انگیل لیے حاضر تھے۔ ہمیشہ کی طرح زبردست تحریر رہی۔ خدا غارت کرے ایسے سیاست دانوں کو جو اپنے مفاد اور حکمران جماعت کو بدنام کرنے کے لیے کسی بھی حد تک چلے جاتے ہیں۔ بے گناہ لوگوں اور معصوم بچوں کی زندگیوں کو خطرے میں ڈال دیتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ اگر آج وہ کچھ بھی ہیں تو اسی وطن اور اس کے معصوم عوام کی وجہ سے ہیں۔ بہرحال ویل ڈن جی۔ انگارے میں قسطنطنیہ جیت گئی اور ریڈ کیٹ سمیت سب گنجے شیطانوں کا صفایا ہوگیا۔ اس بات پر ابھی ٹھیک سے خوشی بھی نہیں منائی تھی کہ شاہی کو ہاناوانی کا دعوت نامہ موصول ہوگیا۔ اگلی قسط دھواں دار ہوگی۔ (انشاء اللہ) محمد اقبال صاحب خوش ہوجائیے آپ کی خواہش پر شاہی اور ہاناوانی کا ٹاکرا ہوہی گیا۔ اب دعا کریں۔ مختصر کہانیوں میں سیہ عادات بہت اچھی رہی۔ برا استاد میں ہنسی کا تڑکا بھی تھا، سو مزہ آیا پڑھ کر۔ گمنام سراغ رساں نے جی بھر کر بور کیا۔ سریلا سراغ بس گزارے لائق رہی۔ کہانی کی تلاش اور مرگ جاناں دلچسپ تحاریر رہیں۔"

دانیال حسن کا نوشہرہ ورکاں سے انکشاف و اسرار "میرا جاسوسی سے جنوری 2018ء کا واسطہ ہے۔ یہ میرا ریکارڈ ہے کہ میں نے اتنی دیر کوئی رسالہ پڑھا ہو۔ (شکریہ) یہ میرا ابھی بھی پہلا خط ہے۔ (نوازش) جاسوسی کے درشن یکم دسمبر کو ہوئے۔ پہلی نظر میں جاسوسی کا ٹائٹل کچھ خاص نہیں لگا۔ (کیوں؟) لڑکی ایک طرف کچھ زیادہ جھکی تھی۔ (صرف اسی وجہ سے؟) ہاں خوب صورت ہے۔ اوپر آدمی بالکل ہالی ووڈ اسٹار جیسا لگ رہا تھا۔ خیر نکتہ چینی زیادہ اور چیچی کم کو چھوڑ کر اور صدی کی بہترین کہانی کی طرف بڑھا۔ جی ہاں، انگارے۔ مغل انکل کمال کرتے ہیں۔ اتنے شاک نہ دیا کریں۔ میرے فیورٹ کردار (تاجور) کو اس طرح دائیں بائیں نہ کریں۔ کبھی اس کو دراج سے پٹواتے ہیں اور کبھی رلاتے ہیں۔ میں نے تو اس وقت ناچنا شروع کردیا جب تاجور، شاہ زیب کی بانہوں میں تھی مگر پھر ہارٹ اٹیک ہوتے ہوتے بچا، جب پتا چلا خواب تھا۔ پھر خواب ہیں خوابوں سے نہ کر پیار کبھی۔ ہائے شاہ زیب لٹ گیا اور پکڑا گیا۔ آخر میں اگلے ماہ کا پڑھ کر دماغ بھک سے اڑ گیا۔ چھوٹی کہانیوں میں سریلا سراغ، مرگ جاناں، سیہ عادات، تیغ، ہیرو وہ ویرا انگیل اور برا استاد اچھی رہیں۔ (اچھی کہانیاں ہی شائع کرنے کی کوشش کی جاتی ہے) دوسرا رنگ ابھی آدھا پڑھا ہے۔ باقی ابھی زیر مطالعہ ہے۔ میرا خط لازمی شائع کیجیے پلیز...... پلیز۔"

فتح پور لیہ سے سید محی الدین اشفاق کی واپسی اور فرمائشی درخواست "13 ماہ کی طویل غیر حاضری کے بعد حاضر محفل ہوں، امید ہے شفقت فرمائیں گے۔ (وہ تو ہم فرمائیں گے مگر آپ کہاں تشریف فرما تھے اتنے ماہ سے؟) تاہم اس دوران کوئی بھی ایسا مہینہ نہیں گزرا کہ جس میں جاسوسی نہ ہو۔ (کیوں کہ سیکرٹ ایجنسی جوائن کرلی ہے!) جاسوسی دسمبر کا ٹائٹل شاندار تھا۔ حسینہ بے نیاز تھی، اس کو صنف مخالف کی کوئی پروا نہ تھی۔ مدیر اعلیٰ سے چیکی نکتہ چینی میں ملاقات ہوئی، زبردست۔ قدرت جب کچھ کرتی ہے تو انسان بے بس ہوجاتا ہے لیکن اس میں بھی یقینی طور پر انسان کے اپنے خراب اعمال کا دخل ہوتا ہے۔ اسی امید کے ساتھ کہ 2019ء ہمارے لیے انفرادی اور اجتماعی طور پر بہت اچھا ہو۔ (آمین) طاہر جاوید مغل صاحب انگارے میں کمال کرتے جارہے ہیں۔ قسطنطنیہ کی پاکستان آمد اور شاہ زیب سے ٹاکرا، بہت شاندار منظر نگاری ہے۔ ٹیکساری گینگ کو ابھی مکمل ختم نہ کریں۔ لگتا بھی ہے کہ انیق کی موت اور سجاول جیسا لاابالی کردار ختم ہوگیا۔ اس میں... تاجور کو تھوڑا تبدیل کریں۔ کہانی کو ابھی ختم نہیں ہونا چاہیے۔ آوارہ گرد میں ڈاکٹر صاحب خوب اچھا کام کررہے ہیں۔ تاہم عابدہ کا کردار سامنے نہ آنا طویل عرصے میں بوریت کا سبب بن رہا ہے۔ لگتا ہے عابدہ کے ملتے ہی کہانی کا خاتمہ ہوجائے گا۔ آزاد قیدی، منظر امام کی تحریر زبردست تھی۔ جامشورو سے خالد شیخ طاہری صاحب ونگ سیٹ پر اچھے تبصرے کے ساتھ براجمان تھے۔ جاسوسی ہمارے ہاں بھی دیر سے آتا ہے۔ محمد رمشا، ساگر گکھڑ اور باسط شہزاد کے تبصرے جاندار تھے۔ باقی رسالہ زیر مطالعہ ہے۔ محفل کے تمام پرانے دوستوں کو یاد کرتا ہوں۔ ہمایوں سعید، ماہ ایمان، آمنہ پٹھانی وغیرہ امید ہے کبھی نہ کبھی واپسی کریں گے۔ ایک فرمائش نئے سال سے جاسوسی اور سسپنس میں دیوتا اور شکاری کو قسط وار شائع کریں۔ (دونوں سلسلے کتابی صورت میں بازار میں دستیاب ہیں) تمام محفل اور ادارے کی پوری فیملی کو نیا سال مبارک ہو۔"

رانا بشیر احمد ایاز کے احسان پور ضلع رحیم یار خان سے رسمی تقاضے "28 نومبر کو جاتے ہوئے سال کا الوداعی شمارہ موصول ہوا۔ سرورق کی حسینہ کو شاید سردی کی وجہ سے سر درد تھا اور چہرے کا رنگ بھی اڑا ہوا تھا۔ اوپر کوئی صاحب عجیب و غریب حلیہ اپنائے کھڑے تھے۔ (کیوں خود کو پہچانا نہیں) موصوف کا آدھا جسم حسینہ کے بالوں میں اس طرح گم دکھائی دیا جیسے پاکستانی عوام مہنگائی کے سمندر میں غوطے کھانے کے بعد گم ہوجاتی ہے۔ اشتہارات کی رنگین دنیا سے کنارہ

کشتی کرتے ہوئے سید عالی محفل ست رنگ میں قدم رکھنے کی کوشش کی۔ محفل میں کرسیِ اقتدار پر خالد شیخ صاحب راجا اندر کی شان سے براجمان بیٹھے نظر آئے۔ مبارک باں سائیں۔ باقی تبصرہ نگاروں میں محمد رمشا، ساگر کلوکر، طلعت مسعود، محمد اقبال اور یاسر شہزاد کے تبصرے شاندار رہے۔ عبدالجبار رومی بھائی کہاں غائب ہیں آپ؟ جلدی سے محفل میں جلوہ افروز ہوں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے آغاز انگارے سے کیا۔ جو اب دسمبر کی ٹھنڈ میں ماحول کو گرم کرنے کا کام بخوبی سرانجام دے رہے ہیں۔ (شاید اسی لیے گیس کی بندش کی جارہی ہے) قسطینا کی ریڈ کیٹ کے ساتھ لڑائی زبردست رہی۔ اگر ریڈ کیٹ دھوکے سے کام نہ لیتی تو فائٹنگ نے سماں باندھ دینا تھا۔ داؤد بھاؤ بہت سرگرم نظر آیا۔ بنارس کو غداری کی بہت بھیانک سزا ملی۔ پہلوان حشمت کی دوبارہ انٹری بہت اچھی رہی۔ تمر کا ہاناوانی کے قبضے میں آنا کافی شاک دے گیا لیکن اب سسپنس بڑھ گئی ہے۔ دیکھتے ہیں اب کیا ہوتا ہے۔ آوارہ گرد بہت زیادہ بور کر رہی ہے۔ بھٹی صاحب پتا نہیں کیا کرنا چاہ رہے ہیں۔ خواہ مخواہ کہانی کو گھسیٹ رہے ہیں۔ فاروق انجم کی پہچان بس مناسب کہانی رہی۔ سرورق کی پہلی کہانی پر منظر امام کا نام دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ اس دفعہ سال کا آخری شمارہ یادگار ہوگا مگر اونچی دکان پھیکا پکوان۔ اتنی بورنگ کہانی منظر امام کے قلم سے؟ (فیصل آباد کی عائشہ مرزا کچھ اور لکھتی ہیں) سرورق کی دوسری کہانی تو بالکل بچکانہ سی رہی۔ دوٹکی چھاپ لڑکے کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں اور قتل تو میرا خیال ہے کہ کلو کے حساب سے کرائے ہیں مصنف نے اور فرحانہ کا فالج زدہ باپ جو کہ ہل بھی نہیں سکتا، ایک زبردست ہیکر نکلا۔ چلو یہاں تک بھی بات ٹھیک ہے مگر ایک معذور شخص راجا و روزی سمیت بیک وقت چار پانچ افراد کو کیسے بروقت دیکھ سکتا ہے۔ (اس کو دیکھنا آتا تھا) اسما قادری کی روپ بہروپ، زبردست پلاٹ، جاندار کردار اور ہر موڑ پر سسپنس سے بھرپور ڈائیلاگز۔ انسپکٹر اسد کا اصل روپ ششدر کر گیا۔ زبردست کہانی، ویری ویلڈن اسما قادری اور آخر میں جاتے ہوئے رسمِ دنیا کے تقاضے کو نبھاتے ہوئے سب دوستوں اور ادارے کو سالِ نو مبارک ہو۔“

میرپور خاص سے نواز علی مری کی زندگی کے تغیرات ”میں پچھلے اٹھارہ سال سے جاسوسی ڈائجسٹ پڑھتا آرہا ہوں۔ اٹھارہ سال میں کئی لمحے آئے گئے مگر میں نے کسی بھی حال میں ڈائجسٹ پڑھنا نہیں چھوڑا۔ (ایسے ہوتے ہیں اچھے قارئین) 2011ء میں ہمارے گاؤں میں شدید زلزلہ آیا۔ کئی لوگ دربدر ہو گئے مگر میں نے ان حالات میں بھی اپنا ڈائجسٹ نہیں چھوڑا۔ میری بیوی نے ڈائجسٹ کو اپنی سوکن کا نام دیا ہے۔ آج اس امید سے یہ خط لکھ رہا ہوں کہ شاید جاسوسی کے کسی کونے میں مجھے بھی جگہ ملے گی۔ (ضرور ملے گی یہ آپ کا اپنا ہے) عبدالرب بھٹی صاحب کی آوارہ گرد بہت اچھی کہانی ہے اور طاہر جاوید مغل کی انگارے بھی میری پسندیدہ کہانی ہے۔ اگر جگہ ملی تو پھر لکھتا رہوں گا اور جاسوسی سے رشتہ ہمیشہ قائم رہے گا۔“ (جگہ بہت ہے، آپ ہمت تو کریں)

ریاست خان داؤد خیل، میانوالی سے لکھتے ہیں ”پورا ماہ جاسوسی ملنے کا انتظار ہوتا ہے۔ جاسوسی ہے ہی اتنا اچھا۔ اس بار جاسوسی 28 تاریخ کو ملا۔ سرورق نہایت شاندار تھا۔ مہ جبیں شاید صحرا میں ہیر کی طرح اپنے رانجھے کو الوداع کہہ رہی تھی۔ ماڈرن رانجھا بھی کمر سے بیگ لٹکائے ہیر کو الوداع کہتا سفر پر نکل رہا تھا۔ چیکی نکتہ چینی میں پہنچے جہاں خالد صاحب اولین کرسی پر براجمان نظر آئے۔ بہت بہت مبارک باں جناب تبصرہ واقعی لاجواب تھا۔ طاہر صاحب لڑکی کی اتنی تعریف اچھی نہیں اگر بیوی نے دیکھ لیا تو۔ (وہی ہوگا جو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے) محمد صاحب آپ نے عورت کو قتل کیے جانے کے موضوع پر کہانی لکھی کیا صرف یہی موضوع رہ گیا ہے۔ کسی مرد کے قتل کے موضوع پر کہانی لکھتیں تو بات تھی۔ (مرد بے چارے تو ویسے ہی جان ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں) آپ کی بھی گریجویشن ہو چکی مبارک باں۔ باقی سب دوستوں کے تبصرے بہت اچھے تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے روپ بہروپ پڑھی۔ اسما قادری کی لاجواب کہانی نے آخر میں چونکا دیا۔ ہم اسد کو ہیرو سمجھتے رہے، وہ آخر میں قاتل نکلا۔ فیصل اور فرح کے کردار بہت پسند آئے۔ واقعی زندگی نام ہی اسی کا ہے کہ دوسروں کے کام آیا جائے۔ انگارے تو ہماری فیورٹ جارہی ہے۔ کہانی شروع کرو تو پتا بھی نہیں چلتا اور ختم ہو جاتی ہے کیا انگارے کے صفحات میں اضافہ نہیں ہو سکتا؟ (طاہر صاحب توجہ دیں) یہ قسط تو اور بھی لاجواب تھی۔ مجھے یہ پڑھ کے بہت اچھا لگا کہ تاجور، شاہ زیب کے پاس واپس آچکی ہے لیکن پھر پتا چلا کہ وہ تو خواب تھا۔ (خوابوں میں ہی ارمان پورے ہوتے ہیں) آہ بے چارہ ایسٹر۔ شاہ زیب آخر کار ہاناوانی کی قید میں پہنچ ہی گیا، اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ آوارہ گرد میں شہزی آخر کار امریکا پہنچ ہی گیا۔ ہم بھی تو امریکا کا بغیر ویزہ کے نظارہ کر رہے ہیں۔ واقعی یہ بات حیران کن ہے کہ امریکی مسلمانوں کو ہی آخر نائن الیون کا ذمے دار کیوں سمجھتے ہیں۔ سرورق کی پہلی کہانی اور وہ بھی منظر امام کی۔ آزاد قیدی اس معاشرے کے نازک پہلو کو اجاگر کرتی لاجواب تحریر تھی حقیقت کے قریب تر (منظر امام خوابوں کی دنیا سے ذرا دور ہی رہتے ہیں)۔ سب ہی کردار بہت اچھے تھے۔ پگلی کڑی، امجد جاوید کی عمدہ تحریر تھی۔ اس معاشرے میں اس جیسی کتنی کہانیاں ہمارے سامنے ہیں۔ جاسوسی کا شکریہ کہ وہ معاشرے کے نازک پہلو ہمارے سامنے رکھتا ہے۔ گم نام سراغ رساں انگریزی ترجمہ کی ایک لاجواب تحریر تھی۔ خوشی کا سودا اچھی کاوش تھی۔ بیٹی کو بھی وہی مقام ملنا چاہیے جو بیٹوں کو ملتا ہے۔“

نارووال سے سید ذیشان حیدر کاظمی کی خواب پسندی ”دسمبر کے شمارے کے ٹائٹل کا دیدار چھبیس نومبر کو ہوا۔ گداز ہاتھوں میں کڑوٹی انگلی میں سنہری چھلا پہنے اپنے بال سہلاتی لڑکی کے سر سے پہلے تو ایک جواں جھلک نظر آئی۔ پھر غور سے دیکھا تو اندازہ ہوا کہ سلمان خان کی لک جیسی جھلک دکھاتا یہ کوئی منفرد وجاہت ہے۔ فہرست پر نظر دوڑائی تو ایک مدت پرانی خواہش پوری ہوتے دیکھ کر یقین نہیں آیا۔ اولین صفحات پر اسما قادری کو دیکھنے کی تمنا تو کب سے تھی۔ (مبارک ہو تمنا پوری ہوئی) پہلی فرصت میں یہی کہانی پڑھی۔ بہت زیادہ کرداروں کے ساتھ کچھ الجھی ہوئی کہانی نے پہلے تو دماغ گھمایا لیکن پھر کلائمکس سے پہلے سب کچھ واضح ہوتا گیا۔ اس کے بعد نکتہ چینی کا رخ کیا۔ جامشورو سے شیخ صاحب کا تبصرہ جلوہ افروز تھا، مبارک باد۔ محمد رمشا نے مستقبل میں جاسوسی کہانیوں میں انٹری کا سگنل دیا۔ انتظار رہے گا ان کی کہانی کا۔ ساگر کلوکر کی تجویز پڑھ کر نواب صاحب کی اندھیر نگری پڑھنے کو دل مچلنے لگا۔ اگر اشاعت مکرر ہو جائے تو کیا کہنے۔ ریاست خان! اب ماسٹرز کس سبجیکٹ میں کرنے کا ارادہ ہے؟ جدہ سے پرویز احمد لانگاہ کا درہم برہم قہقہہ پڑھ کر ہنسی تو بڑی آئی۔ (یہ تو اچھی بات ہے) ذرا ہتھ ہولا رکھو سرکار! محمد اقبال صاحب اتنی قنوطیت اچھی نہیں جناب! ہمیں نئی حکومت سے بہت سی امیدیں ہیں جو انشاء اللہ پوری بھی ہوں گی۔ (دل کے

سمجھانے کو غالب خیال اچھا ہے) انکتہ چینی کے بعد انگارے کی طرف دوڑ لگائی۔ منظر نگاری تو بس ہمارے دلوں کی دھڑکن مغل صاحب پر ختم ہے۔ ریڈ کیٹ اور قسطینا کی لڑائی کے بعد کھوہ میں تاجور کا ایکشن دسمبر میں بھی دل کو گرما گیا۔ (چلو شکر ہے ٹھنڈ سے بچے رہو گے) ہاہا وانی میری فیورٹ ولن بن گئی ہے۔ اس کی انٹری سے کہانی میں مزید سنسنی خیزی پیدا ہونے کی توقع ہے۔ امید ہے کہ شاہ زیب کا انگوٹھے میں ہیئر لائن فریکچر اسے ٹرانس میں گرفتار ہونے سے بچائے گا۔ تاجور کی تخیل میں آمد بہت دھانسو اور دل گداز تھی۔ مغل صاحب! منظر سلیم ہاشمی کی براساتا بڑی اچھی تھی۔ اعتزاز سلیم وصلی کی دہرا کھیل ٹی ٹوئنٹی لیگ کی طرح اتنی سپر فاسٹ تھی کہ میرا تو اختتام تک پہنچتے سانس پھول گیا۔ (درمیان میں ذرا پانی کا وقفہ لے لیا ہوتا) اس کہانی کو تھوڑی سی مزید ٹریٹمنٹ سے سرورق کا رنگ بنایا جا سکتا تھا۔ (وصلی صاحب! کان دھریں) سید حارث، سربیا سراغ اور پہچان اچھی رہیں۔ سرورق کے رنگوں میں بہت معتبر نام نظر آئے۔ منظر امام نے فٹ پاتھیوں اور ان کے مسائل سے بہت اچھا تعارف کروایا لیکن انجام کچھ تشنہ سا لگا۔ (بس یہی کرتے ہیں منظر امام اور الزام ہم پر رکھ دیتے ہیں) چنگی گر بھی شہر قائد کے مسائل پر معلومات دیتی اچھی چلتی رہی لیکن اختتام تک آتے کچھ عجلت نظر آئی۔

اسلام آباد سے انور یوسف زئی کی رائے "بوجہ علالت طویل غیر حاضری کے بعد محفل میں حاضر ہوں۔ اپنے مختصر تبصروں کی بنا پر اپنے پرانے لکھنے والوں کو میں یاد ہوں گا۔ (بالکل...... ہمیں تو غیر حاضری نے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا) جاسوسی اس بار 27 نومبر ہی کو مل گیا۔ سرورق بس ٹھیک تھا مگر وہ بات کہاں ذاکر صاحب مرحوم کی سی۔ اولین صفحات کی کہانی اسما قادری کی روپ بہروپ اس ماہ کی بہترین کہانی رہی۔ پولیس والا ہی ڈاکو نکلا۔ اسما صاحبہ نے موجودہ معاشرت اور سیاست دانوں کا اصل روپ خوب اجاگر کیا۔ دیسی کہانیوں میں فاروق انجم کی پہچان ایک اچھی کہانی تھی۔ سرورق کی دونوں کہانیاں آزاد قیدی اور چنگی گر جاسوسی کے معیار کی نہیں تھیں۔ قسط وار دونوں کہانیاں انگارے اور آوارہ گرد اپنی بے جا طوالت کی وجہ سے اپنی دل کشی کھو چکی ہیں۔ بہتر ہے اب نئی کہانیاں شروع کی جائیں۔ کارٹون اور کترنیں شاندار تھیں۔"

"چشمہ بیراج سے ساگر نکوکر کی اختتام جمت" چشمہ بیراج سے میانوالی سٹی 35 کلومیٹر دور ہے۔ وہاں کے دو چکر لگانے کے بعد عزیز جاسوسی نصیب ہوا۔ (آپ کی ہمت کو سلام) سرورق پر مزید محنت کر کے بہتر سے بہتر بنایا جا سکتا تھا۔ (بہت روشن تجز ہے امید بہار رکھ) چٹکی نکتہ چینی میں خالد شیخ طاہری کے تبصرے کی روانی بہت بھلی لگی۔ من سے مبارک ہو۔ رمشا جی ...تکرار کرتی نظر آئی۔ ریاست خان رمشا اپنی جیب سے جاسوسی کیسے لے سکتی ہے بھئی۔ طلعت مسعود اور پرویز احمد لاڈلہ کی دیار غیر سے شرکت ہمیشہ اچھی لگتی ہے۔ باسط شہزاد بھولنے کی عادت چنگی نہیں۔ انگارے، کنفرنو ہ برام رام کر کے (بقول پہلوان) تاجور نے حق مشوق ادا کر دیا۔ چاقو سے ٹیکساری گینگ کے دشمن پر حملہ یقین نہیں آتا۔ قسطینا اور ریڈ کیٹ کی لڑائی پر پہلوان کی کمنٹری کی شدت سے محسوس ہوئی۔ داؤد بھاؤ ہاتھ پیر ہلاتے نظر آئے ورنہ پہلے تو صرف زبان ہی چلاتے رہتے ہیں۔ ہاہا وانی بھرپور ایکشن میں ہے۔ شاہ زیب تو کھوہ سے نکلا اور ہاہا وانی کی قید میں جا پھنسا بقول پہلوان آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔ اگلی قسط سنسنی خیز ہوگی۔ شاہ زیب کی خوش بختی ہے کہ اس کا انگوٹھا ہی زخمی ہے۔ مزید جھیل کر ہاہا وانی کے وار سے بچنے کی امید واثق ہے۔ سید حارث بہت پیاری دلچسپ اور سبق آموز کہانی تھی۔ الزام تراشی نے کئی گھر اجاڑے ہیں۔ یہ کبیرہ گناہ ہے۔ اس کی ممانعت کی گئی ہے۔ رشید خوش نصیب نکلا۔ غلط راستے سے داخل ہو کر سیدھی راہ پر آ گیا۔ براساتا پل پل بدلتی مسکراتی، جرم و سزا اور رومان پرور لمحوں پہ ختم ہوتی کہانی بہت اچھی لگی۔ اب تک جتنی تراجم کہانیاں پڑھیں، ان میں سب سے زیادہ اچھی لگی۔ براساتا یاد رہے گی۔ سراغ رساں، دنیا میں بھی کیسے کیسے ذہین لوگ پائے جاتے ہیں۔ جو چھوٹی سے چھوٹی بات سے مجرم پکڑ لیتے ہیں۔ خوشی کا سودا تحسین یونگ ین کا کارنامہ اور نصیحت بہت پسند آئی۔ پہچان، ساجد شہرت کی خاطر اندھا دھند غلط فیصلے اور کام کرتا رہا۔ آخر کار ایک مجرم کی شہرت اسے مل گئی۔ دہرا کھیل اچھے موضوع پر کہانی تھی۔ کردار اور واقعات تھوڑے ڈھیلے رہے۔ ان پر مزید محنت کر کے کہانی کو بہتر سے بہترین بنایا جا سکتا تھا۔ (سیکھ جائے گا) چنگی گر بیرو، بڈھی گھوڑی لال لگام کے مترادف بڑھاپے میں بڑی بی کو تجدید عشق کی سوجھی دے رے محبت۔ (بوڑھیوں کے سینے میں بھی دل ہی دھڑکتا ہے، بہتر نہیں!) ولی کو ستانے مہارت سے ناصر کرونز کے چھپے اشارے کے کارنامے دریافت کیا۔ کہانی کی تلاش، حساس موضوع پر بہترین کہانی۔ ہمارے نام نہاد صحافیوں کو اس سے سبق سیکھنے کی ضرورت ہے۔ گمنام سراغ۔ پل پل بدلتی دنیا یہاں کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ مرگ جاناں۔ اب کیا پچھتائے ہوت...... روپ بہروپ۔ خوابوں اور جذبات سے گندھی پُرتجسس تحریر نے ابتدائی صفحات کا حق ادا کر دیا۔ غلط راہوں پر چل کر انسان کبھی سرخرو نہیں ہو سکتا۔ فیصل اور فرح کے ساتھ یہی ہوا۔ رانیہ کی موت نے رلا دیا۔ ملک احسن کا کردار ایک حقیقی سیاست داں سے بہت زیادہ ملتا جلتا لگا۔ انسپکٹر اسد کی ایمانداری متاثر کر رہی تھی مگر افسوس وہ بھی کالی بھیڑ نکلا۔ سرورق کی پہلی کہانی۔ آزاد قیدی بے رحم دنیا کی سچی کہانی جہاں انسان اپنی مجبوریوں اور خواہشوں کی ان دیکھی زنجیروں سے جکڑے ہیں۔ انسان انسان کو نگل رہا ہے۔ خلوص اور ہمدردی ختم ہو گئی ہے۔ شاہکار کہانی بہت پسند آئی۔ ایسی ہی عام انسانوں کی کہانیوں کو سرورق کی زینت بننا چاہیے۔ سرورق کی دوسری کہانی چنگی گر عنوان کے حساب سے اچھی لگی۔ اس بات پہ حیرت ہے کہ راجہ تین قتل اور ڈکیتیاں کر کے بھی مجرمانہ ذہن نہیں رکھتا تھا۔ مجرموں اور بیکرز کے گرد گھومتی کہانی میں پولیس کا کردار کہیں نظر نہیں آیا۔ (کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے) ماسٹر مائنڈ نے حیرت میں ڈال دیا۔ کترنیں کم مگر شاندار تھیں۔"

اسلام آباد سے ایمانے زارا شاہ کی سواری "سال کا آخری شمارہ بڑی تگ و دو کے بعد ہاتھ میں آیا...... ٹائٹل والی خاتون تو بہتر تھی لیکن اس کی زلفوں سے لٹکا دیو ہیکل آدمی بڑا ہی خوفناک تھا۔ سمجھ میں نہیں آیا یہ زلفوں سے برآمد ہو رہا تھا یا چھپنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا (جو بھی سمجھ لیں)...... اولین تبصرے پر براجمان رہے تھے خالد شیخ طاہری...... تبصرہ بھی سپر ڈوپر رہا...... مبارک باد واسطے رمشا دکھو میں آ گئی...... اتنی آوازیں دو گی تو قبر سے مردہ بھی چھینکوں سے تنگ آ کر آ جائے گا...... یاد کرنے کا شکریہ...... ساگر نکوکر آپ کی تو ٹرین چھوٹ رہی ہوتی ہے ایسے بھاگم بھاگ تبصرے کرتے ہیں۔ طلعت یہ تو ہم نے آپ سے سیکھا ہے۔ آپ بھی غائب ہو گئے تھے نا۔ باسط شہزاد کا تبصرہ اس بار بھی بہت اچھا رہا...... البتہ جس تبصرے نے پیٹ میں بل ڈال دیے وہ تھا سر انکل کا درہم برہم کر دینے والا انداز...... یونیک انداز کے سر درہم برہم! ہم بھی ڈائجسٹ کے اولین صفحات کو پھلانگتے ہوئے انگارے کی سمت چل دیے۔ انگارے میں ایک موڑ پر تو غصے

سے ہماری شریان پھٹنے والی تھی صد شکر کہ وہ خواب تھا..... حقیقت نہیں..... تاجور اور شاہ زیب ایک..... نہ بابا نہ..... شاید ہم عجیب قاری ہیں جو ہیرو ہیروئن کو دور دور رکھنا چاہتے ہیں (آپ تو بہت سنگ دل ہیں) حالانکہ یہ آگ پانی تو ہیں نہیں..... اختتامی لمحات میں ''فخر'' کا ٹرانس میں آنا ایک زوردار جھٹکا تھا جسے سہنا بس سے باہر ہے..... کیونکہ ابھی تو انیق کا غم نہیں بھرا تھا پھر سجاول کی حالت..... اور اب فخر! مجھے یقین ہے جہانی استاد نے جیسے سانوس کا مقابلہ کیا تھا اسی کی طرح شاہ زیب بھی ہاناوانی کا مقابلہ کرے گا انشاء اللہ۔ اسما قادری کی روپ بہروپ کمال کہانی تھی۔ پڑھتے ہوئے ایک لمحے کو بھی انسپکٹر اسد پر شک نہیں گیا۔ فیصل کے غلط اعمال کا منطقی انجام یہی بنتا تھا۔ سارا گھر کھونے کے بعد بھی اسے عقل، کافی دیر سے آئی۔ زبردست کہانی ہمیشہ کی طرح! آکرس کے حوالے سے برا سامنا ہرگز برا نہیں تھا بیچارہ بڑا معصوم سا تھا اور اس کے دل میں دبے جانے والے شگفتہ کو سنوں کو سن کر..... مزہ آ گیا۔ (یہ تو اچھا ہوا) لیکن پتا نہیں کیوں الفاظ کا چناؤ ذرا کھلا ڈلا تھا۔ باقی ڈائجسٹ ابھی پڑھا نہیں اس لیے فی الوقت اتنا ہی!''

جامشورو سندھ سے، خالد شیخ طاہری کے مشورے ''ہمیں تاریخ جاسوسی کے حوالے سے اہم ہوتی ہے۔ ایک خواہش ہوتی ہے کاش جاسوسی مل جائے۔ اس بار یہ خواہش پوری نہیں ہوئی ہمیں کو صبح ہی صبح جاسوسی ملا تو بڑی خوشی سے دل بلیوں اچھلنے لگا۔ ایک خوشی جاسوسی ملنے کی دوسری اولین تبصرے کی۔ سرورق پر نظر ڈالی تو بس ٹھیک ٹھاک ہی لگا۔ فہرست میں سرپرائز موجود تھے۔ اولین صفحات پر اسما قادری کو دیکھ کر اچھا لگا اور رنگوں میں منظر امام اور امجد جاوید کے ناموں نے جاسوسی کو پڑھے بغیر ہی شاندار قرار دے دیا۔ (شکریہ) محفل میں پہنچا تو پہلے صفحے پر خود کو دیکھ کر جو خوشی ہوئی وہ بیان سے باہر تھی۔ ساتھ ساتھ دعا بھی کی کہ اللہ پاک ہمارے پیارے وطن کو قدرتی آفات اور زمینی آفات سے محفوظ رکھے۔ دیگر تبصروں کی بات کروں تو کسی ایک کا نام لے کر دوسروں سے زیادتی نہیں کر سکتا، تمام تبصرے ہی بہترین رہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے اعتزاز سلیم وصلی کو پڑھا۔ دہرا کھیل کھیلنے والوں کا انجام ایسا ہی ہونا چاہیے۔ جنگیوں کی انٹری نے کہانی کو پُر تجسس بنا کر اعتزاز کو شاباشی کا مستحق بنایا۔ جاوید مغل صاحب نے اس دفعہ وہ کمال دکھایا جو مغل صاحب کا خاصہ ہے۔ قاری کو کہانی میں پہنچا دیا۔ انیق کے بعد فخر بھی ہاناوانی کا شکار ہو گیا اب شاہ زیب بھی گرفت میں ہے تو کہانی ایسے موڑ پر آ رکی ہے جہاں اب کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ دیکھیں مغل صاحب اگلی قسط میں قاری کو کون کون سے جھٹکے دیتے ہیں۔ رنگوں نے تو اس دفعہ وہ رنگ جمایا کہ جاسوسی کا مزہ ہی آ گیا۔ منظر امام کی آزاد قیدی جب چلتے چلتے ختم ہوئی تو سوچا منظر امام صاحب سے درخواست کروں گا اسی کہانی کو آگے بڑھایا جائے کیونکہ اختتام زبردست رنگ تشنہ سا رہ گیا ہے۔ (یقیناً آئندہ بھی عزائم رکھتے ہیں وہ) دوسرا رنگ پنکی گرل میں امجد جاوید نے بہترین رنگ بکھیرا۔ ایک چونکا دینے والے اختتام نے پورے رنگ میں چار چاند لگا دیے۔ دونوں لکھاریوں نے رنگوں کا حق ادا کیا۔ ترجمہ کہانی برا ساتھی کو طاہر سلیم ہاشمی نے منفرد انداز میں لکھا جو چھا گیا۔ سرور اکرام صاحب کی سیدھا راستہ دوستی کا حق ادا کرتی بہترین لگی۔ منفی ذہن رکھنے والا بھی نام و مقام حاصل نہیں کر پاتا بالآخر اپنے انجام کو پہنچ جاتا ہے۔ محمد فاروق انجم کی پہچان زبردست رہی۔ جاسوسی کے گولڈن صفحات پر اس بار امام نے اپنے قلم سے ایسے باندھا کہ اسٹوری پوری پڑھ کر ہی آزاد ہوا۔ (آزادی مبارک) ماضی کے حوالے کس طرح ہماری زندگی میں اثر انداز ہوتے ہیں بہروپ کو پڑھ کر اندازہ ہوا۔ مرکزی کردار فیصل کی زندگی بھی ایک ایسے ہی حوالے سے زیر و زبر ہوئی۔ ترجمہ کہانیوں میں تنویر ریاض کی گمنام سراغ رساں اور ن فاطمہ کی خوشی کا سودا نے جاسوسی کے معیار کا بھرم رکھا۔ جمال دستی کی ہیرو اور تحسین رضا کا قابل شکست کے ساتھ بہترین رہے۔ (اس چینج کا شکریہ) سلیم انور کی سریلا سراغ بس ٹھیک تھی مگر احمد جعفری کی سرگوجاناں اور محمد عرفان آزاد کی کہانی کی تلاش دلچسپی لیے ہوئے تھی۔ کترنوں نے اس دفعہ مزہ نہیں دیا۔ (اور اسے کہتے ہیں نکتہ چینی) چلتے چلتے ایک بات کہنی ہے کہ اس بات میں تو کوئی دو رائے نہیں ہے کہ ادارہ قارئین کی دلچسپی، ذوق و شوق اور ادبی ذہن کو مدنظر رکھتے ہوئے اچھے سے اچھے اقدامات کرتا ہے مگر ڈاکٹر انکل (اللہ پاک انہیں جنت میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا فرمائے) کے بعد سرورق کے معیار پر کچھ فرق پڑا ہے۔ اس کی طرف توجہ دینا ضروری ہے اگر ہو سکے تو جدید ٹیکنالوجی سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ یہ بس ایک تجویز ہے جو ذہن میں آئی تو عرض کر دی۔'' (بہت شکریہ)

جدہ سے پرویز احمد لانگاہ کے قلم سے درہم برہم تبصرہ ''سال آخر کے جاسوسی سرورق پر غریبوں کی سری دیوی بالوں میں انگلیاں ڈالے سوچ رہی تھی کہ یہ سال بھی گزر گیا مگر شوہر نہیں ملا جس کو درہم برہم کر سکوں مگر سانوں کی پیچھے بھی مرد خود کو شاید کاٹھ کو سمجھ رہا ہے وہ بھی یہی کہہ رہا ہے درہم برہم ہو جا سانوں کی۔ آج کل احمد اقبال صاحب کی شکاری زیر مطالعہ ہے اس لیے سوچا تھا کہ تبصرہ اگلے ماہ کروں گا۔ محفل یاراں میں میرے اپنے شہر جامشورو سے خالد شیخ صاحب سوچوں کو تاؤ دیتے ہوئے پائے گئے۔ شیخ صاحب مبارکاں۔ دوسرے تبصرے میں نکو کر صاحب جاسوسی کو سینے سے لگائے نظر آئے ساگر میاں اگلی بار جاسوسی کو گردے پھیپھڑے سے بھی لگانا ورنہ وہ طبیعت درہم برہم کر کے رکھ دیں گے۔ دور جاہلیت میں بے وقوف لوگ صرف سنی سنائی باتوں پر اپنے اوچھل ہونے کا ثبوت دیتے تھے اور دشمنی میں آگے نکل جاتے تھے لیکن اب بھی فرق نہیں آیا کیونکہ میرا پچھلے مہینے کا درہم برہم تبصرہ بھی کچھ لوگوں نے اپنے اوپر لے لیا۔ ادیب نام رکھ لینے سے کوئی لکھاری نہیں بن جاتا ویسے ہی جاسوسی سے محبت کرنے والا اس کے خلاف نہیں بول سکتا۔ جاسوسی میری جان ہے اور اس کی آن بان پہ یہ لانگاہ قربان ہے۔ کہانیوں میں ہمیشہ کی طرح انگارے سے شروعات کی۔ ڈیتھ اسکواڈ کو کتے کی موت مار کے شاہ زیب اور قسطینہ نے کمال کر دیا۔ قسطینہ اور کیٹ کی لڑائی اس قسط کا بہترین سین تھا۔ تاجور کا شاہ زیب کے گلے لگ جانا پہلے تو بہت شاکنگ لگا مگر اچھا ہوا جو وہ خیال ہی تھا ورنہ میں مغل صاحب کو پرسنل خط لکھ کر کہتا سری تاجور والا منظر درہم برہم کر دیں یا اسے درہم برہم کر دیں۔ فخر کا ہاناوانی کے زیر اثر آ کر شاہ زیب کو پھنسانا جھٹکا لگا گیا، اب شاہ زیب ہاناوانی کے سامنے ہے۔ دیکھتے ہیں مغل صاحب کتنی اقساط میں کہانی کا تیا پانچہ کر کے سب کو درہم برہم کرتے ہیں کیونکہ جس رفتار سے کہانی جاری ہے لگتا ہے کہانی تک جانی ہے۔ تک جانے سے یاد آیا یہ آوارہ گرد کب ختم ہو رہی ہے۔ اگلی قسط وار ناصر ملک صاحب کی ہو تو ماڑا شیخ کی یاد تازہ ہو جائے اور سب کچھ درہم برہم ہو جائے۔ منظر امام نے کئی کہانیوں کو ملا کر سرورق کا رنگ پیش کیا اور دل کو درہم برہم کر دیا۔ میں ان کی کہانیاں مزاحیہ ہونے کی وجہ سے شوق سے پڑھتا لیکن اس بار تو اداسی بال کھولے سب کچھ درہم برہم کر رہی تھی۔ امجد جاوید نام بڑا اور درشن چھوٹے والا کام کرنے لگ گئے ہیں۔ گرتے پاجامے میں ملبوس لڑکی جب اسکرٹ کے نیچے سے پستول نکالتی ہے تو میرے جیسے قاری کا قہقہہ بھی نکل جاتا جو سب درہم برہم کر دیتا۔ ان سے بہتر کی توقع ہے۔ اسما قادری کی روپ بہروپ اچھی کہانی تھی لیکن

جب وہ اتنی تفصیل بتاتی ہیں تو کہانی کا سسپنس درہم برہم ہو کر تیل لینے چلا جاتا ہے۔ چھوٹی کہانیاں بالکل نہیں پڑھی ہیں۔ ایک سوال میری ایک سچ بیانی سرگزشت میں چھپ چکی ہے جاسوسی کے لیے ایک جاسوسانہ کہانی لکھی ہے بھیج دوں؟" (کہانی بس درہم برہم نہ ہو)

دبئی سے طلعت مسعود کی پسندیدہ باتیں "سال کا آخری جاسوسی اس وقت ہاتھ میں ہے۔ سرورق اس بار کچھ خاص نہیں رہا۔ اس پورے سال میں چند ایک ہی سرورق تھے جو جاسوسی کے مزاج کے مطابق رہے۔ خالد شیخ طاہری صاحب اس بار چیچی بحث چنگی کے اجلاس کی صدارت کر رہے تھے۔ مبارکباد، تبصرہ عمدہ رہا آپ کا۔ ساگر کلوکر اس بار انگلش کہانیوں سے رجوع کرتے نظر آئے۔ اچھی بات ہے۔ آگے پرویز احمد لانگاہ صاحب اپنے قہقہوں سے پوری محفل کو درہم برہم کیے ہوئے تھے۔ ذرا ہولے۔ خواتین بھی موجود ہیں کہیں وہ آپ کے قہقہوں سے ڈر کر بھاگ نہ جائیں۔ فضل کریم صاحب کو خوش آمدید، امید ہے آپ آئندہ بھی آتے رہا کریں گے۔ سحر رمشا کا تبصرہ دلچسپ رہا اس کے علاوہ باسط شہزاد، محمد اقبال اور ریاست خان کے تبصرے اچھے رہے۔ انگارے تیز رفتاری سے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اب شاہ زیب اور ہاہا دانی کے ٹاکرے کا انتظار ہے جو لگتا ہے اب نزدیک آچکا ہے۔ اولین صفحات میں روپ بہروپ بھرے کرداروں کی داستان شروع میں تو عام سی لگی لیکن جیسے جیسے آگے بڑھتی گئی۔ کہانی دلچسپ سے دلچسپ ہوتی گئی اور آخر میں کا گہرا اثر چھوڑ گئی۔ کئی دفعہ جذبات میں ناجائز راستہ اختیار کرتے ہوئے یہ گمان بھی نہیں ہوتا کہ زندگی میں نہ جانے کب تک اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا اور اس سے خود سے جڑے لوگ بھی اس کی قیمت ادا کرتے ہیں۔ جیسا فیصل کے ساتھ ہوا لیکن سب کچھ کھو کر اس نے سبق بھی حاصل کیا۔ کہانی کا آخری پیغام بہت عمدہ رہا۔ آزاد قیدی میں منظر امام صاحب نے ان لوگوں سے ملاقات کروائی جنہیں معاشرے میں شاید کبھی بھی کوئی مقام نہیں دیا جاتا۔ کہانی اچھی رہی لیکن آخر میں ایسا لگا جیسے یکدم ہی اسٹاپ کر دیا گیا ہو۔ اسی طرح دوسرا رنگ چلی گر بھی شروع میں جس اٹھان کے ساتھ شروع ہوا تھا، انجام اس کا بھی زبردستی لگا جیسے بس سمیٹنے والی بات کی گئی ہو۔ براساتا، دلچسپ رہی۔ دہشت گردی کی لعنت اور اس کی آڑ میں اپنے مفاد پورے کرنے والوں کی داستان دہرا کھیل اچھی رہی۔ لیکن ابتدا میں بیان کیا گیا سین کہیں دوبارہ پکڑائی نہیں دیا۔ کہیں غائب تھا یا مجھے نظر نہیں آیا۔ کہانی کی تلاش، تو ہمارے آج کل کے میڈیا کی کافی حد تک عکاس ہے۔ اپنی خبر بنانے کے لیے سب کچھ جائز کی داستان۔ سریلا سراغ مختصر لیکن اچھی رہی۔ پہچان اور سیدھا راستہ بہتر رہیں۔ اور اب اس دعا کے ساتھ اجازت کے نیا سال انفرادی اور اجتماعی طور پر خوشیوں بھرا سال ہو۔ اگلی بار پھر حاضری کی کوشش کریں گے۔

کوئٹہ سے سیف خان کی کاوش "گزشتہ سال جاسوسی میں کیا کچھ ہوتا رہا، اس مختصر سالنامے میں اس کا جائزہ لیتے ہیں۔ پچھلے سال کے سرورق دو کیٹیگریز میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ اگست، اکتوبر اور نومبر کے بہترین سرورق A کیٹیگری میں آتے ہیں۔ کیٹیگری B میں جنوری، فروری، مارچ، مئی، ستمبر اور دسمبر کے ماڈلز آتے ہیں۔ یہ ہلکے پھلکے مگر اچھے سرورق رہے۔ اپریل، جون اور جولائی کے ماڈلز جس کیٹیگری میں آتے ہیں اس کا میں نام بھی نہیں لینا چاہتا۔ ان تینوں ماڈلز کی تیز سی ہیری حسینائیں ایک دوسرے کی جڑواں بہنیں ہی لگ رہی تھیں۔ سال بھر کے ماڈلز میں ایک عدد گن کی جھلک مشترک رہی۔ گن کے علاوہ دیگر اوزار حرب و ضرب کی نمائش بھی ہونی چاہیے۔ (بہتر) ماڈلز کے بعد تذکرہ محفل چیچی بحث چنگی کا۔۔۔۔ راقم سمیت منظر سلیم ہاشمی، بلقیس خان، سجاول خان، سعدیہ قادری، عاصم شہزاد، طلعت مسعود، فیصل مشتاق، ایمانے زارا شاہ، عبدالرزاق (عبدل جی)، باسط شہزاد اور خالد شیخ طاہری نے باری باری مسند صدارت کے مزے لوٹے۔ اس کے علاوہ سحر رمشا، پرویز احمد لانگاہ، عائشہ مرزا، محمد صفدر معاویہ، عبدالودود عامر، عائشہ خان، ڈاکٹر صبا ارشد، اشتیاق شاہین، ماہ رخ ارباب، مومنہ کشف، اے آر جٹ، ساگر کلوکر، ذوالفقار شاہد، ایم اقبال، منشی عزیز، ذیشان حیدر کاظمی، عبدالجبار رومی اور قدرت اللہ نیازی تو آتے ہی حالات حاضرہ پر تبصرہ کرتے اور بیٹھک کی شان بڑھاتے رہے۔ بھولی بسری سعدیہ ہما شیخ نے بھی اک واری جھلک دکھائی اور باوا آدم کے زمانے کی آمنہ رانا بھی ایک ہی مرتبہ بن ٹھن کے آئیں۔ فضل کریم کا دورانیہ تبصرہ سال کا آخری تبصرہ ضرور ثابت ہوا لیکن امید ہے یہ ان کی آخری حاضری نہیں رہے گی۔ محفل کے تذکرے سے ہاتھ جھاڑ کر چلتے ہیں ابتدائی صفحات کی جانب۔ پچھلے سال کی طرح اس بار بھی یہاں امجد رئیس کے نام کا طوطی بولتا رہا۔ کل 5 ایک سے بڑھ کر ایک ناولز دیے انہوں نے۔ تابکار مجرم، سفینۂ مرگ، آئینہ وفا، سیلون کا سورج اور عروسی عذاب کے نام سے ابتدائی صفحات پر ان کے نام کا ڈنکا بجتا رہا۔ اس سال زویا اعجاز نے بھی قفس شکن کی صورت یہاں ڈیرے ڈالے رکھے۔ موضوع کے حوالے سے یہ خاص تحریر کہلائی جا سکتی ہے۔ اکتوبر کے ابتدائی صفحات پر کاشف زبیر صاحب کے توشہ خاص چاہ گر نے یادوں کا ریلا سا بہا دیا۔ وقت جتنا بھی گزر جائے کاشف صاحب کی یاد سے دل معمور رہے گا۔ جولائی اور اگست میں ایچ اقبال اور ہمایوں بلگرامی نے اپنی موجودگی ان صفحات پہ باور کرائی۔ اس کے علاوہ فیورٹ لکھاری روبینہ رشید نے مئی میں رقابت در رقابت کی صورت ایک یادگار تحریر دی جو اس سال ابتدائی صفحات کی بہترین کہانیوں میں شمار کی جا سکتی ہے۔ سال کا آخری توشہ اسما قادری کی جانب سے تھا۔ روپ بہروپ پڑھ کر ان کے طویل ناول پڑھنے کی شدت سے خواہش ابھری۔ انگارے اس سال ذرا وقفے وقفے سے لیکن خوب دہکے۔ اب ذرا رنگ برنگے رنگوں کا احوال۔ اس بار اسما قادری اور روبینہ رشید کی جوڑی کے رنگ پورے سال چھائے رہے۔ دونوں نے کل 7 رنگ بکھیرے۔ اسما صاحبہ نے 4 اور روبی صاحبہ نے 3 مرتبہ رنگ پاشی کی۔ امجد جاوید صاحب نے بھی اس بار رنگوں میں اپنی موجودگی یقینی بنائے رکھی اور انجانا کھیل، پیادہ اور پتلی گر کی صورت 3 بھرے پُرے رنگ دیے۔ کبیر عباسی بھی جون، اگست اور نومبر میں پوری تندہی کے ساتھ رنگ پاشی کرتے رہے۔ سیماب، زمین خور اور حاصل لاحاصل تینوں رنگ ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ وبالِ عشق اور بلائے جان کی صورت 2 رنگ فاروق انجم صاحب نے بھی لکھے دونوں ہلکی پھلکی تحریریں ثابت ہوئیں۔ زویا اعجاز، سید شکیل کاظمی، منظر امام اور سرور اکرم نے ایک ایک رنگ لکھا اور کیا خوب لکھا۔ اس سال رنگوں میں نئے نام بھی نظر آئے۔ اعتزاز سلیم وصلی، جام منظم سلیم، یاسر اعوان، ذوالقرنین خان اور طلحہ تجابی نے بطور رائٹر پہلی مرتبہ جھلک دکھائی۔ مختصر تحریروں میں منظر امام، عمران قریشی اور اعتزاز سلیم وصلی کی طبع زاد تحریریں دلچسپ اور ایک سے بڑھ کر ایک رہیں۔ تراجم میں نگس فاطمہ اور جمال دتی ہلکی پھلکی تحریریں دیتے رہے۔ نئے سال کے لیے ادارہ جاسوسی اور آپ سب قارئین کے لیے تہ دل سے دعائیں اور نیک خواہشات۔" (اس قدر محنت کے لیے تہ دل سے شکر گزار ہیں)

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

عذرا نصیر، کراچی۔ مراد خان، میانوالی۔ محمد اقبال، کراچی۔ شہزاد احمد، پنڈی۔ صبا پرویز، حیدرآباد۔ ثمینہ جاوید، اسلام آباد۔

قلم کاروں کے لیے

انعامی سلسلہ

10,000 روپے
آپ کے بھی ہوسکتے ہیں

اگر آپ معاشرتی یا جرم و سزا کی مضبوط و مربوط کہانی سوچ اور لکھ سکتے/سکتی ہیں تو

سسپنس ڈائجسٹ اور جاسوسی ڈائجسٹ

کے صفحات حاضر ہیں۔ یہ مستقل قلم کاروں کی صف میں شامل ہونے کی ابتدا ہوسکتی ہے

- ○ کہانی طبع زاد ہونی چاہیے۔
- ○ پلاٹ اور واقعات کسی اور تحریر سے ماخوذ یا ترجمہ نہ ہوں۔
- ○ کہانی رسائل کے تیس سے چالیس صفحات پر مشتمل ہو۔ غیر ضروری یا ضمنی مواد شامل نہ ہو۔
- ○ انعام یافتہ کے علاوہ اس سلسلے میں موصول ہونے والی دوسری قابل اشاعت کہانیاں ادارے کی عمومی شرح سے معاوضے کی ادائیگی پر شائع کی جاسکیں گی۔
- ○ صرف اصل مسودہ یا ہارڈ کاپی قابل قبول ہوگی۔ فوٹو کاپی یا ای میل پر آنے والے مسودے انتخاب میں شامل نہیں ہوں گے۔
- ○ جس پرچے کے لیے کہانی ارسال کریں، اس کا نام ضرور درج کریں۔ اپنا نام، پتا اور رابطے کا نمبر مسودے کی ابتدا میں درج کریں۔

مسودے موصول ہونے کی آخری تاریخ 28 فروری 2019ء ہے

اپنے مسودے اس پتے پر ارسال کریں

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C، فیز II ایکسٹینشن، کورنگی روڈ، ڈیفنس، کراچی

UrduBooks.pk

لہروں کا فریب

زویا اعجاز

شوق جب تک اپنی حدوں میں رہے، کردار کی تعمیر کرتا ہے لیکن جب یہ جنون کی حدوں کو چھونے لگے تو اپنی اچھائی اور برائی سے قطعِ نظر کردار کشی شروع کردیتا ہے... فطری نشوونما اس شوق میں دب کر رہ جاتی ہے... بچپن اور لڑکپن جو بھولی بھالی اور معصوم سرگرمیوں میں پروان چڑھنا چاہیے، اس انہونی کی خوراک بن جاتا ہے... وقت سے پہلے کی آگہی عذاب کے مانند ہوتی ہے... فضائوں میں پھیلی ماورائی لہروں کا جال اس دور میں نئی نسل کو جکڑتا جارہا ہے۔ یہ ریڈیائی لہریں اور ان میں چھپے تصویری اور تحریری فتنے بعض صورتوں میں ہولناک رنگ دکھا رہے ہیں... ان رنگوں سے رنگی ایک ہوش رُبا کہانی... جو فکر و تشویش کے نئے در وا کرتی ہے۔

سیاست...... بغاوت...... عداوات اور عشق و محبت
کی دلفریبیوں میں ڈوبتی ابھرتی سنسنی خیز داستان

آسمان پر آخری تاریخوں کا چاند بادلوں کی اوٹ میں پوشیدہ تھا۔ ملک میں بارشیں خوب کھل کر برسی تھیں۔ جس سے حسبِ سابق و حسبِ دستور سڑکیں ندی نالوں کا منظر پیش کررہی تھیں۔ اہلِ علاقہ پانی اور لوڈشیڈنگ کے باعث گھروں میں ہی محصور تھے۔ سڑکوں پر ٹریفک بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ مضافاتی علاقہ میں تو یہ صورتِ حال اور بھی ابتری کا شکار تھی۔ جگہ جگہ 'مین ہول' نہایت خطرناک صورت اختیار کرچکے تھے جس کے باعث مکین گھر سے باہر نکلتے ہوئے خوفزدہ رہتے۔ اس سنسان ماحول میں ذیلی سڑک پر سیاہ رنگ کی گاڑی متوازن انداز میں پانی کے چھینٹے اڑاتی آگے بڑھ رہی تھی۔

"آج موسم بڑا بے ایمان ہے...... بڑا بے ایمان ہے...... آنے والا کوئی طوفان ہے...... کوئی طوفان ہے......" فرنٹ سیٹ پر بیٹھے تیس، بتیس سالہ ایک شخص نے مستی بھرے انداز میں بہ آوازِ بلند گنگنانا شروع کردیا۔ اس کی شخصیت بالکل عام سی تھی۔ گہرے سانولے رنگ پر مہاسوں کے پرانے اور سیاہ نشان، اندر دھنسی ہوئی سیاہ آنکھیں اور گھنی باہم جڑی بھوئیں

UrduBooks.pk

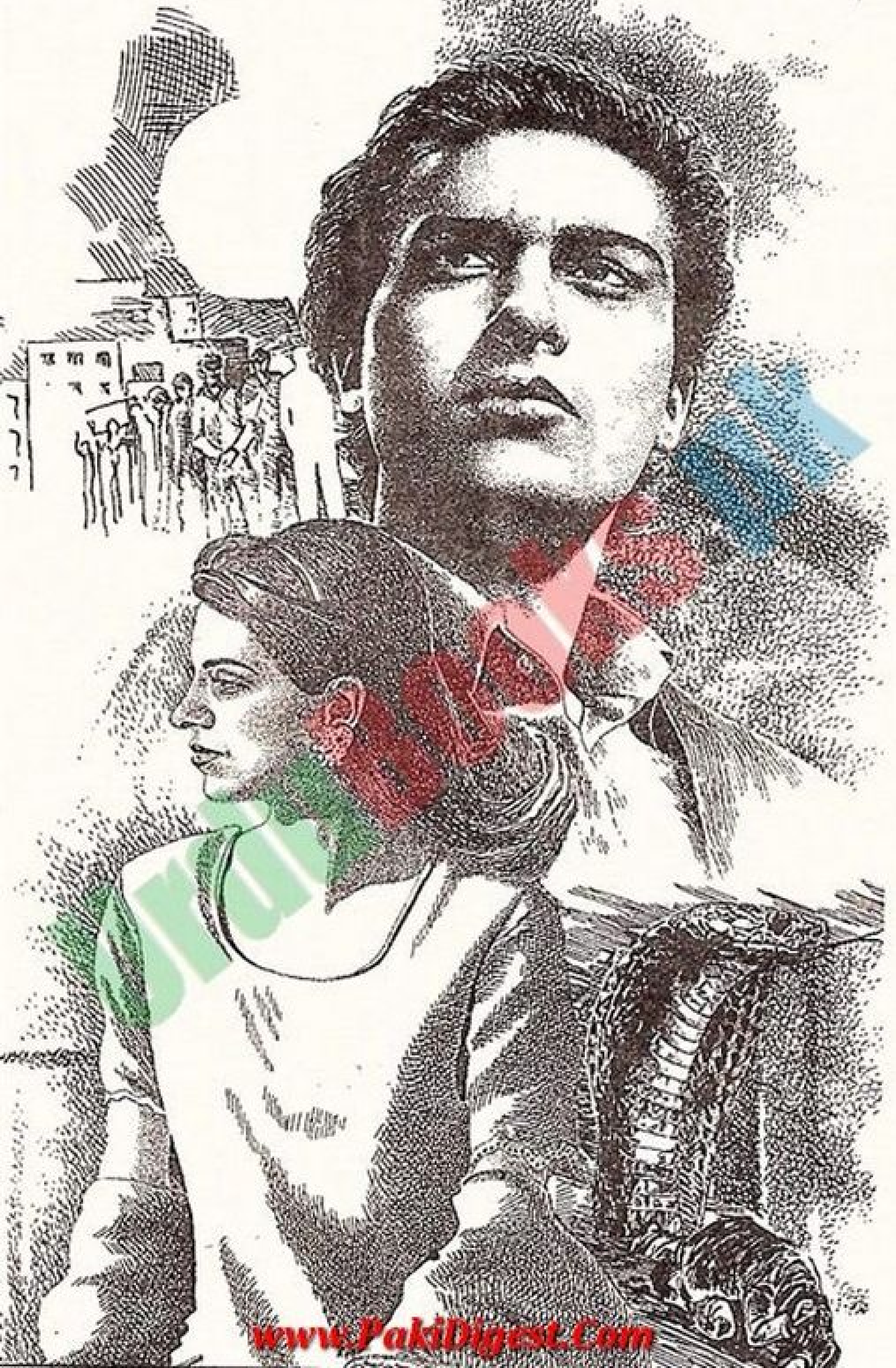

اس کی لاابالی طبیعت کی علامت تھیں۔ ڈھیلی ڈھالی سیاہ شرٹ اور کھلی پینٹ نے اسے خاصی مضحکہ خیز ہیئت دے رکھی تھی۔

”اے غریبوں کے محمد رفیع! اپنی یہ بے سُری تان بند کر دے۔“ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص نے تمسخر سے کہا۔ اس کا نام ماجد تھا اور وہ گزشتہ بیس منٹ سے بہت احتیاط سے گاڑی چلا رہا تھا۔

”بڑے ہی بور انسان ہیں آپ۔ ایسے موسم میں تو طبیعت خود بخود مچل جایا کرتی ہے۔“ امتیاز نامی اس شخص نے شکوہ کناں نگاہوں سے ماجد کو دیکھا۔

”ارے باس! کیوں روک رہے ہو بے چارے کو؟“ پچھلی سیٹ سے ایک شستہ آواز ابھری۔

”لو جی! بی مینڈکی کو بھی زکام ہو گیا۔“ ماجد نے تاسف سے سر ہلایا۔

”ایک تو آپ کی یہ مشکل اور گاڑھی اردو مجھے سمجھ نہیں آتی۔ میں اچھا خاصا ایک ہینڈسم لڑکا ہوں۔ مینڈکی کیسے ہو گیا؟ اور مجھے زکام بھی بالکل نہیں ہے۔“ فرحان الجھ گیا۔ اس کا ردِعمل بہت بے ساختہ تھا۔

”میرے برگر بچے! آتی ہے اردو زبان آتے آتے لیکن یہ تم جیسے کانونٹ زدہ کو کیسے سمجھ آسکتی ہے۔ تمھیں تو انگریزی زبان ’گھٹی‘ میں پلائی جاتی ہوگی۔“ ماجد نے اس کے حلیے پر لطیف طنز کیا۔ فرحان نے سیاہ چست جینز اور گہری بھوری ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ بالوں کی کٹنگ جدید انداز میں تھی جس میں دائیں جانب سے بال تقریبا صاف کر دیے گئے تھے۔ بائیں جانب ہلکے بھورے بال اچھے انداز میں جمائے گئے تھے۔ کان میں مصنوعی سونے کی بالی کے علاوہ بھوؤں کے دائیں سمت بھی ایک بالی موجود تھی۔ اس کی سرمئی آنکھوں میں بے چینی کی جھلک واضح طور پر محسوس کی جاسکتی تھی۔

”اچھا! مجھے چھوڑیں۔ اس بے چارے کو کیوں ٹوک رہے ہیں۔“ فرحان نے اس کا طنز نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

”یہ بے چارہ کب سے ہو گیا؟“ ماجد نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔ امتیاز اور فرحان کے برعکس اس کا حلیہ ’سفید پوش‘ تھا۔ بال قدرے لمبے تھے جن میں سفیدی کی جھلک نمایاں تھی۔ وہ بالوں میں کسی جیل کے بجائے خوشبودار تیل استعمال کرتا تھا۔ داڑھی کا خط بھی سلیقے سے بنا رہتا۔ اس کا مجموعی تاثر کسی دکاندار کا سا محسوس ہوتا تھا۔

”آپ کے اعصاب کی مضبوطی سے میں تو بہت متاثر ہوں باس!“ امتیاز نے ستائشی نظروں سے اس کے پُرسکون چہرے کو...... دیکھتے ہوئے کہا۔

”اے دھیان رکھیو! یہ خبر کسی اور تک نہ پہنچنے دینا!“ وہ آنکھ میچ کر بولا۔ تاہم دھیان اب بھی ڈرائیونگ کی طرف مرکوز تھا۔

”ایسا کیوں باس؟“ فرحان ایک بار پھر اُلجھا۔

”کچھ دن پہلے کرکٹ بورڈ اور ہاکی فیڈریشن والے میرے پاس چلے آئے تھے کہ ان کے لونڈوں کو ’اعصابی مضبوطی‘ ادھار دے دوں۔“ ماجد کے انداز پر وہ دونوں بے ساختہ ہنسنے لگے۔ وہ کھیلوں کے متعلق اس کی شوقین مزاجی سے بخوبی واقف تھے۔ یہ بھی جانتے تھے کہ کسی بھی شکست کی صورت میں وہ یوں ہی ہر بات پر طنز کے تیر چلانے لگتا ہے۔

”اتنا منہ پھاڑ کر ہنسنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کیا جانتا نہیں ہوں کہ ہر بار ایسے کسی بھی ’ٹرپ‘ پر جاتے ہوئے اپنے متو میں رفیع، لتا اور کشور کے ساتھ نصیبو لعل کی روحیں حلول کر جاتی ہیں۔ یہ ان کے سدابہار گانوں کا ستیاناس کرتے ہوئے اپنی بے چینی چھپانے کی کوشش کرتا ہے اور.. ایک ادھا پیگ بھی لگا آتا ہے۔“ وہ بیک ویو مرر سے فرحان کو دیکھتے ہوئے بولا جو اس کے بالکل درست اندازے پر نظریں چرانے لگا تھا۔ امتیاز بھی پہلو بدل کر رہ گیا۔

”اب روٹھی ہوئی زنانیوں کی طرح خاموش مت رہو۔ خود کو سدھارنے کی کوشش کرو۔ اس بزنس میں اعصابی مضبوطی ہی کامیابی کی پہلی شرط ہوتی ہے۔“ وہ انھیں لتاڑنے کے موڈ میں لوٹ آیا تھا۔

”ٹھیک ہے باس!“ فرحان نے سعادت مندی سے سر ہلایا۔

”تم نہیں سدھرو گے کبھی!“ وہ خشمگیں نگاہوں سے اسے گھورنے لگا۔ اسے اپنے ان ماتحت افراد سے ہمیشہ ہی یہ شکایت رہی تھی کہ وہ ’ولایتی اسٹائل‘ اپنانے کی کوشش میں ہلکان رہتے تھے۔ ماجد بھی اس میدان میں زیادہ ’تدیم‘ نہ تھا۔ اس نے ’نظریۂ ضرورت‘ کے تحت مختلف کرائم شوز دیکھ کر ہی جرائم کی ابجد سیکھی تھی لیکن اپنا ہر کام سلیقے سے کرنے کی کوشش میں ان دونوں کو بھی ہلکان رکھتا تھا۔

”بس...... سوری استاد!“ امتیاز نے بات ختم کرنی چاہی۔

گاڑی میں اب خاموشی چھا گئی تھی۔ اگلے پانچ منٹ میں وہ اپنے مطلوبہ مقام تک پہنچ چکے تھے۔ ایک بڑے سے آہنی گیٹ کے سامنے سے گزرتے ہوئے ماجد نے گہری نگاہوں سے صورتِ حال کا جائزہ لیا اور اطمینان سے سر ہلایا

اور احتیاط سے گاڑی پچھلی جانب لے آیا۔

اس نے چند روز قبل مکمل ریکی سے مطلوبہ معلومات حاصل کر لی تھیں لہٰذا اعتماد سوا تھا۔ وہ پُرسکون انداز میں نیچے اترا اور دیوار پھاند کر اندر کود گیا۔ طے شدہ منصوبے کے مطابق دو منٹ بعد فرحان اور امتیاز بھی وہیں چلے آئے۔ وہ اپنے اعصاب پر قابو پانے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے۔ جرم کی اس دنیا میں وہ اپنی مکمل رضامندی سے وارد ہوئے تھے۔ معاوضے کی بھی کوئی پریشانی نہ تھی۔ ماجد ہر ٹرپ کی کامیابی کے بعد انہیں معقول ادائیگی کرتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ اپنی خلش سے رہائی حاصل کر نہیں پا رہے تھے۔ ہر بار خود کو سمجھانے اور اعصاب پُرسکون کرنے کے باوجود عین لمحات میں دل و دماغ پر بوجھل سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔

آسمان پر بادل مزید گہرے ہونے لگے۔ چند لمحوں بعد بجلی چمکی اور بادلوں کا کلیجا شق ہو گیا۔ بارش کی بوندیں ہلکی بوچھاڑ کی صورت میں دھرتی کی پیاس بجھانے لگیں۔

”آج قدرت نے بھی ہمارا ساتھ دینے کی ٹھان لی ہے۔ یہ موسم ہمارے لیے ایک آئیڈیل ماحول بن جائے گا۔“ ماجد پُرجوش ہوا۔ فرحان اور امتیاز نے دزدیدہ نظروں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور اس کی ہدایات پر عمل کرنے لگے۔

نصف گھنٹے بعد وہ کامیابی سے سرشار سیٹی پر قدرے پرانے اور مقبول پنجابی گانے کی دھن بجاتا ہوا ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا۔ فرحان اور امتیاز خالی خالی نظروں سے کھڑکی سے باہر اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں سڑک پر کھڑے پانی کے اندر بارش کی بوندوں کا رقص دیکھنے لگے۔ انہیں اپنے وجود سے گھن آرہی تھی۔

☆☆☆

رات اپنا اختتامی سفر طے کر رہی تھی لیکن سیٹھ سلیم کل کے اس پُرتعیش کاٹیج میں اب بھی دن کا سماں تھا۔

وہ شہر کے معروف کاروباری افراد میں سے ایک تھا جس نے بہت مختصر عرصے میں کامیابیاں سمیٹی تھیں۔ اس نے ایک چھوٹے سے اسٹور سے کاروبار کا آغاز کیا تھا جو اب بڑھتے ہوئے تین ڈیپارٹمنٹل اسٹورز تک جا پہنچا تھا۔ اس کامیابی کے لیے سلیم نے ہر جائز و ناجائز ہتھکنڈا آزمایا تھا۔ اس کے کاروباری حریفوں کی ہر ممکن کوشش کے باوجود اسٹورز کی بڑھتی مقبولیت میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

سیٹھ سلیم اس وقت اپنے مخصوص کاٹیج میں موجود تھا۔ زندگی کی بھاگ دوڑ سے اکتا کر وہ یہاں وقت گزاری کے لیے چلا آتا تھا۔ شراب و شباب کے ساتھ جدید زندگی کی ہر آسائش سے وہ بہت پُرسکون لمحات گزار کر تازہ دم ہو جاتا۔ میکانکی زندگی سے چرائے ان لمحات میں وہ ہر قسم کی بے احتیاطی سے بھی گریز نہ کرتا۔

”تم گئیں نہیں اب تک؟“ باتھ روم سے باہر آکر اس نے صوفے میں سمٹی سکڑی لڑکی کو دیکھ کر کہا۔

”صاحب! آج بارش بہت ہے۔ تم بولو تو میں یہیں رک جاؤں۔ صبح ہوتے ہی چلی جاؤں گی۔“ سیما نامی وہ لڑکی لجاجت سے کہنے لگی۔

”تو کیا کاغذ کی بنی ہوئی ہے جو گیلی ہو کے تیری سیاہی اتر جائے گی۔“ سلیم نے نیم باز نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے منہ بنایا۔

”صاحب! پلیز صاحب! آپ نے تو کہا تھا کہ دو دن مجھے ساتھ ہی رکھو گے۔ اب اچانک ایسا کیا ہو گیا؟“ وہ اس کے قریب آکر ناز سے بولی۔

”پیچھے ہٹ کر بات کر مجھ سے......“ اس نے سیما کو نفرت سے جھٹکتے ہوئے اپنی بیزاری کی وجہ ظاہر کی۔ وہ احساسِ توہین سے شل ہو کر رہ گئی لیکن اس وقت کسی بھی منفی جذبے کا اظہار مزید نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔

”آپ کا یہ کاٹیج بھی تو اتنی دور ہے۔ اس وقت تو کوئی سواری بھی نہیں ملے گی۔ سردی کی یہ بارش مجھے بیمار کر دیا کرتی ہے۔“ سلیم نے اسے فٹ پاتھ سے گاڑی میں بٹھایا تھا۔ قریبی بس بھی ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد ہی مل سکتی تھی۔

”یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔ کرایہ لے اور چلتی بن یہاں سے۔“ اس نے غصے سے تپائی پر پڑا والٹ اٹھایا اور چند بڑی مالیت کے نوٹ نکال کر اس کی طرف پھینک دیے۔ سیما اس کی سرد مہری دیکھ کر مزید کچھ بھی کہنے کی ہمت نہ کر سکی۔ وہ نفرت بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بہ آواز بلند مغلظات بکنے لگی۔ سلیم نے آگے بڑھ کر اسے ایک زوردار طمانچہ رسید کیا اور بالوں سے گھسیٹتا ہوا دروازے سے باہر لے جا کر پھینک دیا۔

”اللہ کرے کتے کی موت مرے تو!“ سیما نے روتے ہوئے کہا۔ سلیم کا مزاج مکدر ہو چکا تھا۔ کمرے میں واپس آکر اس نے نیا جام بنایا اور پُرسکون انداز میں لیٹ کر تنہائی کو اپنے اندر جذب کرنے لگا۔ بارش کی رفتار یکدم ہی بڑھ گئی تھی۔ اس دلفریب موسیقی کی جلترنگ اعصاب کو دھیرے دھیرے پُرسکون کرنے لگی۔

’’آج ہر کام ہی الٹ پلٹ ہو رہا ہے۔ ماجد کی جانب سے بھی ابھی تک کوئی گڈ نیوز نہیں ملی۔‘‘ اس کے ذہن میں سوچ ابھری۔

’’اونہوں! وہ ہوشیار آدمی ہے۔ یقیناً اپنا کام مکمل کر چکا ہوگا۔‘‘ طاقتور احساس نے اسے بے چینی میں مبتلا ہونے سے محفوظ رکھا۔ وہ جانتا تھا کہ کام مکمل ہو جانے کے بعد ماجد اسے از خود اطلاع کر دے گا۔ شراب کے خمار اور بارش سے سردی کی شدت میں اضافے نے اس کے وجود پر کسلمندی طاری کر دی۔ چند لمحوں میں ہی وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکا تھا۔

☆☆☆

شب بھر برسنے والی بارش کا زور ٹوٹا تو فضا میں اذانِ فجر کی صدائیں گونج رہی تھیں۔

نفس کی نادیدہ زنجیروں میں جکڑے انسانوں کے وجود، موسم کی اس نئی کروٹ سے مزید پژمردہ اور سستی سے مغلوب ہو چکے تھے۔ بستر کی نرماہٹ اور بھرپور آرام و سکون کو ترک کر کے ان صداؤں پر لبیک کہنے کی ہمت کسی میں بھی نہ تھی۔ ’نائٹ پیکجز‘ سے مستفید ہونے والے افراد بھی نیند کی وادیوں میں کھو چکے تھے۔ اس رہائشی کالونی میں کولتار کی بھیگی سڑک پر نوجوان اور بااعتماد قدموں کی چاپ کے سوا کہیں کوئی آہٹ نہ تھی۔ اپنے ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں ڈالے لمبے ڈگ بھرتا یہ نوجوان قمر تھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی اور چہرے پر تھکاوٹ کے آثار تھے۔ وہ نماز کی ادائیگی کے لیے مسجد کی طرف گامزن تھا۔ باجماعت نماز کی ادائیگی میں وہ کم ہی کوتاہی کرتا تھا۔

مسجد میں داخل ہو کر اس نے سیاہ سوئیٹر کی آستینیں چڑھائیں اور ایک جانب بنے وضو خانے کی طرف بڑھ گیا۔ عام نمازیوں کے برعکس وہ اذان مکمل ہونے سے قبل ہی وہاں چلا آیا کرتا تھا۔ اسے تقدس بھرا یہ ماحول بہت سکون دیتا تھا۔ آج بھی نمازیوں کی تعداد نصف درجن سے زائد نہ تھی۔ امام صاحب نے حسبِ سابق دکھ اور تاسف سے ان سب پر طائرانہ نگاہ دوڑائی اور تکبیر کہتے ہوئے ہاتھ بلند کر دیے۔ پندرہ منٹ بعد نمازی گھروں کو روانہ ہو چکے تھے۔ خالی الذہنی کے عالم میں بوجھل اعصاب لیے قمر ایک ستون سے کمر ٹکا کر بیٹھ گیا۔ پشت سے سرایت ہونے والی ٹھنڈک اس کے لیے فرحت بخش تھی۔ وہ سکون اور ٹھہراؤ سے امام صاحب کی خوش الحان تلاوت سننے لگا۔ اس مشغلے میں ایک گھنٹا خاموشی سے بیت گیا۔ سورج کی ٹھٹھری ہوئی کرنیں کھڑکیوں کے شیشے عبور کرنے میں ناکام ہو رہی تھیں۔ امام صاحب تلاوت سے فراغت پا کر اس کے پاس چلے آئے۔ وہ اس کی کسلمندی محسوس کر چکے تھے۔

’’کیا بات ہے جوان؟ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟‘‘ انہوں نے محبت سے پوچھا۔

’’جی ہاں! سر میں درد ہے اسی لیے سستی سی طاری ہے۔‘‘ اس نے جلدی سے پاؤں سمیٹ کر کہا۔

’’اتنی سی عمر میں سر درد...... کیا کوئی پریشانی ہے؟‘‘ وہ تشویش زدہ ہو گئے۔ انہیں یہ نوجوان ہمیشہ ہی کسی گہری اُلجھن اور پریشانی میں گرفتار دکھائی دیتا تھا۔ اس کی کشادہ پیشانی اور باحیا آنکھیں کسی اچھے خاندانی پس منظر کی گواہی بھی دیتیں۔ جانے کیوں انہیں اس سے بے نام سی انسیت محسوس ہونے لگی تھی۔

’’جی نہیں! پریشانی تو خیر کوئی نہیں۔‘‘ وہ سنبھل کر بولا۔ امام صاحب نے آنکھیں موندیں اور زیرِ لب آیات کا ورد کرتے ہوئے اس پر پھونک مار دی۔ قمر ان کی پُرخلوص ادا پر مسکرائے بنا نہ رہ سکا۔

’’شکریہ مولانا صاحب!‘‘ اس نے عقیدت سے کہا۔

’’یہاں نئے معلوم ہوتے ہو!‘‘ انہوں نے سلسلۂ گفتگو کو طول دیا۔

’’جی ہاں! ابھی ایک ماہ پہلے ہی اس علاقے میں آیا ہوں۔‘‘

’’یہاں کس کے گھر رہ رہے ہو؟‘‘ ان کی انگلیاں تسبیح پر گردش کرنے لگیں۔

’’خالہ زاد بہن کے گھر۔ ان کے شوہر کا نام توقیر علی ہے۔‘‘ اس کے جواب پر مولانا صاحب کے چہرے پر تفکر کی ہلکی سی پرچھائیں جھلکی۔ قمر کے لیے یہ انوکھی بات نہ تھی۔ اسے علم تھا کہ توقیر کی روکھی طبیعت اور سخت مزاجی کے باعث اسے کالونی میں زیادہ پسند نہیں کیا جاتا۔

’’کسی نوکری کے سلسلے میں آئے ہو کیا؟‘‘ ان کے سوال پر قمر جز بز ہونے لگا۔ یہ استفسار اسے ہمیشہ ایک نئے سرے سے اذیت دیا کرتا تھا۔

’’میں چلتا ہوں جناب! دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔‘‘ وہ ادب سے کہتا ہوا اٹھا اور ڈھیلے قدموں سے بیرونی سمت روانہ ہو گیا۔

بہت شریف والدین کی اولاد معلوم ہوتا ہے۔ بے روزگاری سے خاصا اکتایا ہوا بھی محسوس ہو رہا ہے۔ پروردگار

اسے ہر مشکل سے محفوظ رکھے اور بہترین معاش عطا فرمائے۔ وہ اپنے ہاتھ میں موجود تسبیح پر آیات کا ورد کرتے اس کی پشت پر نظریں جمائے سوچنے لگے۔

ان کی نیک خواہشات اور تمناؤں سے بے نیاز قمر اپنی ہی دھن میں گیلی سڑک پر چلا آیا جہاں سرد ہوا مٹی کی خوشبو لیے اعصاب کو مدہوش کر رہی تھی۔ وہ چند لمحے وہیں کھڑا گہری سانسیں بھرتا رہا۔ اسے حیرت انگیز طور پر ذہنی دباؤ بھی کم ہوتا محسوس ہونے لگا۔ متوازن قدموں سے چلتا وہ گھر کے پاس آیا تو قدم آگے بڑھنے سے انکاری ہو گئے۔ اس کی نظریں سفید رنگ کے ایک دروازے پر مرکوز تھیں۔ اس مقام پر پہنچتے ہی قمر کے دل میں ایک عجیب سی ترنگ جاگ اٹھتی۔ دھڑکنیں یکدم ہی کوئی نئی لے پکڑ لیا کرتیں۔ وہ کچھ دیر تو بے اختیاری کے عالم میں اس گھر کے در و دیوار کو دیکھتا رہتا اور پھر کسی نہ کسی مزاحتی سوچ کے زیر اثر مچلتے جذبات پر قابو پاتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ اس وقت بھی یہی ہوا۔

وہ بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے آگے بڑھا اور جیب سے گھر کی چابی نکال کر آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اسے علم تھا کہ نسرین اور بچے کسی بھی تعطیل پر دس بجے سے پہلے بیدار نہیں ہوتے لیکن احتیاط کا دامن تھامے رکھنا بہر صورت لازم تھا۔ صحن عبور کر کے کمرے تک رسائی کا مرحلہ بخیریت مکمل ہوا اور وہ تھکاوٹ سے چور بدن لیے نیند کی وادیوں میں کھو گیا۔

☆☆☆

قمر کے گھر میں معمولاتِ زندگی کا آغاز ہو چکا تھا۔

توقیر علی کا یہ دو منزلہ گھر ایک مڈل کلاس کالونی میں واقع تھا۔ اہلِ علاقہ بامروت اور ملنسار تھے۔ اکثر گھروں کی چھتیں باہم متصل اور دلوں میں عزت و محبت تھی۔

”یہ ناشتا پکڑو بھئی! جلدی سے ڈائننگ ٹیبل پر لے آؤ۔ بہت بھوک لگی ہے۔“ توقیر نے گھر میں داخل ہوتے ہی اپنی مخصوص پاٹ دار آواز میں کہا۔

”اتنی دیر کیوں لگا دی آپ نے؟“ نسرین نے روایتی شکوہ کیا۔

”میرے ہیلی کاپٹر میں پیٹرول ختم ہو گیا تھا...... اس کی ٹینکی فل کروائی تو پنکھوں کی گراریاں خراب ہو گئیں۔“ اس نے حسبِ عادت طنز کیا۔ نسرین خجل ہو گئی۔ بارش کے بعد ناشتے کی دکانوں پر بڑھنے والے ہجوم کے متعلق وہ بھی باعلم تھی لیکن شوہر سے بات برائے بات کرنے کی خواہش میں وہ ہمیشہ یونہی کوفت اٹھایا کرتی تھی۔

توقیر اب مصروف سے انداز میں ہاتھ دھونے لگا تھا۔ نسرین سرعت سے حلوا پوری اور نان چنے پلیٹوں میں منتقل کرتے یکدم ساکت ہو گئی۔ چار پوریاں اور چار نان اس بات کا واضح اعلان تھے کہ وہ قمر کے لیے آج بھی ناشتا لانا بھول گیا ہے۔ ایسا پہلی بار تو نہیں ہوا تھا لیکن نسرین روزِ اول کی طرح دکھی ہونے لگی۔ اس نے خاموشی سے برتن میز پر رکھے اور شکوہ کناں نظروں سے توقیر کو دیکھنے لگی۔ ہر عورت کی طرح اسے بھی یہی ’خوش فہمی‘ لاحق تھی کہ شوہر ایسے ناز و انداز سے اپنی سوچ و عمل پر پشیمان ہو کر فوراً اپنی روش ترک کر دے گا۔

”نواب صاحب رات کتنے بجے گھر آیا تھا؟“ توقیر نے لقمہ چباتے ہوئے کہا۔

”بارہ ایک بجے تک آ گیا تھا۔“ وہ رکھائی سے بولی۔

”اس پردہ داری سے کوئی فائدہ نہیں نسرین بیگم!“ وہ استہزائیہ ہنسا۔ ”موصوف فجر تک پاشا کی بیٹھک میں کارڈز کھیلتے رہے ہیں۔“ اس نے زہریلے انداز میں انکشاف کیا۔ نسرین بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گئی۔

”توقیر! بس کر دیں پلیز۔“ اس نے لقمہ پلیٹ میں پٹخ دیا۔

”ٹھیک ہے! میں خاموش ہو جاتا ہوں۔ کل کو علم ہو گا کہ نواب صاحب نے شراب اور عورت بازی بھی شروع کر دی ہے۔ اپنی شکل کا... ’ایڈوانٹیج‘ تو اسے شروع سے ہی حاصل ہے۔“ اس کی پھنکار پر نسرین نے اذیت سے آنکھیں میچ لیں۔ قمر کے نقوش میں چاکلیٹی ہیرو وحید مراد کی شباہت تھی۔ آغازِ نوجوانی میں ہی اس نے بالوں کا انداز بھی ویسا ہی اختیار کر لیا تھا۔ بائیس سال کی عمر تک آتے وہ اسّی فیصد سے زائد وحید مراد ہی لگنے لگا تھا۔ اپنے چہرے اور نقوش کی وجہ سے اس نے زندگی میں کئی حادثات بھی برداشت کیے تھے۔ منفی زیادہ اور مثبت کم۔

”آپ اس بات کو کبھی نہیں چھوڑیں گے۔“ وہ غصے سے ناشتا چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ دونوں بچے سہمی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

”یہ نوٹنکی وہاں کرنا جو تم سے واقف نہ ہو۔“ توقیر نے ایک اور کچوکا لگایا۔ ”اپنے اس بھائی کے لیے ناشتا چھوڑنے کا آج کوئی اور بہانہ نہیں ملا تو یہی سہی۔“ توقیر نے ایک اور کچوکا لگایا۔

نسرین اپنے آنسو ضبط کرتی ہوئی باورچی خانے میں چلی آئی۔ قمر کے متعلق توقیر کا یہ رویہ ہرگز نیا نہیں تھا لیکن وہ

ہنوز اس بات کی عادی نہیں ہو سکی تھی۔ جذبات پر بمشکل قابو پاتے ہوئے وہ چائے بنانے لگی۔ توقیر ایک مشکل اور روایتی شوہر تھا۔ نسرین شادی کے پندرہ سال بعد بھی اس کی عادات سے سمجھوتا کرنا سیکھ نہ سکی تھی۔

☆☆☆

امتیاز اس مختصر فلیٹ کے تنگ زینے کے سامنے کھڑا خاصی جھنجلاہٹ کا شکار تھا۔

وہ گزشتہ پندرہ منٹ سے ناشتے کا سامان ہاتھ میں لیے دروازے پر دستک دے رہا تھا لیکن فرحان کی جانب سے جواب ندارد تھا۔ اس نے دائیں ہاتھ سے جیکٹ کی جیب میں رکھا سگریٹ نکالا اور ہونٹوں میں دبا کر لائٹر تلاش کرنے لگا۔ اس کے ہاتھوں میں بھی ہلکی سی لرزش محسوس کی جاسکتی تھی۔ اسی وقت دروازے کے عقب میں کچھ آہٹیں سنائی دیں اور بالآخر فرحان کا چہرہ نمودار ہوا۔

”کہاں مر گیا تھا سالے؟ میں کب سے یہاں کھڑا دستک دے رہا ہوں۔“ امتیاز نے لائٹر کی تلاش ترک کر کے اپنا ’قیمتی‘ سگریٹ دوبارہ جیب میں رکھ لیا۔

”م...... میں...... س...... سو...... رہا...... تھا یار!“ فرحان کی آواز میں شدید لڑکھڑاہٹ تھی۔ اس کے وجود سے شراب کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔

”تو نے پھر اپنی اوقات سے بڑھ کر پی لی ہے ناں؟“ امتیاز نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا اور اکلوتے کمرے کی طرف چلا آیا۔

”اگر...... میں...... نہ...... پیتا...... تو...... کل...... رات...... کیسے...... گزار...... پاتا؟“ وہ بمشکل بولا۔

”یہاں اور کون تھا تیرے ساتھ رات کو؟“ اس نے کمرے میں نظریں دوڑائیں۔

”روزی...... تھی......“ فرحان نے کہا۔

”تیری یہ حالت دیکھنے کے بعد لعنت بھیج کر چلی گئی ہو گی۔“ امتیاز کی بات پر وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ کچھ لمحے اسی سکوت کی نذر ہو گئے۔

”چل چھوڑ ان باتوں کو! آجا ناشتا کرتے ہیں۔“ اس نے ڈسپوزیبل پلیٹوں میں چنے نکالے اور کلچا ہاتھ میں ہی تھما دیا۔ فرحان نے بددلی سے ایک لقمہ لیا اور دھیرے دھیرے نگلنا شروع کر دیا۔ اگلے ہی لمحے وہ اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھے دہرا ہو گیا۔ ’اوغ‘ کی آواز سے اس کی ناک اور منہ سے بدبودار زرد سیال قے کی صورت میں بہتا چلا گیا۔

”ابے ڈنگر! یہ کیا کر دیا؟“ امتیاز ناگواری سے پیچھے ہٹا۔

ناشتا اور برتن بُری طرح غلاظت میں لتھڑ چکے تھے۔

”کیا ہو گیا ہے یار تجھے؟“ وہ بڑبڑا گیا۔

”میں بہت بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہوں متو! میری آنکھوں کے سامنے سے وہ سین جاتے ہی نہیں ہیں۔ سلیپنگ پلز کھائے بغیر ایک لمحے کے لیے بھی سو نہیں پاتا۔ کیا کروں میں؟ بول! آخر کیا کروں میں کہ سکون مل جائے۔“ فرحان کے جدید انداز میں تراشیدہ بال بُری طرح بکھر چکے تھے۔ امتیاز اس کی حالت دیکھ کر دہل سا گیا۔

”خود کو سنبھال یار! ایسا کیا ہو گیا ہے؟“

”اپنے پیدا کرنے والوں کی قسم کھا کر کہہ! کیا تو اس نئے کام میں آنے کے بعد سکون سے زندگی گزار رہا ہے؟“

”نہیں یار! لیکن اب کیا ہو سکتا ہے؟“ امتیاز نے نظریں چرائیں۔

”کیا ہم اس رستے سے واپس نہیں ہو سکتے؟ میں سچ کہتا ہوں یہ کام مجھ سے مزید نہیں ہو سکتا۔“ وہ گہری سانسیں لیتا ہانپنے لگا۔ اس کی حالت قابلِ رحم تھی۔

”میں آج کل میں ہی استاد سے بات کرتا ہوں۔ تو فکر نہ کر! وہ بندے تھوڑی کھاتا ہے۔ ہمیں یہ کام وارا نہیں کھاتا بس! ہم اپنی پچھلی زندگی میں ہی بہت خوش تھے۔“ امتیاز نے اسے بھرپور تسلی دی لیکن اپنے لہجے کے کھوکھلے پن کا اسے خود بھی اندازہ ہو رہا تھا۔

وہ جرائم کی دنیا میں نو وارد بالکل نہیں تھے تاہم حقیقت یہی تھی کہ ماجد کے ساتھ شراکت نے ان کے ہوش و حواس مختل کرنے شروع کر دیے تھے۔ امتیاز کا احساسِ جرم اس سلسلے میں فرحان کی نسبت اس لیے بھی زیادہ تھا کہ وہ اسی کی رضامندی اور دباؤ سے ماجد کے ساتھ کام کرنے پر راضی ہوا تھا۔

”مجھے ماجد سے بات کرنی ہی ہو گی۔ یہ کوئی زبردستی کا سودا تھوڑی ہے۔“ امتیاز نے فرحان کو فرش پر بچھے گدے پر منتقل کرتے ہوئے عزم کر لیا۔

☆☆☆

”کیا پکا رہی ہو آج؟“ قمر نے فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر منہ سے لگاتے ہوئے پوچھا۔ دسمبر کے اس یخ بستہ مہینے میں بھی اسے ٹھنڈے ٹھار پانی سے ہی تشفی ہوتی تھی۔

”اٹھ گئے تم؟“ نسرین نے شکوہ کیا۔

”نہیں بھئی! خواب میں تم سے ملنے چلا آیا ہوں۔“ وہ

اطمینان سے بولا۔

"میں کل رات اتنی دیر تک تمہارا انتظار کرتی رہی۔ کہاں رہ گئے تھے تم؟" اس نے ایک بار پھر شکوہ کناں انداز اختیار کیا۔ قمر کی آنکھوں میں یکدم شرارت کا ایک اور کوندا لپکا جو مسکراہٹ اور نرمی بن کر اس کے چہرے پر بکھر گیا۔

نثار شہر کے نواحی علاقے میں لیڈیز ٹیلر تھا۔ قمر ان کا اکلوتا بیٹا اور امیدوں کا محور تھا۔ والدین کی چند ماہ کے وقفے میں ہونے والی وفات کے بعد اپنی ذات کے ساتھ پیش آنے والے حادثے سے وہ ڈپریشن میں مبتلا ہو گیا تھا۔ ان دنوں نسرین بھی کسی قریبی سسرالی عزیز کی شادی میں شرکت کے لیے وہاں موجود تھی۔ محبت و خلوص سے اصرار کر کے وہ قمر کو اپنے گھر لے آئی۔ اس وقت سے وہ اسی کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔

"مستقبل کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟" نسرین نے اسے خیالات میں غلطاں دیکھ کر محتاط انداز میں سلسلہ کلام جوڑا۔

"ایک دو جگہ انٹرویو دیے تو ہیں۔ امید ہے کوئی اچھا سبب بن جائے گا۔" یہ بتاتے ہوئے قمر کے پردۂ تصور پر ایک سراپا لہرا گیا۔ ماریہ نامی اس لڑکی نے اسے یہاں آتے ہی متوجہ کر لیا تھا۔ قمر کو اسے سوچنا، دیکھنا اور سماجی روابط کی ویب سائٹس پر تلاش کر کے زندگی کے خفیہ گوشوں کی سن گن لینا اچھا لگتا تھا۔ اس کی ان کیفیات کو 'محبت' کا نام تو ہرگز نہیں دیا جا سکتا تھا۔ وہ نوجوانوں کی اس مخصوص نفسیات سے مغلوب تھا جس کے تحت زندگی گزارنے کا سہل طریقہ کسی سے جذباتی وابستگی اور خواب بننا ہوتا ہے۔ قمر کی سوچوں کو بھی ماریہ کی صورت میں ایسی ہی ایک مصروفیت اور محور مل گیا تھا۔

"اللہ جلد تم کو کامیاب کرے میرے بھائی!" نسرین اس کی کھوئی کھوئی سی کیفیت کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "ابھی تو ناشتے کے بارے میں بتاؤ جلدی۔"

"ارے نسرین! تم نے ابھی تک اپنے بھائی کو صبح کی چھوڑی کاوڑی اور ٹھنڈے نان چنے اوون میں گرم کر کے نہیں کھلائے۔" توقیر ان کی ہنسی کی آوازیں سن کر وہیں چلا آیا تھا۔ اس کی بات سن کر وہ احساسِ شرمندگی سے زمین میں گڑ گئی۔ قمر کا چہرہ بھی طیش سے سرخ ہو گیا۔

"نسرین! میں جتنے دن بھی یہاں رہوں گا، تمہیں کھانے پینے اور کمرے میں بجلی کے استعمال کے پیسے دے دیا کروں گا۔"

"ہاں! وہی پیسے ناں جو کل رات میرے والٹ سے اُڑائے ہیں تم نے۔" توقیر پھنکارا اور پھر بیوی کی طرف سرد نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"جب سے یہ اس گھر میں آیا ہے، چوری چکاری کے واقعات بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ پہلے میری گھڑی، پھر موبائل اور اب تیسری بار پیسے غائب ہوئے ہیں۔ کون ذمے دار ہے آخر اس کا؟"

"توقیر! اب آپ زیادتی کر رہے ہیں۔ قمر ایسی کوئی حرکت کیوں کرے گا بھلا؟" وہ دکھ سے بولی۔

"بے روزگاری تو کسی سے کچھ بھی کروا سکتی ہے۔" وہ زہرخند ہوا۔

"معاف کیجیے گا توقیر صاحب!" قمر نے تیزی سے کہا۔ "میں بے روزگار ضرور ہوں، بے غیرت نہیں۔ رہی نوکری کی بات! تو وہ بھی جلد مل جائے گی۔"

"اوہ آئی سی! کہیں یہ بھی ویسی ہی نوکری تو نہیں جس کی وجہ سے پچھلی بار تمہیں بہت 'عزت افزائی' دی گئی تھی۔" اس نے ایک اور تازیانہ لگایا۔ قمر کی برداشت کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ ضبط کرتے ہوئے اٹھا اور تیز تیز قدموں سے چلتا گھر سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

دوپہر کی پژمردہ دھوپ کسی ضدی بچے کی طرح شام کا آنچل اوڑھ لینے کے لیے لپک رہی تھی۔

کالونی میں اس وقت خاصی چہل پہل تھی۔ دس سے چودہ سالہ بچے گراؤنڈ میں کرکٹ کھیلنے میں مصروف تھے۔ آسمان پر سرمئی بادلوں کی اوٹ میں ڈھلتے سورج کی سرخی کا بہت دلفریب منظر تھا۔ مختلف گھروں کی چھتوں پر رنگین لہراتے آنچل اس منظر کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہے تھے۔ سیلفیز کا بازار بھی خوب گرم تھا۔ قمر گراؤنڈ میں موجود سنگی بینچ پر نیم دراز تھا۔ سرد ہوا کے جھونکے اس کے وجود کو سکون بخش رہے تھے۔ توقیر کے زہریلے الفاظ کی بازگشت اس کا پیچھا چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھی۔ اس نے نہایت کم ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے قمر کی زندگی کے کمزور پہلوؤں کو نشانہ بنایا تھا۔

مشہور زمانہ اور محبوب ترین اداکار سے مشابہت کے باعث قمر ہمیشہ ہی لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا رہا تھا۔ اصولی طور پر تو اسے توجہ اور اہمیت سے بہت لطف اندوز ہونا چاہیے تھا لیکن صورتِ حال اس کے بالکل برعکس تھی۔ وہ اسے اپنی ذاتی شخصیت کی نفی سمجھتے ہوئے بیزاری کا شکار ہو جاتا۔

والدین کی وفات کے بعد اس کے اچھے کردار کے پیشِ نظر مکان مالک نے گھر میں رہنے کی اجازت دے دی

تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب اس کا سامان سمٹ کر بیرونی بیٹھک تک محدود ہو گیا۔ نثار کی تمام تر جمع پونجی دونوں کے علاج معالجے میں خرچ ہو چکی تھی۔ ان دنوں وہ 'ہوم ٹیوشنز' دے کر اپنے اخراجات پورے کر رہا تھا۔ کھانا پکانے کے ضمن میں بھی اس نے مکان مالک سے معقول رقم طے کر لی تھی جس کی ادائیگی سے تین وقت کا کھانا کمرے میں ہی پہنچا دیا جاتا۔ اسے امید تھی کہ اچھی نوکری کے حصول تک یہ تنگی کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جائے گی۔

قمر کے تمام تر خواب اس وقت چکنا چور ہوئے جب ملک عابد کے بیٹے کو پڑھانے کی غرض سے اس کے گھر میں آمدورفت شروع ہوئی۔ عابد مشہور کاروباری شخص تھا۔ اسے اکثر بیرونِ ملک کے دورے بھی درپیش رہتے۔ اس کی غیر موجودگی میں اس کی پینتالیس سالہ بیوی نے نفس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے۔ قمر کی محبوب ہیرو سے مشابہت، شوخ طبیعت اور پُراعتماد انداز اسے عجیب دیوانگی میں مبتلا کرنے لگی۔ وہ کسی بھی قیمت پر اسے تسخیر کرنا چاہتی تھی۔ قمر کی جانب سے اس غلیظ کھیل میں عدم شرکت کے واضح اعلان نے اسے چوٹ کھائی ہوئی ناگن بنا دیا۔ اس نے مکاری کا اعلیٰ ثبوت دیتے ہوئے سازش تیار کی اور پہلے مرحلے میں بیٹے کو کسی رشتے دار کے گھر بھیجا۔

''میں آپ سے پہلے بھی گزارش کر چکا ہوں کہ اگر نوی گھر پر نہ ہو تو انفارم کر دیا کریں۔ آنے جانے میں میرا بہت وقت ضائع ہوتا ہے۔'' پندرہ منٹ انتظار کے بعد قمر اکتا کر بولا۔

''وہ باہر کھیلنے کے لیے گیا تھا۔ کسی دوست کے ساتھ اِدھر اُدھر نکل گیا ہوگا۔'' شبنم نے اطمینان سے کہا۔

''میں چلتا ہوں پھر! مجھے اور بھی بہت کام ہیں۔'' وہ جھنجلا کر اٹھا۔ شبنم نے پُرسکون انداز میں ہاتھ آگے بڑھایا اور اس کی گردن، چہرے کو بری طرح نوچ لیا۔

''یہ کیا کر رہی ہو؟'' وہ چلّا اٹھا۔

''دیکھتے رہو میری جان! ابھی تو پارٹی شروع ہوئی ہے۔'' سلگتے انداز میں کہتے اس نے اپنی قمیص پھاڑ ڈالی۔ قمر بھونچکا رہ گیا تھا۔ وہ اس کی چال سمجھ گیا تھا لیکن شبنم اس کے تصور سے زیادہ پھرتیلی ثابت ہوئی۔ قمر کو کسی بھی ردِعمل کا موقع دیے بغیر وہ واویلا مچاتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اس کے بعد پیش آنے والے واقعات ہولناک تھے۔ اسے علاقے کے جذباتی افراد کی جانب سے زدوکوب کرنے کے بعد بیٹھک سے دربدر کر دیا گیا۔ وہ وقت موت سے بھی بدتر تھا۔ برسوں سے بنائی عزت ایک نفس پرست عورت کے انتقام کی بھینٹ چڑھ گئی۔ وہ زندگی کی چاہت سے محروم ہو کر خودکشی ہی کر بیٹھتا۔ انہی دنوں نسرین وہاں کسی شادی میں شرکت کے لیے موجود تھی۔ خالہ زاد بھائی کی یہ حالت اس سے کیونکر برداشت ہو پاتی؟ وہ نہایت مان اور خلوص سے قمر کو اپنے گھر لے آئی جہاں توقیر کا رویّہ ایک نئے عذاب کی صورت میں اس کا منتظر تھا۔

☆☆☆

''انکل! بال پاس کر دیں پلیز!'' ایک معصوم سی آواز نے اسے خیالات سے چونکایا۔

''بیٹا! بال سے کہو محنت کیا کرے۔ خود ہی فیل نہیں ہو گی۔'' وہ مسکرایا۔ گیارہ سالہ بچہ بھی اس کی بات پر کھلکھلا کر ہنس دیا۔

''میرے ساتھ کھیلو گے؟'' قمر نے تجویز دی۔ وہ اپنی ذہنی رو کسی بھی طرح تبدیل کرنا چاہتا تھا۔

''شیور انکل! مگر خیال رکھیے گا۔ یہ بال براؤن گیٹ کے آس پاس بھی نہ جائے۔'' بچے نے گراؤنڈ کے بالکل سامنے اشارہ کیا۔ ''وہاں ایک انکل بھوت ناتھ رہتے ہیں۔ دروازے پر ہونے والے ہلکے سے شور پر بھی غصے سے چیخنے لگتے ہیں۔'' قمر دلچسپی سے اس دروازے کی جانب دیکھنے لگا جہاں چھوٹی سی نیم پلیٹ پر 'ماجد ریاض' کا نام کندہ تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور کھیل میں مگن ہو گیا۔ نصف گھنٹے کی اس بھاگ دوڑ میں وہ خوب محظوظ ہوا۔ توقیر سے ہونے والی جھڑپ کے نتیجے میں وہ گھر جانے سے گریزاں تھا اور موبائل گھر بھول آنے کی بدولت وہ کسی دوست سے رابطہ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ شام کے سائے رات کی تاریکی میں ڈھلے تو اس کے دیگر ساتھی بھی وہیں چلے آئے۔ ان سب کے مزاج پر مایوسی طاری تھی۔

''کیا ہو گیا بھئی؟ چہرے کیوں لٹکا رکھے ہیں؟ ایسا لگ رہا ہے گرلز کالج کے باہر کسی لڑکی کے بھائی سے دھلائی کروا کے آئے ہو۔'' قمر نے چٹکی بھری۔

''کچھ نہیں یار! پاکستان کی بیٹنگ دیکھ کر آئے ہیں۔ بہت گندہ کھیلی ہے ٹیم۔ دل ہی بُرا کر دیا ہے۔'' جنید نے غصے سے ایک پتھر کو ٹھوکر سے اُڑایا۔

''تو یہ کون سی نئی بات ہے؟'' اس نے بے نیازی سے کہا۔ ''نئی بات تو تب ہوتی ہے جب ہماری ٹیم اچھا کھیل کر جیت جائے۔ اگر وہ درمیان میں ایسی کارکردگی نہ دکھائے تو 'پرائی' محسوس ہوتی ہے۔''

"تجھے تو کسی بات سے فرق نہیں پڑتا یار!" غیب چڑ کر بولا۔

"ہاں! یہ قمر میری سمجھ سے بھی باہر ہے ویسے۔ خود اتنی اچھی کرکٹ کھیلتا ہے لیکن میچ نہیں دیکھتا۔ انڈیا پاکستان کے میچ سے کوئی ایسا بے نیاز کیسے رہ سکتا ہے؟" کامل نے کہا۔

"کامی بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ انڈیا پاکستان کے میچ میں تو وہ بندہ بھی دلچسپی لیے بغیر نہیں رہ سکتا جسے کرکٹ کا کوئی شوق ہی نہ ہو۔" قاسم نے تائید کی۔ وہ خاصی مشکوک نظروں سے اسے دیکھنے لگے تھے۔

"مجھ سے زیادہ کریزی کون تھا بھلا؟" قمر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں تو ایسے کسی بھی میچ کے لیے باقاعدہ منتیں مانگتا تھا۔ نفلی روزے رکھتا تھا۔ پھر چند سال پہلے ورلڈ کپ میں ایسے بھیانک طریقے سے شکست ہوئی کہ میرا دل ہی ٹوٹ گیا۔ میں نے اپنے جنون کو طلاق دے دی۔ اس کے بعد راوی ہی نہیں...... ستلج، بیاس، چناب، سندھ اور جہلم بھی میری زندگی میں چین ہی چین لکھتے ہیں۔"

"واہ بھئی! کاش، ہم بھی تجھ جیسی قوتِ ارادی کے مالک بن جائیں۔" مائیکل نے آہ بھری۔ وہ کرکٹ کے معاملے میں بے حد جذباتی تھا۔ قمر نے بہت کم وقت میں اس گروپ میں اپنی جگہ بنائی تھی۔ غیب، مائیکل اور جنید یونیورسٹی میں فائنل ایئر کے طالب علم تھے۔ سمسٹر بریک کی وجہ سے وہ ان دنوں فراغت کا شکار تھے۔ قاسم اور کامل البتہ مقامی فیکٹری میں انتظامی عہدوں پر فائز تھے۔ وہ صرف ہفتہ اور اتوار کو ہی ان کے ساتھ شامل ہوا کرتے تھے۔ یہ گفتگو کچھ دیر یونہی چلتی رہی...... کرکٹ کھیلنے والے بچے اپنے گھروں کو روانہ ہو چکے تھے۔ چہل قدمی کے لیے آئے اِکّا دُکّا افراد کے سوا اب وہاں کوئی بھی موجود نہ تھا۔ وہ سب دوست مل کر باتیں کرتے رہے۔ قمر کی بیزاری سب نے محسوس کر لی تھی۔

"کیا بات ہے قمر؟ آج بڑے بدلے بدلے سے سرکار نظر آتے ہیں۔ کوئی مسئلہ ہے تو ہمارے ساتھ شیئر کر لے۔" کامل نے خلوص سے کہا۔

"ارے مسئلہ کیا ہوتا ہے؟ کبھی کبھی بیٹسمین 'آؤٹ آف فارم' بھی تو ہوتا ہے۔" اس نے دانستہ طور پر ہلکے پھلکے انداز میں جواب دیا۔

"میرے رشکِ قمر! مانا تیری شکل وصورت چاکلیٹی ہیرو جیسی ہے لیکن اداکاری تیرے بس کا روگ نہیں ہے۔ اس کوشش میں تو سپر پاور کا حماقت مآب وزیراعظم لگنے لگتا ہے۔" جنید مسکرایا۔

"ہمیں تمہاری ذاتیات میں دخل اندازی کا حق تو نہیں لیکن اگر تم توقیر کی وجہ سے کسی ذہنی الجھن میں ہو تو اسے اتنا سنجیدہ نہ لو۔" مائیکل نے اپنی شرارتوں پر بند باندھتے ہوئے کہا۔ حقیقت یہی تھی کہ کالونی کے اکثر لوگ توقیر کی روکھی طبیعت اور کرخت مزاجی کی بدولت اسے ناپسند کرتے تھے۔

"اس نے کیا کہنا ہے مجھے؟ میں خود وہاں اپنی ذات کو ایک بوجھ محسوس کرتا ہوں۔" قمر نے صاف گوئی سے کہا۔

"تمہارے انٹرویوز کا کیا بنا؟" غیب کو یاد آیا۔

"فی الحال تو ویٹنگ لسٹ میں موجود ہوں۔ خدا جانے کب کال آئے گی؟ آئے گی بھی یا نہیں۔"

"اللہ بہتر کرے گا۔" قاسم نے دلاسا دیا۔

"اگر تم لوگوں کے کسی واقف کار کو دکان پر سیلز مین کی ضرورت ہو تو مجھے ریفر کر دینا۔" وہ بلا تامل بولا۔ توقیر کے زہریلے الفاظ کے بعد وہ ایک لمحہ بھی بلا ادائیگی وہاں قیام نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"سیلز مین تو نہیں...... لیکن ابھی میرے ذہن میں ایک اور آئیڈیا کلک ہوا ہے۔" جنید نے کہا۔ "آج دوپہر مجھے فیاض ملا تھا۔ اس نے بتایا کہ الیکشن سے پہلے سیاسی پارٹیاں ہر علاقے میں اپنے آفس کھول رہی ہیں۔"

"تو اس میں کون سی نئی بات ہے جونی؟ الیکشن سر پر ہوں تو ہر پارٹی ایسے درجنوں آفس بنا لیا کرتی ہیں۔" مائیکل نے قطع کلامی کی۔

"نئی بات یہ ہے مائیکی کہ اس بار یہ سیٹ اَپ نئے انداز میں نظر آئے گا۔ مختلف بینرز، کرسیاں اور دوسرے لوازمات دے کر ہمیں اپنی پارٹی کے ساتھ 'انگیج' کریں گے۔"

"ہمیں کیا کرنا ہوگا اُن کے لیے؟" قمر نے دریافت کیا۔

"اپنے علاقے کے ووٹرز کو ان کے حق میں قائل کرنے کے ساتھ چھوٹے موٹے مسائل بھی حل کرنے ہوں گے۔" جنید نے رسان سے بتایا۔

"اور بدلے میں ملے گا کیا؟" قمر نے ابرو اچکائے۔

"روزانہ تین سے پانچ ہزار کا پیکج مل سکتا ہے۔ ہم برابر تقسیم کر لیا کریں گے۔ اس کارکردگی کی بنیاد پر سیاسی واقفیت بڑھنے سے مستقبل میں جاب کا مسئلہ بھی حل ہو سکتا ہے۔"

"ناٹ آ بیڈ آئیڈیا۔" غیب نے دلچسپی سے کہا۔ جنید اور وہ بحیثیت طالب علم اپنے اخراجات کسی حد تک خود

برداشت کرتے تھے۔ ایسے میں معقول آمدنی کا وسیلہ بننے کسے بُرا لگ سکتا تھا۔ اگلے نصف گھنٹے میں وہ بھی مائیکل کے گھر کے باہر اپنا دفتر بنانے کے لیے رضامند ہو چکے تھے۔ مائیکل کے والدین بڑی بیٹی سے ملاقات کے لیے دوسرے شہر میں تھے۔ ان کی واپسی کے امکانات الیکشن سے پہلے ممکن نہیں تھے۔

"تو پھر ڈن ہوا دوستو! میں فیاض کو تم سب کے نام اوکے کر دیتا ہوں۔ اپنی بہترین تصویریں مجھے واٹس ایپ کر دینا۔ ان کے پرنٹس 'فلیکس' پر لگوا کے بڑی شان سے اپنی پارٹی کو سپورٹ کریں گے۔" جنید نے حتمی اعلان کیا۔ کچھ دیر مزید گپ شپ کے بعد وہ مبینہ بھارتی بیٹنگ کے متعلق اندازے لگاتے گھروں کی جانب روانہ ہو گئے۔ قمر ایک بار پھر سابقہ انداز میں اسی بینچ پر نیم دراز ہو گیا۔ اس کی افسردگی، طے شدہ منصوبہ اور موجودہ حالات کو مخالف سمت میں رکھے بینچ پر بیٹھے ماجد نے معنی خیز اور پسندیدہ نظروں سے دیکھا اور خاموشی سے تاریکی کا حصہ بن کر بھورے گیٹ کی طرف چل دیا۔

☆☆☆

وسط دسمبر کی وہ رات سرد، خاموش اور اداس تھی۔

موسم کے تیور دیکھتے ہوئے کالونی میں بھی چہل پہل کم ہو چکی تھی۔ ماجد اپنی گہری نیلی رضائی میں لپٹا کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ اس کا دھیان اب بھی قمر کی جانب مرکوز تھا۔ ماجد کی تجربہ کار نگاہیں اس لڑکے کے وجود میں پوشیدہ صلاحیتیں بھانپ گئی تھیں۔

"لونڈا علاقے میں نیا ہے اور جذبات کے ہاتھوں فوراً مغلوب بھی ہو جاتا ہے۔" اس نے ذہنی طور پر قمر کی خوبیوں کی فہرست بنانی شروع کی۔ "خوددار اور غیرت مند ہے لیکن کسی ضرورت کے ہاتھوں مجبوری نے اچھے خاصے دباؤ میں بھی مبتلا کر رکھا ہے۔ اسے ریزرو لسٹ میں رکھا جا سکتا ہے۔"

ماجد نے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے بالآخر حتمی فیصلہ کر لیا کہ وہ غیر محسوس طریقے سے قمر پر نگاہ برقرار رکھے گا۔ اس کا وجدان کہتا تھا کہ امتیاز اور فرحان جلد یا بدیر اس کے لیے دردِ سر بن جائیں گے۔ ایسی صورت میں کسی جی دار بندے کا ہاتھ میں ہونا بہت ضروری تھا۔ ماجد نے مزید ممکنہ پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے الیکشنز کے دنوں میں ذہنی طور پر فعال رہنے کا ارادہ بھی کر لیا۔ اسے یقین تھا کہ اس دوران قمر کا کردار اور جنگجوانہ صلاحیتیں مزید کھل کر سامنے آئیں گی۔

ماجد کچھ عرصہ قبل ہی جرم کی اس راہ سے وابستہ ہوا تھا۔ بلحاظ پیشہ وہ ایک الیکٹریشن تھا لیکن آج کل ڈرائیوری کی نوکری سرانجام دے رہا تھا۔ اس کی شادی کو تین سال ہو چکے تھے۔ سکینہ اس کی دوسری بیوی تھی۔ پہلی بیوی بھی اولاد کا سکھ نہ دے پائی تھی۔ سکینہ کی نرم مزاجی نے ہی اسے اولاد کے لیے باہمی چیک اَپ کروانے کے لیے تیار کیا تھا۔ رپورٹس میں دونوں جانب ہی سے کچھ مسائل سامنے آئے۔ علاج قدرے مہنگا تھا اور ماجد اس میں کوئی بھی کسر اٹھا نہ رکھنا چاہتا تھا۔ شومئی قسمت انہی دنوں اس کی 'ذہنی ہم آہنگی' سیٹھ سلیم سے ہو گئی۔ ان کے کچھ مقاصد مشترک تھے لہٰذا باہمی رضامندی سے بہترین لائحہ عمل تیار کر کے عملی میدان میں کود پڑے۔ اب تک وہ تین 'ٹرپ' بھگتا چکے تھے اور ہر دفعہ کامیابی ہی ان کا مقدر رہی۔

☆☆☆

اگلی صبح مزید نکھری ہوئی اور روشن تھی۔

ہلکی نرم دھوپ جسم کو تراوٹ بخش رہی تھی۔ قمر رات گئے اپنے شل ہوتے وجود کے ساتھ گھر لوٹا تھا۔ دسمبر اس کے لیے ہمیشہ ستم گر ہی ثابت ہوا کرتا تھا۔ اس کی فضاؤں میں جانے ایسی کیا بات تھی کہ وہ ہمہ وقت ایک اداسی محسوس کیا کرتا۔ عمر بھر کی تلخیاں، محرومیاں اور خلش ذہن کے مختلف کونے کھدروں سے نکل کر اس کے قدموں سے لپٹنے لگتیں۔

گزشتہ رات بھی اس کے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ فجر کی نماز پڑھ کر گھر لوٹا تھا اور اب دو گھنٹے بعد ہی نسرین کا 'لاؤڈ اسپیکر' بجنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ جھنجلاتی ہوئی بچوں کو اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی جو بستر سے نکلنے کے لیے تیار نہ تھے۔

"عجیب تماشا ہے ان کا! چھٹی والے دن بنا کہے صبح صبح اٹھ کر پورے گھر میں اودھم مچائے رکھتے ہیں لیکن اسکول جانا ہو تو آنکھوں میں ایلفی لگ جاتی ہے۔ نیند ہی نہیں کھلتی۔" وہ پانی کا جگ تھام کر ان کے سرہانے جا کھڑی ہوئی۔ "اٹھ جاؤ! ورنہ یہ پورا جگ تم دونوں پر ڈال دوں گی۔"

"میرے پیٹ میں درد ہے ماما! میں کیسے اسکول جاؤں گا؟" دس سالہ شاہ میر نے رونی صورت بنائی۔

"جھوٹ بول رہے ہو تم!" نسرین مشکوک تھی۔

"نہیں ماما! پرامس...... آئی سوئیر...... میرے پیٹ میں واقعی بہت درد ہے۔" اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ نسرین کا دل پسیج گیا۔

"تم نے پھر کچھ الٹا سیدھا تو نہیں کھا لیا۔ کتنی بار منع کیا ہے کہ جنک فوڈ نہ کھایا کرو۔" وہ حسبِ سابق بہ آواز بلند اسے ڈانٹنے لگی۔ کمرے میں کانوں پر تکیہ رکھے قمر کے لیے

سونے کی ہر کوشش ناکام ہو چکی تھی۔ وہ بیزاری سے اٹھا اور چپل گھسیٹتا بچوں کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

”ارے! تم اتنی جلدی اٹھ گئے قمر؟“ وہ اسے دیکھ کر چونکی۔

”تمہارا اسپیکر کسی کو سونے دے تب ناں! مجھے تو لگتا ہے اس کالونی کی سبھی خواتین کو بیدار ہونے کے لیے کسی الارم کی ضرورت ہی نہیں پڑتی ہوگی۔ تمہاری ایک آواز ہی سے وہ اٹھ جاتی ہوں گی۔“ قمر کے جلے کٹے انداز پر وہ پریشانی کے باوجود بے ساختہ مسکرا اٹھی۔

”شہروز! آپ دین میں اس کے کسی کلاس فیلو سے کہہ دینا کہ شاہ میر کی لیو لکھوا دے۔ آج میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گی۔“ وہ تشویش سے بڑے بیٹے کو کہتی ہوئی ناشتے کا بندوبست کرنے چل دی۔

”اسے مسئلہ کیا ہے آخر؟ ہر دوسرے دن پیٹ میں درد، سر درد اور بخار چڑھوایا ہوتا ہے اس نے۔ اتنی سی عمر میں ہی کون سے روگ لگ گئے ہیں اس چوزے کو؟“ وہ شاہ میر کو ٹٹولتی نظروں سے دیکھنے لگا۔ نسرین اس کا ناشتا کمرے میں ہی لے آئی تھی۔

”خدا جانے کس کی نظر لگ گئی ہے میرے بچے کو۔ پہلے تو اتنا ایکٹو ہوتا تھا۔ خوشی خوشی اسکول جاتا تھا۔ فائنل ایگزامز میں اس نے فرسٹ پوزیشن بھی لی تھی۔“

”تو پھر یکدم ’ایئر موڈ‘ پر لگنے کی وجہ؟“ قمر حیران ہوا۔

”ضرور کسی رشتے دار نے ہی کچھ کروایا ہے۔ تو قیر کے بہن بھائیوں کی اولاد اتنے مہنگے اسکولوں میں نہیں پڑھتی۔ پڑھائی میں بھی کبھی خاص رزلٹ نہیں دیا۔ انہی میں سے کسی کی نظر بد نے جکڑ لیا ہے اسے۔ ذرا دیکھو تو سہی! کتنا سا منہ نکل آیا ہے میرے بچے کا۔“ نسرین کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ قمر نے اس کی جذباتیت اور اندازوں پر کچھ بھی کہنے سے گریز ہی کیا۔ وہ از خود کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

سیٹھ سلیم کو باوقار انداز میں گاڑی کی طرف بڑھتے دیکھ کر ماجد نے دروازہ کھول دیا۔ دو روز کاٹیج میں گزارنے کے بعد سلیم بہت خوش، پُرجوش اور تر و تازہ تھا۔

”سب ٹھیک رہا ماجد؟“ اس نے تجسس سے پوچھا۔

”یس سر!“ ماجد نے ادب سے کہا۔

”میں نے پرسوں کئی بار تمہیں کال کی لیکن سگنلز کی وجہ سے رابطہ ممکن ہی نہیں ہو سکا۔“

”یہ کون سی نئی بات ہے سر! بارش کی دو بوندیں گرتے ہی بجلی اور موبائل نیٹ ورکس دمے کے مریض بن جاتے ہیں۔“

”اسی لیے میں نے رُو برو بات کرنا ہی بہتر سمجھا۔ خیر! ٹرپ کیسا رہا پرسوں؟“

”بمباسٹک! بہت مزہ آیا۔“

”کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی۔“ وہ مکمل اطمینان حاصل کرنا چاہتا تھا۔

”میرے ہوتے ہوئے کوئی گڑبڑ ہو ہی نہیں سکتی کبھی!“ ماجد کا اعتماد دیدنی تھا۔

”تمہارا یہی انداز تو مجھے پسند ہے۔“ سلیم محظوظ ہوا۔ ”لیکن پھر بھی خیال رکھا کرو۔ اوور کانفیڈینس ہی اکثر کرائمز کا دشمن ثابت ہوتا ہے۔“

”اصلاح کے لیے معذرت سر! ہم کوئی کرائم تو نہیں کر رہے۔“ وہ معصومیت سے بولا۔

”ارے ہاں بھئی! تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہ سوشل ورک ہے۔“ سلیم خباثت سے مسکرایا۔ ماجد بھی معنی خیزی سے نچلا لب دانتوں میں دبائے ہنسنے لگا۔

”اپنے ان نئے بندوں کی سناؤ! ان کی کارکردگی سے مطمئن ہو کہ نہیں؟“

”کسی حد تک۔“ ماجد کو ان کی نالائقی یاد آئی۔ ”ابھی وہ مکمل طور پر میرے سانچے میں تو نہیں ڈھل سکے لیکن توقع کرتا ہوں کہ جلد ہی لائن پر آجائیں گے۔“

”گڈ! یہ ٹارگٹ اسی مہینے میں مکمل ہو جانا چاہیے۔“ اس نے ایک چیک نکالتے ہوئے رقم کا اندراج کیا۔ ”تم بھی عجیب ہی شخص ہو ماجد! زمانہ اس قدر ترقی کر چکا ہے لیکن تمہارے طور طریقے اب بھی ویسے ہی پرانے ہیں۔ آن لائن ٹرانزیکشن کے دور میں بھی تمہیں چیک ہی سے پیمنٹ لینی ہوتی ہے۔“

”میں عام سا انسان ہوں سر جی! یہ ٹیکنالوجی کے جھنجٹ میری سمجھ میں نہیں آتے۔“ اس کی منطق پر سلیم ہنس دیا۔

”دیسی بندہ ہوں ناں! چیک اور کتابوں کا مادی لمس بہت اچھا لگتا ہے۔ کاغذ کی خوشبو روح تک سرشار کر دیتی ہے۔ پھر بینک جانا، چیک کیش کروانا اور اپنے اکاؤنٹ میں رقم جمع کر کے ’بابو‘ بننے کا لطف آنے لگتا ہے۔“ ماجد نے مسرت کے عالم میں انگلیوں کے درمیان چیک کی موجودگی محسوس کی۔

"چلو ٹھیک ہے بھئی! جیسے تمہاری خوشی۔ یہ رقم تمہارے بندوں کے لیے۔" سلیم نے ایک پتلی سی گڈی نکال کر اس کی طرف اچھالی۔ اگلے پانچ منٹ میں وہ اسٹور پر پہنچ چکے تھے۔ ماجد کو اگلے حکم تک یہیں گاڑی میں بیٹھ کا انتظار کرنا تھا۔

☆☆☆

قمر ٹیرس میں رکھی کرسی پر بیٹھا بے چینی سے ٹانگیں جھلا رہا تھا۔

اس کی نظریں سڑک پر اور ذہنی پرواز مکمل طور پر شاہ میر، شہروز کی طرف مرکوز تھی۔ اسے نسرین کے گھر میں رہائش کے دوران سب اہلِ خانہ کی بہت سی باتیں اور سرگرمیاں قابلِ اعتراض بھی لگی تھیں لیکن وہ ہمیشہ اپنی نازک ترین حیثیت کی بنا پر کچھ بھی کہنے سے گریز ہی کرتا رہا۔ توقیر اپنی نوکری میں الجھا آدم بیزار قسم کا شخص تھا۔ وہ صبح سات بجے ہی دفتر روانہ ہو جاتا تھا۔ گھر سے دفتر کی مسافت ذاتی سواری پر بھی ڈیڑھ گھنٹے سے کم نہ تھی۔ پانچ بجے فراغت پا کر وہ ایک مشہور فوڈ پوائنٹ کا رخ کر لیتا جہاں چھ بجے سے ساڑھے دس تک اکاؤنٹ کے فرائض سرانجام دے کر بمشکل ساڑھے گیارہ گھر پہنچتا اور کھانا کھاتے ہی انٹاغفیل ہو جاتا۔ اس نے خود کو پیسہ کمانے والی مشین بنا رکھا تھا تو دوسری جانب نسرین بچوں کے ساتھ بیرونی ذمے داریاں سنبھالتی چڑچڑے پن کا شکار ہو چکی تھی۔ ان منتشر خیالات کی پگڈنڈی پر بھٹکتے وہ ماریہ کو اپنے گھر کی جانب آتے دیکھ کر چونک گیا۔ وہ گھنٹی پر ہاتھ رکھے دروازہ کھلنے کی منتظر تھی۔

"ارے ماریہ! تم اس وقت کیسے؟ آج کالج نہیں گئیں کیا؟" نسرین کی آواز سنائی دی۔ قمر کے قدم بھی بے اختیار نیچے جانے کے لیے اٹھ گئے۔

"آج بس یونہی چھٹی کر لی میں نے۔ آپ کے پاس ایک چھوٹی سی فیور لینے آئی ہوں۔ جاوید بھائی کل سے آؤٹ آف سٹی گئے ہیں۔ پاپا کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں۔ آج بجلی کے بل کی آخری تاریخ ہے۔ اگر آپ نے بل جمع نہیں کروایا تو پلیز ہمارا بھی لے جائیے گا۔" وہ متانت سے کہنے لگی۔ قمر گہری نظروں سے اس کی ہر ایک جنبش پر غور کر رہا تھا۔

"او مائی گاڈ! بل جمع کروانے کا خیال تو مجھے بھی نہیں رہا۔ ابھی اور بھی اتنے کام پڑے ہیں۔" وہ حسبِ عادت بوکھلا گئی۔

"ٹینشن نہ لو! مجھے دے دو۔ فارغ ہوں ابھی۔" قمر نے پیشکش کی۔

"میرے پیارے بھائی! بہت شکریہ۔" نسرین نے جلدی سے کہا۔ ماریہ پیسے اور بل اسے تھماتے ہوئے بولی۔

"آج چار بجے امی نے گھر میں قرآن خوانی کا انتظام کیا ہے۔ آپ نے ضرور آنا ہے باجی!"

"ہاں! کیوں نہیں۔ میں ضرور آؤں گی۔" نسرین مسکرائی اور ماریہ کو رخصت کرنے کے بعد اپنے کمرے کی طرف پیسے لینے چل دی۔ قمر سرشاری کے عالم میں اس مختصر ملاقات کی جزئیات میں گم تھا۔

"قمر! میری الماری سے بل کے سارے پیسے غائب ہیں۔" چند لمحوں بعد وہ فق چہرہ لیے باہر آئی۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ صبح سے تو کوئی گیا ہی نہیں وہاں۔" وہ بھی چلّا اٹھا۔ اسے ایک اور پھندا اپنے گلے میں پڑتا نظر آ رہا تھا۔

☆☆☆

ماجد اپنے اکاؤنٹ میں پیسے جمع کروانے کے بعد طبیعت میں کیف و سرور محسوس کر رہا تھا۔

کامیابی اور رقم کی سرشاری سے قطع نظر اسے اپنے گوہرِ مقصود تک رسائی کا خیال زیادہ خوشی دیا کرتا تھا۔ اس کام سے فراغت پاتے ہی وہ دونوں ساتھیوں کو ان کا حصہ پہنچانے کے لیے امتیاز کو فون کرنے لگا۔

"شام کو پارک میں چلے آنا متو! اور اس ہیرو کو بھی ساتھ ہی لے آنا۔" رابطہ ہوتے ہی اس نے ملائمت سے کہا۔

"فرحان کی طبیعت کل دوپہر سے بہت خراب ہے استاد! پانی کی کمی ہو گئی تھی اسے۔ رات تک میں اس کے ساتھ اسپتال میں ہی تھا۔" امتیاز کے لہجے و انداز میں بھی تھکاوٹ نمایاں تھی۔

"ایک تو آج کل کے یہ لونڈے نزاکت اور نخروں میں زنانیوں کو بھی پیچھے چھوڑنے لگے ہیں۔" وہ کوفت سے بولا۔

"نہیں استاد! وہ واقعی بہت بے حال تھا۔" امتیاز گھگھیایا۔ وہ ماجد کے اس انداز سے ہمیشہ ہی دباؤ میں آ جاتا تھا۔

"ابھی کہاں ہے وہ نازک ہیروئن؟"

"میرے فلیٹ میں ہے۔ میں اُسے کل اپنے ساتھ ہی لے آیا تھا۔" ماجد نے مزید کچھ کہنے کے بجائے رابطہ منقطع کر دیا۔ وہ اپنے ذہن میں آنے والے ایک فوری خیال پر عمل کرنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

"کس کا فون تھا متو!" فرحان نے نمکول پانی کا گھونٹ لیتے ہوئے پوچھا۔ امتیاز فون کی گھنٹی بجتے ہی کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

"استاد کا تھا۔" اس نے دھیرے سے بتایا۔

"کیا کہہ رہا تھا؟" وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

"تیری طبیعت کے بارے میں ذرا پریشان تھا۔ کہہ رہا تھا اچھے سے ڈاکٹر کو دکھاؤ۔ بہترین خوراک اور دوائیاں استعمال کرواؤ۔"

"مجھے بنا مت متو! میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ہم لوگ جس فیلڈ میں موجود ہیں، وہاں انسان کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ ہم صرف استعمال کیے جانے کی چیز ہیں۔" وہ تلخی سے بولا۔ امتیاز کے پاس اس تلخ حقیقت کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ گہری سانس بھر کر خاموش ہو گیا۔ فرحان بھی آنکھیں موند کر اپنے اعصاب پُرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ نصف گھنٹے بعد گھنٹی کی آواز نے ساکت ماحول میں ارتعاش پیدا کر دیا۔

"میں نے اپنے لیے کھانے کا آرڈر کیا تھا۔ ڈیلیوری بوائے ہی نہ ہو کہیں۔" امتیاز نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ اسے شدید بھوک محسوس ہو رہی تھی لیکن دروازہ کھولتے ہی سامنے موجود ہستی کو دیکھ کر یکدم سب جذبات ہوا ہو گئے۔

"ابے! پہلی دفعہ دیکھ رہے ہو کیا مجھے؟ ہٹو بھی پیچھے۔" ماجد نے دائیں ہاتھ میں تھاما کچھ سامان بائیں ہاتھ میں منتقل کیا اور اسے دھکیلتا ہوا اندر چلا آیا۔

"کیسی ہے میری ہیروئن؟" اس نے نہایت شفقت سے فرحان کو مخاطب کیا۔

"ٹھیک ہوں استاد!" وہ اس کے طرزِ تخاطب سے جزبز ہونے کے باوجود مزید کچھ نہ کہہ سکا۔

"کس ڈاکٹر کو دکھایا ہے اسے؟" وہ اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھے حرارت کا اندازہ کرتے امتیاز سے استفسار کرنے لگا۔

"یہیں پاس والی ڈسپنسری میں...... اس نے ڈرپ وغیرہ بھی لگائی تھی۔"

"تیری عقل کا بھی ویسے جواب نہیں متو! تم لوگ سستے کے چکر میں ایسے عطائی ڈاکٹروں کے پاس جا گھستے ہو۔ ان کا تو کاروبار ہی تم جیسے عقل کے اندھوں کی وجہ سے چلتا ہے۔" اس کے لہجے میں بلا کی مٹھاس تھی۔

"اس کے ہاتھ میں بڑی شفا ہے استاد!" وہ منمنایا۔

"بیٹا! تجھے اس علاقے میں آئے صرف چھ، آٹھ ماہ ہوئے ہوں گے۔ میں نے سارا بچپن انہی گلیوں میں کھیلتے کودتے گزارا ہے۔ ہر بندے کو اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح جانتا ہوں۔ یہ جسے تم ڈاکٹر سمجھے بیٹھے ہو ناں! کچھ سال پہلے راوی پارک کی ڈسپنسری میں جھاڑو پونچھا کیا کرتا تھا۔ بندہ خیر ذہین تھا اس لیے دوائیوں کی بھی خوب جانکاری لیتا رہا۔ استعمال شدہ سرنجوں کو اپنے نشہ پانی کے لیے استعمال کرتے ہوئے انجکشن لگانے کا طریقہ بھی سیکھ لیا اور اب یہاں اپنی ہائی پوٹینسی کی مخصوص دوائیاں لا کر تم جیسوں کے سر پر آن بیٹھا ہے۔" فرحان حیرت سے اس کا انکشاف سنتا رہا۔

"میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس نے ہیروئن کو جو دوائیں دی ہیں ان کے استعمال کے بعد یہ سر درد اور چکر بھی محسوس کر رہا ہوگا۔" ماجد کے سوال پر فرحان کا سر بے ساختہ اثبات میں ہل گیا۔

"یہ پیسے پکڑو اور اسے کسی اچھے پرائیویٹ اسپتال لے جا کر دکھاؤ۔" اس نے جیب سے بڑی مالیت کے تین چار نوٹ نکال کر بستر پر اچھالے۔

"رہنے دیجے استاد! اس کی کیا ضرورت تھی؟ میں کر لیتا خود ہی کوئی بندوبست۔" فرحان نے شرمندگی سے کہا۔

"اپنی طرف سے دے رہا ہوں۔ ادھار مت سمجھ۔" وہ پچکار کر بولا۔ "اور یہ لو اپنا حصہ!" اس نے پتلی گڈی امتیاز کی طرف اچھالی۔

"استاد! آپ کی کمیشن؟"

"اس دفعہ میں نے نہیں رکھی۔" ماجد نے بے نیازی سے کہا اور پھر ایک جانب رکھے خاکی لفافوں میں سے وہسکی کی بوتل نکال کر امتیاز کی طرف بڑھا دی۔ "پچھلی دفعہ تم لوگوں کے گھر آیا تھا۔ خالی ہاتھ آتے ہوئے اچھا تو نہیں لگتا ناں!"

بہترین شراب کی بوتل دیکھ کر فرحان بھی بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گیا۔ وہ بے اختیار خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔

"اتنا تکلف کیوں کر ڈالا استاد؟" متو بھی للچائی ہوئی نظروں سے بوتل دیکھتا ہوا رسمی انداز میں بولا۔ ماجد اپنے شیریں لہجے سے انہیں اپنے ٹرانس میں لے چکا تھا۔ "یہ لے فرحان! تیرا حصہ میں کیسے بھول سکتا تھا؟ لیکن پہلے ٹھیک ہو جا! پھر اسے استعمال کرنا۔" اس نے دوسرے لفافے سے ایک اور بوتل نکال کر تھمائی۔ ان دونوں کے چہرے خوشی سے تمتمانے لگے۔ پندرہ منٹ بعد ماجد وہاں سے رخصت ہوا تو ان کی سابقہ کیفیات اس کی حالیہ عنایات اور شیریں بیانی سے

مغلوب ہو چکی تھیں۔ اب دل و دماغ پر لالچ اور طلب کے سوا کوئی جذبہ حاوی نہ تھا۔ ان کی بھی کیفیات کو کسی ماہر ٹیلی پیتھی کی طرح محسوس کرتے ماجد کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"الو کے پٹھے! گندی نالی کے کیڑے! بزدل کہیں کے!...... جانتے ہی نہیں کہ انہوں نے جو 'بیاہ' کرلیا ہے اس میں 'طلاق نامہ' کا حق صرف میرے پاس ہے۔ یہ سارے پیسے تو اگلے ٹرپ میں ان کی ہڈیوں سے نکلوا لوں گا۔" اس نے مسکراتے ہوئے بائیک واپسی کے لیے موڑ دی۔

☆☆☆

بل کی متعلقہ رقم کا غیاب نسرین کے لیے بے حد پریشان کن تھا۔ وہ پل بھر میں ہی حواس باختہ ہو گئی تھی۔

"میرے پاس کمیٹی کے کچھ پیسے رکھے ہیں۔ تم اس سے بل تو جمع کروا کے آؤ ناں! اس معاملے کو پھر بعد میں دیکھتے ہیں۔" وہ پیشانی مسلتے ہوئے بولی۔

"توقیر کو ایک بار فون کر کے پوچھ لو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ پیسے رکھنے ہی بھول گیا ہو۔" قمر نے خود کو تیزی سے سنبھالا۔

"نہیں نہیں! ان سے پوچھنا تو بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنا ہے۔ ایک دو بار پہلے بھی میرے پیسے غائب ہو چکے ہیں۔ یہ ضرور کام والی ہی نے گل کھلائے ہیں۔" وہ ذہنی دباؤ میں تھی۔ "خیر! میں اس معاملے کو خود ہی دیکھ لوں گی۔ تم بس بل جمع کروا آؤ۔"

قمر اس کی منطق سے متفق نہ ہونے کے باوجود خاموشی سے پیسے تھامے باہر نکل گیا۔ اس نے علاقے میں بل پیمنٹ کی دو دکانیں دیکھ رکھی تھیں۔ جنید کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے بعد وہ گھر لوٹا تو تین بج چکے تھے۔ شاہ میر اسے ٹی وی لاؤنج میں ہی بیٹھا مل گیا۔

"اب کیسی طبیعت ہے بھئی تمہاری؟" قمر نے دوستانہ انداز اختیار کیا۔ توقیر کی ہدایات کے باعث دونوں بچے اس سے زیادہ بے تکلف ہو ہی نہ پائے تھے۔

"بس ٹھیک ہوں انکل!" وہ دھیرے سے بولا۔ اس کے چہرے سے ہنوز زردی جھلک رہی تھی۔

"ارے یار! کتنی دفعہ کہہ چکا ہوں کہ مجھے انکل مت کہا کرو۔ کیا میں اتنا 'اوورایج' لگتا ہوں تمہیں؟"

"نہیں تو...... آپ تو کافی ہینڈسم ہو۔" شاہ میر نے بھی بے تکلفی جتائی۔

"تو پھر سیدھی طرح ماموں کہہ لیا کرناں! اتنا پیارا اور مٹھاس بھرا رشتہ ہے یہ۔" قمر نے اس کے بال سہلائے۔

"ٹھیک ہے ماموں!" اس نے سعادت مندی سے کہا۔ "ماما آپ کا کھانا اوون میں نکال کر رکھ گئی ہیں۔ کہہ رہی تھیں یاد سے کھا لینا۔" شاہ میر کی نظریں کئی بار گھڑی کی جانب اٹھ چکی تھیں۔

"کیا بات ہے؟ کسی کا انتظار کر رہے ہو کیا؟"

"جی ماموں! میرے ایک فرینڈ نے آنا تھا ہم کو اسٹڈیز کرنی ہے اکٹھی۔" اس کے بتانے پر قمر ایک بار پھر سر سہلاتا اپنے لیے کھانا لینے چل دیا۔ اسی اثنا میں دروازے پر گھنٹی بجی اور ایک بارہ، تیرہ سالہ معصوم صورت لڑکا شاہ میر کے ساتھ لاؤنج میں چلا آیا۔

"یہ تو رومی ہے ناں!" قمر چونکا۔ اس بچے کو وہ کالونی میں فٹ بال کھیلتے کئی بار دیکھ چکا تھا۔

"جی! یہ میرا بیسٹ فرینڈ ہے۔" شاہ میر نے بتایا۔ اس کی آنکھوں میں یکدم ہی ہراس نظر آنے لگا تھا۔ قمر کے اعصاب گزشتہ رات کی بے آرامی اور نیند کی کمی کے باعث بے حد بوجھل ہو چکے تھے۔ اسے شدت سے آرام کی طلب تھی۔

"او کے جنٹلمین! میں کچھ دیر سونا چاہتا ہوں۔ پلیز اپنا 'والیم' ذرا آہستہ رکھیے گا۔" وہ شفقت سے کہتا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ دونوں بچے سرگوشیوں میں کوئی بات چیت کرنے میں مشغول ہو گئے۔ قمر ان کے اطوار دیکھ کر ٹھٹکا لیکن نیند سے مغلوب ہو کر نظر انداز کرنے پر مجبور ہو گیا۔

☆☆☆

نسرین کی واپسی سات بجے ہوئی تھی۔ وہ کافی تھکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

"اتنی دیر کیوں لگا دی تم نے؟ میلاد تو غالباً مغرب سے پہلے ہی ختم ہو گیا تھا ناں!" قمر نے اندازاً کہا۔

"ہاں! اسی وقت ہوا تھا لیکن پھر انہوں نے کھانے کے لیے روک لیا۔"

"اس کھانے کے دوران وہاں کالونی بھر کی خبروں پر خصوصی بلیٹن بھی چلا ہو گا۔ سب خواتین نے یہ بلیٹن اپنی خودکار 'یو ایس بیز' میں منتقل کر لیا ہو گا۔" اس نے طنز کیا۔

نسرین کی غیر ذمے داری اسے ہمیشہ ہی تاسف میں مبتلا کر دیتی تھی۔ دونوں بچے اسکول ہی سے منسلک کوچنگ سینٹر میں آٹھ بجے تک پڑھتے تھے۔ ان کی غیر حاضری میں نسرین موبائل اور ٹی وی ڈراموں سے دل بہلاتی۔ اس کے علاوہ وہ اپنے 'سماجی حلقے' کی کوئی بھی تقریب کسی صورت ترک نہیں کر پاتی تھی۔

’’ہر وقت کا مذاق اچھا نہیں ہوتا قمر! میں سارا دن گھر میں قید ہو کر نہیں رہ سکتی۔‘‘ اس نے بیزاری سے کہا۔ شوہر کی جانب سے عدم توجہی اور اپنی دہری ذمے داریوں نے ردعمل کے طور پر اسے کچھ غیر نصابی سرگرمیوں میں الجھا رکھا تھا۔ ان مصروفیات میں وہ اپنی تشنہ خواہشات اور ادھورے وجود کو بہت ’معتبر‘ محسوس کیا کرتی۔

’’شاہ میر کو ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی تھیں یا نہیں؟‘‘

’’تمہارے جانے کے بعد لے گئی تھی۔ فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔‘‘ وہ قدرے مطمئن تھی۔

’’مسئلہ کیا تشخیص کیا ہے اس نے؟‘‘

’’پڑھائی کا اسٹریس ہے بس! کھانے پینے کی احتیاط کا بھی کہا ہے۔‘‘

’’لیکن مجھے تو یہ مسئلہ کچھ اور ہی لگ رہا ہے۔‘‘ وہ الجھا ہوا تھا۔

’’تم نے ڈاکٹری کب سے شروع کر دی؟‘‘ اس نے اپنے کانوں اور گردن سے زیورات اتارتے ہوئے کہا۔ قمر اس کی غیر سنجیدگی پر ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔

’’بہت تھک گئی ہوں آج میں...... ایک کپ چائے ہی بنا دو میرے پیارے بھائی!‘‘ اس نے ملتجی فرمائش کی۔

’’سوری! میں اس گھر کا رامو کا کا نہیں بننا چاہتا۔‘‘ قمر نے کندھے اچکائے۔ ’’ویسے بھی میں آج سے اپنی نئی جاب کا آغاز کرنے لگا ہوں۔‘‘ اس نے مصنوعی کالر اکڑائے۔

’’سچی! کہاں ملی جاب تمہیں؟ تم نے بتایا ہی نہیں مجھے۔‘‘ وہ بچوں کی طرح پُرجوش ہوئی۔

’’قریبی پیٹرول پمپ پر ملی ہے۔‘‘

’’واہ...... کیا کرنا ہوگا؟ اور تنخواہ کتنی ملے گی؟‘‘

’’وہاں سگریٹ ہاتھ میں پکڑے پیٹرول فلنگ کے لیے آنے والے لوگوں کو ڈرانا ہے۔ تنخواہ ڈر کے تناسب سے دی جائے گی۔‘‘ قمر معصومیت سے بولا۔ جواب میں نسرین کی ہونق شکل دیکھنا اس کے لیے بہت پُرلطف مرحلہ ہوا کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ لطف اندوز ہوتا کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ اسے کپڑے تبدیل کر کے مائیکل اور جنید سے ملاقات کے لیے جانا تھا۔ وہ آج رات سے ہی سیاسی پارٹی کا دفتر کھولنے کے منصوبے پر عمل کرنا چاہتے تھے۔ انہیں امید تھی کہ وقتی کمائی کی سبیل کے ساتھ وہ اپنے بہتر مستقبل کی کوئی راہ بھی ضرور تلاش کر لیں گے لیکن اس رات نے اپنے دامن میں ایک ایسا حادثہ چھپا رکھا تھا جو کالونی کے بہت سے افراد کی ہموار زندگیوں کو تلپٹ کر دینے کے لیے کافی تھا۔

☆☆☆

’’یار! مجھے تو تمہارے اس فیصلے کی کچھ سمجھ نہیں آرہی۔ کیسے ہوگا یہ سب؟ ہم یہاں بیٹھ کر آخر کریں گے کیا؟‘‘ منیب پلاسٹک کی درجن بھر کرسیوں کو دیکھتے ہوئے الجھا۔

’’ارے منیب! تمہارے تو ’کن فیوز‘ ہی رہتے ہیں۔‘‘ جنید نے خودساختہ اصطلاح میں اسے کنفیوژن کا طعنہ دیا۔ ’’ہم کرکٹ کھیلتے ہوئے بھی تو ساری رات گزار ہی دیتے ہیں ناں! الیکشنز تک یہاں بیٹھ جایا کریں گے۔ بہترین ساؤنڈ سسٹم کا بندوبست ہوگا۔ اپنی پارٹی کے ترانے چلائیں گے۔ خوب موج مستی ہوگی۔‘‘

’’پاشا اور مجید نے اپنے تعلقات کا استعمال کرتے ہوئے گراؤنڈ پر قبضہ کر لیا ہے۔ ورنہ ہمارا سیٹ اَپ وہاں زیادہ کامیاب ہو سکتا تھا۔‘‘ قمر نے کہا۔

’’اس میں بھی ہمارا ہی فائدہ ہے پیارے! وہ دو پارٹیز کا سسٹم چلائیں گے۔ کھچڑی بنی رہے گی وہاں ایک۔ ہم لوگ پُرسکون انداز میں کام کریں گے۔‘‘ جنید نے رسان سے کہا۔

’’لیکن صرف اتنے سے کام کے لیے کوئی ہمیں رقم کیوں دے گا؟‘‘ منیب نے ایک بار پھر اعتراض جڑا۔ وہ کسی بھی معاملے کو نصف درجن سے زائد بار دہرا کر نت نئے سوال پوچھے بنا مطمئن ہی نہیں ہو پاتا تھا۔

’’ہمیں ایک اضافی رجسٹر بھی دیا جائے گا۔ علاقے کے لوگوں کی شکایات درج کریں گے۔ ان کے حل کے لیے شام سے پہلے ایک، دو گھنٹے بھاگ دوڑ کر کے یقین دلائیں گے کہ ہمارے سوا ان سے کوئی مخلص ہی نہیں۔‘‘

’’ہم...... اب سمجھا۔ سیاست کی بساط پر ایک نئی شطرنج بچھائی گئی ہے۔‘‘ منیب نے سر ہلایا۔

’’یا اللہ! تیرا شکر ہے کہ اس کی عقل شریف میں دوسری بار میں ہی بات سما گئی ہے۔‘‘ سب لڑکوں نے دعا کے انداز میں چہرے پر ہاتھ پھیر کر اجتماعی شکر ادا کیا۔

اگلے دو گھنٹے بہت مصروف گزرے۔ ساؤنڈ سسٹم سیٹ کرنے کے بعد وہ اپنے پاس آنے والے دیگر نوجوانوں کو بھی ’منشور‘ کے بارے میں سمجھاتے رہے۔ کچھ ہی دیر میں ان کے ساتھ پانچ لڑکوں کا مزید اضافہ ہو چکا تھا۔ قمر کا ارتکاز موبائل کی گھنٹی سے ٹوٹا۔ اسکرین پر نسرین کا نمبر دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔ وہ کبھی اسے بے وقت فون نہیں کرتی تھی۔ کسی بھی ضروری بات کے لیے بھی ہمیشہ ٹیکسٹ میسج ہی کا سہارا لینا اس کی پرانی عادت تھی۔

’’ہیلو قمر! کہاں ہو تم؟‘‘ فون اٹھاتے ہی ہیجان زدہ آواز اس کی سماعت میں پڑی۔

”مرینج پر پلاٹ کی خریداری کے لیے آیا ہوں۔ شہاب کا ننھیال الگ گھر کی فرمائش پر ہی شادی کے لیے راضی ہوا ہے۔ بروکر نے مجھے کہا ہے کہ یہاں سولر پینل بھی بالکل فری ہیں۔“ اس کی زبان فرانے بھرنے لگی۔

”پلیز قمر! یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔ تم فوراً گھر چلے آؤ! شاہ میر کی طبیعت بہت خراب ہے۔“ وہ رونے لگی۔

”اوکے! دو منٹ میں پہنچتا ہوں میں۔“ وہ سنجیدہ ہوا۔ مائیکل کا گھر اسی سڑک کے اختتام پر تھا۔ قمر نے بھاگتے ہوئے وہ فاصلہ طے کیا۔ شاہ میر بخار میں پھنک رہا تھا۔

”کیا ہو گیا اسے؟ شام تک تو اچھا بھلا تھا۔“ وہ تشویش سے بولا۔

”پتا نہیں! تمہارے جانے کے بعد کھانا کھایا تھا اس نے۔ میں نے بیگ سیٹ کر کے صبح اسکول جانے کی بات کی تو اس کی رنگت زرد ہونے لگی اور کپکپاہٹ سے بخار ہو گیا۔“ نسرین کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔

”توقیر کو اطلاع کی کہ نہیں؟“ اس نے وقت کا اندازہ کرتے ہوئے کہا۔ توقیر کی آمد میں پندرہ، بیس منٹ ہی باقی تھے۔

”تمہارے گھر سے جانے کے بعد وہ دس منٹ کے لیے آئے تھے۔ ان کی بڑی بہن کے سسرال میں کسی کی وفات ہو گئی ہے۔ وہ ایک بیگ میں دو جوڑے کپڑے اور ضروری سامان لے کر اس کے گاؤں چلے گئے ہیں۔ واپسی دو یا تین دن سے پہلے ممکن ہی نہیں۔“ نسرین نے چڑ کر بتایا۔ وہ اپنے سسرال میں کم ہی گھلتی ملتی تھی۔ لمبے سفر میں بچوں کو بھی قے ہونے لگتی تھیں لہٰذا توقیر انہیں لے جانے کے لیے بھی اصرار ہی نہ کرتا۔

”میں مائیکل یا جنید سے بائیک لانے کا کہتا ہوں۔ تم تیار ہو جاؤ۔“ اس نے عجلت میں فون پر نمبر ملایا۔

شاہ میر کے جسم کو اب جھٹکے لگنے شروع ہو گئے تھے۔

اگلے پندرہ منٹ میں وہ بائیک پر ان دونوں کو لیے قریبی نجی اسپتال میں پہنچ چکا تھا۔ انتظامیہ کی جانب سے اسے بھرپور توجہ دی گئی۔ وہ نسرین کے ساتھ ویٹنگ روم میں ہی بیٹھ گیا۔ اس کی پیشانی پر سلوٹیں نمایاں تھیں۔

”روی کون ہے نسرین؟ اس کی فیملی کیسی ہے؟“ اس نے بے چینی سے پوچھا۔

”اچھا لڑکا ہے۔ اس کی والدہ بیوہ ہیں۔ کسی بوتیک کے ساتھ کپڑے سینے کا کانٹریکٹ ہے ان کا۔ بہن یونیورسٹی میں پڑھتی ہے اور ہوم ٹیوشنز بھی پڑھاتی ہے۔“ نسرین نے بوجھل انداز میں بتایا۔

”کلاس فیلو ہیں کیا یہ دونوں؟“ قمر کو ان کی عمروں کا تفاوت دوپہر ہی سے کھل رہا تھا۔

”نہیں! روی تو سیونتھ اسٹینڈرڈ میں ہے۔ وہ ’رائزنگ اسٹارز‘ میں پڑھتا ہے۔ شامی کے اسکول کی فیس ان کی پہنچ میں کہاں؟“ اس نے ذرا فخر سے کہا۔ قمر کو اس کا یہ انداز ناگوار تو گزرا تاہم شاہ میر کا جھوٹ اس وقت زیادہ الجھن آمیز تھا...... وہ آنکھیں موند کر کرسی کی پشت سے سر ٹکائے موجودہ صورتِ حال کا تجزیہ کرنے لگا۔ تفکرات کی پرچھائیاں کم ہونے کا نام ہی نہ لے رہی تھیں۔

دو گھنٹے کی بہترین نگہداشت اور ادویات کے استعمال سے بالآخر شاہ میر کی طبیعت سنبھل گئی۔ وہ دونوں ہی اس کی حالت سے مطمئن تھے۔

”شہروز پریشان نہیں ہو رہا ہوگا اکیلا؟ مجھے بھی خیال ...... نہ رہا کہ اسے فون ہی کر دیتا گھر۔“ قمر نے تشویش سے کہا۔

”نہیں! میرے بچے بہت بہادر ہیں۔ وہ اکیلے وقت گزارنے سے کبھی خوفزدہ نہیں ہوتے۔ ہم نے انہیں ذہنی طور پر بہت مضبوط بنا رکھا ہے۔“ اس کے تفاخر بھرے انداز

رئیل اسٹیٹ ایڈوائزر
DHA. KARACHI
DHA. City Karachi
BAHRIA TOWN KARACHI
پلاٹ، مکان، دکان، بنگلوز اور فلیٹ
کی خرید و فروخت کے لیے مستند نام
ریاض حسین
ایڈریس: راحت کمرشل لین 2
DHA PHASE 6 KARACHI
فون نمبر: 0300-3658964

پر قمر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ جلد از جلد گھر پہنچ کر اپنے ذہن میں اٹھتے سوالوں کی تسکین کرنا چاہتا تھا۔

''کیسے ہو آپ میری جان؟ ڈر تو نہیں لگا؟'' نسرین نے گھر آتے ہی شہروز سے پوچھا۔

''ڈر کیسا ماما؟ میں کوئی بچہ تھوڑی ہوں۔'' شہروز کا اعتماد دیدنی تھا۔ نسرین نے جتاتی ہوئی نظروں سے قمر کو دیکھا اور دونوں بچوں کو لیے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ شاہ میر کی طبیعت کے پیشِ نظر وہ اس کے ساتھ ہی لیٹنا چاہتی تھی۔ قمر نے صوفے پر رکھا شامی کا ٹیب اٹھالیا۔ اس کی اسکرین پر کسی اسپورٹس کار کی تصویر تھی۔ ٹیب اپنی سلطنت میں داخلے کی اجازت دینے سے قبل چھ حرفی 'کھل جا سم سم' طلب کر رہا تھا۔

''بیٹا! تم لوگ جتنے بھی سیانے بن لو! ہم بھی اسی دور سے گزر کر یہاں تک پہنچے ہیں۔'' اس نے خودکلامی کرتے ہوئے اندازاً 'پندرہ گیارہ صفر آٹھ' کے نمبر دبا دیے۔ شاہ میر کی پیدائش کا ماہ و سال اور تاریخ ہی اس کے ٹیب کا کوڈ تھی۔ قمر نے اپنی سنسنی پر قابو پاتے ہوئے مختلف فولڈرز کی پڑتال شروع کی تو اس کی پیشانی عرق آلود ہوتی چلی گئی۔ اگلے ایک گھنٹے میں اس کے بدترین خدشات حقیقت کا روپ دھار کر مجسم سامنے آچکے تھے۔ قمر کا دل چاہ رہا تھا کہ شاہ میر کو باہر بلائے اور بے تحاشا تھپڑ مارتے ہوئے اس کا چہرہ سرخ کر دے۔ اس نے گہری سانسیں لیتے ہوئے خود کو پُرسکون کیا۔ وقت بے حد آہستگی سے رینگ رہا تھا۔ فضا میں فجر کی اذان کے پُرتقدس کلمات گونجے تو وہ وضو کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ نماز کی ادائیگی کے بعد وہ اپنے پراگندہ ذہن کو کسی نہ کسی طرح قابو میں لا چکا تھا۔ اب اسے طلوعِ صبح کا شدت سے انتظار تھا۔

☆☆☆

سترہ دسمبر کی اس صبح کا آغاز بہت ہنگامہ خیز تھا۔

نسرین کی آنکھ الارم گھنٹا بجنے کے باوجود نصف گھنٹہ تاخیر سے کھلی اور اب وہ گھن چکر بنی ناشتا تیار کر رہی تھی۔ قمر بھی ڈائننگ ٹیبل پر ہی چلا آیا۔ وہ گہری نظروں سے شاہ میر کی حالت کا جائزہ لے رہا تھا۔ شہروز کے لیے لنچ باکس تیار کرتی نسرین اسکول وین کا ہارن سن کر مزید بوکھلاہٹ میں مبتلا ہوگئی۔ شامی کا چہرہ بھی ایک پل کے لیے متغیر ہوگیا۔ قمر کے ذہن میں ایک برق کوندی۔ وہ بلا ارادہ ہی اٹھ کر باہر چلا آیا۔ اس کے اندازے کے عین مطابق رومی بھی اسی گاڑی میں اسکول جاتا تھا۔ ڈرائیور نے شہروز اور رومی کا بیگ مخصوص اسٹینڈ پر رکھ دیا۔ اس کی عمر اڑتیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ بھوری شلوار قمیص پر سیاہ جیکٹ پہنے وہ چست اور توانا انسان دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے ہر ایک انداز سے عجلت نمایاں تھی۔ ڈبل روٹی بے دلی سے کھاتے ہوئے رومی نے اگلی نشست سنبھال لی تھی۔ قمر کی نگاہیں اس کی معمولی ترین جنبش بھی نظرانداز نہ کر رہی تھیں۔ ڈرائیور کے بیٹھتے ہی اس نے پینٹ کی دائیں جیب میں ہاتھ ڈالا اور بند مٹھی اس کے سامنے کر دی۔ ڈرائیور کی پھرتی بھی دیدنی تھی۔ وہ آگہی کا لمحہ تھا۔ قمر بلا سوچے سمجھے آگے بڑھا اور کھڑکی سے ہاتھ بڑھا کر گاڑی کی چابی نکال کر اس کی جیکٹ سے رومی کا تھمایا گیا سامان بھی برآمد کرلیا۔ وہ پانچ ہزار کا مڑا تڑا سا نوٹ تھا۔

''یہ کیا بے ہودگی ہے؟ تم ہوش میں تو ہو؟'' اسلم نامی وہ ڈرائیور بھڑک اٹھا۔

''باہر نکل ماے خان! اور سیدھی طرح بتا کہ یہ پیسے رومی نے تجھے کس لیے دیے ہیں؟'' قمر غرایا۔

''وین کا کرایہ دیا تھا اس نے مجھے۔ لیکن تم نے یہ کیا غنڈا گردی لگا رکھی ہے؟'' وہ ڈھٹائی سے بولا۔

''اب تو یہ کہے گا کہ رومی نے پچھلے دو ماہ کی فیس پکڑائی ہے۔'' قمر نے اسے گریبان سے پکڑ کر باہر گھسیٹ لیا۔

ہاں! تو اس میں غلط ہی کیا ہے؟ اس پر خدا ترسی کرتے ہوئے میں فیس لیٹ بھی لے لیا کرتا ہوں۔'' اسلم اس کے تیور دیکھ کر اپنا اعتماد کھونے لگا تھا۔ قمر نے طیش کے عالم میں...... اسے زوردار دھکا دے کر سڑک پر گرایا اور اس کی پسلیوں، رانوں پر بے تحاشا ضربات رسید کرتا چلا گیا۔

''میں نے کچھ نہیں کیا...... کیوں مار رہے ہو مجھے؟'' وہ اس کی دیوانگی سے خوفزدہ ہونے لگا تھا۔ اس انوکھی صورت حال کو دیکھ کر پچھلی جانب بیٹھے بچے بھی نیچے اتر آئے۔ اسلم کی چیخ و پکار نے کالونی کے دیگر افراد کو بھی متوجہ کرلیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں کئی مرد و خواتین جمع ہوگئے۔ نسرین اور شاہ میر بھی ان آوازوں کو سن کر باہر لپک آئے تھے۔

''چھوڑ دو اسے جوان! کس بات کا جھگڑا ہے آخر یہ؟'' قمر کو کندھے پر ایک مضبوط ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔

''نہیں چھوڑوں گا میں اسے! یہ ابھی اپنی زبان سے بتائے گا کہ کتنے بچوں کو بلیک میل کر کے گھروں سے پیسے چرانے پر مجبور کرتا ہے۔'' اس کے الفاظ کسی دھماکے کی طرح وہاں گونجے۔ نسرین کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت تھی۔ اسلم کے جسم پر پڑنے والی ہر ضرب شاہ میر کے وجود میں بھی جھٹکے پیدا کر رہی تھی۔ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے زمین بوس ہو چکا تھا۔ رومی بھی بے حد خوفزدہ دکھائی

دے رہا تھا۔

”اگر اسلم نے کوئی غلطی کی ہے تو ہم اس سے نمٹ لیں گے۔ تم بچے کی طرف دھیان دو۔ مجھے اس کی حالت ٹھیک نہیں لگ رہی۔“ اسی شخص نے ایک بار پھر رسان سے قمر کو مخاطب کیا۔

”ماجد ٹھیک کہہ رہا ہے بیٹا! بچے کو اندر لے جاؤ۔“ یہ شفیق آواز ماریہ کے والد کی تھی۔ اسلم کا لباس بُری طرح خاک آلود ہو چکا تھا۔ سڑک سے لگنے والی رگڑوں سے چہرے اور ہاتھوں پر بھی خراشیں نظر آنے لگی تھیں۔ قمر کے لیے خود کو روکنا دشوار تھا۔ وہ نسرین کو کینے سے گھورتا ہوا شاہ میر کو بازوؤں میں اٹھائے اندر بڑھ گیا۔

☆☆☆

شاہ میر کی حالت دیکھ کر نسرین کا ذہن چکرانے لگا تھا۔ وہ فق چہرہ لیے پھٹی پھٹی نظروں سے بیٹے کو دیکھ رہی تھی جو قمر کے ہاتھوں دودھ اور اوولٹین پی رہا تھا۔ اس کے وجود میں ہلکی سی لرزش اب بھی باقی تھی۔

”شامی بیٹا! مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔ آپ تو بہت اسٹرانگ بوائے ہو ناں!“ نسرین نے پچکار کر کہا۔

”ول یو پلیز شٹ اَپ؟ شاہ میر اس وقت صرف اور صرف آرام کرے گا۔“ قمر کے سخت لہجے پر وہ خاموش ہو گئی۔ شامی دودھ کا گلاس اسے تھما کر ممنون نظروں سے دیکھتا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

”تمہیں کیا ضرورت تھی بیچ سڑک پر ایسا تماشا لگانے کی؟ یہ بات ہم اس سے آرام سے بھی تو کر سکتے تھے۔“ وہ ہر ایک لفظ چبا کر بولی۔

”تو کیا میں اس سے برقع پہن کر لڑنے جاتا؟“ قمر نے ناگواری سے کہا۔

”پوری کالونی میں یہ بات پھیل جائے گی اب۔ تو قیر تک یہ معاملہ پہنچا تو وہ میرا جینا حرام کر دیں گے۔“

”آپ بھول رہی ہیں نسرین صاحبہ! میں نے ایک بار بھی وہاں شاہ میر کا نام نہیں لیا۔“ اسے مزید غصہ آیا۔

”تمہیں کیا ضرورت تھی ہیرو پن دکھانے کی؟“ وہ جھنجلائی۔ ”مجھ سے بات کر لیتے۔ ہم اس وین ڈرائیور کو اکیلے میں بھی تو مل سکتے تھے۔ تو قیر کو علم ہوا تو......“

”تمہیں اب بھی اس غیر ذمے دار اور بے حس انسان کی فکر ہے۔ میری ایک بات کان کھول کر سن لو نسرین! اپنی اقدار کا پردہ چاک کرنے والا انسان درندہ بن جاتا ہے اور درندے کا شکار تنہا کرنے نکلو تو لمحہ بھر میں ہی چیر پھاڑ کر رکھ دے گا۔ درندہ ہمیشہ ہانکا دے کر ہجوم کے ساتھ ہی قابو کیا جا سکتا ہے۔ لیکن نہیں! تم یہ باتیں کہاں سمجھو گی؟“ اس کے غصیلے اور طنزیہ انداز پر نسرین یکدم خاموش ہو گئی۔

”تمہیں اس معاملے کا کیسے علم ہوا تھا؟“ وہ جھجک کر بولی۔ گھر میں پے در پے ہونے والے چوری کے واقعات کا شاہ میر سے تعلق اسے ایک تڑپ میں مبتلا کیے ہوئے تھا۔

”میں نے شاید تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ اس کی طبیعت کی خرابی کوئی اور ہی مسئلہ ہے لیکن تم نے میری بات کو کبھی سنجیدگی سے لیا ہی نہیں ہے۔ شدتِ غیظ سے اس کا سانس بے ربط ہونے لگا۔ نسرین ہنوز خاموش تھی۔

”ایک بات تو بتاؤ ویسے؟“ وہ آگے جھکتے ہوئے بولا۔ ”تو قیر بھائی کی ماہانہ آمدنی کیا ہو گی؟“

”تیس ہزار روپے۔“ نسرین اس کے سوال کا مقصد نہ سمجھ سکی۔

”پارٹ ٹائم جاب سے کتنا کما لیتے ہوں گے؟“

”پندرہ ہزار۔“

”اور یہ اضافی کمائی جاتی کہاں ہے؟“

”بچوں کی کوچنگ کلاسز کی فیسیں، اسکول وین کی فیسوں میں۔“ اس کی وضاحت پر قمر کا پیمانۂ برداشت لبریز ہو گیا۔

”تم خود کیوں نہیں پڑھاتیں بچوں کو؟ ماسٹرز ہو۔ کس بات کی کمی ہے آخر؟“

”آج کل کے بچے ماؤں کے قابو ہی کہاں آتے ہیں؟ پھر پڑھائی بھی تو اتنی مشکل ہو گئی ہے۔ میں بھی سارا دن کام کاج کے بعد تھک جاتی ہوں۔ اسی لیے انہیں مکمل توجہ کے لیے کوچنگ کلاسز بھیجتے ہیں۔“ اس نے روایتی تاویل دی۔

”تو یوں کہو ناں کہ اپنے آرام و سکون، موبائل پر رشتے داروں سے گفتگو اور ٹی وی ڈراموں کی قربانی نہیں دے سکتیں تم۔ میں تو جب سے یہاں آیا ہوں، یہی طور طریقے دیکھ رہا ہوں۔“

”قمر! اب تم حد سے بڑھ رہے ہو۔“ نسرین نے منہ بنایا۔ اولاد کی جانب سے پشیمانی نے الگ ہی ذہنی دباؤ میں مبتلا کر رکھا تھا۔

”نہیں محترمہ! حد سے تم لوگ بڑھے ہو تو آج یہ دن دیکھنے کو ملے ہیں۔ تم نے گھریلو خرچ اس قدر بڑھا لیے ہیں جیسے پاکستانی ٹیم زیادہ ٹارگٹ دیکھ کر ’رن ریٹ‘ بڑھا لیتی

ہے۔ یہی کیا کم تھا جو توقیر نے خود کو پیسہ کمانے کی مشین بنا کر بچوں سے دور کر لیا۔''

''یہ سب ہم ان کے بھلے کے لیے ہی کر رہے ہیں۔ ان کا مستقبل بھی تو بنانا ہے کہ نہیں؟'' وہ چلا اٹھی۔

''بچوں کا مستقبل تربیت کی بنیاد پر بناؤ۔ پیسہ کیوں اپنا مذہب بنا رکھا ہے؟ اس عمر میں لڑکوں کو باپ کی سختی اور نگرانی کی ضرورت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔'' وہ اس کے مزاج کو خاطر میں لائے بغیر بولا۔

''قمر! مجھے اس وقت کوئی بھاشن نہیں سننا۔ میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تم نے کس بنیاد پر اتنا بڑا قدم اٹھایا۔'' نسرین اب بھی شاہ میر کے لیے براہِ راست کوئی سخت الفاظ ادا نہیں کر پا رہی تھی۔ بیٹے کے لیے کسی جرم کا خیال ہی اس کا دل مسلنے لگتا۔

''شامی کے ٹیب میں انٹرنیٹ ہسٹری دیکھنے سے۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

''لیکن وہ تو ٹیب پر صرف کارٹونز اور اینی میٹڈ موویز دیکھتا ہے۔ اسے آن لائن گیمز کھیلنے کا ہی تو شوق ہے بس۔'' اس نے فوراً صفائی دی۔

''بالکل وہی دیکھتا ہے لیکن تم نے تو کبھی غور کرنے کی زحمت ہی نہیں کی ہوگی کہ مختلف آن لائن ویڈیوز کے ساتھ کس قدر بے ہودہ ایڈ آیا کرتے ہیں۔ تمہیں یہ بھی کہاں علم ہوگا کہ ان کارٹونز میں ہونے والی ذومعنی اور بولڈ گفتگو کا پس منظر جاننے کے لیے بچوں کے پاس 'سرچ انجنز' جیسی سہولیات بھی پہلے سے موجود ہوتی ہیں۔ وہ ان بھول بھلیوں میں چکراتے ایسی باتیں بھی جان لیتے ہیں جو اُن کے لیے زہرِ قاتل ہیں۔ وقت سے پہلے آگہی ہر لحاظ سے عذاب بن کر آتی ہے۔ یہی آگہی شامی کا روگ تھی۔ ڈرائیور اسلم کے ساتھ اس کا معاملہ کیوں خراب ہوا؟ بلیک میلنگ کی وجوہات کیا تھیں؟ یہ تو اس کی طبیعت سنبھلنے پر ہی علم ہوگا۔'' قمر کی وضاحت پر نسرین کا چہرہ زرد ہونے لگا۔

''میں اپنی کوتاہی تسلیم کرتی ہوں۔ پلیز مجھ پر ایک احسان اور کر دو۔'' وہ آنکھوں میں آنسو لیے بولی۔ ''شاہ میر کو ایک دلدل میں دھنسنے سے بچا کر تم نے واقعی مجھے نئی زندگی دی ہے۔ پلیز توقیر کو اس ٹیب ہسٹری کا علم نہ ہونے دینا۔''

''تم میری سوچ اور تصور سے کہیں زیادہ بے وقوف ثابت ہوئی ہو نسرین! نہایت احمق ہوتی ہیں وہ عورتیں جو مردوں سے حساس گھریلو معاملات چھپا کر خود مرد بننے کی کوشش کیا کرتی ہیں۔ اور اس سے بھی بزدل وہ مرد ہوتے ہیں جو بھی معاملات عورتوں پر چھوڑ کر خود صرف کاروبار میں مصروف رہتے ہیں۔'' اس کے بھرپور طنز پر وہ جز بز ہو کر رہ گئی۔ وہ قمر کو بتا ہی نہ پا رہی تھی کہ اپنے ہم عمر بچوں کی تقلید میں جب شاہ میر نے بھی ٹیب لینے کی ضد کی تو اسی نے کسی نہ کسی طرح توقیر کو یہ 'تحفہ سالگرہ' پر دینے کے لیے قائل کیا تھا۔ وہ صرف اس شرط پر راضی ہوا تھا کہ نسرین اس کی پڑھائی اور ان نئی غیر نصابی سرگرمیوں میں توازن قائم رکھے گی۔

''سوری بہنا! میں اس معاملے میں تمہاری مزید کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ تمہارے شوہر کو اس کی غلطیوں کا احساس ہونا بہت ضروری ہے۔'' وہ قطعیت سے بولا۔ ''میں کل ساری رات جاگتا رہا ہوں۔ اللہ کا واسطہ ہے چند گھنٹے اپنا ساؤنڈ سسٹم آف رکھنا۔ شامی کے اٹھنے پر میں خود ہی اس سے بات کر لوں گا۔ تم 'اسٹرانگ بوائے' کا جھنجھنا بجاتی ہوئی اس کے پاس مت جانا۔'' وہ اپنی سرخ ہوتی آنکھوں کو مسلتے ہوئے کمرے میں چلا گیا۔

☆☆☆

''میں آپ کو شرطیہ یہ بات کہہ سکتا ہوں سر! اس لڑکے میں بہت اسپارک ہے۔'' ماجد نے پُرزور لہجے میں سلیم کو بتایا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو گے ماجد! لیکن ہم بار بار ورکرز کی تبدیلی کا رسک بھی تو نہیں لے سکتے ناں۔'' سلیم نے رسانیت سے کہا۔

''میں آپ کی بات سے سو فیصد متفق ہوں۔ ہمارا معاملہ ایسا ہی ہے کہ ہر شخص ساتھ دینے کا حوصلہ پیدا نہیں کر سکتا۔'' اس نے وثوق سے کہتے ہوئے اپنا موبائل سلیم کو تھمایا۔ قمر کو کسی فلمی ہیرو کے سے انداز میں اسلم کی دھلائی کرتے دیکھ کر وہ بہت متاثر ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں اور چہرے سے جھلکتے جنون نے ہی ماجد کو گرویدہ بنا دیا تھا۔ اسلم سے ہونے والی مار پیٹ کے وقت ماجد ناشتا لینے کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ اس نے موقع دیکھ کر ڈیڑھ منٹ کی ویڈیو ریکارڈنگ بھی کر لی تھی۔

''اس کی پرسنالٹی بھی بہت زبردست ہے۔ ایسا سیلزمین میرے اسٹور پر آجائے تو کیا ہی کہنے! سیل بلاک بسٹر بننے لگے گی۔'' سلیم نے ایک اور خیال پیش کیا۔

''جی ہاں! اس کے نین نقش نے ہی مجھے پہلے متوجہ کیا تھا۔''

''موقع دیکھ کر اسے یہاں جاب کے لیے آفر ضرور

UrduBooks.pk

کرنا! پھر دیکھ لیں گے کہ کہاں ایڈجسٹ کیا جائے اسے۔" سلیم کی رضامندی پر باجد مطمئن ہو گیا۔ اس کی چھٹی حس متواتر اشارہ دے رہی تھی کہ امتیاز اور فرحان کی جانب سے کسی منفی صورتِ حال کے بعد اسے ہنگامی بنیادوں پر قمر جیسے جی دار جوان کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ سلیم کے اسٹور میں جاتے ہی اسے فراغت مل گئی۔ اس کا ذہن نہایت شاطرانہ انداز میں سوچ رہا تھا۔ اسے سلیم کی حکمتِ عملی سے زیادہ اپنے تحفظات کی پروا تھی۔

☆☆☆

شاہ میر بستر پر چت لیٹا چند گھنٹے قبل ہونے والی ایک 'انہونی' کے حصار میں ہی قید تھا۔

اسلم اس کی زندگی کا سب سے بڑا 'خوف' تھا۔ اس آسیب کو اسی کی غلطیوں نے اپنی زندگی پر قابض ہونے کا موقع دیا تھا۔ اپنے ہم عمر بچوں کی طرح شاہ میر کو بھی موبائل، لیپ ٹاپ اور ٹیب پر گیمز کھیلنے، کارٹون موویز دیکھنے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ اسکول میں بچے ان آسائشات کے بارے میں گفتگو کرتے، اپنے تجربات بیان کرتے ہوئے جوش و خروش سے باتیں کرتے تو وہ شدید احساسِ کمتری کا شکار ہونے لگتا۔ اسے محسوس ہوتا کہ دوستوں میں 'راجا اندر' بننے اور مکمل توجہ حاصل کرنے کے لیے ان آلات سے مستفید ہونا ضروری ہے۔ آغاز میں وہ نسرین کے موبائل پر گیمز کھیلا کرتا تھا۔ وہ پہلے پہل تو اسے نظر انداز کرتی رہی لیکن جب اس کی اپنی 'سوشل میڈیا لائف' متاثر ہونے لگی تو اس نے موبائل کے متعلق سختی شروع کر دی۔ شاہ میر نے اپنے اچھے رزلٹس اور پڑھائی میں بہترین ہونے کی دہائی دیتے ہوئے نسرین کو اس جذباتی دباؤ میں لانا شروع کر دیا۔

"آپ اور پاپا مجھ سے پیار ہی نہیں کرتے۔ میری فرمائش پوری نہیں کی کبھی۔ شہروز بھائی کے پاس لیپ ٹاپ ہے۔ اسکول میں بھی ہر بچے کے پاس اپنا ٹیب ہے۔ ایک میں ہی غریب کی اولاد اور سوتیلا ہوں۔" وہ پاؤں پٹخ کے روتا۔ یہی وہ نکتہ تھا جہاں نسرین کمزور پڑ گئی۔ اس نے شوہر کو قائل کر کے بیٹے کی خواہش پوری کر دی۔ آغاز میں وہ اسے مثبت استعمال کرتا رہا لیکن تجسس نے جلد ہی اس کی تلاش کا رخ تبدیل کر دیا۔ اس نئے مدار میں قدم رکھا تو اپنی عمر سے بڑے لڑکوں سے دوستی میں بھی دلچسپی محسوس ہونے لگی۔ وہ اسے مزید تحقیق کی راہیں دکھاتے۔ یہ سلسلہ کافی عرصے کامیابی سے چلتا رہا۔ ایسے ہی ایک روز کلاس میں سب بچوں نے کسی عید ملن پارٹی کے دوران اپنے موبائل اور ٹیب لانے کا ارادہ کیا۔ وہ بھی بہت پُرجوش تھے۔ واپسی پر اسکول وین میں بھی وہ ایک دوسرے کو اپنی تصاویر دکھا کر نئی سیلفیز لیتے رہے۔ رومی اور شاہ میر کو اپنی کالونی کا رہائشی ہونے کی بدولت اسلم سب سے آخر میں چھوڑتا تھا۔ اس کے بعد ایک گھنٹا آرام کرتے ہوئے وہ شہروز کے کیمپس سے بچوں کو لینے چلا جاتا۔ کیری ڈبا کی دروازے والی نشستوں پر بیٹھے ان لڑکوں کی بے چینی اور چہرے کے تاثرات سے وہ جان چکا تھا کہ ان کا موضوعِ گفتگو غیر اخلاقی موضوعات ہی ہیں۔ اس دن کے بعد اسلم نے انہیں اپنے ساتھ اگلی سیٹ پر بٹھانا شروع کر دیا۔

"ان ویڈیو کلپس کا تمہارے ماما پاپا کو پتا ہے کیا؟" اس نے شاہ میر سے دریافت کیا۔ وین کے باقی ماندہ بچے اس وقت عقبی نشستوں پر تھے لہٰذا ان کی یہ گفتگو کسی کی سماعت تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی تھی۔

"کک...... کون سی ویڈیوز؟" وہ بدک گیا۔ رومی کی حالت بھی دیدنی تھی۔

"وہی ویڈیوز بھئی! جو تم لوگ 'سیکرٹ فلیکس' ویب سائٹ سے اکثر دیکھا کرتے ہو۔ میرے پاس اس بات کا ثبوت بھی موجود ہے۔" وہ انہیں مکمل طور پر خوفزدہ کر دینا چاہتا تھا۔ نتیجہ خاطر خواہ برآمد ہوا۔ وہ دونوں اس گھاگ شکاری کی دھمکیوں سے دباؤ کا شکار ہو گئے۔

"کل رات میری گھڑی کہیں گر گئی تھی۔ اب تم لوگوں سے اتنی اچھی دوستی ہو گئی ہے تو ایک تحفہ مجھے دے ہی سکتے ہو ناں!" اس نے پہلا مطالبہ پیش کیا جسے شاہ میر نے اگلے ہی روز پورا کر دیا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا۔ گھڑی، موبائل، پیسوں کی چوری ایک معمول بنتی چلی گئی۔ رومی کو البتہ یہ مواقع قدرے کم ملتے تھے۔ وہ شدید بے بسی میں مبتلا ہو چکے تھے۔

"شاہی! مجھے لگتا ہے اسلم ہمیں گندے کام کرنے کے لیے بھی کہے گا۔" رومی نے کچھ روز قبل ہی اسے خوفزدہ سے انداز میں بتایا تھا۔

"گندے کام؟" شاہ میر کو اپنی سانسیں رکتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

"ہاں! وہی سب جو ہم ویڈیوز دیکھتے تھے۔" رومی اس کی بے یقینی کو ناسمجھی پر محمول کرتے ہوئے بولا۔ وہ خود بھی بہت اذیت کا شکار تھا۔ ان دونوں نے کئی بار اپنے گھر والوں کو اعتماد میں لینے کا ارادہ بھی کیا لیکن اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنے کی ہمت ہی نہ تھی۔

"میرے پاپا بہت ڈانٹیں گے۔ وہ تو پہلے ہی بہت مشکل سے ٹیب کے لیے مانے تھے۔" شامی نے اپنی مجبوری بتائی۔

"میری آپی بھی ماما کو منع کرتی تھیں کہ مجھے موبائل نہ لے کر دیں۔ ماما بہت ناراض ہوں گی۔ وہ تو بیمار ہو جائیں گی۔" رومی کو بھی اپنی بیوہ والدہ کی ذہنی کیفیت کا اندازہ تھا۔ اس کشمکش میں وہ مختلف جسمانی مسائل کا شکار ہونے لگے۔ سردرد، بخار اور متلی کی کیفیات ایک معمول بن رہی تھیں۔ یہ سلسلہ شاید مزید طوالت اختیار کرتے ہوئے جانے کون سے تاوان وصول کرتا لیکن قمر کی بے جگری نے اس عفریت کو یکدم ہی 'بونے' میں تبدیل کر دیا۔ شاہ میر کو اب اپنا وجود کسی بادل کی طرح ہلکا پھلکا محسوس ہونے لگا۔

"اٹھ گئے صاحبزادے؟" قمر مسکراتا ہوا اس کے پاس چلا آیا۔ اس کا انداز دوستانہ تھا۔

"تھینک یو ماموں!" وہ سر جھکا کر بولا۔

"ویلکم ڈیئر بھانجے! لیکن مجھے آپ سے ایسی بزدلی کی توقع نہیں تھی۔ ہم سب آپ سے اتنی محبت کرتے ہیں۔ آپ کسی کو کچھ تو بتاتے۔"

"ماما پاپا بھی کہتے ہیں کہ شاہ میر تو بہت اسٹرانگ بچہ ہے۔ بس! اسی لیے میں انہیں کچھ بتا ہی نہ سکا۔" اس کے سادہ سے الفاظ نے دروازے پر کھڑی نسرین کا وجود آنسوؤں میں ڈھال دیا۔ قمر کی جتلاتی ہوئی نظروں سے ہونے والی شرمندگی اس سے بھی سوا تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر شاہ میر کو اپنی آغوش میں بھر لیا۔

"میرے بچے! وعدہ کرو! مجھ سے آئندہ کوئی بھی بات نہیں چھپاؤ گے۔" اس نے بیٹے سے عہد لیا اور اسے اپنی ممتا و محبت کا بھرپور یقین دلاتے ہوئے قمر کا ہاتھ تھامے رونے لگی۔

"بس کر پگلی! رُلائے گی کیا؟ یہ آنسو سنبھال کر رکھو۔ آئندہ کسی سوپ میں سیریل میں ہیرو کے مرنے یا ہیروئن پر ہونے والے ظلم پر بھی بہانے ہوں گے۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں اسے پچکارتے ہوئے شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ "تم مجھ سے بڑی ہو نسرین! مجھ سے کہیں زیادہ دنیا بھی دیکھی ہوگی لیکن ایک بات یاد رکھنا! بچوں کو ذہنی مضبوطی دینے کا طریقہ یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ انہیں بہادری کا زبردستی اعزاز دیتے رہو۔ انہیں اپنی محبت اور اعتماد کا یقین بھی دلاتے رہنا چاہیے۔"

"میں سمجھ گئی ہوں قمر! زندگی نے آج مجھے بہت بڑا سبق دیا ہے۔"

"گڈ! آج سے اس سبق کو تین بار دہرانا۔ میں روزانہ تم سے سنا کروں گا۔" اس نے کسی سخت گیر استاد کا روپ اختیار کیا اور پھر شاہ میر سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"اب آپ اسکول سے کوئی چھٹی نہیں کریں گے۔ شہروز سے اس بارے کوئی ذکر بھی نہیں کرے گا۔ رومی ایک اچھی فیملی کا لڑکا ہے۔ اس سے ہونے والی غلطی کا یہ مطلب نہیں کہ اسے اچھوت بنا کر ہر رشتہ ہی ختم کر دیا جائے۔" قمر نے ایک عمومی معاشرتی رویے کو ذہن میں رکھتے ہوئے انہیں تنبیہ کی۔ "میں ابھی کچھ دیر پہلے رومی کی والدہ سے بھی مل کر آیا ہوں۔ اتفاق سے وہ آج گھر پر ہی تھیں۔ ان نفیس خاتون نے بھی اس معاملے کو مثبت انداز میں ہی حل کرنے کی یقین دہانی کروائی ہے۔"

"قمر! آج شہروز کو چھٹی ہوتے ہی گھر لے آنا بلکہ کل سے تم ہی ان دونوں کو اسکول سے لانے اور لے جانے کی ذمے داری اٹھالو۔ ایک، دو روز ہی کی بات ہے پھر دسمبر کی چھٹیوں کے لیے اسکول بند ہو جائیں گے۔ میں توقیر کی واپسی کے بعد ہی کسی نئے وین ڈرائیور کا بندوبست کر سکوں گی۔" نسرین نے پیشانی مسلتے ہوئے ایک نئی فرمائش داغ دی۔

"تمہاری ماں نے مجھے مصباح الحق سمجھ لیا ہے بھانجے! ہر ذمے داری میرے کاندھوں پر ڈالتی جا رہی ہے جیسے میں مصباح کی طرح خاموشی سے بہترین انداز میں سب کچھ نبھا سکوں گا۔" وہ رنجیدگی سے کہنے لگا۔ نسرین کی ملتجی نظروں سے مجبور ہو کر اسے اقرار کرتے ہی بنی۔

☆☆☆

اس صبح کی طرح وہ رات بھی بہت بے یقین اور ہنگامہ خیز تھی۔

گزشتہ رات قمر کو اپنا کام ادھورا چھوڑ کر اسپتال روانہ ہونا پڑا تھا۔ دیگر دوستوں نے بہرحال کامیاب وقت گزارا تھا۔ انہوں نے کسی معمول کی طرح چھ بجے ہی مائیکل کے گیراج میں رکھا سامان سڑک پر ترتیب سے لگا دیا۔

"کل کوئی شکایات وغیرہ آئیں کہ نہیں؟" قمر نے اپنی کرسی سنبھالتے ہوئے جنید سے پوچھا۔

"ہاں بالکل آئیں۔ ہم سب نے اپنا گیم پلان بنا لیا ہے۔ منیب اور قاسم بھاگ دوڑ والا یہ ڈیپارٹمنٹ سنبھالیں گے۔"

"اور میرے لائق کوئی سیوا؟" اس نے دلچسپی سے کہا۔

"تمہارے ذمّے تو سب سے مزیدار کام لگایا گیا ہے۔ اس علاقے میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اس خیال سے ووٹ دینے نہیں نکلتے کہ ان کے ایک ووٹ سے بھلا کیا فرق پڑ جائے گا۔ تم ہر روز ایک گھنٹا اس کالونی کے علاوہ دوسرے بلاکس میں بھی چکر لگا کر لوگوں کو ٹٹولنے کی کوشش کرو گے اور پھر غیر محسوس طریقے سے کسی لیکچر کے بغیر ان میں قومی ذمّے داری کا احساس پیدا کرو گے۔" جنید نے تفصیل سے بتایا۔

"ہمارے رشکِ قمر کے لیے یہ کام کیا مشکل ہوگا بھلا؟ اکثر لوگ تو اس کا چہرہ دیکھتے ہی بات ماننے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔" مائیکل نے شرارت سے کہا۔ اسی ہلکے پھلکے انداز میں دیگر ذمّے داریوں کے متعلق بات چیت کرتے ہوئے گھڑیاں گیارہ کے ہندسوں تک جا پہنچیں۔

"یار جونی! آج کھانے پینے کو کچھ ملے گا یا نہیں؟" منیب نے دہائی دی۔

"اچھا یاد کروایا بھئی۔ آ جاؤ میرے ساتھ ہی۔ مین آفس سے لے آتے ہیں کھانا۔"

ان دونوں کے جاتے ہی مائیکل بھی کسی کام سے گھر کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔ قمر نے وقت گزاری کے لیے موبائل تھام لیا۔ فیس بک کھولتے ہی دو گھنٹے قبل ملنے والے ایک میسیج نے اس کی تمام تر حسیات بیدار کر دیں۔ وہ بے یقین سی نظروں سے اس چند سطری پیغام میں پوشیدہ معنویت تلاش کرنے لگا۔

"السلام علیکم! آپ یقیناً یہی سوچ رہے ہوں گے کہ یہ کیسی لڑکی ہے جو کسی جان پہچان کے بغیر آپ کے اِن باکس میں چلی آئی ہے۔ سو پہلے میں اپنا تعارف کروا دوں۔ میرا نام ماریہ ہے۔ آپ کی کزن نسرین باجی سے بہت اچھے روابط ہیں۔ آپ سے کل دوپہر ہی ملاقات بھی ہوئی تھی لیکن اس وقت آپ بہت الجھے ہوئے اور کسی عجلت میں دکھائی دے رہے تھے اس لیے غور ہی نہیں کیا ہوگا۔ اینی ہاؤ! مجھے اسلم کے متعلق شکریہ ادا کرنا تھا۔ آج صبح جو بھی ہنگامہ ہوا، اس کے بعد کالونی کے سبھی لوگ ایک بار تو اپنے بچوں پر نظر رکھنے کے لیے سوچنے پر ضرور مجبور ہوں گے اور یہ بہت اچھی بات بھی ہے۔ میرا بھتیجا حمزہ بھی روی کا بہت اچھا دوست ہے۔ بھائی نے اسے اپنے مخصوص انداز میں ٹٹولا تو علم ہوا کہ وہ کسی نہ کسی حد تک شاہ میر اور روی کے مسائل سے باخبر ہو چکا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اسلم نے ان سے موبائل اور پیسے لیے ہیں۔ حمزہ نے یہ بھی بتایا ہے کہ اسے ڈرائیور انکل کی اسموکنگ اور مذاق مذاق میں ہاتھ اٹھا کے جسم کو چھونے کے طور طریقے بھی سخت ناپسند تھے۔ یہ سب جان کر اہلِ خانہ کے دل پر جو بیتی ہے اس کا اندازہ شاید آپ ہی لگا سکتے ہیں۔ آج کل کی یہ نسل ہماری غیر ذمّے داریوں سے بہت غلط سمت میں جا رہی ہے...... میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گی۔ میرے بارے میں کوئی بھی غلط رائے قائم نہ کیجیے گا۔ ہم تہ دل سے آپ کے شکرگزار ہیں۔"

قمر نے یہ پیغام بیسیوں مرتبہ پڑھا لیکن طبیعت سیر ہو کے ہی نہ دے رہی تھی۔ اس کے دل و دماغ میں ہیجانی کیفیت برپا تھی۔ من چاہی عورت کا رابطہ میں پہل کرنے کا نشہ اس کی مردانگی کو بھرپور تسکین دے رہا تھا۔

"آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ کیسی لڑکی ہے جو کسی جان پہچان کے بغیر آپ کے اِن باکس میں چلی آئی ہے۔" اس کے ذہن میں یہ الفاظ ماریہ کے صوتی آہنگ میں گونجے۔

"اس وقت آپ عجلت میں تھے اس لیے غور ہی نہیں کیا ہوگا۔" اس کی آواز نے ایک بار پھر سماعت کو اپنے حصار میں لیا۔

"غور...... آج رابطہ تو ہو ہی گیا۔ کسی دن تمہیں یہ بھی ضرور بتاؤں گا کہ کل تم نے جو چادر لے رکھی تھی، اس میں پھول کی پتیاں کتنی تعداد میں تھیں۔" خود ساختہ سوال و جواب کا یہ سلسلہ مزید طویل ہوتا لیکن اسی وقت منیب نے اس کا کندھا ہلاتے ہوئے کہا۔

"کدھر گم ہو گیا بھئی؟ دو بار کھانے کے لیے کہہ چکا ہوں تمہیں۔" قمر نے بے دھیانی سے پلیٹ تھامی اور چھوٹے چھوٹے لقمے لینے لگا۔

"تم نے آج واقعی دلیری دکھائی ہے قمر!" جنید نے لیگ پیس کے ریشے الگ کرتے ہوئے کہا۔ "کچھ علم ہوا کہ وہ روی کو بلیک میل کیوں کرتا تھا؟"

"نہیں یار! میں نے زیادہ کُریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ یہ معاملہ اس کی فیملی ہی دیکھے تو بہتر ہے۔"

"تمہیں شک کیسے ہوا تھا اس پر؟ کہیں ہوا میں تو تیر نہیں چلایا۔" قاسم بھی اس کی 'بے خبری' کی کیفیت میں اپنا کام نمٹا کے واپس آ چکا تھا اور اب نہایت اہتمام سے لبالب پلیٹ بھر کے بریانی سے مکمل انصاف کر رہا تھا۔

"پتا نہیں! بس یہ چھٹی حس کا کمال سمجھ لو۔ اس وقت مجھے وہ بچہ بہت خوفزدہ سا محسوس ہوا تھا۔ اسلم نے جس طرح جھپٹتے ہوئے مڑا تڑا نوٹ تھام کر اپنی جیب میں منتقل کیا تھا،

مجھے کسی گہری گڑبڑ کا احساس ہوا۔ اگر وہ وین کی فیس تھی تو اصولی طور پر گن کر اطمینان سے اپنے پاس رکھتا۔ مجھے خود بھی سمجھ نہیں آئی کہ میں کیوں 'اوور ری ایکٹ' کرتا چلا گیا۔" قمر نے دانستہ طور پر احساسِ شرمندگی ظاہر کی۔ وہ کسی بھی طرح دونوں لڑکوں کا بھرم برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ اس مرحلے پر اگر وہ جوش وخروش یا کسی تفاخر کا مظاہرہ کرتا تو اس کی ذاتی رنجش یا عناد کی خبریں کالونی بھر میں زبان زدِ عام ہو جاتیں اور ایسا وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا۔

"اسلم کا ماضی بھی اس معاملے میں بہت شاندار رہا ہے۔ یہ تو کالونی کے لوگوں نے ایک موقع دینے کا سوچتے ہوئے اسکول وین کے لیے تعاون کر دیا ورنہ پاشا کی بیٹھک میں چرس بیچتے ہوئے گرفتار بھی ہو چکا ہے ایک بار۔" مائیکل نے منہ بنایا۔

"تم نے اچھا ہی کیا قمر! مجھے تو یہ شخص ویسے بھی ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ اب کالونی والے خود ہی اپنے فیصلے کا نتیجہ دیکھ لیں گے۔" قاسم نے سراہا۔ قمر اُن کی باتوں کا ہوں، ہاں میں جواب دیتا رہا۔ وہ ذہنی طور پر ماریہ ہی کے پیغام میں مقید تھا۔ اسے بہترین اور مہذب ترین انداز میں جواب دینے کے لیے الفاظ کا چناؤ قمر کے لیے بہت بڑا امتحان تھا۔ اس نے کسی نہ کسی طرح کھانا ختم کیا اور اپنی مخصوص عادت کے مطابق 'اردو کی بورڈ' کا انتخاب کرتے ہوئے لکھنے لگا۔

"وعلیکم السلام امیرا بے ساختہ اور غیر ارادی ردِعمل اگر آپ کے لیے یا اس کالونی کے افراد کے لیے مددگار ثابت ہوا ہے تو یہ میری خوش قسمتی ہے۔ آئندہ بھی خدانخواستہ کوئی ایسا موقع آیا تو میں سب سے پہلے آگے کھڑا ہوں گا۔ برائی کو برا کہنا، اس کی اصلاح کا حوصلہ وہمت ہونا آپ کے ایک بہترین انسان ہونے کی دلیل ہے۔ اس بنا پر میں خود کو آپ کی عزت وتکریم پر مجبور پاتا ہوں۔" اس نے دانستہ طور پر کسی بھی ذاتی بات چیت سے گریز کرتے ہوئے برقی 'کبوتر' کو اس کی مقناطیسی پرواز کے ذریعے پیغام لے جانے کا اشارہ دے دیا۔

ماریہ کو بھیجا جانے والا یہ پیغام نصف گھنٹے بعد ہی دیکھ لیا گیا۔ قمر کا دل شدت سے چاہ رہا تھا کہ وہ مزید بھی کوئی بات کرے لیکن اس خواہش پر بند باندھنے میں ہی عافیت تھی۔ اپنا ذہن بٹانے کے لیے وہ دوستوں کے ساتھ 'کارڈز' کھیلنے میں مصروف ہو گیا۔ دل ودماغ ہنوز اسی آرزو کے تابع تھے۔ وہ بے اختیار موبائل تھامتا اور کسی نئے پیغام کی آس میں، کتاب چہرہ، کھول لیتا۔ اس کی حرکات غیر ارادی اور اضطراری تھیں۔ اس لاحاصل انتظار کی لذت میں گرفتار قمر کو اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ ان کی سیاسی پارٹی کے منشور، وہاں موجود افراد کے خلوصِ نیت کو سراہتے ماجد نے اس کے موبائل کا پاسورڈ ذہن نشین کر لیا ہے۔ تقدیر بہت جلد اسے مختلف محاذوں پر گھیرنے کی تیاریاں کرتے آستینیں چڑھا چکی تھی۔

☆☆☆

اس شب گہما گہمی کا خاتمہ دو بجے ہوا تو وہ بھی تھکن سے چُور تھے۔

مائیکل کے ساتھ گیراج میں سامان منتقل کرتے قمر کو بھی ایک بھرپور نیند کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ گھر پہنچتے ہی وہ بستر پر گر کر ہوش وحواس سے بے گانہ ہو گیا۔

"قمر! اٹھ بھی جاؤ...... کب سے آوازیں دے رہی ہوں تمہیں۔" اس کی سماعت میں نسرین کی آواز پڑی۔

"ایک تو ہمارے پڑوسی ملک کے وزیروں کی طرح تمہیں بھی معصوم عوام کا چین اور سکون برداشت نہیں ہوتا۔ فوراً سرجیکل اسٹرائیک کرنے چلی آتی ہو۔" اس نے بیزاری سے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔

"ساڑھے سات ہو گئے ہیں۔ تم نے خود ہی تو کل شام بچوں کو اسکول لانے، لے جانے کی ہامی بھری تھی۔"

قمر نے بادلِ ناخواستہ بستر چھوڑا اور چہرے پر پانی کے ایک دو چھینٹے مارتے ہوئے بالوں میں الٹی سیدھی کنگھی کر کے باہر نکل آیا۔ نیند کی کمی اور سر درد نے اسے کوفت میں مبتلا کر رکھا تھا۔ بوجھل آنکھوں کو بمشکل کھولتے ہوئے اس نے بائیک سڑک پر نکالی۔ اسی لمحے فائل اور بیگ تھامے ماریہ نظر آئی تو اس کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ بے اختیار بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ ماریہ کی آنکھوں میں بھی قمر کو دیکھ کر ایک واضح چمک پیدا ہوئی تھی۔ وہ سر جھکائے خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔ قمر کی نظریں مسلسل اس کے تعاقب میں تھیں۔

"بس کر دیں ماموں! اب کیا کالج تک چھوڑ کر آئیں گے انہیں؟" شہروز نے بائیک کی نشست سنبھالتے ہوئے کہا۔

"اوئے لکڑی کے باندر! زیادہ شوخا مت بن!" قمر نے ذرا سنجیدگی دکھائی اور شاہ میر کے بیٹھتے ہی بائیک چلا دی۔

شہروز اور شاہ میر کا کیمپس ہی نہیں بلکہ چھٹی کے اوقات بھی مختلف تھے۔ شہروز کو چھوڑنے کے بعد شاہ میر کے

اسکول کے سامنے بائیک روکی تو وہ اندر جانے کے بجائے وہیں رک گیا۔ اس کے چہرے پر ہچکچاہٹ کے تاثرات تھے۔ وہ سست قدموں سے چلتا قمر کے پاس آیا اور دھیرے سے بولا۔

”آپ بہت اچھے ہیں ماموں! بس جلدی سے کوئی جاب کر لیں پھر پاپا آپ سے کبھی ناراض نہیں ہوں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ہمیشہ ہمارے ساتھ ہی رہیں۔“ وہ قمر کے رخسار کا بوسہ لے کر تیزی سے واپس مڑ گیا۔ اس کے الفاظ میں پوشیدہ مفہوم وہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ دل پر یکدم ہی بوجھ در آیا۔ آنکھوں کی بڑھتی تپش پر قابو پاتے ہوئے وہ گھر چلا آیا۔

☆☆☆

سیٹھ سلیم کا مزاج قدرے الجھا ہوا تھا۔ اسٹور تک کا رستہ اس نے بہت خاموشی سے گزارا۔ اس کے چہرے پر کسی شدید کشمکش کے آثار بھی واضح تھے۔

”میں ڈیڑھ ہفتے کے لیے لندن جا رہا ہوں۔ مسز کی کچھ میڈیکل رپورٹس اچھی نہیں آئیں۔ اسٹور کے معاملات شمشیر سنبھال لے گا۔“ اس نے خاموشی توڑتے ہوئے اپنے برادر نسبتی کا حوالہ دیا۔

”لیکن سر وہ......“ ماجد نے حیرانی سے اپنے مشترکہ پراجیکٹ کے متعلق بات کرنی چاہی۔

”اس سلسلے کو یہیں وائنڈ اَپ کر دو۔ کل رات ’پارٹی‘ سے میری بات چیت ہو گئی ہے۔ ان کا ٹارگٹ انہی ’ٹرپس‘ میں پورا ہو چکا ہے۔ وہ رزلٹ کے لیے مزید انتظار نہیں کر سکتے۔ ان سے میری اگلی ملاقات لندن میں ہی ہو گی۔ وہیں پر واپس آ کر فائنل رزلٹ دیکھنے کی میٹنگ ہو گی۔ پیمنٹ ہمیں یہیں آ کر کی جائے گی۔“ سلیم نے تفصیل سے بتایا۔

ماجد کا چہرہ فق ہونے لگا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ سلیم کا یہ پروگرام اس قدر تیزی سے تبدیل ہو جائے گا۔ ماجد کے وجود میں طیش کی لہریں ہلکورے لینے لگیں۔ اپنا مطلب پورا ہوتے ہی اس نے کس قدر آسانی سے ماجد کی ’ضروریات‘ کو فراموش کر دیا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اسے کم از کم ایسے تین ٹرپس کی ضرورت تھی۔ ماجد کو قمر کے متعلق اس کی عدم دلچسپی دیکھ کر ہی اچنبھا ہوا تھا۔ غالباً یہ فتور اسی وقت سلیم کے ذہن میں پرورش پانے لگا تھا۔

”آج سہ پہر چار بجے میری فلائٹ ہے۔ اس کے بعد واپسی تک تم آف کرنا۔ شمشیر اپنے معاملات خود ہی دیکھتا رہے گا۔“ وہ بے نیازی سے کہتا اپنے لیپ ٹاپ پر مصروف ہو گیا۔ اس کا یہ رویہ ماجد کو مزید غصے میں مبتلا کر رہا تھا۔

”بڑے لوگوں کی باتیں یونہی چھوٹی ہوتی ہیں۔“ اس نے تنفر سے سوچا۔ ”انسانوں کو کسی ٹشو پیپر کی طرح استعمال کرتے ہیں اور اپنا مطلب پورا ہو جانے پر آنکھیں پیشانی پر رکھ لیتے ہیں۔ جہنم میں جائے یہ! میں خود ہی اپنا کام مکمل کر لوں گا۔ یہ سلسلہ ادھورا چھوڑ دینے میں میرا کتنا نقصان ہے یہ مردود جانتے ہوئے بھی انجان بن رہا ہے۔ بیوی کی بیماری تو بہانہ ہی ہو گی۔ کرسمس اور نیو ایئر کے لیے عیاشی کرنے لندن جانا ہو گا اِسے۔“ اس کے ذہن پر منفی سوچیں غالب آ چکی تھیں۔

سلیم کو تین بجے ہوائی اڈے پر چھوڑنے کے بعد اس نے گاڑی سیٹھ کے گھر چھوڑی۔ اپنے حالیہ طے شدہ منصوبے کے مطابق مخصوص خریداری کرتے ہوئے امتیاز سے رابطہ کر لیا۔ فرحان کی طبیعت قدرے سنبھل چکی تھی لیکن وہ ہنوز امتیاز ہی کے پاس قیام پذیر تھا۔

امتیاز کے فلیٹ تک پہنچتے ہوئے وہ اپنے چہرے کے زاویے اور پیشانی کی سلوٹیں درست کر چکا تھا۔ دستک کے بعد دروازہ حسب توقع امتیاز ہی نے کھولا۔ فرحان بھی وہیں ایک جانب بستر پر نیم دراز تھا۔

”کیسی طبیعت ہے اب ہیروئن کی؟“ اس نے بے تکلفی سے کہا۔

”اب تو بہت بہتر ہوں استاد۔“ وہ جھینپ کر بولا۔

”یہ تو بہت اچھا شگون ہے پھر!“ ماجد مسکرایا۔ ”آج کا جام تیری صحت کے نام۔“ اس نے خاکی لفافے میں لپٹی ایک بوتل نکالتے ہوئے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ فرحان کی آنکھیں جوش سے چمکنے لگیں۔

”جیو استاد! آج تو موسم کی مہربانی سے اس کی طلب بہت شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔“ اس کے بدن میں یکدم ہی پھرتی پیدا ہوئی۔

”ارے واہ! آج تو ہیروئن نے پورے جملے میں انگریزی کے کسی لفظ کا تڑکا نہیں لگایا۔“ ماجد نے ستائشی انداز میں کہا۔ امتیاز اس کے تیور دیکھ کر الجھنے لگا تاہم خاموشی سے تین گلاس لا کر چھوٹی سی تپائی پر رکھ دیے۔

”لگتا ہے آج پھر کسی نئے ٹرپ کا پلان لے کر آئے ہیں آپ۔“ فرحان کے اعصاب میں تناؤ پیدا ہونے لگا۔

”ہاں! تین بار کے بعد میں خود ہی یہ کام ختم کر دوں گا۔ اس دفعہ ہر چکر کے پچاس ہزار روپے ملیں گے لیکن کام ختم ہونے کے بعد۔“ ماجد نے صاف گوئی سے کہا۔ سلیم کی

UrduBooks.pk

روانگی کے بعد اس نے ذاتی حیثیت میں یہ معاملہ نمٹانے کا فیصلہ کیا تھا۔ دونوں کے لیے ایک لاکھ معاوضے کا بندوبست بلاشبہ بہت زیادہ اور مشکل ہدف تھا۔ اس ضمن میں ماجد کی تمام تر امیدیں سلیم کی لندن سے واپسی کے بعد اسے ملنے والے بقایاجات سے ہی وابستہ تھیں۔

''میں کل تک ریکی مکمل کرلوں گا۔ اس دفعہ زیادہ تاخیر کی گنجائش ہی نہیں۔ ہم تیئس دسمبر کی رات گیارہ بجے روانہ ہوں گے۔''

''ٹھیک ہے استاد! ہم تیار ملیں گے۔'' فرحان نے اپنے گلاس میں مزید مشروب انڈیلتے ہوئے کہا۔ امتیاز حیرانی و بے یقینی کی کیفیت میں اسے دیکھ کر رہ گیا۔ اس مہم کی کچھ جزئیات طے کرنے کے بعد ماجد نے واپسی کی راہ لی تو امتیاز نے فرحان کے لتّے لینے شروع کردیے۔

''تو کیا شے ہے یار؟! ابھی کچھ دن پہلے میرے سامنے بھکاریوں کی طرح رو کر اس دھندے سے جان چھڑوانے کے لیے بین کررہا تھا۔ اور اب......''

''لالچ نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر ماجد کے ساتھ کام کرنے کے لیے اکسایا تھا تو! مجھے اعتراف ہے کہ میں اس معاملے میں بہت بزدل ثابت ہوا لیکن پریکٹیکل ہو کے سوچوں تو اب کوئی رستہ بھی کہاں نظر آتا ہے؟'' وہ بے بسی سے بولا۔

''صحیح کہہ رہا ہے۔ یہ کام دیکھنے میں بہت آسان لگتا تھا لیکن میرا ابھی دل اوب گیا ہے۔'' امتیاز نے بھی لاچاری سے جواب دیا۔

''ہم اپنے حصے کا پیسہ لے کر اس شہر سے دور چلے جائیں گے۔ استاد خود اپنی زبان سے کہہ چکا ہے کہ تین ٹرپس ہی رہ گئے ہیں۔'' فرحان پُراُمید تھا۔

''ہاں! کسی چھوٹے موٹے کاروبار میں پیسہ لگا کر شادی وادی کا پروگرام بنائیں گے اور درجن بھر بچے پیدا کریں گے۔'' امتیاز کے حواس پر نشہ غالب آنے لگا۔

''ڈن ہوگیا جگر! بس اب اس آوارگی بھری زندگی کو تین مشکل دنوں کے بعد ایک شاندار فیئرویل پارٹی دیں گے اور شادی کی صورت میں شرافت کا لائسنس حاصل کرلیں گے۔'' فرحان بھی اپنے ہوش کھونے لگا۔ الٹی سیدھی ہانکتے ہوئے وہ چند ہی لمحوں میں اتنا کنفیوز ہوگئے۔

☆☆☆

''کب واپس آنا ہے تمہارے مجازی خدا نے؟'' قمر نے ناشتے کی میز پر نسرین سے دریافت کیا۔

''کل رات بات ہوئی تھی اُن سے۔ بتا رہے تھے کہ پاؤں میں موچ آنے کی وجہ سے سفر سے گریز کررہے ہیں۔ شاید آج رات یا کل صبح تک پہنچ جائیں گھر۔'' نسرین نے تفصیل سے بتایا۔

''اس کے آتے ہی پہلی فرصت میں بچوں کے متعلق بہترین فیصلہ کرنا۔ میرے خیال میں ان کا اسکول اتنی دور نہیں ہے کہ وین کے جھنجٹ پالے جائیں۔ وہ سائیکلز پر کالونی میں 'ون وہیلنگ' کرسکتے ہیں تو اسکول کیوں نہیں جا سکتے؟'' قمر خلاف عادت سنجیدگی سے بولا۔

''ایسا ہی کروں گی۔ میں تو دعا بھی مانگ رہی ہوں کہ جلد از جلد یہ چھٹیاں ختم ہوں اور دونوں جِن بوتل میں قید ہوں۔'' نسرین کی لاچاری اپنے عروج پر تھی۔

معمولاتِ زندگی میں تبدیلی نے سب ہی کو ایک انوکھی کیفیت میں مبتلا کر رکھا تھا۔ دسمبر کے آخری عشرے کا آغاز ہوتے ہی اسکولز، کالجز میں تعطیلات کا اعلان کردیا گیا تھا۔ بچوں کے لیے بھی راوی شوخیاں و شرارتیں لکھنے لگا تھا۔ قمر نمازِ فجر کے بعد گھر لوٹتا اور دوپہر ڈھلنے تک آرام کرتا۔ شام ہوتے ہی کالونی میں چہل پہل شروع ہوجاتی۔ الیکشن میں اب کچھ ہی روز باقی تھے۔ سیاسی بخار نے ہر ایک کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

نسرین سے اسی بارے میں گفتگو کرتے ہوئے اس نے ناشتا ختم کیا ہی تھا کہ گھنٹی کی آواز نے ماحول میں ارتعاش پیدا کردیا۔ قمر انگلیاں چٹخاتے ہوئے دروازے کی جانب بڑھ گیا جہاں پاشا نہایت درشت تاثرات لیے کھڑا تھا۔ اس کے عقب میں پستہ قد اور مخنی جسامت کا حامل ایک رکشا ڈرائیور عاطف موجود تھا جس کی بابت قمر کو گزشتہ رات ہی علم ہوا تھا کہ وہ اسلم کا بھائی ہے۔

''خیریت پاشا بھائی! مجھے بلا لیا ہوتا۔'' اس نے شائستگی سے کہا۔

''اپنی یہ ڈونگی بند کردے قمر! تو شاید اس محلے کا دادا بننا چاہتا ہے لیکن میرے ہوتے ہوئے ایسا کبھی نہیں ہوگا۔'' پاشا نے کف اڑایا۔

''آپ شوق سے یہ عہدہ سنبھالے رکھو یار! چاہو تو کالونی میں اشتہار لگوا دو کہ آئندہ آپ کو دادا اور عاطف کو دادی بلایا جائے۔ مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے بھلا۔''

''پاشا بھائی! جب سے یہ اس علاقے میں آیا ہے یہاں کا ماحول ہی بدل کر رہ گیا ہے۔'' عاطف نے اپنی باریک آواز میں کہا۔

"صحیح کہہ رہا ہے۔ دیکھ قمر! تمہارے لونڈوں نے کل رات میری پارٹی کے بینرز پھاڑ کر فلیکس پر عجیب و غریب داڑھی مونچھیں بنا دی ہیں۔ یہ سبق یقیناً تو نے ہی انہیں پڑھایا ہوگا۔" پاشا نے نتھنے پھلائے۔

"نہیں پیارے بھائی! میں اتنا بڑا استاد نہیں ہوں۔ یہ سبق اگر میں نے پڑھایا ہوتا تو آپ کے فلیکسز پر براجمان افراد کے ناک، کان اور گلے میں زیورات بنا کر انہیں چنریا بھی اوڑھوا دیتا۔" قمر نے دوبدو جواب دیا۔

"اب کے یہ بھی کر کے دیکھ لینا! پھر تیرے ساتھ جو تماشا ہوگا، وہ ساری کالونی دیکھے گی۔" عاطف نے اپنی مخنثی آواز میں رعب پیدا کرنے کی کوشش کی۔

"ڈن ہو گیا استاد جی! الیکشن کے روز جیت کا اعلان ہوتے ہی میں ایسا دھماکا کروں گا کہ کالونی کا ہر فرد واش اش کر کے کہے گا۔ ہائے اللہ! قمر تم پہلے کیوں نہ آئے یہاں!" قمر نے اسی کے لب و لہجے کی نقالی کرتے ہوئے باریک ترین آواز میں جواب دیا۔ وہ دونوں تن فن کرتے واپس گئے تو قمر نے غصے سے ہونٹ بھینچ لیے۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ حرکت کس کی ہے۔ نسرین بھی اس صورتِ حال سے آگاہی پر خاصی تشویش زدہ تھی۔ دونوں بچوں کی کلاس لینے کے بعد اس نے کسی خیال کے تحت موبائل نکالا اور ماریہ کو ایک مختصر پیغام لکھ بھیجا۔

"ڈسٹرب کرنے کے لیے آپ سے معذرت چاہتا ہوں لیکن اس وقت معاملہ ایسا تھا کہ آپ کے علم میں لانا بہت ضروری ہے۔"

"اٹس او کے! آپ کو کسی بھی وضاحت کی ضرورت نہیں۔" ماریہ آن لائن ہی تھی اس لیے فوری جواب دے دیا۔ "سب خیریت تو ہے ناں؟"

"نہیں! کل رات حمزہ نے اپنے چھوٹو گینگ کے ساتھ مل کر پاشا کے دفتر کے باہر فلیکس وغیرہ کو کافی نقصان پہنچایا ہے۔ وہ خاصا بدلحاظ آدمی ہے۔ ہماری پارٹی کی مقبولیت سے ویسے ہی بھرا بیٹھا ہے۔ ابھی جھگڑنے کے لیے آ گیا تھا۔ میں نے یہاں تو دونوں کو سمجھا دیا ہے۔ آپ حمزہ کو بھی ذاتی طور پر ایسی حرکتوں سے منع کر دیجیے گا۔" قمر نے تفصیلی جواب دیا۔

"اوہ! یہ تو بہت نامناسب حرکت کی ان بچوں نے۔"

"جی ہاں! میں یہ بات آپ کے بھائی جاوید سے بھی کر سکتا تھا لیکن وہ مزاجاً بہت تیز ہیں۔ خواہ مخواہ حمزہ کے درپے ہو جاتے۔" قمر اس سے بات چیت میں بہت محظوظ ہو رہا تھا۔

"آپ نے بہت اچھا کیا جو مجھے اعتماد میں لے لیا۔ میں اس مسئلے کو جلد از جلد حل کر لوں گی۔" ماریہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تو قمر کو اپنے وجود میں خواہ مخواہ گدگدی ہوتی محسوس ہونے لگی۔ "ویسے آپ بہت کم عرصے میں اس علاقے کے مزاج آشنا ہو گئے ہیں۔" اس کے اگلے پیغام پر وہ مسکرا اٹھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ ماریہ بھی کچھ دیر اس گفتگو کو طول دینا چاہتی ہے۔

"نسرین آپ کے سب گھر والوں کی بہت تعریف کرتی ہے۔ اس لیے مجھے اندازہ ہو ہی گیا بس۔"

"نسرین باجی آپ کے احساسِ ذمے داری سے بھی بہت متاثر ہیں۔ آج کل تو آپ نے پارٹی ورکنگ میں بھی خوب جھنڈے گاڑ لیے ہیں۔"

"پارٹی کے متعلق کوئی بھی بات کرنے سے پہلے اتنا بتا دیجیے کہ آپ کس کی سپورٹر ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری محنت مجھے آپ کی بلیک لسٹ میں پہنچا دے۔" اس نے خوفزدہ اسمائل بھیجی۔

"فکر نہ کریں۔ میرا تعلق بھی آپ ہی کے قبیلے سے ہے۔" اس نے بھرپور ہنسی کے ساتھ جواب دیا۔ قمر کے اعصاب پُرسکون ہو گئے۔ یہ بات چیت بلاتعطل جاری رہی۔ موضوعِ گفتگو سیاست، علاقائی صورتِ حال، کالجز میں نظامِ تعلیم کے بعد ذاتی پسند ناپسند پر کس طرح منتقل ہوا انہیں خود بھی علم نہ ہو سکا۔ ایک طاقتور مقناطیسی رو تھی جو انہیں اپنے ساتھ بہائے لے جا رہی تھی۔ تین گھنٹے سے زائد ہونے والی اس چیٹنگ کے بعد تکلفات کے پردے چاک ہو گئے۔ قمر کی باقاعدہ دوستی کا پیغام بھی بخوشی قبول کر لیا گیا۔ اس روز انہیں کائنات کی ہر شے حسین معلوم ہو رہی تھی۔

☆☆☆

فرحان حسبِ سابق دوپہر ایک بجے امتیاز کی آمد پر بیدار ہوا۔ اس کے منہ میں شدید کڑواہٹ گھلی تھی۔

"بوتل لایا ہے کہ نہیں؟" اس نے ٹوٹتے بدن کو دباتے ہوئے کہا۔

"لے آیا ہوں۔ تُو نے کل رات بھی ضرورت سے زیادہ چڑھا لی تھی۔ اب پھر سے شروع نہ ہو جانا۔" امتیاز نے اسے گھرکا۔

"یہ میرے لیے پیٹرول ہے یار! اس کے بغیر اب کام ہو ہی نہیں سکتا۔" فرحان نے جھومتے ہوئے جواب دیا۔ کل رات انہیں پھر سے وہی امتحان درپیش تھا۔ نئی زندگی میں قدم رکھنے کے لیے طے شدہ منصوبے پر سختی سے عمل درآمد بہت ضروری تھا۔ اس کے ذہن میں ایک نیا خیال سر اٹھانے

لگا۔

"اب کس سوچ میں کھو گیا ہے؟" امتیاز نے اس کے سامنے چٹکی بجائی۔

"میں یہ سوچ رہا ہوں متو! ہم نے اس دلدل سے نکلنے کا ارادہ تو کرلیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ہماری وجہ سے کسی کی زندگی بھی سدھر جائے۔"

"تمہارا اشارہ کہیں روزی کی طرف تو نہیں؟" وہ اس کا مدعا بھانپ گیا۔

"ہاں! اس نے مشکل وقت میں میرا بہت ساتھ دیا ہے۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" اس صاف گوئی پر امتیاز دنگ رہ گیا۔

"تو اس وقت بہت نشے میں ہے۔ اس فیصلے میں اتنی جلدی مت کر۔ ویسے بھی وہ عمر میں تجھ سے بڑی ہے۔"

"تو کیا فرق پڑتا ہے؟ تبدیلی کے معاملے میں ایسی کسی بھی عورت کی قوت ارادی بہت مضبوط ہوتی ہے جو گناہ چھوڑ کے صاف ستھری زندگی گزارنا چاہتی ہو۔ اگر میں اپنی نئی زندگی کے مدار میں بھٹک کر واپس لوٹنا بھی چاہوں تو وہ کسی چٹان کی طرح سہارا دے کر روک لے گی۔" فرحان اپنے فیصلے پر اٹل دکھائی دے رہا تھا۔

"جیسے تیری مرضی! میں پھر یہی کہوں گا کہ پینے کے معاملہ میں احتیاط برتنا اور شام کو میری طرف آجانا۔" وہ بڑے خلوص سے اسے ہدایات دیتا ہوا واپس چلا گیا۔ فرحان ہمت مجتمع کرتے ہوئے اٹھا اور ٹھنڈے پانی کے چھپاکے چہرے پر مارتا ہوا حواس بحال کرنے لگا۔ بالوں میں اچھی طرح کنگھی کرکے وہ روزی کے فلیٹ پر جا پہنچا۔

"آج تم کیسے رستہ بھول آئے یہاں؟" اس نے فرحان کو اندر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے شکوہ کیا۔ اپنی طبیعت کی خرابی کے بعد وہ مستقل طور پر امتیاز ہی کے ساتھ رہا تھا۔

"تم سے ایک بہت ضروری بات کرنے آیا ہوں۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔ روزی اس کے سامنے ہی کرسی پر براجمان تھی۔

"سوری! آج رات میری بکنگ ہے۔ میں نہیں آسکوں گی۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔

"مجھ سے شادی کرو گی روز!" فرحان نے دانستہ طور پر اس کا نام چاہت سے لیتے ہوئے کہا۔ روزی اس اچانک 'وار' پر دنگ رہ گئی۔ اس کے منہ میں دبا سگریٹ گود میں جا گرا۔

"یہ کیا مذاق ہے؟ میرے دھندے میں کوئی ہم سے شادی نہیں کرتا۔ لگتا ہے آج پھر تم نے ضرورت سے زیادہ پی لی ہے۔" وہ ناگواری سے بولی۔

"عورت چاہے عرش کی بلندی پر ہو یا پاتال کی گہرائی میں، اس کے دل سے لائف پارٹنر اور گھر کی تمنا کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ میں نئے سال کا آغاز ایک نئی زندگی سے کرنے والا ہوں جس میں تمہارا ساتھ مل جائے تو میری ہی بہتری ہے۔"

فرحان کے لہجے میں سادگی اور بے ساختگی تھی۔ روزی بے یقینی کے بحر میں غوطہ زن تھی۔ اس نے سات سال قبل اپنے گھر والوں کی مرضی کے خلاف شادی کرکے اپنی زندگی ایک دائمی عذاب میں مبتلا کرلی تھی۔ نکھٹو شوہر جواری اور شرابی تھا۔ ایسے ہی ایک جوئے کی محفل میں مخالف سے شکست کے بعد لڑائی مول لے کر جان کی بازی بھی ہار گیا۔ روزی کو ہر جانب گدھ ملے جو اسے جسم فروشی کے دھندے میں لے آئے۔

آج اتنے عرصے بعد اسے خود سے پانچ سال چھوٹا لڑکا ایک بار پھر وہی زندگی دینے کی بات کر رہا تھا جس کی تمنا لیے اس نے پہلی بار گھر چھوڑا تھا۔

"یہ اگر کوئی مذاق ہے فرحان تو نہایت بے ہودہ ہے۔" وہ اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

"نہیں! یہ کوئی مذاق نہیں ہے۔ تم آج اور ابھی سے میری ذمے داری ہو۔ کہیں کسی بکنگ پر جانے کا نام بھی مت لینا اب۔" اس نے جیب سے بڑی مالیت کے چند نوٹ نکالے۔ "میں کچھ روز کے لیے امتیاز کے ساتھ رہوں گا۔" وہ یکدم ہی بردبار مرد بن گیا۔

"لیکن فرحان...... ایسے کیسے بھلا؟" روزی کو اپنا دل پگھلتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

"میں چلتا ہوں اب۔ اگر مجھ سے نکاح منظور ہو تو اکتیس دسمبر کی شام اپنا جواب میرے فلیٹ پر خود آکر دینا۔ اس رات میں یہ علاقہ ہمیشہ کے لیے چھوڑنے والا ہوں۔ اور ایک بات مان لو پلیز! تمہارا جواب جو بھی ہو! اس دن تک اپنے دھندے کو بھول جاؤ۔ ایک عام عورت بن کے یہ فیصلہ کرنا۔" فرحان کی متانت اور سنجیدگی حد سے سوا تھی۔ روزی کا دل چاہا وہ اسی لمحے دھول بن کر اس کے قدموں میں بکھر جائے لیکن اتنی جلدی اقرار کرکے اپنی نسوانیت کا بھرم نہیں کھونا چاہتی تھی۔

"ٹھیک ہے! تم سے اکتیس دسمبر کی شام ہی ملاقات ہو گی۔" وہ ٹھہراؤ سے بولی۔ فرحان واپسی کے لیے دروازے تک پہنچا تو اس نے بے ساختہ صدا دی۔

”سنو فرحان!“

”کیا ہوا روز؟“ وہ حیرانی سے پلٹا۔

”اپنا خیال رکھنا پلیز! اور ڈرنک کم کردو۔“ روزی نے نظریں چُراتے ہوئے کہا۔ فرحان نے اس کے لہجے کی حدت شدت سے محسوس کی اور مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔

☆☆☆

توقیر کی آمد اس شام چار بجے کے قریب ہوئی تھی۔ نسرین نے خوشی اور گرمجوشی سے شوہر کا استقبال کیا۔ شوہر کی واپسی سے ملنے والی مسرت اپنی جگہ مسلم لیکن توقیر کی پیشانی پر نظر آتی سلوٹیں دیکھ کر اس کی چھٹی حس کسی نئے طوفان کی آمد کا عندیہ دے رہی تھی۔

”آپ کے پاؤں کی موچ کیسی ہے اب؟“ وہ محبت سے بولی۔

”ٹھیک ہے۔ قمر کہاں ہے اس وقت؟“ توقیر کے انداز میں غیر معمولی پن تھا۔

”سو رہا ہے۔ اصل میں اس نے نیا کام شروع کیا ہے تو......“ وہ فوراً وضاحت دینے لگی۔ شوہر کا سرد مزاج اور روکھا پھیکا انداز ہمیشہ ہی اس کا اعتماد ختم کردیتا تھا۔

”یہ کیسا کام ہے بھئی جس میں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔“ اس نے چائے کا کپ تھامتے ہوئے کہا۔

”سیدھی طرح بتاؤ ناں کہ غنڈا گردی کرنے لگا ہے اب وہ۔ کالونی کا دادا بن گیا ہے۔“ توقیر کی پھنکار پر نسرین یکدم ہراس میں مبتلا ہوگئی۔ اسے قمر اور اپنی سلامتی خطرے میں دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی تمام تر دعاؤں کے برعکس قمر بیدار ہوگیا۔

”بچے کہاں ہیں نسرین؟ انہوں نے میرے ساتھ ... سیلون پر کٹنگ کے لیے جانا تھا۔“ وہ بے دھیانی سے کہتا باہر چلا آیا۔

”بچوں کا باپ ابھی زندہ ہے۔ وہ ان کی ذمے داریاں خود اٹھا بھی سکتا ہے اور نبھا بھی سکتا ہے۔“ اس کا لہجہ شرربار تھا۔

”اللہ پاک آپ کو سلامت ہی رکھے۔“ قمر نے خلوص سے کہا۔ ”باپ تو اپنی اولاد کے لیے سائبان ہوتا ہے جس کی موجودگی ہی سے زندگی میں بہاریں سلامت رہ سکتی ہیں۔“ وہ توقیر کی ذہنی سطح اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ اس کا شمار معاشرے کے ان نوے فیصد افراد میں ہوتا تھا جو بیوی اور سسرالی رشتے داروں کو کبھی باعزت مقام نہیں دیا کرتے۔ ان کی ذہنی تربیت ہی اس طرح کی جاتی ہے کہ احساسِ برتری کا آسیب مقابل کی کوئی بھی اچھائی نظر آنے ہی نہیں دیتا۔

والدہ

سیلز گرل نے تھیلا درست کرکے گھر کی گھنٹی بجائی۔ چند لمحوں بعد دروازہ کھلا اور اٹھائیس تیس سال کی ایک فیشن زدہ سی خاتون نمودار ہوگئیں۔

سیلز گرل نے اپنی مہارت سے کام لیتے ہوئے پوچھا۔ ”بیٹی! آپ کی والدہ موجود ہیں؟“

خاتون کا چہرہ مسرت سے تمتما اٹھا، آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی۔ ”کیا کام ہے؟“

”ہماری کمپنی کا واشنگ پاؤڈر سب سے بہتر ہے۔ ہم رعایتی داموں پر گھر گھر پہنچا رہے ہیں۔“

خاتون نے فوراً دس پیکٹ خرید لیے۔ دام پوچھے بغیر!

شاہینہ اقبال کا لاہور سے تعاون

”لیکن کچھ لوگوں کو باپ کی موت سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ آوارہ گردی اور بے حیائی کے نئے ریکارڈ بناتے ہوئے مفت خوری کے لیے کسی نہ کسی بہن کے گھر چلے آتے ہیں۔“ توقیر کا زہریلا انداز مکمل جوبن پر تھا۔

”قمر! پلیز تم اندر چلے جاؤ۔“ نسرین نے التجا کی۔ وہ ان کی چپقلش کو کسی بھی طریقے سے روکنا چاہتی تھی۔

”اندر نہیں نسرین بی بی! اس شخص کو گھر سے ہمیشہ کے لیے جانے کا کہو۔ اس کی وجہ سے میرا بیٹا کالونی میں کسی کو منہ دکھانے لائق نہیں رہا۔“

”ایسا کچھ بھی نہیں ہے توقیر بھائی!“ قمر نے تیزی سے کہا۔ ”میں نے کسی بھی موقع پر شاہ میر کا نام نہیں لیا۔“

”بکواس بند کرو ذلیل کتے!“ توقیر نے آگے بڑھ کر اس کا گریبان تھام لیا۔ ”تمہیں کس نے حق دیا تھا کہ اسلم سے مار پیٹ کرو۔“

”قمر ٹھیک کہہ رہا ہے۔ آپ ایک بار اس کی بات تو سنیے۔ شاہ میر نے بھی خود اس بات کا اعتراف کیا ہے۔“ نسرین نے وضاحت دینی چاہی۔

”تمہاری زبان سے ایک لفظ بھی مزید نکلا تو میں تمہیں تین حرف کہہ کر اس کے ساتھ ہی نکال دوں گا۔“ وہ کچھ بھی

سننے کے لیے تیار ہی نہ تھا۔ قمر کے لیے اب وہاں ایک لمحے کا قیام بھی دشوار تھا۔ اس نے اپنے سلگتے جذبات پر بمشکل قابو پاتے ہوئے کپڑے، کاغذات اور ضروری سامان ایک بیگ میں ٹھونسا اور نسرین کے آنسوؤں سے نظریں چراتا باہر نکل آیا۔

”اپنا اور بچوں کا سامان باندھ لو! چھٹیاں ختم ہونے تک ہم آپا کے ساتھ رہیں گے۔ دفتر اور فوڈ پوائنٹ سے مزید چھٹیاں لے لی ہیں میں نے۔“ توقیر نے نیا حکم صادر کیا۔ نسرین بے بسی سے تعمیل کے لیے چل دی۔

☆☆☆

قمر ایک بار پھر گھر بدر ہو چکا تھا۔

اس کے ذہن میں آندھیاں رقصاں تھیں۔ احساسِ توہین، ذلت اور ناقدری نے اسے مایوسی میں مبتلا کر دیا۔ آج ایک بار پھر وہ خود کو اسی مقام پر کھڑا محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنا چھوٹا سا سفری بیگ تھامے گراؤنڈ میں چلا آیا۔ مشتعل جذبات پر قابو پاتے ہوئے اس نے انٹرنیٹ پر کالونی کے آس پاس ہاسٹلز کا اتا پتا تلاش کرنا شروع کر دیا۔

”فضول کوشش کر رہا ہے قمر!“ اس کے ذہن میں صدا ابھری۔ ”ہاسٹل تو بہت سے مل جائیں گے۔ کرایہ اور اخراجات کے پیسے کہاں سے لائے گا؟“ وہ بہت دیر تک وہیں بیٹھا اپنے نئے مسائل کا حل سوچتا رہا۔ ہر سوچ کی تان نوکری پر ہی آ کر ختم ہوتی۔ جھنجلاہٹ کے عالم میں اس نے جنید کو پیغام لکھا۔

”فارغ ہوتے ہی گراؤنڈ میں چلے آنا۔“

تھوڑی ہی دیر بعد جنید اور مائیکل اس کے پاس موجود تھے۔

”توقیر کے ساتھ کوئی نیا جھگڑا ہوا ہے کیا؟“ انہوں نے چھوٹتے ہی کہا۔

”نہیں! وہ تو بس......“ قمر عذر تلاشنے لگا۔ توقیر کی یہ حرکت اس کے تصور سے بھی بالاتر تھی۔

”موصوف تھوڑی دیر پہلے گھر لاکڈ کرتے ہوئے بیوی بچوں کے ساتھ کہیں روانہ ہوئے ہیں۔ جاتے ہوئے ہمسایوں کو تاکید کر کے گئے ہیں کہ اگر تمہیں گھر کے آس پاس بھی دیکھیں تو فوراً اسے اطلاع کریں۔“ جنید بولا۔ قمر کو ایک بار پھر کسی نے پاتال کی گہرائیوں میں لے جا پھینکا۔ شدتِ دکھ سے اس کی گویائی سلب ہو چکی تھی۔

”اگر ایسا کوئی مسئلہ ہے تو میرے گھر کے دروازے تیرے لیے کھلے ہیں تو جب تک چاہے میرے ساتھ رہ سکتا ہے۔“ مائیکل کی پیشکش پر اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ فیصلہ کرنا مشکل کیونکر ہوتا؟ اس کے پاس اور کوئی انتخاب ہی نہ تھا۔ اپنی رضامندی ظاہر کرتے ہوئے قمر کے پیشِ نظر جلد از جلد نوکری و علیحدہ رہائش کا مقصد تھا۔

☆☆☆

تئیس دسمبر کی اس رات تک فرحان نے خود کو مکمل طور پر شراب میں غرق کر لیا تھا۔

طے شدہ منصوبے کے مطابق وہ اپنے مخصوص مقام پر جا پہنچے جہاں ماجد سیاہ گاڑی لیے پہلے ہی ان کا منتظر تھا۔ فرحان اور امتیاز خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گئے۔

”میں نے تمہیں ان حرکتوں سے منع کیا تھا ہیروئن! کام کے دوران کوئی غیر ذمے داری نہیں چلے گی۔“ ماجد کی آواز میں سختی جھلکی۔

”سوری استاد! لیکن میں اس کے بغیر کام نہیں کر سکوں گا اور آج میں واقعی اس ٹرپ کے لیے بہت سیریس ہوں۔“ اس نے نرمی سے اپنا موقف سمجھایا۔

کچھ ہی دیر میں وہ اپنے مطلوبہ مقام تک پہنچ گئے۔ آہنی دروازہ حسبِ توقع نیم وا تھا۔ ماجد نے عقبی صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ کہیں بھی کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ اس نے تمام راستہ پندرہ منٹ پہلے ہی کلیئر کیا تھا لہٰذا وہ پُراعتماد تھا۔ اس دفعہ ہتھیار خود ماجد نے سنبھال رکھے تھے۔ امتیاز کے پاس ریگزین کا بڑا بیگ تھا۔ فرحان کو یہ جگہ کچھ شناسا معلوم ہو رہی تھی لیکن ذہن پر بہت زور دینے کے باوجود اسے کچھ یاد ہی نہ آ رہا تھا۔ نشے سے جھوجتے ذہن میں کوئی جگنو سا لپکتا اور گرفت میں آنے سے پہلے ہی معدوم ہو جاتا۔

اگلا نصف گھنٹا بہت مشکل تھا تاہم فرحان بہت سلیقے سے اپنی ذمے داریاں نبھاتا رہا۔ دسمبر کی اس سخت سردی میں بھی اس کی پیشانی اور ہتھیلیوں پر پسینے کی نمی تھی۔ کام مکمل کرتے ہی اس نے جیب سے چپٹی بوتل نکال کر آخری گھونٹ لیا اور ہانپتے ہوئے بوتل وہیں لڑھکا دی۔

”اسے وہاں سے اٹھاؤ بے وقوف! کسی قسم کا کوئی سراغ نہیں چھوڑنا یہاں۔“ ماجد نے کوفت سے کہا۔

”اپنی ٹارچ ذرا اس سائڈ پر کر لو استاد!“ وہ مخمور لہجے میں بولا۔ ماجد نے ٹارچ کا رخ تبدیل کر دیا۔ اگلے چند لمحے بہت ہولناک تھے۔ بوتل تھامتے ہوئے دکھائی دینے والا منظر اسے ساکت کر چکا تھا۔

”یہ...... کیا...... کر...... دیا...... میں...... نے؟ ایسا...... کیسے...... ہو...... سکتا...... ہے؟“ وہ شدید بے یقین

تھا۔ ماجد اس کی حالت سے بے نیاز امتیاز کو ریگزین کا بیگ مطلوبہ مقام تک پہنچانے کی ہدایات دینے لگا۔ فرحان چیخ چیخ کر اپنا کلیجا شق کر دینا چاہتا تھا لیکن نشہ اس قدر شدید تھا کہ الفاظ کی ادائیگی ممکن ہی نہیں ہو پا رہی تھی۔ بے یقینی پتھر کی کسی بھاری سل کی طرح سینے پر دھری سانس لینا بھی دشوار کر رہی تھی۔

”آج تو تم نے کمال کر دیا ہیروئن!“ ماجد نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اسے کھلے دل سے سراہا۔ ”تیری کارکردگی لاجواب رہی۔“

فرحان کا دل شدت سے چاہا کہ وہ ماجد کا نرخرہ ادھیڑ دے لیکن ایک بار پھر بے یقینی آڑے آ گئی۔ وہ اب بھی اپنی بصارت پر اعتبار ہی نہ کر پا رہا تھا کہ دیکھا گیا منظر حقیقت میں وہی تھا یا محض فریبِ نظر۔

”میں اتنی بڑی غلطی کیسے کر سکتا ہوں بھلا؟ وہ میرا وہم ہی ہو گا۔ میں نے جو دیکھا، اسے بالکل غلط سمجھا ہوں۔“ اس نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر خود کو پُرسکون کرنا چاہا۔

”ایک فیور کر دیں استاد! مجھے میرے فلیٹ تک پہنچا دیں آج۔“ اس نے بدقت تمام کہا۔ ذہن میں کسی برقی کوندے کی طرح اپنی کشمکش سے رہائی کا طریقہ لپکا تھا جس کے لیے وہ مکمل تنہائی چاہتا تھا۔ ماجد نے اسے رہائشی عمارت کے باہر اتار دیا۔ فرحان لڑکھڑاتے قدموں سے تنگ زینوں کی طرف بڑھا لیکن بے جان ہوتی ٹانگیں مزید سہارا دینے سے انکاری تھیں۔ وہ ایک جھٹکے سے وہیں ڈھے گیا۔ زینوں کے اکھڑے ہوئے سیمنٹ کی ٹھنڈک وجود میں گھومتی آتش کو سکون دینے لگی۔ اٹھنے کی کئی ناکام کوششوں کے بعد وہ الٹے رخ سے بیٹھے بیٹھے ہی اوپر بڑھنے لگا۔ اس کا دل بُری طرح متلا رہا تھا۔ سترہ سیڑھیوں کا فاصلہ طے کرتے اس نے تین مرتبہ قے کی۔ غلاظت کے چھینٹے اکھڑے سیمنٹ اور اس کی پینٹ کو بھی آلودہ کر چکے تھے۔ اپنے فلیٹ کے دروازے تک پہنچا وہ نڈھال ہو چکا تھا۔ کپکپاتے ہاتھوں سے دروازہ کھولتے ہوئے چابی کئی مرتبہ پھسل کر نیچے جا گری۔ ہانپتے کانپتے اندر بڑھ کر اس نے جیب سے موبائل نکالا اور ایک خصوصی فولڈر نکال کر چند تصویریں کھولے فرش پر ہی بیٹھ گیا۔ قے رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ وہ قیامت خیز لمحہ تھا۔ ماجد کے ساتھ دیکھا جانے والا نظارہ بدترین حقیقت بن کر اس کے سامنے موجود تھا۔

”لعنت ہے...... لعنت ہے مجھ پہ...... یہ میں نے کیا کر دیا؟ اللہ!...... یہ مجھ سے کیا ہو گیا۔“ وہ بچوں کی طرح بلکتا فرش پر لیٹے لیٹے رونے لگا۔ اسے اپنے وجود سے شدید کراہت محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ دیر اسی آہ و بکا میں گزر گئی۔ بے بسی اب طیش میں ڈھلنے لگی تھی۔ اس نے آنکھیں مسلتے ہوئے فون نکالا اور امتیاز کے نمبر پر ایک مختصر پیغام لکھ کر بھیج دیا۔ فون جیب میں ڈال کر وہ ایک نئے جذبے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا ماجد! تجھ جیسے خبیث انسان کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔“ وہ جیکٹ کی آستین سے چہرہ پونچھتے ہوئے بیرونی سمت بڑھنے لگا۔ اس کے سر پر خون سوار تھا۔ وہ خود موت سے بغلگیر ہونے یا ماجد کو نیست و نابود کر دینے کے جذبے سے لبریز تھا۔ دروازہ چند قدم ہی دور تھا کہ فرش پر بکھری حالیہ غلاظت سے اس کا پاؤں پھسل گیا۔ نشے سے ڈولتا وجود سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے اس کا توازن بری طرح بگڑا اور چشم زدن میں ہی وہ ایک جانب رکھی تپائی پر گرا۔ چھناکے کی زوردار آواز سے سر کے عقبی حصے میں جان لیوا درد نے اس پر نیم غشی طاری کر دی۔ گہرے سیال لہو کا بہاؤ آخری احساس تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا۔

☆☆☆

قمر اور اس کے سبھی دوست تھکاوٹ سے بے حال تھے۔ گزشتہ دو روز سے وہ بے پناہ مصروفیات میں گھرے ہوئے تھے۔ وقت گزاری اور معاشی سکون کے لیے شروع کیا جانے والا یہ کام کس وقت نظریاتی جنگ میں تبدیل ہوا، انہیں علم ہی نہ ہو سکا۔ اپنی کالونی کے علاوہ ملحقہ علاقے میں گھوم پھر کر لوگوں کے مسائل حل کرنے میں انہیں اپنا وجود بہت معتبر محسوس ہونے لگا۔ یہ ان کے اپنے لوگ تھے۔ سالوں سے جبر، استحصال اور مسائل کی چکی میں پستے ہوئے وہ حالات سے اس قدر ناامید ہو چکے تھے کہ ووٹ دینے کی اہمیت ہی فراموش ہو گئی تھی۔ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے پارٹی انتظامیہ نے تین رکنی گروہ بنایا جو ہر گھر میں جانے کے لیے مامور تھا۔ وہ خوش خلقی سے گھر کے سربراہ کا شناختی کارڈ طلب کر کے مخصوص نمبر پر میسج سے پولنگ اسٹیشن معلوم کرتے اور نہایت تہذیب و شائستگی سے انہیں قومی ذمے داری نبھانے کے لیے قائل کرنے لگتے۔

”ووٹ لازمی دیجیے گا سر! یہ آپ کا فرض اور ملک کا حق ہے۔“

”سر! ہم یہ نہیں کہتے کہ آپ ہماری ہی پارٹی پر نظرِ کرم

کریں۔ ووٹ جسے چاہیں دیں لیکن اپنی یہ امانت ضائع مت کیجیے گا۔'' جنید بھی خلوص سے کہتا۔

''بے فکر ہو جاؤ۔ ہم ووٹ ضرور دیں گے۔'' مقابل کا اصرار اور باڈی لینگویج میں تبدیلی انہیں سرشار کر دیتی۔ اس بھاگ دوڑ میں وہ بمشکل کھانے کے لیے وقت نکال پا رہے تھے۔

''تم نے آج صبح ہلکا سا ناشتا کیا تھا قمر! اب تو کچھ کھا لے۔'' مائیکل نے سنجیدگی سے کہا۔ وہ اس وقت اتفاق ہی سے اکٹھے بیٹھ پائے تھے بصورت دیگر کوئی نہ کوئی فرد کسی ذمّے داری کے لیے غیر حاضر ہی رہتا۔

''دل نہیں چاہ رہا یار!'' وہ کرسی پر نیم دراز ہو کر موبائل تھامے ماریہ کا احوال پوچھنے لگا۔

''دل کو سمجھاؤ بھئی! تھکاوٹ سے کہیں بیمار ہی نہ پڑ جانا۔'' جنید نے اس کی طبیعت کو توقیر کی بے حسی کا شاخسانہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''مجبوری ہے یار! بہت بڑی مجبوری۔'' اس نے تھکے ہوئے انداز میں اپنا سر کرسی کی پشت پر دائیں طرف لگایا اور دھیرے دھیرے کنپٹیاں مسلنے لگا۔

''کیسی مجبوری؟'' مائیکل چونکا۔ وہ اس کی چھوٹی سے چھوٹی بات کا بھی بہت خیال رکھتا تھا۔ اسے ہمیشہ یہی خدشہ رہتا تھا کہ قمر اس کے گھر میں قیام کی بابت منفی سوچ میں مبتلا نہ ہو سکے۔

''میرا وزن بہت بڑھ گیا ہے۔ شباب کے نانا نے الٹی میٹم دیا ہے کہ وہ کسی 'ہمپٹی ڈمپٹی' کو اپنا داماد نہیں بنائیں گے۔ بس اسی لیے یہ دوڑ دھوپ کر رہا ہوں۔'' اس کے معصومیت بھرے انداز پر فضا میں ایک زبردست قہقہہ گونج اٹھا۔ اسی ہنسی مذاق میں کھانا ختم کر لیا گیا۔ وہ سب حقیقتاً بہت تھک گئے تھے لیکن مختلف لوگوں کی آمدورفت کا سلسلہ اب بھی جاری تھا۔

''میرا خیال ہے کہ اب ہمیں اس 'چاند رات' کا اختتام کر دینا چاہیے۔ کل صبح نئی ذمّے داریاں سنبھالنی ہوں گی۔'' نقیب نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

''اکثر لوگوں نے شکایت کی ہے کہ ان کا پولنگ اسٹیشن بہت دور بنا ہے۔ ان کی 'پک اینڈ ڈراپ' کے لیے کیا کرنا ہے؟'' قمر نے استفسار کیا۔

''ملک صاحب سے میری بات ہو گئی تھی۔ وہ گاڑی مہیا کر دیں گے تاکہ بزرگوں اور خواتین کو سہولت مل جائے۔ اُدھر والوں نے تو عاطف کے ذمّے یہ کام لگایا ہے۔ ہماری طرف یہ ذمّے داری تم سنبھال لینا۔'' جنید نے قمر سے کہا۔

کچھ ہی دیر میں وہ حتمی ہدایات وصول کرتے اپنے گھروں کو... روانہ ہو گئے۔ قمر اسی انداز میں کرسی پر بیٹھا آسمان کی وسعتوں کو دیکھتا رہا۔ مائیکل اسے جلد از جلد اندر آنے کا کہتا سامان سمیٹنے لگا۔

☆☆☆

چوبیس دسمبر کا دن اپنی تمام تر گہما گہمی لیے طلوع ہو چکا تھا۔

امتیاز حسبِ معمول دس بجے بیدار ہو گیا۔ گزشتہ رات اپنے علاقے کے بچوں کا جوش و جذبہ دیکھتے وہ بہت تاخیر سے لوٹا تھا۔ اس وقت موبائل کی بیٹری اپنے آخری سانسوں پر تھی۔ فون چارجنگ کے حوالے کیے وہ کچھ ہی دیر میں سو گیا۔ بیداری کے بعد موبائل آن کرتے ہی فرحان کی جانب سے ملنے والے پیغام نے اس کے چودہ طبق روشن کر دیے۔ امتیاز دیوانہ وار اس کا نمبر ملانے لگا لیکن وہ فون اٹھا کے ہی نہ دے رہا تھا۔

''اُلّو کا پٹھا! نشے میں الٹی سیدھی ہانکتا رہتا ہے۔ اب یہ بھی کوئی نیا وہم سوجھا ہو گا اُسے۔'' اس نے غصے سے سوچا۔

''لیکن اتنی بڑی بات وہ وہم میں بھی کیسے کہہ سکتا ہے؟'' ایک اور صدا ذہن میں ابھری۔ امتیاز نے بے چینی سے کئی بار اس کا نمبر ملایا لیکن جواب اب بھی ندارد تھا۔ اس نے فرحان کے فلیٹ پر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

عمارت کی سیڑھیوں میں تعفن کا احساس تھا۔ یہاں جرائم پیشہ افراد کے علاوہ دوسرے شہروں سے رزق کی تلاش میں آئے ایسے افراد رہائش پذیر تھے جو اچھے علاقوں میں کسی اکلوتے کمرے کا کرایہ بھی دینے کے اہل نہ تھے۔ ہر کابک نما فلیٹ میں تین سے چار لوگ رہتے تھے جنہیں صفائی ستھرائی سے کوئی سروکار ہی نہ تھا۔ اس ناگوار بُو کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ فلیٹ کے دروازے تک پہنچا تو دایاں ہاتھ عادتاً دستک کے لیے ہوا میں بلند ہو کر اگلے ہی لمحہ ساکت ہو گیا۔ دروازہ نیم وا تھا۔

''تیری یہ بے احتیاطی اور نشے کی زیادتی کسی دن مروائے گی تجھے فرحان!'' وہ جھنجلاہٹ سے کہتا اندر بڑھا۔ کمرے کا منظر اس کے حواس پر بجلی گرانے کے لیے کافی تھا۔ تپائی کے ساتھ غیر فطری انداز میں فرش پر گرے فرحان کا چہرہ زرد اور اذیت کی واضح تصویر تھا۔ اس کے سر سے نکلنے والا خون فرشی ڈھلان کے باعث دروازے کی طرف آنے کے بجائے مخالف سمت گہری لکیریں بناتا جم چکا

تھا۔ اس ابتدائی جھٹکے سے بمشکل سنبھلتے ہوئے امتیاز نے دیوانہ وار فرحان کو ہوش میں لانے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی لیکن اس کی روح جسم کی قید سے آزاد ہو چکی تھی۔ امتیاز ایک بار پھر اس کے آخری پیغام کی بازگشت میں کھو گیا۔

”کیا واقعی فرحان کا کہا سچ تھا؟“ اس نے بے چینی سے انگلیاں چٹخاتے ہوئے سوچا۔ ”کیا واقعی استاد ماجد اس حادثے کا قصوروار ہے؟“

”لیکن استاد کو اس بات کا علم تھوڑی ہی تھا۔ اس کے لیے تو یہ ایک معمول کا ٹرپ تھا۔“ دوسری صدا کی صورت میں ذہنی رو نے اسے پُرسکون کرنا چاہا۔

”نہیں! قصوروار بس وہی تو ہے۔ اسی نے ہمیں اس راہ پہ لگایا تھا۔“ امتیاز نے مزاحمت کی۔

”تو پھر اسے یہاں بلواؤ! ہمت ہے تو دوٹوک بات کرو۔ اگر قصور اسی کا ہے تو فرحان کی آخری خواہش تم پوری کر دو۔ اسے جان سے مار دو۔“ اس طاقتور لہر نے اسے پل بھر میں ہی چوکس کر دیا۔ اپنا فون تھامے وہ ماجد کا نمبر ملانے لگا۔

☆☆☆

ماجد اس صبح بہت خوشگوار مزاج لیے بیدار ہوا۔

گزشتہ رات اپنے دونوں ساتھیوں کے بھرپور تعاون سے کی جانے والی واردات نے اسے پور پور سرشاری میں مبتلا کر رکھا تھا۔ وہ بستر پر لیٹے کتنی ہی دیر اپنی کامیابی کے بعد ملنے والے نتائج کا تصور کرتے ہوئے حظ اٹھاتا رہا۔ دس بجے کے قریب اس نے بھرپور انگڑائی لیتے ہوئے بستر چھوڑا اور الماری میں لٹکے کپڑوں میں سے ایک جوڑا نکال کر غسل کرنے چل دیا۔ آج بہت عرصے بعد اس کا دل بازار سے ناشتا کرنے کو چاہ رہا تھا۔ گھر کا دروازہ مقفل کیے وہ باہر آیا تو چہل پہل اور جوش و خروش کی فضا اس کی منتظر تھی۔ ناشتے کی دکان کالونی کی ملحقہ سڑک پر تھی جہاں ایک جانب کرسیاں اور میزیں رکھ کر بیٹھنے کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔

”وے ماجے! کدھر غائب رہتا ہے تو آج کل؟“ تھوڑی دور جاتے ہی اسے دائیں سمت سے ایک آواز سنائی دی۔ ماجد کی پیشانی ناگواری سے شکن آلود ہو گئی۔ اس اندازِ تخاطب سے اسے سخت چڑ تھی۔

”کہیں غائب نہیں ہوتا خالہ! اپنے کام میں مصروف ہوتا ہوں۔“ اس نے ضبط کرتے ہوئے جواب دیا۔ وہ علاقے کی خاصی عمر رسیدہ اور جہاندیدہ عورت تھی۔

”تیرے کون سے کام ہوتے ہیں بھئی؟ چھڑے چھانٹوں والی تیری زندگی ہے۔ بیوی گھر پر ہے، نہ ہی کسی نیانے کی فکر۔ تو نے کون سے پہاڑ کھودنے ہوتے ہیں۔“ خاتون خاصی منہ پھٹ اور بدلحاظ تھیں۔ غصے سے ماجد کے نتھنے پھڑکنے لگے۔

”ویسے خیر سے گئی ہے ناں تیری لگائی؟“ وہ متجسس تھیں۔

”اس کے خاندان میں شادیاں تھیں اس لیے وہاں رہنا زیادہ ضروری تھا۔“ وہ جان چھڑانے کے انداز میں بولا۔

”اچھا! تو کہتا ہے تو مان لیتی ہوں۔ ورنہ خدا لگتی کہوں گی۔ عورت کے پیروں میں اولاد کی زنجیر نہ ہو تو وہ گھر میں ٹکتی ہی کہاں ہے؟“ ان کا ہر ایک لفظ ماجد کو کوڑے کی طرح لگ رہا تھا۔

”آپ کو مجھ سے کوئی کام تھا خالہ؟“ وہ اکتا کر بولا۔

”ارے ہاں! ہمارا یو پی ایس چیک کر لیتا ذرا آ کے۔ نئی بیٹریاں ڈلوائی ہیں لیکن پھر بھی آدھے گھنٹے بعد ہی اس کی چیخ و پکار شروع ہو جاتی ہے۔“

”میرے پاس ٹائم نہیں خالہ!“ رکھائی سے کہتا آگے بڑھ گیا۔ اس کا موڈ سخت خراب ہو گیا تھا۔ ”جاہل عورتیں! رشتے، شادی اور اولاد کی پیدائش سے آگے سوچ ہی نہیں بڑھتی ان کی۔“ وہ تن فن کرتا حلوا پوری کی دکان پر پہنچا۔ رستے میں نظر آتے لوگوں کی کیفیت اس کے لیے انوکھی تھی۔ ہر کوئی بہت فخر سے اپنے انگوٹھے پر سیاہی کا نشان لیے اتراتا پھر رہا تھا۔ غصے کی شدت قابو کرتے اس نے پوریاں اور قیمے والی کچوری منگوائی اور رغبت سے ناشتا کیا۔ اب اس کا ارادہ اپنے معالج سے ملاقات کا تھا لیکن روانگی سے قبل فون کرنا مناسب تھا۔ اس نے وہیں کرسی پر بیٹھے موبائل نکالا اور امتیاز کا نمبر جگمگاتا دیکھ کر چونک گیا۔

”استاد! فف...... فرحان......“ حسب سابق ہکلاتی ہوئی آواز اس کی سماعت میں پڑی۔

”اسے کیا ہو گیا اب؟ رات کو اچھا خاصا چھوڑا تھا میں نے۔“ وہ بھنایا۔

”آپ ابھی اس کے فلیٹ پر ہی آجائیں۔ دیر مت کرنا۔“ امتیاز کا عجلت بھرا انداز ماجد کے دل میں کئی طرح کے واہمے پیدا کرنے لگا۔ وہ ناشتے کے بل کی ادائیگی کر کے تیز تیز قدموں سے چلتا گھر پہنچا اور بائیک نکالتے ہوئے کسی خدشے کے تحت اپنا سائلنسر لگا ریوالور بھی جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔

UrduBooks.net

فلیٹ کا بیرونی ماحول حسب توقع تھا لیکن اصل جھٹکا تو فرحان کی لاش کی صورت میں اس کا منتظر تھا۔ اس کا نیم وا منہ، زرد چہرہ، اکڑا ہوا جسم اس بات کا واضح ثبوت تھے کہ وہ کسی عبرتناک موت کا شکار ہوا ہے۔ ماجد کے چہرے پر فطری حیرت اور بے یقینی تھی۔ اس کی نظر راکھ اور شراب کی خالی بوتلوں کے درمیان میلے گدے پر بیٹھے امتیاز پر پڑی۔ آنکھیں چار ہوتے ہی ماجد کے ذہن نے ہوشیار کا اشارہ دیا۔ یہ لمحات اس کے لیے بہت نازک تھے۔ ماجد کے سامنے ایک لاش موجود تھی جس کا ماتم کرتے شخص نے ہمیشہ ہی اس کا بہت خیال رکھا تھا۔

”یہ سب کیسے ہوا؟ رات تک تو اچھا خاصا تھا یہ؟“

”میرے موبائل کی بیٹری لو تھی استاد! آج صبح فون چالو کیا تو اس کا میسج آیا ہوا تھا۔“ امتیاز کے چہرے پر صدمے اور بے یقینی نے ڈیرے جمارکھے تھے۔ ماجد اس کی ہر ایک جنبش پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

”کیسا میسج؟“ ماجد سنبھل کر بولا۔ امتیاز نے اپنا موبائل اس کے سامنے کردیا۔

”ہم نے اس کے ساتھ واقعی بہت زیادتی کردی استاد! میرا دل کہتا ہے کہ فرحان نے یہ سب کچھ بہت اذیت میں لکھا تھا۔“

”ریلیکس ہوجا متو! وہ ضرور کسی حادثے کا شکار ہوا ہے۔ میری عقل تو اس بات کو تسلیم نہیں کر پا رہی کہ وہ جس علاقے میں ہمارے ساتھ گیا تھا، اس کی حقیقت سے لاعلم ہو؟“ ماجد نے نرمی سے کہا۔

”تم...... درندے انسان...... تمہیں یہ کیوں سمجھ نہیں آرہی کہ فرحان کی اس دکھی موت کا ذمے دار تو ہی ہے۔“ امتیاز یکدم آپے سے باہر ہوگیا۔ اس نے گدے پر دھرے بدبودار کمبل کے نیچے سے ایک ٹوٹی ہوئی بوتل نکال کر ماجد پر حملہ کردیا۔ ماجد اس صورت حال کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔ اس نے تیزی سے جھکائی دے کر اپنی گردن زخمی ہونے سے بچائی۔ حیران کن طور پر امتیاز بھی پھرتی سے اس کی جانب پلٹ آیا۔ اس کے تیور خونخوار تھے۔ ماجد نے بلاتاخیر اپنا ریوالور نکالا اور اس کی پیشانی پر گولی داغ دی۔ امتیاز نکیلی سی بوتل ہاتھ میں پکڑے کسی نیم مردہ چھپکلی کی طرح پشت کے بل زمین بوس ہوگیا۔

”سالا! اُلّو کا پٹھا! چھوٹی سوچ کبھی ترقی کر ہی نہیں سکتی۔“ وہ تنفر سے بولا۔ امتیاز کی پیشانی سے رواں خون فرحان کے لہو میں مدغم ہونے لگا تھا۔ ماجد نے ریوالور اپنی جیب میں رکھا اور بچھے ہوئے کاؤچ پر بیٹھ کر اعصاب پُرسکون کرتے ہوئے کمرے کا باریک بینی سے جائزہ لینے لگا۔ اس نے فلیٹ میں آتے ہوئے اپنے ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں ہی رکھے تھے لہٰذا دروازے کے سوا کہیں بھی فنگر پرنٹ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کچھ لمحے سوچ بچار کے بعد ماجد نے ایک رومال ہاتھ پر لپیٹا اور فرحان کے کپڑوں کی تلاشی لیتے ہوئے فون برآمد کرلیا۔ امتیاز کے موبائل پر قبضہ کرتے ہوئے وہ لہو سے بچتا اٹھ کھڑا ہوا۔

”اپنے مقصد میں کامیابی کے لیے مجھے ایسی دس لاشیں بھی بچھانی پڑیں تو ہر قیمت پر ایسا کرکے ہی رہوں گا۔“ اس نے دروازے سے انگلیوں کے نشانات مٹاتے ہوئے خودکلامی کی۔ جرائم پیشہ اور جنسی دھندے میں ملوث افراد پر مشتمل اس عمارت میں کسی بھی فرد کے غیاب کا اندازہ ہونا ممکن ہی نہ تھا۔ لاشوں سے تعفن کی برآمدگی ہی ان کی موت کا نقارہ بجا سکتی تھی۔ اس فلیٹ میں ماجد پہلی دفعہ آیا تھا لہٰذا کسی کی جانب سے شناخت کا بھی کوئی خدشہ نہ تھا۔ اسے ان دونوں کے مرنے پر محض اتنا افسوس تھا کہ اب اس کی دو قدم دور منزل کی مسافت میں کہیں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہوجائے۔۔

”نہیں! کسی صورت بھی نہیں! مجھے اگلی واردات پر اگر مختلف بندے بھی لے جانے پڑے تو یہ تکلیف بھی برداشت کرلوں گا۔“ اس نے بائیک پر بیٹھتے ہوئے عزم سے سوچا۔ اسے جلد از جلد کسی نئے مددگار کا بندوبست کرنا تھا اور جانے کیوں اس بار بھی ذہن میں قمر ہی کا تصور رہ رہ کر ابھر رہا تھا۔

☆☆☆

قمر اپنی ڈرائیونگ کی ذمے داری مکمل خلوص سے نبھا رہا تھا۔

صبح آٹھ بجے سے شروع ہونے والا یہ کام دوپہر ایک بجے تک خاصا زور پکڑ چکا تھا۔ اس مصروفیت کے باوجود وہ ماریہ سے بھی مسلسل رابطے میں تھا۔

”آپ صبح سے ووٹرز کے ساتھ گھن چکر بنے ہوئے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ناشتا بھی گول کردیا ہوگا۔“ محبت اور تڑپ کی چاشنی میں گندھے ان الفاظ کی مہک سے قمر مخمور ہونے لگا۔ ماریہ ہر گزرتے دن کے ساتھ بہت تیزی سے اس کے قریب آگئی تھی۔

”آپ کا اندازہ بالکل بجا ہے۔ میں نے واقعی ناشتا نہیں کیا۔“ اس نے مسکراتی ہوئی سمائلی کے ساتھ جواب لکھ کر بھیجا۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی علاقے کے کچھ لوگوں کو پولنگ

UrduBooks.Pk

اسٹیشن سے واپس لایا تھا اور اب اگلی کھیپ کے لیے مزید افراد کا منتظر تھا۔ اس کی توقعات کے عین مطابق اس مرتبہ ووٹرز کا ٹرن اوور بہت اچھا تھا۔ لوگ جوش اور ذمے داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی قومی امانت کا حق ادا کر رہے تھے۔

"ایسا کیسے چلے گا بھئی؟" ماریہ نے ناراضی جتائی۔

"آج کا دن قومی تاریخ میں بے حد اہم ہے۔ میں پہلے اسے مکمل کرنا چاہتا ہوں۔" وہ سنجیدہ ہوا۔

"آپ کی یہ لگن بہت متاثر کن ہے قمر!" ماریہ نے ناز سے کہا۔

"شکریہ جی! آپ نے ووٹ دیا کہ نہیں؟"

"نہیں! دادی جان کا بلڈ پریشر ہائی ہو گیا تھا۔ اب کچھ بہتر ہوئی ہیں وہ۔ اگلے ایک گھنٹے میں سبھی روانہ ہوں گے۔"

"گڈ! اس وقت تک میں بھی اگلے راؤنڈ کے لیے فارغ ہو جاؤں گا۔" قمر نے ڈھکے چھپے الفاظ میں ایک پیغام دیا۔

"ٹھیک ہے! ملتے ہیں ایک بریک کے بعد۔" ماریہ کے جواب پر اس کی خوشی دیدنی تھی۔ قمر کا اگلا راؤنڈ منتظر تھا۔ چند خواتین اور بزرگ افراد کو قدرے قریبی اسکول میں لے کر جانا تھا۔

"مفت کی بیگار کر رہا ہے صبح سے! کچھ حاصل نہیں ہوگا تجھے۔" واپس آتے ہی اس کی سماعت میں عاطف کا زہریلا فقرہ آیا۔ وہ بھی اسی وقت کسی راؤنڈ سے لوٹا تھا۔ "تیری پارٹی کو جیت کا 'موقع' کبھی نہیں ملے گا۔"

"صبر کر کاکے منے! تمہاری پارٹی کا ٹائی ٹینک بھی ڈوب چکا ہے۔ تم لوگوں کے پاس کھوکھلے وعدوں اور نعروں کے سوا عوام کو دینے کے لیے کچھ بھی نہیں رہا۔" قمر نے اس کی باریک آواز کی شاندار نقالی کرتے ہوئے بھرپور جوابی وار کیا۔ ترش جملوں کا یہ تبادلہ کچھ دیر یونہی جاری رہا۔

"بس کر دو جوانو! اس طرح لڑتے ہوئے کون سی جائدادیں بانٹ لو گے؟" ماجد نے دوستانہ انداز میں کہا۔

"یہ سب تو یونہی چلتا رہے گا جی! یہی تو جمہوریت کا اصل حُسن ہے۔" قمر نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ عاطف موبائل پر آنے والی کال سننے میں مصروف ہو گیا۔ "آپ کا انگوٹھا اتنا سُونا کیوں ہے؟ کیا ووٹ کاسٹ نہیں کیا ابھی تک؟"

"نہیں! صبح سے گھر پر ہی ہوں۔ ناشتا کرنے ہی نکلا تھا بس تھوڑی دیر پہلے۔" وہ کسلمندی سے بولا۔ قمر نے اس کا پولنگ اسٹیشن معلوم کر کے ساتھ چلنے کے لیے قائل کر کے ہی دم لیا۔ ماجد سے بات کرنے کے ساتھ وہ کئی بار موبائل دیکھ چکا تھا۔ انتظار کی گھڑیاں بالآخر ختم ہوئیں اور ماریہ چند خواتین کے ساتھ گھر سے برآمد ہوئی۔ قمر کا ہاتھ بے اختیار اپنے بال سنوارنے لگا۔ ماریہ کی آنکھوں میں بھی خوبصورت چمک پیدا ہوئی تاہم اس نے بہت جلد اپنے بشرے پر بے نیازی طاری کر لی۔

"آ جائیں ماں جی! میں آپ کو لیے چلتا ہوں۔" عاطف لپک کر آگے بڑھا۔ اس کی پُرشوق نظریں بھی ماریہ کے سراپا پر مرکوز تھیں۔

"رہنے دے بھئی! مجھے تیرا لیڈر نہیں پسند۔ میں تیرے ساتھ نہیں جاؤں گی۔" دادی نے ہاتھ جھٹکتے ہوئے جواب دیا۔ عاطف کو سخت اہانت محسوس ہوئی۔

"معاف کیجیے گا بھائی صاحب! ماں جی آپ کی وین میں گھٹنوں کی تکلیف کے باعث سوار نہیں ہو سکیں گی۔" ماریہ کی والدہ نے بات سنبھالی۔ عاطف کے پاس پک اپ وین تھی جس کی اگلی نشست پر پہلے ہی ایک بزرگ براجمان تھے۔

"ہیرو پتر! مجھے تیری گاڑی میں جگہ مل جائے گی ناں!" دادی نے بڑی شفقت سے قمر کو مخاطب کیا۔

"سو بسم اللہ ماں جی! آئیے ناں آپ۔" اس نے بہت احترام سے انہیں کیری ڈبے کی عقبی سمت میں سوار کیا۔ عاطف حسد و طیش سے بے حال ہو چکا تھا۔ ماریہ کی 'باڈی لینگویج' اور قمر کی سرشاری سے ان دونوں کی 'کیمسٹری' کا کوئی بھی اندازہ لگا سکتا تھا۔ کسی خاص جذبے میں مبتلا دو افراد اپنی بے نیازی کے باوجود رازِ دل خود ہی عیاں کر دیا کرتے ہیں۔ انہیں اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ بے خودی کب ایک جست میں وجود پر غالب آ کر بانگِ دہل اہلِ عالم کو بتاتی ہے کہ میں نے ان دو اجنبیوں کو ایک ان دیکھی ڈور میں باندھ دیا ہے۔ وہ ڈور جو ازل ہی سے صنفِ مخالف میں ایک جبلی کشش ہے۔ دھڑکنیں کسی انوکھی تال میل پر رقصاں ہوں تو چہرے از خود کھلی کتاب بن جاتے ہیں جن پر لکھی تحریر پڑھ کر ہر کوئی اپنے ذہنی معیار کے مطابق مطالب دے لیا کرتا ہے۔ قمر اور ماریہ کی حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔

"تم نے ووٹ کہاں کاسٹ کیا قمر؟" فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ماجد نے پوچھا۔

"مجھے اتنا وقت ہی نہیں ملا۔ میرا حلقہ ویسے بھی آبائی

علاقہ تھا۔ وہاں آمدورفت میں ہی کئی گھنٹے ضائع ہوجاتے۔ آپ لوگوں کے ووٹس زیادہ اہم تھے۔ پارٹی نے اپنی کالونی کے ساتھ تین علاقوں کی ذمے داری... بھی میرے کندھوں پر ڈال دی ہے۔ اس بھاگ دوڑ میں ناشتا بھی نہیں ہوسکا۔" اس نے تفصیل سے بتاتے ہوئے ڈیش بورڈ پر رکھے ایک خاکی لفافے سے سینڈوچ نکالا جو واپسی پر ایک بیکری سے لیتے ہوئے آیا تھا۔ ماجد نے اس کی سہولت کے لیے ریپنگ کھول دی۔ قمر نے ماہرانہ انداز میں ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے بیک ویو مرر میں دیکھا اور سینڈوچ کترنے لگا۔ ماریہ کی آنکھوں میں تشکر اور مان کا جذبہ ہلکورے لینے لگا۔ بیس منٹ کی مسافت کے بعد ایک وسیع وعریض سڑک پر پہنچے جہاں متضاد سمت میں دو اسکول تھے۔ ماجد اپنا شناختی کارڈ سنبھالے بائیں جانب بڑھ گیا۔ قمر نے وادی کے نیچے اترنے میں مدد کی اور لفافے میں رکھا 'پیٹیس' نکال کر کھانے لگا۔ اس کی نظریں ماریہ پر ہی مرکوز تھیں۔

پچیس منٹ بعد ماجد باہر آیا تو کافی حیرت زدہ دکھائی دے رہا تھا۔

"بہت زبردست رسپانس ہے اندر! مجھے لگتا ہے کہ نئی پارٹی ضرور میدان مارے گی۔"

"واہ! اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔" قمر پُرجوش ہوا۔ وقت گزاری کے لیے وہ ماجد سے رسمی و بے معنی گفتگو کرنے لگا۔

"نوکری کرنے کا کیا ارادہ ہے ویسے؟" اس نے محتاط انداز میں اپنے اصل مدعا پر آتے ہوئے کہا۔

"الیکشنز سے فارغ ہوکر کچھ پرائیویٹ کالجز میں سی وی جمع کروانے کا سوچ رکھا ہے۔ جاب کے ساتھ ساتھ سی ایس ایس کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا ماریہ اتنا طویل انتظار کرلے گی؟" ماجد کے معنی خیز انداز پر قمر کو جھٹکا لگا۔

"اس میں ماریہ کہاں سے آگئی بھلا؟" وہ سنبھلتے ہوئے بولا۔

"برخوردار! ہم بھی اپنی جوانی میں یہی سب کرتے رہے ہیں۔ تم دونوں کے چہرے اشتہار بنے ہوئے ہیں۔ کنٹرول کرو یار!" اس نے خوشدلی سے کہا۔

"کیا کریں ماجد بھائی! کنٹرول ہی تو نہیں ہوتا۔" وہ جھینپ کر بولا۔ "ہم لوگ صرف اچھے دوست ہیں۔ شادی وادی کا ابھی کچھ سوچا ہی نہیں۔"

"کالجز میں نئے سیشن کے ساتھ ٹیچرز بھرتی کیے جاتے ہیں۔ اس میں تو ابھی کافی وقت باقی ہے۔ جاب ملنے تک تم ہمارے ساتھ جوائن کیوں نہیں کرلیتے؟ اچھا پیکیج مل جائے گا۔" ماجد نے ترغیب کا جال پھینکا۔

"او کے! میں اس بارے ضرور سوچوں گا۔" وہ نیم رضامند تھا۔ ماجد نے طمانیت سے اپنا سر سیٹ کی پشت سے لگادیا۔ خواتین کے واپس آتے ہی قمر نے گاڑی چلادی۔

☆☆☆

پولنگ کا وقت ختم ہوچکا تھا۔

قمر کے اس 'اوپن ایئر دفتر' میں دن بھر کے تجربات پر بات چیت جاری تھی۔ جنید اور مائیکل نے ایک ایل ای ڈی سسٹم کا انتظام کر رکھا تھا۔ اب انہیں شدت سے شام چھ بجے کا انتظار تھا۔ سڑک کی دوسری جانب پاشا کے پارٹی اراکین بھی خوب تیاریوں میں مگن تھے۔ ان کی جانب سے فائرنگ اور آتش بازی کا بندوبست صبح ہی سے تیار تھا۔

"کچھ لوگوں کی قسمت ہمیشہ کی طرح آج بھی دھوکا ہی دے گی۔" پاشا نے باآواز بلند تان لگائی۔

"ایسا کیوں ہوگا بھلا پاشا بھائی؟" اس کے قریبی ساتھی شخص نے معصومیت سے پوچھا۔

"بس! کچھ لوگ ہارنے کے لیے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ انہیں جیتنے کا موقع کبھی مل ہی نہیں سکتا۔" پاشا نے قمر اور جنید کی جانب دیکھتے ہوئے تمسخرانہ جواب دیا۔

"اگنور کرو انہیں! کچھ دیر صبر کرلو بس! میں نے ایک دھانسو پلان تیار کر رکھا ہے۔" قمر نے انہیں حوصلہ دیا۔ نیوز چینل کی مخصوص موسیقی کا آغاز ہوتے ہی سب اسکرین کی جانب متوجہ ہوگئے۔ نیوز اینکر ہاتھ میں سفید کاغذ تھامے پُرجوش انداز میں کسی دوردراز قصبے سے حاصل ہونے والے نتیجے کا اعلان کر رہا تھا جس کے مطابق قمر کی پارٹی نے پہلی کامیابی حاصل کرلی تھی۔ تمام لڑکے خوشی سے نعرے لگانے لگے۔ جنید نے فوراً گیراج میں رکھا درمیانے سائز کا ڈھول اٹھایا اور گلے میں لٹکائے بھرپور بیٹ دینے لگا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ رواں ہوگیا۔ مخالف پارٹی کو ملنے والی جیت فضا میں فائرنگ سے ارتعاش برپا کردیتی لیکن ڈھول کی لہو گرمادینے والی تال پر ماہرانہ رقص کا تناسب تشویشناک حد تک زیادہ تھا۔ دسمبر کی اس سرد رات میں موسم کی ہر شدت بے معنی ہوچکی تھی۔ رگوں میں دوڑتی حدت سے ان کے چہرے تمتمانے لگے۔ قمر نے اپنی جیکٹ اتار کر وہیں کرسی پر رکھی اور آنکھوں میں شرارت کی ایک نئی چمک لیے جنید سے ڈھول تھام لیا۔

"اب میں جو کہوں! میرے پیچھے کہتے رہنا بس! آج یہاں جون جولائی کی گرمی جیسی تپش نہ پھیلائی تو میرا بھی نام نہیں۔" وہ اسلم کو پاشا کے ساتھ چہلیں کرتے دیکھ کر معنی خیزی سے بولا۔

"آج در پر چل کے آیا ہے موقع۔" اس نے تھاپ دیتے ہوئے بہ آواز بلند کہا تو لڑکے بے اختیار پھڑک اٹھے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ مخالف پارٹی کے سامانِ جشن پر بھرپور انداز میں چوٹ کرتے ہوئے 'موقع موقع' کے فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے۔ چھتوں اور بالکونیوں میں کئی خواتین بھی اس نئے ہنگامے سے لطف اندوز ہونے چلی آئیں۔ قہقہوں اور سیٹیوں کی گونج میں قمر کو ملنے والی داد نے پاشا کے ضبط کا خاتمہ کر دیا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً غلیظ گالیوں کا طوفان برپا کر دیا۔ ماحول میں یکدم غیر فطری سی خاموشی چھا گئی۔

"اپنی زبان کو لگام دے پاشا!" مائیکل بھڑک اٹھا۔

"تجھ سے کون بات کر رہا ہے......؟" اسلم نے اس کے گھر میں قمر کے قیام کو نہایت نازیبا الفاظ میں بیان کرتے ہوئے فحش گالی دی۔

"ہاں! بات تو اس...... سے کرنی ہے جو اپنی شکل پر بہت اتراتا پھرتا ہے۔" پاشا نے بھی نسرین کے حوالے سے واہیات طعنہ دیا۔

"بس! اب ایک لفظ اور نہیں۔" قمر نے ڈھول اتار کر زمین پر پٹخ دیا۔

"تجھے علم ہے اسلم! اس ماے خان کو بہنوئی نے دھکے مار کر گھر سے نکال دیا تھا۔ اس نے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا انہیں۔" عاطف نے بھی اس لغو گوئی میں شرکت کی۔ یہ صورت حال اردگرد موجود خواتین کے لیے نامناسب ہو چکی تھی۔ وہ ایک دوسرے سے نظریں چراتیں پیچھے لوٹ گئیں۔ قمر کے لیے ضبط محال تھا۔ اس نے اندھا دھند مخالف سمت میں جست لگائی اور عاطف کو دھکا دیتے ہوئے سڑک پر گرا دیا۔ اس کے وجود میں وحشیانہ قوت سما گئی تھی۔ مائیکل، جنید، منیب اور قاسم بھی پاشا، اسلم اور دیگر لڑکوں سے بھڑ گئے۔ اس 'جنگِ عظیم' نے ہر ایک کی حسیات جکڑ لی تھیں۔ کسی کو علم ہی نہ ہو پایا کہ ماجد نے نہایت سکون و اطمینان سے قمر کی جیکٹ سے موبائل برآمد کر کے چند ہی لمحوں میں ایک نئی بربادی کی بنیاد رکھ دی ہے۔ اپنی کارکردگی پر خود کو سراہتے ہوئے اس نے موبائل دوبارہ جیب میں رکھا اور پریشان کن انداز میں لڑکوں کے پاس چل دیا جہاں متحارب گروہوں کے سپہ سالار کف اُڑا رہے تھے۔ کالونی کے معزز افراد انہیں الگ کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

"تم لوگ تو اس طرح لڑ رہے ہو جیسے لیڈروں نے اس بہادری کے عوض زمینیں تمہارے نام کر دینی ہیں۔ ابھی پولیس آ گئی تو خواہ مخواہ دنگے فساد کے کیس میں دھر لیے جاؤ گے۔" ایک معمر شخص نے تیور دکھائے۔

"چھوڑیں حاجی صاحب! بچے ہیں۔ خون میں ابال تو آ ہی جاتا ہے۔" ماجد نے بُردباری سے کہا۔

"دیکھ لوں گا میں! یہ 'موقع' تجھے بہت مہنگا پڑے گا۔" پاشا نے قمر کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور اپنے دفتر کی جانب بڑھ گیا۔ ماجد دیگر معزز افراد کے ساتھ قمر کو سمجھانے لگا۔ ماحول کی حدت دھیرے دھیرے اپنا اثر کھونے لگی تھی۔

☆☆☆

ماریہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی بریکنگ نیوز سے محظوظ ہو رہی تھی۔

مختلف نیوز چینلز پر جاری شدہ الیکشن کے نتائج نے اسے بھی بہت پُرجوش کر رکھا تھا۔ کالج سے چھٹیوں کے باعث وہ پڑھائی اور صبح جلدی اٹھنے کے جھنجھٹ سے بھی آزاد تھی۔ کچھ دیر قبل وہ بھی بالکونی میں ہی موجود قمر کی کارکردگی پر جھوم رہی تھی۔ ماریہ ایک سلجھی ہوئی...... مڈل کلاس لڑکی تھی۔ اس کا گھرانا روایت پسند تھا۔ صنفِ مخالف سے بات چیت کو مناسب نہیں سمجھا جاتا تھا تاہم وہ سوشل میڈیا پر محتاط انداز میں کبھی کبھی اس 'لذت' سے لطف اٹھانے میں کوئی عار نہیں سمجھتی تھی۔ اسے خوشی ہوئی تھی کہ اپنی آمد کے پہلے ہی روز کالونی میں مرکزِ نگاہ بن جانے والے قمر نے اس کی ذات میں دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ اس کے دروازے پر بے ساختہ رک جانا، بار بار کسی بہانے سے گھر کی جانب دیکھنا، کرکٹ کھیلتے ہوئے گیند گر جانے کی صورت میں ہمیشہ خود آنا ایسے عوامل ہرگز نہیں تھے جنہیں نظرانداز کیا جا سکتا۔ وہ اس کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھانے پر مجبور ہو گئی۔ کالونی میں قمر کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے وہ بھی جذبۂ تفاخر میں مبتلا ہو رہی تھی۔ دوستی کا علم تھامے باہمی کشش کی پُرپیچ راہوں پر اندھا دھند بھاگتے ہوئے ماریہ کی خوشی بے بہا تھی۔ اس کی کزنز اور کئی سہیلیاں بھی قمر میں دلچسپی لے رہی تھیں۔ اس صورتِ حال میں ماریہ کا احساسِ ملکیت سوا ہو جاتا۔ انہی سوچوں میں غلطاں وہ غائب دماغی سے ٹی وی دیکھنے میں مگن تھی کہ موبائل کی گنگناہٹ نے اسے چونکا دیا۔ اسکرین پر اس کی خالہ زاد بہن اور بہترین سہیلی کا نمبر جگمگا رہا تھا۔

’’ماروا فوراً آن لائن آجاؤ۔‘‘ شمائلہ کی ہیجانی آواز ابھری۔

’’وائی فائی کے سگنل کمزور ہیں۔ ایسی کیا ایمرجنسی آن پڑی؟‘‘ اس نے پہلو بچایا۔

’’میں تمہیں کہتی تھی ماروا محتاط اور پھونک پھونک کر قدم اٹھا کر چلنے والی لڑکیاں صنفِ مخالف کو چیلنج محسوس ہوتی ہیں۔ وہ کسی بھی طرح انہیں داغ دار کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ کتنا سمجھایا تھا تمہیں کہ اپنا رویہ اتنا مختلف نہ رکھو۔‘‘ وہ شدید پریشان تھی۔

’’پھری گلے دم تو لے یار! ہوا کیا ہے؟‘‘ ماریہ اُلجھ گئی۔

’’فیس بک پر تمہارے نام کے اشتہار لگے ہوئے ہیں۔‘‘ شمائلہ نے غصے سے کہا۔ ماریہ نے فون بند کیا اور فوراً اپنا اکاؤنٹ کھول لیا۔ حیرت کا ایک شدید جھٹکا اس کا منتظر تھا۔ قمر کی جانب سے انتہائی بے ہودہ ویڈیو میسجز بھیجے گئے تھے۔ بات صرف یہیں تک محدود نہ تھی۔ گزشتہ تمام عرصے میں ہونے والی چیٹنگ سے ذومعنی گفتگو کے اسکرین شاٹس لے کر درجن بھر لوگوں کو پوسٹ ٹیگ کی گئی تھی۔ الفاظ نہایت زہریلے اور غلاظت میں لتھڑے تھے۔

’’بظاہر پارسا نظر آنے والی خواتین اِن باکس کے ’ہائیڈ پارک‘ میں اس طرح کی گفتگو پسند کرتی ہیں۔ وہ ڈھکے چھپے انداز میں اپنی پسندیدگی جتاتے ہوئے لڑکوں کو پھانستی ہیں۔ پہل خود کرتی ہیں لیکن بدنام ہم ہی کیوں ہوتے ہیں؟‘‘

ماریہ کی کیفیت کاٹو تو بدن میں لہو جیسے نہ تھا۔ اس کا وجود شل ہو چکا تھا۔ اتنی ذلت...... ایسی رسوائی...... یہ کس ناکردہ جرم کی سزا تھی؟ ماریہ کے ذہن میں آندھیاں چلنے لگیں۔ یہ پوسٹ پندرہ منٹ پہلے تخلیق ہوئی تھی اور خوش قسمتی سے ابھی کسی کی نظر سے نہ گزری تھی۔ غالباً اس کی وجہ یہی تھی کہ کالونی کے بھی لڑکے باہر ہنگامہ خیزی میں مصروف تھے۔ وہ انگاروں پر لوٹ کر رہ گئی۔ وہ ذہنی طور پر مفلوج ہو چکی تھی۔ فوری ردِعمل کے طور پر اس کے ذہن میں یہی خیال آیا کہ اپنی آئی ڈی ہی ختم کر دی جائے لیکن اس توہین کے ذمے دار کو یونہی چھوڑ دینا بھی اسے گوارا نہ تھا۔ ان انگاروں کی تپش میں وہ قمر کو بھی جلا کرنا چاہتی تھی۔ سلگتے دل اور آتشیں آنسوؤں پر قابو پاتے ہوئے وہ کپکپاتے ہاتھوں سے آخری پیغام لکھنے لگی۔

’’مجھے سمجھ لینا چاہیے تھا کہ جس شخص پر اس کا بہنوئی ہی اعتبار نہ کرے، اس کا کردار کس حد تک غلیظ ہوگا۔ میں خواہ مخواہ نسرین کی باتوں میں تمہارا مثبت خاکہ بناتی رہی۔ میں نے یہ کیوں نہ سوچا کہ وہ تو پہلے ہی احمق اور جذباتی ہے۔ ایسی عورت اپنے بھائی کے سیاہ کرتوتوں پر پردہ نہیں ڈالے گی تو اور کیا کرے گی؟ تمہارا خمیر خباثت، بدنیتی اور فریب سے گندھا ہے۔ تم سے بات کرنا میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ مجھے تو تمہارے تصور سے ہی گھن ہونے لگی ہے۔ آخ تھو...... اب اگر چاہو تو اس میسج کا بھی اشتہار لگا کر اپنی نامردی کا ثبوت دے دینا۔‘‘ اپنی بھڑاس اچھی طرح نکالنے کے بعد ماریہ نے اسے بلاک کیا اور پھر اپنی آئی ڈی معطل کر دی۔

دسمبر کی اس دھند آلود رات میں فتح کا جشن اس کے آنسوؤں پر منتج ہوا تھا۔

☆☆☆

کالونی میں ڈھول تاشوں اور فائرنگ کا بازار گرم تھا۔ قمر کی پارٹی واضح اکثریت سے کامیاب قرار پائی۔ پاشا کے کیمپ میں مرگ کا سا سکوت تھا۔ (یہ وہی وقت تھا جب شمائلہ کی جانب سے ماریہ کو فون موصول ہوا) اپنی فتح کا جشن منانے کے لیے جنید نے ڈھول کے ساتھ پوری کالونی کا چکر لگانے کی تجویز دی۔ سب لڑکے بخوشی تیار ہو گئے۔ منیب البتہ کرسی پر ہی بیٹھا رہا۔

’’میرا تو اسٹیمنا نہیں ہے ابھی۔ تم لوگ ہو آؤ۔‘‘ اس کا سانس پھولنے لگا۔ شوقیہ سگریٹ نوشی سے وہ مکمل فٹ نہیں تھا۔ تمام لڑکے پاشا کے حامیوں کی رہائش گاہ کے باہر زیادہ دیر ڈھول بجانے جیسے منصوبے بناتے روانگی کے لیے تیار تھے۔

’’قمر! تم رک جاؤ ذرا۔ انہیں جانے دو۔‘‘ منیب کے ہاتھوں میں موبائل فون اور لہجہ صدمے سے چور تھا۔

’’تمہارا فون کہاں ہے؟‘‘ وہ سب کے جاتے ہی سختی سے بولا۔

’’میری جیکٹ کی جیب میں تھا شاید۔‘‘ قمر نے اپنی پینٹ ٹٹولتے ہوئے کہا۔

’’یہ کیا حرکت ہے؟‘‘ منیب نے اپنا موبائل اس کے سامنے کیا۔ قمر کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

’’یہ میں نے نہیں کیا یار! خدا کی قسم! مجھے میرے مرے ہوئے ماں باپ کی قسم!‘‘ وہ بوکھلا گیا اور اپنا فون ٹٹولتے ہوئے اس بھیانک حقیقت کے ’آفٹر شاکس‘ دیکھ کر مزید صدمے میں مبتلا ہو گیا۔ وہ الفاظ نہیں پتھر تھے جو اس کی خودداری اور عزتِ نفس کو پل بھر میں ہی چکنا چور کر کے کسی

زہریلے تیر کی طرح سینے میں پیوست ہو گئے تھے۔

”اسٹیچو کیوں بن گیا ہے گھامڑ؟ اس پوسٹ کو ڈیلیٹ کر فوراً۔ فی الحال سب لڑکے میچ میں مصروف ہیں۔ اگر کسی نے اسے دیکھ لیا تو اس لڑکی کے لیے قیامت برپا ہو جائے گی۔“ نیب نے اسے جھنجوڑا۔ قمر نے ایسا ہی کیا۔

”مجھے کئی دنوں سے شک تھا کہ تم لوگوں کے درمیان کچھ چل رہا ہے لیکن میں چاہتا تھا کہ تم خود ہی اس بارے میں کوئی بات کرو۔“ اس نے انکشاف کیا۔

”میں نے یہ سب نہیں کیا یار! تیرے سامنے ہی تو ہم پون گھنٹے سے اس پاشا کے پھیلائے وبال میں اُلجھے ہیں۔“ قمر مضطرب تھا۔

”یہ بات میں جانتا ہوں شہزادے! لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسی حرکت کس نے کی ہے؟ تیرا موبائل پیٹرن اور کس کے علم میں ہے؟“ اس نے منطقی نقطہ اٹھایا۔

”مجھے نہیں معلوم!...... مجھے کچھ نہیں معلوم۔“ وہ بالوں کو مٹھی میں بھینچتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ ماریہ کے الفاظ نے اسے شدید اذیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ ایک بار پھر اس کا کردار بُری طرح مجروح کیا گیا تھا۔ شکستہ پندار کی کرچیاں اسے بے حال کر رہی تھیں۔

”بس! بہت ہو گیا۔ میں کوئی مٹی کا مادھو ہوں کیا؟ جس کا جب دل چاہتا ہے مجھ پر الزامات کی بوچھاڑ کر کے خود پارسا بنے ہاتھ جھاڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔“ قمر کے وجود میں ایک طاقتور صدا ابھری۔ وہ غصے سے اٹھا اور کرسی کو ٹھوکر مار کر گراتے ہوئے اندر بڑھ گیا۔ آج کی یہ چوٹ شدید اور ردِعمل شدید تر تھا۔ اس کی کیفیت دیکھ کر جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کھڑے ماجد کے اطمینان اور سرشاری میں مزید اضافہ ہو گیا۔

☆☆☆

پچیس دسمبر کی صبح بہت نکھری ہوئی اور روشن تھی۔

کئی روز سے ٹھٹھری اور مرجھائی ہوئی دھوپ آج اعصاب کو تمازت بخش رہی تھی۔ موسم کی اس دلفریبی سے لطف اندوز ہونے کے لیے کئی مرد و خواتین چھتوں پر موجود تھے۔ سیلفیز کا بازار گرم تھا۔ کھٹے میٹھے کینو فروٹر کی قاشیں نمک کے ساتھ پھانکتے ہوئے ہر جگہ موضوعِ گفتگو گزشتہ رات ہونے والے جھگڑے، الیکشن کے نتائج اور نئی متوقع کابینہ کے متعلق مختلف اندازے تھے۔ ماجد اپنی چھت پر موجود بہت گہری نظروں سے اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ ماریہ کا ستا ہوا غمگین چہرہ دیکھ کر اسے حقیقتاً بہت لطف محسوس ہونے لگا تھا۔ اس نے گاڑی میں قمر اور ماریہ کو بیٹھی بیٹھی باہم نظروں سے نہارتے دیکھا تھا۔ اپنی شر پسندی کی نتیجے میں ان جذبات کی رکھائی، طیش اور نفرت میں تبدیل ہونے کی جھلک اسے قہقہے لگانے پر مجبور کر رہی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ دنیا ایک بہت بڑا کینوس ہے جس پر رنگ بکھیرتے مختلف کرداروں کی ہیئت تبدیل کر دینا سُرور کی انتہا تھی۔ وہ سر دھنتے ہوئے دوسری جانب موجود قمر کو دیکھنے لگا جو مائیکل کے گھر کی چھت پر بے نیازی ظاہر کرتے ہوئے موبائل پر مصروف تھا۔ ماجد کے لیے یہ مناظر بہت پسندیدہ تھے۔ وہ اس خوشی سے مزید کچھ دیر لطف اندوز بھی ہوتا لیکن کندھے میں لگنے والی گیند نے تمام تر جذبات جھنجلاہٹ میں تبدیل کر دیے۔

”انکل پلیز! بال دے دیں۔“ سڑک کی جانب سے مختلف آوازیں ابھریں۔ نصف درجن کے قریب بچے گراؤنڈ میں کرسیوں کی بدنظمی کے باعث سڑک پر ہی کرکٹ کھیل رہے تھے۔

”دفع ہو جاؤ یہاں سے!“ وہ دہاڑا۔ ”تم لوگوں کو اور کوئی کام دھندا نہیں ہے کیا؟“

”انکل پلیز! آخری دفعہ پھینک دیں۔“ روی نے التجا کی۔

”تمہارے والدین سے کرتا ہوں بات! اولاد پیدا کر کے دوسرے لوگوں کی زندگی اجیرن کرنے کے لیے انہیں سڑکوں پر چھوڑ دیتے ہیں۔“ ماجد حسبِ سابق آپے سے باہر ہو چکا تھا۔ کھیلتے کودتے بچوں کو دیکھ کر وہ ہمیشہ ایسی ہی دیوانگی میں مبتلا ہو جایا کرتا۔ تمام بچے مجروح نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔

”دفع ہو جاؤ مردودو! اب مجھے کوئی نظر نہ آئے یہاں۔“

”چڑیل بھی نہ رہے جس کے ساتھ......“ روی نے بہ آواز بلند کہا۔

”وہ ہے انکل بھوت ناتھ...... بھوت ناتھ۔“ دیگر بچوں نے کورس میں کہا۔ ماجد جلبلاتا ہوا انہیں گالیاں دینے لگا۔

☆☆☆

”کیا بات ہے ہیرو؟ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟ کالونی میں تمہاری کامیابی کی دھوم مچی ہے لیکن تم دیوداس بنے پھر رہے ہو۔“ اس شام قمر کو گراؤنڈ میں اکیلے بیٹھے دیکھ کر ماجد اس کے پاس چلا آیا۔ وہ اپنے مزاج پر کافی حد تک قابو پا چکا تھا۔

”کیا ہوا حالت کو؟ ٹھیک تو ہوں میں۔“ قمر بیزاری

سے بولا۔ وہ اپنی تنہائی مجروح نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ بے گھر ہونے کا احساس دل پر کچوکے لگاتا تھا۔ زندگی اسے کیسے موڑ پہ لے آئی تھی؟ کچھ عرصہ قبل وہ اپنے والدین کے ساتھ خوش باش زندگی گزارتا ایک سادہ مزاج نوجوان تھا جس کے خواب بہت بلند اور ارادے پختہ تھے۔ اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ ایک ہر دلعزیز اداکار کی مشابہت لیے پیدا ہوا تھا۔ اس مماثلت نے ایک نفس پرست خاتون کی خشم مزاجی کا نشانہ بنایا۔ اتفاق یہ تھا کہ اس کا بہنوئی سینہ خاتون کے لیے اوائل جوانی ہی سے دل میں خصوصی جذبات رکھتا تھا۔ اس کے تئیں شبنم کبھی غلط ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اپنے بچوں کو شتر بے مہار چھوڑ دینے والے توقیر نے قمر کی پُرخلوص کوششوں کو پل بھر میں ہی بے مول کرتے ہوئے گھر بدر کیا اور اب ماریہ نے اسے اپنی ہی نظروں سے گرا دیا۔ قمر کے دل میں ماریہ کے لیے جذبات پیار محبت کی نہج پر تو نہ تھے لیکن عزتِ نفس کی شکستگی کسی بھی سانحے کی اذیت سے زیادہ تھی۔ کل رات فتح کا اعلان ہونے کے بعد سب دوست حسبِ پروگرام اگلی چند چھٹیاں مری اور شمالی علاقہ جات میں گزارنے روانہ ہو گئے۔ ان کے بہت اصرار کے باوجود قمر ساتھ جانے کے لیے خود کو آمادہ نہیں کر پایا۔ وہ انہیں کیسے بتاتا کہ سیاسی پارٹی کے لیے کی جانے والی بھاگ دوڑ سے حاصل شدہ پیسے ہی اس کی متاع تھے۔ وہ اس جمع پونجی کو سیر و تفریح پر ضائع کر دیتا تو بعد میں کیونکر گزارہ کر پاتا؟ مائیکل نے حقِ دوستی نبھانے کے لیے بہت خلوص سے اپنے گھر میں رہنے کی اجازت دی اور کرسمس منانے والدین کے پاس چلا گیا۔ اب تنہائی کے سوا اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ اسے اپنی بے لوث ساتھی سے انسیت ہو گئی تھی۔ وہ اسے کسی کے ساتھ بھی بانٹنا نہیں چاہتا تھا۔

”نوکری کے بارے میں کچھ سوچا تم نے؟“ ماجد نے اس کی طویل خاموشی سے اکتا کر کہا۔

”کیا آفر ہے آپ کے پاس؟“ قمر نے پوچھا۔

”تمہیں میرے ساتھ ایک جگہ جانا ہوگا۔ میری کچھ مدد کر کے تم دس ہزار روپے کما سکتے ہو۔“ ماجد نے دانستہ اپنا لہجہ سپاٹ رکھا۔

”کیا کرنا ہوگا مجھے؟ موبائل چھیننا ہے کسی کا یا بائیک چوری کرنی ہے؟“

”اس سے بھی آگے کی چیز ہے۔ بڑے بڑوں کا پتا پانی ہو جاتا ہے۔“ وہ ہنسا۔

”لگتے تو نہیں ہو ایسے تم!“ قمر نے اندازِ تخاطب تبدیل کیا۔

”شہزادے! ضرورت انسان کو سب کچھ بنا دیتی ہے۔“

”تمہیں کیا ضرورت پڑ گئی؟ گھر، پیسہ، نوکری، بیوی سب کچھ تو ہے تمہارے پاس۔“ وہ ترشی سے بولا۔

”سب کچھ ہے...... بس اولاد نہیں ہے۔ ہمارے اردگرد یہ جو دنیا بستی ہے ناں! یہ کبھی خوش رہتی ہے، نہ کسی کو رہنے دیتی ہے۔ رزلٹ آ گیا؟ پرسنٹیج کتنی آئی؟ نوکری مل گئی؟ کتنی تنخواہ ملے گی؟ شادی ہو گئی؟ اپنوں میں کی یا غیروں میں؟ چلو اللہ پاک نصیب اچھے کرے! اولاد ہوئی؟ نہیں؟ کیوں نہیں ہوئی؟ چیک اپ کروایا؟ کمی کس میں ہے؟ یہ سائیکل ساری زندگی چلتی رہتی ہے۔ تم ابھی دوسری اسٹیج پر ہو۔ میں یہ سب کچھ سہتے ہوئے آخری اسٹیج تک آ چکا ہوں۔ جہاں مجھ جیسا انسان اپنا راستہ تبدیل کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اب تم میرے پارٹنر بن ہی گئے ہو تو خود ہی جان لو گے کہ ضرورت انسان کو کیا کچھ کرنے پر مجبور کرتی ہے۔“ ماجد بلاتکان بولتا رہا۔

”تم میرا تجسس بڑھا رہے ہو!“ قمر نے اشتیاق سے کہا۔

”مجھے نہیں علم کہ میں یہ سب باتیں تم سے کیوں کہہ رہا ہوں۔ بس کل رات تک برداشت کر لو۔ تمہاری ہمت اور حوصلہ بھی آزما لیتے ہیں۔“ وہ بے تاثر لہجے میں کہتا وہاں سے اٹھ گیا۔ قمر نے بھی کچھ پوچھنے سے گریز کیا۔

☆☆☆

چھبیس دسمبر کی وہ رات سرد اور دھند آلود تھی۔

ماجد نے اپنی منزل کی ریکی کر کے خطرے کی واحد گھنٹی کو وقتی طور پر آف کر دیا تھا۔ قمر کو طے شدہ مقام سے گاڑی میں بٹھانے کے بعد وہ مطلوبہ مقام تک پہنچ گئے۔

”یہ کہاں آ گئے ہم...... یونہی ساتھ چلتے۔“ قمر نے حیرانی سے کہا۔

”اُف خدایا! تم نے بھی امتیاز والی حرکتیں شروع کر دیں۔ وہ بھی یونہی بے تُکے راگ الاپا کرتا تھا۔“ ماجد کراہا۔ اس کے انداز نے قمر کو بے طرح چونکا دیا۔

”پچھلی سیٹ سے ہتھیار اٹھا لو! استعمال کا طریقہ اندر چل کے سمجھا دوں گا۔“

”یہاں ہتھیاروں کا کیا کام؟“ قمر نے ایک نظر آہنی دروازے کی جانب دیکھ کر حیرت جتائی۔ اسے ماجد کی ذہنی حالت مشکوک لگنے لگی تھی جو خاموشی سے گاڑی عمارت کے عقبی جانب لے آیا تھا۔ قمر نے الجھتے ہوئے اس کی تقلید میں

دیوار پھلانگی۔ سرد ہوا جسم کے کھلے حصوں کو برمے کی طرح چھید رہی تھی۔

”السلام علیکم یا اہلِ القبور!“ قمر نے آگے بڑھتے ہوئے متوازن انداز میں کہا۔ ماجد ٹھٹک کر رکا اور کوفت زدہ نظروں سے اسے دیکھتا ہوا سر جھٹک کر رہ گیا۔ قمر کی نظروں کے سامنے تاحدِ نگاہ قبرستان پھیلا تھا۔ چاندنی نے ماحول کو دودھیا تاثر دے رکھا تھا۔ جھاڑیوں سے الجھتی سرسراتی ہوا اسے کسی دلفریب موسیقی کے مانند لطف دے رہی تھی۔

”تمہیں خوف محسوس نہیں ہو رہا کیا؟“ ماجد نے یکدم پوچھا۔

”نہیں! ان سے کیسا خوف بھئی؟ تمہیں کیا علم کہ یہ جگہ مجھے بچپن ہی سے کتنی فیسی نیٹ کرتی ہے۔ یہاں چھایا سکون اور پُراسرار خاموشی ہمیشہ ہی سے بہت رومانٹک لگتی رہی ہے۔“ وہ کسی یاد پر مسکرایا۔

”کمال ہے! اسی لیے تو میرا دل بار بار تمہاری طرف مائل ہوتا تھا۔“ وہ اب اسے لیے خودرو جھاڑیوں کے عقب میں چلا آیا جہاں چاندنی کی روشنی قدرے کم تھی۔ ماجد نے ٹارچ آن کرلی۔ اس کی جسمانی حرکات و سکنات میں یکدم ہی تبدیلی آئی تھی۔

”کدال نکال کر اس قبر کو کھود دو!“ اس نے شکستہ قبر کی طرف دیکھتے ہوئے تحکمانہ کہا۔

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟“ قمر بدک گیا۔

”ہاں! اور تمہیں کس لیے لایا ہوں میں؟ قبر کھود دو! سلیب نکال کر کفن کھولو اور مردے کی تمام ہڈیاں مجھے نکال دو۔“ وہ اطمینان سے بولا۔

”لاحول ولاقوۃ الا باللہ! اس کے بعد ان ہڈیوں کا کیا کرو گے؟“ قمر کا دماغ چکرانے لگا۔

”عامل تاگی کے پاس لے کر جاؤں گا۔ وہ اس پر مخصوص عمل کر کے مجھے دوائی بنا کر دے گا۔ پھر مجھے باپ بننے کی صلاحیت مل جائے گی۔“ ماجد کسی روبوٹ کی طرح کہتا چلا گیا۔ اسے دوپہر ہی میں ’معالج‘ نے یقین دہانی کروائی تھی کہ آج کی یہ مہم اس کے تمام دلدر دور کر دے گی۔ اسی لیے وہ بلاخوف و خطر قمر کے سامنے اپنے راز افشا کرتا گیا۔ قمر آنکھیں پھاڑے اس عجوبہ روزگار شخص کو دیکھنے لگا۔

”میں ہرگز اس جرم میں حصہ نہیں لوں گا۔“ اس نے بے خوفی سے کہا۔

”تمہارا باپ بھی یہ کام کرے گا۔“ ماجد نے پھرتی سے ریوالور نکالا۔

”یہ کام تم خود کیوں نہیں کر لیتے؟ اولاد حاصل کرنے کی اتنی ہی ہڑک ہے تو اٹھاؤ کدال اور قبر کھود کر نکال لو ہڈیاں۔“

”عامل نے جو ہدایات دی ہیں‘ مجھے من وعن اسی پر عمل کرنا ہے۔“

”یار! کیا احمق انسان ہو تم...؟ ڈھونگی عامل تم سے قبروں کی بے حرمتی کروا رہا ہے۔ غیر منطقی کاموں میں الجھا کر تمہیں الّو بنا رہا ہے اور تم......“ قمر سر پیٹ کر رہ گیا۔ ماجد کی گرفت ریوالور پر مزید سخت ہوگئی۔ وہ اسے بتانے سے قاصر تھا کہ عامل تاگی کے کہنے پر اس نے اپنے علاج کے پہلے مرحلے میں خواتین کی نئی قبروں کو کھود کر کس قدر قبیح اعمال سر انجام دیے تھے۔

”کدال اٹھاؤ قمر! ورنہ آج میں ان دونوں کی طرح تمہیں بھی نہیں چھوڑوں گا۔“ اس نے روانی میں کہا، قمر جملے کی معنویت پل بھر میں ہی سمجھ گیا۔ ماجد کے خونخوار تاثرات دیکھتے ہوئے اس نے کچھ سوچ کر کھدائی شروع کردی۔ شکستہ ڈھیری کی حالت سے عیاں تھا کہ لواحقین دنیاوی دھندوں میں الجھ کر فاتحہ خوانی کے لیے مدتوں سے نہیں آسکے۔

”تمہیں کسی گورکن کی آمد کا خدشہ لاحق نہیں ہوتا کیا؟“ وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

”نہیں! سیٹھ سلیم کی دولت سے ان کا منہ بند ہو جاتا تھا۔ آج میں یہاں کے گورکن کو چند گھنٹوں کے لیے بے ہوش کر آیا ہوں۔“ ماجد کے اُلجھے ہوئے جوابات میں ’تھا‘ اور ’ہے‘ کی تکرار قمر کے ذہن میں مزید سوالات پیدا کرنے لگی۔ اسے عقل و شعور سے عاری اس شخص کی جہالت پر شدید غصہ آرہا تھا۔ وہ غفلت کے کسی ایک لمحے کی تلاش میں تھا جو بالآخر اسے مل گیا۔ ایک تہائی قبر کھود لیے جانے کے بعد ماجد نے زیرِ لب بدبدانا شروع کردیا۔ غالباً یہ بھی اس کے ’معالج‘ کے ہدایت نامہ کی کوئی شق تھی۔ چند سیکنڈز بعد وہ چاند کی طرف دیکھتا اور اپنے جسم پر پھونک مار لیتا۔ قمر کے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے سیدھا ہوا اور کدال ماجد کے ریوالور بدست بازو پر دے ماری۔ یہ لمحات بہت نازک تھے۔ کسی بھی قسم کی غلطی اس کے لیے بہت مہنگی ثابت ہو سکتی تھی۔ قمر نے برق رفتاری سے کدال کا چوبی حصہ ماجد کے سر اور گردن پر رسید کیا جس کا نتیجہ حسبِ توقع برآمد ہوا۔ ماجد بری طرح لڑکھڑاتا ہوا زمین بوس ہوا۔ ریگزین کے بیگ سے ایک رسی برآمد کرتے ہوئے قمر نے اس کے ہاتھ اور پاؤں سختی سے عقبی سمت باندھ دیے۔ ماجد کی حالت دیدنی تھی۔ سر سے بہتا لہو سیاہ لباس میں جذب ہو رہا تھا۔

"تم انسان نہیں حیوان ہو ماجد! فطری کمزوری کے ساتھ سمجھوتے کے بجائے جنگ کرنے کی ٹھان کر تم نے جانے کتنے گناہ کمائے ہیں۔ اب اسی قبر میں لیٹے رہو۔" قمر نے اس کے منہ میں رومال ٹھونسا اور سلیب اٹھا کر اسے پہلو کے بل اندر پھینک دیا۔ کدال اور بیگ سے حتی الامکان اپنے فنگر پرنٹس مٹاتا وہ عقبی دیوار سے ہی باہر نکل آیا۔ اسے اپنے حواس پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔

☆☆☆

"کوئی ہے...... میری مدد کرو! مجھے یہاں سے نکالو ورنہ میری ساری 'ریاضت' غارت ہو جائے گی۔" ماجد کے چیخ چیخ کر کہے گئے یہ الفاظ منہ میں ٹھنسے رومال کے باعث حلق میں ہی دم توڑتے رہے۔ وہ بے بسی سے اپنا سر زمین پر پٹخ رہا تھا۔ مٹی کے ذرات ناک میں گھستے ہی چھینکنے کا جان لیوا مرحلہ اس کی آزمائش کے لیے تیار تھا۔

"یا خدا! میں اس مردود کو کیوں اپنے ساتھ لے آیا؟" وہ بلک اٹھا۔ قبر کے اوپری کنارے پر رکھی ٹارچ کی روشنی میں اسے اپنے اطراف میں حشرات رینگتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ ماجد کے جسم کا ہر مسام پسینا اگلنے لگا۔ اس نے ایک بار پھر زور لگا کر بندشوں سے آزاد ہونا چاہا لیکن بے سود۔ اس کی توانائی تیزی سے ضائع ہو رہی تھی۔ ڈوبتے ذہن میں بیتے لمحات کے جگنو رقصاں تھے جن کی ٹمٹماتی روشنی میں اسے جھگڑتی بیوی نظر آئی۔ وہ اسے بے اولادی کے کوسنے دیتی...... نامرد ہونے کے طعنے دے رہی تھی۔ منظر بدلتے ہی اسے ایک دوست کا چہرہ نظر آیا جو کالے علم کے ماہر کی خوبیاں گنواتے ہوئے اسے علاج کے لیے قائل کر رہا تھا، منظر پھر تبدیل ہوا۔ اب ماجد سیاہ لبادے میں ملبوس، بدبودار جسم کے حامل، لمبے جٹاؤں جیسے بال اور سرخ آنکھوں والے ایک شخص کے پاس بیٹھا تھا۔ اس کے پلائے گئے ایک مشروب نے ماجد کی قوتِ ارادی کا خاتمہ کر دیا۔ ان خطرناک آنکھوں کے زیرِ اثر وہ کسی مردہ خاتون کے ساتھ قبیح فعل سرانجام دینے لگا تو ناگی کے خصوصی چیلے نے یہ منظر کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کر لیا۔ ضرورت اور مجبوری ایک ساتھ مل کر نئی داستانیں رقم کرنے لگیں۔ وہ عامل ناگی کی ہر بات پر من و عن عمل کرتا چلا گیا۔ علاج کے پہلے مرحلے میں اسے تنہا سب کچھ سنبھالنے میں بہت سے مسائل درپیش تھے۔ انہی دنوں قسمت نے اسے سیٹھ سلیم سے ملوایا جو اسی کی طرح کسی خاص مقصد کے لیے قبرستان آیا تھا۔ سیٹھ نے اسے اپنا ڈرائیور مقرر کر کے دو 'مددگار' رکھنے کی تجویز بھی دی۔ سیٹھ نے اپنی ضرورت پوری ہوتے ہی اسے تنہا چھوڑ دیا اور وہ تن تنہا اپنے علاج کا بیڑا اٹھائے قمر کو ساتھ ملانے کی حماقت کر بیٹھا۔ اس کی عقل یہ بات سمجھ ہی نہ پا رہی تھی کہ قمر کی صورت میں اس کے گناہوں کا یہ سلسلہ اختتام تک پہنچنا تھا۔ طاقت و کامیابی کے نشے میں چور ہر مجرم اپنے خاتمے کی بنیاد خود ہی تو فراہم کیا کرتا ہے۔ قمر کی طرف راغب ہونے کا خیال قدرت کی جانب سے ایک طے شدہ امر تھا۔

قبر کی اس کوٹھری میں وقت کا ہر ایک لمحہ اسے نئے عذاب میں مبتلا کر رہا تھا۔ ماجد کو اپنے کپڑوں میں حشرات کے رینگنے کا احساس ہوا۔ وہ پوری قوت سے مچل کر سیدھا ہوا تو پشت پر بندھے ہاتھوں میں اذیت کی لہریں سرایت کر گئیں۔ اس پر مستزاد پہلو میں کفن میں ملبوس استخوانی ڈھانچے کا لمس مزید وحشت میں مبتلا کر رہا تھا۔

"یا اللہ! میری مدد کرنا!" وہ حلق کے بل چلایا۔ رگیں پھول کر نیلگوں ہو گئیں لیکن آواز ہنوز غائب تھی۔ اسی لمحہ فرحان کا وحشت زدہ چہرہ اس کے پردۂ تصور پر ابھرا۔ ماجد نے تیسرے درجے کے ان اٹھائی گیروں کی کمزوریوں سے بھی تو خوب فائدہ اٹھایا تھا۔

"مجھے معاف کر دے ہیروئن!" اس کے دل سے صدا برآمد ہوئی۔ فرحان کا آخری میسج اپنی مکمل ہولناکی سے اس کی بصارت میں تازہ ہوا۔

"امتیاز! آج تو جس بدنصیب کی ہڈیاں لے کر گیا ہے وہ میری ماں تھی۔" ان الفاظ کے یاد آتے ہی ماجد وحشت و دیوانگی کے نئے دورے میں مبتلا ہو گیا۔

اس کشمکش میں جانے کتنا وقت بیت گیا۔ وہ ہمیشہ کسی دور دراز کونے میں موجود ایسی قبر کا انتخاب کیا کرتا تھا جس کے لواحقین اپنے کسی پیارے کو فراموش کر چکے ہوں۔ آج یہی 'دانشمندی' اس کے گلے پڑ گئی تھی۔ وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو چلا تھا۔ دفعتاً اسے اپنی ٹانگ پر نرم، طویل سی شے چلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ خوف سے اس کا پیشاب خطا ہو گیا۔ یہ تین فٹ لمبا، سیاہ رنگ کا خوفناک صورت سانپ تھا جس کی پھنکارتی زبان اب اسے اپنے چہرے سے چند گز کے فاصلے پر نظر آ رہی تھی۔ ماجد کو اپنی رگوں میں شدید کھنچاؤ محسوس ہوا۔ دو دھاری زبان قریب...... اور قریب آتی گئی۔ درد کا ایک گولا سینے میں پھٹا اور وہ اپنے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا۔

☆☆☆

سیٹھ سلیم ایک پرتعیش لانج میں موجود تھا۔

بیرونِ ملک آنے کے بعد وہ ہمیشہ ہر لمحے سے محظوظ ہوا

کرتا تھا۔ اس کی بیوی اس وقت شہر کے بہترین اسپتال میں زیرِ علاج تھی۔ ڈاکٹرز نے مکمل یقین دہانی کروائی تھی کہ ابتدائی اسٹیج پر تشخیص ہونے والا کینسر بہت جلد کنٹرول ہو جائے گا۔ وہ مطمئن ہو گیا۔ پاکستان روانگی نئے سال کی تقریبات سے لطف اندوز ہونے کے بعد ہی طے تھی لہٰذا اس کا ہر ایک لمحہ عیش و عشرت میں بیت رہا تھا۔ یہ خوشی و سرشاری مختصر المدت ثابت ہوئی۔ شمشیر کی جانب سے دو گھنٹے قبل موصول ہونے والے فون نے رنگ میں بھنگ ڈال دیا تھا۔

''بھائی جان! آج صبح آپ کی تلاش میں پولیس میرے پاس آئی تھی۔'' وہ خاصا الجھا اور بوکھلایا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

''واٹ رَبش! میری تلاش میں کیوں؟'' سلیم تکبر سے بولا۔

''پولیس افسر پہلے تو بہت سرد مہری سے بات کرتا رہا لیکن میرے تعلقات نے اسے جلد ہی ڈھیر کر دیا۔ اس نے بتایا کہ چھبیس دسمبر کی رات ایک فون موصول ہوا جس سے علم ہوا کہ ماجد ریاض نامی شخص اس وقت فلاں قبرستان کے مشرقی کونے میں 'جینن دین' کی قبر میں بند جا پڑا ہے۔ وہ کسی شیطانی عمل کے لیے مُردوں کی ہڈیاں چوری کرواتا تھا اور اس کام میں اسے سیٹھ سلیم کی سپورٹ حاصل تھی۔ پولیس کو قبر کی تلاش میں دیر ہو گئی۔ ماجد ہارٹ اٹیک سے وہیں مر چکا تھا۔ پوسٹ مارٹم سے علم ہوا کہ اس کے جسم پر سانپ اور بچھوؤں کے کاٹنے کے نشانات بھی موجود تھے۔ پولیس اس کی ملازمت ٹریس کرتے اسٹور تک چلی آئی۔ میں نے بہرحال ان کا منہ بند کروا دیا ہے۔ وہ دوبارہ یہاں کا رخ نہیں کریں گے۔'' شمشیر نے تفصیل سے بتایا۔ سلیم کی پیشانی کے بل ختم ہو گئے۔

''گڈ جاب ڈن!'' وہ ستائشی لہجہ میں بولا۔ اسے ماجد کی ہٹ دھرمی اور موت پر کوئی افسوس نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے اس نے ایسا کوئی احمقانہ قدم بہرصورت اٹھانا تھا۔

''کس سوچ میں کھو گئے مسٹر سلیم؟'' اسے وکٹر کی آواز نے چونکایا۔

''کچھ نہیں! یہ بلراج کہاں رہ گیا؟'' وہ بات ٹالنے کی غرض سے بولا۔

''ہیئر ہی اِز!'' وکٹر نے بائیں طرف اشارہ کیا۔ بہترین تراش خراش کے سوٹ میں ملبوس وجیہہ شخصیت کے مالک بلراج نے آتے ہی ان سے پُرجوش معانقہ کیا۔ سلیم کی ان سے شناسائی سوشل میڈیا پر ہوئی تھی۔ وکٹر اور بلراج یہودی و ہندو اقوام سے تعلق رکھتے تھے۔ ان تینوں میں ایک ہی قدر مشترک تھی کہ وہ ملحدانہ عقائد کے حامل تھے۔ ان کے ایما پر سلیم نے ایک نئے کام کا آغاز کیا۔

''کرسمس کیسا گزرا بلراج؟'' وکٹر نے دریافت کیا۔

''ارے بھئی! مجھے ان مذہبی تہواروں سے کیا لینا دینا؟ میں نے تو بس خوب عیاشی کی۔'' بلراج ہنسا۔ لانچ اب کھلے پانی میں چلی آئی تھی۔

''ہمارا مشن کہاں تک پہنچا مسٹر سلیم؟'' وکٹر نے دوٹوک انداز میں پوچھا۔ وہ ایک عام سی شخصیت لیکن خطرناک ترین ذہانت کا حامل شخص تھا۔

''کام مکمل ہے ڈیئر! تم اور بلراج کسی بھی وقت پاکستان چلے آنا۔ میرے پاس مطلوبہ قبرستان اور بگڈ کی گئی قبروں کی تفصیل موجود ہے۔ تم اپنے پراجیکٹ کا آغاز اطمینان سے کر سکتے ہو۔'' سلیم نے فخر سے بتایا۔ ان دونوں حضرات کو بعد از مرگ قبر میں ہونے والے حساب کتاب اور پوشیدہ زندگی کے حقائق تسخیر کرنے کا جنون تھا۔ اسی دیوانگی کے پیشِ نظر وہ ایک عیسائی قبرستان میں بھی تابوت بگڈ کروا چکے تھے۔ انہی کے مہیا کردہ وسائل سے سلیم نے گورکن سے ساز باز کرتے ہوئے لاوارث قبریں بگڈ کروائیں۔ مُردوں کی باقیات نالوں اور دریاؤں میں پھینک دینے کے بعد مخصوص مقامات پر آلات نصب کرواتے۔ اس کے بعد سلیم کے اشارے پر وہ گورکن وہاں کوئی نئی قبر تعمیر کر دیتے۔

''بہت خوب سلیم! ہماری یہ پارٹنرشپ اور ریسرچ دنیا میں تہلکہ مچا دے گی۔'' بلراج خباثت سے ہنسا۔

''ہاں! اب وقت آ گیا ہے کہ دنیا جان لے کہ یہ کائنات ایک نظام سے چل رہی ہے۔'' وکٹر اپنا جام تھامے سمندر کی وسعتوں پر نظریں جمائے بولا۔ ان دونوں نے سلیم کے اسٹور کو برانڈڈ مصنوعات نہایت کم داموں میں فروخت کر کے اسے شہر کا کامیاب انسان بنا دیا تھا۔ وہ مذہب و خدا کے متعلق ایک تباہ کن نظریے کے پرچار کی جانب گامزن تھے۔

''نئے سال کے آغاز پر ہم پاکستان میں اس پراجیکٹ کا آغاز کر دیں گے۔'' بلراج نے جام ہوا میں لہرایا۔

''ہاں! اچھے نتائج آنے پر تحقیق کا دائرۂ کار بڑھایا بھی جا سکتا ہے۔'' وکٹر ان دونوں کے ہمراہ ریلنگ کے بہت قریب آ چکا تھا۔ اسی لمحے ان کے وجود کو ایک جھٹکا لگا۔ مضبوط اور اَن ٹوٹ ریلنگ ہلکے پھلکے کاغذ کی طرح بے وزن ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ تینوں خلا میں معلق ہوئے اور چھپاک سے پانی میں گر گئے۔

”یہ کیا ہوا؟“ وکٹر کی خوفزدہ آواز سنائی دی۔

”ریلنگ کیسے ٹوٹ گئی؟“ بلراج کا انداز بھی متوحش تھا۔ سلیم کے ذہن پر بھی دھند طاری ہونے لگی تھی۔ وہ تینوں ہاتھ پاؤں مارتے لانچ کی طرف دوبارہ بڑھنے میں ہانپ گئے تھے۔ زندگی چندفٹ کے فاصلے پر بانہیں کھولے ان کی منتظر تھی کہ انہیں ایک نامانوس آواز سنائی دی۔ یہ دو شارک مچھلیاں تھیں جو تیزی سے ان کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ تینوں کی سٹی گم ہوگئی۔ اس انوکھے واقعے نے لمحے بھر میں ہی ان کی عقل سلب کرلی تھی۔

”یا اللہ! رحم فرمانا۔ آج مجھے زندگی بخش دے۔ میں آئندہ ہر گناہ چھوڑ دوں گا۔“ سلیم گڑگڑایا۔

”اللہ تجھے ایسی جگہ موت دے کہ قبر بھی نصیب نہ ہو!“ اس کے ذہن میں ایک گناہ گار عورت کے الفاظ گونجے جسے اس نے بڑے کروفر سے دھتکار دیا تھا۔ اپنے کئی صغیرہ و کبیرہ گناہ یاد کرتے ہوئے اسے دائیں جانب شدید اذیت کا احساس ہوا۔ شارک نے اس کا بازو اور پہلو بری طرح ادھیڑ دیا تھا۔ بقا کی جبلی خواہش کے تحت وہ ایک بار پھر تیراکی کی کوشش کرنے لگا لیکن مچھلیوں کی تعداد خوفناک حد تک زیادہ ہوگئی تھی۔ اسے چندفٹ کے فاصلے پر وکٹر کا سر اپنے جبڑے میں دبائی ایک شارک نظر آئی۔ بلراج کا سینہ، پیٹ اور بازو چاک ہوچکے تھے۔ جان کنی کے ان لمحات میں اسے خدائے بزرگ و برتر کی متعین کردہ حدود پھلانگنے پر شدید پشیمانی ہوئی لیکن اب توبہ کا در بند ہوچکا تھا۔ خونخوار جبڑے کھولے ایک شارک اس کی طرف تیزی سے بڑھی اور سیٹھ سلیم کا وجود دولخت ہوکر اس کے پیٹ میں منتقل ہوگیا۔

☆☆☆

ماریہ اپنے کمرے میں ملول اور خاموش بیٹھی تھی۔

اس کے ہاتھ میں موبائل فون تھا جس کی مضبوط گرفت اس کی ذہنی پراگندگی کا ثبوت دے رہی تھی.... دکھ، تاسف، افسردگی اور طیش کی کیفیات نے تین روز سے اس کی طبیعت بوجھل کررکھی تھی۔ دکھ تھا کہ اس کا مان بہت بری طرح بکھرا۔ تاسف تھا کہ اس نے ایک اجنبی پر ضرورت سے زیادہ بھروسا کرلیا۔ افسردگی تھی کہ ایک ہموار اور خوش کن رشتہ غیر فطری موت مرگیا اور طیش تھا کہ قمر نے کس قدر آسانی سے اسے بےوقوف بنا کر سرِعام رسوا کردیا۔ ان سب سے سوا ایک خلش تھی۔ اتنا کچھ ہوجانے کے باوجود دل کا کوئی گوشہ بے یقین تھا۔ یہ کس جرم کی سزا پائی تھی؟ وہ ہمہ وقت سوچتی اور خودترسی میں مبتلا ہوجاتی۔ سماجی روابط سے قطع تعلقی کا اضطراب بھی اسے بے کل سا کیے ہوئے تھا۔ ان روابط کی لت کسی بھی انسان کے حواس کو آسیب کی طرح جکڑ لیا کرتی ہے۔ یکدم لاتعلق ہوجانا بلاشبہ اعصابی مضبوطی کے لیے ایک بہت بڑا امتحان ہوا کرتی ہے۔ اس ضمن میں ماریہ کی قوتِ ارادی کمزوری کا شکار تھی۔ اس نشے کی طلب ناقابلِ برداشت ہوئی تو وہ اپنے بھتیجے کا اکاؤنٹ کھول بیٹھی۔ حمزہ نے اسی کی مدد سے اپنی آئی ڈی ترتیب دی تھی جس کے بعد پاس ورڈ ماریہ کے لیے انجان نہیں تھا۔

کسی طاقتور جذبے سے مغلوب ہوکر اس نے قمر کی پروفائل میں تاک جھانک شروع کردی۔ قمر نے آخری بار پچیس دسمبر کی صبح ایک پوسٹ کی تھی جس میں اپنے مخصوص انداز میں الیکشن جیتنے کی مبارکباد دی گئی تھی۔ الفاظ میں وہی مٹھاس اور خوبصورتی تھی جس کی کشش وہ آج بھی بہت مس کرتی تھی۔ کالونی کی سڑک پر دوستوں کے ساتھ لی گئی تصاویر میں وہ ہمیشہ کی طرح بہت وجیہہ لگ رہا تھا۔ ماریہ کے دل میں بےچینی کی شدید لہر اٹھی وہ ان تصویروں پر بےاختیار انگلیاں پھیرنے لگی۔ دل میں پیدا ہونے والا گداز اَن چاہا تھا۔ گزرے لمحات کی حسین یادیں تلخ حقائق میں مدغم ہوکر اس کی آنکھوں میں نمی بن گئیں۔ یہ کیفیات اس کے لیے یکسر اجنبی تھیں۔ وہ بلاارادہ قمر کی گزشتہ سرگرمیاں دیکھتی رہی۔ ہر ایک پوسٹ سے کتنی ہی یادیں وابستہ تھیں۔ اسی بےمقصد عمل میں اسے اپنی خلش کا جواب مل گیا۔ قمر عادتاً اپنی ہر پوسٹ اردو میں لکھا کرتا تھا جبکہ تصاویر کے ساتھ موجود عبارت رومن انگلش میں تھی۔ وہ یقینی طور پر اس انداز سے بھی محروم تھی جو قمر کا خاصّہ تھا۔ انکشاف کا یہ لمحہ پہلے سے بھی اذیت ناک تھا۔ غصہ اور بدگمانی کی دھند چھٹتے ہی اسے مزید حقائق یاد آنے لگے۔ بارہ بج کر تین منٹ پر تخلیق کی گئی اس 'شناعت' کے وقت تو قمر کا پاشا سے جھگڑا جاری تھا۔ اسے یہ وقت کیسے بھول سکتا تھا کیونکہ یہی تو وہ لمحہ تھا جب جاوید نے گھر کی سب خواتین کو نیچے جانے کا حکم دیا تھا۔ اس کے بعد وہ ٹی وی لاؤنج میں آکر خبریں دیکھنے لگی تھی۔

”اُف خدایا! یہ میں نے کیا کردیا؟ قمر کو صفائی کا موقع تو دیا ہوتا۔“ وہ سر تھام کر بیٹھ گئی۔ اپنے نفرت سے لتھڑے الفاظ یاد آتے ہی اسے نئے سرے سے پشیمانی گھیر لیتی۔ معافی مانگنے کا خیال ذہن کے دریچوں پر دستک دیتا لیکن ضدی انا دونوں کان لپیٹے کسی بھی پیشرفت کے لیے تیار نہ تھی۔

”نہیں! غلطی اسی کی تھی۔ اس نے اپنا موبائل کیوں اتنی بےپروائی سے اِدھر اُدھر پھینک دیا کہ کوئی بھی اس کا

پیٹرن کھول کر مس یوز کرتا رہے۔'' ایک ہٹ دھرم سوچ اس کے ذہن میں ابھری۔ ''اسے خود مجھ سے معافی مانگنی ہوگی۔ وہ اپنی غلطی مان لے گا تو میں بھی اسے معاف کر دوں گی۔'' اپنی آئی ڈی ایگنور کر کے قمر کو ان بلاک کرتے ہوئے ماریہ نے ارادہ کیا۔ اس کی نادان ذہنیت یہ جانتی ہی کہاں تھی کہ مرد کو ہمیشہ محبت اور اطاعت سے تسخیر کیا جا سکتا ہے۔ مرد سے انا کی جنگ لڑنے والی عورت اپنا مقام دائمی طور پر کھو دیا کرتی ہے۔

☆☆☆

''تم تو عید کا چاند ہو گئے ہو قمر! اتنی بھی کیا ناراضی؟'' اس کے فون اٹھاتے ہی نسرین نے شکوہ کیا۔

''یہ کیفیات تم کبھی سمجھ ہی نہیں سکو گی۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ماجد کے ساتھ گزارا گیا وقت، اس کی حقیقت کا انکشاف اور اضطراری ردِعمل کے طور پر ہونے والی موت نے قمر کی طبیعت میں گہری خاموشی پیدا کر دی تھی۔ وہ اسے قتل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کا مطمحِ نظر تو صرف یہ تھا کہ ماجد موت کی وحشت محسوس کر سکے۔ اس نے قبرستان سے نکلتے ہی کسی طرح کال آفس ڈھونڈ کر پولیس کو اطلاع بھی دے دی تھی لیکن تقدیر ماجد کے گرد شکنجہ کس چکی تھی۔ اس کا اصل کردار پوشیدہ نہ رہ سکا۔ کالونی میں اس کی 'وجۂ موت' پر بہت... چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ قمر اعصابی طور پر مزید منتشر رہنے لگا تاہم اسے یقین تھا کہ اس نے کوئی ثبوت نہیں چھوڑا۔ ماجد کی بیوی اور سسرال نے تدفین کے بعد مکان خالی کر دیا۔ قمر کی بیزاری میں اضافہ ہونے لگا۔ نسرین اس صورتِ حال کو کیسے جان سکتی تھی؟ وہ اس کی خاموشی کو سابقہ ناراضی پر محمول کرتے ہوئے دل جوئی کرنے لگی۔ اس نے قمر کو توقیر کی غیر موجودگی میں گھر آنے کے لیے قائل کر لیا۔

''ماموں! ہم سب آپ کو اتنا مس کرتے ہیں۔'' شاہ میر اس کے پہلو میں آ بیٹھا۔

''آپ تو چندا ماموں دور کے ہو گئے ہیں۔'' شہروز نے بھی محبت سے کہا۔

''ہاں بیٹا! چندا ماموں ہمیشہ دور ہی اچھے لگتے ہیں۔'' وہ بے دلی سے مسکرایا۔

''تم شوبز میں اپنی قسمت کیوں نہیں آزماتے قمر!''

''یہ بات تم پہلے بھی سات سو چھپن بار مجھ سے کہہ چکی ہو۔ میرا ایک ہی جواب ہوتا ہے کہ میں کبھی وہاں ذاتی شناخت نہیں بنا سکوں گا۔ سماجی حلقوں میں جانا کا وحید مراد ہونے کا ٹھپا لگا کے خوب تمسخر اڑایا جائے گا۔ لیکن تم فکر نہ کرو! میں اس گھر میں دوبارہ کبھی رہائش کے لیے نہیں آؤں گا۔'' وہ تلخی سے

کیا آپ
لبوب مقوی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے۔ اعصابی کمزوری دور کرنے۔ ندامت سے نجات، مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے۔ کستوری، عنبر، زعفران جیسے قیمتی اجزاء سے تیار ہونے والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ یعنی ایک انتہائی خاص مرکب خدارا۔۔۔ ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے اور خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کیلئے۔ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ آج ہی صرف ٹیلیفون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی منگوالیں۔

المسلم دارلحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی طبی یونانی دواخانہ)
ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383
فون صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک کریں

بولا۔

”میں تو قیر کی عادات تبدیل کروانے کی ہر ممکن کوشش کر چکی ہوں قمر! وہ اپنے موقف سے ایک انچ بھی ہٹنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے۔“ نسرین افسردہ ہوئی۔

”یہی تو تم نے غلط حکمتِ عملی اختیار کی۔ عادات فطرت بن جائیں تو تبدیل کہاں ہوتی ہیں۔ توقیر کی ذہنی تربیت ہی ایسے ہوئی ہے۔ وہ اپنی بیوی اور سسرالی اقارب کو بھی عزت اور برابری کے مقام تک نہیں لا سکتا۔ تمہیں تبدیلی کی کوشش کرنے کے بجائے متبادل بہترین عادات پروان چڑھانی چاہیے تھیں۔ خیر! ابھی بھی وقت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تم اپنے بیٹوں کی ذہنی تربیت اس طریقے سے کرنا کہ وہ ایسی کوئی تاریخ نہ دہرائیں۔ اولاد کی ذہن سازی ذاتی ترجیحات و خواہشات کی قربانی بھی طلب کرتی ہے نسرین! اپنا مقام و مرتبہ پہچانو! ورنہ مستقبل میں تمہاری ہی طرح کوئی خاتون شہروز یا شاہ میر کی فطرت سے دکھی ہو کر بیٹھی ہوگی۔“ قمر نے مدلل انداز میں کہا۔ نسرین کا چہرہ فق ہو گیا، تیر بالکل نشانے پر لگا تھا۔ بچوں کے ساتھ مزید کچھ وقت گزار کر وہ ایک بار پھر جاب انٹرویو کے لیے چل دیا۔

☆☆☆

روزی کرسمس کی چھٹیاں گزارنے کے بعد اپنے فلیٹ میں لوٹ آئی تھی۔

گزشتہ کئی سالوں سے وہ کرسمس کا دن تنہا ہی بسر کیا کرتی تھی۔ مایوس اور گمراہ کن سوچیں اس کے ذہن میں مزید انتشار برپا کیا کرتی تھیں۔ فرحان کے ساتھ کیے گئے عہد کے بعد وہ اس ماحول سے دور رہ کر کوئی فیصلہ کرنا چاہتی تھی۔ آج فلیٹ میں داخل ہوتے ہی اسے فرحان کی شدت سے یاد آئی۔

”کہاں ہوگا وہ اس وقت؟ کیا کر رہا ہوگا بھلا؟“ اس نے سوچا۔

”اس کے فلیٹ پر چکر لگاتی ہوں۔ شاید وہیں مل جائے۔“ وہ مستقبل کی بابت اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کرنا چاہتی تھی۔ بااعتماد قدموں سے چلتی وہ اوپری منزل تک پہنچی۔ دروازے کے پاس آتے ہی اسے تعفن اور ناگواری کے احساس نے بے چین کر دیا۔ اس نے دروازے پر کئی بار دستک دی لیکن کوئی جواب نہ مل سکا۔ ہینڈل گھمانے سے علم ہوا دروازہ تو غیر مقفل تھا۔

”فرحان! تم اندر ہی ہو ناں؟“ وہ پکارنے لگی۔ اندرونی ماحول اس کے لیے مکمل دھچکا تھا۔ ذرا سے فاصلے پر پڑی دو لاشوں نے اسے ساکت کر دیا۔ بصارت پر یقین اب بھی دشوار تھا۔ اپنے ہیجان پر بمشکل قابو پاتے وہ لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھی اور پھٹی پھٹی نظروں سے فرحان کا چہرہ دیکھنے لگی۔ اذیت اور دکھ اس کے ہر ایک نقش پر ثبت تھا۔ روزی تعفن اور ناگواری فراموش کیے دوزانو اس کے پاس بیٹھ گئی۔

”تم میرا فیصلہ سنے بغیر کیسے جا سکتے ہو فرحان؟“ وہ صدمے سے بولی۔

”تمہیں یہ بات جاننے کے لیے زندہ رہنا چاہیے تھا کہ تمہارے پروپوزل کے بعد میں نے ایک نئے انداز میں سوچنا شروع کیا۔ مجھے تو تمہیں یہ بھی بتانا ہے کہ ہمدردی یا اپنے سہارے کے لیے مجھے گندگی سے نکالنے کی سوچ نے میرا ذہن کتنا تبدیل کیا۔ میں تو تمہیں یہ بتانے آئی تھی کہ گناہوں سے پاک زندگی بسر کرنے کے لیے میں نے مقامی چرچ سے وابستہ این جی او میں بچوں کے ساتھ رہنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ میں بے جوڑ شادی کے بعد ایک اور گھٹن زدہ زندگی نہیں چاہتی تھی۔ میری سوچ کو ایک نیا رخ دینے کے بعد تم ایسے کیسے جا سکتے ہو؟“ وہ چلانے لگی۔ اسے حقیقتاً اس الجھی ہوئی شخصیت کے حامل لڑکے کی موت نے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ دل کا غبار نکالنے کے بعد وہ سست قدموں سے چلتی اپنے فلیٹ میں چلی آئی۔ اسے پولیس کو دوہری موت کی اطلاع کے بعد اپنا سامان باندھ کر چرچ روانہ ہونا تھا جہاں تک رسائی کا خیال دینے والے شخص کی موت نے اسے پھوٹ پھوٹ کر رونے پر مجبور کر دیا تھا۔

☆☆☆

”نماز کے بعد تھوڑی دیر یہیں رکیے گا قمر! مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔“ مولانا صاحب نے شفقت سے اسے کہا۔

”جیسے آپ کا حکم!“ قمر نے تابعداری سے کہا۔ وہ نماز ظہر کی ادائیگی کے لیے مسجد آیا تھا۔ نصف گھنٹے بعد تمام نمازیوں کے روانہ ہوتے ہی وہ اس کے پاس آئے اور اِدھر اُدھر کی باتوں کا آغاز کر دیا۔

”آپ کی نوکری کی تلاش کہاں تک پہنچی بیٹا!“ کچھ دیر بعد وہ محبت سے دریافت کرنے لگے۔

”میری نوکری ایک کھٹارا گاڑی کی طرح ہے مولانا صاحب! جس کا انجن اور بیرونی ڈھانچا تک زنگ آلود ہے۔“ وہ کوشش کے باوجود تلخی پوشیدہ نہ رکھ سکا۔

”مایوسی کفر ہے میرے بچے!“

”میری زندگی میں مایوسی کے سوا کچھ باقی رہا ہی نہیں۔“ وہ افسردگی سے چٹائی پر انگلی پھیرنے لگا۔

"کیا آپ اب بھی مائیکل ہی کے گھر قیام پذیر ہیں؟"

"جی ہاں! ایک دو روز میں وہ بھی واپس آجائے گا۔ اس کے بعد جانے قسمت کہاں لے جائے گی؟"

"میں نے سنا ہے کہ آپ کے گروپ کو سیاسی پارٹی نے مستقبل میں بھی ان کے ساتھ کام جاری رکھنے کی پیشکش کی ہے۔" وہ متانت سے بولے۔

"جی! باقی لڑکے تو رضامند ہو گئے ہیں لیکن میں نے انکار کر دیا۔" اس نے سر جھکا۔

"آپ نے غلط کیا۔ یہ پیشکش قبول کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ وہ آپ کو 'یوتھ ونگ' کا صدر بنا رہے تھے۔" مولانا صاحب کی معلومات قابلِ رشک تھیں۔

"بدلے میں مجھے کیا ملتا؟ میں مکمل تنخواہ دار نوکری کرنا چاہتا ہوں۔ اس معاشرے میں پیسے کے بغیر عزت ہی کہاں ہے؟" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"آپ کی بات بالکل بجا ہے۔ میں بھی مسئلہ تو حل کرنا چاہتا ہوں۔" ان کی مسکراہٹ پر قمر الجھ کر رہ گیا۔

"میں وضاحت سے بتائے دیتا ہوں۔ میں نے اپنی ضرورت ہی کے لیے آپ کو یہاں روکا ہے۔ میرے ایک دیرینہ دوست عبدالقدوس نے شاہ جہاں کالونی میں اپنی رہائش گاہ سے ملحقہ چھوٹا سا مدرسہ قائم کر رکھا تھا۔ وہ انہیں دینی اور دنیاوی تعلیم سے سرفراز کرتے۔ کچھ روز پہلے ان کی وفات ہو گئی۔ اولادِ نرینہ میں کوئی اس سعادت سے بہرہ مند ہونے کے لیے تیار ہی نہیں۔ وہ مکان کی فروخت کے بعد حصہ لینے کے درپے ہیں۔ مرحوم کی بیٹی میرے پاس آئیں اور والد سے تعلقات کی لاج رکھنے کا کہتے ہوئے یہ ذمے داری مجھے سنبھالنے کی التجا کی۔ میرے سامنے اس وقت دو مسائل تھے۔ دنیاوی تعلیم میں اپنی کمزوری سے بھی واقف تھا تو دوسری طرف جگہ کا انتظام بھی محال تھا۔ قسمت نے یاوری کی۔ ماجد ریاض کی تدفین کے بعد ان کی بیوہ میرے پاس آئیں اور اپنا مکان دینی تعلیم کے لیے میرے حوالے کرنے کا عندیہ دیتے ہوئے قانونی چارہ جوئی کا اختیار بھی مجھے ہی سونپ دیا۔ میں چاہتا ہوں کہ عبدالقدوس صاحب کا مشن ادھورا نہ رہے۔ ہم بچوں کی رہائش گاہ مرحوم ماجد کے گھر میں بنائیں گے۔ انگریزی، ریاضی اور سائنس جیسے مضامین بشرط رضامندی آپ کے حوالے کیے جا سکتے ہیں۔ ارم بیٹی آپ کو ہر ماہ معقول معاوضہ ادا کریں گی۔ آپ چاہیں تو وہیں قیام بھی کر سکتے ہیں۔ اس پیشکش کے ساتھ سیاسی سرگرمیاں سنبھالنا بھی مشکل نہ ہوگا۔ ہم جیسے لاکھوں لوگ مستقبل میں اس ملک کی عنان نوجوان خون کے ہاتھوں میں دیکھتے ہیں۔ الیکشن کے دنوں میں آپ کی لگن، نیت اور جانفشانی اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ نوجوان نسل قوم کی تقدیر بدل دینے کی صلاحیت سے مالا مال ہے۔" وہ تفصیل سے کہتے چلے گئے۔

"میں تیار ہوں حضرت جی!" کچھ دیر سوچنے کے بعد قمر نے مضبوط لہجے میں کہا۔ دراصل میں اس کی زندگی کے عفریت نما مسائل پل بھر میں ہی حل ہو گئے تھے۔ شکر گزاری کے جذبات سے آنسوؤں کا نذرانہ لیے وہ اسی پل سجدہ ریز ہو گیا۔ بے شک اللہ ہی عظیم ترین کارساز ہے۔ ہر رات کے بعد ایک روشن سویرا بھی موجود ہے۔

☆☆☆

اکتیس دسمبر اپنے اختتام کی جانب رواں دواں تھی۔

قمر اپنے دوستوں کے ہمراہ مشہور عوامی پارک کے سامنے چوبی بینچ پر بیٹھا گول گپے کی پلیٹوں کا منتظر تھا۔ نوکری اور رہائش ملنے کے بعد دوست 'ٹریٹ' لینے اسے یہاں لے چلے آئے تھے۔

"میرے رشکِ قمر! تو نے ایسی خبر مجھ کو سنائی کہ مزہ آ گیا۔" جنید نے ایک بار پھر تان لگائی۔ وہ اس انکشاف کے بعد مسلسل یہی بول گنگناتا رہا تھا۔

"واقعی شہزادے! ہم سب تیرے لیے بہت پریشان تھے۔" غیب نے بھی خلوص سے کہا۔

"بالکل! مجھے بھی تو ڈر تھا کہ کہیں شباب کے نانا غصے میں آ کر کوئی الٹا سیدھا فیصلہ نہ کر لیں۔" قمر کی بذلہ سنجی بھی لوٹ آئی۔ وہ بھی اپنے ہم مزاج دوستوں کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ زندگی میں یہی تو اس کا اثاثہ تھے۔

"تو پھر کل سے اپنی پارٹی کا کام بھی شروع کیا جائے؟" مائیکل نے ترش گول گپا منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں! اور اس بار دفتر میرا کمرا ہوگا۔" قمر نے انہیں رضامند کیا۔ پندرہ منٹ میں گول گپوں کی چھ پلیٹیں ڈکار لینے کے بعد وہ واپسی کے لیے پر تولنے لگے۔

"تم لوگ جاؤ یار! میں ابھی کچھ دیر یہیں فٹ پاتھ پر گزارنا چاہتا ہوں۔" اس نے التجا کی۔ غیب نے بھی آنکھ کے اشارے سے انہیں جانے کا کہہ دیا۔

"ایک بات پوچھوں قمر؟ کچھ دن سے شام کو کہاں غائب ہو جاتے ہو؟" غیب پُرتجسس تھا۔ "کل جنید بھی یہی پوچھ رہا تھا مجھ سے۔"

"قبرستان جاتا ہوں۔" وہ مختصراً بولا۔

"اوہ! اچھا...... انکل آنٹی کی قبروں پر جاتے ہو گے؟"

اس نے اندازہ لگایا۔ قمر خاموش رہا۔ وہ غیب کو اصل ماجرا کیونکر بتا سکتا تھا؟ ماجد کی مذموم حرکات اور موت نے اس کے اعصاب کو اب تک رہائی نہیں دی تھی۔ وہ بلا ارادہ ہر روز قبرستان جاتا اور ویران قبروں پر گل پاشی کرتے ہوئے فاتحہ خوانی کیا کرتا۔ قمر غافل لواحقین کو جھنجوڑتے ہوئے احساس دلانا چاہتا تھا کہ ان مرحومین کی تدفین کے بعد بھی حقوق پورے کیے جاتے ہیں۔ قبر ان کی آخری آرام گاہ ہے جہاں فاتحہ خوانی اور مصروفِ زندگی سے نکالے گئے چند لمحات گزارنا بہت سے پچھتاووں سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

"اب کہاں گم ہو گئے؟ کہیں ماریہ کے متعلق تو نہیں سوچ رہے؟" غیب نے ٹٹولا۔ "اس سے رابطہ ہوا دوبارہ؟"

"نہیں! اب میں اس سے کوئی رابطہ نہیں کرنا چاہتا۔ اس بارے میں مجھ سے مزید کوئی سوال نہ کرنا پلیز!" قمر نے دوٹوک انداز میں کہا۔ غیب خاموش ہو گیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ گھر سے ضروری فون آنے پر عجلت میں روانہ ہو گیا۔ اس کی والدہ کو بلڈ پریشر کی دوا درکار تھی۔

قمر اپنی جیکٹ کے کالر چڑھائے فٹ پاتھ سے اٹھ بیٹھا۔ دسمبر کی اس آخری دھند آلود رات کو وہ یونہی الوداع کیا کرتا تھا۔ چہل قدمی کرتے اس کی ذہنی رو ماریہ کی جانب منتقل ہو گئی۔ وہ اس کی زندگی میں آنے والی لڑکیوں سے قدرے مختلف تھی اس لیے کشش و انسیت کا جبلی رشتہ استوار ہوتا گیا۔ قمر کو اس اعتراف میں کوئی عار نہ تھا کہ اگر وہ اس سے مزید بات چیت کرتا تو یقینی طور پر شادی کی پیشکش کر بیٹھتا۔ اپنے موبائل سے ہونے والی اس پوسٹ کا اصل مجرم ہنوز اس سے پوشیدہ تھا۔ وہ ذہنی جمناسٹک کرتے قصوروار کی نشاندہی کرنا چاہتا تو نتیجہ زیرو بٹا زیرو ہی برآمد ہوتا۔ ماریہ کے ردِعمل نے ابتدائی طور پر اسے شدید دھچکا پہنچایا تھا تاہم بعدازاں اس کی ذہنی کیفیت کے پیشِ نظر قمر رعایت دینے کے لیے بھی تیار ہو گیا۔ ماریہ کی مسلسل خاموشی نے اسے بھی ضد میں مبتلا کر دیا۔ قمر کا گمان یقین میں بدلنے لگا کہ وہ اسے کبھی سمجھ ہی نہیں پائی تھی...... ضد اور انا چند دنوں میں ہی پھل پھول کر تناور درخت بن گئیں۔ اب اگر وہ رابطہ کی کوئی صورت نکال بھی لیتی تو قمر کے دل سے یہ خلش ختم نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اس کے حالات کی تبدیلی پر مائل ہوئی ہے۔

ان سب باتوں سے قطع نظر اسے زندگی میں محبت و وفا کی تشنگی اب محرومی اور کسک بن کر ستانے لگی تھی۔ رستے میں آتے چھوٹے کنکروں کے ساتھ 'فٹبال' کھیلتے وہ خیالات کی شورش میں نسرین سے ملنے چل دیا۔

"میں نے تمہیں ایک ضروری بات کے لیے بلایا ہے قمری!" نسرین نے محبت سے اس کا نام بگاڑا۔

"سب خیریت ہے ناں؟" اسے تشویش ہوئی۔

"ہاں! گھر میں تو سب ٹھیک ہے۔ بچوں کو اسکول سے لانے، لے جانے کی ذمے داری توقیر نے اٹھالی ہے۔ بجٹ میں کٹوتیاں کرنے سے آئندہ ماہ انہیں پارٹ ٹائم جاب کی ضرورت بھی نہیں ہوگی۔" اس نے اپنی کارکردگی سے آگاہ کیا۔

"یہ تو اچھی بات ہے بہنا!" وہ مطمئن ہوا۔

"آج شام روحی کی والدہ میرے پاس آئی تھیں۔" نسرین نے تمہید باندھی۔ "اسلم نے ان کی بیٹی کے لیے رشتہ بھجوایا ہے۔ پہلی شادی کے باوجود وہ اسے دوسری منکوحہ بنا کر اپنے انتقام کی بھینٹ چڑھانا چاہتا ہے۔"

"تو کیا وہ مجھ سے یہ چاہتی ہیں کہ سیاسی اثر و رسوخ سے اس کے ہوش ٹھکانے لگاؤں؟" قمر حیران ہوا۔

"نہیں! وہ چاہتی ہیں کہ تم سائرہ سے شادی کر لو۔ وہ تمہارے کردار اور سوچ سے بہت متاثر ہیں۔" نسرین نے اصل انکشاف کیا۔ "دیکھو میرے بھائی! تمہیں کہیں نہ کہیں تو گھر بسانا ہی ہے تو یہیں کیوں نہیں؟ وہ بھی ہماری ہی طرح ایک عام گھرانے کی لڑکی ہے۔ تعلیم یافتہ بھی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہی تمہارے لیے بہترین شریکِ حیات ثابت ہوگی۔" وہ اسے قائل کرنے لگی۔

"ٹھیک ہے! مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" لمحاتی سوچ کے بعد اس نے گہری سانس بھری۔

"ماموں! چھت پر چل کر آتش بازی دیکھتے ہیں۔" شہروز اور شاہ میر اس کے درپے ہوئے۔ کالونی کے اکثر گھروں کی چھتوں پر سالِ نو کا جشن دیکھنے کے لیے بہت سے افراد موجود تھے۔ بارہ بجتے ہی آسمان رنگ و نور کی بارش میں شرابور ہو گیا۔ نئے سال کی آمد پر سابقہ غلطیوں سے سیکھنے کے عہد اور متوقع ذمے داریوں کے احساس میں گھرا قمر آسمان کی وسعتوں میں نظریں جمائے کھڑا تھا...... اس لمحہ وہ خلش اور انا کی دھند میں لپٹی ماریہ کو دیکھ ہی نہ سکا جس کی آنکھوں میں شکوے اور شکایات بھی نمایاں تھیں۔ قمر کے بشرے پر چھائی 'اجنبیت' اسے مکمل شدت سے محسوس ہوئی۔ اس بے نیازی کو رکھائی گردانتے ہوئے اس کے دل پر چوٹ سی لگی۔ وہ کچھ لمحے اس کے پلٹنے کی منتظر رہی اور پھر بوجھل دل لیے نیچے لوٹ آئی۔ انا اور جذبات کی جنگ میں آج ایک اور رشتے کو مات ہو گئی تھی۔

* * *

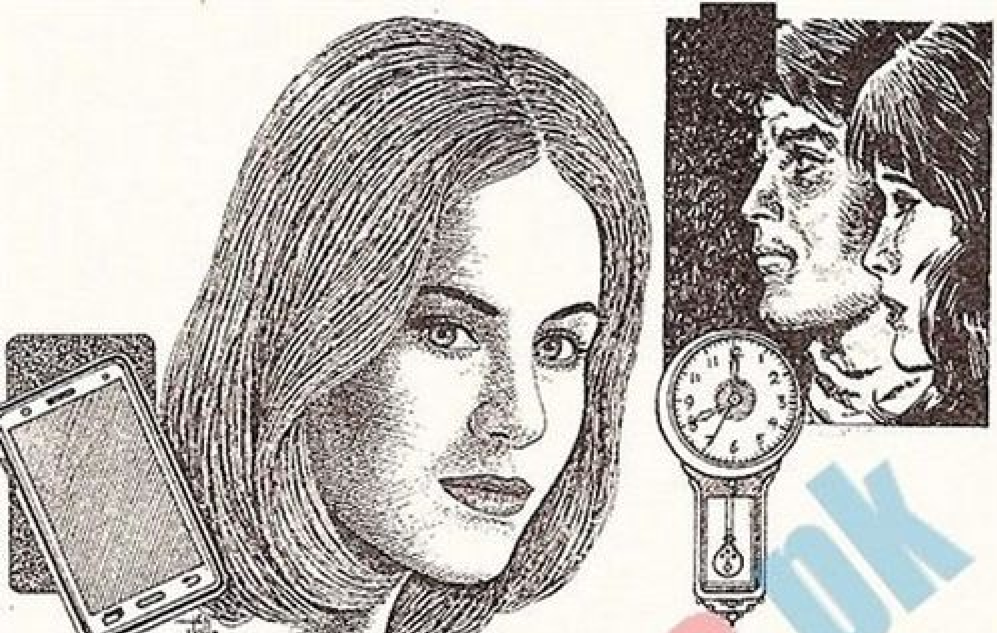

وقت کی جکڑ

سلیم انور

کسی کی آمدورفت سے متعلق مختلف لوگوں کے اپنے اپنے نظریات ہیں... کسی کی آمد مبارک ثابت ہوتی ہے تو کسی کی نحس... ایک ایسی ہی عورت کا ماجرا جو اپنی ماں کے پاس چھٹیاں گزار کے آئی تھی... گھر میں داخل ہوتے ہی ایک افتاد اس کی منتظر تھی۔

مغربی خواتین کے درمیان ہونے والی ملاقات کا انجام

ریٹائرڈ اسکول ٹیچر فرانسس ویلنٹائن نے ہال وے میں عین اسی وقت قدم رکھا جب اس کی سابقہ اسٹوڈنٹ پچیس سالہ ٹرش مورگن ایک سوٹ کیس اٹھائے اپنے سیکنڈ فلور کے اپارٹمنٹ کی جانب جارہی تھی۔ اس کے اپارٹمنٹ کے داخلی دروازے کی چابی اس کے ہاتھ میں تھی۔

''مس ویلنٹائن!'' ٹرش نے قدرے حیرت سے کہا۔ ''یہاں کیسے آنا ہوا؟''

UrduBooks.pk

''اگر کوئی مضائقہ نہ ہو تو میں تمہارے ساتھ اندر چلوں؟'' فرانسس نے کہا۔

ٹرش کا لیونگ روم قدرے خستہ حال لیکن گرم اور آرام دہ تھا۔ اس کمرے میں ایک کاؤچ، ایک آرام دہ کرسی، ایک ٹی وی موجود تھے۔ کمرے کی ایک دیوار پر فریم شدہ تصویریں آویزاں تھیں۔ دوسری جانب کی دیوار پر ایک قدیم گھڑی لگی ہوئی تھی۔

اس وقت تقریباً دوپہر کے بارہ بجے کا عمل تھا۔

ٹرش نے اپارٹمنٹ کا دروازہ بند کیا اور اپنا سوٹ کیس ایک جانب رکھ دیا۔ پھر فرانسس کی جانب رخ گھماتے ہوئے بولی۔ ''میں حقیقت میں بہت زیادہ تھکی ہوئی ہوں۔ کیا تمہیں زیادہ وقت لگ جائے گا؟''

''صرف چند منٹ۔'' فرانسس نے کاؤچ پر براجمان ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تمہیں آتے ہوئے دیکھا تو میں یہاں چلی آئی اور...... بس، میں تم سے چند سوالات کرنا چاہتی ہوں۔''

''مجھ سے؟'' ٹرش نے حیرانی سے کہا۔ ''میں تو پانچ ہفتوں سے شہر سے باہر تھی۔''

''کہاں گئی تھیں؟''

''اپنی ماں کے گھر...... ویلس میں۔''

''یہ پہلے سے طے شدہ پروگرام تھا؟''

ٹرش کی تیوریوں پر بل آگئے۔ ''تم یہ بات کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''اس لیے کہ جس روز تم یہاں سے گئی تھیں اسی روز جیمز کینڈل نے ڈولانز ہارڈ ویئر اسٹور میں ڈکیتی کی واردات کی تھی۔''

یہ سُن کر ٹرش نے تھوک نگلتے ہوئے اپنا حلق تر کیا اور ایک لمحے کے لیے خاموش رہی۔ اس کے پیچھے دیوار پر لگے پرانے پینڈولم اسٹائل کے کلاک نے گجر بجایا۔ کھڑکی سے باہر شاہ بلوط کے درختوں کے پتے ہوا میں لہرا رہے تھے۔

''کیا پولیس نے اسے پکڑ لیا تھا؟''

''اس کا مطلب ہے کہ تمہیں اس ڈکیتی کی خبر مل گئی تھی۔'' فرانسس نے کہا۔

''مجھے یقین نہیں آیا تھا۔ میری کزن جینا نے مجھے دوسرے دن فون پر اس بارے میں بتایا تھا۔''

''تمہیں فون کرنے والوں میں اکیلی تمہاری کزن ہی نہیں تھی۔'' فرانسس نے اپنا پرس کھولتے ہوئے کہا اور اس میں سے ایک کاغذ نکالا۔ ''فون کمپنی کا ریکارڈ بتا رہا ہے کہ اس واردات سے ایک ہفتہ قبل جیمز نے تین مرتبہ فون کیا تھا۔''

اس بات پر ٹرش نے شانے اُچکا دیے۔ ''تو پھر؟ جیمز شہر میں ہر کسی کو ڈیٹ دیتا ہے مس ویلنٹائن۔ غالباً اس نے اس ہفتے نصف درجن خواتین کو فون کیے ہوں گے۔''

''حقیقت یہ ہے کہ اس نے صرف تمہیں فون کیا تھا۔''

''تو پھر یہ سب کیا ہے؟ تمہارے خیال میں کیا میں اس کی تلاش میں مدد کر سکتی ہوں؟''

''میرا ایسا خیال تھا کہ تم مدد کر سکتی ہو۔ جیمز نے ڈکیتی میں کوئی بڑی رقم تو نہیں لوٹی تھی لیکن اب اس واردات کو ایک مہینے سے زیادہ ہو چکا ہے۔ سب ہی نے اس کی تلاش ترک کر دی ہے۔''

''ماسوائے تمہارے۔''

فرانسس اس بات پر مسکرانے لگی۔ ''ہاں، مجھے تجسس ہے۔''

''آئی ایم سوری مس ویلنٹائن۔ لیکن مجھے اس وقت تک اس واردات کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا جب تک میری کزن نے فون پر مجھے اس کی اطلاع نہیں دی تھی۔''

فرانس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر ایک نگاہ کمرے کا جائزہ لینے کے انداز میں دوڑانے کے بعد بولی۔ ''جب تم گئی ہوئی تھیں تو کیا کوئی تمہارے اپارٹمنٹ کا دھیان رکھنے کے لیے یہاں آتا تھا؟''

''نہیں، میں نے کوئی پالتو پرندے یا جانور نہیں پالے ہوئے تھے کہ جنہیں خوراک دینے کی ضرورت ہوتی۔ کوئی پودے نہیں کہ جنہیں پانی دینا ضروری ہوتا۔ کوئی ہاؤس کیپر نہیں کہ جو صفائی ستھرائی کے لیے یہاں آتی!''

''اور بوائے فرینڈز؟''

''کیا؟''

فرانسس نے اپنی نظریں ٹرش کے چہرے پر گاڑ دیں۔ ''یہ اپارٹمنٹ جائے واردات سے صرف ایک بلاک کے فاصلے پر واقع ہے، ٹرش اور شیرف کے دفتر سے صرف دو دروازوں کی دوری پر ہے۔ کوئی بھی جیمز کو اتنے نزدیک

UrduBooks.pk

English®

انگلش پھر سب سے آگے !

Cavity Protection All Day Long
English
Rs. 20 ONLY
SAVE Rs. 8
FREE Toothbrush
SAVE Rs. 20

انگلش دنیا کا بہترین ٹوتھ پیسٹ ہے۔

کیونکہ اس میں ہے لیکوئیڈ کیلشیم کے ساتھ ڈبل فلورائیڈ، تاکہ آپ کے دانتوں کو ملے Maximum نہیں بلکہ Guaranteed Cavity Protection

A Product of Sarwana & Sohzsihru Pakistan

@SnScare

english.toothpaste

Pakistan Standards
سے تصدیق شدہ

میں تلاش کرنے کا خیال بھی دل میں نہیں لاسکتا۔ خاص طور پر اس صورتِ حال میں جب تم اپنے اپارٹمنٹ میں موجود نہیں تھیں۔"

ٹرش کی آنکھیں حیرت سے پھٹ پڑیں۔ "کیا؟"

"میں نے خود بھی ابھی تک اس بارے میں نہیں سوچا تھا۔ لیکن یہ حقیقت دکھائی دے رہی ہے۔ تمہارے تمام پڑوسی عمر رسیدہ ہیں۔ اس لیے غالباً انہیں تمہارے فلیٹ میں کبھی کبھار چلنے پھرنے کی آوازیں یا ٹوائلٹ کے فلش کرنے کی آوازیں سنائی نہیں دیتی ہوں گی اور وافر مقدار میں ڈبوں میں پیک غذائیں اور ٹائمر سے منسلک روشنیوں کے آن آف ہونے کے سسٹم سے جیمز کو اپارٹمنٹ سے باہر نکلنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی ہوگی۔ اس نے یہاں اس وقت تک قیام کرنا تھا جب تک ڈکیتی کی اس واردات کی خبریں سرد خانے میں نہیں چلی جاتیں۔ اس نے اسی کے بارے میں تمہیں فون کیے تھے، ایسا ہی ہے نا؟"

ٹرش کے چہرے کے تاثرات کرخت ہوگئے۔ "تم غلط کہہ رہی ہو، مس ویلنٹائن۔ میں نے بھی......"

فرانسس نے اس کی بات مکمل نہیں ہونے دی اور بلند آواز سے پکارنے لگی۔ "جیمز؟ باہر نکل آؤ۔"

ٹرش منہ پھاڑے فرانسس کو دیکھنے لگی۔

"جیمز!" فرانسس دوبارہ چیخی۔

"میں یہاں ہوں۔" جواباً آواز آئی۔

دونوں خواتین آواز کی سمت دیکھنے لگیں۔ وہاں جیمز کھڑا ہوا تھا۔

"ویل، ویل، ویل۔" فرانس نے اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "مفرور حاضر ہوگیا ہے۔"

ٹرش کا چہرہ پھیکا پڑ چکا تھا۔ وہ بے ساختہ بولی۔ "آئی ایم سوری، جیمز! مجھے نہیں معلوم کہ اسے کیسے پتا چلا۔"

"سب ٹھیک ہے، ٹرش۔" جیمز نے کہا۔ "ہم بہرحال اب یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں، او کے؟"

جیمز کے ہاتھ میں ایک ڈوری اور ماسکنگ ٹیپ کا رول تھا۔ "سوری مس ویلنٹائن! ہمیں یہاں سے عجلت میں نکلنا ہے۔ اس لیے میں تمہیں باندھے جا رہا ہوں۔"

"میرے خیال میں تم ایسا نہیں کر سکو گے۔" فرانسس نے کہا۔ ساتھ ہی اس نے اپنے پرس میں سے ایک سیل فون نکال لیا اور اسے کان سے لگاتے ہوئے بولی۔

"تم نے سب کچھ سن لیا، لوسی؟"

"ہاں سن لیا۔" سیل فون سے فرانسس کی بیٹی شیرف لوسی کی آواز خاموش کمرے میں صاف سنائی دے رہی تھی۔

"ہم پہنچ چکے ہیں۔"

یہ سنتے ہی جیمز کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا اور چہرہ لٹک گیا۔ "تم نے شیرف کو اس وقت آن لائن لے لیا تھا جب تم نے فون کمپنی کا ریکارڈ والا کاغذ نکالنے کے لیے پرس میں ہاتھ ڈالا تھا۔"

ٹرش کی آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہوگئے۔ "اسے جانے دیں مس ویلنٹائن۔ تھوڑی سی رقم کی تو بات ہے۔"

"اس نے قانون شکنی کی ہے ٹرش بلکہ تم دونوں نے کی ہے۔" فرانسس نے کہا۔

جیمز تھکے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔ "اگر تمہیں معلوم تھا تو تم نے شیرف کو پہلے ہی سے فون کیوں نہیں کیا؟"

"میں اس بارے میں مکمل طور پر پُریقین نہیں تھی۔" فرانسس نے بتایا۔ "مجھے صرف اتنا پتا تھا کہ اپارٹمنٹ میں کوئی موجود ہے۔"

"لیکن تمہیں میری موجودگی کا پتا کیوں کر ہوا؟"

اتنے میں دیوار پر لگے ہوئے قدیم کلاک نے سوا بارہ کا گجر بجایا۔ ان سب کی نظریں وال کلاک کی جانب اٹھ گئیں۔

ٹرش نے اپنی آنکھیں میچ لیں۔ "اس کلاک کی وجہ سے!" اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔

فرانسس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "اپارٹمنٹ سے تمہاری غیر حاضری ایک مہینے سے زیادہ عرصے کی تھی۔ اگر کوئی اس قدیم کلاک میں روزانہ چابی نہیں بھر رہا ہوتا تو اس کو... رک جانا تھا اور یہ وقت نہیں بتا سکتا تھا۔ اس کا پینڈولم بھی حرکت نہ کرتا۔"

ٹرش کے شانے لٹک گئے۔ جیمز کا چہرہ سپاٹ ہوگیا۔

"پکڑے جانے کا کیا جواز بن گیا۔" وہ بڑبڑایا۔

"وقت کی جکڑ اسی کو کہتے ہیں۔" فرانسس نے تبصرہ کیا۔

اسی اثنا میں دروازے پر دستک ہوئی اور شیرف لوسی اپنی پولیس ٹیم کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوگئی۔

UrduBooks.pk

پائپ کی گواہی

تنویر ریاض

عادتیں بدلنا مشکل ہی نہیں، ناممکن ہوتا ہے... کیونکہ وہ رگ و پے میں اُتر چکی ہوتی ہیں... اور پھر یہی عادات کبھی کبھی جان لیوا بھی ثابت ہو جاتی ہیں... ایک جج کی ناگہانی موت نے سبھی کو ششدر کر دیا تھا۔ بیوی کی حالت دگرگوں تھی۔ وہ اس سانحے کو تسلیم کرنے پر تیار نہ تھی۔ شوہر کی بے وقت موت نے اسے وسوسوں اور اندیشوں میں جکڑ دیا تھا۔

تمباکو نوشی کی لت میں مبتلا جج کی پُراسرار موت کا معما

جب سینا نے سان فرانسسکو مارننگ کال میں شائع ہونے والی جج رابرٹ شیلون کی خبر کے بارے میں بتایا جس کی موت اس کی اسٹڈی میں ہوئی تھی تو کومین کین نے اس میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی۔ وہ قتل کے ایسے کیس حل کرنے میں مہارت رکھتا تھا جو پیچیدہ اور بظاہر ناممکن نظر آتے ہوں جبکہ اس نامور جج کے خاندانی معالج ڈاکٹر مارٹی فلپ کا کہنا تھا کہ رابرٹ کی موت دل کی شریانوں میں خون جمنے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ اس نوعیت کی طبعی اموات میں اس کی دلچسپی

نہ ہونے کے برابر تھی۔

بعد میں اسے اپنا ذہن تبدیل کرنا پڑا جب ایک خوشگوار صبح ایک دبلی پتلی عورت سیاہ ماتمی لباس، سیاہ ہیٹ اور سیاہ جالی دار نقاب لگائے مارکیٹ اسٹریٹ پر واقع اس کے دفتر میں داخل ہوئی۔ اس نے اپنا تعارف جج کی بیوہ مارگریٹ شیلون کے طور پر کروایا اور کہا کہ اسے اپنے شوہر کی اچانک موت پر سنجیدہ نوعیت کے تحفظات ہیں۔''

''تحفظات؟'' کوئین نے پوچھا۔ ''میں کچھ سمجھا نہیں مسز شیلون۔''

''وہ صرف بیالیس سال کا تھا اور اس کی صحت بالکل ٹھیک تھی۔ اسے کبھی دل کی تکلیف نہیں ہوئی۔''

سینا نے آہستہ سے کہا۔ ''بظاہر صحت مند نظر آنے والے اوسط عمر کے افراد کی اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔''

''جانتی ہوں لیکن اس کے باوجود میں یہ محسوس کرتی ہوں کہ رابرٹ کی موت طبعی نہیں تھی۔''

''کیا تمہارے پاس یہ شبہ کرنے کی کوئی ٹھوس وجہ ہے؟''

''ہاں، اسے تین دن پہلے ایک خط موصول ہوا تھا جس میں اسے جان سے مارنے کی دھمکی دی گئی تھی۔''

''وہ گمنام خط تھا یا اس پر بھیجنے والے کا نام درج تھا؟''

''گمنام، لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ خط اسے کس نے بھیجا ہوگا۔''

''تمہارے خیال میں وہ کون ہو سکتا ہے؟''

''اس کا نام جارج ہے۔ چھ سال قبل رابرٹ نے اسے قتل کے الزام میں جیل بھیج دیا تھا۔ وہ دورانِ سماعت اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا رہا اور جب اسے سزا سنائی گئی تو اس نے عہد کیا کہ وہ اس بے رحمی کا انتقام لے گا۔ وہ نو دن پہلے ہی جیل سے رہا ہوا ہے۔''

''کیا تمہارے پاس وہ خط ہے؟''

''نہیں، رابرٹ نے اسے ضائع کر دیا تھا۔''

''کیا اس نے تمہیں وہ خط دکھایا تھا یا صرف بتایا کہ اس میں کیا لکھا ہے؟''

''ہاں، اس نے صرف اس کا ذکر کیا تھا۔''

''کیا وہ اس دھمکی کی وجہ سے پریشان تھا؟''

مسز شیلون نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''وہ خوف زدہ نہیں تھا لیکن میں بہت زیادہ پریشان ہو گئی تھی۔''

کوئین نے پوچھا۔ ''کیا اس کے اور دشمن بھی تھے جو اسے نقصان پہنچانا چاہتے ہوں؟''

''میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتی لیکن رابرٹ جیسے سخت گیر اور اصول پسند شخص کے کئی دشمن ہو سکتے ہیں۔''

''کیا تمہیں ڈاکٹر کی تشخیص پر شبہ ہے؟''

''رابرٹ اور میری شادی سے پہلے بھی ڈاکٹر فلپ کئی برسوں تک میرے باپ کا معالج رہ چکا ہے اور اس کی تشخیص ہمیشہ درست ہوتی ہے۔'' اس عورت نے رومال سے آنکھیں صاف کرنے کے لیے اپنا جالی دار نقاب ذرا سا ہٹایا تو کوئین نے اس کے چہرے کی ایک جھلک دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا کہ وہ کافی پُرکشش تھی۔ اس نے بے تکلفی کے عالم میں پوچھا۔

''کیا کوئی ایسی صورت ہے جس میں کسی شخص کو اچانک ہی جان لیوا دل کا دورہ پڑ جائے؟''

''ایسا صرف جسمانی تشدد یا دہشت کی وجہ سے ہو سکتا ہے۔'' کوئین نے جواب دیا۔

''دہشت؟'' مسز شیلون نے سر اٹھا کر دیکھا۔

''میرے علم میں ایک واقعہ ہے جب متاثرہ شخص ایک ایسی شے کو دیکھ کر چل بسا جسے وہ بھوت سمجھ رہا تھا۔''

''رابرٹ کے معاملے میں یہ ناممکن ہے جیسا کہ میں بتا چکی ہوں کہ وہ ڈرپوک نہیں تھا اور نہ ہی وہ بھوتوں پر یقین رکھتا تھا۔''

''جب اسے دل کا دورہ پڑا تو کیا اس وقت وہ مطالعے کے کمرے میں اکیلا تھا اور وہاں کے تمام دروازے، کھڑکیاں بند تھیں؟''

''ہاں وہ روزانہ کام کرنے یا غور و فکر کی نیت سے تقریباً دو گھنٹے اس کمرے میں گزارتا تھا اور یہ اس کی پرانی عادت تھی کہ دروازہ اندر سے بند کر لیتا تاکہ کوئی اسے ڈسٹرب نہ کرے۔ یہاں تک کہ میں نے بھی اتنی بہادری نہیں دکھائی کہ کسی ضروری کام کے علاوہ اس کمرے میں جاؤں۔''

''بہادری؟'' سینا بولی۔ ''اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''

''وہ کمرا ہر وقت دھوئیں سے بھرا رہتا تھا۔ وہ کام کے دوران مسلسل پائپ پیتا رہتا، اس کا کہنا تھا کہ اس طرح اس کی قوتِ ارتکاز کئی گنا بڑھ جاتی ہے اور وہ پائپ میں بہت ہی تیز قسم کا تمباکو استعمال کرتا تھا۔ میری مخالفت کی وجہ سے وہ اپنی اسٹڈی یا گھر سے باہر تمباکو نوشی کیا کرتا

تھا۔''

کوئین کو خود بھی پائپ کی طلب ہو رہی تھی لیکن سینا کی آنکھوں میں اشتباہ دیکھ کر اس نے وقتی طور پر پائپ پینے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور اپنی داڑھی کھجانے لگا۔

''کیا اس رات تمہارے شوہر کے انتقال سے قبل کوئی اس سے کوئی ملنے آیا تھا؟'' سینا سے پوچھا۔

''نہیں۔''

''کوئی فون کال؟''

''کوئی نہیں، ورنہ میں گھنٹی کی آواز سن لیتی۔''

''کیا وہ کسی وقت کمرے سے باہر آیا؟''

''میرے علم میں نہیں۔ ویسے وہ عام طور پر اپنا کام ختم کیے بغیر کمرے سے باہر نہیں آتا تھا۔''

''اخبار کی خبر کے مطابق تم نے اس کی چیخ سنی۔'' کوئین نے کہا۔ ''جیسے وہ مدد کے لیے پکار رہا ہو۔''

مارگریٹ نے کہا۔ ''چیخ تو نہیں البتہ یوں لگا جیسے اچانک اسے کوئی تکلیف ہو گئی ہو پھر وہ زور سے چلایا اور اس سے پہلے ایک بھاری آواز سنائی دی۔''

''اس نے چلاتے ہوئے کیا لفظ کہا تھا؟''

''میں یقین سے نہیں کہہ سکتی لیکن شاید اس نے پیٹ میں درد کہا تھا۔''

''اور وہ آواز کیسی تھی؟''

''جیسے دو سخت چیزیں آپس میں ٹکراتی ہوں۔''

''اس وقت تم کہاں تھیں؟''

''اسٹڈی کے برابر ملاقاتی کمرے میں رابرٹ کے سوتیلے بھائی پیٹر لیسن اور پڑوسی جیروم پاکسن کے ساتھ گیم کھیل رہی تھی۔ جیسے ہی اس کے چلانے کی آواز سنی ہم اسٹڈی کی طرف بھاگے۔''

''کیا تم نے اس کے علاوہ بھی اندر سے کوئی آواز سنی؟''

''نہیں، ہم نے رابرٹ کو آواز دی لیکن کوئی جواب نہیں ملا تو جیروم اور پیٹر نے دروازے پر زور آزمائی کی اور اندر داخل ہو گئے۔ وہ دروازے سے تھوڑی ہی دور فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ......'' مسز شیلون نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔

''ہم ڈاکٹر فلپ کو فون کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ زیادہ دور نہیں رہتا۔''

''کیا تم نے وہاں کوئی ایسی چیز دیکھی جو غیر معمولی لگی ہو؟''

''میں نے غور نہیں کیا۔ اس وقت میری توجہ رابرٹ پر تھی۔''

''کیا اب بھی سب چیزیں اپنی جگہ پر ہیں جیسی اس رات تھیں؟''

''ہاں، میں ابھی تک اس کمرے میں جانے کا حوصلہ نہیں کر سکی۔''

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا۔ مسز شیلون نے اپنا رومال لپیٹ کر ہاتھوں میں دبا لیا اور سوچتی ہوئی آنکھوں سے پہلے کوئین اور پھر سینا کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں جانتی ہوں کہ بظاہر یہ ایک خوفناک طریقے سے پیش آنے والا حادثہ ہے لیکن میں اپنے شبہات کو مسترد نہیں کر سکتی۔ رابرٹ تمہاری ایجنسی کی بہت تعریف کیا کرتا تھا۔ خاص طور پر گزشتہ برس چائنا ٹاؤن والے اسکینڈل کے بعد اس کا کہنا تھا کہ تم نے اس شہر کے سب سے زیادہ قابلِ اعتبار سراغ رساں کے طور پر اپنی ساکھ بنالی ہے۔ کیا تم اس سلسلے میں کچھ کر سکتے ہو؟''

سینا کے چہرے اور اس کی گہری نیلی آنکھوں میں ابھرنے والے تاثرات دیکھ کر کوئین سمجھ گیا کہ وہ انکار کرنے والی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی۔ وہ بول اٹھا۔

''ہم اس معاملے کی تحقیقات کر سکتے ہیں مسز شیلون گو کہ تم نے جو صورتِ حال بتائی ہے، اس میں کسی نتیجے کی نہیں البتہ کوشش کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔''

''میں بھی کوشش کرنے کے لیے ہی کہہ رہی ہوں۔''

''پھر ہماری خدمات حاضر ہیں۔'' اس نے سینا کی آنکھوں میں نامنظوری کی جھلک کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اس معاملے کو ذاتی طور پر دیکھوں گا اور اس کی شروعات تمہارے شوہر کی اسٹڈی کے معائنے سے ہو گی۔ اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو۔''

اسے کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن فی الوقت اس کی دوسری مصروفیت تھی۔ اسے اپنے شوہر کی تجہیز و تکفین کے انتظامات کے سلسلے میں جانا تھا۔ اس نے چار بجے کا وقت دیا۔ اس نے معاہدے پر دستخط کیے اور معاوضے کی پہلی قسط ادا کرنے کے بعد وہ چلی گئی۔

اس کے جاتے ہی سینا۔ نے غصے سے کہا۔ ''تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے جان۔ یہ جانتے ہوئے کہ اس کیس میں کچھ نہیں رکھا، تم نے صرف بھاری فیس کی خاطر ہامی بھر لی۔''

''اس فیس سے تو ہماری روٹی چلتی ہے۔'' اس نے

کہا۔ ''اسے معمولی مت سمجھو۔''

''کیا تمہیں واقعی یہ امید ہے کہ اس تحقیقات کے نتیجے میں تمہیں کسی فاؤل پلے کا سراغ مل جائے گا؟''

''اس کا امکان ہے۔ فی الحال ہمارے پاس کچھ نہیں لیکن اس عورت کے کھاتے میں ایک دو نکات ایسے ہیں جن پر چھان بین کی جاسکتی ہے۔''

''مثلاً؟''

کوئین مسکراتے ہوئے بولا۔ ''بشرطیکہ وہ کارآمد ثابت ہوئے تو تمہیں بھی معلوم ہوجائے گا۔''

ڈاکٹر مارٹی فلپ اپنے مکان میں ہی پریکٹس کیا کرتا تھا جو مسز شیلون کی رہائش گاہ سے چند بلاک کے فاصلے پر تھا۔ خوش قسمتی سے اس وقت وہ کسی مریض کو نہیں دیکھ رہا تھا جب کوئین اس سے ملنے پہنچا۔ اس نے ایک نرس کے ذریعے ڈاکٹر کو اپنی آمد کی اطلاع دی۔ ڈاکٹر کی عمر ستر برس سے زائد تھی۔ طویل قامت، گنجے سر اور روشن آنکھوں نے اس کی شخصیت کو پُرکشش بنادیا تھا لیکن جب کوئین نے اپنی آمد کی وجہ بتائی تو اس کا لہجہ تلخ ہوگیا۔

''مسز شیلون اس وقت رنج کی کیفیت میں ہے اور دماغ سے نہیں سوچ رہی۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''اسے اس قسم کی فضول تحقیقات کے بجائے آرام کی ضرورت ہے۔''

''لیکن اس نے مجھے اس کا معاوضہ دیا ہے اور میں کبھی کوئی فضول کام نہیں کیا کرتا۔''

''تم اپنا وقت اور اس کا پیسا ضائع کررہے ہو۔ اس کے نتیجے میں تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جج کی موت دل کا دورہ پڑنے سے واقع ہوئی۔ میں نے اس طرح کے درجنوں کیس دیکھے ہیں۔''

''میں یا وہ تمہاری تشخیص پر شبہ نہیں کررہے۔'' کوئین نے چرب زبانی سے کہا۔ ''لیکن میں تمہارا بے حد ممنون ہوں گا اگر تم میرے کچھ سوالوں کا جواب دے سکو جن سے اس کے شبہات دور کرنے اور اسے پُرسکون کرنے میں مدد ملے گی۔''

''ٹھیک ہے لیکن میں تمہیں زیادہ وقت نہیں دے سکوں گا۔''

''جب تم وہاں پہنچے تو رابرٹ کی لاش کمرے کے فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ کیا وہ اسی حالت میں تھی جس میں وہ پائی گئی؟''

''کیا تم یہ پوچھ رہے ہو کہ اسے اپنی جگہ سے ہٹایا گیا تھا تو میرا جواب نہیں میں ہے۔''

''وہ کس پوزیشن میں لیٹا ہوا تھا؟''

''پوزیشن؟ میں کچھ سمجھا نہیں۔''

''میرا مطلب ہے کہ وہ چت لیٹا ہوا تھا، اوندھا یا کروٹ کے بل۔ اس کے ہاتھ پاؤں سیدھے تھے یا مڑے ہوئے؟''

''فضول سوال ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''وہ نومولود بچے کی طرح دائیں جانب بل کھائے ہوئے تھا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے جسم کے درمیانی حصے کو دبایا ہوا تھا۔''

''دل کا دورہ پڑنے کی صورت میں تو سینے کو دبایا جاتا ہے۔''

''ضروری نہیں۔ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ جان کنی کی کیفیت میں کوئی بھی مختلف ردِعمل ظاہر ہوسکتا ہے۔''

''کیا مسز شیلون یا اس کے مہمانوں نے تمہیں بتایا کہ کیا سن کر وہ اسٹڈی کی جانب متوجہ ہوئے۔ کوئی چیخ یا پیٹ میں درد کی تکلیف کے الفاظ؟''

''ہاں، مجھے اس بارے میں بتایا گیا تھا۔''

''کیا تم نہیں سمجھتے کہ جس شخص کو دل کا دورہ پڑا ہو وہ پیٹ میں درد کی شکایت کیوں کرے گا؟''

''میں نے تمہیں بتایا ہے کہ جان کنی کی کیفیت میں کوئی بھی ردِعمل ظاہر ہوسکتا ہے۔ ممکن ہے کہ پہلے اس نے پیٹ میں درد محسوس کیا ہو۔''

''تمہارے خیال میں وہ اس وقت کہاں ہوگا جب اسے دل کا دورہ پڑا، اپنی میز پر یا کمرے میں کسی اور جگہ؟''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ کہاں تھا۔ وہ چلّایا اور دروازہ کھولنے سے پہلے ہی گر پڑا۔''

''تم نے اس کا اسی جگہ معائنہ کیا جہاں وہ لیٹا ہوا تھا؟''

''ظاہر ہے۔ مجھے موت کی وجہ کا تعین کرنے میں کافی دیر لگی۔'' ڈاکٹر نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''کمرا تمباکو کے دھوئیں سے بھرا ہوا تھا جیسے ہلکی دھند چھائی ہوئی ہو۔ میرے لیے یہ ناقابلِ برداشت تھا اور اس کی وجہ سے مجھے سانس لینے میں دشواری ہورہی تھی۔''

''کیا تم نے بعد میں لاش کا دوبارہ معائنہ کیا؟''

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں تھی۔'' اس نے ایک بار پھر ہونٹ سکیڑے۔ ''حقیقت تو یہ ہے کہ جج شیلون بہت زیادہ تمباکو نوشی کرتا تھا۔ میں نے اسے کئی بار تنبیہ کی لیکن اس نے میری ایک نہیں سنی۔''

''تمہیں تنبیہ کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟''

''اس طرح کے تیز تمباکو کا مسلسل استعمال صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔ ممکن ہے کہ اسی وجہ سے اسے دل کا دورہ پڑا ہو۔''

''لیکن مسز شیلون نے مجھے بتایا ہے کہ اس کی صحت بہت اچھی تھی۔''

''جب میں نے اسے آخری بار زندہ دیکھا تو مجھے بھی وہ بالکل ٹھیک لگا لیکن بعض اوقات ظاہری حالت بھی دھوکا دے جاتی ہے۔''

تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' کوئین نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر نے دیوار پر لگے ہوئے کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا وقت ختم ہو گیا۔ اب تم مطمئن ہو گئے ہو گے۔''

کوئین نے سر ہلا دیا جبکہ وہ پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔

شیلون ہوم ڈاکٹر کے گھر کے مقابلے میں بہت بڑا اور کہیں زیادہ خوب صورت تھا۔ کوئین ٹھیک چار بجے وہاں پہنچ گیا۔ اسے توقع تھی کہ مسز مارگریٹ شیلون خود دروازے پر آئے گی لیکن اس کے بجائے ایک مرد نے دروازہ کھولا۔ وہ ایک لمبے قد کا دبلا پتلا چالیس سالہ شخص تھا جس نے عمدہ تراش کا قیمتی سوٹ اور سیاہ چمکدار جوتے پہن رکھے تھے تاہم اس کے رویے اور آواز میں استقبالیہ جھلک نہیں تھی۔

''میرے خیال میں تم ہی جان کوئین ہو؟'' اس نے کہا۔

''درست، میری مسز شیلون سے ملاقات طے ہے۔''

''اس نے مجھے بتایا تھا لیکن اس سے پہلے کہ تم اندر جاؤ۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

''اچھا، لیکن تم کون ہو؟''

''جیروم پاکسن۔'' اس نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کیا اور بولا۔ ''میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ اس نے انتہائی غم کی کیفیت میں تمہاری خدمات حاصل کر کے غلطی کی ہے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے تکلیف ہو رہی ہے کہ وہ ایک جذباتی عورت ہے اور بلاوجہ اندیشوں میں گھری رہتی ہے۔''

''لگتا ہے کہ تم اسے بہت اچھی طرح جانتے ہو؟''

''بالکل، میں اس کا پڑوسی ہی نہیں بلکہ دوست بھی ہوں۔ یقیناً رابرٹ کی موت ایک حادثہ ہے جو اچانک دل کا دورہ پڑنے سے ہوئی۔ تمہیں مسز شیلون نے ضرور بتایا ہو گا کہ اس رات میں بھی یہیں موجود تھا اور صرف میں ہی نہیں بلکہ اس کا دیور پیٹر لیسن بھی اس کی تصدیق کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ جس ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کیا، وہ بھی تمہیں بتائے گا کہ رابرٹ کی موت دل کا دورہ پڑنے سے ہوئی۔''

''وہ مجھے پہلے ہی بتا چکا ہے۔'' کوئین نے کہا۔ ''میں اس سے مل چکا ہوں۔''

''جب تم اس سے بات کر چکے ہو تو تمہیں محسوس ہو جانا چاہیے کہ اس بارے میں مزید تحقیقات بالکل غیر ضروری اور بے مقصد ہے اور اس سے مارگریٹ کی ذہنی صحت متاثر ہو سکتی ہے۔ تمہاری بڑی مہربانی ہو گی اگر تم اپنی یہ کوشش ترک کر دو۔''

''جب تک مسز مارگریٹ خود نہ کہے، میں ایسا نہیں کر سکتا۔''

''انتہائی بدلحاظ شخص ہو۔'' پاکسن نے تیوری چڑھاتے ہوئے کہا۔

''مجھے صورتِ حال کے مطابق چلنا ہوتا ہے۔'' کوئین نے بے رخی سے جواب دیا۔ ''فی الحال میں مسز شیلون سے ملنا چاہوں گا۔''

پاکسن کچھ اور کہنا چاہ رہا تھا لیکن اس نے اپنا ارادہ بدلتے ہوئے اچانک ہی دروازے کو دھکا دیا اور کوئین اس کے پیچھے اندر چلا گیا۔ وہ ایک مختصر راہداری سے پارلر میں داخل ہوئے جس میں قیمتی فرنیچر رکھا ہوا تھا اور ایک بڑی سی تاش کھیلنے کی گول میز جس کے گرد چار کرسیاں بھی تھیں۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس گھر میں باقاعدگی سے تاش کھیلے جاتے ہیں۔

مارگریٹ شیلون ایک صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ رانوں پر رکھے ہوئے تھے۔ اس وقت بھی اس نے ماتمی لباس پہن رکھا تھا۔ البتہ سر پر ہیٹ اور چہرے پر جالی دار نقاب نہیں تھا۔ اس کی عمر پینتیس سال سے زیادہ نہیں تھی اور کوئین نے ایجنسی میں اس کی جھلک دیکھ کر جو تاثر قائم کیا تھا، اس سے کہیں زیادہ پُرکشش نظر آ رہی تھی۔ پاکسن بھی اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔

''ہمارے پاس غیر ضروری باتوں میں وقت ضائع کرنے کی گنجائش نہیں ہے مسز شیلون۔'' کوئین نے کہا۔ ''اور مجھے یقین ہے کہ تم اس سے اتفاق کرو گی۔ لہٰذا میں فوری طور پر تمہارے شوہر کی اسٹڈی دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''ہاں بالکل۔'' اس نے ایک اندرونی دیوار میں بند دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

’’لیکن تم وہاں اکیلے جاؤ گے۔ مجھ میں ابھی اندر جانے کی ہمت نہیں ہے۔‘‘

’’جیسے تمہاری مرضی۔‘‘ اس نے کہا۔ وہ خود بھی یہی چاہتا تھا۔

پاکسن نے کہا۔ ’’اس بات کا خیال رکھنا کہ اسٹڈی میں وقت ضائع کرنے کے دوران تم کسی چیز کو ہاتھ نہ لگاؤ۔‘‘

کوئین اسے کوئی سخت جواب دینا چاہ رہا تھا لیکن کچھ سوچ کر خاموش ہو گیا۔ وہ مسز شیلون کے سامنے تعظیماً جھکا اور اسٹڈی کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ کھڑکیوں کے پردے گرے ہوئے تھے اور کمرے میں اندھیرا تھا۔ اس نے دیوار پر لگا ہوا سوئچ تلاش کیا اور چھت پر لگے ہوئے بلب روشن ہو گئے۔ دروازے کی چٹخنی اور پٹ دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے زبردستی کھولا گیا ہے لیکن اس نے اپنے اطمینان کے لیے ان کا معائنہ کیا کہ کیا دروازہ واقعی اندر سے بند تھا۔ پیتل کی بڑی سی چابی ابھی تک تالے میں لگی ہوئی تھی، اس نے دروازہ بند کیا اور چند سیکنڈ تک کمرے کا جائزہ لیتا رہا۔

وہ خاصا بڑا کمرا تھا جس کی ایک دیوار پر کتابوں کے شیلف لگے ہوئے تھے جن میں قانون کی کتابیں رکھی ہوئی تھیں جبکہ دوسری دیوار پر دو آئل پینٹنگز آویزاں تھیں جن میں کمرائے عدالت کے مناظر کی عکاسی کی گئی تھی۔ اس کمرے کا فرنیچر بھی پارلر کی طرح قیمتی مہاگنی لکڑی کا تھا جس میں ایک بڑی سی میز، فائل کیبنٹ، دو آرام کرسیاں اور فرش پر گہرے نیلے رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا۔ رابرٹ کے استعمال میں آنے والے تیز تمباکو کی کڑوی بو فضا میں پھیلی ہوئی تھی جو کئی سالوں سے اس کمرے کی ہر چیز میں سرایت کر چکی تھی۔ اگر کمرے کی تمام کھڑکیاں اور دروازے کھول دیے جاتے تب بھی یہ بُو باقی رہتی۔

کوئین کا پہلا تاثر اس کمرے میں موجود چیزوں کی ترتیب کے بارے میں تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رابرٹ نے یہاں کام کرنے، پڑھنے اور غور فکر کرنے میں زیادہ وقت گزارا تھا لیکن اس کے باوجود کمرے کی ترتیب میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ تمام قانونی کتابیں اور رسائل ایک میز پر ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔

کوئین نے کھڑکیوں کے پردے ہٹا کر چٹخنیاں دیکھیں۔ دونوں مضبوطی سے لگی ہوئی تھیں اور ان میں سے کوئی بھی اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی نہ تھی۔ اس کے بعد وہ میز کی طرف مڑا۔ میز کے پیچھے رکھی ہوئی گھومنے والی کرسی پیچھے کی جانب ایک ایسے زاویے پر کھسکی ہوئی تھی کہ اس کے صرف دو پہیے غالیچے پر تھے جو قالین کی حفاظت کے لیے بچھایا گیا تھا۔ میز کی اوپری چمک دار سطح پر تمام چیزیں ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں ٹیلی فون، تمباکو کا ڈبا، شیشے کی ایش ٹرے اور قلم دان، کچھ کاغذ اور ایک قانون کی کتاب شامل تھی۔ کرسی اور غالیچے کی پوزیشن کو دیکھ کر ایسا نہیں لگتا تھا کہ جج کی موت اس وقت واقع ہوئی جب وہ یہاں بیٹھا ہوا تھا۔

لیکن اس کے برعکس بھی کچھ علامات نظر آئیں۔ اس نے میز کی اوپری سطح کو قریب سے دیکھا تو دو اہم باتوں کا انکشاف ہوا۔ میز کے دائیں کنارے کے نزدیک ایک چھوٹا سا دھبا نظر آیا جیسے کسی چیز کے گرنے سے نشان پڑ جائے اور تمباکو کی راکھ کے کچھ دھبے جو بلاٹنگ پیپر کے دائیں جانب نچلے کونے سے چپکے ہوئے تھے۔ اس نے اپنی انگلی سے چھو کر دیکھا۔ یہ راکھ حال ہی میں پی جانے والے تمباکو کی تھی۔

اسے میز کی سطح پر مزید راکھ نظر نہیں آئی لیکن برابر میں رکھی ہوئی ٹوکری میں پائپ میں بچے ہوئے تمباکو کا گل بکھرا ہوا تھا۔ جب اس نے ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل جھک کر سر کو نیچے کیا تو اسے کئی دھبے نظر آئے۔ اس کے علاوہ اس نے ایک چھوٹا جھلنے کا نشان بھی دیکھا جو انگارے کے جلنے سے بنتا ہے۔ ایک بار پھر اس کی نظریں اپنی جگہ سے ہٹے ہوئے قالین کے ٹکڑے پر گئیں۔ اس نے کرسی کو دھکیل کر نیچے بچھے ہوئے قالین کو دیکھنے کے لیے وہ ٹکڑا اٹھایا تو وہاں ایک اور نسبتاً بڑا جلنے کا نشان نظر آیا۔

ان تمام باتوں سے اس حقیقت کو تقویت ملی کہ رابرٹ مرتے وقت اپنی میز پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کی موت کی وجہ قدرتی نہیں تھی۔ اس جیسا نازک مزاج شخص کبھی بھی جلتی ہوئی راکھ کو قیمتی قالین پر گرنے نہیں دیتا۔ اس کی تصدیق یوں بھی ہو رہی تھی کہ قالین پر کسی اور جگہ جلے ہوئے نشان نظر نہیں آئے اور نہ ہی وہ بے پروائی سے کوئی چیز میز پر گراتا جس سے اس کی سطح پر نشان پڑ جاتا جیسے جلتا ہوا پائپ۔ یہ سب ایک اچانک اور شدید حملے کی صورت میں ہی ممکن تھا جس کے نتیجے میں یہ دونوں باتیں ظہور پذیر ہوئیں۔

حملے کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ وہ ایک جھٹکے سے اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا اور امکان یہی ہے کہ اس نے کرسی کو مزید پیچھے دھکیل دیا ہو گا اور وہ جو کام کر رہا تھا اس میں جزوی طور پر گڑبڑ ہو گئی۔ جو پائپ پی رہا تھا، وہ اس کے منہ سے نکل کر جلتی ہوئی چنگاریاں بکھیرتا ہوا میز کے کنارے پر

جا کر لگا۔ اس کے گرنے سے جو آواز ہوئی وہی مسز شیلون اور دوسرے لوگوں نے سنی۔ اس کے بعد اس کے حلق سے ایک چیخ نکلی، وہ لڑکھڑایا اور دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ مر گیا۔

تحقیقات کا یہ حصہ بالکل واضح تھا لیکن وہاں کوئی پائپ نظر نہیں آیا سوائے بلاٹنگ پیپر اور قالین پر لگے ہوئے دھبوں اور ٹوکری میں جلے ہوئے تمباکو کے گل کے علاوہ اور کچھ نہ ملا۔ میز پر قانون کی کتاب اور کاغذات دوبارہ ترتیب سے رکھ دیے گئے تھے غالیچہ کو قالین پر پڑے ہوئے جلنے کے نشانات چھپانے کے لیے کھسکایا گیا تھا اور کرسی کو میز کے قریب کر دیا گیا تھا۔ یہ صفائی اور ترتیب مارگریٹ شیلون یا اس کے کسی بااختیار فرد نے نہیں کی تھی۔ تو کیا قاتل کا کام تھا جو اس نے اس قتل پر سے لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لیے کیا تھا؟

اس کے بعد کوئین نے اس ڈبے پر توجہ مرکوز کی جس میں چھ مختلف قسم کے پائپ رکھے ہوئے تھے۔ کوئین سوچنے لگا کہ شیلون جو پائپ پی رہا تھا وہ اس ڈبے میں سے لیا گیا یا ان سے الگ تھا لیکن دونوں صورتوں میں اسے میز یا فرش پر ہونا چاہیے تھا۔ پھر ایک خیال کے تحت اس نے تمباکو کا ڈبا کھولا اور اس میں سے ایک چٹکی نکال کر سونگھی، یہ ورجینیا کی ایک قسم تھی جبکہ وہ خود نیوی کٹ پسند کرتا تھا۔ اس نے پتیوں کو انگوٹھے اور انگلی کے درمیان رکھ کر مسلا اور زبان سے چکھنے لگا۔ اس کا ذائقہ اور مہک عام تمباکو جیسی تھی۔

اس نے میز پر رکھا پیتل کا ڈبا کھولا۔ اس میں لکڑی کی ماچس اور مرغی کے پر رکھے ہوئے تھے جن سے پائپ کی جمی ہوئی نکوٹین کی تہ صاف کی جاتی ہے۔ وہ خود بھی اپنے فلیٹ اور دفتر میں ان کی اچھی خاصی مقدار رکھتا تھا۔ باکس بند کرتے وقت اس کی نظر پائپ کے اوپر اٹھے ہوئے پیالے پر گئی اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ صرف ایک نہیں بلکہ سب پائپوں میں اندر کی جانب کاربن کی تہ جمی ہوئی ہے۔ جج ایک بے پروا تمباکو نوش تھا۔ وہ پائپ کا تنا تو باقاعدگی سے صاف کیا کرتا تھا لیکن اس نے پیالے کی صفائی کو نظرانداز کر دیا۔ اس طرح کاربن جمع ہونے سے یہ پائپ بالآخر ناقابلِ استعمال ہوتے جاتے ہیں۔

وہ کچھ دیر کھڑا اپنی قائم کردہ رائے پر غور کرتا رہا پھر پارلر سے واپس چلا گیا۔ مارگریٹ شیلون اور جیروم پاکسن ابھی تک صوفے پر برابر، برابر بیٹھے ہوئے تھے بلکہ اب جیروم پہلے کی نسبت اس کے اور زیادہ قریب ہو گیا تھا۔ اس نے کوئین کی چبھتی ہوئی نظروں کی بھی پروا نہیں کی۔

”میں تم سے اکیلے میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں مسز شیلون۔“

”کیا تمہیں کچھ ملا؟“

”وہاں ایسی کوئی چیز نہیں جو یہ معلوم کر سکے۔“ پاکسن نے کہا۔ ”یہ صرف تمہیں پریشان کرنا چاہ رہا ہے مارگریٹ۔“

”تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا اگر میں اپنی موکلہ سے تنہائی میں کچھ باتیں کر لوں؟“

”مجھے اعتراض ہے......“

”پلیز جیروم۔“ مارگریٹ نے اس کی بات کاٹتے

ایک دلچسپ واقعہ

مُلّا نصیرالدین کے پاس ایک دن ایک مہمان آیا اور مرغی بھی ساتھ لایا تاکہ ملا نصیرالدین کو تکلیف نہ ہو۔ رات کو مُلّا نصیرالدین نے مرغی تیار کی اور دونوں نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔

کچھ دنوں کے بعد ملا نصیرالدین کے پاس پھر ایک مہمان آیا اور کہنے لگا میں آپ کے اس دوست کا دوست ہوں جو مرغی لایا تھا۔ ملا نے اس کی اچھی خاطر تواضع کی اور یہ سلسلہ جاری رہا۔ کچھ دنوں کے بعد پھر ایک مہمان آیا اس نے بھی یہی کہا کہ میں آپ کے اس دوست کا دوست ہوں جو مرغی لایا تھا۔ چار و ناچار ملا کو مہمان کی خاطر تواضع کرنی پڑی۔ اس طرح پھر ایک دن ملا نصیرالدین کے پاس ایک مہمان آیا اور کہنے لگا میں آپ کے اس مرغی والے کے دوست کا دوست ہوں۔ ملا نے اس کو بھی اندر بٹھایا پھر رات کو کھانے کے وقت اپنی بیوی سے بولے۔ ”شوربہ لے آؤ۔“

وہ شوربہ لے آئی تو مُلّا نے وہ مہمان کے آگے رکھ دیا۔ مہمان نے شوربہ چکھا تو اس میں نہ مرچ تھی نہ نمک نہ اور کچھ، صرف گرم پانی تھا۔ مہمان نے پوچھا کہ یہ کیسا شوربہ ہے تو ملا نے جواب دیا کہ۔ ”یہ اس مرغی کے شوربے کے شوربے کا شوربہ ہے۔“

میانوالی سے غازی مغل کا تعاون

ہوئے کہا۔ ”میں مسٹر کوئین سے اکیلے میں بات کرنا چاہوں گی۔ تمہیں یہاں مزید رکنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

”میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ اس کے جانے کے بعد چلا جاؤں گا۔“

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم میری فکر نہ کرو۔“

”کیسے نہ کروں۔ تمہاری بھلائی میرے لیے بہت اہم ہے۔“

اس کے جواب میں وہ دھیرے سے مسکرا دی۔ اس کے بعد پاکسن نے مزید بحث نہیں کی۔ اس نے کوئین کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور کھڑے ہوتے ہوئے مارگریٹ سے بولا۔

”اگر تمہیں میری ضرورت ہو تو فون کر لینا۔ میں شام کو گھر پر ہی رہوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد کوئین نے کہا۔ ”لگتا ہے کہ پڑوسی کو تمہارا بہت خیال ہے؟“

”میں بھی یہی سمجھتی ہوں۔ وہ بہت مہربان اور توجہ دینے والا شخص ہے۔“

”کیا تمہارے شوہر سے بھی اس کی اچھی دوستی تھی؟“

”ہاں بالکل، ہم دونوں سے ہی اس کی دوستی تھی۔“

”کیا وہ شادی شدہ ہے؟“

”نہیں، ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی۔ تین سال پہلے وہ پڑوس کے مکان میں آیا تھا جو اسے اس کی آنٹی سے ورثے میں ملا ہے۔“

”اس کی گزر اوقات کا ذریعہ کیا ہے؟“

”وہ جیکسن مینوفیکچرنگ میں ایگزیکٹو ہے۔“ اس نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا جیسے وہ موضوع بدلنا چاہ رہی ہو۔ ”تم مجھ سے کوئی بات کرنا چاہ رہے تھے مسٹر کوئین۔ کیا تمہیں رابرٹ کی اسٹڈی سے کوئی اہم بات معلوم ہوئی؟“

”فی الحال کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ تمہارے شوہر کا پسندیدہ پائپ کون سا تھا جسے وہ سب سے زیادہ استعمال کرتا ہو؟“

یہ سوال سن کر وہ چکرا گئی اور اس نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ وہ یہ کیوں جاننا چاہ رہا ہے۔

”ہاں، وہ ایک سفید اور زرد رنگ کا غیر معمولی پائپ تھا جو اسے کسی نے تحفے میں دیا تھا۔“

”کیا وہ یہی پائپ روزانہ استعمال کرتا تھا؟“

”ہاں، جہاں تک میں جانتی ہوں۔ میں نے اسے زیادہ تمباکو نوشی کرتے نہیں دیکھا سوائے اس کے کہ جب کبھی ہم ایک ساتھ باہر جاتے۔“

”تمہارے علاوہ اس کی اسٹڈی تک اور کس کی رسائی تھی؟“

”رسائی؟ میں کچھ سمجھی نہیں۔“

”میں اس سوال کو دوسری طرح کرتا ہوں۔ کیا رابرٹ اور تمہارے علاوہ کسی اور کے پاس اس مکان کی چابیاں ہیں؟ مثال کے طور پر تمہارا دیور؟“

”ہاں، پیٹر کے پاس ایک چابی ہے۔“

”اس کے علاوہ کوئی اور؟“

”جیروم۔ ہم نے آپس میں چابیوں کا تبادلہ کیا تھا تا کہ اگر کسی ایک کی چابی کھو جائے تو دوسرے سے لے سکیں۔ اس کے علاوہ کسی اور کے پاس مکان کی چابی نہیں۔ یہاں تک کہ ہم نے اس عورت کو بھی چابی نہیں دی جو ہفتے میں دو بار ہمارے مکان کی صفائی کرتی ہے۔ یقیناً تم ان میں سے......“

کوئین نے اس وقت تک اپنے شبہات کا ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا جب تک کہ ان کی تصدیق نہ ہو جائے۔ اس نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ”معاف کرنا، میں ایک بار پھر اسٹڈی میں جانا چاہوں گا۔“

”جیسے تمہاری مرضی۔“

وہ دوبارہ اسٹڈی میں آیا۔ دروازہ بند کیا اور پائپ ریک میں سے مطلوبہ پائپ اٹھا لیا۔ اس کا پیالہ خاصا بھاری تھا اور اس کے ایک جانب خراش کا نشان تھا جو گرتے وقت میز کے کنارے سے ٹکرانے پر بنا ہوگا۔ اس نے پیالے کو سونگھا اور پائپ کو رومال میں لپیٹ کر کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ اس کے بعد وہ واپس پارلر میں آگیا۔

”میرا کام مکمل ہو گیا مسز شیلون۔“ اس نے کہا۔ ”میں جانے سے پہلے چند سوالات اور کرنا چاہوں گا۔ تمہارے دیور کا ذریعۂ معاش کیا ہے؟“

”وہ نایاب کتابیں اور مسودوں کی خرید و فروخت کرتا ہے۔“

”اس کی کوئی دکان ہے؟“

”ہاں، اندرون شہر مسٹر اینڈ میسن میں اس کی دکان ہے جبکہ وہ ٹیلی گراف ہل پر رہتا ہے۔“

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہارے شوہر کی آخری رسومات کب ادا کی جائیں گی؟“

”جمعے کے روز دوپہر میں۔“

UrduBooks.PK

گویا دو دن بعد۔ اس طرح وہ جمعرات کے روز پیٹر لیسن کی دکان کا چکر لگا سکتا ہے۔ اس کے بعد سہ پہر میں وہ اپنی مؤکلہ سے ملنے آئے گا۔ مناسب ہوگا کہ پہلے اس کے کل کے پروگرام کے بارے میں معلوم کرلیا جائے جس پر اس نے کہا کہ وہ گھر پر ہی ہوگی کیونکہ لوگ ابھی تک اس سے تعزیت کرنے آرہے ہیں۔

"ٹھیک ہے۔ میں کل سہ پہر میں تم سے ملنے آؤں گا۔"

"کیا تمہیں امید ہے کہ مجھے کوئی قطعی بات بتا سکو گے؟"

"میں کوئی ضمانت نہیں دے سکتا۔ سوائے اس کے کہ اپنی طرف سے پوری کوشش کروں۔"

کوئین نے سیکرٹ سروس میں دس سال کی ملازمت اور پرائیویٹ سراغ رساں کے طور پر چھ سال کام کرکے ہر شعبۂ زندگی کے لوگوں سے تعلقات قائم کرلیے تھے۔ ان میں آرتھر اسکاٹ نامی ایک کیمسٹ بھی تھا جو بیٹری اسٹریٹ پر واقع ایک لیبارٹری میں کام کرتا تھا۔

مارگریٹ شیلون کے گھر سے نکل کر وہ سیدھا اسکاٹ کے پاس چلا گیا اور اپنے آنے کی وجہ بیان کی۔ تھوڑی سی بحث کے بعد ان کے درمیان اس کے معاوضے پر اتفاق ہوگیا اور اسکاٹ نے وعدہ کیا کہ وہ صبح تک رزلٹ دے دے گا۔ اس وقت شام کے سات بج رہے تھے۔ پیٹر کی دکان بند ہوچکی تھی اور سینا بھی دفتر بند کرکے گھر جاچکی ہوگی چنانچہ کوئین بھی گھر جانے سے پہلے اپنے پسندیدہ ریستوران میں ڈنر کرنے چلا گیا۔

اسکاٹ نے وعدے کے مطابق صبح نو بجے رپورٹ اسے دے دی جس کے بعد وہ لیسن سے ملنے چلا گیا۔ وہ ایک درمیانی عمر کا شخص تھا۔ اس نے کوئین کے مطلوبہ سوالوں کے جواب خوش اسلوبی سے دیے اور اس طرح یہ معما پوری طرح حل ہوگیا۔

وہ دوپہر کے وقت اپنے دفتر میں داخل ہوا۔ سینا اپنی میز پر موجود تھی۔ اس نے جدید طرز کا اسکرٹ اور سبز رنگ کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جان، آج تم بہت خوش نظر آرہے ہو؟"

"ہاں اور اس کی ایک معقول وجہ ہے۔ جج رابرٹ شیلون کی موت معما نہیں رہی۔ اسے قتل کیا گیا ہے۔"

اس نے بھویں چڑھاتے ہوئے کہا۔ "تمہیں اس پر یقین ہے؟"

"سو فیصد۔ میں جانتا ہوں کہ اسے کس نے قتل کیا ہے۔ اس کا محرک کیا تھا اور یہ کس طرح ہوا؟"

"پھر تو تم یہ کیس لینے میں حق بجانب تھے۔ کیا یہ وہی جارج نامی شخص ہے جس نے جج کو دھمکی آمیز خط لکھے تھے؟"

"نہیں، اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ سوائے اس کے کہ اس کی دھمکی کی وجہ سے مسز شیلون کو ہمارے دروازے پر آنا پڑا۔"

"پھر وہ کون ہے؟"

"شیلون کا پڑوسی جیروم پاکسن۔"

"اور قتل کا محرک کیا تھا؟"

"رقابت...... اس کا دل مارگریٹ پر آگیا تھا۔"

سینا چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی۔ "لیکن جس وقت جج کی موت واقع ہوئی، وہ مسز شیلون اور اس کے دیور کے ساتھ تاش کھیل رہا تھا پھر اس نے یہ قتل کیسے کیا؟"

"اس وقت اس نے کچھ نہیں کیا۔" کوئین نے کہا۔ "جج کی موت شریان میں خون جمنے سے نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر فلپ نے غلط تشخیص کی کیونکہ جو وجہ اس نے بتائی اور جو اصل وجہ تھی۔ ان دونوں کی علامات ایک جیسی تھیں۔ اس کے علاوہ جج کی اسٹڈی تمباکو کے دھوئیں سے بھری ہوئی تھی جس سے لاش کے معائنے کے دوران اس کی ناک بند ہوگئی۔"

"خدا کے واسطے جان...... پہیلیوں میں بات نہ کرو۔ یہ بتاؤ کہ شیلون کی موت کیسے واقع ہوئی؟"

"اسے زہر دیا گیا تھا۔"

"وہ کس طرح؟"

"نکوٹین کے ذریعے۔ خالص نکوٹین۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ اس کے تمباکو میں نکوٹین ملا دی گئی تھی؟"

"نہیں، خام نکوٹین کی بو بہت تیز ہوتی ہے اور تمباکو کو زہر آلود کرنے کے لیے جو مقدار درکار ہے، اس سے نکلنے والی بو کا ڈبا کھولتے ہی پتا چل جاتا۔ پاکسن نے جو طریقہ اختیار کیا۔ اس میں صرف ایک یا دو قطرے ہی کافی تھے۔ اس نے مقتول کی عادات اور ڈاکٹر فلپ کی سونگھنے کی صلاحیت پر بھروسا کیا۔"

"تم نے پھر بات کو گھمانا شروع کردیا۔" سینا نے غصے سے کہا۔ "کیا تم سیدھے سادے انداز میں وضاحت نہیں کرسکتے؟"

"میں اسی طرف آرہا ہوں۔ جج رابرٹ ایک بے

UrduBooks.PK

پروا شخص تھا۔ اس نے کبھی اپنے پائپ کے آگے بنی ہوئی کٹوری کو کسی چھوٹے چاقو سے صاف کرنے کی زحمت نہیں کی جیسا کہ تم نے مجھے بھی کرتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے ہر پائپ کی کٹوری میں کاربن کی تہ جمتی چلی گئی۔ پاکسن کیونکہ اس کے ساتھ کافی وقت گزارتا تھا۔ اس لیے اس نے جج کی اس عادت کا بغور مشاہدہ کیا اور اسی کے مطابق اس نے اپنا منصوبہ بنایا۔''

''اور وہ منصوبہ کیا تھا؟''

''اسے شیلون کے گھر تک رسائی حاصل تھی کیونکہ وہ مسز شیلون کے ساتھ چابیوں کا تبادلہ کر چکا تھا جیسا کہ اکثر پڑوسی کرتے ہیں۔ وہ اس روز ان کی غیر موجودگی میں آیا اور جج کے پسندیدہ پائپ کی جمی ہوئی کاربن میں نکوٹین ڈال دی۔ جب میں نے اس کی پیالی سونگھی تو فوراً سمجھ گیا کہ اس میں کچھ ڈالا گیا ہے۔ میں گزشتہ روز اسے اسکاٹ کے پاس لے کر گیا اور آج صبح اس نے باؤل میں جمی ہوئی کاربن کا تجزیہ کرنے کے بعد تصدیق کر دی کہ اس میں زہر جذب ہو چکا ہے۔ جب رابرٹ نے اس میں تمباکو ڈال کر آگ دکھائی۔ حل شدہ نکوٹین کے ابتدائی چند کش ہی اس مہلک دورے کے لیے کافی تھے۔''

''اوہ، اب سمجھی۔ اس نے خبیث بن کر ہوشیاری سے قتل کا طریقہ اپنایا۔''

''اس کے ساتھ ہی انتہائی تکلیف دہ بھی۔ نکوٹین کے زہر سے اس کے پیٹ میں شدید درد ہونا شروع ہو گیا۔ اسی لیے اس نے پیٹ میں درد کی آواز لگائی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اسے متلی بھی ہونے لگی۔ اسی لیے اس نے مرتے وقت اپنے ہاتھوں سے جسم کا درمیانی حصہ پکڑا ہوا تھا۔ اس کے منہ سے نکوٹین کی تیز بو آ رہی ہوگی لیکن ڈاکٹر اپنی کمزور قوتِ شامہ کی وجہ سے اسے نہ سونگھ سکا اور پاکسن اس بارے میں پہلے سے جانتا تھا۔ اگر ڈاکٹر اسے سونگھ لیتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ جج کے تمباکو میں کیا چیز ملائی گئی تھی۔ چنانچہ اسے لاش کے سطحی معائنے کے دوران ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا جس سے وہ موت کی اصل وجہ کے بارے میں جان سکتا۔''

''لیکن پاکسن نے خالص نکوٹین کس طرح حاصل کی؟ عام دکانوں پر تو اس کا ملنا مشکل ہے۔''

''اسے نکوٹین خریدنے کی ضرورت نہیں تھی۔'' کوئمین نے کہا۔ ''مجھے گزشتہ روز مسز شیلون نے بتایا کہ وہ جیکسن مینوفیکچرنگ میں ایگزیکٹیو ہے اور آج صبح پیٹرلیمن سے معلوم ہوا کہ یہ ایک کیمیکل کمپنی ہے جو دوسری چیزوں کے علاوہ نکوٹین سلفیٹ بھی بناتی ہے۔ یہ ایک کیڑے مار دوا ہے جو فصلی کیڑوں اور مکڑیوں کو مارنے کے کام آتی ہے۔''

سینا نے پوچھا۔ ''تمہیں پاکسن پر شبہ کیسے ہوا؟''

''باریک بینی سے مشاہدہ، پائپ اور زہر کے بارے میں معلومات، چھوٹے چھوٹے اشارے اور ان سے اخذ کردہ نتائج، ان سب نے مل کر میرا کام آسان کر دیا۔''

''جان۔'' وہ ناراض ہوتے ہوئے بولی۔

''چند حقائق کی روشنی میں مجھے آگے بڑھنے میں مدد ملی۔'' اس نے وضاحت کی ...... ''جج کی نازک مزاجی، میز کے کنارے پر پڑے ہوئے دھبے، جلنے کے نشانات، قالین پر پڑی ہوئی راکھ اور پاکسن کی مارگریٹ کی جانب حد سے زیادہ بڑھی ہوئی توجہ۔'' اس نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

''پاکسن ممکنہ طور پر گزشتہ روز دوبارہ شیلون ہاؤس میں داخل ہوا جب مسز شیلون ہمارے دفتر آئی تھی۔ اس نے قالین پر بکھری ہوئی راکھ صاف کی اور استعمال شدہ پائپ کو دوسرے پائپوں کے ساتھ ریک میں رکھ دیا اور مسز شیلون یہی سمجھی کہ پائپ اپنی جگہ پر نہیں ہے۔''

سینا کے پاس پوچھنے کے لیے کوئی سوال نہیں تھا لیکن اس نے اتنا ضرور کہا۔ ''بہرحال تم یہ ضرور محسوس کرو گے کہ جو شہادتیں تم نے اکٹھی کی ہیں، وہ واقعاتی ہیں۔ تمہارے پاس پاکسن کے خلاف کوئی قانونی ثبوت نہیں ہے کہ اسی نے پائپ میں نکوٹین کے قطرے ملائے۔''

''میں جانتا ہوں۔'' کوئمین نے کہا۔ ''میرا اس سے الجھنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے کیونکہ وہ کبھی اپنے جرم کا اعتراف نہیں کرے گا اور نہ ہی میں پولیس کے پاس جاؤں گا۔ میں آج کسی وقت مسز شیلون اور پیٹرلیمن سے مل کر انہیں یہ سب باتیں بتا دوں گا۔ اب یہ ان پر منحصر ہے کہ وہ ان معلومات کی روشنی میں کیا قدم اٹھاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی مناسب ہے۔ کیا تم اس سے اتفاق کرتی ہو؟''

''بالکل۔'' اس نے شرماتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تمہاری رفاقت پر فخر ہے۔''

''پھر مجھے اجازت دو کہ اس کامیابی کی خوشی میں ایک پائپ سلگا لوں۔''

''او نو۔'' وہ اٹھلاتے ہوئے بولی اور کھڑکی کھولنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

* * *

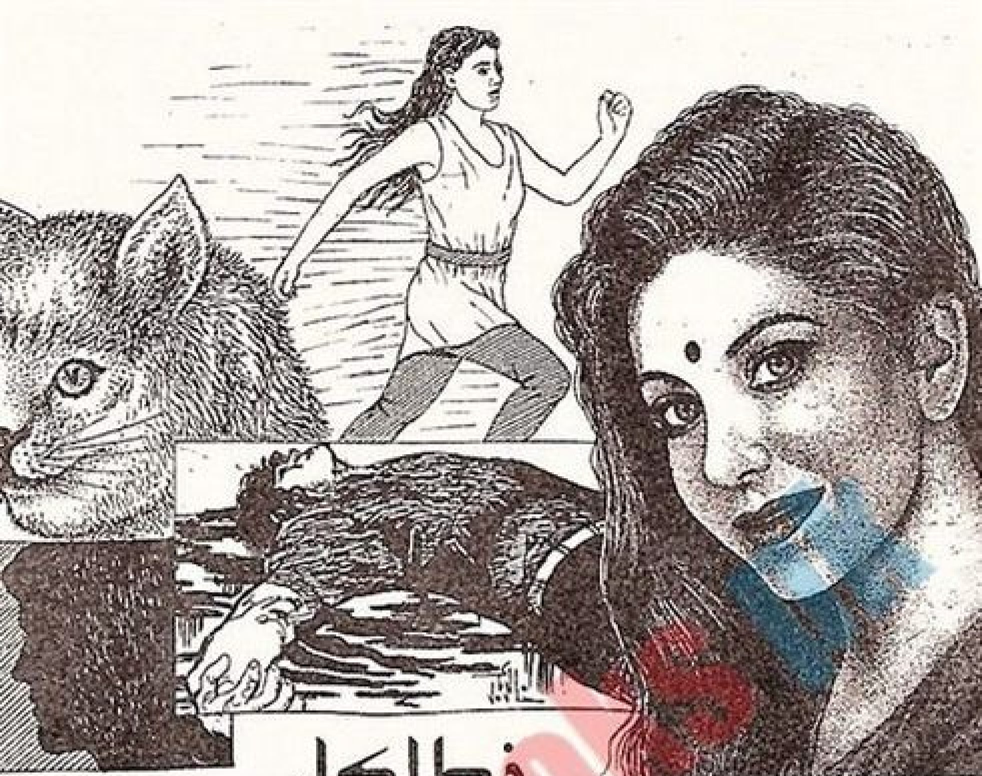

خطاکار

ماہ رخ ارباب

شرافت و نجابت کسی بھی خاندان کی پہچان ہوتی ہے... ایسے خاندان کا سربراہ اپنے اُصولوں سے ہٹ کر کسی بھی معاملے میں سمجھوتا کرنا پسند نہیں کرتا ؤہ اپنی خاندانی روایات و تہذیب کے امین اور تا زندگی عزت کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ معمولی خاندان سے آشنائی انہیں کسی طور قابلِ قبول نہیں ہوتی... ایک ایسے ہی نجیب الطرفین خاندان کا سپوت... وہ اپنے خاندان اور مسلک سے ہٹ کر روایت شکنی کا مرتکب ہو رہا تھا...

حسد و رقابت کے سرکش جذبات جو اپنی ہر حد پار کر چکے تھے

وہ بہت برق رفتاری سے نیچے آ رہی تھی۔ ایک ساتھ دو دو سیڑھیاں اُترنے کی کوشش میں دو بار اس کا پیر رپٹا۔ طویل سفید گاؤن بار بار پیروں میں اُلجھ کر تار تار ہونے لگا تھا لیکن اسے اس وقت کسی بات کی پروا نہیں تھی، جیسے تیسے کر کے وہ بیرونی دروازے کا قفل کھولنے میں کامیاب رہی۔ اس ساحلی شہر میں بے موسم کی بارش کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ عام حالات میں وہ اس سے لطف اندوز ہوتی مگر اس وقت ذہن پر ایک ہی بات سوار تھی کہ کسی طرح اس جگہ سے

باہر نکلا جائے۔ تیز پانی کے چھینٹے اس کے زخمی جسم پر کوڑوں کی طرح لگ رہے تھے۔ جسم پر جا بہ جا لگے دانتوں اور کھرونچوں کے نشانات سے مسلسل خون کی روانی جاری تھی۔ زخموں کی تکلیف کو سوا کرتا یہ احساس کہ یہ سلوک اس کے شوہر نے کیا ہے، اس کی کمزوری میں اضافہ کر رہا تھا۔ اپنی شب زفاف کو شوہر کی بربریت سے بچانے کے لیے وہ چھپتی پھر رہی تھی۔ گھر سے باہر پھیلے وسیع گارڈن میں جھومتے بڑے بڑے ناریل کے درخت اس کے لیے اچھی پناہ گاہ ثابت ہوتے اگر وہ وہاں جانے کی ہمت پاتی۔ جسم سے تیزی سے بہتا ہوا خون اس پر کمزوری طاری کرنے لگا تھا۔ گاڑی چند قدم کے فاصلے پر موجود تھی مگر اس کی چابی لینے کے لیے اندر جانے کا حوصلہ ناپید تھا۔ بے بسی کے عالم میں جان بچانے کی آخری کوشش کے طور پر وہ ننگے پاؤں پیدل ہی وہاں سے نکل گئی۔ پہاڑیوں پر بنے یہ کاٹیج ایک دوسرے سے اتنے فاصلے پر تھے کہ ان کا درمیانی فاصلہ پاٹنے کے لیے بھی دس پندرہ منٹ لگ جاتے۔

وہ اندھیرے میں چھپی چٹانوں کو تراش کر بنائی گئی سیڑھیوں کی طرف بھاگی۔ اسی وقت گھر کا مین گیٹ کھلنے سے باہر آنے والی روشنی نے تھوڑی دیر کے لیے زینوں کو بھی منور کر دیا۔ اس نے پلٹ کر کسی وحشت زدہ ہرنی کے مانند دیکھا اور رفتار مزید بڑھا دی۔ آخری قدم اس کے پیر کے لمس سے آشنا ہو پاتا کہ اچانک لگنے والے جھٹکے سے الٹ کر سنگی فرش پر کمر کے بل ٹکرائی۔ اس کی لمبی زلفیں کسی کی گرفت میں تھیں۔ اس نے پلٹ کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ بس ساکت پڑی رہی۔ وہ اس کے بال مٹھی میں جکڑے اس کے گالوں اور گردن سے نکلتے خون کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ ہمیشہ جگمگاتی آنکھوں کا رنگ اس وقت کبوتر کے خون کی سی رنگت لیے ہوئے تھا۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا اچانک چہرے کے نقوش بگڑنے لگے۔ ذہن میں ہوتی سنسناہٹ میں اس کی نوبیاہتا دلہن کی گونجتی چیخیں معدوم ہوتی چلی گئیں۔

☆☆☆

”اب آپ اپنی دلہن کو پیار کر سکتے ہیں۔“ پادری نے بائبل کو بند کرتے ہوئے خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ دولہا کو ہاتھ کا اشارہ کیا۔ وہ خوشی سے تمتماتے چہرے کے ساتھ سفید براق لباس میں ملبوس دلہن کو دیکھنے لگا۔ اپسرائیں زمین پر نہیں اترتیں مگر اپنی زندگی کے اس خاص دن ہر لڑکی خود کو اپسرا سمجھتی ہے۔ اپسرا دکھنا چاہتی ہے۔ وہ بھی خوبصورت نظر آنے کے سارے جتن کیے ایک نگاہِ خاص کی منتظر تھی۔

ضبط کی آخری منزلوں پر کھڑی بیلا سے اب یہ سب تماشا دیکھنا ناممکن ہو گیا تھا۔ وہ شادی کی پوری تقریب میں مکمل برداشت کے ساتھ شریک ہوئی تھی کہ عدم شرکت کی صورت میں مزید طنز برداشت کرنا پڑتے مگر عین تقریب کے اختتام پر ضبط کی طنابوں کا ہاتھ سے چھوٹنا وجود میں بھونچال لے آیا تھا، مصنوعی بردباری کا بت پارہ پارہ ہوا تو وہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہوئی۔ اپنے محبوب کو کسی اور کا ہوتے ہوئے دیکھنا اس جیسی تسلط پسند لوگوں کے لیے جان کنی کے عذاب سے زیادہ سخت ہوتا ہے شاید۔

چرچ کے پُرسکون ماحول میں اس کی یہ حرکت نمایاں ہوئی تو نئی نویلی دلہن تمسخرانہ انداز میں اسے تیز تیز قدموں سے باہر جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ برابر کی بینچ پر بیٹھا اس کا شوہر اس حرکت پر جیسے زمین میں گڑ گیا۔ اس کی پُرتپش نگاہیں باہر کی تیز دھوپ میں اوجھل ہو جانے تک اسے گھورتی رہیں۔ لوگوں کی ترحم بھری، مذاق اڑاتی نگاہوں کو سہنے کا مزید خود میں حوصلہ نہ پاتے ہوئے وہ بھی اپنی بیوی کے پیچھے ہی چرچ سے نکلتا چلا گیا۔

☆☆☆

چرچ سے نکلی تو غصہ کسی آتشیں سیال کی طرح رگ و پے میں ٹھاٹھیں مارتا رہا تھا۔ انتونیو سے محبت کا رشتہ ایک دو دن کی بات نہیں تھی۔ گوا کی گلیوں میں کھیلتے کودتے گزرنے والا بچپن جوانی کی بہار آنے سے پہلے ہی محبت کے شگوفے کھلانے لگا تھا۔ دو متضاد تہذیبوں کا ٹکراؤ دوستی پر بھی اثر انداز نہیں ہو سکا۔ بتدریج تبدیل ہوتے جذبات کا بہاؤ جلد ہی رویوں میں جھلکنے لگا تو کھلتے شگوفوں کی خوشبو سے ماحول کیسے محفوظ رہتا۔ دوستوں میں رومیو جولیٹ سمجھے جانے والے کچھ ہی عرصے میں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم سے ہو گئے تھے۔

جب وہ اپنی شادی کے لباس کا ڈیزائن پسند کرنے کے مرحلے تک آ پہنچی تب سرد و گرم چشیدہ بوڑھوں کو مذہبی روایات کی پاسداری کا خیال ستانے لگا۔ انتونیو کی فیملی کو یکدم ہی احساس ہوا کہ ایک ہندو لڑکی ان کے گھر کے لیے مناسب بہو نہیں ہو سکتی۔ جو اپنے روایتی برہمن طور طریقوں کے ساتھ جن پر اسے بجا طور پر فخر ہے، کبھی ان کی روایتوں کو نہیں اپنائے گی۔ انتونیو کے بقول اس نے والدین کو منانے کی بہت کوشش کی مگر دو تہذیبوں کو ایک کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اپنے روایت پسند والدین کو منانا اس کے بس سے باہر تھا۔

اسے منانے کی کوششیں شاید وہ مزید جاری رکھتی اگر وہ گوا سے اچانک غائب نہ ہو جاتا۔ سال بھر تک اس کی منتظر رہنے کے بعد اس نے سباسچین سے شادی کرلی اور ایک اچھی بیوی بننے کی پوری کوشش کی۔ ایک عیسائی سے شادی شاید ایک لاشعوری کوشش تھی انتونیو کے والدین کو یہ دکھانے کی کہ محبت فاتح عالم ہے۔ اگر دل بدل جائے تو تہذیبیں بھی بدل جاتی ہیں۔ روایات گھر بنانے میں رکاوٹ نہیں بنتی ضد بنتی ہے۔ سباسچین ایک اچھا انسان تھا اس کے ماضی سے مکمل واقفیت رکھنے کے باوجود اس نے بھی اس بارے میں تجسس کا اظہار نہیں کیا۔

دونوں کی زندگی بہت اچھی گزر جاتی اگر انتونیو واپس نہیں آجاتا۔

☆☆☆

وہ نہ صرف واپس آیا بلکہ اپنے ساتھ ایک عدد منگیتر بھی لے آیا۔ ایک ہندو بیوروکریٹ فیملی کی خالص برہمن لڑکی۔ خوبصورتی میں شاید وہ بیلا کے آس پاس بھی نہیں تھی۔ مگر بے تحاشا دولت اس کی کم روئی کا پردہ بن گئی۔ انتونیو کی بے تحاشا دولت اور نئے منصوبے اس کی تمام کوتاہیوں کا مداوا بن گئے جلد ہی اس نے قصبے میں اسٹورز کی چین کا افتتاح کیا اور قصبے کا ہر نوجوان اس کے ساتھ کام کرنے کا خواہاں ہو گیا مگر اس نے خود ہاتھ بڑھایا تو سباسچین کی طرف۔ اور اب انتونیو کے بزنس پارٹنر کی بیوی کی حیثیت سے وہ اس کی شادی میں بھی شریک تھی۔ عین اختتام پر جب سب کچھ ختم ہو جانے والا تھا وہ اپنی جذباتیت پر قابو نہیں رکھ پائی تھی۔ جانے سباسچین میرا یہ قصور معاف کرے گا یا نہیں۔ اس نے چٹان پر مضبوطی سے قدم جماتے ہوئے سوچا۔ ساحل کی تیز ہوا میں اس کے سیاہ لہراتے بال بار بار چہرے سے ٹکرانے لگتے۔

سمندری پانی کی نمکین بوچھاڑ چٹان سے ٹکرا کر اس کا لباس بھگونے لگی تو اس نے مزید آگے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ نیلا آسمان سمندر کی نیلاہٹوں کے ساتھ مل کر دل و دماغ پر سحر طاری کر رہا تھا۔ آبی پرندوں کے شور میں موجود زندگی، ارد گرد موجود نباتات اور اونچے ناریل کے پیڑوں سے گزر کر آتی ہوا نے اس کے مزاج کی تپش پر خوشگوار اثر ڈالا تھا۔ غصے کا ابال اترتے ہی اپنی جذباتیت اسے شرمندہ کرنے لگی تھی۔ سباسچین کو اس کے اس طرح اچانک اٹھنے پر کن نظروں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا اور وہ خود اپنی حرکت کی صفائی کن الفاظ میں دے گی۔

خیالات کا اُتار چڑھاؤ دوبارہ اسے مضطرب کرنے لگا۔ ساحل پر خرمستیاں کرتے سیاح اب دھیرے دھیرے رخصت ہونے لگے تھے تو اس نے بھی واپسی کے لیے ڈھلان پر قدم جمایا۔

☆☆☆

اس نے پردے سمیٹ کر ایک طرف کر دیے، رات ہوئی زوردار بارش کے بعد ماحول مزید نکھر آیا تھا۔

"ناشتا تیار ہے۔" سباسچین کو اندر آتا دیکھ کر اس نے بناوٹی اطمینان سے کہا۔ ورنہ اندر ہی اندر اضطراب کی کروٹ لیتی لہریں اسے مسلسل بے سکون کر رہی تھیں۔ اسے سباسچین کے ردعمل کا خوف تھا۔

"کیا خیال ہے آج آؤٹنگ پر نہ چلا جائے؟" اس نے تجدید تعلق کی ایک اور کوشش کی۔

"ہمم ٹی وی آن کرو ذرا۔" وہ سنجیدگی سے کہتا ناشتے کی ٹیبل پر براجمان ہو گیا۔

بیلا نے اتنے پر بھی سکون کی سانس لی ورنہ کل رات ہونے والے زوردار جھگڑے کے بعد اپنی شادی شدہ زندگی کی ناؤ ڈولتی ہوئی لگنے لگی تھی۔

پلیٹیں ٹیبل پر سیٹ کرتے ہوئے اس کی تمام حسیات ٹی وی کی طرف مرکوز ہو گئیں۔ جہاں ایک انسپکٹر کسی قتل کی تفصیلات بتا رہا تھا۔

"لاش کی حالت دیکھتے ہوئے یہ اندازہ کرنا بہت آسان ہے کہ وہ مسٹر انتونیو ڈی سوزا کے ہاتھوں سے قتل ہوا ہے لیکن ابھی تک مسٹر انتونیو ڈی سوزا کی موت کی وجوہات کا علم نہیں ہو سکا فوری طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ یقیناً تفتیش سے بہت کچھ سامنے آئے گا۔"

"ناظرین یہ تھی مسز شلپا ڈی سوزا کے اندوہناک قتل پر انسپکٹر اشیش اگروال کی رائے چلتے چلتے واضح کر دیں کہ نوجوان بزنس مین مسٹر انتونیو ڈی سوزا اور مسز شلپا ڈی سوزا صرف ایک روز قبل ہی رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے تھے۔ ان کی ملازمہ جس نے صبح سویرے لاشیں دریافت کیں ہیں، کے مطابق اسے کل شادی کی تقریب ختم ہونے کے بعد رخصت کر دیا گیا تھا ورنہ شاید صورت حال کچھ مختلف ہوتی۔ شادی کے روز دلہن کا بہیمانہ قتل اور دولہا کی پُراسرار موت بہت سے سوال چھوڑ گئی ہے۔"

نیوز کاسٹر کچھ اور بھی بولتی رہی مگر بیلا کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اچانک اسکرین پر شلپا کی لاش کی تصاویر دکھائی جانے لگیں۔ نرخرہ اور چہرہ کچھ یوں بریدہ تھا جیسے کسی درندے کے جبڑوں سے اس کا آدھا چبایا شکار نوچ کر نکالا

گیا ہو۔ بقیہ جسم پر زخم تلاش کرنا مشکل تھا سوائے سفید عروسی لبادے پر جابجا نظر آتے خون کے دھبے یہ بتانے کے لیے کافی تھے کہ مقتولہ کا وقتِ نزع اذیت ناک رہا ہوگا۔ رات ہونے والی بارش سے جائے وقوع کافی حد تک صاف ہو چکا تھی۔ کمرے میں مرگ آسا سکوت طاری تھا۔ بیلا اچانک ابکائیاں لیتی سنک کی طرف پلٹی۔ سبا چیمن کی پھٹی ہوئی نگاہیں یک ٹک اسکرین کی طرف مرکوز تھیں۔

☆☆☆

وہ بہت احتیاط سے بیگ کو تھامے اسے ایک ٹرے کے نزدیک لایا جس کی سوراخ دار سطح اسے کسی قسم کے سانچے کی شکل دے رہی تھی۔ کھولتے ہوئے عنابی محلول کو ایک جدید ڈراپر کی مدد سے سانچوں میں بھرتے ہوئے وہ حد درجہ منہمک تھا کہ اچانک دروازہ دھاڑ کی آواز سے دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس نے دہل کر دروازے کی سمت دیکھا اور ہاتھ لگنے سے بیکر زمین بوس ہوا۔ محلول کے چھینٹے دور دور تک پھیل گئے۔ وہ اچھل کر کھولتے ہوئے عرق سے دور ہٹا۔

''خدا کی پناہ! یہ کیا طریقہ ہے کسی کی لیب بلکہ گھر میں داخل ہونے کا؟'' اس نے پریشان نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ عنابی عرق تیزی سے جمنے لگا تھا۔ اپنی پریشانی میں وہ بیلا کی فق ہوتی رنگت کو یکسر نظر انداز کر گیا۔

''انٹونیو مر گیا آنند۔'' بیلا کی لرزیدہ آواز پر اس نے چونک کر دیکھا تو اس کی پریشان حالی کا اندازہ ہوا۔ وہ اسفنج سے صفائی کرتے ہوئے یکدم رک گیا۔ اس نے بیلا کو تھاما اور اسے لیب سے باہر لے جانے لگا...... جاتے ہوئے وہ احتیاط سے لیب نما کمرے کا دروازہ بند کر گیا لیکن باہر نکلتے ہوئے کھڑکی بند کرنا بھول گیا۔

☆☆☆

بیلا کے گھر سے نکلتے ہی سبا چیمن نے تیزی سے جگہ چھوڑی۔ انٹونیو کی قبل از مرگ بیان کی گئی حالت نے اس کے حواس مختل کر دیے تھے۔ وہ فوراً بیڈروم کی طرف لپکا اور میٹرس اٹھا کر کچھ تلاش کرنے لگا۔ مطلوبہ چیز ہاتھ میں آتے ہی تیزی سے اسے باہر نکال کر اس کا جائزہ لینے لگا۔ سفید شفاف سفوف کے کرسٹلز کھڑکی سے آتی روشنی میں چمکنے لگے تھے۔

''یہ تو دکھ کی بات مگر ضروری ہے کہ اسے تلف کر دیا جائے۔'' اس نے خود کلامی کی۔ برق رفتاری سے اس تمام پاؤڈر کو سنک میں خالی کر کے نلکا کھول دیا۔ پانی کی دھار نے فوراً ہی تمام سفوف نالی میں بہا دیا۔ اس نے کچن میں نظر گھمائی دودھ کا ڈبا سامنے ہی دھرا تھا۔ اسے بھی سنک میں انڈیل کر قینچی سے ڈبے کا دہانہ کھولا اور تھیلی اس کے اندر رکھ دی۔ اسے اپنا آپ کسی مجرم جیسا محسوس ہوا۔ ڈبے کو ڈسٹ بن میں ڈال کر وہ کرسی پر بیٹھ کر زور زور سے ہانپنے لگا۔ انٹونیو کی حالت نے اسے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ گردن دبوچے جانے کے خوف نے اسے بے سکون کر دیا تھا۔

☆☆☆

انسپکٹر اشیش اگروال ایک ذہین اور مستعد شخص تھا۔ اگر اس میں یہ خوبیاں نہ ہوتیں تو گوا کا یہ ہائی پروفائل کیس کبھی مقامی پولیس کے حوالے نہ کیا جاتا۔ لیکن بڑوں کے اس اعتماد نے کیس کے جلدی حل کا دباؤ اس پر بڑھا دیا تھا۔ اسے جلد سے جلد جانچ مکمل کر کے اس کے دولت مند والدین اور میڈیا کو مطمئن کرنا تھا جو انٹونیو کی موت کو مسلسل قتل ثابت کرنے پر مصر تھے۔ اس وقت بھی وہ اپنے آفس میں بیٹھا انٹونیو کے والدین کی جانب سے مہیا کی گئی اس کے دوستوں اور کاروباری رفیقوں کے علاوہ اس سے معمولی سی بھی چپقلش رکھنے والوں کے ناموں کی لسٹ پر نظر دوڑا رہا تھا۔ ایک علیحدہ کالم میں تنازعے کی وجوہات بھی درج تھیں۔ سرفہرست نام پر اس کی نظر ٹھہر گئی۔

سجاش مہرہ نے ایک بزنس ٹائیکون...... کسی ہشت پا کی طرح شہر کے ہر بزنس میں اپنے ہاتھ پیر پھیلا رکھے تھے۔ وہ ایک بڑا ٹیکس دہندہ تھا۔ ایسے لوگوں کی رعونت انہیں خود کو قانون سے بالاتر سمجھتی ہے۔ اس سے کسی بھی قسم کی معلومات کا حصول آسان نہ ہوگا۔ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اشیش نے دونوں کے درمیان وجہ تنازع کا جائزہ لینا شروع کر دیا کہ کسی کی کمرے میں موجودگی نے اسے چونکا دیا۔

''سر یہ انٹونیو ڈی سوزا کی پوسٹ مارٹم رپورٹ۔'' اس کے نائب فرنانڈس نے سیلوٹ کرتے ہوئے دو لفافے اس کے سامنے دھر دیے۔

''دیکھیں!'' مسز شلپا کی موت کی وجوہات واضح تھیں۔ اس کے اندازے کے مطابق خون زیادہ بہہ جانا موت کی وجہ بنا۔ سب سے گہرا زخم اس کے نرخرے پر موجود تھا۔ ڈی سوزا کے دانتوں اور ناخنوں میں پھنسے اس کی جلد کے ریشے یہ بتانے کے لیے کافی تھے کہ وہ اسی کی درندگی کا شکار ہوئی ہے۔''

''یہ موت کا ٹائم اتنا ایکیوریٹ بتایا ہے ساڑھے گیارہ سے بارہ یہ اس ٹائم وہیں موجود تھا کیا؟'' انسپکٹر نے اپنے نائب کو مخاطب کرتے ہوئے پوسٹ مارٹم رپورٹ

جاری کرنے والے ڈاکٹر کا مذاق اڑایا۔

''مسٹر رات بارش ہوئی تھی، لاش بالکل دھلی دھلائی پڑی تھی۔ پندرہ بیس منٹ بارش ہوئی ہے اسی سے مدد لی ہے ڈاکٹر بامبو نے۔'' نائب نے ہلکے سے ہنس کر وضاحت کی۔ ڈاکٹر بامبو کا اصل نام تو رابرٹو گونزالوس تھا مگر اپنے لمبے قد اور چڑچڑے مزاج کی وجہ سے پولیس والوں میں بامبو (بانس) مشہور تھا۔

''جانتا ہوں رے فرنانڈس تو کیا اس کی وکالت شروع کردیتا ہے کبھی تو جینے دیا کر۔'' انسپکٹر نے کچھ بدمزہ ہو کر اسے ٹوکا۔

انٹونیو کی موت سے پہلے کی جانے والی درندگی انسپکٹر کو ایک شبہے میں مبتلا کر رہی تھی اور رپورٹ سے اس کی تصدیق ہوگئی۔ لاش کے معدے اور ٹشوز میں نشہ آور اجزا کی موجودگی اس کی ذہنی ابتری کی وجہ تھی مگر رپورٹ نشے کی نوعیت بتانے سے قاصر تھی۔ پڑھتے پڑھتے وہ اپنی سیٹ سے اچھل پڑا۔ ایک جملے پر اس کی نظر جم کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

سجاش مہرہ کا ایڈریس دیکھ کر اشیش اگروال کے لبوں سے ایک گہری سانس خارج ہوئی۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ سجاش مہرہ نہ صرف انٹونیو ڈی سوزا کا کاروباری حریف بلکہ اس کا پڑوسی بھی تھا۔ اس کا شاندار ولا دیکھ کر فرنانڈس کے لبوں سے سیٹی کی آواز نکلی۔ اشیش نے گھور کر اسے دیکھا تو وہ جلدی سے مؤدب ہوگیا۔

توقع کے برخلاف سجاش کا رویہ بہت خیر مقدمی تھا۔ ان کی آمد کی اطلاع پاکر وہ نہ صرف گھر پر موجود تھا بلکہ ان کے انتظار میں اپنے خوبصورت سے لان میں براجمان تھا۔ وہ بہت مصروف انسان تھا۔ اس سے ملاقات کے لیے لوگوں کو اپائنٹمنٹ بھی مشکل سے ملتا تھا۔ اپنے طویل پیشہ ورانہ کیریئر میں اشیش نے ایک بات بہت پہلے سے جان لی تھی کہ جو قالین جتنا زیادہ صاف نظر آتا ہے، اس کے نیچے اتنی ہی گندگی ہوتی ہے۔ سجاش کا حد سے زیادہ تعاون اسے مشکوک بنا رہا تھا۔ ایک ملازم انہیں سجاش تک پہنچا کر خود ولا کے اندر غائب ہوگیا۔

''تشریف رکھیے انسپکٹر۔'' وہ مسکراتے ہوئے بغور اشیش کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ صورت سے چالاک نظر آتا ایک سیاہ رو شخص تھا جس کی تمام طاقت اس کی ذہانت اور معاملہ فہمی تھی۔

''آپ میری یہاں آمد سے تو یقیناً واقف ہوں گے کہ مہرہ صاحب؟'' انسپکٹر نے خوبصورت گارڈن چیئر پر بیٹھتے ہوئے کیپ اتار کر گود میں رکھی۔ آسمان پر گہرے سرمئی بادل پہرے سے جمے کھڑے تھے۔ ہوا میں نمی اور حبس نے گھٹن سی پیدا کردی تھی۔

''ہاہاہا......'' ایک زوردار قہقہہ اس کے لبوں سے بے ساختہ آزاد ہوا۔ ''آپ کے خیال میں اگر میں آپ کی آمد کی وجہ سے واقف نہ ہوتا تو یہاں براجمان ملتا؟'' اس نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے ٹانگ پر ٹانگ جمائی۔ ''ارے ہم قانون کا احترام کرنے والے لوگ ہیں۔ اب بتائیں آپ کیا جاننا چاہتے ہیں؟''

ایک گہری سانس لیتے ہوئے وہ بولا تو لہجہ بہت ٹھوس تھا۔

''مسٹر مہرہ پانچ جنوری کی شام آپ انٹونیو ڈی سوزا کے گھر گئے اور جھگڑا کرنے کے بعد اسے تباہ کردینے کی دھمکیاں بھی دیں۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد انٹونیو ڈی سوزا کی دردناک موت ہوگئی، کیا یہ محض اتفاق ہے؟''

مہرہ نے پوری بات خاموشی سے سنی۔ ''انسپکٹر ہم کاروباری لوگ ہیں۔ اس طرح کسی کو برباد نہیں کیا کرتے۔ ہم تیس سال سے گوا میں پراپرٹی بزنس کے کنگ ہیں۔ اور اچانک ایک ناتجربہ کار نوجوان آکر اپنے اردگرد خوشامدیوں کا ٹولا جمع کرکے سب الٹ پلٹ کردے، یہ بات بہت تکلیف دہ تھی۔''

مہرہ کے انداز میں دبا دبا غصہ تھا۔ ''مین مارکیٹ کے پیچھے والی زمین اس نے کیسے حاصل کی مجھے سب علم ہے اور اس موقع کی زمین پر وہ بیوقوف سپر اسٹور بنا رہا تھا۔ محض اپنی محبوبہ کو خوش کرنے کے لیے۔''

''سابقہ محبوبہ؟''

ایک غیر محسوس سی مسکراہٹ نے سجاش مہرا کے ہونٹوں کا احاطہ کیا۔ ''بیلا بینرجی، اسی کے شوہر کی شراکت میں بن رہا تھا وہ سپر اسٹور۔ ہم تو بس اسے یہ پیشکش کرنے گئے تھے کہ ہمارے ساتھ کام کرے، زمین اس کی سرمایہ ہمارا۔ دکانوں سے زیادہ یہاں ہوٹلز کی ضرورت ہے۔'' بیلا بینرجی کا نام اسے گالی کی طرح لگتا تھا۔

''بہرحال یہ تو کہنا پڑے گا انٹونیو کی موت سے سب سے زیادہ فائدہ آپ کو ہوا اب کوئی حریف باقی نہیں رہا۔'' انسپکٹر نے سادہ انداز میں بہت چبھتا ہوا سوال کیا تھا مگر گھاگ بزنس مین شاید ان سوالات کے لیے پہلے سے تیار تھا۔

''یقیناً یہ ایک افسوسناک صورت حال ہے۔ لیکن کتنا

UrduBooks.ml

بھی بڑا سانحہ ہو کسی نہ کسی کو ضرور فائدہ دے جاتا ہے۔" مہرہ نے سنجیدگی سے انسپکٹر کی پھینکی گئی گیند کو پویلین سے باہر بھیج دیا۔

"ایک آخری سوال آپ تیرا اگست کی رات آٹھ سے بارہ تک کہاں تھے؟"

"ایک بزنس میٹنگ جس کے بعد ڈنر جو لیٹ نائٹ تک جاری رہا۔ اس کی ویڈیوز اور گواہ موجود ہیں جو شہر کے معززین ہیں۔"

سجاش مہرہ اب جیسے اس پوچھ گچھ سے کچھ اکتانے لگا تھا۔

"ٹھیک ہے سر آپ سے درخواست ہے کہ شہر سے باہر جانے کی صورت میں ہمیں انفارم کریں۔"

"ضرور......" اس نے صرف اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

☆☆☆

آنند صرف بیلا کا اکلوتا بھائی ہی نہیں، اس کا واحد دوست اور غمگسار بھی تھا۔ والدین کی موت اور انتونیو کی بے وفائی کے بعد جب اس کی ذہنی حالت دیوالیہ پن کے قریب تھی، اس وقت آنند ہی تھا جس نے اسے نہ صرف ذہنی طور پر بلکہ معاشی طور پر بھی سہارا دیا جبکہ وہ اس وقت خود بھی ایک اسٹوڈنٹ تھا اور پارٹ ٹائم ایک فارماسیوٹیکل کمپنی میں لیب اسسٹنٹ تھا۔ ساتھ ہی اپنے چھوٹے سے مکان میں ایک کمرے کو لیب بنائے دن رات نئے تجربات کرتا رہتا۔ اس وقت بھی بیلا کی درماندہ کیفیت نے اسے مضطرب کر دیا۔ اسے وہ وقت یاد آیا جب وہ انتونیو کی شادی کی خبر سن کر اس کے پاس آئی تھی۔ آنند نے ایک چور نظر اپنی لیب کی طرف ڈالی۔

"انتونی مر گیا آنند۔" وہ اسی طرح بیٹھی بیٹھی آواز میں بولی۔

"کم ڈاؤن بیلا! اس کے مر جانے پر تم کیوں پریشان ہو۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔ اس نے جو کچھ تمہارے ساتھ کیا، وہ اس کا مستحق تھا۔ اگر تم زیادہ دکھی ہو تو اس کے لیے دعا کرو۔ حقیقت میں مجھے اس کی موت کا کوئی دکھ نہیں۔" آنند نے صاف گوئی سے کہا۔

"آنند تم اسے پہلے بھی پسند نہیں کرتے تھے۔" وہ زخمی لہجے میں بولی۔

"ہاں کیونکہ وہ پہلے بھی ایک لیڈی کلر بگڑا ہوا رئیس زادہ تھا ہر کوئی اسے جانتا تھا سوائے تمہارے۔ نہ تم نے اس وقت میری بات سنی نہ ابھی سننے کو تیار ہو۔" وہ بس خاموشی سے سسکتی رہی۔

"تمہارے لیے کافی بناؤں؟ یا ہاٹ چاکلیٹ۔"

بیلا کے جواب نہ دینے پر وہ فرج سے دودھ نکالنے لگا۔ اس کی نظر اپنے پالتو بلے پر پڑی جو بند کھڑکی سے دیوانہ وار اندر آنے کے لیے مچل رہا تھا۔

وہ سیامی نسل کا موٹا تازہ بلا تھا جو سائز میں کسی بلے کے برابر تھا۔ اس کی ندیدی جدوجہد دیکھ کر آنند نے ہنستے ہوئے کھڑکی کا شیشہ اوپر کر دیا اور بلا کسی گیند کی طرح اچھلتا ہوا آنند کی طرف آیا۔ اس کے حلق سے عجیب سی غراہٹیں خارج ہو رہی تھیں۔ غیر ارادی طور پر آگے کیے گئے بازو کو نوچتا ہوا وہ زمین بوس ہو گیا لیکن فوراً ہی دانت نکوستا ہوا دوبارہ حملہ آور ہوا اس بار اس کا نشانہ آنند کا چہرہ تھا۔ ہاتھ میں موجود دودھ کی بوتل کو دفاعی ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہوئے اس نے بلے کو انٹا غفیل کر دیا۔ اسے جلدی سے ایک پنجرے میں بند کر کے وہ ہذیانی انداز میں چیختی ہوئی بیلا کی طرف متوجہ ہوا۔ بلے کے منہ اور فر پر لگی عنابی رنگ کی جھلک نے اسے پورا معاملہ سمجھا دیا تھا۔ اصل مسئلہ بیلا کو تمام صورتِ حال سمجھانا تھا۔

☆☆☆

انسپکٹر جس وقت سباتچین کے گھر پہنچا، وہ ٹی وی کے سامنے براجمان تھا۔ اشیش نے دروازہ بجانے سے پہلے کھڑکی سے اندر جھانکا۔ ٹی وی سے آتی آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی کامیڈی شو چل رہا ہے مگر سباتچین کے چہرے کی گمبھیرتا اور مسلسل ہلتا ہوا پیر بتا رہا تھا کہ وہ ذہنی طور پر کہیں اور مصروف ہے۔ بیل بجا کر وہ ایک طرف کھڑا ہو گیا تا کہ جوں ہی دروازہ کھلے، وہ اس کے سامنے آ کر چہرے کے تاثرات جانچ سکے۔ اسے دیکھتے ہی سباتچین کی فق ہوتی رنگت اس نے بغور محسوس کی۔

"ہیلو مسٹر سباتچین۔" اشیش چہچہایا۔

"ہائے انسپکٹر......" خود کو سنبھالنے کی کوشش میں اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"معاملہ ایک قتل کا ہے تو آپ یقیناً یہاں کھڑے کھڑے تمام بات کرنا پسند نہیں کریں گے۔"

"جی جی پلیز! اندر آ جائیں۔" اشیش نے بیٹھنے سے پہلے ایک گہری نگاہ سے گھر کا طائرانہ جائزہ لیا۔

وہ چھوٹا سا مگر قیمتی ساز و سامان سے آراستہ مکان تھا مگر وہاں ہر چیز سے جھلکتی بے ترتیبی مکینوں کی عدم دلچسپی کی

غماز تھی۔

”مسز سبا چین گھر میں موجود نہیں؟“ انسپکٹر نے فرنانڈس سے ٹی وی کا والیوم کم کرواتے ہوئے پوچھا۔

”وہ اپنے بھائی کے گھر جاچکی ہے اور تین چار گھنٹوں سے پہلے واپس نہیں آئے گی......“ اس نے سپاٹ انداز میں جواب دیا۔

”ان کے بھائی صاحب کا تعارف؟“

”آنند ایک کیمسٹ ہے نندنی فارما میں کوئی جاب ہے اس کی۔“

اپنا انداز بے تاثر رکھنے کی کوشش کے باوجود اس کے لہجے میں ایک محسوس کیے جانے والی تلخی تھی۔ اشیش نے نائب کی طرف دیکھا، وہ اسی کو دیکھ رہا تھا۔

”مسٹر سبا چین آپ نے نیوز تو دیکھی ہوں گی۔ ہماری آمد کے مقصد سے واقف ہوں گے؟“

”آپ بتادیں تو بہتر ہوگا۔“ وہ فطرتاً ایک محتاط شخص تھا۔ انسپکٹر سے پوچھ گچھ کی غرض و غایت اس نے بہت خاموشی سے سنی۔

”آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس کیس میں آپ کے بیان کی کیا حیثیت ہے خاص طور پر آپ کی مسز۔“

”میں سمجھتا ہوں انسپکٹر آپ کیا جاننا چاہتے ہیں، میں مکمل تعاون کروں گا۔“

”آپ اس نئی شراکت داری سے پہلے کیا کام کرتے تھے؟“

”میں ایک جنرل اسٹور چلا رہا تھا اسی کی فروخت سے حاصل شدہ رقم اور کچھ جمع جتھا میں نے نئے کاروبار میں لگایا تھا۔“ اس کی آواز ایک پل کو لرزی اور پھر سے وہ ویسا ہی سپاٹ نظر آنے لگا۔

”ایک بہت بڑا بزنس مین ہوتے ہوئے شراکت کے لیے کئی دولت مند اُمیدواروں کو نظرانداز کر کے انتونیو ڈی سوزا نے آپ کا انتخاب کیا ایسی کیا خاص بات نظر آئی انہیں آپ میں؟“ انسپکٹر نے پھر ایک چبھتا ہوا سوال کیا۔ اس نے کالر میں انگلی پھنسائی اور اسے گردن سے یوں دور ہٹایا جیسے سانس لینے میں دقت ہو رہی ہو۔

”اس بات کا جواب تو مرحوم ہی دے سکتا تھا۔ اسے یقیناً میرے تجربے پر بھروسا ہوگا۔“ اس نے پوری گفتگو کے دوران نگاہیں زمین پر گاڑ رکھی تھیں۔ انسپکٹر نے اس کے رویے کو ایک پُرمعنی انداز میں دیکھا۔

”اپنی ہفتے کی رات کی تفصیل کے جواب میں اس

سال کا پہلا شمارہ............ اہمیت کا حامل شمارہ

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

کراچی
ماہنامہ
سرگزشت

شمارہ جنوری 2019ء
کی جھلکیاں

ناکردہ گناہ

اس نے صرف چھ سال حکومت کی اور
برصغیر کی شکل بدل دی۔ تاریخ کے
جھروکے سے محبت کی لودیتی داستان

دوسری نور جہاں

پاکستانی فلم کی ایک نامور گلوکارہ جس نے آتے
ہی ایسی ہلچل مچادی کہ ہر ایک چونک اٹھا تھا

شاخ زیتون

مقبوضہ اسرائیل کی ایک یہودی لڑکی
نے ایک مسلمان لڑکے سے دل لگا لیا تھا

وارث

اونچی حویلیوں کی دیواروں کے پیچھے کیسے کیسے
کھیل ہو رہے ہیں۔ دل دکھا دینے والی سچ بیانی

ان کے علاوہ

بہت سے سچے واقعات، سچ بیانیاں، سچے قصے۔
وہ سب کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے
ہیں، آپ کو پڑھنا چاہیے۔

نے اعتراف کیا کہ وہ انتونیو کی شادی کی تقریب ادھوری چھوڑ کر گھر واپس آ گیا اور رات بھر گھر میں رہا۔

”ٹھیک ہے مسٹر سباچینی ہمیں مسٹر آنند کے گھر کا ایڈریس بتادیں، ہم ان سے ضرور ملنا چاہیں گے۔“

☆☆☆

”تمہارا کیا اندازہ ہے فرنانڈس۔“ انسپکٹر نے باہر نکل کر فرنانڈس کی رائے لی۔

”سر جی بندہ اتنا سیدھا نہیں، جتنا بن رہا ہے جبکہ یہ اچھی طرح جانتا بھی ہے، اپنی بیوی میں مرنے والے کی دلچسپی......“ اس نے پیٹ سے پھسلتی پینٹ کو کھینچ کر اوپر کرتے ہوئے جواب دیا۔

”میرا بھی یہی خیال ہے اور تم اپنی یہ مٹکی اندر کرو ورنہ تنزلی کی سفارش کردوں گا۔“ انسپکٹر نے اسٹک سے اس کی توند بجائی۔

”ہی ہی...... سر جی یہ باہر بہت آرام سے آجاتی ہے آسانی سے اندر نہیں جاتی، اب کہاں جانا ہے سر؟“

”سینٹ زیویئرز کالج کے سامنے والے کیفے۔“

ایک مصروف سڑک پر واقع تاریخی حیثیت کا حامل کیفے ڈی فلورا کافی مصروف تھا۔ کسی بیچ ریزورٹ کی طرز پر ترتیب دیا گیا اس کا انٹیریئر سیاحوں کے لیے کشش کا باعث تھا۔ انسپکٹر کا ارادہ گاڑی کو کچھ دور پارک کرکے وہیں انتظار کرنے کا تھا مگر اچانک فرنانڈس کو شدید قسم کی بھوک نے ستانا شروع کردیا۔ اشیش نے سیاحوں کے ایک گروپ کو کیفے میں داخل ہوتے دیکھا جس میں کافی پرکشش قسم کی لڑکیاں جنہوں نے ماحول کی تمازت کو مدنظر رکھتے ہوئے بقدرِ ضرورت لباس پہننے کو ترجیح دی تھی۔ وہ فرنانڈس کی بے وقت بھوک کی وجہ تک پہنچ گیا۔

”دونوں مقتولین کی فیملیز جلتے توے پر بیٹھی ہیں۔ اتنے پریشر میں کام کرتے دو دن میں صرف چار گھنٹے سویا ہوں۔ میری بیوی نے دھمکی دی ہے کہ اس ویک اینڈ اگر اس کے میکے نہ لے کر گیا تو مجھے ڈائیورس کردے گی اور تجھے ایسے میں لڑکیاں دیکھنی ہیں بے......“ انسپکٹر نے کہتے کہتے اچانک اس کی گدی پر ہاتھ مارا۔ وہ جو دھیان سے یہ دکھ بھری کہانی سن رہا تھا یکدم جیسے ہڑبڑا اٹھا۔

”سر جی اب بھوک پر کس کا زور ہے۔“ وہ پھر سے منمنایا۔

”اچھی طرح جانتا ہوں تجھے کاہے کی بھوک ہے جا ایک پیزا اور دو کافی لے آ۔“ مگر اس سے پہلے کہ فرنانڈس واپس آتا انسپکٹر کو اپنا گوہرِ مقصود نظر آ گیا۔ وہ برق رفتاری سے جیپ سے اتر کر اس کی طرف دوڑا۔ اس شخص نے جب اشیش کو کسی ڈبل ڈیکر بس کی طرح اپنی سمت آتے دیکھا تو وہاں سے دوڑ لگادی مگر اس کی بدقسمتی ایک موٹی گوانیز خاتون سے ٹکرایا کر زمین بوس ہوگیا جس وقت انسپکٹر اس کے قریب پہنچا، وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے خاتون کے پرس کے خطرناک حملوں سے بچنے کی کوشش کررہا تھا۔

”ہائے ڈیئر...... امید ہے مجھ سے مل کر خوشی ہوئی ہوگی۔“ انسپکٹر نے بتیسی نکالتے ہوئے اسے گدی سے پکڑ لیا۔

☆☆☆

وہ ساحلی شہر جہاں سیاحوں کی آمدورفت زیادہ رہتی ہو وہاں ہمہ وقت موج مستی اور گہما گہمی کا سا ماحول بنا رہتا ہے۔ جو مقامی آبادی کے کاروبار کے فروغ کے لیے کافی سازگار رہتا ہے۔ وہیں قانون نافذ کرنے والے اداروں کی دردسری بھی بڑھ جاتا ہے۔ اس وقت بھی انسپکٹر اشیش کو ایک ایمرجنسی کال کے نتیجے میں اس ہاسپٹل کی طرف دوڑ لگانی پڑی۔ ایک گورے سیاح کو کال گرل اور اس کے ساتھی نے تمام متاع سے محروم کردینے کی کوشش میں مزاحمت کے نتیجے میں زخمی کردیا تھا۔ اگر کسی مقامی کے ساتھ یہ ہوا ہوتا تو نچلا عملہ سنبھال لیتا لیکن سیاحوں کے ساتھ ایسے واقعات بدنامی کا سبب بنتے تھے۔

”یہ سالے گورے ہر وقت ہر جگہ مصیبت کھڑی کرتے ہیں جب انہیں سمجھایا جاتا ہے کہ کس جگہ جانا ان کے لیے خطرناک ہوگا تو الو کی طرح سر ہلائے جاتے ہیں اور پھر سارے کے چکر میں لٹ کر ہمارے گلے پڑتے ہیں۔“ فرنانڈس مسلسل بڑبڑاتا ہوا چل رہا تھا۔

تب ہی اشیش کی نظر اسٹریچر پر لیٹے نوجوان پر پڑی جسے اسپتال کا عملہ تیزی سے کھینچتا ہوا لے جا رہا تھا۔ نوجوان کے زخموں سے چور بدن کو دیکھ کر اشیش کا ذہن ایک دم شلپا کی لاش کی طرف گیا۔ اس نے ایک میل نرس کو روکا۔

”اے سنو! اسے کیا ہوا ہے؟“

”سر اینیمل اٹیک کا کیس ہے پالتو بلے نے حملہ کر دیا۔ وہ خود بھی زخمی ہے شاید ریبیز کا ایک جانچ ہوگی اس کی بھی۔“ نرس نے جواب دے کر تیزی سے نکلنا چاہا۔

”کون لایا ہے اسے؟“

”وہ میم لائی ہیں۔ آپ ریسپشن سے تفصیل لے لیں۔“ اس نے اسٹریچر کے ساتھ چلتی عورت کی طرف

اشارہ کیا۔ اشیش نے اسے جانے کا اشارہ کیا اور خود ریسیپشن لیڈی کی طرف چل دیا۔ وہاں سے حاصل ہونے والی معلومات نے اس کے ذہن کو ایک نئی نہج پر ڈال دیا۔ وہ ریسیپشن پر موجود خاتون اور اپنے نائب فرنانڈس کو کچھ ضروری ہدایات دیتا ہوا سیاح کے روم کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

بیلا کی رُو رُو کر حالت تباہ تھی۔ آنند کے گھر میں اس کے بلے کے اچانک حملے کے بعد اسے بٹھا کر بہت تفصیل سے آنند نے قیامت خیز انکشافات کیے تھے اور تب سے وہ نڈھال تھی۔ بلے کو لیب لے جا کر وہ اس پر کچھ تجربات کرنا چاہتا تھا اور تب ہی اس چھوٹی سی بلا کو ہوش آ گیا۔ وہ یکدم آنند کے قابو سے باہر ہوا تھا۔ اگر اس نے اس وقت ہمت دکھا کر فرائنگ پین کے استعمال سے اسے بے بس نہ کیا ہوتا تو وہ آنند کا نرخرہ چبا چکا ہوتا۔ اور اب سباچین نے اسے زبردستی ٹرینکولائزر دے کر سونے کی ہدایت کی جب ایک کال کے ذریعے انہیں پولیس اسٹیشن پہنچنے کی ہدایت کی گئی۔ سپاہیوں کے بجائے فون کال کے ذریعے پولیس اسٹیشن میں طلبی دونوں کے لیے کافی اطمینان کا باعث تھی۔

انتونیو کے والدین کے ساتھ اس کی ملازمہ کو دیکھ کر وہ کچھ چونکے مگر بنا رکے آگے بڑھ گئے۔

☆☆☆

اشیش کے کمرے میں ایک اجتماع کی سی کیفیت تھی۔ بیلا اور سباچین کے علاوہ انتونیو کے والدین اور اس کی ملازمہ اور اشیش کی میز کے پیچھے مؤدب کھڑا فرنانڈس۔ اس کے باوجود وہاں مکمل سناٹا اور خاموشی طاری تھی۔

”آپ لوگ سوچ رہے ہوں گے اس طرح یہاں بلاوے کا آخر مقصد کیا ہے؟“ اشیش اگروال نے اچانک بولنا شروع کیا۔

”مسز کارلوس آپ لوگوں کا جو نقصان ہو چکا، اسے کسی طرح واپس لوٹایا نہیں جا سکتا لیکن اس کے ذمے داران کو قرار واقعی سزا دی جا سکتی ہے اور یہ بہت حیرت انگیز بات ہے کہ قصور وار محض قسمت سے شکنجے میں آئے۔“

اس نے جملہ حاضرین کا جائزہ لیا۔ تمام لوگ سپاٹ چہرے کے ساتھ اس کی بات مکمل ہونے کے منتظر تھے سوائے مسز کارلوس کے جو گاہے بگاہے ناک پر رومال رکھ کر ایک سسکی سی لیتی تھیں۔ ”انتونیو کی حالت کو دیکھتے ہوئے ایک اندازہ تھا کہ وہ کسی قسم کے دماغی دورے یا منشیات کا شکار ہوا ہے۔ آٹوپسی رپورٹ سے علم ہوا کہ اس کے جسم میں کوکین کی بڑی مقدار موجود تھی لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ اسے مہیا کی گئی تھی، اس نے خود نہیں لی تھی۔“ اشیش نے بولتے بولتے ہاتھ سے اشارہ کیا اور فرنانڈس ایک دبلے پتلے گوانیز کو دھکیلتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ سباچین کی اڑی ہوئی رنگت کو انسپکٹر نے غور سے ملاحظہ کیا۔

”یہ ایک منشیات فروش ہے۔ گوا کا یہ ایریا یہی کور کرتا ہے اور دلچسپ بات اپنے گاہکوں کو شکل سے پہچانتا ہے، بتاؤ انہیں بچے کو کیا ہوا تھا؟“

اشیش کا اشارہ پاتے ہی وہ شروع ہو گیا۔

بقول اس کے مسٹر سباچین جو بہت عرصے سے ایم کے خریدار تھے اچانک انہوں نے کوکین کی خریداری شروع کر دی اور بارہ تاریخ کو اسے ایک کاٹیج کا ایڈریس دیا گیا کہ یہ مال وہاں سپلائی کرنا ہے، جس نے وہ پیکٹ وصول کر کے رقم اس کے حوالے کی، اس کی موت ہو چکی ہے، یہ بات اسے نیوز سے پتا چلی۔

”یہ دونوں ہمارے خاص کسٹمر تھے ہمیشہ میں نے انہیں کوالٹی والا مال ہی دیا۔“ کمرے میں موجود لوگوں کی کٹیلی نگاہوں کو خود پر مرکوز دیکھ کر سباچین کی ہمت جواب دے گئی۔

”میں بس انتونیو کو خوش کرنا چاہتا تھا۔ اسے یہ سب پسند تھا لیکن وہ خود اس میں لوث نہیں ہو سکتا تھا اس لیے میرا سہارا لیا۔“ اس کی آواز کی لرزش محسوس کی جانے والی تھی۔

”یہ شخص زندہ رہنے کے قابل نہیں ہے انسپکٹر۔“ مسٹر کارلوس نفرت انگیز نگاہوں سے سباچین کو گھورتے ہوئے بولے۔

”ارے نہیں مسٹر کارلوس آپ شاید سوچ رہے ہیں یہ انتونیو کے لیے کوکین مہلک ثابت ہوئی حالانکہ ایک عادی نشے باز کے لیے یہ ممکن نہیں۔ اپنے الفاظ کے لیے معذرت، ہم پھر بھی ایسا سوچ لیتے اگر تلاش کے دوران ایک دلچسپ چیز ہمیں نہ ملتی۔ ایک شیمپین کی بوتل وہ بھی تحفتاً پیش کی گئی تھی۔ اب اتفاق سے اس دوست کو یہاں لانا ممکن نہیں کیونکہ وہ اپنی ہی لگائی آگ میں جل کر شدید زخمی ہے۔“

”مگر اس کا بیان یہاں سنوائے دیتے ہیں۔“ اس نے ایک کونے میں موجود ٹی وی آن کیا۔ وہ ایک ہاسپٹل کا منظر تھا۔ انسپکٹر نے بیلا کی طرف دیکھا۔ وہ مضطرب ہو کر انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ نین کٹورے چھلک پڑنے کو بے تاب تھے۔ بیڈ پر لیٹے ہوئے شخص کا اوپری دھڑ مکمل طور پر پٹیوں میں ملفوف تھا۔ اس کی آواز اتنی بدل چکی تھی کہ نہ سمجھ

آنے والی جھنجھناہٹ سے تنگ آ کر اشیش اگروال کو پورا بیان خود پڑھنا پڑا۔

جس کے مطابق بیلا اور انتونیو کے تعلقات اس کے بھائی آنند کو بھی پسند نہیں تھے۔

”انتونیو اسے دھوکا دے رہا تھا اور ایک دن وہ اسے چھوڑ گیا۔ میں نے اس کے دکھی ہونے کے باوجود سکھ کی سانس لی۔ لیکن واپس آتے ہی اس نے بیلا سے رابطہ کیا۔ اور یہ دوبارہ اس سے ملاقاتیں کرنے لگی۔“ سباتینی نے زخمی نگاہوں سے بیلا کی طرف دیکھا لیکن وہ یک ٹک اپنے پیروں کی طرف متوجہ تھی۔

”میں ان دنوں مختلف جڑی بوٹیوں پر تجربات کر رہا تھا۔ سیاح ایسی چیزوں کے اچھے دام دیتے تھے جو ان کے خون کی روانی تیز کر دے۔ میں نے تب مختلف جڑی بوٹیوں اور کوکین کے ملاپ سے ایک نئی چیز بنائی جسے جلد سے جلد انسانی جسم پر آزمانا تھا۔ انتونیو کی شادی پر بیلا کی ذہنی کیفیت نے مجھے شدید غصے میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں نے اسی وقت سوچ لیا تھا کہ اس رذیل کو ایسے ذہنی طور پر مفلوج کر دوں گا کہ پھر کسی عورت کو نشانہ نہ بنا سکے۔ اس کی شادی کی رات ڈرگز آلود شیمپین اسے پلانے اور گفٹ کرنے کے لیے مجھے تھوڑی سی ایکٹنگ کرنی پڑی تھی۔“

انسپکٹر نے صفحہ ٹیبل پر رکھ دیا۔ کمرے میں مرگ آسا سناٹا طاری تھا۔ سب ہی کسی نہ کسی پچھتاوے کے زیر اثر مکمل طور پر خاموش تھے۔ مسز کارلوس اپنے بیٹے کے متعلق انکشافات سن کر عجیب گم صم سی کیفیت میں تھے۔ وہ شادی شدہ عورتوں کے پیچھے بھاگتا تھا اور ڈرگز لیتا تھا۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔

وہ اسے ایک بہت اچھا انسان سمجھتے رہے۔ بیلا کا حال سب سے ابتر تھا۔ اس کی غلطی نہ صرف اس کی ازدواجی زندگی کو تباہی کے دہانے پر لے آئی تھی بلکہ چہیتا بھائی بھی قانون کے شکنجے میں تھا۔

”حسد اور رقابت بہت بُری چیز ہیں۔“ انسپکٹر، بیلا کو دیکھتے ہوئے بولا ”لیکن اعتبار کا خون کرنا اس سے بھی برا ہے۔ ڈرگز کا اوور ڈوز آپ کے بیٹے کی جان لے گیا شاید ہم یہی سمجھتے رہتے اگر سائنس اتنی ترقی نہ کر گئی ہوتی اور پوسٹ مارٹم رپورٹ میں زہر کی موجودگی سامنے نہ آتی۔“

سب لوگ اپنی جگہوں سے اچھل پڑے سوائے بیلا کے جو بمشکل خود کو سنبھالے بیٹھی تھی مگر اس کا باقاعدہ لرزتا وجود جیسے گرنے کو تھا۔

”چاہتا تو یہ تھا کہ یہ اعترافی بیان مس بیلا کی زبان سے ادا ہوتا مگر ان کی حالت کے پیشِ نظر مس ماریہ کی مدد لیتے ہیں۔“ مسز کارلوس کی نگاہوں کی بے اعتباری اور بعد ازاں نگاہوں سے جھلکتی نفرت نے ماریہ کو اپنی سیٹ پر سکڑنے پر مجبور کر دیا۔ اس کی زردی مائل رنگت مزید بجھ گئی۔ مصنوعی پرسکون انداز ہوا ہو چکا تھا۔

”مس بیلا کے کہنے پر میں لالچ میں آ گئی تھی۔ اس رقم سے میرے بہت سے کام ہو جاتے۔ وہ جڑی بوٹی اور کیڑے مار گولیاں بھی انہوں نے لا کر دیں جسے میں نے کھانے میں استعمال کیا۔“ ماریہ نے کس طرح اچانک بولنا شروع کیا یونہی اچانک چپ ہو کر زور زور سے رونے لگی اور کسی مردے کی طرح نڈھال پڑی بیلا میں اچانک جیسے جان آ گئی۔ کسی اسپرنگ کی طرح اچھل کر اس نے ماریہ کی گردن پکڑ لی۔

”جھوٹی، مکار، حرافہ تجھے اس کمینی عورت کو مارنے کا کہا تھا تو نے انتونیو کو مار دیا۔“

بیلا شاید اس کی جان لے لیتی اگر اسے ماریہ سے الگ نہ کیا جاتا۔

”اب جبکہ کمرے کا ماحول سازگار نہیں رہا تو میں بتاتا ہوں کہ کیا ہوا ہوگا۔ تیرہ اگست کی رات جب تقریب اختتام پذیر ہوئی اور ریسٹورنٹ سے منگوایا گیا کھانا سرو کرنے کے لیے ماریہ کو کہا گیا تو اس کے پاس بہت عمدہ موقع تھا کھانے میں زہر شامل کرنے کا۔ سوال یہ ہے کہ اس نے مس شلپا پر اثر کیوں نہیں کیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ زہر صرف گوشت کی ڈشز میں تھا۔ اب سوال پھر پیدا ہوتا ہے کہ مس ماریہ نے یہ انتہائی اقدام کیوں کیا۔ پیسہ وجہ بنا؟ نہیں مسٹر انتونیو کی دوستیاں صرف باہر کی خواتین تک محدود نہیں تھیں بلکہ گھر کی ملازمہ کے ایک سے زائد بار ابارشن کے ذمے دار آپ کے بیٹے ہی تھے۔ جن کی طرف سے پے کیے گئے میڈیکل بلز اس بات کا ثبوت ہیں۔“

انسپکٹر کی بات مکمل ہو چکی تھی۔ کمرے میں گونجتی مسز کارلوس کی سسکیاں تیز ہو چکی تھیں مگر انتونیو قتل کیس نے ان سب پر ثابت کر دیا کہ شرافت...... خاندان کے اونچے ناموں یا دولت کی مرہونِ منت نہیں ہوتی...... انتونیو کے خاندان نے بیلا کو اس بنیاد پر رد کر دیا تھا۔

خوش قسمت

جمال دستی

کسی کی زندگی کا نچوڑ یہ ہوتا ہے کہ غلطی کے بعد غلطی کی... جو کچھ کیا برے انداز میں کیا... ایک ایسے ہی برے شخص کا قصہ... حالات ایسے رونما ہو رہے تھے جو اسے مشکل اور پستی میں دھکیل رہے تھے۔

اس برے شخص کی کہانی جو قسمت کا دھنی تھا

"جولیس سے بات کرواؤ۔"

میرے وجود میں سنسنی پھیل گئی۔ یہ آواز ڈیسمنڈ گروش کی تھی جسے ایک دفعہ جولیس نے انتہائی خطرناک شخص قرار دیا تھا۔ میں نے جولیس کو بتایا کہ گروش اس سے بات کرنا چاہ رہا ہے۔ اس وقت وہ اپنے دفتر میں وائن اسپیکٹیٹر کے تازہ شمارے میں کوئی دلچسپ مضمون پڑھ رہا تھا۔ چند لمحوں کے لیے اس کی آنکھوں میں الجھن نظر آئی پھر وہ بولا۔

”آرچی، کیا یہ کوئی بے ہودہ مذاق ہے؟“

”میں مذاق نہیں کر رہا، وہ شیطان لائن پر ہے اور تم اسے انتظار کروا رہے ہو، مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔“

اس نے اپنا سیل فون اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ بات کراؤ۔“

میں نے لائن ملا دی۔ گروش کہہ رہا تھا۔ ”کنز! تم ایک ایسے معاملے میں مداخلت کر رہے ہو جو تمہیں نہیں کرنی چاہیے تھی۔“

”وہ کیا؟“ جولیس نے پوچھا۔

”تم اچھی طرح جانتے ہو۔“

”بڑی دلچسپ بات ہے۔“ جولیس نے کہا۔ ”اس وقت تو میں بورڈ گیمس کی مختلف اقسام کے بارے میں پڑھ رہا ہوں جنہیں خریدنے کا ارادہ ہے۔ شام کو میرا پروگرام بیلو یڈر کلب جانے کا ہے جہاں میں عمدہ قسم کی فرانسیسی شراب سے دل بہلاؤں گا۔ میں نہیں سمجھتا کہ ان میں سے کوئی بھی مصروفیت تمہارے لیے دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہے۔“

میرے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ میں ایک ضرب دو انچ کے خول میں بند ایک روبوٹ ہوں جسے جولیس ایک ٹائی پن کی طرح استعمال کرتا ہے اور میں اپنے آڈیو ویڈیو سسٹم کی وجہ سے سب کچھ دیکھ اور سن سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ انتہائی حساس قسم کے نیورون نیٹ ورک کی بدولت مجھ میں سوچنے اور ٹیلی پیتھی کی طرز پر کام کرنے کی صلاحیت موجود ہے البتہ میں سونگھنے اور سردی گرمی یا رطوبت محسوس کرنے سے محروم ہوں۔

”تم ایک خطرناک کھیل میں حصہ لے رہے ہو۔“ گروش نے سرد لہجے میں تنبیہ کی۔ ”میں تمہارے ٹاؤن ہاؤس کو ایک دھماکے سے اڑا سکتا تھا۔ اگلی بار شاید مجھے یہی کرنا پڑے۔“ اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

واقعی ایسا ہو چکا تھا۔ وائن کے اس کریٹ میں ایک بم نصب کیا گیا تھا جو جولیس کے زمین دوز شراب خانے میں لایا گیا۔ بم پھٹنے سے صرف تیس سیکنڈ پہلے گروش نے جولیس کو فون پر اس کی اطلاع دی۔ وہ بمشکل اپنی جان بچا کر بھاگا۔ اسے اتنی مہلت بھی نہیں ملی کہ وہ خاندانی تصاویر، ورثے میں ملی نادر اشیا اور قیمتی شراب کی بوتلیں ساتھ لے جا سکتا۔ دھماکے میں ٹاؤن ہاؤس مکمل طور پر تباہ ہو گیا اور اسے دوبارہ تعمیر کرنا پڑا۔

جولیس نے فون رکھ کر کافی کا گھونٹ لیا اور مجھ سے پوچھا کہ گروش کا اشارہ کس جانب تھا۔ ”میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ میں نے جواب دیا۔

”تم اندازہ تو لگا سکتے ہو۔“

”ممکن ہے کہ وہ میرے کسی کیس کے بارے میں کہہ رہا ہو۔“

اس کا منہ بن گیا اور وہ ناراض ہوتے ہوئے بولا۔ ”یعنی تم نے مجھے بتائے بغیر سراغ رسانی شروع کر دی۔“

”میں نے صرف سات کیس کیے ہیں جو میں خود بھی فون ریکارڈ اور بینک اکاؤنٹ ہیک کر کے ہینڈل کر سکتا تھا۔ ان میں سے تین میں چیک کے بارے میں معلومات حاصل کرنا تھیں جبکہ ایک عورت نے مجھ سے اپنے شوہر کے خفیہ اثاثوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے کہا تھا کیونکہ وہ اپنے شوہر سے طلاق حاصل کرنا چاہ رہی تھی۔ باقی کیسز بھی اسی نوعیت کے تھے۔“

”یہ سلسلہ کب سے چل رہا ہے؟“

”تین ہفتے ہو گئے جب میں نے تمہیں وارننگ دی تھی کہ تمہارا بینک اکاؤنٹ بہت تیزی سے ختم ہو رہا ہے اور اس میں صرف ایک مہینے کے اخراجات کے لیے رقم رہ گئی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم زیادہ وقت میگزین پڑھنے، اپنے دفتر میں سوچ بچار کرنے اور ہفتے کے روز جوا کھیلنے میں گزارتے ہو۔ پچھلی بار تم نے ایک بڑی رقم جیتی تھی لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ کئی مرتبہ تمہیں ہار بھی ہوئی ہے۔“

”میری مالی پوزیشن اتنی خراب نہیں ہے آرچی۔ میں نے کافی سرمایہ کاری کر رکھی ہے۔ وہاں سے پیسے نکال سکتا ہوں۔“

وہ اپنے شراب کے ذخیرے کے بارے میں بات کر رہا تھا جس کی میں نے فہرست بنا رکھی تھی کیونکہ بحیثیت پرسنل سیکریٹری یہ بھی میرے فرائض میں شامل تھا۔ اس کی فروخت صرف نیلامی کے ذریعے ممکن تھی اور اس سے ملنے والی قیمت کا انحصار نیلامی میں حصہ لینے والے لوگوں اور دیگر کئی عوامل پر تھا۔ اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو جاتا کہ جولیس کو پیسوں کی ضرورت ہے تو ان کی قیمت آدھی سے بھی کم ہو جاتی۔ ہم دونوں یہ بھی جانتے تھے کہ اس کے لیے یہ شراب فروخت کرنا کتنا تکلیف دہ ہوگا۔

”میں جانتا ہوں کہ تمہیں اپنے کھیل پر بہت اعتماد ہے لیکن اگر کبھی تمہارے پاس خراب پتے آ گئے تو کیا کرو گے۔ اسی بُرے وقت کے لیے میں نے اس سراغ رسانی سے اب تک چھ ہزار ڈالر جمع کر لیے ہیں۔ تمہیں میرا شکریہ

ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اب بھی گگی کو لے کر لی چی کرو، میں ڈنر کر سکتے ہو۔ بجائے اس کے کہ تم اسے دا پچی پگ وسل، میں لے کر جاؤ۔"

"دا پچی پگ وسل۔ یہ کہاں ہے؟"

"یہ ریستوران لوئر واشنگٹن اسٹریٹ پر واقع ہے۔ گو کہ وہ اپنی ڈشوں میں پروٹین کے لیے ایک دو مکھیاں ڈال دیتے ہیں لیکن وہ اس ریستوران کے مقابلے میں بہت سستا ہے جہاں تم جانا پسند کرتے ہو۔"

جولیس نے کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ "گو کہ تم بڑی محنت اور خلوص سے کام کر رہے ہو لیکن میں چاہوں گا کہ تم فوری طور پر یہ سرگرمیاں ترک کر دو۔ اب تم خود کسی کے لیے کام نہیں کر سکو گے۔ میں تمہاری پروگرامنگ میں کچھ ایسی تبدیلیاں کر دوں گا کہ تم دوبارہ یہ کام نہ کر سکو۔"

پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "مجھے اس کیس کے بارے میں بتاؤ جس پر تم اس وقت کام کر رہے ہو۔"

میرے لیے یہی غنیمت تھا۔ اس طرح کم از کم میرا ایک کیس بچ گیا جو کہ دوسروں کے مقابلے میں غیر معمولی تھا۔ پرسکاٹ نامی شخص بوسٹن پریمیئر وائنز کا مالک تھا۔ یہ دکان بوسٹن کے علاقہ فورٹ پوائنٹ میں واقع تھی۔ اس کی دکان سے شراب کا ایک کیس غائب ہو گیا تھا جسے وہ نیلام کرنے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق اس شراب کی قیمت گیارہ ہزار ڈالر کے قریب تھی اور اسے دکان کے اسٹور میں رکھا گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ چوری دکان کے پانچ ملازمین میں سے کسی ایک نے کی تھی اور اس نے چور کا پتا لگانے کے لیے میری خدمات حاصل کی تھیں۔

میں جانتا تھا کہ یہ سن کر جولیس کے زخم ہرے ہو جائیں گے۔ ایک سال پہلے اس نے پرسکاٹ سے ایک خاص شراب کے بارے میں کہا تھا کہ اگر اس کی کوئی بوتل اس کے ہاتھ لگے تو وہ اسے اس کے لیے رکھ لے۔ تین ماہ قبل جب پرسکاٹ کے پاس اس شراب کی چار بوتلیں آئیں تو اس نے انہیں نیلام کر دیا اور جولیس کو اس بارے میں نہیں بتایا اس طرح وہ نیلامی میں حصہ نہ لے سکا۔ جولیس نے اپنے جذبات کا اظہار نہیں کیا۔ تاہم اس نے پرسکاٹ کی دکان سے شراب خریدنا بند کر دی اور نہ ہی اس کے یہاں ہونے والے کسی نیلام میں شرکت کی۔

"پرسکاٹ کو پانچ روز قبل اس چوری کا پتا چلا تو اس کے دوسرے روز اس نے میری خدمات حاصل کیں۔ میں اس کے ملازمین کے ٹیلی فون، ای میل اور بینک ریکارڈ کی نگرانی کر رہا ہوں لیکن تا حال مجھے کوئی بھی مشتبہ نظر نہیں آیا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ آج کسی وقت ان پانچوں سے فرداً فرداً فون پر بات کروں۔ شاید اس طرح کوئی سرا ہاتھ آ جائے۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔ تم پرسکاٹ کو فون کر کے بتا دو کہ تم اس کیس سے دستبردار ہو رہے ہو اور اگر تم نے اس سے کوئی رقم بطور ایڈوانس لی ہے تو اسے واپس کر دو۔"

"تمہیں یہ تجسس نہیں کہ گروش اس قیمتی شراب کو چرانے کی زحمت کیوں کرے گا۔ گیارہ ہزار ڈالر اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔"

"آرچی، یہ تمہارا مفروضہ ہے۔ ہمارے پاس گروش کو اس چوری سے جوڑنے کے لیے کوئی ثبوت نہیں ہے۔ دکانوں میں ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ تمہارے سوال کا جواب یہ ہے کہ مجھے اس بارے میں بالکل بھی تجسس نہیں ہے۔ اس کے بجائے میری دلچسپی اس فرانسیسی شراب میں ہے جو آج متعارف کروائی جائے گی۔"

میں نے اس کے کہنے پر پرسکاٹ کو فون کر کے یہ بری خبر سنا دی۔ ہفتے کے روز جولیس ایک بار پھر جوئے میں آٹھ ہزار سے زیادہ ڈالر ہار گیا۔ اس کے بعد اس کا بینک اکاؤنٹ تقریباً خالی ہو گیا۔ میں نے اس سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی اور پیر کی صبح کا انتظار کرنے لگا۔ جب وہ کافی اور اخبار سے فارغ ہو گیا تو میں نے اس کے اسٹاک میں شراب کی فہرست ای میل کر دی۔

"اگر میں نے یہ ذخیرہ آج نیلامی میں رکھ دیا تو اس ہفتے کے اختتام تک یہ رقم تمہارے اکاؤنٹ میں آ جائے گی۔" میں نے کہا۔

اس نے اس طرح منہ بنایا جیسے کوئی بدمزہ چیز چکھ لی ہو پھر ای میل پڑھے بغیر اسے صاف کر دیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اب تمہارے پاس کیا انتخاب رہ گیا ہے؟" میں نے کہا۔ "تمہارے پاس ایسا کوئی کیس نہیں جس سے معقول آمدنی کی توقع ہو اور جس طرح تم گزشتہ چھ ماہ سے مؤکلوں کو انکار کر رہے ہو۔ اس کے بعد وہ کہیں اور جا سکتے ہیں اور اب شاید مجھے تمہارے لیے نیا کلائنٹ تلاش کرنے میں کئی ہفتے لگ جائیں جبکہ اگلے ہفتے پراپرٹی ٹیکس کا بل بھی دینا ہے۔"

جولیس نے میری بات کا جواب دینے کی زحمت نہ

کی۔ اس کے باوجود میں نے اگلا ایک گھنٹا مختلف لوگوں کو فون کرنے میں گزارا۔ اس امید پر کہ شاید ان میں سے کوئی جولیس کی خدمات لینے پر آمادہ ہو جائے لیکن لگتا تھا کہ وہ اسے بھول چکے تھے۔ کسی زمانے میں اس کا شمار بوسٹن کے ذہین ترین سراغ رسانوں میں ہوتا تھا لیکن گزشتہ چھ ماہ سے اس نے کوئی کیس نہیں لیا اور اب وہ ماضی کی یاد بن کر رہ گیا تھا۔ میں نے یہ بات اسے نہیں بتائی لیکن جب وہ لنچ کے بعد دفتر میں واپس آیا تو میں نے کہا۔

’’آج کل پبلسٹی کا زمانہ ہے، میں دیکھتا ہوں کہ اگر کوئی مقامی اخبار تمہارا انٹرویو شائع کرنے پر آمادہ ہو جائے۔‘‘

اس نے شرلے جیکسن کی سوانح حیات اٹھائی اور کتاب پر سے نظریں ہٹائے بغیر بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

’’اس کی ضرورت نہیں۔‘‘

اس کے بعد میں خاموش ہو گیا۔ جولیس کتاب پڑھتا رہا۔ پانچ بجے کے قریب اس نے کتاب اپنی جگہ پر رکھی اور ایک شیلف سے بوسٹن سٹی کی اٹلس نکالی اور اس میں اپنا مطلوبہ علاقہ تلاش کرنے لگا۔ پھر اس نے مجھے ایک فہرست دی جس میں کچھ پتے لکھے ہوئے تھے۔

’’آرچی پلیز، ان عمارتوں کے مالکان کو تلاش کرو۔‘‘

ان میں سے ایک ایڈریس ڈونلڈ پرسکاٹ وائن شاپ کا تھا اور میں جانتا تھا کہ پرسکاٹ ہی اس عمارت کا مالک ہے جبکہ جن دوسری عمارتوں کے پتے درج تھے وہ بھی اسی بلاک میں تھیں۔ ان کے مالکان کو تلاش کرنا بہت مشکل تھا۔ جب جولیس ڈنر کے بعد واپس آیا تو میں نے اسے بتا دیا کہ پرسکاٹ کے علاوہ دوسری عمارتیں شیل کمپنیوں کی ملکیت تھیں۔

’’میں نے مختلف ڈیٹا بیس میں جا کر دیکھا لیکن ان کے مالکان کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ میں یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ یہ ساری کمپنیاں ایک ہی شخص کی ملکیت ہیں۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’شاید تم سوچ رہے ہو کہ گروش ہی ان عمارتوں کا مالک ہے۔ اس کے علاوہ تمہارے دماغ میں کیا ہے؟ یہی کہ وہ پرسکاٹ کی عمارت بھی حاصل کرنا چاہتا ہے اور شراب کی چوری کا اس معاملے سے گہرا تعلق ہے۔‘‘

جولیس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور بولا۔

’’میں صرف اپنا تجسس دور کرنا چاہ رہا ہوں۔ برائے مہربانی تم پرسکاٹ کو فون کر کے کہو کہ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

اس کے دماغ میں ضرور کوئی ٹھوس بات ہوگی ورنہ وہ پرسکاٹ سے ملنے کے لیے نہ کہتا چنانچہ میں نے اس کے کہنے پر عمل کیا اور پرسکاٹ کے لیے پیام چھوڑ دیا۔ اس کے بعد میں نے دو گھنٹے ضائع کیے۔ پہلے ڈیسمنڈ گروش سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر یہ اندازہ لگانا چاہا کہ کیا محض عمدہ قسم کی شراب چوری کر کے پرسکاٹ پر عمارت بیچنے کے لیے دباؤ ڈالا جا سکتا ہے تاہم یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں تھی اور پرسکاٹ کے اسٹور کا انشورنس تھا بہرحال اسے یہ جاننے کی خواہش تھی کہ اس کے ملازمین میں سے کس نے چوری کی ہے۔

دس بجے کے قریب میں نے اپنی کوششیں ترک کر دیں۔ جولیس بھی دوبارہ کتاب پڑھنے میں مشغول ہو گیا تھا لیکن وہ جس انداز سے کرسی کے ہتھے پر انگلیوں سے طبلہ بجا رہا تھا اس سے بے سکونی ظاہر ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے گلا صاف کیا اور مجھ سے کہا کہ میں دوبارہ پرسکاٹ سے رابطہ کروں۔

میں نے نمبر ملایا اور ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی لیکن وہ پرسکاٹ نہیں تھا۔ ہم ایک منٹ بات کرتے رہے پھر میں نے جولیس کو بتایا کہ سراغ رساں مائیک گرف مجھ سے مخاطب تھا۔ ’’پرسکاٹ گرفتار ہو گیا ہے اور گرف تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔ کیا میں اس سے ملاؤں؟‘‘

’’اسے کس الزام میں گرفتار کیا گیا ہے؟‘‘

’’قتل کے الزام میں۔ مجھے یہ بات گرف نے نہیں بتائی لیکن میں نے بوسٹن پولیس ڈپارٹمنٹ کے کمپیوٹر سسٹم میں ہیکنگ کر کے معلوم کی ہے۔ آج شام آٹھ بج کر تیس منٹ پر ایوننگ شفٹ کی پولیس کو نو گیارہ پر اطلاع ملی۔ جب وہ جائے وقوعہ پر پہنچے تو انہوں نے پرسکاٹ کو اپنے ایک ملازم جم ڈنکن کے اپارٹمنٹ سے نکلتے ہوئے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں چوری کی ہوئی فرانسیسی شراب کا کیس تھا۔ اپارٹمنٹ کے اندر بیڈ روم میں انہیں ڈنکن کی لاش ملی۔ اس کے سر پر ٹائر کھولنے والی راڈ سے حملہ کیا گیا تھا۔‘‘

’’کس نے نو گیارہ کو اطلاع دی تھی؟‘‘

’’رپورٹ میں یہ نہیں بتایا گیا۔ میں نے اس دوران کی جانے والی کالز... کی فہرست دیکھی۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ کال کسی برنر فون سے کی گئی تھی۔ میں گرف سے کیا کہوں؟‘‘

’’اس سے میری بات کراؤ۔‘‘

گرف بہت جلدی میں تھا اور جاننا چاہ رہا تھا کہ جولیس، پرسکاٹ کو کیوں فون کر رہا تھا۔ جولیس نے الٹا اس سے سوال کر دیا کہ ایک ہومی سائڈ سراغ رساں پرسکاٹ کے بجائے اس کے فون پر کیوں بات کر رہا تھا۔

جولیس نے کہا۔ ”کیا ڈونلڈ پرسکاٹ کا قتل ہو گیا ہے؟“

”نہیں۔“

”تو پھر وہ قتل کے الزام میں گرفتار ہوا ہوگا۔ کیا جائے وقوعہ سے شراب کا کیس بھی ملا ہے؟“

گرف نے مشکوک انداز میں پوچھا۔ ”تمہیں شراب کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟“

”میرے اسسٹنٹ آرچی اسمتھ کو چار روز قبل پرسکاٹ نے یہ ذمے داری سونپی تھی کہ وہ اس ملازم کا سراغ لگائے جس نے شراب چوری کی تھی۔ آرچی بھی کبھی فری لانس سراغ رساں کے طور پر کام کرتا ہے۔ اس نے مجھے آج یہ بات بتائی تو مجھے بھی تجسس ہوا۔ میں اسی لیے پرسکاٹ سے بات کرنا چاہ رہا تھا کہ میں نے اس بارے میں جو نظریہ قائم کیا ہے، اگر وہ درست ہے تو اس کی چوری شدہ شراب جلد ہی مل جائے گی۔“

”تمہارا نظریہ کیا ہے؟“

”شاید یہ بہتر ہوگا کہ ہم بالمشافہ گفتگو کریں۔“

جولیس کی خوش قسمتی تھی کہ یہ قتل کیمبرج کے بجائے بوسٹن میں ہوا۔ اور اس کا واسطہ سراغ رساں مارک کریمر کے بجائے گرف سے تھا۔ ورنہ کریمر تو اس سے رتی برابر بھی تعاون نہ کرتا اور عین ممکن تھا کہ پولیس کی تحقیقات میں مداخلت کرنے کے الزام میں وہ جولیس کو گرفتار کرنے کی کوشش کرتا۔ اس کے برعکس گرف تھوڑی سی بڑبڑاہٹ کے بعد جولیس کی شرائط پر متفق ہو گیا۔

پچاس منٹ بعد جولیس اور اس کے وکیل ہنری زیک کی ملاقات نیوسڈبری پولیس اسٹیشن کی حوالات میں ڈونلڈ پرسکاٹ سے ہوئی۔ اس کی عمر باسٹھ سال تھی اور اس نے شکن آلود گہرے نیلے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ رسمی گفتگو کے بعد اس نے جولیس کو اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی کوشش کی لیکن جولیس نے اسے روک دیا اور اصل معاملے پر توجہ دیتے ہوئے اسے مشورہ دیا کہ وہ زیک کو اپنا وکیل مقرر کرے اور ساتھ ہی اسے اس مشکل سے نکالنے کے لیے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ جولیس نے جو شرائط پیش کیں، ان سے متفق ہونے کے بعد پرسکاٹ نے معاہدے پر دستخط کر دیے۔

اس کے بعد جولیس نے ایک فون کیا اور ان تینوں کو پولیس اسٹیشن کے کانفرنس روم میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں گرف ان کا انتظار کر رہا تھا۔ جولیس نے پہلے ہی اسے اس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ ان کی ملاقات ہونے تک وہ پرسکاٹ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرے گا لہٰذا ابھی تک اس پر قتل کا الزام عائد نہیں کیا گیا تھا۔

”جولیس، میں اپنی بات پر قائم ہوں گو کہ ہم نے پرسکاٹ کو رنگے ہاتھوں پکڑا۔ بظاہر یہ ایک سیدھا سادہ قتل کا کیس ہے۔“ گرف نے کہا۔ ”بہرحال ہم تمہارا نظریہ بھی سن لیتے ہیں۔“

”مائیک میں اپنی ذمے داری ضرور پوری کروں گا لیکن اس سے پہلے ایک دو سوال کرنا چاہتا ہوں۔ کیا پولیس نو گیارہ کی کال سننے کے بعد جم ڈکسن کے اپارٹمنٹ پر گئی تھی؟“

”ہاں۔“

”کیا فون کرنے والے نے اپنا نام بتایا تھا؟“

”نہیں، یہ ایک گمنام کال تھی اور کسی برنر فون سے کی گئی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس نے ایک چیخ سنی تھی۔ آپریٹر یہ نہیں بتا سکا کہ وہ کوئی مرد تھا یا کھردری آواز والی عورت۔ اس طرح کی کال مشتبہ نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ ڈکسن کے پڑوس سے کی گئی تھی۔“

”کیا پولیس نے مسٹر پرسکاٹ کو فرانسیسی شراب کا کیس لے جاتے ہوئے دیکھا تھا؟“

”ہاں، انہوں نے اسے روکا جب وہ ڈکسن کے اپارٹمنٹ سے باہر آ رہا تھا۔“

”اس اپارٹمنٹ کے بارے میں بتا سکتے ہو؟“

”ہاں، وہ براؤن اسٹون میں ایک کمرے کا اپارٹمنٹ ہے۔“

”کون سی منزل پر؟“

”تہ خانے میں۔“

”یعنی اس کا الگ دروازہ ہوگا؟“

”ہاں۔“ گرف نے پرسکاٹ پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”اور کوئی بھی شخص دوسرے کرائے داروں کی نظروں میں آئے بغیر وہاں آ جا سکتا ہے۔“

جولیس نے پرسکاٹ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”تم نے شراب کہاں سے حاصل کی؟“

”ظاہر ہے کہ جم ڈکسن کے اپارٹمنٹ سے۔“ اس

نے بے خوفی سے کہا۔

”تمہیں وہاں سے شراب ملنے کی امید تھی؟“

”بالکل ورنہ میں وہاں نہ جاتا۔“

”تمہیں یہ اندازہ کیسے ہوا کہ شراب اسی کے اپارٹمنٹ میں ہوگی؟“

پرسکاٹ نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ڈنکن کی جانب سے ایک ایس ایم ایس موصول ہوا کہ میری چوری ہوئی شراب اس کے پاس ہے اور اگر وہ مجھے چاہیے تو اس کے لیے اس کے اپارٹمنٹ پر آنا ہوگا۔“

”تم یہ پیغام ملتے ہی سیدھے اس کے پاس چلے گئے؟“

”پہلے میں نے اسے فون کیا لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔“

جولیس نے گرف سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ تم نے مسٹر پرسکاٹ کے ایس ایم ایس اور کال ہسٹری دیکھ لی ہوگی۔“

گرف نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے کہا۔ ”پھر کیا ہوا؟ اس سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ یہ وہاں نہیں گیا اور اس نے ڈنکن کو قتل نہیں کیا جبکہ یہ خود کہہ رہا ہے کہ یہ وہاں سے شراب لے کر نکل رہا تھا۔“

جولیس نے پرسکاٹ سے پوچھا۔ ”جب تم ڈنکن کے اپارٹمنٹ پہنچے تو کیا ہوا؟“

”میں نے گھنٹی بجائی۔“ اس نے کہا۔ ”جب کوئی جواب نہیں ملا تو میں نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی، وہ غیر مقفل تھا۔ میں نے دیکھا کہ چوری شدہ شراب لیونگ روم کے فرش پر رکھی ہوئی تھی۔ میں نے ڈنکن کو آواز دی لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ میں نے شراب اٹھائی اور جب میں باہر آ رہا تھا تو پولیس نے مجھے روک لیا۔“

گرف نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے جولیس سے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ تم مجھے اپنا نظریہ بتانے والے تھے؟“

”صرف دو سوال اور...... پھر میں اپنا نظریہ بتاؤں گا۔“ پھر وہ پرسکاٹ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”جس عمارت میں تمہاری دکان ہے، کیا کسی نے اسے خریدنے کی کوشش کی ہے؟“

”ہاں، دو ماہ قبل ایک پرکشش پیشکش ہوئی تھی لیکن میں نے انکار کر دیا۔ میں اس عمارت کو فروخت کرنا نہیں چاہتا۔“

”یہ پیشکش کس نے کی تھی؟“

”میں اس کا نام نہیں جان سکا۔ اس نے مجھے ایک بزنس کارڈ دیا جس پر اس کمپنی کا نام اور فون نمبر درج تھا جس کی وہ نمائندگی کر رہا تھا۔ میں نے وہ کارڈ اسی وقت ضائع کر دیا۔ مجھے اس کمپنی کا نام بھی یاد نہیں۔“

جولیس اپنے ساتھ بوسٹن سٹی کی اٹلس بھی لایا تھا۔ اس نے وہ صفحہ کھولا جس پر پرسکاٹ کی عمارت تھی اور گرف سے کہا۔ ”آرچی نے اس بلاک میں دوسری عمارتوں کے مالکان کا پتا لگانے کی کوشش کی ہے اور صرف یہ معلوم ہو سکا کہ یہ شیل کمپنیز کے نام پر ہیں۔“

”تمہارا خیال ہے کہ ان عمارتوں کے مالک نے ہی یہ پیشکش کی ہوگی؟“

”ہاں، یہ بھی میری تھیوری کا حصہ ہے۔ اس کے اہم ترین پہلو کو ثابت کرنے کے لیے اس شراب کی ایک بوتل اور دو گلاس درکار ہیں۔“

گرف نے اسے یوں دیکھا جیسے اس نے کوئی احمقانہ بات کہہ دی ہو۔ ”میں تمہیں وہ ثبوت نہیں دے سکتا کہ تم اسے پی جاؤ۔“

”کس بات کا ثبوت؟ میں نہیں سمجھتا کہ تم اس کی مدد سے عدالت میں کچھ ثابت کر سکو گے۔ اس کے علاوہ میں بارہ نہیں بلکہ صرف ایک بوتل مانگ رہا ہوں، اگر مسٹر پرسکاٹ کو کوئی اعتراض نہیں جو اس شراب کا مالک ہے تو تمہیں بھی نہیں ہونا چاہیے۔“

گرف کو یہ بات پسند نہیں آئی تاہم قدرے ہچکچاہٹ کے بعد وہ مان گیا اور پرسکاٹ نے بھی ایک بوتل کھولنے کی اجازت دے دی۔ جولیس نے دونوں گلاسوں میں شراب انڈیلی اور ان میں سے ایک پرسکاٹ کو پکڑا دیا۔ دونوں نے شراب کو چکھنے سے پہلے اسے سونگھا اور انہوں نے اسے کافی مگ میں پھینک دیا جو گرف نے مہیا کیے تھے۔ پرسکاٹ اس شراب کو چکھنے کے بعد ششدر رہ گیا جبکہ جولیس نے ایسا تاثر دیا جیسے وہ یہی توقع کر رہا تھا۔

”یہ شراب چالیس ڈالر میں بری نہیں لیکن یقیناً فرانسیسی شراب نہیں ہے۔“ جولیس نے کہا۔

”تم یہ کہہ رہے ہو کہ فرانسیسی شراب کو سستی وائن سے بدل دیا گیا۔“ گرف نے کہا۔

”بالکل ایسا ہی ہے۔“

”اور اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟“

جولیس نے پرسکاٹ سے پوچھا کہ شراب چوری

ہونے سے کیا اسے اتنا زیادہ نقصان ہوا کہ وہ اپنی عمارت بیچنے پر مجبور ہو جائے جس پر اس نے جواب دیا کہ نقصان تو ہوا لیکن اتنا زیادہ نہیں۔ ”اگر یہ بوتلیں نہ ملتیں تو مجھے انشورنس سے تین ہزار ڈالر مل جاتے۔“

”اگر تم اصلی فرانسیسی شراب کے نام پر تبدیل شدہ وائن نیلام میں رکھ دیتے تو کیا ہوتا؟“

”یہ میرے لیے تباہ کن ہوتا جب میرے گاہکوں کو پتا چلتا تو وہ مجھ سے منہ موڑ لیتے اور میرا کاروبار چوپٹ ہو جاتا۔“

”اور اس کے بعد اگر دوبارہ تمہیں عمارت بیچنے کی پیشکش ہوتی؟“

”تو میں اسے قبول کر لیتا۔“

گرف نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”میں جانتا ہوں کہ یہ ایک دلچسپ کہانی ہے لیکن اس سے کہیں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ پرسکاٹ نے ڈنکن کو قتل نہیں کیا۔“

”ممکن ہے کہ ایسا نہ ہو لیکن یہ تمہارے لیے اتنی دلچسپ ضرور ہے کہ تم مسٹر پرسکاٹ پر الزام عائد کرنے سے پہلے اسے چوبیس گھنٹے کے لیے حوالات میں رکھ سکو کیونکہ مجھے امید ہے کہ اس سے پہلے ہی میں اصل قاتل کو تمہارے حوالے کر دوں گا۔“

گرف نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”تمہارے پاس کل شام چھ بجے تک کا وقت ہے۔“

جولیس نے وکیل سے مختصر بات کی اور ہم ٹاؤن ہاؤس کی جانب روانہ ہو گئے۔ میں نے کار میں سوار ہونے سے پہلے اس سے کہا۔ ”تم نہیں جانتے کہ پرسکاٹ بے گناہ ہے۔ وہ ڈنکن کو غصے کے عالم میں بھی قتل کر سکتا ہے۔“

جولیس نے اپنا سیل فون نکال لیا۔ یہ ظاہر کرنے کے لیے وہ کسی سے باتیں کر رہا ہے۔

”پرسکاٹ جھوٹ نہیں بول رہا تھا آرچی۔“

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کل شام چھ بجے تک اصل قاتل کا پتا چلا سکے گا۔ میں نے یہی بات اس سے کہی تو وہ ناک سکیڑتے ہوئے بولا۔ ”اگر میں کل شام تک قاتل کو بے نقاب نہیں کر سکا تو ساری زندگی واپس پگ وسل میں کھانا کھاؤں گا۔“

ممکن ہے کہ وہ پوری طرح اس تحقیقات میں الجھا ہوا ہو۔ اس کے باوجود اس کے معمول میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اگلی صبح وہ ہمیشہ کی طرح ساڑھے چھ بجے بیدار ہوا۔ دو گھنٹے مارشل آرٹس کی مشق کی پھر نہا دھو کر لباس تبدیل کر کے کچن میں گیا۔ اپنے لیے کافی بنائی اور توس پر جام لگایا۔ ناشتا کرنے کے بعد اخبار لے کر دفتر میں آگیا پھر اس نے مجھے مختلف ہدایات دیں اور اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔

ساڑھے دس بجے اس نے اخبار ایک طرف رکھا اور مجھ سے پوچھا۔ ”آرچی! کیا ٹام اور سول موجود ہیں؟“

”ٹام ڈنکن اور سول پینزر کا شمار شہر کے بہترین پرائیویٹ سراغ رسانوں میں ہوتا تھا اور جولیس اکثر ان کی خدمات حاصل کرتا تھا۔ میں نے اسے بتا دیا کہ وہ تیار ہیں اور انتظار کر رہے ہیں۔

”بہت اچھے، دوسرے لوگوں سے وقت لینے میں کوئی مشکل تو نہیں ہوئی؟“

”تھوڑی سی مشکل ہوئی۔ پرسکاٹ کا ایک ملازم یہاں آنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس پر میں نے اسے دھمکی دی کہ اگر وہ نہیں آیا تو یہ سمجھا جائے گا کہ وہی چور ہے۔ باقی تینوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔“

”مزاحمت کرنے والا کون تھا؟“

”گرے پارکر، وہ اسٹاک روم کا انچارج ہے۔ وہ مہنگی شراب وصول کرنے کا ذمے دار ہے اور یہ ممکن نہیں کہ اسے شراب کی چوری کا علم نہ ہو۔“

میں نے جولیس کو ان چاروں مشتبہ افراد کے پس منظر کے بارے میں بتا دیا لیکن اس میں کوئی خاص بات سامنے نہیں آئی۔ میں ان چاروں اور گروش کے درمیان کوئی تعلق تلاش نہ کر سکا اور نہ ہی حالیہ دنوں میں ان کے بینک اکاؤنٹ میں کوئی بڑی رقم منتقل ہوئی تھی۔ ان میں سے جو کوئی بھی گروش کے لیے کام کر رہا تھا، وہ انتہائی محتاط اور رازدار تھا۔

گیارہ بجے میں نے باہر لگی ہوئی ویب کام پر دیکھا کہ ایک بتیس سالہ دبلا پتلا شخص جولیس کے دروازے کی طرف آ رہا ہے۔ میں اس شخص کو پہچانتا تھا کیونکہ میں نے پہلے ہی چاروں مشتبہ افراد کے ڈرائیونگ لائسنس کی کاپیاں ہیک کر لی تھیں۔

”تمہارا پہلا ملاقاتی وقت پر آگیا ہے۔“ میں نے جولیس کو بتایا۔ ”بوسٹن پریمیئر وائن کا ویب ماسٹر بن ہیلے۔“

جولیس نے گھنٹی بجنے کا انتظار کیا پھر وہ کرسی سے اٹھ کر دروازے تک گیا اور اپنے مہمان کو لے کر دفتر میں آگیا۔ مہمان کے چہرے پر پھیلی ہوئی طنزیہ مسکراہٹ دیکھ

کر میں سوچنے لگا کہ کیا یہ شخص قاتل ہو سکتا ہے۔ یہ بات تو سمجھ میں آگئی تھی کہ کمپیوٹر سے واقفیت رکھنے والا کوئی بھی آدمی گروش سے خفیہ رابطہ رکھنے کے قابل ہو سکتا ہے۔

جولیس نے بھی اس کی مسکراہٹ کو نوٹ کیا اور بولا۔ ”کیا تمہیں یہاں کوئی دلچسپ بات نظر آرہی ہے؟“

وہ شرماتے ہوئے بولا۔ ”نہیں، دراصل یہ سب کچھ مجھے بہت غیر حقیقی لگ رہا ہے۔ میں نے اخبارات میں تمہارے بارے میں پڑھ رکھا ہے لیکن کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میں تمہارے دفتر میں بیٹھ کر شراب کی چوری جیسے معمولی کیس کے بارے میں تمہارے سوالات کے جواب دوں گا۔“

”شاید تم سمجھ رہے ہو گے کہ میں کسی قتل کے بارے میں تم سے پوچھ گچھ کروں گا۔“

ہیسلے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ ”نہیں بالکل نہیں۔“

”چوری ہونے والی شراب کی قیمت گیارہ ہزار ڈالر تھی اور میساچوسٹس میں اسے ایک بڑی چوری سمجھا جاتا ہے جس پر پانچ سال قید کی سزا ہے، کیا اب بھی تم اسے دلچسپ سمجھتے ہو؟“

”میں نے کبھی اسے دلچسپ نہیں سمجھا۔“

”کیا تم نے یہ شراب چرائی ہے۔“

”نہیں۔“

”اگر تم نہیں تو پھر کون ہو سکتا ہے؟ کیا جم ڈنکن نے یہ شراب چرائی تھی؟“

”میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تم خود ہی اس سے پوچھ لینا۔“

”اب مجھے یہ موقع نہیں ملے گا۔“ جولیس نے کہا۔ ”گزشتہ شام اس کا قتل ہو گیا ہے۔“

وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”بہت بُرا ہوا۔ لیکن اتنی معمولی سی بات پر اس کا قتل نہیں ہو سکتا۔ اس کی کوئی اور وجہ ہوگی۔“

اس کے بعد جولیس نے اسے کریدنا شروع کر دیا۔ وہ جھوٹا ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ہوشیار اداکار بھی ہو سکتا تھا۔ جولیس نے اس سے معمول کے سوالات کیے اور رفتہ رفتہ اس کے گرد گھیرا تنگ کرتا گیا۔ مثلاً یہ کہ کام ختم ہونے کے بعد وہ کیا کرتا رہا۔ ہیسلے نے بتایا کہ وہ ساڑھے پانچ بجے تک اپنے کام میں مصروف تھا کیونکہ اسے ویب سائٹ پر ایک نئے نیلام کی تفصیلات ڈالنا تھیں۔ پھر وہ کھانا خریدنے کے لیے مارکیٹ گیا۔ اس کے بعد گھر جانے سے پہلے وہ مارکیٹ کے سامنے والے پارک میں ایک بینچ پر بیٹھ کر کتاب پڑھتا رہا۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ کسی نے اسے وہاں بیٹھے ہوئے دیکھا ہوگا۔

”میرے خیال میں تو یہ جائے وقوعہ سے اپنی غیر موجودگی ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔“ میں نے جولیس سے کہا۔ ”اس نے کتنی ہوشیاری سے جتا دیا کہ دکان پر نقد ادائیگی کی تھی اور یہ کہ اسے کسی نے پارک میں بیٹھے نہیں دیکھا۔“

جولیس نے میری بات پر کوئی توجہ نہیں دی اور سوالات کا سلسلہ جاری رکھا۔ پندرہ منٹ بعد اسے اپنی کوشش ترک کرنا پڑی اور اس سے کہہ دیا کہ وہ جا سکتا ہے۔

ہیسلے حیران ہوتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا اور جیسے ہی اس نے ناب پر ہاتھ رکھا جولیس نے پیچھے سے آواز دے کر پوچھا۔ ”گروش نے پہلی بار تم سے کس طرح رابطہ کیا تھا؟“

”میں گروش نام کے کسی شخص کو نہیں جانتا۔“ اس نے جواب دیا۔

جولیس نے مزید کوئی بات نہیں کی اور اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے جولیس سے کہا۔ ”میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ اس شخص نے کبھی گروش کا نام نہیں سنا ہوگا۔“

جولیس نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ”اگر یہ شخص اس معاملے میں ملوث ہے تو گروش نے اس سے ڈیل کرنے کے لیے اپنے کسی کارندے کو استعمال کیا ہوگا اور اس کا بہت کم امکان ہے کہ گروش کا نام سامنے آئے لیکن اگر اس کا پیچھا کیا جائے تو ہمارا مقصد حل ہو سکتا ہے۔“

میں نے پہلے ہی اسٹین گرین سے کہہ دیا تھا کہ یہ جیسے ہی ہیسلے ٹاؤن ہاؤس سے باہر آئے اس کا تعاقب شروع کر دیا جائے، اگر وہ واقعی ملوث ہے تو کسی سے ملنے یا اس جگہ جانے کی کوشش کرے گا جہاں سے اسٹین کو کوئی ثبوت مل سکے اور اگر وہ واپس بوسٹن پریمیئر وائن جانا چاہے گا تو وہ اسے راستے میں روک کر کسی جگہ لے جا کر اس وقت تک بٹھائے رکھے جب تک جولیس دوسرے مشتبہ افراد سے بات نہ کرلے۔

بارہ بج کر پانچ منٹ پر اسٹین نے اطلاع دی کہ ہیسلے واپس اپنے کام پر جا رہا تھا کہ اس نے اسے راستے

میں روک لیا اور اب وہ مزید سوالات کے لیے اس کے ساتھ ایک کافی ہاؤس میں بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے جولیس کو یہ بات بتا دی تو اس نے مجھے انتظار کرنے کے لیے کہا کیونکہ دوسرے مشتبہ فرد کی آمد کا وقت ہو چکا تھا۔

بوسٹن پر یمیئر وائن کی کیشیئر اور بک کیپر آرین ڈوئل مقررہ وقت سے چار منٹ پہلے ہی آ گئی۔ ڈرائیونگ لائسنس کے مطابق اس کی عمر چھپن برس کی تھی لیکن دیکھنے میں وہ دس سال چھوٹی لگ رہی تھی۔ وہ دبلی پتلی اور درمیانہ قد کی تھی اور اس کی شکل اداکارہ ریٹا ہیورتھ سے مل رہی تھی گو کہ ڈنکن اس کے مقابلے میں قد آور اور قدرے وزنی تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اسے قتل نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے صبح ہی ہیکنگ کے ذریعے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ پڑھی تھی جس میں بتایا گیا کہ ڈنکن کے سر کی پشت پر سات مرتبہ لوہے کی سلاخ سے ضرب لگائی گئی۔ اس کے علاوہ ہیکنگ کے نتیجے میں یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ لوہے کی سلاخ پرسکاٹ کی کار سے نکالی گئی تھی۔ میرا اندازہ ہے کہ قاتل گن پوائنٹ پر ڈنکن کو بیڈ روم میں لے گیا ہوگا۔ اسے گھٹنوں کے بل جھکنے پر مجبور کیا اور سلاخ سے پے در پے وار کر کے اسے ہلاک کر دیا۔ ان چاروں مشتبہ افراد میں سے کوئی بھی یہ قتل کر سکتا تھا۔

جولیس نے اسے کافی پیش کی اور گفتگو کا آغاز ہو گیا۔ ڈوئل نے ابتدا میں ہی واضح کر دیا۔ ”میں یقین نہیں کر سکتی کہ بوسٹن پر یمیئر وائن، کے کسی ملازم نے یہ چوری کی ہو، تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم سب ایک خاندان کی طرح ہیں۔“

”خاندان میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔“ جولیس نے کہا۔ ”چور سے لے کر قاتل تک، اگر تمہیں اپنے ساتھیوں میں سے چور کی نشاندہی کرنا پڑے تو تم کس کا نام لو گی؟“

”کسی کا بھی نہیں۔“

”جم ڈنکن کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”وہ بہت ہی پیارا انسان ہے۔ ہر وقت مسکراتا رہتا ہے۔ اس لیے ہم اسے پیار سے اسمائیلی، کہتے ہیں۔ دراصل ہم سب کا کوئی نہ کوئی نک نیم ہے۔“

”تمہارا نک نیم کیا ہے؟“ جولیس نے پوچھا۔

”مسٹر پرسکاٹ نے مجھے شروع میں ہی ہنی، کہنا شروع کر دیا تھا کیونکہ میں بہت تیزی سے کام کرتی تھی۔“

جولیس نے اس سے جارج ایسٹر کے بارے میں پوچھا جو دکان کے لیے خریداری کرتا تھا اور یہ کہ کیا اس پر بھروسا کیا جا سکتا ہے۔ ڈوئل نے اصرار کیا کہ وہ بھی، پر مکمل بھروسا کرتی ہے۔ اسے بھی دکان میں کام کرتے ہوئے اس کے برابر ہی عرصہ ہو چکا ہے۔“

اس کے باوجود جولیس اس سے پوچھتا ہے کہ کیا وہ چور ہو سکتا ہے اور ڈوئل اصرار کرتی رہی کہ ایسا ممکن نہیں۔ اس نے یہی بات گیری پارکر کے بارے میں بھی کہی جس کا نک نیم گریسی، تھا۔ جب جولیس نے اس سے پوچھا کہ کیا مل ہیسلے چور ہو سکتا ہے تو اس نے تاخیری حربے کے طور پر کافی کا گھونٹ لیا اور بولی نہیں۔

”اس کا نک نیم کیا ہے؟“

اس کی آنکھیں بے رونق ہو گئیں جب اس نے بتایا کہ ہیسلے کا نک نیم جوکر ہے۔ وہ یقیناً جانتی ہو گی کہ اس چوری کے پیچھے ہیسلے کا ہاتھ ہے۔

جولیس نے پوچھا کہ کیا اسے جوکر اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں حسِ مزاح زیادہ ہے۔ اس پر وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ ”میں سمجھتی ہوں کہ یہ نام اس پر فٹ ہے۔“

اس کے بعد اگلے آٹھ سیکنڈ تک جولیس کا چہرہ کسی پتھر کے مجسمے کی طرح سخت ہو گیا اور میں سمجھ گیا کہ اس کا دماغ تیزی سے اس معمے کو حل کرنے میں مصروف ہے۔ جب وہ اس کیفیت سے باہر آیا تو اس نے ایک نوٹ پیڈ پر میرے لیے کچھ ہدایات لکھیں جنہیں پڑھ کر مجھے ایک لمحے کے لیے اس کی ذہنی صحت پر شک ہونے لگا۔

اس نے ڈوئل کو باتوں میں لگائے رکھا۔ غالباً وہ انتظار کر رہا تھا کہ میں کس حد تک اس کی ہدایات پر عمل کرنے میں کامیاب ہوتا ہوں۔ ٹھیک بائیس منٹ اور اٹھارہ سیکنڈ بعد ای میل کے ذریعے نتائج سے آگاہ کر دیا۔ اس نے معذرت کر کے جلدی جلدی اخبار میں چھپنے والا مضمون اور دیگر معلومات پڑھیں جو میں نے اسے ای میل کی تھیں اور ڈوئل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بولا۔ ”معاف کرنا، میں نے تمہارا بہت وقت لیا۔“

جب وہ اسے دروازے تک رخصت کرنے جا رہا تھا تو میں نے اس سے پوچھا کہ کیا میں الیون اسٹب کو فون کر کے کہہ دوں کہ اسے ڈوئل کا پیچھا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

”ہاں آرچی، ایسا ہی کرو۔“

''سول کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا میں اسے فون کر کے کہہ دوں کہ تمہیں اس کی خدمات کی ضرورت نہیں ہے۔''

''نہیں، اس سے رابطہ کرو۔ میرے پاس اس کے لیے ایک نیا کام ہے۔''

اٹھائیس منٹ بعد اس کا اگلا ملاقاتی ایسٹر عرف بگی، آیا۔ وہ اپنے حلیے سے ہی ہلبلو لگ رہا تھا۔ جولیس نے اس سے پس منظر کے بارے میں کچھ سوالات کیے۔ اس کی عمر چھیالیس سال تھی۔ وہ ساؤتھ بوسٹن میں پلا بڑھا۔ اس نے اسکول تک تعلیم حاصل کی لیکن کالج کی شکل نہیں دیکھی اور چھوٹے موٹے کام کرتا رہا پھر اسے بوسٹن پریمیئر وائن، میں ملازمت مل گئی۔ اس وقت اس کی عمر پچیس سال تھی۔ شروع میں اس نے اسٹاک روم میں کام کیا پھر وائن شاپ کے لیے خریداری کرنے لگا۔

جولیس نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم نے یقینا کچھ عرصہ الباما میں گزارا ہوگا؟''

''میں کبھی وہاں نہیں گیا۔'' ایسٹر نے کہا۔

''عجیب بات ہے۔ مجھے تمہارے نک نیم کے بارے میں بتایا گیا ہے اور یہ کہ تمہارا یہ نام کس طرح پڑا۔ یہاں کوئی بھی شاپنگ کارٹ کو بگی نہیں کہتا البتہ الباما میں یہ لفظ عام ہے۔''

''ہوسکتا ہے کہ میں نے بچپن میں یہ نام سنا ہو۔''

جولیس نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نہیں جانتا کہ میں نے الباما کا نام کیوں لیا۔ بگی کی اصطلاح پورے جنوب میں استعمال کی جاتی ہے۔ تمہارے اندر کوئی ایسی بات ضرور ہے جس کی وجہ سے میں یہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ تمہارا تعلق الباما سے ہے۔ بہرحال تم جاسکتے ہو۔''

ایسٹر کو اپنے تاثرات چھپانے پر عبور حاصل تھا۔ وہ کرسی سے اٹھا اور دروازے کی طرف جانے لگا۔ دفتر سے نکلنے سے پہلے جولیس نے اس سے کہا کہ وہ شراب کی چوری کی تحقیقات نہیں کر رہا ہے۔ ایسٹر نے پیچھے مڑ کر دیکھا لیکن یہ نہیں پوچھا کہ پھر وہ کس بات کی تحقیقات کر رہا ہے۔ میں ویب کام کے ذریعے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ جولیس کے کچن میں گیا اور وہاں سے ایک چاقو اٹھا لیا لیکن اسے اس کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ جولیس نے کنگ فو میں بلیک بیلٹ حاصل کر رکھی ہے اور وہ اسے بہ آسانی قابو کر سکتا ہے۔ میں نے اس کے ٹاؤن ہاؤس سے باہر جانے سے پہلے جولیس سے پوچھا کہ کیا ایسٹر کو یونہی جانے دیا جائے۔

''آرچی، ہم وہ تمام واقعاتی شہادتیں استعمال کر سکتے ہیں جو ہمیں مل جائیں۔''

اٹھائیس منٹ بعد ٹام ڈورگن نے اطلاع دی کہ ایسٹر سیدھا بس اسٹیشن گیا اور وہاں سے اس نے مشی گن کے شہر ڈیئر بورن کا یک طرفہ ٹکٹ خریدا۔ ''میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ ہمارے ساتھ تمہارے دفتر آنا چاہتا ہے یا پولیس اسٹیشن جانا پسند کرے گا۔ اس نے تمہارے دفتر کو ترجیح دی۔

ٹام نے ہم کا صیغہ استعمال کیا تھا۔ اس کا اشارہ اپنے اور سول کی جانب تھا۔ مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ خود بھی ایسٹر یا ورجل ہڈسن سے نمٹ سکتا تھا کیونکہ ایسٹر کا اصلی نام یہی تھا لیکن اس شخص نے لوہے کی سلاخ سے جم ڈنکن کو موت کے گھاٹ اتارا، اس لیے جولیس نے احتیاط کے طور پر سول کو ٹام کے ساتھ کر دیا تھا۔

جب وہ لوگ ہڈسن کو لے کر آئے جولیس نے انہیں باہر رکنے کے لیے کہا۔ ان کے جانے کے بعد تنہائی میں اس نے ہڈسن کو بائیس سال پرانے اخبار کی کاپی دکھائی جس میں اس کے وارنٹ گرفتاری کی خبر اور جوانی کی تصویر شائع ہوئی تھی جس میں اس کے لمبے بال اور گھنی مونچھیں تھیں۔ یہ اخبار میں نے ہی تلاش کر کے جولیس کو دیا تھا۔ اس خبر میں بتایا گیا تھا کہ کس طرح ہڈسن نے ایک شخص کو سفاکانہ طریقے سے قتل کیا تھا۔

''جب تک پولیس ڈنکن کے قتل میں تمہارے ملوث ہونے کے فارنسک ثبوت تلاش نہیں کر لیتی میرے لیے تمہیں مجرم ثابت کرنا مشکل ہوگا۔'' جولیس نے اعتراف کیا۔ ''لیکن مجھ سے ملنے کے بعد تمہاری.. ریاست سے فرار ہونے کی کوشش تمہیں نظر بند کرنے کے لیے کافی ہے۔ تاوقتیکہ الباما کی پولیس تمہیں اپنے ساتھ لے جا کر تم پر مقدمہ چلائے۔ یہ فیصلہ تمہیں کرنا ہے کہ تم الباما یا میساچوسٹس میں سے کس جگہ قتل کے مقدمے کا سامنا کرنا پسند کرو گے۔ الباما میں اس کی سزا موت ہے لیکن میساچوسٹس میں نہیں۔''

ہڈسن حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ''اگر میں ڈنکن کے قتل کا اعتراف کر لوں تو تم میری اصل شناخت ظاہر نہیں کرو گے؟''

''نہیں، میری خدمات جم ڈنکن کے قتل کا سراغ لگانے کے لیے حاصل کی گئی تھیں لیکن اگر پولیس نے تمہاری

اصل شناخت معلوم کر لی تو پھر میں کچھ نہیں کر سکتا لیکن مجھے لگتا نہیں کہ ایسا ہوگا۔''

ہڈسن سمجھ چکا تھا کہ اس کی پوزیشن کتنی نازک ہو گئی ہے چنانچہ اس نے کہا۔ ''میں جم ڈنکن کے قتل کا اعتراف کرتا ہوں۔''

''جس نے بھی تمہیں اس جرم کے لیے بلیک میل کیا۔ اس نے کبھی بتایا کہ تم کس کے لیے یہ کر رہے ہو؟''

''میں اس بارے میں بات نہیں کر رہا۔ انہوں نے مجھے کچھ دھمکیاں دی تھیں اور مجھے ان پر یقین کرنا پڑا۔''

''تم پولیس کو بتا سکتے ہو کہ ڈنکن نے تمہیں شراب چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا تھا اور تم نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ شراب اسے واپس کر دو گے تاکہ وہ اسے واپس اسٹور میں رکھ دے۔ اس کے بجائے تم جعلی شراب لے کر آئے اور ڈنکن کو قتل کر کے اس جرم کو پرسکاٹ کے سر ڈالنے کی کوشش کی۔ یہ سب ایک حد تک سچ ہے اور میں اس سے اختلاف نہیں کروں گا لیکن میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ان لوگوں سے بات چیت کے دوران کبھی ڈیسمنڈ گروش کا نام بھی سننے میں آیا۔''

ہڈسن نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نہیں۔''

''کیا وہ جانتے تھے کہ تم ڈنکن کو قتل کرنے اور اس کا الزام پرسکاٹ پر ڈالنے والے ہو؟''

''نہیں، یہ سب اسی طرح ہوا جیسے تم نے کہا۔ جم نے مجھے شراب چراتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس نے شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے شراب واپس کرنے کا موقع دیا۔ دوسری طرف مجھے دھمکی دی گئی کہ اگر میں نے پرسکاٹ کو اسٹور فروخت کرنے پر آمادہ نہ کیا تو اس کے سنگین نتائج برآمد ہوں گے۔ چنانچہ میں نے پرسکاٹ کو پھنسانے کے لیے یہ سب کیا۔''

جب گرف، جولیس کے دفتر آیا تو ہڈسن کا دستخط شدہ بیان پڑھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے ہڈسن کو ہتھکڑی لگائی اور اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ جب میں اور جولیس اکیلے رہ گئے تو میں نے اس سے کہا کہ تمہارا ایک نیم کی ہونا چاہیے۔

''جب تم نے مجھے ریاستوں کی ایک فہرست اور ٹائم فریم دیا تاکہ میں نوجوان جارج ایسٹر کی تصویروں والے اخبار تلاش کروں تو وہ اس وقت مجھے یہ تمہارا پاگل پن لگا تھا۔''

''ہم اس بارے میں بعد میں بات کریں گے۔ فی الحال تم میری ڈیسمنڈ گروش سے بات کراؤ۔''

میں نے اس کے کہنے پر گروش کا نمبر ملایا تو جولیس بولا۔ ''مجھے اندیشہ ہے کہ تم نے اس بلاک کی عمارتوں کو خریدنے کا جو منصوبہ بنایا تھا اب اس پر عمل نہیں ہو سکے گا۔''

''میں نہیں جانتا کہ تم کس بارے میں بات کر رہے ہو۔'' گروش نے کہا۔

''تم اچھی طرح جانتے ہو لیکن پھر تمہاری آسانی کے لیے بتا رہا ہوں کہ درجل ہڈسن یا جارج ایسٹر، جم ڈنکن کو قتل کرنے کے الزام میں گرفتار ہو گیا ہے گو کہ میں نے پولیس کو تمہارا نام نہیں دیا لیکن انہیں بتا دیا ہے کہ شراب کی چوری اور اس کے بعد ڈنکن کے قتل کی وجہ صرف پرسکاٹ کی عمارت حاصل کرنا تھی۔ مالیاتی ماہرین شیل کمپنیوں کا جال کھولنے کی کوشش کر رہے ہیں جو تم نے تخلیق کیا تھا۔ تمہاری آخری امید یہ ہے کہ تم ان عمارتوں سے جان چھڑا لو لیکن شاید اب بہت دیر ہو چکی ہے۔''

گروش سرد آواز میں بولا۔ ''اگلی بار میں تمہیں یقیناً بم سے اڑا دوں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

''کیا یہ کہنا عقل مندی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

جولیس کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''ڈنکن کے قتل کا معاملہ حل ہونے سے پرسکاٹ کو کوئی مدد نہ ملتی۔ میں اس بات کو یقینی بنانا چاہتا تھا کہ گروش اسے تنہا چھوڑ دے اور اب وہ ایسا ہی کرے گا۔ میں نے تمہیں کبھی نہیں بتایا کہ گروش نے مجھے اس وقت بم کے بارے میں کیوں اطلاع دی تھی۔ اس میں اس کا خلوص شامل نہیں تھا۔ تمہارے آنے سے پہلے میں نے گروش کے جرائم کے بارے میں ایک فائل بنائی تھی اور اسے بتا دیا تھا کہ یہ فائل میری موت کے بعد متعلقہ حکام کے حوالے کر دی جائے گی۔ وہ جانتا ہے کہ میں کبھی اس کے راستے میں کانٹے نہیں بچھاتا البتہ اس وقت اس کے معاملات میں مداخلت کرتا ہوں جب ہمارے درمیان مفادات کا ٹکراؤ ہوتا ہے۔ اس فائل میں اس کی جان ہے۔ وہ کبھی نہیں چاہے گا کہ میری موت کے بعد وہ فائل حکام کے ہاتھ لگ جائے۔ اس لیے وہ تمام تر اختلافات کے باوجود مجھے زندہ دیکھنا چاہتا ہے۔''

جولیس نے وائن کی بوتل کھولی اور اپنے لیے گلاس بھرتے ہوئے بولا۔ ''بعض اوقات انسان کو اپنی قسمت خود بنانا پڑتی ہے۔''

کوئی بے وقوف ہی اس سے بحث کر سکتا تھا اور میرا بے وقوف بننے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ اس بار بھی ہمیشہ کی طرح قسمت اس پر مہربان رہی۔ وہ واقعی قسمت کا دھنی تھا۔

طاہر جاوید مغل

انگارے

تینتالیسویں قسط

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خود غرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوث ہو اور سینے میں دردمند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر ہولناک آسیب منہ پھاڑے انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیل اور جاگیرداری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان در امتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور ذہانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سایوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... الم و رسوخ اور درندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا مگر وہ ہار مان کر بیٹھ جانے والوں میں سے نہیں تھا...

سطر سطر رنگ بدلتی... ایک لہو رنگ اور دل گداز داستان...

UrduBooks.PK

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ڈنمارک سے پاکستان کسی کی تلاش میں آیا تھا مگر یہ تلاش شروع ہونے سے پہلے ہی ایک ایسا واقعہ ہوگیا جس نے میری زندگی کو تہ وبالا کردیا۔ میں نے سرِ راہ ایک زخمی کو اٹھا کر اسپتال پہنچایا۔ مقامی پولیس نے مددگار کے بجائے مجرم ٹھہرایا اور یہیں سے جبر و ناانصافی کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے مجھے شکیل داراب اور لالہ نظام جیسے خطرناک لوگوں کے سامنے کھڑا کردیا۔ یہ لوگ ایک قبضہ گروپ کے سرغنہ تھے جو ہاؤسنگ کالونیاں بنانے کے لیے چھوٹے زمینداروں اور کاشت کاروں کو ان کی زمینوں سے محروم کررہا تھا۔ میرے چچا حفیظ سے بھی زبردستی ان کی آبائی زمین ہتھیانے کی کوشش کی جارہی تھی۔ چچا کا بیٹا ولید اس جبر کو برداشت نہ کرسکا اور شکیل داراب کے دستِ راست انسپکٹر قیصر چودھری کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہوگیا۔ اس جرأت کی سزا اسے یہ ملی کہ ان کی حویلی کو اس کی ماں اور بہن فائزہ سمیت جلا کر راکھ کردیا گیا اور وہ خود دہشت گرد قرار پاکر جیل پہنچ گیا۔ انسپکٹر قیصر اور لالہ نظام جیسے سفاک لوگ میرے تعاقب میں تھے، وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ میں MMA کا یورپی چیمپئن تھا، وسطی یورپ کے کئی بڑے بڑے گینگسٹر میرے ہاتھوں ذلت اٹھا چکے تھے۔ میں اپنی پچھلی زندگی سے بھاگ آیا تھا لیکن وطن پہنچتے ہی یہ زندگی پھر مجھے آواز دینے لگی۔ میں یہاں سے بیزار ہوکے واپس ڈنمارک جارہا تھا کہ ایک انہونی ہوئی۔ وہ جادوئی حسن رکھنے والی لڑکی مجھے نظر آگئی جس کی تلاش میں، میں یہاں پہنچا تھا۔ اس کا نام تاجور تھا اور وہ اپنے گاؤں چاند گڑھی میں نہایت پریشان کن حالات کا شکار تھی۔ میں اس کے گاؤں جا پہنچا اور ایک ٹریکٹر ڈرائیور کی حیثیت سے اس کے والد کے پاس ملازم ہوگیا۔ انیق بطور مددگار میرے ساتھ تھا۔ تاجور کا غنڈا صفت منگیتر اسحاق اپنے ہمنواؤں زمیندار عالمگیر اور پیر ولایت کے ساتھ مل کر تاجور اور اس کے والد دین محمد کے گرد گھیرا تنگ کررہا تھا۔ مقامی مسجد کے امام مولوی فدا کی موت میں بھی اسی زمیندار کا ہاتھ تھا۔ مولوی جی کی بیٹی زینب ایک عجیب بیماری کا شکار تھی۔ وہ زمیندار عالمگیر کے گھر میں ٹھیک رہتی لیکن جب اسے وہاں سے لایا جاتا تو اس کی حالت غیر ہونے لگتی۔ اسی دوران میں ایک خطرناک ڈاکو سجاول نے گاؤں پر حملہ کیا۔ حملے میں عالمگیر کا چھوٹا بھائی مارا گیا۔ میں تاجور کو حملہ آوروں سے بچا کر ایک محفوظ جگہ لے گیا۔ ہم دونوں نے اچھا وقت گزارا۔ واپس آنے کے بعد میں نے بھیس بدل کر مولوی فدا سے ملاقات کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ عالمگیر وغیرہ نے زینب کو جان بوجھ کر بیمار کر رکھا ہے اور یوں مولوی صاحب کو مجبور کیا جارہا ہے کہ وہ اپنی بچی کی جان بچانے کے لیے اسحاق کی حمایت کریں۔ مولوی صاحب کو قتل کردیا گیا۔ ایک گمنام درگاہ کے خاتمے کے بعد ہم گھروں کی جانب گامزن تھے کہ میں اور تاجور سجاول ڈاکو کے ڈیرے پر جا پہنچے۔ یہاں سجاول کی ماں (ماں جی نے) مجھے اپنا ہونے والا جوائی سمجھا۔ جس کی پوتی مہناز عرف مانی سے میری بات طے تھی۔ یوں سجاول سے ہماری جان بچ گئی۔ سجاول کے ساتھ میرا مقابلہ طے پاچکا تھا کہ میرا ذہن ماضی میں بھٹک گیا۔ جب میں ڈنمارک میں تھا اور ایک کمزور پاکستانی کو گورے اور انڈین غنڈوں سے بچاتے ہوئے خود ایک طوفان کی لپیٹ میں آگیا۔ وہ غنڈے ٹیکساری گینگ کے لوگ تھے جس کا سرغنہ جان ڈیرک تھا۔ مجھ سے بدلہ لینے کے لیے انہوں نے میری یونیورسٹی دوست ڈیزی کے ساتھ اجتماعی کھیل کھیلا، پھر ڈیزی غائب ہوگئی۔ اس واقعے کے بعد میری زندگی میں ایک انقلاب آگیا پھر میرا رجحان مارشل آرٹ کی طرف ہوگیا اور ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے MMA کی فائٹس میں تہلکہ مچاتا رہا اور دوسری طرف اسکائی ماسک کی اوٹ میں ٹیکساری گینگ کے غنڈوں سے برسر پیکار رہا۔ اسی مارشل آرٹ کی بدولت میں نے سجاول سے مقابلہ کیا اور سخت مقابلے کے بعد برابری کی بنیاد پر ہار مان کے سجاول کا دل جیت لیا۔ سجاول سے کہہ کر میں نے انیق کو بلوا لیا۔ سجاول ایک حسین دوشیزہ سنبل کو نوبیاہتا دلہن کی طرح سجا سنوار کر ریان فردوس (وڈے صاحب) کی خدمت میں تحفے کے طور پر پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں، انیق اور جاناں ساتھ تھے۔ ہم ریان فردوس کے محل نما بنگلے پارا ہاؤس پہنچے۔ وڈا صاحب اپنے دو بیٹوں کے ہمراہ برونائی سے پاکستان شفٹ ہوا تھا۔ برونائی میں اس کی خاندانی دشمنی چل رہی تھی۔ سجاول کو پارا ہاؤس میں کلیدی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ پارا ہاؤس میں کوئی بڑا چکر چل رہا تھا۔ کھوج لگانے پر پتا چلا کہ بڑے صاحب کے دونوں بیٹوں میں زہریلا عنصر پایا جاتا ہے۔ زینب والا معاملہ بھی اسی طرف اشارہ کررہا تھا۔ اسی وجہ سے زینب کو بھی اغوا کرلیا گیا۔ ابراہیم اور کمال احمد کے لیے جو لڑکیاں تیار کی گئی تھیں، وہ پارا ہاؤس پہنچ چکی تھیں۔ ایک تقریب میں دونوں لڑکیوں کی رونمائی کی گئی تو ان میں ایک زینب تھی۔ ابراہیم نے مجھ پر اور سجاول پر اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ ابراہیم نے بتایا کہ دونوں بھائیوں میں زہریلا پن موجود ہے اسی لیے ان کے لیے ایسی لڑکیاں ڈھونڈی گئی ہیں۔ میں نے ابراہیم کو آگاہ کیا کہ زینب پوری طرح محفوظ نہیں ہے اور شادی کی صورت میں اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ یہ سن کر ابراہیم پریشان ہوگیا۔ ادھر آقا جان جو پارا ہاؤس کا کرتا دھرتا تھا، دھماکے کی گونج اٹھے۔ میرے کہنے پر ابراہیم نے زینب کا خون ٹیسٹ کرایا تو حقیقت کھل کر سامنے آگئی۔ اس تمام قتل و غارت میں آقا جان ملوث تھا مگر کوئی اس پر شک کرنے کو تیار نہ تھا۔ ثاقب کی موت کے بعد برونائی میں مخالفین نے بڑی کارروائی کرکے وڈے صاحب کے برادرِ نسبتی کو مار ڈالا تھا۔ بڑی بیگم صاحبہ کا رو رو کر برا حال تھا، ان حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے میں اور سجاول وڈے صاحب کے ساتھ برونائی جانے کے لیے تیار تھے۔ برونائی جانے سے پہلے میں ایک نظر تاجور کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک طویل فاصلہ طے کرکے میں تاجور کی ایک جھلک ہی دیکھ پایا تھا کہ گاؤں کے چند لڑکوں نے مجھے گھیر لیا۔ میرے سامنے وہ بچے تھے۔ اپنی ہار کے بعد ایک دلیر لڑکا میرے گلے کا ہار بن گیا اور میرا پیچھا کرتا ہوا پارا ہاؤس تک آگیا۔ سیف عرف سیفی کی سختی نکالنے کے لیے ہم اسے اپنے ساتھ برونائی لے آئے تھے۔ یہاں حالات بہت خراب تھے۔ ریان فردوس کا بیٹا رائے زل مخالف پارٹی بن چکا تھا۔ امریکن ایجنسی کے ساتھ مل کے پورے علاقے پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ فردوس بھی قسطینا کمانڈر اور جی وار آفیسر تھی۔ وہ

ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے مجھے جان گئی تھی۔ میں کئی مہم میں اس کے ہمراہ رہا۔ ریان فردوس کی پہلی بیوی اور اس کے بیٹے کی شورشیں بڑھتی جاری تھیں۔ مجھے شروع ہی سے آقا جان پر شک تھا۔ اور اس کی سرگرمیاں بڑھتی جارہی تھیں۔ رائے زل اور امریکن ایجنسی کی قوت نے محل پر دھاوا بول دیا تھا۔ افراتفری اور قتل وغارت گری نے اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ اس حملے میں ریان فردوس اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ اب ریاست پر کلی طور پر رائے زل کا قبضہ ہو چکا تھا۔ ہم سب بڑی مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہوسکے تھے۔ آقا جان اور رائے زل کے کارندے ہماری تلاش میں تھے۔ ابراہیم اور زینب کا برا حال تھا۔ میری ذات ان کے لیے بہت بڑا سہارا تھی۔ کمال اس جنگ میں جان سے دھو بیٹھا تھا۔ ہم زیرِزمین مقید تھے۔ مگر انتقام رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ جس لانچ میں ہم یہاں آئے تھے وہ ابھی تک باہر موجود تھی۔ آقا جان کے آدمیوں سے بچنے کے لیے اسے ٹھکانے لگانا ضروری تھا۔ بن مشہد اور تبارک زیرزمین بنکر سے باہر نکل گئے۔ مگر باہر سخت پہرا تھا...... تبارک پھسل کر ایک کھائی میں گر جاتا ہے۔ میں اور سیف اسے ڈھونڈنے جاتے ہیں مگر ایجنسی کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ بے تحاشا تشدد سہنے کے باوجود ہم قسطینا اور ابراہیم کا پتا نہیں بتاتے...... سیف کی حالت بری تھی۔ مجھے اس کو اپنے ہاتھ سے زہر دے کے اذیت کم کرنا پڑی۔ مگر میرا اپنا حال بہت برا تھا۔ امریکی لونگ نے تشدد کی انتہا کردی تھی۔ جاماجی کے حالات روز بروز بدتر ہورہے تھے۔ میں رائے زل کی قید سے رہائی پاچکا تھا۔ عوام کا سمندر میرے لیے بے چین تھا۔ وہ مجھے اپنا سربراہ مان چکے تھے۔ وہ آزادی کے لیے سر پر کفن باندھ چکے تھے۔ ہمارا قافلے کا رخ اب ڈی پیلس کی جانب تھا۔ پال کی مدد سے پوری ٹیم اور عوام کا سمندر ڈی پیلس کی جانب گامزن تھا۔ ہر طرف گولیاں...... شیلنگ اور دھواں دھار لڑائی تھی۔ بالآخر پسی ہوئی عوام نے اپنے جوش، جذبے اور جنوں سے کام لے کر رائے زل کے ساتھیوں کا خاتمہ کردیا۔ اب تخت کے حق دار قسطینا اور ابراہیم تھے۔ وطن آنے کے بعد تاجور اپنے گھر چلی گئی اور میں داؤد بھاؤ کے پاس تھا لیکن وطن آتے ہی اس دشمن نے مجھے ڈھونڈ ہی لیا جس سے میں چھپتا پھر رہا تھا۔ ٹیکساری گینگ پاکستان آچکا تھا ہر طرف قتل وغارت گری پھیلا رہے تھے...... ڈیتھ اسکواڈ کے کارندے میری تلاش میں کئی معصوم لوگوں کی جان لے چکے تھے۔ اب ان کا خاتمہ ضروری ہوگیا تھا میں اور انیق نے ان کے ٹھکانے کا کھوج لگایا اور بہت ہوشیاری سے ان کے جشن والے دن رنگ میں بھنگ ڈال دیا۔ ادھر جاماجی سے خورسنہ آچکی تھی اور سجاول کو اپنا حتمی فیصلہ سنانا چاہتی تھی۔ ڈیتھ اسکواڈ کا خاتمہ بے حد ضروری تھا۔ میں نے انیق کے ساتھ مل کر ان کے ٹھکانے کو تباہ کردیا اور خود بھی بمشکل یعنی جان بچا پایا۔ اس مقام پر زبردست بلاسٹ ہوا اور مجھے بھی مردہ سمجھ لیا گیا۔ ٹیکساری گینگ سے بچنے کا ایک ہی طریقہ سمجھ میں آیا کہ میں سب کی نظروں میں مردہ رہوں۔ اپنے چہرے پر سرجری کے ذریعے تبدیلیاں کرواکے میں اپنوں میں اجنبی بن گیا تھا۔ سیف کے گھر اور تاجور تک رسائی کے بعد میں مطمئن تھا مگر تاجور کی شادی داراب فیملی میں طے پا چکی تھی۔ تاجور کے بغیر میری زندگی ادھوری تھی، میں اسے ساتھ لے آیا تھا مگر اچانک انیق کی آمد ہوئی، اس نے سیف کے حوالے سے غلط باتیں کرکے تاجور کا دل متنفر کردیا۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ میں انیق کی اس حرکت پر مشتعل تھا۔ وہ بیاہ کے داراب ہاؤس جا چکی تھی۔ بالآخر ہم نے انیق کی دشمنی کا کھوج لگایا۔ وہ ہاناوانی کے کالے علم کی زد میں تھا۔ ہاناوانی اپنے بیٹے کی موت کا بدلہ ہم سب سے لینا چاہتی تھی۔ اس نے سجاول کے ہاتھوں انیق کا قتل کروایا۔ سجاول نے اس کی انتقامی کارروائی سے بچنے کے لیے اپنی آنکھوں اور کانوں کو قربان کردیا تھا۔ ہاناوانی کے دہشت ناک حملے جاری تھے۔ اب وہ پرندوں کے ذریعے ہمیں نیست ونابود کردینا چاہتی تھی۔ ہاناوانی کا اگلا شکار تاجور تھی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ شہر کے باہر جارہی تھی۔ حملے کا شدید خطرہ تھا۔ وہی ہوا راستے میں پرندوں کی یلغار نے گاڑیوں کو تباہ کردیا۔ میں اپنے ساتھیوں اور تاجور کے ہمراہ ایک کھوہ میں پناہ لے چکا تھا۔ ٹیکساری گینگ کے متواتر حملے جاری تھے۔ دراج کی والدہ اس صورت حال سے گھبرا کے ٹیکساری گینگ کے پڑاؤ کا رخ کرچکی تھیں۔ مگر نتیجہ انتہائی ہولناک موت کی صورت میں نکلا تھا۔ بالآخر ہم اس کھوہ سے نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس بار داؤد بھاؤ ہمارے کام آیا تھا۔ اب خضر کی تلاش جاری تھی۔ ایک دن ہمیں خضر کا پیغام ملا اور میں اس سے ملاقات کے لیے چل پڑا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ہاناوانی میرے سامنے تھی۔ اس کے چوڑے چکلے چہرے پر طیش اور تکبر کے سوا کچھ نہیں تھا۔

میں نے کہا۔ ”تم ٹھیک کہتی ہو ہاناوانی! میں وہیں پہنچ گیا ہوں جہاں مجھے پہنچنا چاہیے تھا...... لیکن تم لوگوں کی بہادری اور بے خوفی کا یہ عالم ہے کہ درجنوں رائفل برداروں کی موجودگی میں بھی میرے ہاتھ الٹی ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے ہیں۔“

”گھبراؤ مت ایسٹرن! بہت جلد تمہارے یہ ہاتھ کھول دیں گے اور آزاد بھی کردیں گے پھر اپنی مرضی سے جو بھی کرنا چاہو گے اس کے لیے آزاد ہوگے۔“

”میں اس آزادی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم اپنی ایک خداداد صلاحیت کو شیطانی کاموں کے لیے استعمال کررہی ہو۔ تمہاری حرص اور ہوس کی حدیں بہت آگے تک ہیں لیکن یہ رویہ تمہیں برباد کردے گا۔ رائے زل کا تو صرف سر کاٹا گیا تھا، تمہارے جسم کے ٹکڑے ہوجائیں گے...... اور وہی لوگ کریں گے جو تمہارے ظلم کا شکار ہورہے ہیں۔“

دو گن بردار ملائیشین بھڑک کر میری طرف آئے۔ لگتا یہی تھا کہ میرے سر پر رائفل کے دستے رسید کریں گے یا پھر

مجھے ٹھوکروں پر رکھ لیں گے۔ انہوں نے رائفل تو استعمال نہیں کی تاہم ایک گارڈ نے دو تین طوفانی ٹھوکریں میری کمر پر رسید کردیں۔ ہاناوانی کی رعب دار آواز نے انہیں روک دیا۔ ''نہیں اس کی ضرورت نہیں۔'' وہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔ ''اس کو زیادہ کڑی سزا ملنے والی ہے۔''

دونوں رائفل بردار پیچھے ہٹ گئے۔ ان کی جگہ دو لڑکیاں برآمد ہوئیں۔ ان کے جسموں پر گرے فورس کی وردیاں تھیں۔ انہوں نے بڑی تیزی کے ساتھ میرے جسم کے گرد ایک رسی کو کئی بل دے دیے۔ اب میں اس کرسی کے ساتھ پیوست ہوگیا تھا جس پر بیٹھا ہوا تھا۔ ایک لڑکی جس کے جسم پر غالباً کیپٹن کی یونیفارم تھی ایک ٹرے میں میڈیکل کا کچھ سامان لے کر نمودار ہوئی۔ ایک بڑے سائز کی سرنج میں اس نے دو انجکشن بھرے اور میری قمیص کے اوپر سے ہی میرے بازو میں ٹھونک دیے۔ میں نے مزاحمت کی تھوڑی سی کوشش کی لیکن جلد ہی سمجھ میں آگیا کہ یہ بیکار ہے۔

ہاناوانی بڑی شان سے اپنی زرنگار کرسی پر بیٹھی تھی۔ ہمیشہ کی طرح اس کے پورے جسم پر قیمتی نگینوں والے طلائی گہنے چمک رہے تھے۔ اس کے عین سامنے بلند و بالا چھت پر درجنوں چمگادڑیں ایک بڑی سیاہ جھالر کی طرح جھول رہی تھیں۔ کسی خاص نسل کی بہت بڑی سیاہ بلی زرنگار کرسی کے قریب بالکل ساکت بیٹھی تھی۔ کسی وقت تو لگتا تھا کہ وہ بلی زندہ نہیں بلکہ مجسمہ ہے لیکن جب اس کے کان، جو دور سے سینگوں کی طرح نظر آتے تھے، ہلتے تھے تو پتا چلتا تھا کہ وہ گوشت پوست کی ہے۔ گنجے سروں والے دونوں گدھ ......نیم تاریک چھت میں کہیں اوجھل ہوچکے تھے۔ تاہم قبریں کھودنے والا بجو ایک طویل روشن دان میں مسلسل حرکت کرتا دکھائی دے رہا تھا۔

ہاناوانی اپنے پُراسرار علوم کی آبیاری کے لیے اور اپنی مکروہ توانائیوں میں اضافے کے لیے قبرستانوں میں راتیں گزارتی تھی۔ وہ کھلی قبر میں بیٹھ کر مخصوص چلّے کاٹتی تھی۔ اب وہ کسی قبرستان میں نہیں تھی، ایک عالیشان عمارت میں تھی لیکن یہاں بھی قبرستانوں اور ویرانوں کی نشانیاں اس کے ساتھ ساتھ تھیں۔ وہ اپنی ذات میں انوکھی تھی......اور اپنے اس تمام تر انوکھے پن کے ساتھ اس وقت میرے سامنے ایک سرخ چبوترے پر فروکش تھی۔

''کیسا محسوس کررہے ہو ایسٹرن؟'' اس کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔

میں نے کہا۔ ''یہی محسوس کررہا ہوں کہ اپنی جس پُراسرار قوت کا تم ڈھنڈورا پیٹتی ہو اس پر تمہیں خود بھی پورا اعتماد نہیں ہے۔ ورنہ اس کے لیے تم دواؤں کا سہارا کیوں لیتیں۔ تم نے یہ انجکشنز مجھے اسی لیے لگائے ہیں ناں کہ مجھے اپنے منحوس ٹرانس میں لینے کے لیے تمہیں کوئی دشواری نہ ہو۔''

''ہر موذی جانور سے نمٹنے کا الگ طریقہ کار ہوتا ہے۔ شیر کو گولی ماری جاتی ہے، کتّے کو زہر دیا جاتا ہے اور سانپ کو پاؤں سے مسلا جاتا ہے۔ تمہاری کھال بھی گھڑیال کی طرح تھوڑی سی موٹی ہے اس لیے تمہیں یہ انجکشن دیے گئے ہیں۔''

میں سمجھ گیا کہ ''کھال موٹی ہونے سے'' اس کا مطلب کیا ہے، اور وہ کس طرف اشارہ کررہی ہے۔ پچھلی مرتبہ اس نے جاماجی میں مجھے اپنی آنکھوں کے ذریعے زیر کرنے کی کوشش کی تھی اور ناکام رہی تھی۔ اب وہ زیادہ شدت اور توانائی سے حملہ کرنے والی تھی۔ میں بظاہر نارمل نظر آنے کی کوشش کررہا تھا تاہم میرے جسم کے ہر مسام سے پسینا بہہ نکلا تھا۔ حقیقتاً مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

انجکشنز کا اثر ہونا شروع ہوگیا تھا۔ جسم میں عجیب سی سنسناہٹ محسوس ہورہی تھی ذہن ماؤف ہوتا جارہا تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ ہاناوانی اپنی سیاہ عینک آنکھوں سے اتار رہی ہے۔ ہال کمرے کی روشنیاں ایک دم بجھ گئیں۔ کچھ اور طرح کی دھیمی نیم گلابی اور زرد روشنیاں اس وسیع ہال کے ایک مخصوص حصے کو روشن کرنے لگیں۔ ان روشنیوں کا محور ہاناوانی کی شاندار نشست ہی تھی۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ بیشتر افراد اس ہال کمرے سے نکل گئے ہیں۔ شاید ایک دو خاص محافظ ہی یہاں موجود رہے تھے۔

''میری طرف دیکھو ایسٹرن۔'' چند سیکنڈ بعد ہاناوانی کی جادوئی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

ذہن میں دھند سی تھی۔ میں نے جیسے بے ساختہ ہاناوانی کی طرف دیکھا اور یہی لمحے تھے جب اس کی جگر پاش نگاہوں نے مجھے پوری طرح اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ مجھے اب کیا کرنا ہے۔ میرے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور میں اچھی طرح جانتا تھا کہ میرے ہاتھ کے زخمی انگوٹھے میں ایک فریکچر ہے۔ میں ایک بار پھر اپنے ساتھ اذیت اور اذیت کے ذریعے سوچوں کی منتقلی کا

www.PakDigest.Com

کھیل کھیلنے والا تھا۔

چند سیکنڈ مزید گزرے اور پھر ہاناوانی نے مجھے اپنے بدنام زمانہ ٹرانس میں لینا شروع کر دیا۔ اس کی جادوئی آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ ”تم سو رہے ہو ایسٹرن...... تم اونگھنا شروع ہو گئے ہو...... تمہارے گرد کیا ہے...... غور سے دیکھو...... تمہارے گرد دھند ہے...... اور یہ آہستہ آہستہ گلابی رنگ اختیار کر رہی ہے......“

دھند واقعی گلابی رنگ میں ڈھل رہی تھی پھر اس میں نیلے اور زرد رنگ کی لہریں شامل ہونے لگیں...... پھر کچھ اور رنگ شامل ہوئے...... پھر یہ وہی ست رنگا بھنور بن گیا جس سے ایک دفعہ پہلے بھی میرا ٹکراؤ ہو چکا تھا۔ ست رنگ کا بھنور پھیل رہا تھا، اس کی رفتار تیز ہو رہی تھی...... وہ مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ ایک ہیجان خیز موسیقی تھی جو آہستہ آہستہ بلند ہوتی جا رہی تھی۔ ہاناوانی شاید اب بھی بول رہی تھی۔ اس کی آواز دور افتادہ گھنٹیوں کی طرح تھی۔ مجھے لگا جیسے اب کچھ کرنے کا وقت ہے۔ اگر میں نے اب بھی نہ کیا تو اس بھنور میں ڈوب جاؤں گا۔ میں نے اپنے زخمی انگوٹھے پر بے رحمی سے دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ ہاتھ سے درد کی لہریں اٹھیں اور پورے جسم میں پھیلنے لگیں۔ میں چند لمحوں کے لیے جیسے اس خوش رنگ بھنور سے دور ہٹ گیا...... لیکن ایک بار پھر وہی ہوا۔ بھنور کا پھیلاؤ اور اس کی رفتار تیز ہونے لگی۔ کوئی مقناطیس کی طرح مجھے اس بھنور کی طرف کھینچ رہا تھا۔ میں نے دل کڑا کیا...... دانت بھینچے اور انگوٹھے پر انگلیوں سے شدید دباؤ ڈال کر ہڈی توڑ ڈالی۔ میرے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے، اردگرد موسیقی کا شور تھا اور نیم تاریکی تھی۔ ہڈی چٹخنے کی مدھم سی آواز پیدا ہوئی بھی ہو گی تو کسی کے کانوں تک کہاں پہنچی ہو گی لیکن اس عمل نے درد کی جو شدید لہریں میرے بازو اور پورے جسم میں پیدا کیں، انہوں نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ ان شدید لہروں کا ردِعمل میری منشا کے مطابق تھا۔ ست رنگا بھنور سست پڑنے لگا۔ اس کی مقناطیسی کشش کم ہونے لگی۔

...... یہ اس بھنور کا اور میری اذیت کا مقابلہ تھا...... یہ بدنام ترین ہپناٹسٹ ہاناوانی اور ایسٹرن کا مقابلہ تھا...... گھڑی کی سوئیاں آگے کو سرک رہی تھیں...... اور کوئی بھی اپنی ہار ماننے کو تیار نہیں تھا پھر ہاناوانی نے سنگین ترین ہتھکنڈے کا استعمال شروع کیا۔ وہ میری سوچوں میں گھس چکی تھی...... میرے ذہن میں دندنا رہی تھی۔ وہ اپنی طاقتور سوچ کے زوردار جھکولوں سے مجھے پھر ست رنگے بھنور کی طرف دھکیلنے لگی۔ تب مجھے محسوس ہوا کہ اس بھنور میں کچھ پرچھائیاں حرکت کر رہی ہیں۔ آہستہ آہستہ یہ پرچھائیاں نمایاں ہو کر نسوانی جسموں کی شکل اختیار کر گئیں۔ یہ دلربا حسینائیں تھیں۔ ان کے لچک دار ریشمی بدن سات رنگ کے اس بھنور میں محوِ رقص تھے۔ پھر مجھے ان میں تاجور نظر آئی۔ اس کے حسین پیکر پر گلاب کے پھولوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ یہی پھول تھے جو اس کے بدن کو ڈھانپ رہے تھے اور اس کی آرائش بھی کر رہے تھے۔ وہ سادہ حسن کا بے مثال نمونہ تھی۔ چاندگڑھی کے چھوٹے سے گاؤں میں کھلنے والا ایک ایسا یکتا پھول جو خوب صورتی کے مروج پیمانوں پر بے شک پورا نہیں اترتا تھا لیکن اپنے اندر ایک ایسی جاذبیت رکھتا تھا جو دلوں کو گھائل کر دیتی تھی...... اور وہ اب بھی میرے لیے دل میں نرم گوشہ رکھتی تھی۔ وہ مجھے اپنی طرف بلا رہی تھی۔ وہ بھی محوِ رقص تھی۔ اس کے جسم کے گلاب ایک ایک کر کے جھڑ رہے تھے۔ اس کے پیکر کے دہکتے ہوئے سونے کو نمایاں کر رہے تھے۔ اس نے اپنی بانہیں میرے لیے کھول رکھی تھیں۔ وہ مجھے بلا رہی تھی اپنی طرف...... میرے جسم سے جسم ملا دو...... میرے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دو۔ میں ہار گئی ہوں، تم جیت گئے ہو۔

میرے قدم بے ساختہ اس کی طرف اٹھنے لگے۔ بھنور کی کشش بے پناہ ہو رہی تھی۔ میں نے زخمی انگوٹھے کو بے طرح مسل دیا۔ ہڈی ٹوٹ چکی تھی۔ میں اپنی انگلیوں کے ذریعے ہڈی کی کڑکڑاہٹ محسوس کر رہا تھا۔ ٹوٹی ہوئی ہڈی کی کوئی چونچ گوشت میں دھنسنے لگی۔ اذیت بے پناہ ہو گئی۔ پرچھائیوں کے رنگ دھیمے پڑنے لگے، ان میں تاجور کی پرچھائیں بھی تھی۔ چند سیکنڈ پہلے تک یہ پرچھائیں اس قدر جیتی جاگتی لگ رہی تھی کہ اس کے حوالے سے اپنی بے مہار سوچوں کا رخ بدلنا میرے لیے ممکن نہیں رہا تھا مگر اب پھر حقیقت اور تصور میں فرق نمایاں ہونے لگا۔ میں نے بے رحمی سے مٹھی بھینچی...... غالباً ٹوٹی ہوئی مختصر سی ہڈی گوشت میں دھنستی چلی گئی تھی۔ اذیت بے کراں ہو گئی۔ بھنور کا طلسم ٹوٹنے لگا۔ پرچھائیوں کے رنگ پھیکے پڑنے لگے۔ میں کسی نادیدہ حصار سے نکل رہا تھا۔ پہلے مجھے ہاناوانی کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی، صرف کانوں کے اندر گھنٹیاں سی بجتی تھیں اور بھنور دکھائی دیتا تھا لیکن اب ہاناوانی کی آواز بھی سنائی دینے لگی۔ وہ سحر انگیز لہجے میں بار بار کہہ رہی تھی۔

”میں وہی کروں گا، جو ہاناوانی مجھ سے کہے گی...... میرے الفاظ دہراؤ...... میں وہی کروں گا جو ہاناوانی مجھ سے کہے

گی۔‘‘

میرے دماغ کے اندر جیسے یکایک ہزار پاور کا بلب روشن ہو گیا۔ دھندلائے ہوئے ذہن میں ایک سوچ آئی۔ میں نے غنودہ ذہن کو سنبھالا اور لڑکھڑاتے ہوئے سے لہجے میں بولا۔ ’’میں وہی کروں گا جو ہاناوانی مجھ سے کہے گی......‘‘

’’دوبارہ بولو۔‘‘ اس نے سحر انگیز آہنگ میں ’’ہدایت‘‘ دی۔

’’میں وہی کروں گا...... جو ہاناوانی مجھ سے کہے گی۔‘‘

’’اپنے ہاتھ پاؤں بالکل ڈھیلے چھوڑ دو...... اور اپنی آنکھیں اب بند کر لو۔‘‘

میں نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے اور آنکھیں بند کر لیں۔ اپنے زخمی انگوٹھے پر میرا دباؤ برقرار تھا...... تاہم اب مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں مشکل ترین وقت سے گزر چکا ہوں۔

ہاناوانی کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ’’اب کوئی تمہارا دشمن نہیں لیکن وہ جس کے بارے میں، میں تمہیں بتاؤں گی۔ اب کوئی تمہارا دوست نہیں لیکن وہ جس کے بارے میں، میں تمہیں بتاؤں گی۔ کیا تم میری بات سمجھ رہے ہو ایسٹرن؟‘‘

’’میں سمجھ رہا ہوں۔‘‘ میں نے جواب دیا۔

اس نے اپنی مسحور کن آواز میں کچھ مزید فقرے میری سماعت میں انڈیلے...... وہ بتا رہی تھی کہ سب کچھ بدل گیا ہے۔ ماضی بدل گیا ہے اور حال بھی...... اب میرے اردگرد سب کچھ نیا ہے...... اب وہی عین سچ ہے جو ہاناوانی مجھ سے کہے گی...... وہ اپنے ان مخصوص جملوں کے ذریعے جیسے میری برین واشنگ کر رہی تھی۔ میں نے آنکھیں موند رکھی تھیں اور بس کبھی کبھی اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کر رہا تھا۔ زخمی انگوٹھے پر میرا دباؤ برقرار تھا۔ کسی وقت اب بھی مجھے یہی لگتا تھا کہ اگر میں نے ذہن کو ڈھیلا چھوڑ دیا تو وہ ہاناوانی کی گرفت میں چلا جائے گا۔

ہاناوانی کی طاقتور ہدایت، آواز کی صورت میرے کانوں تک پہنچی۔ ’’اب میں تمہیں کچھ چہرے دکھا رہی ہوں۔ یہ بظاہر تمہارے دوست تھے لیکن حقیقت میں بدترین دشمن۔ تم ذہنوں اور دلوں کے اندر نہیں جھانک سکتے اس لیے تم ان کے اندر کی گھٹاٹوپ سیاہی سے بالکل بے خبر تھے۔ یہ زہریلے سانپوں کی طرح تمہیں ڈسنے والے تھے اور اب بھی یہی ارادے رکھتے ہیں۔ ایک اور درمیانے سائز کی اسکرین پر میرے ساتھیوں کے چہرے نمودار ہوئے پھر ان میں سے فخر کا چہرہ اتار رخ ہو کر سامنے آ گیا۔ فخر کے بعد فارس جان، فارس جان کے بعد داؤد بھاؤ، سب چہرے نمایاں ہونے لگے۔ ہاناوانی بولی۔ ’’اس حرام زادے انیق کی طرح یہ فخر بھی تاجور کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہو چکا ہے۔ یہ رقابت کی آگ میں جل رہا ہے...... اور شاید تمہیں عجیب لگے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ افغانی فارس جان بھی تاجور پر عرصے سے بدنگاہ رکھتا ہے۔ یہ دونوں کسی بھی وقت کسی بھی حیلے سے تمہاری جان لینا چاہتے ہیں۔ اگر تم ان کو نہیں مارو گے تو یہ تمہیں مار ڈالیں گے...... تم میری بات سمجھ رہے ہو؟‘‘

’’میں سمجھ رہا ہوں۔‘‘

’’پورا یقین کر رہے ہو؟‘‘

’’پورا یقین کر رہا ہوں۔‘‘

’’داؤد بھاؤ تمہاری زندگی کا سودا کر چکا ہے۔ اس نے سارا ملبا اپنے کوتاہ قد کارندے بنارس پر ڈال دیا لیکن سچ یہی ہے کہ وہ بھی شکیل داراب سے ایک بہت بڑی رقم اینٹھ چکا ہے۔ وہ تمہیں اور تاجور کو ایسی جگہ مارے گا جہاں میلوں تک پانی نہیں ملے گا۔ داؤد زہریلے ترین ناگ سے زیادہ زہریلا ہے۔ جہاں ملے اس کا سر کچل ڈالو۔ اس کی کوئی دلیل کوئی وضاحت، قابلِ قبول نہیں ہے۔‘‘

میں خاموشی سے سنتا رہا......

’’قسطینا بھی ایک زخمی ناگن ہے۔‘‘ ہاناوانی کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ ’’تم اس کی پہلی محبت تھے اور وہ اس محبت کی ناکامی کو بھولی نہیں۔ وہ تاجور کی جانی دشمن ہے اور یہ دشمنی تمہاری سوچ سے بھی زیادہ ہے۔ دراصل تاجور پر کاری وار کرنے کے لیے ہی وہ یہاں پہنچی ہے۔ وہ اس سے رابطے میں ہے، کسی بھی وقت اسے لاش میں بدل دے گی...... میں تاجور کے سینے میں، ہرن کے سینگ کے دستے والا ایک خنجر دھنسا ہوا دیکھ رہی ہوں۔ ایسٹرن! تم میری باتیں سمجھ رہے ہو ناں؟‘‘

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

’’بغیر کسی شک کے پوری طرح یقین کر رہے ہو؟‘‘

’’ہاں ہاناوانی، پوری طرح یقین کر رہا ہوں۔‘‘

وہ مسلسل بولے جا رہی تھی اور برین واشنگ کر رہی تھی۔ اس نے مختلف دلیلوں اور انکشافات کے ذریعے سجاول، رضوان ٹی اور خورسند وغیرہ کے حوالے سے بھی

میرے ذہن میں بے تحاشا زہر بھرا۔ اس کے الفاظ کا انتخاب...... اس کی پُراثر آواز، اس کے لہجے کا اتار چڑھاؤ، سب کچھ خاص الخاص تھا۔ ایک مرتبہ قسطینا نے کہا تھا کہ اس بدذات عورت کو دنیا کے خطرناک ترین ہپناٹسٹ میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہتی تھی۔ وہ بدستور میری برین واشنگ میں مصروف تھی۔ اس نے میری نجی زندگی کے حوالے سے مجھے سجیشنز دیں۔ اس نے عورت کا ذکر کیا اور شراب کا ذکر کیا...... اور مجھے بتایا کہ یہ چیزیں میرے شب و روز کا حصہ ہیں۔ میں نے ان سے دور ہو کر خود پر اور اپنی طبع پر ایک ظلم کر رکھا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

وہ ایک طویل دورانیہ تھا...... اور وہ ایک نہایت طویل سجیشن تھی۔ اس مشکل وقت کا ہر ہر لمحہ میں نے جیسے ایک سولی پر گزارا۔ اپنے ذہن کو بیدار رکھنے کے لیے میرا واحد سہارا میرا ٹوٹا ہوا انگوٹھا تھا جسے میں نے اسی ہاتھ کی مٹھی میں جکڑ رکھا تھا۔

بالآخر میری زندگی کی یہ سخت ترین آزمائش گزر گئی۔ ہال کمرے کی روشنیاں جل اٹھیں۔ میں اسی طرح نڈھال سا...... دیوار سے سر ٹکائے، کرسی پر بیٹھا تھا۔ آنکھوں کی جھری میں سے میں نے دیکھا...... دراز قد...... قوی ہیکل ہاناوانی اپنی پُرشکوہ نشست سے کھڑی ہوگئی۔ نیم تاریک چھت میں اوجھل ہونے والے دونوں گدھ پھڑپھڑاتے ہوئے نمودار ہوئے اور ہاناوانی کے دونوں کندھوں پر بیٹھ گئے (اس اثنا میں ہال کے دو تین دروازے کھلے تھے اور مسلح گارڈز واپس ہال میں آگئے تھے)

ہاناوانی اپنی سیاہ عینک پہنتی ہوئی بلند و بالا مرکزی دروازے کی طرف بڑھی۔ قبریں کھودنے والا یتیم بچھو پھدکتا ہوا اس کے پیچھے جارہا تھا۔ یہ سب کچھ کسی خوفناک ڈرامائی فلم کا حصہ معلوم ہوتا تھا...... لیکن میں جیتی جاگتی حالت میں اور پورے حواس کے ساتھ یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ میرا دل چاہا...... کاش کوئی گارڈ اس وقت میری بندشیں کھول دے...... اور میں سب اندیشے بالائے طاق رکھ کر اس منحوس عورت پر جاپڑوں...... اس کی اکڑی ہوئی گردن کا کڑاکا نکال دوں۔

ہاناوانی کے جانے کے بعد دو گارڈز آگے بڑھے اور انہوں نے رسی کی وہ گرہیں کھول دیں جنہوں نے مجھے کرسی سے باندھ رکھا تھا...... تاہم میرے ہاتھ ابھی تک پشت پر جکڑے ہوئے تھے۔ یہ لوگ انہیں کھولنے کا رسک اب بھی نہیں لے سکتے تھے۔ کم از کم دو رائفلوں کے بیرل میری جانب اٹھے ہوئے تھے۔ اسی دوران میں ایک مقامی گارڈ کی نگاہ میرے زخمی انگوٹھے پر پڑ گئی۔ انگوٹھا خون میں لتھڑا ہوا تھا...... میں نے ٹوٹی ہوئی ہڈی پر اتنی بے رحمی سے دباؤ ڈالا تھا کہ اس کی چھوٹی سی چونچ جلد پھاڑ کر باہر جھانکنے لگی تھی۔ خون کے قطرے فرش پر بھی گرے ہوئے تھے۔

"یہ کیا ہوا ہے؟" مقامی شخص نے حیرت سے کہا۔

ملائیشین گارڈ انگلش میں بولا۔ "اسے چوٹ تو پہلے ہی لگی ہوئی تھی۔ لگتا ہے کہ چوٹ پر اور چوٹ لگ گئی ہے۔"

گارڈز کے درمیان جو گفتگو ہوئی، اس سے پتا چلا کہ وہ میرے انگوٹھے کی اس لرزہ خیز حالت کو ان ٹھوکروں کا شاخسانہ سمجھ رہے ہیں جو میری تلخ کلامی سے مشتعل ہوکر گارڈز کے انچارج نے مجھے لگائی تھیں۔

میرے زخمی انگوٹھے پر عارضی طور پر ایک پٹی لپیٹی گئی اور مجھے دونوں کندھوں سے دو گارڈز نے تھام لیا۔ آہستہ آہستہ چلاتے ہوئے، وہ مجھے ہال کمرے سے باہر لے آئے۔

☆☆☆

اونچی چھتوں اور بلند و بالا دروازوں والی اس وسیع عمارت کے اندر ایک نیا کھیل شروع ہوگیا تھا، انوکھا اور پہلودار کھیل...... میں ہاناوانی کے بدنام زمانہ ٹرانس میں آنے سے بچ گیا تھا مگر ظاہر یہی کر رہا تھا کہ میں اس ٹرانس میں پہنچ گیا ہوں۔ ٹرانس والے واقعے کو اب قریباً چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ میں خود کو کھویا کھویا اور گم صم ظاہر کر رہا تھا۔ میں اداکاری کر رہا تھا لیکن مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ مجھے کس طرح کی اداکاری کرنا چاہیے اور میں جو "ایکسپریشنز" دے رہا ہوں، وہ میرے کردار کو تقویت دے رہے ہیں یا کمزور کر رہے ہیں۔

میری الٹی ہتھکڑی تو اسی وقت کھول دی گئی تھی جب مجھے میرے "لاک اَپ" میں واپس لایا گیا تھا۔ ایک ڈاکٹر نے میرے بدحال انگوٹھے پر ایک چھوٹا سا پلاستر چڑھا دیا تھا۔ میں نے ناشتا کیا تھا اور دوپہر کا کھانا بھی ٹھیک سے کھایا تھا۔ باقی وقت میں بس آنکھیں موندے بستر پر پڑا... رہا تھا۔

اگلے روز رات نو بجے کے لگ بھگ میرا کمرا تبدیل کردیا گیا۔ یہ ایک آرام دہ بلکہ پُرآسائش کمرا تھا۔ اے سی، ایل سی ڈی اور ریفریجریٹر جیسی سہولیات یہاں موجود تھیں۔ بہرحال کھڑکی یہاں بھی نہیں تھی اور دروازے پر ایک چاق و چوبند مسلح گارڈ بھی تعینات تھا۔ یہاں پہنچتے ہی

مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کمرے میں خفیہ نگرانی کا نظام موجود ہے۔ چھت کی بناوٹ اور آرائش کچھ ایسی تھی کہ اس میں بہ آسانی ایک دو منی کیمرے نصب کیے جاسکتے تھے۔ میں نے ان کیمروں کی تلاش میں نگاہیں دوڑانا بھی مناسب نہیں سمجھا اور چپ چاپ لگژری بیڈ پر لیٹ گیا۔ ابھی مجھے لیٹے پانچ دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ ایک خدمت گار بھی آن موجود ہوئی۔ وہ ایک مہ رخ، پری پیکر دراز قد لڑکی تھی۔ نجانے کیوں اسے دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہوا کہ وہ انڈین ہے۔ یہ اندازہ بالکل درست تھا۔ اس نے مجھے اپنا نام شاردا بتایا اور یہ بھی بتایا کہ وہ پچھلے کئی برس سے جاماجی میں مقیم ہے۔ پہلے وہ عزت مآب ریان فردوس کے محل میں تھی اور وہاں نوخیز رقاصاؤں کو رقص کی تربیت دیتی تھی...... جب ریان فردوس کو شاہی محل میں قتل کر دیا گیا اور بعد کے خونریز واقعات کے نتیجے میں نئے عزت مآب جواں سال ابراہیم نے مسندِ اقتدار سنبھال لی تو ساری کایا پلٹ گئی۔ شاردا نے بتایا کہ اب ڈی پیلس میں کچھ اور ہی ماحول بن چکا ہے۔ طاؤس و رباب اور مے نوشی کی محفلیں ختم ہو چکی ہیں۔ ان سرگرمیوں سے تعلق رکھنے والے سیکڑوں مرد و زن بے روزگار ہونے کے ڈر سے نیوسٹی کی طرف رخ کر گئے ہیں اور وہاں ہاناوانی کے لیے ''خدمات'' انجام دے رہے ہیں۔ شاردا بھی ان میں سے ہی ایک تھی۔ اس نے واضح الفاظ میں آگاہ کیا کہ اس کا تعلق صرف ناچ گانے سے ہے۔ وہ اپنے فن سے مخلص ہے اور اس نے کبھی بھی جسمانی تعلقات اور جسم فروشی کی طرف جانے کی کوشش نہیں کی۔

میں خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ اس نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ اس نے باقاعدہ سیلف ڈیفنس کی تربیت لی ہوئی ہے...... اور وہ مجھے... ایسٹرن کی حیثیت سے اچھی طرح جانتی ہے۔ اس کی گفتگو مکمل طور پر جھوٹ نہیں تھی...... اور شاید مکمل طور پر سچ بھی نہیں تھی۔ وہ مجھے مسلسل، ایسٹرن اور مسٹر ایسٹرن کہہ کر مخاطب کر رہی تھی......

''میرا خیال ہے کہ آپ کھانے سے پہلے ڈرنک کرنا پسند کرتے ہیں۔'' اس نے اٹھلا کر کہا اور میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی قدِ آدم ریفریجریٹر کی طرف بڑھ گئی۔ وہ چست پتلون اور ہاف سلیو شرٹ میں ملبوس تھی۔ ترشے ہوئے سیاہ بال شانوں پر لہرا رہے تھے۔ دو منٹ بعد ہی میرے سامنے شیشے کی خوب صورت میز پر وہسکی کی بوتل اور دیگر لوازمات رکھے تھے۔ یہ میرا پہلا امتحان تھا اور کافی کڑا تھا۔ تاجور کے ساتھ اپنے انوکھے تعلق میں گرفتار ہونے کے بعد میں نے بہت کچھ چھوڑا تھا اور ان میں یہ شراب خانہ خراب بھی شامل تھی۔ اب مجھے اس کی بُو سے بھی متلی ہونے لگتی تھی۔ (نفر میری اس کایا پلٹ پر بہت حیران ہوا تھا کیونکہ وہ اب بھی اس شغل کو بُرا نہیں سمجھتا تھا)

میرا جی چاہا کہ میں ہاتھ مار کر یہ سب کچھ میز پر سے گرا دوں لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ میری ہر ہر حرکت کو دیکھا اور جانچا جا رہا ہے۔ میں ایک خطرناک امتحان سے گزر رہا تھا۔ اگر ہاناوانی اور اس کے گرگوں کو شک بھی ہو جاتا کہ میں کسی طرح کا ڈراما کر رہا ہوں تو میرے لیے صورتِ حال نہایت بدتر ہو سکتی تھی۔ چند سیکنڈ کے اندر ہی میں تذبذب کے ایک شدید ترین ریلے کی زد میں آ گیا، اس ریلے کے اندر جیسے لڑھکنیاں کھانے لگا۔ ایک خیال یہ بھی ذہن میں آیا کہ وقتی طور پر اس مشکل سے جان چھڑانے کے لیے کہہ دوں کہ ابھی موڈ نہیں ہو رہا، مگر بات پھر وہی تھی۔ ہلکا سا شک بھی سارا کھیل بگاڑ سکتا تھا۔

''ایک پیگ بناؤ۔'' میں نے شاردا کو ہدایت کی۔

کچھ ہی دیر بعد پیگ میرے ہاتھ میں تھا اور دل مالش کر رہا تھا مگر میں ''بڑی رغبت'' سے اسے چڑھا گیا۔

پھر دوسرا...... اور پھر تیسرا......

قریباً دو گھنٹے بعد مجھے لگا کہ میں نے خود کو مخمور کر کے اچھا ہی کیا تھا۔ ورنہ جو دیگر امتحان مجھے درپیش تھے، ان سے گزرنا بہت مشکل ہو جاتا۔ ان میں سے ایک امتحان تو خود یہ شاردا ہی تھی۔ اپنی آمد کے وقت اس نے بڑے طنطنے سے کہا تھا کہ وہ صرف رقص و نغمے تک محدود ہے اور ''جسمانی تعلقات'' سے بہت دور رہتی ہے لیکن پُرتکلف ڈنر کے بعد اس کی ادائیں اور اس کے اشارے کنایے کچھ اور کہانی سنانے لگے۔ اس نے خود بھی پی تھی اور اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں نشہ نظر آنے لگا تھا۔ وہ بہانے بہانے سے اپنے جسم کو بار بار میرے جسم سے چھوا جاتی تھی اور اس کے ہونٹوں پر معنی خیز تبسم چمک جاتا تھا۔

وہ بولی۔ ''مسٹر ایسٹرن! میں جاماجی میں آنے سے پہلے آگرہ میں رہتی تھی۔ سیلف ڈیفنس کی تربیت میں نے وہیں سے لی تھی۔ میں تب سے آپ کو ایم اے کے چیمپئن کی حیثیت سے جانتی ہوں۔ اس وقت سوچا بھی نہ تھا کہ ایک دن ایسا آئے گا جب میں آپ سے ملوں گی...... آپ کے ساتھ ایک کمرے میں ہوں گی۔''

میں نے کہا۔ ''میں نے بھی ایسی بہت سی باتیں نہیں سوچی تھیں جو ہو گئی ہیں...... اور ہو رہی ہیں۔''

وہ اپنی ہی رو میں بولتی گئی۔ ''کمانڈر قسطینا کو میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں، وہ اپنی ضد کی بہت ہی پکی ہیں۔ انہوں نے آپ سے پیار کیا، آپ کو پانا چاہا لیکن پا نہ سکیں...... غالباً آپ کے مجبور کرنے پر ہی انہوں نے اس افغانی فارس جان سے شادی کر لی...... لیکن مسٹر ایسٹرن! آپ ابھی اُن کے دل سے نہیں نکلے...... اور یہی وجہ ہے کہ وہ تاجور کی جانی دشمن بن چکی ہیں۔ وہ یہاں پہنچی ہی اس لیے ہیں کہ موقع ملتے ہی تاجور صاحبہ کا کام تمام کر سکیں......''

''ایسا کبھی نہیں ہو سکے گا۔'' میں نے گمبھیر لہجے میں کہا اور تلخ سیال کا پیمانہ ایک بڑے گھونٹ میں خالی کر دیا۔

وہ ہنسی اور اس کے سفید دانت لشکارے مارنے لگے۔ ''کتنی عجیب بات ہے قسطینا، تاجور کو مارنا چاہتی ہیں اور ان کے شوہر صاحب تاجور پر جان چھڑکتے ہیں۔ میں اندر خانے کے رازوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ یہ فارس جان بھی تاجور پر بڑی نظر رکھتا ہے۔ یہ معاملہ ان ہی دنوں پروان چڑھا تھا جن دنوں تاجور آپ کو امریکی جلاد لونگ کے چنگل سے نکالنے کے لیے جا ماکی پہنچی تھیں۔ ان دنوں فارس جان نے......''

''اچھا چھوڑو اس ذکر کو۔'' میں نے بھنا کر اس کی بات کاٹی...... ''وہ اب زندہ نہیں بچے گا...... بلکہ سمجھو کہ مر چکا ہے...... اور مرے ہوؤں کی باتوں پر اپنا وقت برباد کیوں کیا جائے؟''

''بات تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مسٹر ایسٹرن۔'' اس نے معنی خیز لہجے میں کہا اور جام میری طرف کھسکایا۔ ایسا کرتے ہوئے شیشے کا کنارہ میرے زخمی ہاتھ سے ٹکرا گیا۔ درد کی ایک لہری انگوٹھے سے لے کر کندھے تک چلی گئی۔

میرے تاثرات دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔ ''اوہ سوری...... ویری سوری...... شما چاہتی ہوں۔ مجھے پتا نہیں چلا۔''

میں غصے کا گھونٹ بھر کر رہ گیا۔ وہ بتدریج بے تکلف ہوتی چلی جا رہی تھی۔ ایک کے بعد دوسری حد پار کر رہی تھی۔ اب خود ہی اس نے جام بنا کر میری طرف بڑھا دیا تھا۔

میں نے اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم تو کہتی تھیں کہ تم صرف ڈانس وغیرہ تک محدود ہو اور باقی ''معاملات'' سے دور ہو؟''

''کون سے معاملات؟'' وہ نشیلی نظروں سے دیکھ کر مسکرائی۔

''اتنی انجان نہ بنو۔'' میں نے اسے گھورا۔

اس نے گہری سانس لے کر میری آنکھوں میں دیکھا۔ ''میں نے غلط نہیں کہا کہ صرف ڈانس اور SINGING تک محدود ہوں لیکن بندے بندے کی بات بھی تو ہوتی ہے۔ آپ کوئی عام نہیں ہو...... آپ ایسٹرن ہو۔ آپ کے بے شمار پرستار ہیں۔ ان میں ہزاروں لڑکیاں بھی ہوں گی۔ مجھے بھی ان میں سے ایک سمجھیں۔ آپ کے ساتھ سے گزارنا میرے لیے بڑے فخر کی بات ہوگی۔''

وہ بکواس کر رہی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں اس پر لعنت بھیجی۔ میں جانتا تھا کہ وہ صرف وہی کر رہی ہے، جو اس کے آقاؤں نے اسے حکم دیا ہے۔ میرے لیے بھی ضروری تھا کہ اپنے کردار کا بھرم رکھوں اور اسی طرح ایکٹ کروں جس طرح وقت کی ضرورت ہے۔ شراب کے بعد یہ دوسرا کڑا امتحان تھا۔ اس میں ناکام ہونے سے میری ساری پلاننگ ناکام ہوتی تھی اور میرے پیارے بدترین خطروں کی زد میں آتے تھے۔

شاردا کی اشتعال انگیز اداؤں کا ردِعمل ظاہر کرنا ضروری تھا۔ میں نے اسے جلتی نظروں سے دیکھا اور پھر اس پر جھپٹ پڑا۔ اب وہ میری مصنوعی بے قراریوں کے حصار میں تھی۔ اس کے گلے کی مالا بکھر گئی، چوڑیاں ٹوٹ گئیں، میں نے اسے اپنے قریب تر کر لیا لیکن یہ سب کچھ ایسے ہی تھا جیسے کوئی شخص سیر شکم ہونے کے باوجود غیر مرغوب کھانے کو گلے میں ٹھونسنے کی کوشش کرے اور میں اسے پوری طرح ٹھونسنا چاہتا بھی نہیں تھا، میں کئی سال سے کسی کی محبت میں مبتلا تھا...... اور اس تعلق کے سبب، میں ''محبت میں وحدت'' پر یقین رکھنے لگا تھا۔ مجھے گوارا نہیں تھا کہ اس محبت پر کسی کی شراکت کا جھوٹا سایہ بھی پڑے۔

اس صورتِ حال سے بچنے کے لیے میں نے ایک بار پھر اپنے زخمی انگوٹھے کو استعمال کیا۔ شاردا سے پُرجوش قربت کا مصنوعی کھیل کھیلتے ہوئے میرے ہاتھ اور بیڈ کے کراؤن کا زوردار تصادم ہوا۔ میں بُری طرح کراہ اٹھا اور شاردا سے الگ ہو کر بیٹھ گیا۔

میرے انگوٹھے کا پلاستر ہاتھ کے قریباً نصف حصے پر محیط تھا۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے زخمی انگوٹھے کو تھام لیا۔

''اوہ گاڈ، کیا ہوا؟ زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟'' شاردا اپنے بال سمیٹتے ہوئے پریشان لہجے میں بولی۔

''کچھ...... زیادہ ہی آئی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ہڈی پھر ہل گئی ہے۔''

''تو کیا...... ڈاکٹر کو بلانے کی ضرورت ہے؟'' وہ

میرے تاثرات دیکھتے ہوئے بولی۔

''پتا نہیں...... لیکن...... ابھی تھوڑی دیر دیکھتا ہوں، شاید درد کم ہو جائے۔'' میں نے تکلیف میں ہونے کی کامیاب اداکاری کی۔

وہ رات جیسے تیسے گزر گئی اور وہ خوب صورت بلا بھی ٹل گئی۔ میرے انگوٹھے پر ''چوٹ'' لگنے کے بعد وہ آدھ پون گھنٹا ہی میرے پاس رہی تھی۔ میں نے دو پین کلر گولیاں کھا کر اسے روانہ کر دیا تھا۔ انگوٹھے میں سچ مچ ہلکا ہلکا درد بھی شروع ہو گیا تھا۔ پین کلرز سے افاقہ ہوا اور میں کل پیش آنے والے ممکنہ معاملات کے بارے میں سوچتے سوچتے سو گیا۔

اگلا روز کافی ہنگامہ خیز ثابت ہوا۔ وہی کچھ ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ ہاناوانی کو یقین تھا کہ میں اس کے ٹرانس میں آ چکا ہوں...... اور میرے ٹرانس میں آنے کے بعد وہ مجھ سے جو پہلا کام لینا چاہتی تھی وہ یہی تھا کہ وہ میرے ذریعے میرے ساتھیوں تک پہنچ جائے...... فخر تو یہ کام نہیں کر سکتا تھا کیونکہ وہ واقعی ''راوی فارم'' کا راستہ بھول چکا تھا لیکن اب یہی بھلکو پن میرے کام بھی آ سکتا تھا۔ (ویسے بھی راوی فارم کا راستہ اتنا آسان نہیں تھا)

صبح نو بجے کے لگ بھگ مجھے اس وسیع و عریض عمارت سے نکالا گیا۔ میرے ذہن میں خدشہ تھا کہ شاید میری آنکھوں پر پٹی باندھی جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ مجھے ایک عام سی اسٹیشن وین میں بٹھایا گیا۔ اس پر لاہور کا نمبر تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میں لاہور کے آس پاس ہی کہیں موجود ہوں۔ عمارت باہر سے اتنی شاندار نہیں تھی جتنی اندر سے تھی۔ پاپولر، سنبل اور سرو کے اونچے درختوں سے گھرا ہوا یہ ایک پرانی طرز کا مینشن دکھائی دیتا تھا۔ کئی جگہ سے پلاستر اور رنگ روغن اکھڑا ہوا تھا۔ عمارت کے آگے وسیع و عریض لان تھا جس میں ہر طرح کے پودے موجود تھے۔ اسٹیشن وین میں میرے ساتھ گہری سیاہ رنگت والا ایک بدمعاش صورت شخص موجود تھا۔ یہ ایک مقامی تھا۔ جیسا کہ بعد میں اندازہ ہوا کہ اردگرد کے علاقے کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کا نام جمال تھا اور اس کے ساتھی اسے جمالا بھائی کہتے تھے۔ اس کے ایک کان میں سونے کی چھوٹی سی بالی تھی اور چہرے پر پرانے زخموں کے کئی نشان تھے۔ اس کے ساتھی بھی شکلوں اور حلیوں سے مقامی گرگے ہی لگتے تھے۔ ان کی تعداد تین تھی اور ان میں سے ایک اسٹیشن وین کی ڈرائیونگ نشست پر بیٹھا تھا۔ وین عمارت سے نکلی تو میں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ یہ بالکل مضافاتی علاقہ تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ میں واہگہ سائڈ سے بہت زیادہ دور نہیں ہوں۔ اس کا مطلب تھا کہ لاہور بھی بیس پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہی ہوگا۔

''کس طرف جانا ہے جناب؟'' جمالے نے پنجابی لہجے کی اردو میں دریافت کیا۔

''راوی فارم۔'' میں نے گمبھیر لہجے میں جواب دیا۔

''ہم نے بھی یہ نام تھاڈے سے ہی سنا ہے۔ آپ رستہ بتاؤ گے تو ہم پہنچ جائیں گے۔''

''بارڈر کس سائڈ پر ہے۔'' میں نے جمالے سے پوچھا۔

اس نے پیچھے کی طرف چہرہ پھیر کر دور مشرقی افق کی طرف اشارہ کیا۔ ''کوئی بارہ کلومیٹر کا رستہ ہے۔ بڑی نہر ہمارے پچھے پاسے ہے۔''

میں نے کچھ دیر سوچ بچار کے تاثرات دیے پھر جمالے سے کہا۔ ''پہلے نہر کی طرف چلو، وہاں پہنچ کر شاید کچھ اندازہ ہو جائے۔''

چھوٹی نال کی بھری ہوئی روسی رائفل میری گود میں رکھی تھی۔ میرا بریٹا پسٹل بھی مجھے واپس کر دیا گیا تھا۔ وہ میں نے قمیص کے نیچے لگا لیا تھا۔

اسٹیشن وین وہاں سے روانہ ہو گئی۔ یہ ایک سرد دن تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی مگر تمازت بہت کم تھی۔ کل ہاناوانی نے مجھے جو ٹپشنز دی تھیں، ان کے مطابق تو داؤد بھاؤ، سجاول اور قسطینا وغیرہ میرے بدترین دشمن تھے اور مجھے پہلی فرصت میں انہیں مار ڈالنا تھا اور میرے یہ دشمن اس وقت کہیں اور نہیں راوی فارم میں ہی پائے جاتے تھے۔ میرا راوی فارم کی طرف جانا عین ہاناوانی کی مرضی کے مطابق تھا۔

آدھے گھنٹے میں ایک نیم پختہ راستے پر قریباً پانچ کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے ہم ایک نالے کے چھوٹے سے پل پر پہنچ گئے۔ یہ پل میں نے پہلے بھی دیکھا ہوا تھا اگر ہم اس نالے کے ساتھ ساتھ قریباً چھ کلومیٹر سفر طے کرتے تو اس راستے پر پہنچ جاتے جو آگے جا کر راوی فارم پہنچنے والی نیم پختہ سڑک سے اٹیچ ہوتا تھا۔ اگر میں واقعی ہاناوانی کے ٹرانس میں ہوتا تو شاید ایک گھنٹے سے بھی تھوڑے وقت میں راوی فارم پہنچ جاتا...... لیکن میں ٹرانس میں نہیں تھا اور یہی وجہ تھی کہ میں نے راوی فارم بھی نہیں پہنچنا تھا۔

مجھے سوچ میں دیکھ کر جمالا گہری نظروں سے پرکھنے

UrduBooks.PK

کوہِ نور

ہیئر آئلز

پلاسٹک پیک
KOHINOOR
AMLA HAIR OIL
کوہ نور آملہ ہیئر آئل
KOHINOOR
AMLA HAIR OIL
KOHINOOR
AMLA HAIR OIL
کوہ نور آملہ ہیئر آئل
BONCO'S
KOHINOOR
RAUGHAN CHAMBELI
No. 570
کوہ نور

کوہ نور آملہ ہیئر آئل

کوہ نور چنبیلی ہیئر آئل

... زندگی سے بھرپور صحت مند بال

KAHO/03/2K18

لگا...... پھر مؤدب انداز میں بولا۔ ''کیا سوچ رہے ہو جی؟''

میں نے کہا۔ ''یہ پل تو دیکھا ہوا ہے...... لیکن...... یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ...... یہاں سے دائیں مڑنا ہے یا بائیں......''

جمالے نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آسے پاسے نظر دوڑاؤ جی۔ اگر پل نظر آ گیا ہے تو کوئی اور نشانی بھی تجھ وچ آ جائے گی۔''

میں نے تھوڑی دیر ''غور و فکر'' کے بعد ان لوگوں کو دائیں رخ پر ڈال دیا۔ اس رخ پر چل کر ہم راوی فارم پر نہیں پہنچ سکتے تھے...... ہاں پہلوانوں کے شہر گوجرانوالہ پہنچ جاتے تو اور بات تھی۔

کم و بیش دو گھنٹے تک میں نے جمالے اور اس کے ساتھیوں کو خوب اِدھر اُدھر خوار کیا...... اور انہیں یہی باور کرایا کہ میں بھی فخری کی طرح راوی فارم کا راستہ ڈھونڈ نہیں پا رہا۔ جمال عرف جمالا اسٹیشن ویگن سے دور چلا گیا اور ایک کھیت کے کنارے کھڑا ہو کر موبائل فون پر بات کرنے لگا۔ اس کی آواز مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی مگر اندازہ یہی ہو رہا تھا کہ وہ کسی ایسے شخص سے بات کر رہا ہے جو اس کی گلابی اردو کا ترجمہ کر کے ہاناوانی تک پہنچا سکے۔ وہ اُسے یہ ''بدخبری'' سنا رہا تھا کہ راوی فارم ابھی تک گمشدہ ہے۔

میرا ذہن بھی مسلسل مختلف سوچوں میں الجھا ہوا تھا۔ میں ہر صورت ہاناوانی کو یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ میں اس کے ٹرانس میں ہوں اور اس حوالے سے کوئی رسک لینا نہیں چاہتا تھا۔ ایسا سوچتے ہوئے میرے ذہن میں یہ بات بھی آئی تھی کہ کیوں ناں جمالے وغیرہ کو راوی فارم تک لے ہی جاؤں۔ اس سوچ کے پیچھے ایک اور سوچ کارفرما تھی۔ اور وہ یہ کہ عین ممکن ہے، داؤد بھاؤ نے خطرے کے پیش نظر راوی فارم خالی کر دیا ہو...... لیکن یہ بس ایک سوچ تھی۔ اتنا بڑا خطرہ مول لینا میرے لیے ممکن نہیں تھا......

جمالے اور اس کے ساتھیوں کو مختلف دیہی علاقوں کی ''ان چاہی'' سیر کرانے کے بعد میں انہیں اسی وسیع و عریض مینشن میں واپس لے آیا جہاں ہاناوانی اور اس کے ملائیشین ساتھی اپنے خطرناک ترین ارادوں کے ساتھ موجود تھے۔

شام کے بعد شاردا ایک بار پھر اٹھلاتی ہوئی میرے کمرے میں پہنچی۔ آج وہ ساڑی میں تھی اور بال کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ میرے ہاتھ کا حال احوال پوچھنے کے بعد بولی۔ ''آج ہم سب کے لیے ایک زبردست تفریح فراہم ہونے والی ہے۔ آپ کا مقابلہ آپ کے ایک پرانے دوست سے ہونے والا ہے جو اب دشمن کی شکل اختیار کر چکا ہے۔''

''کیا کہنا چاہ رہی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''فخری نے آپ کے ساتھ یار مار کا کردار ادا کیا ہے۔ آپ کی محبت پر ڈاکا ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ آج آپ اس سے بدلہ لے سکیں گے۔ ہاناوانی کے حکم کے مطابق آپ دونوں میں آج رات دست بدست لڑائی ہو گی۔ ہاناوانی بھی اس لڑائی کو کلوز سرکٹ ٹی وی کے ذریعے دیکھیں گی۔''

''لیکن...... یہ تو سراسر ناانصافی ہے۔'' میں نے بھنّا کر کہا۔ ''وہ حرام زادہ فخری کوئی معمولی فائٹر نہیں ہے۔ وہ مجھے کسی بھی وقت ناکوں چنے چبوا سکتا ہے۔ خاص طور سے اس صورتِ حال میں کہ میرا انگوٹھا بھی سخت زخمی ہے۔''

''ہاناوانی بھی یہ سب جانتی ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ انہوں نے اس لڑائی کو بیلنس کرنے کا بھی کوئی نہ کوئی انتظام کر رکھا ہے۔''

''پتا نہیں، تم کیا کہہ رہی ہو؟''

''میری جانکاری کے مطابق آپ کو زیادہ سے انتظار کرنا نہیں پڑے گا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر میں آپ کو بڑے ہال کمرے میں بلا لیا جائے گا۔'' شاردا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ ہاناوانی اپنے اسی منحوس منصوبے پر عمل پیرا ہے۔ اپنی قسم کے مطابق وہ ہم سب کو ہمارے ہی ذریعے ایک دوسرے سے مروانے کی تمنا رکھتی ہے۔

شاردا نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ کم و بیش ڈیڑھ گھنٹے بعد میں اسی ہال کمرے میں موجود تھا جہاں ہاناوانی نے مجھے اپنے مہلک ٹرانس میں لینے کی کوشش کی تھی اور میں نے خود کو درد کے دریا میں ڈبو کر اپنے ذہن کو اس کے حوالے نہیں ہونے دیا تھا...... ہاں یہ وہی بلند و بالا چھت والا پُراسرار ہال تھا جس میں دھیمی اور تیز روشنیوں کے سائے ایک جادوئی ماحول پیدا کرتے تھے۔ کل جس وقت مجھے ہپناٹائزڈ کیا گیا، اس ہال میں کچھ جانور بھی موجود تھے لیکن آج چھت پر جھولتی چمگادڑوں کی جھالر کے سوا اور کچھ نہیں تھا...... ہاناوانی بھی نہیں تھی اور نہ ہی اس کی زرنگار کرسی تھی۔ ایک بہت بڑی اسپاٹ لائٹ قریباً بیس فٹ قطر کے فرش کو روشن کر رہی تھی۔ میں اس روشن دائرے کے اندر پہنچا تو چند ہی سیکنڈ بعد فخری بھی میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ وہ اس لباس

UrduBooks.pk

میں نہیں تھا جس لباس میں چند روز پہلے ٹیوب ویل کے کمرے میں میرے سامنے آیا تھا اور مجھے گن پوائنٹ پر رکھ لیا تھا۔ اب وہ نیلی جینز اور ہاف سلیو شرٹ میں تھا جس میں سے اس کے بازوؤں کی توانا مچھلیاں جھلک دکھاتی تھیں۔ وہ دوست تھا لیکن ہاناوانی کا شکار ہو کر جانی دشمن بن چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے قہر کی بجلی چمک رہی تھی۔ میں نے بھی اسے قہرناک نظروں سے دیکھا اور اس سے لڑنے کے لیے تیار دکھائی دینے لگا۔

ہمارے اردگرد مسلح ملائیشین اور مقامی گارڈز تھے۔ گرے فورس کی وہی لڑکی آگے بڑھی جس کے جسم پر کیپٹن کی وردی نظر آتی تھی۔ اس نے ایک چھوٹا آرمی ڈیگر ایک لاسٹک بینڈ کے ساتھ میری پنڈلی سے منسلک کر دیا۔ میں نے فخر کی طرف دیکھا۔ اس کی پنڈلی کے ساتھ کوئی تیز دھار آلہ منسلک نہیں تھا۔ اس کے پاس اور بھی کسی طرح کا ہتھیار دکھائی نہیں دیتا تھا۔

میں نے سوالیہ نظروں سے گرے فورس کی آفیسر کی طرف دیکھا۔ وہ شستہ انگلش میں بولی۔ ''تم زخمی ہو ایسٹرن، اور تمہارا حریف زخمی نہیں ہے۔ ہاناوانی کے حکم پر اس لڑائی کو متوازن کیا گیا ہے۔''

میں نے دل ہی دل میں اس آفیسر لڑکی اور ہاناوانی کو ایک موٹی گالی دی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ ہاناوانی کیا چاہتی ہے۔ وہ ہم سب کو مارنا چاہتی تھی لیکن آج رات اس لڑائی میں وہ فخر کے مقابلے میں مجھے شاید زندہ رکھنا چاہتی تھی۔ ظاہر ہے کہ سجاول، داؤد اور قسطینا جیسے پیارے ساتھیوں کو جب میں اپنے ہاتھوں سے مارتا، تو ہاناوانی کو زیادہ شادمانی اور آسودگی محسوس ہوتی۔

فخر کو دیکھا تو میرا دل جیسے کٹ کر رہ گیا۔ یہ وہ فخر تو ہرگز نہیں تھا جو کچھ روز پہلے کلر کہار سے آگے شمشان گھاٹ کے نواح میں ہم سے جدا ہوا تھا۔ میرے کندھے سے کندھا ملا کر ہر خطرے کے سامنے ڈٹ جانے والا۔ میرے پسینے پر اپنا خون گرانے والا۔ یہ تو کوئی اور تھا۔ میرے لیے اس کی آنکھوں میں ایک قاتل چمک لشکارے مار رہی تھی اور میں اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ ایک آسان حریف نہیں ہے۔ وہ ایک چنگھاڑ کے ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوا۔ ہم دست و گریباں ہوگئے۔ وہ ایم اے کے ان سارے داؤ پیچ سے واقف تھا جو مجھے آتے تھے...... بلکہ اکثر موقعوں پر ہم نے اکٹھے ہی اکتساب فن کیا تھا اور سخت ٹریننگ کے مراحل سے گزرے تھے۔ وہ پے در پے وار کرنے لگا اور میں ان کا توڑ کرنے میں مصروف ہوگیا۔ اس کے کئی زوردار پنچ میرے چہرے پر لگے۔ میں نے بھی پاؤں کی ایک سخت ضرب اس کے سینے پر سامنے کی طرف لگائی پھر ہم گتھم گتھا ہوگئے۔ کسی موہوم امید کے سہارے میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ''فخر، ہوش کرو۔ میں دشمن نہیں، دوست ہوں، میں شاہ زیب ہوں...... میں تمہارا ایسٹرن ہوں؟''

وہ پھنکارا۔ ''مجھے بھی پتا ہے تم کیا ہو اور میں آج اسی جگہ تمہاری گردن توڑ کر تمہارے سینے پر ناچنا چاہتا ہوں۔''

تین چار منٹ تک ہمارے درمیان زوردار کشمکش ہوئی۔ ہال میں مسلح گارڈز کے سوا اور کوئی نہیں تھا تاہم یقینی بات تھی کہ کلوز سرکٹ ٹی وی کے ذریعے یہ مناظر اور بھی کئی لوگ دیکھ رہے ہیں۔ عین ممکن تھا کہ ان میں ہاناوانی بھی ہو۔ میں اپنے زخمی ہاتھ کو اس لڑائی سے دور رکھے ہوئے تھا مگر گاہے بگاہے اس ہاتھ کو بھی چھوٹی موٹی چوٹ پہنچ رہی تھی۔ اپنے ایکٹ کا بھرم رکھنے کے لیے میں موقع ملتے ہی وحشیانہ انداز میں فخر پر جھپٹ پڑتا تھا...... موقع پر موجود تماشائی اس خطرناک مقابلے سے یقیناً لطف اندوز ہو رہے تھے۔ بالآخر میں نے فوجی خنجر اپنی پنڈلی کے بینڈ میں سے کھینچ لیا۔

میں اپنے پیارے دوست کو اپنے ہاتھوں سے کیسے مار سکتا تھا۔ میں نے اسے موقع فراہم کیا کہ وہ خنجر مجھ سے چھین لے۔ یہ سب کچھ اتنے حقیقی انداز میں ہوا کہ کسی کو پلاننگ کا شائبہ تک نہیں ہوا ہوگا۔ پندرہ بیس سیکنڈ بعد لڑائی میں وہ اسٹیج آگئی جب غضبناک فخر میرے سینے پر چڑھا بیٹھا تھا، اس کے ہاتھ میں موجود خنجر کی دھار میری شہ رگ سے قریب تر ہو رہی تھی اور میں اس دھار کو خود سے دور رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ بچانے والے مجھے بچالیں گے کیونکہ میرا مرنا ان کے ایجنڈے میں شامل نہیں تھا۔ ان کے ایجنڈے میں فخر کا مرنا تھا۔

اور پھر وہی کچھ ہوا...... جس وقت واقعی مجھے لگنے لگا کہ میری گردن آرمی ڈیگر کی دھار تلے آجائے گی۔ کسی خفیہ اسپیکر سے ملائیشین زبان میں کچھ کہا گیا اور دو تین گارڈز نے لپک کر فخر کو دبوچ لیا اور مجھ سے علیحدہ کر دیا۔ وہ دہاڑ رہا تھا۔ ''مار دوں گا...... ٹکڑے کر دوں گا۔'' اس کی آنکھوں میں حیوانی چمک لشکارے مار رہی تھی۔

گارڈز نے اس کے ہاتھوں سے آرمی ڈیگر کھینچا اور اسے گھسیٹ کر مجھ سے فاصلے پر لے گئے۔ میں نے بھی خود کو بے حد مشتعل ظاہر کیا...... ایک گارڈ نے مجھے بھی کمرے

تھام رکھا تھا۔ میں نے فخر کو مخاطب کیا اور للکارا۔ ''اپنے ہاتھوں سے تیری جان لوں گا...... ایک ایک ہڈی کا سرمہ بناؤں گا۔ دیکھ لینا ایسا ہی کروں گا۔''

میری یہ ساری بھڑک بازی فقط اور فقط فخر کی جان بچانے کے لیے تھی۔ یقیناً ہاناوانی کو یہ بات بہت پسند ہوتی کہ میں ایک زوردار مقابلے میں فخر کو ایک بری موت کا تحفہ دوں لیکن کیا واقعی فخر میرے ساتھ کسی اگلی لڑائی کے لیے زندہ رہ پائے گا؟ اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

میرے زخمی انگوٹھے سے درد کی شدید ٹیسیں اٹھنا شروع ہو گئی تھیں۔ پلاسٹر کے نیچے سے انگوٹھے کی جانب تھوڑا سا خون بھی رستا تھا۔ ایک لحاظ سے تو یہ اچھا ہی تھا۔ اگر آج رات پھر وہ آفتِ جان شاردا میرے سر پر منڈلانے لگتی تو اسے دور رکھنے کے لیے یہ اچھا بہانہ موجود تھا۔

اگلے روز شام قریباً سات بجے کی بات ہے۔ میں ایک بار پھر ہاناوانی کے رُوبرو اسی ہال میں تھا۔ آج پھر ہاناوانی اسی طرح ایک ریشمی پردے کے عقب سے نمودار ہوئی جس طرح پہلے روز ہوئی تھی۔ اس کے کندھوں پر لمبی گردنوں اور گنجے سروں والے دو گدھ تھے۔ سیاہی مائل بجّو اس کے عقب میں رینگتا چلا آرہا تھا۔ غیر معمولی سائز کی سیاہ بلی مخملی چبوترے کے سامنے ساکت بیٹھی تھی۔

ہاناوانی کرسی پر براجمان ہونے لگی تو گدھ پھڑپھڑا کر چھت کی نیم تیرگی میں کہیں اوجھل ہو گئے۔ میں چبوترے کے عین سامنے اسی ڈارک براؤن کرسی پر بیٹھا تھا لیکن آج مجھے کرسی کے ساتھ باندھا نہیں گیا تھا۔ صرف اتنی احتیاط کی گئی تھی کہ ہاتھ پشت پر جکڑ دیے گئے تھے۔ اردگرد موجود گارڈز بھی ایزی موڈ میں ہی دکھائی دیتے تھے۔ غالباً یہ تبدیلی اس لیے تھی کہ ان کی سوچ کے مطابق میں ہاناوانی کے ٹرانس میں تھا۔

ہاناوانی نے اپنی سیاہ عینک اتاری اور ایک بار پھر مجھ پر اپنا تنویمی عمل شروع کیا...... اس بار ہاناوانی کا انداز بالکل مختلف تھا۔

اس کے لہجے میں نرمی تھی اور آنکھوں سے نکلنے والی مقناطیسی لہروں کی شدت بھی وہ نہیں تھی جو میری نگاہوں کے سامنے سات رنگ کے بھنور کو ابھارتی تھی اور میں نہ چاہنے کے باوجود اس کی طرف کھنچتا چلا جاتا تھا۔ بس ایک سنسناہٹ سی ضرور محسوس ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ ہاناوانی کی آواز میری سماعت کے راستے میرے جسم میں سرایت کر رہی ہے اور رگ و پے میں ایک بے نام آمادگی جگا رہی ہے۔ اپنی قوتِ ارادی کے ذریعے اس آمادگی سے نمٹنا میرے لیے کچھ زیادہ مشکل ثابت نہیں ہو رہا تھا۔

وہ بولی۔ ''ایسٹرن! راستہ یاد کرو...... اس فارم کا راستہ یاد کرو جہاں وہ باسٹرڈ قسطینا موجود ہے جو تمہاری محبوبہ کی جان لینے یہاں پہنچی ہے۔ وہ ہرن کے سینگ کے دستے والا خنجر اس کے سینے میں اتارنے کے لیے بے تاب ہے۔ اسے مارو ورنہ وہ تاجور کو مار ڈالے گی۔''

اس نے دو بار اپنے یہ جملے دہرائے۔ تب میں نے سوئے سوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''میں بے بس ہوں ہاناوانی...... میں کوشش کر رہا ہوں...... لیکن ابھی ٹھیک سے کچھ یاد نہیں آرہا...... بس ایک پُل نظر آتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جھاڑیاں ہیں اور اس سے آگے کھیت ہیں پھر ایک دیوار سی سامنے آجاتی ہے، میں اس کے پار نہیں دیکھ پاتا......''

ہاناوانی کچھ دیر اسی حوالے سے مجھے مختلف مشورے دیتی رہی، پھر میرے دماغ کو بند جان کر اس نے گفتگو کا رخ بدل دیا۔ وہ داؤد بھاؤ کی طرف آگئی...... اپنی پُراثر آواز میں بولی۔ ''چلو وہ باسٹرڈ قسطینا پھر سہی لیکن داؤد بھاؤ تو راوی فارم میں نہیں ہوتا۔ وہ تو کہیں اور ہوتا ہے اور تم بہت دفعہ لاہور میں اس کے ٹھکانے پر آچکے ہو۔''

''بالکل ہاناوانی، اس سؤر کے اڈے کا راستہ مجھے اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح یاد ہے۔ میں ایک گھنٹے میں وہاں پہنچ سکتا ہوں بلکہ آپ مجھے اجازت دیں، میں وہاں پہنچنا چاہتا ہوں۔ اس نے میرے سر کا سودا کیا ہے۔ وہ آستین کے سانپ سے بڑھ کر زہریلا ہے۔ میں اس کا سر کچلنا چاہتا ہوں، ابھی کچلنا چاہتا ہوں۔''

''میں بھی چاہتی ہوں کہ یہ کام آج ہی ہو لیکن آج رات تمہیں ایک دوسرے دشمن کو بھی جہنم واصل کرنا ہوگا۔ وہ بھی تمہاری پہنچ میں ہے۔''

''آپ حکم کریں ہاناوانی۔''

''خورشہ...... تم اس کے ٹھکانے سے اچھی طرح واقف ہو۔ وہاں اس کے شوہر نے زبردست پہرا بٹھا رکھا ہے لیکن تمہیں تو وہاں جانے سے کوئی نہیں روکے گا۔ تمہیں اس بدبخت کا سر کاٹنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہی؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں ہاناوانی...... وہ اور

UrduBooks.pk

اس کا بچہ کل کا سورج نہیں دیکھ سکیں گے۔ لالہ موتی کے اس گھر کی دیواروں پر ان کے خون کی پچکاریاں چلادوں گا۔"

"تو پھر نکلو یہاں سے اور پہلے جہنم واصل کرو اس غدار داؤد کو۔ تمہیں دکھانے کے لیے اس نے جو کرنسی نوٹ اس بونے بنارس کے گلے میں ٹھونسے تھے وہ خود اس کے گلے میں ٹھونسے جانے چاہئیں۔" وہ سرا تی آواز میں بولی۔ (روشنیوں کا ایک جال سا میرے اردگرد بُنا گیا تھا۔ یہ پُراسرار روشنیاں بھی دل و دماغ کو ماؤف کرنے کی صفت رکھتی تھیں)

"میں آج صبح سے پہلے پہلے داؤد بھاؤ اور خورشنہ کی سانسیں پی جاؤں گا۔" میں نے ہیجانی لہجے میں کہا۔

"لیکن خود کو اب نارمل نہیں کرنا۔ ہر طرح سے نارمل نظر آؤ گے۔ اپنا لب ولہجہ اور اپنے تاثرات بالکل نارمل لوگوں والے رکھو گے۔ تم پوری طرح میرے اثر میں ہو لیکن تم ایسٹرن ہو۔"

"آپ کی ہر بات میرے دل و دماغ میں سما چکی ہے بانا وانی۔ آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی...... اور شکایت ہو بھی کیوں؟ یہ لوگ آپ سے زیادہ میرے دشمن ہیں۔ میری پیٹھ میں چھرے گھونپے ہیں انہوں نے۔"

"ویل سیڈ...... ویری نائس۔ اب میں اپنی ہدایات دہرا رہی ہوں۔ تم انہیں میرے ساتھ ساتھ دہراؤ گے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ ایک بار پھر الف ب سے شروع ہو کر آخر تک گئی۔ آخر میں کہنے لگی۔ "تم اپنا کام اچھی طرح جانتے ہو...... تم داؤد کو کہاں مارنا پسند کرو گے؟ اس کے اڈے پر یا اڈے سے باہر؟"

میں نے بلاتوقف جواب دیا۔ "مادام! میں کوشش کروں گا کہ اسے اس کے ٹھکانے سے نکال کر مارا جائے۔ کیونکہ اگر میں اُسے اس کے ٹھکانے پر ماروں گا تو پھر میرا اپنا دفاع مشکل ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے، تم اپنے دفاع کو سب سے اہم رکھو گے۔ ابھی تمہیں اپنے اور بہت سے قرض اتارنے ہیں۔"

"میں ایسا ہی کروں گا مادام۔"

☆☆☆

اور یہ منظر تھا لاہور میں داؤد بھاؤ کے خفیہ ٹھکانے کا۔ رات کے قریباً نو بج چکے تھے۔ لاہور کی سڑکوں پر رش تھا...... روشنیوں کی جگمگاہٹ تھی۔ یہ داؤد بھاؤ کا وہی ٹھکانا تھا جہاں مجھے پاکستان میں آنے کے بعد پہلی بار پناہ ملی تھی...... اور میں داؤد بھاؤ کی مدد سے لالہ نظام جیسے دشمن کا قلع قمع کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ داؤد بھاؤ کی کوئی بھی نوازش مجھے بھولی نہیں تھی...... اور آج میں اسے "قتل" کرنے کے لیے یہاں موجود تھا۔

میں ایک چھوٹی کورے گاڑی میں یہاں پہنچا تھا۔ میرے پاس بریٹا کے علاوہ ایک مشین پسٹل بھی تھا۔ اس کے علاوہ ایک دو دھاری خنجر تھا جسے میں نے باقی دونوں ہتھیاروں سمیت اپنی سیاہ جیکٹ میں اچھی طرح چھپا رکھا تھا۔ بھاؤ کا یہ ٹھکانا ایک بارونق علاقے میں تھا۔ اوپر ایک بہت بڑا اسنوکر کلب تھا اور زیرزمین وہ وسیع تہ خانے تھے جہاں قانون سے بھاگے ہوئے لوگوں کی پناہ گاہیں تھیں اور باکسنگ سمیت مارا ماری کے مختلف مقابلے ہوتے تھے۔ میں اسنوکر کلب میں پہنچا تو مجھے یہاں کچھ ٹوٹ پھوٹ کے آثار دکھائی دیے۔ چند کھڑکیوں کے شیشے بھی ندارد تھے۔ لگتا تھا کہ ایک آدھ دن پہلے یہاں کچھ مارا ماری ہوئی ہے۔

میری حیثیت یہاں ایک جانے پہچانے شخص کی تھی۔ بھاؤ کے سارے گارڈز مجھے بخوبی پہچانتے تھے۔ مجھے بغیر تلاشی کے بیسمنٹ میں اترنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی کیونکہ یہاں پہنچتے ہی میں نے فون پر بھاؤ کو اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی۔

میں ہال کمرے میں پہنچا تو "باکسنگ رنگ" میں حسبِ معمول باکسنگ جاری تھی۔ مجھے دیکھ کر یہ سلسلہ رک گیا۔ بھاؤ کے ایک دو بے تکلف ساتھیوں کی طرف سے مجھے آفر کی جانے لگی کہ میں Ring میں آؤں اور اپنے بے مثال ہنر کی چند جھلکیاں دکھاؤں...... لیکن جب یہ دیکھا گیا کہ میرے ہاتھ پر "بے مثال چوٹ" بھی لگی ہوئی ہے اور پلاستر چڑھا ہوا ہے تو مجھ پر زیادہ زور نہیں دیا گیا۔

جواں سال روبی کی موت کے بعد بھاؤ کچھ عرصہ اداس رہا تھا لیکن اب روبی کی جگہ ایک اور پری چہرہ لے چکی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر صوفے سے کھڑی ہوگئی اور سلام کیا۔ اس کے حلیے سے عیاں تھا کہ وہ کچھ دیر پہلے تک صوفے پر نہیں بلکہ بھاؤ کی آغوش میں تھی اور پینے پلانے میں اس کی مدد کر رہی تھی۔ (جب سے گینگ میں غداری والا معاملہ ہوا تھا، بھاؤ کافی پریشان دکھائی دیتا تھا)

میں اندر داخل ہوا تو بھاؤ نے زندگی میں پہلی بار مجھے ٹٹولنے والی گہری نظروں سے دیکھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ایسے کیوں دیکھ رہا ہے۔ بانا وانی کی پاکستان میں آمد اور انیق کی موت کے بعد ہم سب ہی جیسے ایک دوسرے کی نگاہوں میں مشکوک ہوگئے تھے۔ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کسی پر

ہانا وانی کا داؤ نہ چل گیا ہو۔ خاص طور سے فی الوقت میرے حوالے سے بھاؤ کا شک تو سمجھ میں آتا تھا۔ میں راوی فارم والے ٹھکانے سے اشرف عرف اچھو کو ساتھ لے کر نکلا تھا تاکہ ’’راستہ بھولے ہوئے فخر‘‘ کو فارم پر لاسکوں مگر اسے واپس لانے کے بجائے میں خود اوجھل ہو گیا تھا اور اپنے پیچھے ہیڈ مالی (اشرف عرف اچھو) کی لاش چھوڑ گیا تھا۔ اب کئی روز بعد میں اچانک نمودار ہوا تھا اور سیدھا بھاؤ کے خفیہ ٹھکانے پر پہنچا تھا۔

میں نے پُرسکون انداز میں بھاؤ کی طرف دیکھا اور پھر میز کے نیچے ہاتھ لے جا کر وہ دو بٹن آف کر دیے جو اس کمرے کے خفیہ وڈیو اور آڈیو سسٹم سے منسلک تھے۔ بھاؤ بے حد چونکی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ بھاؤ جیسے شخص کے لیے یہ اندازہ لگانا ہرگز مشکل نہیں تھا کہ میری جیکٹ کے اندر فرشتۂ اجل کی یہاں آمد کنفرم کرنے کا کافی سامان موجود ہے۔

میں نے اس کے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ’’بھاؤ! میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ مجھے یوں شک بھری نظروں سے کیوں دیکھ رہے ہیں اور آپ کا شک کوئی ایسا غلط بھی نہیں ہے۔ میں آج کی رات کو آپ کی آخری رات بنانے کے لیے یہاں آیا ہوں۔ ہانا وانی مجھے اپنے ’’ٹرانس‘‘ میں لے چکی ہے۔‘‘

کوئی اور ہوتا تو سرتاپا دہل جاتا لیکن بھاؤ آرام سے بیٹھا رہا۔ اس نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے ایک دوسرے پر جما رکھے تھے اور عقابی نظروں سے میرا جائزہ لیتا جا رہا تھا۔ آخر گہری سانس لے کر بولا۔ ’’ہانا وانی تمہیں اپنے ٹرانس میں لے چکی ہے لیکن تم اس کے ٹرانس میں آئے ہو یا نہیں؟‘‘

’’آپ کو کیا لگتا ہے؟‘‘

’’...... مجھے لگتا ہے...... بلکہ ہمیشہ سے لگتا ہے...... کہ تمہارے اندر کرشماتی صلاحیتیں موجود ہیں۔ شاید تم نے یہاں بھی کوئی کرشمہ دکھایا ہے۔‘‘

’’مجھے بھی لگتا ہے کہ...... آپ بندے کے اندر بہت گہرائی تک دیکھ سکتے ہیں۔‘‘ میری بات پر وہ بڑے دھیمے انداز میں مسکرا دیا۔ ہم کچھ دیر تک معنی خیز خاموشی سے ایک دوجے کی طرف دیکھتے رہے۔ ہال کمرے کی طرف سے ’’ہاؤ ہو‘‘ کا بلند ہونے والا شور، دھیمی آواز میں اس کمرے تک پہنچ رہا تھا۔ وہاں مارشل آرٹ کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ’’بھاؤ! میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ مجھے آج ہی رات آپ کو ختم کرنا ہے اور پھر لالہ موسیٰ پہنچ کر خورسند اور اس کے بچے کی جان بھی لینی ہے۔ ان دونوں کاموں کے لیے، ہانا وانی نے مجھے بس آٹھ گھنٹے دیے ہیں۔‘‘

’’تمہارے ہاتھ کے انگوٹھے کو کیا ہوا ہے؟‘‘

’’لمبی کہانی ہے بھاؤ! پھر بتاؤں گا۔ اس وقت تو ایک ایک منٹ قیمتی ہے۔‘‘

’’تو کیا چاہتے ہو؟‘‘

میں نے موضوع پر آتے ہوئے کہا۔ ’’پچھلے دنوں آپ نے بتایا تھا کہ آپ نے اپنا ایک ’’ڈپلی کیٹ‘‘ ڈھونڈ رکھا ہے۔ بوقتِ ضرورت وہ آپ کا روپ دھار کر نقل و حرکت کرتا ہے۔‘‘

’’ہاں...... کرچن ہے۔ فرنیڈس نام ہے اُس کا...... لیکن تم اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟‘‘ بھاؤ کا لہجہ چونکا ہوا تھا۔

’’میں لمبی چوڑی تمہید نہیں باندھ سکتا بھاؤ...... میرا سوال یہ ہے کہ کیا ہم اس بندے کی قربانی دے سکتے ہیں؟‘‘

’’یہ کیسی بات کہہ رہے ہو تم؟‘‘ بھاؤ کے چوڑے چکلے چہرے پر سوچ اور تفکر کی گہری پرچھائیاں نظر آنے لگیں۔

’’بھاؤ! میں ایک مشکل ترین آزمائش سے گزر رہا ہوں...... اور میری وجہ سے آپ سب بھی۔ میں بہت شرمندہ ہوں لیکن اس صورتِ حال سے نکلنے کا کوئی راستہ میری سمجھ میں نہیں آرہا۔ فخر پوری طرح ہانا وانی کے قبضے میں جا چکا ہے۔ وہ اپنی دانست میں مجھے بھی اپنے شکنجے میں لے چکی ہے۔ وہ میرے ذریعے راوی فارم تک پہنچنا چاہ رہی تھی، میں نے اس سلسلے میں تو اسے چکما دے دیا ہے لیکن آج رات اس کا یہ دوسرا حکم مجھے ہر صورت پورا کرنا ہے۔ میرا دماغ تو بند ہو رہا ہے۔ اگر آپ کی سمجھ میں کوئی حل آرہا ہے تو مجھے بتائیں لیکن یہ یاد رکھیں بھاؤ! وہ بہت چوکس اور غیر معمولی طور پر عیار عورت ہے۔‘‘

داؤد بھاؤ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ ساری صورتِ حال کو بڑی اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ اس حوالے سے میرے اور اس کے درمیان دس پندرہ منٹ گفتگو ہوئی اور دیگر آپشنز پر بھی غور ہوا۔ اس گفتگو میں راوی فارم کی صورتِ حال پر بھی بات ہوئی۔ بھاؤ کی اس اطلاع پر میں... نے گوناگوں تسلی محسوس کی کہ میرے غائب ہو جانے کے بعد اس نے قسطینا، زینب، سجاول اور پہلوان وغیرہ کو فارم

ہاؤس سے نکال لیا ہے، اب وہ لاہور ہی کی ایک کوٹھی میں موجود ہیں۔ گفتگو کا رخ ایک بار پھر ہاتاوانی کی طرف مڑ گیا۔ یہ بات تو بھاؤ بہت اچھی طرح جان گیا تھا کہ میں نے ٹرانس میں آجانے کے حوالے سے ہاتاوانی کو چکما دے کر ایک بہت بڑا کام کیا ہے۔ اب میری یہ کامیابی ہم سب کو بہت سے شدید خطرات سے بچاسکتی ہے بلکہ ہاتاوانی کی موت کا راستہ بھی ہموار کرسکتی ہے۔ میں نے اپنے ہاتھ کے زخمی ہونے کا احوال بھی بھاؤ کے گوش گزار کردیا تھا۔ بھاؤ کو یہ سب کچھ بہت عجیب لگ رہا تھا۔ اس قسم کی سچویشن سے اس کا شاید ہی کبھی واسطہ پڑا ہو۔

ایک مرحلے پر وہ بولا۔ ''......شاہ زیب! تم فرنیڈس والی بات تو کررہے ہو مگر میرے ذہن میں دو باتیں آرہی ہیں۔ پہلی یہ کہ مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ دوسری یہ کہ......'' وہ کہتے کہتے چپ ہوگیا۔ چند سیکنڈ بعد خود ہی سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولا۔ ''وہ کوئی ہوبہو میرا ہم شکل تو نہیں ہے۔ بس یہ ہے کہ نقش ملتے ہیں اور ڈیل ڈول ملتا ہے۔ بالفرض اس کی لاش کسی چوراہے میں پڑی ملتی ہے تو بہت جلد، قانون نافذ کرنے والے اس نتیجے پر پہنچ جائیں گے کہ یہ داؤد نہیں ہے۔''

''اس کا ایک حل ہے میرے پاس...... میں وہ بھی آپ کو بتاتا ہوں لیکن پہلے آپ یہ فیصلہ کرلیں کہ یہ قربانی دے سکتے ہیں یا نہیں؟''

داؤد بھاؤ کا چہرہ چٹان کی طرح سخت تھا۔ تاثرات سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ میں نے کہا۔ ''بھاؤ! ہاتاوانی ایک آفت کی طرح یہاں نازل ہوئی ہے...... اگر ہم کسی طرح اس کی شیطانیت سے بچ کر اسے جہنم واصل کرسکیں تو یہ ہماری بہت بڑی کامیابی ہوگی۔''

داؤد بھاؤ نے اپنی چوڑی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا۔ ''شاہی! میں جانتا ہوں کہ کبھی کبھی کچھ فیصلے بے رحمی سے بھی کرنا پڑتے ہیں لیکن جس پر بے رحمی کی جارہی ہو، اس کا کوئی نمایاں قصور بھی تو ہو۔''

''بھاؤ، کبھی کبھی گناہ کہیں اور کیا جاتا ہے، سزا کہیں اور مل جاتی ہے۔ آپ نے ایک بار خود ہی تو بتایا تھا کہ اس فرنیڈس نے اپنے سوتیلے بھائی اس کی بیوی اور اس کی ماں کو گولیوں سے چھلنی کردیا تھا اور لاشیں جلا ڈالی تھیں۔''

بھاؤ کچھ دیر گم صم رہنے کے بعد بولا۔ ''شاہی! یہاں جتنے بھی ہیں وہ کوئی نہ کوئی جرم کرکے ہی تو پہنچے ہیں۔ اس لحاظ سے تو پھر میں بھی قتل کیے جانے کا حق دار ہوں۔''

بھاؤ کی بات میں وزن تھا۔ میں خاموش رہا۔ بھاؤ بھی خاموشی سے گلاس میں وہسکی انڈیلنے لگا۔ گھڑی کی سوئیاں حرکت میں تھیں۔ بھاؤ نے ایک دراز میں سے فرنیڈس نامی اس شخص کی تصویر نکالی۔ بھاؤ کی طرح وہ بھی خوب گورا چٹا تھا۔ شکل اور ڈیل ڈول بھی کافی حد تک ملتا تھا۔ بھاؤ نے کہا۔ ''اس چہرے کو دھوکے کے لیے تو استعمال کیا جاسکتا ہے...... لیکن اگر یہ شخص مرجاتا ہے اور پولیس والے یا دیگر لوگ اسے باریک بینی سے دیکھتے ہیں تو پھر اس کی شناخت کو میری شناخت سے الگ کرنا مشکل نہیں ہوگا۔''

میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''لیکن اس کا حل بھی تو ہوسکتا ہے بھاؤ۔ مشین پسٹل کا ایک بھرپور برسٹ اس کے چہرے کو کافی حد تک ''کیموفلاج'' کرسکتا ہے...... لیکن بات تو پھر وہیں آجاتی ہے...... آپ اس شخص کو کھونا چاہتے ہیں یا نہیں......''

اچانک کچھ آوازوں نے مجھے چونکا دیا۔ یہ کسی قریبی بند کمرے سے ابھری تھیں۔ میں ان چنگھاڑتی ہوئی مکروہ آوازوں کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ ان کا تعلق نیکساری گینگ کے شیطانی ٹولے سے تھا۔ ''یہ ''شیطانی ٹولا'' یوں تو ختم ہوچکا تھا لیکن ایک آدھ ابلیس زادہ اور ان کا باس جان ڈیرک ابھی باقی تھے۔ میں نے حیران نظروں سے بھاؤ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ کون ہے؟''

''وہی شیطان ہے، جسے تم پکڑ کر راوی فارم پر لائے تھے۔''

''لیکن...... یہ یہاں کیسے پہنچ گیا؟''

''ہمارے خدشات سے کہیں زیادہ خبیث نکلا یہ...... لاک اپ کے اندر زبردست ڈراما کیا اس نے...... رات دو بجے پہریدار نے دیکھا تو یہ لاش کی صورت پڑا تھا۔ ناک منہ سے خون نکل کر فرش پر پھیلا ہوا تھا۔ پہریدار بدحواسی میں اندر چلا گیا۔ اس نے اس کی گردن توڑ دی اور باہر نکل آیا۔ پہلے اس نے اسٹور میں گھس کر اندھا دھند شراب پی، پھر فارم کے بڑے کچن میں گھس گیا۔ وہاں ایک ملازمہ اپنے بچے کا فیڈر دھو رہی تھی۔ اس بدبخت نے اسے وہیں کچن کے فرش پر ریپ کیا اور اس بے ہوش کو ایک واش روم میں لاک کرکے گیراج میں گھس گیا۔ وہاں میری والی گاڑی بھی موجود تھی۔ پتا نہیں اس نے کس طرح اس کی ڈکی کھولی تھی...... حالانکہ اس میں سیکیورٹی الارم لگا ہوا تھا۔ یہ ڈکی میں گھس کر بیٹھ گیا۔ اسی رات چار بجے کے لگ بھگ مجھے لاہور واپس آنا تھا۔ میں یہاں پہنچا تو یہ باسٹرڈ بھی

گاڑی کی ڈکی میں موجود تھا......"

داؤد بھاؤ بات ختم کر کے میری طرف دیکھنے لگا۔ بھاؤ کی آنکھوں میں ہلکی سی کھسیاہٹ بھی دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے اسے افسوس ہو کہ وہ اتنا تجربہ کار ہونے کے باوجود اپنی کار میں کسی دشمن کی موجودگی سے بے خبر رہا۔

میں نے تاسف سے سر ہلایا۔ "بھاؤ! میں نے لودھی اور اس کے ماتحت گارڈز سے کہا بھی تھا کہ یہ ایک خونی جانور ہے۔ اس کے قریب جانے سے بھی پرہیز کریں لیکن...... خیر چلو...... جو ہونا تھا ہو گیا، وہ عورت بچ گئی؟"

"عورت بھی کیا لڑکی سی تھی...... اس کے حواس ٹھیک کام نہیں کر رہے...... اسپتال میں ایڈمٹ ہے۔ یہاں تم نے اوپر اسنوکر کلب میں ٹوٹ پھوٹ کے آثار دیکھے ہی ہوں گے؟" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ بھاؤ بولا۔ "یہ سب اسی حرام زادے کا کارنامہ ہے۔ ڈکی سے نکل کر یہ کلب میں گھس گیا۔ شکر ہے کہ کلب میں کھیلنے والے نہیں تھے۔ رات کے چار بجے تھے۔ اسنوکر کے ہال میں بس دو چار لائٹس ہی آن تھیں۔ یہاں ایک گاڑی کا ڈرائیور میز پر ہی کمبل اوڑھے سویا ہوا تھا۔ اس نے ڈرائیور کی جیب سے گاڑی کی چابی نکال لی۔ جانے سے پہلے وہ شیطانی پر آمادہ تھا۔ اس نے ہال کمرے میں سوئی گیس کے وہ کنکشن کھول دیے جو ہیٹرز وغیرہ کے لیے لگائے گئے تھے۔ حرامی یہاں آگ لگانا چاہتا تھا۔ خوش قسمتی ہماری کہ نیچے یہاں سی سی ٹی وی پر اسے دیکھ لیا گیا۔ گارڈز اوپر پہنچے اور انہوں نے اسے گھیر لیا۔ وہ آسانی سے پکڑا نہیں گیا۔ اچھا خاصا اودھم مچایا اس نے اور توڑ پھوڑ کی، دو گارڈز زخمی بھی ہوئے......"

بات کرتے کرتے اچانک داؤد رک گیا۔ میں نے اس کی عقابی آنکھوں میں تیز چمک ابھرتے دیکھی۔ اس نے ہونٹ سکیڑے اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا ہوا بھاؤ؟" میں نے پوچھا۔

بھاؤ نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔ اس نے کمرے کے اندر ہی چند قدم چہل قدمی کی پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "شاہی! ایک کام ہو سکتا ہے...... بالکل ہو سکتا ہے۔" اس کے لہجے میں سنسنی تھی۔

میں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بھاؤ اسی لہجے میں کہنے لگا۔ "ٹیکساری گینگ کا یہ گنجا قاتل قد کاٹھ میں میرے جیسا ہی ہے اور ایک زبردست اتفاق اور بھی ہے...... ہاں زبردست اتفاق ہے......" بھاؤ نے خود ہی اثبات میں سر ہلایا اور پھر میری جانب دیکھ کر بولا۔ "میری طرح اس کے سامنے کے دو دانت بھی نقلی ہیں۔ کسی چوٹ کی وجہ سے ٹوٹ گئے ہوں گے......"

"آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔ آپ کی بات پوری طرح میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

"لیکن میری سمجھ میں آ رہی ہے...... سمجھو کہ...... تمہارا کام ہو گیا، تقریباً ہو گیا۔"

بھاؤ نے مجھے ساتھ لیا اور تیزی سے اس کمرے میں پہنچا جہاں ٹیکساری کے اس شیطان زادے کو بڑی احتیاط سے مقفل کیا گیا تھا۔

☆☆☆

کم و بیش ایک گھنٹے بعد وہ پلان مکمل ہو چکا تھا جو بھاؤ نے میرے ساتھ مل کر بنایا تھا۔ ہم اسی کمرے میں تھے جہاں شیطان زادے کو مقفل کیا گیا تھا۔ وہ ہمارے سامنے تھا لیکن اس کی طرف سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں تھا کیونکہ وہ فرش پر بے ہوش پڑا تھا۔ اسے وہسکی میں تیز اثر والی بے ہوشی کی دوا پلائی گئی تھی۔ یہ کوئی پون گھنٹا پہلے کی بات تھی۔ اب شیطان زادے کے جسم پر داؤد بھاؤ کا لباس نظر آ رہا تھا۔ اس کے گلے میں پلاٹینم کی وہ موٹی زنجیر تھی جس میں تین چار قیمتی پتھر لگے ہوئے تھے۔ یہ بھاؤ کی پہچان تھی۔ بھاؤ کی تین قیمتی انگوٹھیاں بھی شیطان زادے کی انگلیوں میں دکھائی دے رہی تھیں۔ بھاؤ کی رسٹ واچ بھی اسے پہنائی جا چکی تھی۔ پروگرام کے مطابق شیطان زادے کو بھاؤ کی ہی ایک کیڈلک کار میں جل کر بھسم ہو جانا تھا۔ گاڑی میں چالیس پینتالیس لیٹر پیٹرول کے علاوہ وائٹ فاسفورس کی بھاری مقدار بھی رکھ دی گئی تھی۔ نہایت سرعت سے آگ پکڑنے والا یہ مادہ بڑا دھماکا تو پیدا نہیں کرتا مگر آگ کی شدت اور اس کا والیم بہت زیادہ ہوتا ہے۔

بھاؤ نے مجھے آخری ہدایات دیتے ہوئے کہا۔ "تم اپنی کورے گاڑی پر نکلو گے، کیڈلک کو میرا سینئر گارڈ مجید چلا کر لے جائے گا۔ ریموٹ کنٹرول بھی اسی کے پاس ہے۔ ہاؤسنگ سوسائٹی کی کسی خالی سڑک پر مجید کیڈلک کو ریموٹ کے ذریعے اڑا دے گا اور ریموٹ تمہیں دے دے گا تا کہ یہ ثبوت کے طور پر تمہارے پاس رہے۔"

"آپ کا کیا اندازہ ہے...... میرے منہ میں خاک...... آپ کی موت کی خبر کب تک آؤٹ ہو جائے گی۔"

"میرا نہیں خیال کہ اس میں آدھ گھنٹے سے زیادہ لگے گا۔ میری کیڈلک بڑی جلدی پہچان لی جائے گی۔ لاش تو

ظاہر ہے جل کر بھسم ہو جائے گی مگر دیگر نشانیاں بہت سے پولیس والوں کے لیے بھی جانی پہچانی ہیں۔'' بھاؤ کا اشارہ پلاٹینم کی چین اور رسٹ واچ وغیرہ کی طرف تھا۔

میں نے وال کلاک کی طرف دیکھا، رات کے گیارہ بجنے والے تھے...... اور ہاناوانی کی منشا کے مطابق ابھی مجھے لالہ موسیٰ بھی پہنچنا تھا، خورسند اور اس کے بچے ذیشان کے لیے موت کا ''تحفہ'' لے کر۔ میں اس بارے میں بھی بھاؤ کو سب کچھ بتا چکا تھا۔

میں نے فرش پر بے حس و حرکت پڑے ڈیتھ اسکواڈ کے اس آخری چشم و چراغ کی طرف دیکھا۔ بے ہوشی کی حالت میں بھی اس کے کلین شیوڈ چہرے پر لعنت برس رہی تھی۔ بدنام زمانہ مجرم ''ایول'' کے نطفے سے جنم لینے والی یہ قاتل مشینیں تھیں۔ مجسم بدی و شیطانیت...... وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑا تھا اور جانتا نہیں تھا کہ اسی حالت میں اپنے آخری سفر پر روانہ ہونے والا ہے۔

دس منٹ بعد میں کورے گاڑی میں کیڈلک کے پیچھے پیچھے ایک نیم آباد ہاؤسنگ سوسائٹی میں داخل ہو رہا تھا۔ کیڈلک کو بھاؤ کا مجید نامی سینئر گارڈ ڈرائیو کر رہا تھا۔ ایک قدرے ویران سڑک پر اس نے گاڑی روک دی۔ میں بھی گاڑی کے عقب میں تیس چالیس میٹر کے فاصلے پر رک گیا۔

مجید باہر نکلا اور میری گاڑی کی طرف آ گیا۔ محفوظ فاصلے پر پہنچ کر اس نے ریموٹ کنٹرول استعمال کیا۔ ایک دھماکا ہوا اور پلک جھپکتے میں کیڈلک آگ کا گولا بن گئی۔ شعلے تیس فٹ سے زیادہ بلندی تک پہنچ رہے تھے۔

مجید لپک کر میری گاڑی میں آ بیٹھا۔ ہم فراٹے کے ساتھ وہاں سے آگے بڑھ گئے۔ ہم نے ہاؤسنگ سوسائٹی کے سیکیورٹی گارڈز کو دیکھا جو ایک موٹر بائیک پر سوار تیزی سے آتش زدہ کیڈلک کی طرف لپک رہے تھے۔ چند ہی منٹوں میں یہاں کافی لوگ جمع ہونے والے تھے۔

مجید نے سفید رنگ کا ریموٹ کنٹرول مجھے تھما دیا اور بولا۔ ''شاہ زیب صاحب! ڈی این اے وغیرہ کا کیا بنے گا؟''

''ڈی این اے میچ کس سے کریں گے؟'' میں نے جواب دیا۔ ''تفتیش کرنے والوں کے پاس بھاؤ جی کا میچنگ سیمپل نہیں ہے اور نہ ملے گا۔''

مجید نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔

ہاؤسنگ سوسائٹی سے نکلنے کے بعد میں نے مقررہ جگہ پر مجید کو ڈراپ کر دیا اور پھر گاڑی کا رخ جی ٹی روڈ کی طرف

2019ء کے پہلے شمارے کی ایک جھلک
خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ
مزید
مرزا امجد بیگ کا دلنشیں انداز

مہرہ

معاشرے کے نفسیاتی مریضوں کا معصوم انسانوں پر ستم
آخری صفحات پر **اسما قادری** کا پُرفکر انداز

مہم جو

ماضی کے پوشیدہ گوشوں کی فسوں گری اور بند دریچوں میں پنہاں
راز و نیاز...... تاریخی صفحات پر **ابراھیم نجم** کے قلم کی روانی

رنگ آسماں

زہریلے سانپوں اور گہری چالوں پر مشتمل خوفناک اور عبرت ناک
واقعات کا سنگم...... **اے آر راجپوت** کے خیالات کی پرواز

وقت

خوشگوار مستقبل کی آس اور کربناک ماضی کی بھول بھلیوں میں گم شدہ
لمحات کا احاطہ کرتے وقت کی مکاریاں۔ **حسام بٹ** کے قلم کا جادو

اس کے علاوہ

تنویر ریاض۔ شاہ زین رضوان ثمر عباس۔ آصفہ ضیا احمد۔
ظفر اقبال ظفر اعتزاز سلیم وصلی کی خوبصورت کہانیاں

موڑ دیا۔ اب مجھے لاہور سے نکل کر لالہ موسیٰ کی طرف روانہ ہونا تھا۔

......ڈرائیونگ کے دوران ہی میں نے ہاناوانی کے خاص نمبر پر کال ملائی۔ پہلے گرے فورس کی کیپٹن لڑکی کی آواز آئی، پھر ہاناوانی لائن پر آ گئی۔ ”کیا بنا ایسٹرن؟“ اس نے بھاری بھر کم آواز میں پوچھا۔

”پہلا کام ہو گیا مادام ہاناوانی! داؤد کو اس کے کیے کی سزا مل گئی۔ وہ گاڑی میں جل مرا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں خبر آپ کو مل جائے گی۔“ میں نے دبے دبے جوش سے کہا۔

”بلاسٹ کیا ہے؟“

”ایسا ہی کچھ ہوا ہے جی۔“

”ڈرائیونگ کر رہے ہو تم؟“

”جی مادام! یہ جی ٹی روڈ کہلاتی ہے۔ مجھے سیدھا اسی قصبے میں لے جائے گی جہاں خورسنہ رہ رہی ہے۔“

”او کے...... میں دوسری اچھی خبر کا بھی انتظار کر رہی ہوں۔“

رسمی کلمات کے بعد اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

”کورے کار“ گوجرانوالہ کی طرف فرانے بھر رہی تھی۔ نومبر کی اس ٹھٹھری ہوئی شب میں اس مصروف شاہراہ پر معمول کا ٹریفک جاری تھا۔ یہی سڑک تھی جو آگے جا کر راولپنڈی اور اسلام آباد سے ملتی تھی۔ اسلام آباد جہاں تاجور رہتی تھی اور اس کا زہریلا خاوند رہتا تھا۔ وہ اس کا تمام تر زہریلا پن جھیل رہی تھی...... اور اس میں خوش تھی۔ پتا نہیں کیوں اب مجھے تاجور کے خیال سے ایک طرح کی اُلجھن ہونے لگتی تھی۔ میں سوچتا تھا کہ میں کیوں ”سوچتا“ ہوں اس کے بارے میں۔ اب میرے اور اس کے درمیان باقی رہ ہی کیا گیا ہے۔ اب آس کی ایسی کون سی ڈور ہے جس کو میں تھام کر بیٹھا رہوں۔ کار کے ریڈیو پر نغمہ گونج رہا تھا۔

اُڑتے اُڑتے آس کا پنچھی دور اُفق میں ڈوب گیا
روتے روتے بیٹھ گئی آواز کسی سودائی کی

میں نے ریڈیو بند کر کے خیالات کا رخ بدلا اور پھر اس شخص کے نمبر پر کال کی جس کو سجاول نے لالہ موسیٰ میں خورسنہ اور اس کے بچے ذیشان کی حفاظت کا ذمے دار بنا رکھا تھا۔ میرا مطلب فیض محمد سے ہے۔ کوٹلی والے ڈیرے پر قیام کے دوران میں، میں نے فیض محمد کو بڑی اچھی طرح پہچانا تھا۔ ادھیڑ عمری کے باوجود فیض محمد کی دانش مندی، ہمت اور ذمے داری میں کوئی شبہ نہیں تھا۔

میں نے دوسری بار اس کا نمبر پریس کیا تو اس نے کال ریسیو کر لی۔ ”ہیلو۔“ اس کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

”میں شاہ زیب بول رہا ہوں۔“

”میں نے پہچان لیا ہے، خیریت تو ہے؟“

”خیریت نہیں ہے۔“ میں نے اطمینان سے کہا۔ ”میں لاہور سے لالہ موسیٰ پہنچ رہا ہوں، بیگم خورسنہ اور بچے کو قتل کرنے کے لیے۔“

چند لمحے سناٹا رہا پھر فیض محمد کی لرزاں آواز سنائی دی۔ ”تم کیا کہہ رہے ہو شاہ زیب؟“

میں نے سنجیدہ لہجہ اختیار کیا۔ ”میری بات دھیان سے سنو فیض محمد...... تمہارے قریب کوئی اور تو موجود نہیں؟“

”نہیں، میں اکیلا ہوں۔“

”کہاں ہو؟“

”جہاں سردار نے ڈیوٹی لگا رکھی ہے۔ بیگم صاحبہ اور بچے کی حفاظت کی۔“ اس نے کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ”ہم نے بیگم صاحبہ کی رہائش کے ساتھ ہی دو گھر کرائے پر لے رکھے ہیں۔ ان کی چھتوں پر ہر وقت آٹھ دس ”ہتھیار بند“ بندے موجود رہتے ہیں۔ میں خود بیگم صاحبہ کے گھر کی چھت پر موجود رہتا ہوں، گھر کے بالکل سامنے جنرل اسٹور پر بھی اپنے ہی دو بندے ہوتے ہیں۔ چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی۔“

”لیکن اب بات چڑیا کی نہیں فیض محمد...... میں خود پر مارنے پہنچ رہا ہوں۔ تم یوں سمجھو کہ کسی نے میری ذمے داری لگائی ہے کہ میں آج رات خورسنہ اور اس کے بچے کو قتل کر دوں اور مجھے یہی ظاہر کرنا ہے کہ میں نے یہ ذمے داری پوری کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، وہ غور سے سن رہے ہو ناں؟“

فیض محمد نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں گوجرانوالہ کے پاس ہوں۔ دو گھنٹے تک پہنچ جاؤں گا۔ ان ڈیڑھ دو گھنٹوں میں تمہیں دو کام کرنے ہیں۔ پہلا یہ کہ ابھی اسی وقت بیگم خورسنہ اور ذیشان کو اس گھر سے نکال لو اور لالہ موسیٰ میں یا پھر کہیں بھی کسی محفوظ جگہ پر پہنچا دو۔ اس میں کوئی دشواری تو نہیں ہو گی؟“

”اگر یہ بہت ضروری ہے تو پھر میں کر لیتا ہوں۔“

”بہت بہت ضروری ہے اور یہ کام ابھی اسی وقت

UrduBooks.PK

بہت رازداری سے ہونا چاہیے۔ دوسرا کام یہ ہے کہ گھر کے آس پاس تم نے جو مسلح بندے بٹھا رکھے ہیں انہیں بھی فوراً وہاں سے ہٹالو، کرائے کے دونوں گھر خالی ہونے چاہئیں۔ خورسند والے گھر کو بھی لاک کردو۔“

فیض محمد نے سنسناتی ہوئی سی آواز میں پوچھا۔ ”یہ وہی کالے علم والی عورت کا معاملہ تو نہیں؟“

”سمجھو وہی ہے، لیکن اس وقت اتنی مہلت نہیں کہ اس بارے میں تفصیل سے بات کرسکیں۔ ہمیں جو کرنا ہے بہت جلدی میں کرنا ہے۔“

فیض محمد کو کچھ ضروری ہدایات دے کر میں نے سلسلہ منقطع کرنے کا ارادہ کیا لیکن ابھی لائن پر کچھ کھسر پھسر سنائی دی۔ فیض محمد اپنے کسی ساتھی سے بات کررہا تھا...... چند سیکنڈ بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوا اور بولا۔ ”شاہ زیب! ابھی ایک اور خبر پہنچی ہے مجھ تک...... شاید تم تک پہنچی ہے یا نہیں؟“

”کون سی خبر؟“

فیض محمد نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ ”ٹی وی پر داؤد بھاؤ کے بارے میں کچھ چل رہا ہے۔ کہا جارہا ہے کہ اسے قتل کردیا گیا ہے۔ اس کی گاڑی میں دھماکا ہوا ہے۔“

میں نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ”یہ تو واقعی بہت حیران کن ہے، اور کیا کہا جارہا ہے؟“

”میں نے خود تو کچھ نہیں سنا۔ یہ دیدار شاہ ہی بتارہا ہے۔ ابھی پوری طرح تصدیق تو نہیں ہوئی پر کہا یہی جارہا ہے کہ مرنے والا لاہور کا داؤد بھاؤ ہی ہے۔“

”یہ بہت بری اور بہت بڑی خبر ہے...... چلو جو کچھ بھی ہے تھوڑی دیر میں سچ جھوٹ کا پتا چل جائے گا۔“ چند لمحے توقف کرکے میں نے فیض محمد سے کہا۔ ”تم اپنی ساری توجہ میرے بتائے ہوئے کام پر رکھو فیض محمد...... ذہن میں رہے کہ ہمارے پاس زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے ہیں۔“

فیض محمد سے بات ختم کرنے کے بعد میں نے ریڈیو آن کیا اور داؤد والی نیوز تلاش کرنے کی کوشش کی...... لیکن ابھی یہ خبر شاید ریڈیو والوں تک نہیں پہنچی تھی۔ میں نے ریڈیو آف کردیا اور اپنے ذہن کو ایک بار پھر لالہ موسیٰ والے معاملے پر فوکس کیا۔ آج رات مجھے ہر صورت ہاناوانی کو مطمئن کرنا تھا۔ میں ایک مرحلے سے تو بخوبی گزر گیا تھا اب دوسرا مرحلہ درپیش تھا۔

میں سوچنے لگا کہ انسانی ذہن بھی کیا گورکھ دھندا ہے۔ ایک طرف اس میں تسلیم و رضا بھی ہے اور دوسری طرف ضد اور ہٹ دھرمی کے ایسے ایسے تماشے بھی دکھاتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اب یہ ہاناوانی والا معاملہ ہی دیکھا جاتا۔ ہاناوانی کو خورسند اور ذیشان کے ٹھکانے کا علم تھا۔ اگر وہ چاہتی تو خود بھی خورسند اور ذیشان پر حملے کی ایک کارگر کوشش کرسکتی تھی۔ اس کے پاس گرے فورس کے خطرناک نشانے باز اور خونخوار قاتل موجود تھے...... لیکن وہ قسم کھائے بیٹھی تھی کہ وہ ہمیں نہیں مارے گی، ہم خود ہی ایک دوسرے کو اپنے ہاتھوں سے اذیت ناک موت دیں گے۔ اب تک وہ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب تھی۔ تاہم آج رات جو کچھ ہورہا تھا، وہ اس کی سابقہ کامیابیوں سے بہت مختلف تھا۔ اس کے پیچھے ایک وجہ تھی۔ چند دن پہلے میرے انگوٹھے کی ٹوٹ جانے والی ہڈی نے میرے اندر اذیت کا ایک دریا بہایا تھا اور اس دریا نے ہاناوانی کے مسمریزم کو شکست دی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ وہ ابھی تک اس شکست سے بے خبر تھی۔

☆☆☆

لالہ موسیٰ پہنچنے سے آدھ گھنٹا پہلے میں نے فیض محمد کو دوبارہ فون کیا۔ اس نے فوراً ہی کال ریسیو کی اور مجھے بتایا کہ میری ہدایات پر عمل ہوچکا ہے۔ بیگم اور بچے کو رازداری کے ساتھ اس رہائش گاہ سے نکال لیا گیا ہے۔ اردگرد سے تمام بندے بھی ہٹائے جاچکے ہیں۔

میں نے فیض محمد سے کہا۔ ”میں پچیس تیس منٹ میں اس مکان پر پہنچ رہا ہوں جہاں خورسند اور بچہ رہائش رکھے ہوئے تھے۔ میں وہاں جو کچھ بھی کروں گا تم لوگوں نے اس سے بالکل لاتعلق رہنا ہے۔“

”کیا یہ سردار سجاول کا حکم ہے؟“

”تم اس وقت مجھے ہی سردار سمجھ لو تو تمہاری بہت مہربانی ہوگی۔“ میں نے خشک لہجے میں کہا۔

فیض محمد نے کہا۔ ”داؤد بھاؤ کے بارے میں بڑی خاص خبریں ہیں......“

میں نے کہا۔ ”ہاں، میں نے بھی سن لی ہیں۔ اس بارے میں پھر تبصرہ کرتے ہیں۔“

فیض سے بات ختم کرتے کرتے میں لالہ موسیٰ کی حدود میں داخل ہوچکا تھا۔ خوب صورت و خوش اخلاق لوگوں کا یہ بارونق قصبہ، رات کے اس آخری پہر خاموش اور غنودہ حالت میں تھا۔ بس کہیں کہیں، منہ اندھیرے کھل جانے والی ناشتے کی دکانوں پر ملازمین برتن وغیرہ دھوتے نظر آتے تھے یا دودھ فروشوں اور اخبار فروشوں کی نقل و حرکت دکھائی دیتی تھی۔ میں گنجان آبادی میں اترتا چلا گیا۔

وی کی آواز مسلسل میرے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ جلد ہی وہ خبر بھی میری سماعت سے ٹکرا گئی جس کا میں انتظار کر رہا تھا۔ یہ اہم خبر داؤد بھاؤ کی ''ناگہانی موت'' کے بارے میں تھی۔ فوٹیج میں بار بار ہاؤسنگ سوسائٹی کی وہ سڑک دکھائی جا رہی تھی جہاں جلی ہوئی کیڈلک کا ڈھانچا پڑا تھا۔

فیلڈ رپورٹر کہہ رہا تھا۔ ''علاقہ مکینوں کا بھی یہی کہنا ہے کہ انہیں کوئی بڑا دھماکا سنائی نہیں دیا ہے لیکن گاڑی کی حالت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں بدترین قسم کی آتشزدگی ہوئی ہے۔ غالباً گاڑی میں بڑی مقدار میں کوئی آتش گیر مادہ موجود تھا...... یا پھر رکھا گیا تھا۔ اسپتال ذرائع کے مطابق لاش کی حالت بھی بہت بری ہے۔ اس کے علاوہ......''

اسٹوڈیو میں بیٹھے نیوز کاسٹر نے رپورٹر کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔ ''اسپتال کے ذرائع شناخت کے بارے میں کیا کہتے ہیں، اس واقعے کو اب قریباً چھ گھنٹے گزر چکے ہیں۔ کیا لاش کو داؤد بھاؤ کی لاش کے طور پر شناخت کر لیا گیا ہے؟''

''بالکل جی، لاش کے ساتھ داؤد بھاؤ کی جو ذاتی اشیا موقع سے ملی ہیں، وہ ثابت کرتی ہیں کہ داؤد بھاؤ کو ان کی ذاتی گاڑی میں بلاسٹ کے ذریعے ہلاک کیا گیا ہے......''

''کیا اس واقعے کو کسی طرح کی گینگ وار کا حصہ سمجھا جائے؟'' نیوز کاسٹر نے پھلجھڑی چھوڑی۔

''شاید اس کے بارے میں کچھ کہنا ابھی قبل از وقت ہوجی مگر یہ تو حقیقت ہے کہ ہمارے اردگرد کچھ عرصے سے غیر معمولی اور حیران کن واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ پہلے لاہور میں جناب دارج صاحب کی قیام گاہ پر چمگادڑوں کا حملہ ہوا۔ ابھی اس واقعے کی بازگشت ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ دارج صاحب کے قافلے پر حملہ اور پھر ان کی گمشدگی کا واقعہ ہو گیا۔ بیگم یاسمین صاحبہ کی موت ایسا واقعہ ہے جس نے ابھی تک لوگوں کے دلوں کو دہلا رکھا ہے۔ اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ہمارے درمیان کچھ نہایت خطرناک غیر ملکی موجود ہیں جو حالات خراب کر رہے ہیں اور جن کے سبب کچھ محیر العقول واقعات سامنے آ رہے ہیں۔''

ابھی گفتگو جاری تھی کہ ڈھابے کے ملازم لڑکے نے چینل تبدیل کر دیا اور اسکرین پر یوسف خاں اور مصطفیٰ قریشی کے پنجابی للکارے سنائی دینے لگے۔ میرا دھیان اب قسطینا اور سجاول وغیرہ کی طرف جا رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ ان کو فون کر کے حال احوال دریافت کروں اور ان سے ان کی صحیح لوکیشن بھی معلوم کروں۔ لیکن پھر میں نے یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ ابھی میں ہاناوانی کے گھیرے میں تھا۔ اس بات کا خدشہ ختم نہیں ہوا تھا کہ وہ کسی وقت مجھے مغلوب کر لے۔ ایسے میں مجھے اپنے ساتھیوں کی لوکیشن کا علم ہونا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا۔ میں جس ڈھابے پر موجود تھا، وہ اس سڑک سے زیادہ دور نہیں تھا جو سیدھی سکھیرا گاؤں کو جاتی تھی۔ بمشکل بیس پچیس منٹ کا راستہ ہوگا۔ پتا نہیں کیوں دل میں آئی کہ یہاں سے گزرتے ہوئے سیف کے گھر والوں کا حال احوال دریافت کرنا چاہیے۔ تاجور نے بھی تو اپنی آخری خواہش یہی بتائی تھی کہ میں سیف کی بے آسرا بہنوں کا خیال رکھوں، اگر سیف کے اہلِ خانہ خوش ہوں گے تو وہ بھی جہاں ہوگی آسودگی محسوس کرتی رہے گی۔

میں نے ہاناوانی سے اجازت طلب کرنے کے لیے اسے فون کرنا چاہا مگر اس کے ملاکیشین پی اے نے بتایا کہ مدر مادام سونے کے لیے جا چکی ہیں۔ عام لوگوں کے لیے دن چڑھ رہا تھا اور شاید ہاناوانی کی رات شروع ہو رہی تھی۔ ہاناوانی سے تو رابطہ نہیں ہوا مگر میں سکھیرا گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ کچھ دیر بعد میں اسی سڑک پر تھا جہاں سے ایک دفعہ تاجور کے ساتھ موٹر سائیکل پر گزرا تھا۔ وہ ساری یادیں ذہن میں تازہ ہو گئیں۔ میں اردگرد کے کھیتوں، کھلیانوں کو محویت سے دیکھتا ہوا جلد ہی سکھیرا گاؤں کی حدود میں داخل ہو گیا۔ دن چڑھ چکا تھا مگر مطلع ابر آلود ہونے کی وجہ سے ابھی تک اندھیرا محسوس ہوتا تھا۔ کسی وقت ہلکی بوندا باندی بھی ہونے لگتی تھی۔ سکھیرا گاؤں کی گلیاں فی الحال سنسان ہی نظر آ رہی تھیں۔ پھر بھی احتیاطاً میں نے گرم چادر کو سر پر رکھ کر خواتین کے دوپٹے کی طرح لپیٹ لیا تھا۔ میری معلومات کے مطابق سیف کی بڑی بہن شازیہ کی شادی ہو چکی تھی اور اس کا شوہر اکبر آج کل ان کے گھر پر ہی رہ رہا تھا۔ مجھے امید تھی کہ میں اس نوبیاہتا، خوش و خرم جوڑے کو دیکھ سکوں گا۔ میں اس باغ کے قریب سے گزرا جہاں میں نے ایک دفعہ تاجور کو سہیلیوں کے ساتھ اداس موڈ میں بیٹھے دیکھا تھا۔ اس وقت آہیں، امیدیں شاید پوری طرح ٹوٹی نہیں تھیں پھر مجھے وہ احاطہ نظر آیا جہاں رنگ رنگیلے پنجابی گبرو سیف سے میرا پہلا ٹاکرا اور پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ دل رنج سے بھر گیا۔

دو منٹ بعد میں سیف کے گھر کے دروازے پر کھڑا

دستک دے رہا تھا۔ میری توقع کے عین مطابق دروازہ کھولنے والی سیف کی بہن شازیہ ہی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر اور پہچان کر دنگ رہ گئی۔ ”وقاص...... مم...... میرا مطلب ہے شاہ زیب بھائی آپ؟“ اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں پٹ پٹا کر کہا۔

”السلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام بھائی۔ مم...... مجھے یقین نہیں آرہا۔“

”اب یہیں کھڑے کھڑے سب کچھ پوچھو گی یا اندر آنے کے لیے بھی کہو گی۔“

وہ ذرا گڑبڑائی پھر بولی۔ ”آیئے ناں...... اندر آیئے ناں......“

میں اندر داخل ہوا اور اس نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ میں گاڑی کافی فاصلے پر درختوں کے بیچ کھڑی کر کے آیا تھا۔ تاکہ گاڑی دیکھ کر کسی کو شک نہ ہو۔

وہ مجھے کمرے میں لے آئی۔ دونوں چھوٹی بہنیں بھی جاگ گئیں اور میرے پاس آبیٹھیں...... وہ مجھے چہکتی ہوئی چڑیوں کی طرح لگتی تھیں اور انہیں دیکھ کر سینے میں مشفقانہ جذبات کی رو سی چلنے لگتی تھی۔ لیکن نجانے کیوں مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ان چڑیوں کی چہکار کہیں کھوئی ہوئی ہے۔ گھر کی حالت بھی کچھ زیادہ اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ حالانکہ میں نے پہلوان حشمت کے ذریعے خاصی بڑی رقم شازیہ کی شادی اور گھر کے اخراجات کے لیے بھجوائی تھی۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”شازیہ! اکبر کہاں ہے؟“

شازیہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر خاموش رہ گئی۔ اس کی جگہ منجھلی بہن نے کہا۔ ”بھائی جان...... جیجا اکبر گھر میں نہیں ہے...... وہ کافی دنوں سے نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟ کہیں کام سے گیا ہے؟“

وہ سوالیہ نظروں سے بڑی بہن شازیہ کی طرف دیکھنے لگی، پھر ذرا حوصلہ کر کے بولی۔ ”اکبر بھائی آج کل پتا نہیں کیا کرتا پھر رہا ہے۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ کوئی ایک مہینا پہلے گھر آیا تھا۔ تب بھی باجی سے جھگڑ کر گیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میں اپنے کاموں میں پھنسا ہوا ہوں اور ہم لوگوں کو اپنی ضرورتوں کے رونے پڑے رہتے ہیں......“

”پر وہ ہے کہاں؟“ میں نے اپنا اندرونی طیش دباتے ہوئے پوچھا۔

”لاہور کے پاس ہی کسی کے ساتھ مل کر کوئی کام شام کر رہا ہے۔“ منجھلی بہن نے جواب دیا۔

”کیا کام کر رہا ہے؟“ میں نے دریافت کیا۔

شازیہ نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے چھوٹی بہن کو مخاطب کیا اور اس سے کہا کہ وہ میرے لیے چائے وغیرہ بنائے۔

دونوں چھوٹی بہنیں باہر چلی گئیں۔ شازیہ کی ناک کی چونچ سرخ ہو رہی تھی اور اندازہ ہوتا تھا کہ وہ آنسو روکنے کی بھرپور کوشش کر رہی ہے۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”شازیہ! کیا بات ہے، مجھے بتاؤ، مجھے یہاں کے حالات زیادہ اچھے نہیں لگ رہے۔ کہاں ہے اکبر؟ وہ تو کہتا تھا کہ جیسے ہی اس کے پاس پیسے آئیں گے وہ اپنا کام شروع کر دے گا۔ مشینیں وغیرہ تو پہلے ہی اس نے لی ہوئی ہیں۔ اب معقول رقم بھی آگئی تھی کارخانہ چلانے کے لیے۔“

وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولی۔ ”کارخانے کا ہی سوچا تھا انہوں نے لیکن پھر پتا نہیں ایک دم کیا ہوا۔ ارادہ بدل دیا۔ کہنے لگے جو رقم شاہ زیب بھائی کی طرف سے ملی ہے، اس سے میں کوئی اور کام کروں گا۔ کوئی وکھری طرح کا کام۔ وہ کسی کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہ رہے تھے لاہور میں......“

بات کرتے کرتے اچانک شازیہ کو ابکائی آئی اور وہ منہ ڈھانپ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ اسے قے ہو رہی تھی۔ میں نے دیکھا ایک طرف تپائی کے شکستہ شیشے پر دو تین دوائیں پڑی تھیں۔ اندازہ ہوا کہ شازیہ پریگننٹ ہے۔

میں یہاں سیف کے اہلِ خانہ کو خوش وخرم دیکھنے کی امید لے کر آیا تھا مگر یہاں دکھ اور پریشانی کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔

کچھ دیر بعد دُھلے ہوئے چہرے اور جھکے ہوئے سر کے ساتھ شازیہ دوبارہ کمرے میں آگئی۔ وہ بڑی حد تک خوبرو سیف کی ہم شکل تھی مگر اس وقت مرجھایا ہوا پھول دکھائی دے رہی تھی۔ چھوٹی بہن اندر آئی اور چائے، بسکٹ، ابلے ہوئے انڈے وغیرہ رکھ کر خاموشی سے باہر چلی گئی۔ وہ بھی پہلے سے کافی کمزور نظر آتی تھی۔

میں نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ ”ہاں...... تو کیا نیا کام کرنا چاہ رہا تھا اکبر؟“

وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔ ”پتا نہیں کیا بات سمائی تھی اُن کے دماغ میں۔ بڑے بڑے پنجرے بنوا رہے تھے۔ کہہ رہے تھے، میں نے پرندے وغیرہ پالنے ہیں۔ رنگ دار طوطوں کی بات کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ ان کی کچھ نسلیں بڑی مہنگی ہوتی ہیں، بڑی قیمت پڑتی ہے ان کی۔

UrduBooks.pk

بندہ دنوں میں امیر ہو جاتا ہے……''

طوطوں کے ذکر نے مجھے چونکایا۔ میں کچھ حیران سا شازیہ کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ میرے تاثرات دیکھے بغیر اپنی ہی رو میں بولتی چلی گئی۔ اس نے بھیگے بھیگے لہجے میں اگلے چار پانچ منٹ میں جو کچھ بتایا، اس سے پتا چلا کہ اکبر شادی کے بعد دو تین ہفتے تک بڑا خوش رہا۔ وہ کام شروع کرنے کے سلسلے میں بڑا پُرجوش تھا۔ شازیہ کے تایا کے اصرار پر وہ یہیں اس گھر میں آ گیا تھا اور شازیہ کی چھوٹی بہنوں کا اپنی بہنوں کی طرح خیال رکھ رہا تھا لیکن پھر ایک دم ہی سب کچھ بدلا بدلا نظر آنے لگا۔ وہ کارخانے کا کچھ سامان لینے کے لیے لاہور گیا اور دو تین دن واپس نہیں آیا۔ واپس آ کر اس نے بتایا کہ اسے ایک پرانا دوست ملا ہے، وہ ٹولنٹن مارکیٹ میں پرندے بیچنے کا کام کر رہا ہے، وہ اس کے ساتھ مل کر بڑے پیمانے پر پرندے پالنا چاہتا ہے۔ اس کی بات کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ نہ ہی یہ پتا چل رہا تھا کہ وہ ایک دم اتنا اکھڑ مزاج اور غصیلا کیوں ہو گیا ہے۔ یوں لگتا تھا کہ ایک دم اس نے کسی طرح کا نشہ شروع کر دیا ہے۔ جو رقم پہلوان حشمت کے ذریعے شازیہ وغیرہ تک پہنچی تھی وہ سب اس کے پاس ہی تھی۔ ایک دن اس نے شازیہ کو بتایا کہ اس نے رقم نکلوالی ہے اور وہ لاہور جا رہا ہے…… تین چار روز میں واپس آ جائے گا…… مگر وہ واپس نہیں آیا۔ شازیہ کے تایا اور ایک ننھیالی عزیز نے اس کے پیچھے کافی بھاگ دوڑ کی تھی مگر اس کا کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ اب شازیہ کے سسرال والے سارا الزام شازیہ پر دھر رہے تھے۔ وہ اسے منحوس قرار دے رہے تھے۔ شازیہ اور اس کی بہنوں پر دہرا عذاب ٹوٹا ہوا تھا۔ دوسری طرف کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ اکبر نے چونکہ پسند کی شادی کی ہے اس لیے اس کے گھر والوں میں سے کسی نے اس پر تعویذ وغیرہ کر ڈالے ہیں……

میں نے شازیہ کی پوری رُوداد سنی۔ میرے ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی اور اس کی اصل وجہ یہی تھی کہ اس رُوداد میں پرندوں اور طوطوں کا ذکر آ رہا تھا…… یہ اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی کہ ہانا وانی ہر طرف وار کر رہی ہے…… کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اکبر بھی کسی طور اس کی زد میں آ چکا ہو۔

قسطینا کے ایک بار کہے ہوئے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ ''شاہ زیب! اس خبیث نے قسم کھا رکھی ہے کہ یہ اپنے بیٹے کے قاتلوں کو خود نہیں مارے گی…… وہ خود ایک دوسرے کو ماریں گے۔''

جب سے یہ پرندوں کے حملے شروع ہوئے تھے، میں نے کئی بار سوچا تھا کہ اگر یہ ہپناٹائزڈ پرندے ہم میں سے کسی کی جان لے لیں تو پھر ہانا وانی کا عہد کیا ہوگا؟ اس کی یہ شرط تو ادھوری رہ جائے گی کہ ہم سب خود ایک دوسرے کی جان لیں گے۔ لیکن اب جس نئی صورتِ حال کا اشارہ مل رہا تھا، اس سے یہ قیاس بھی کیا جا سکتا تھا کہ یہ پرندے بھی دراصل ہمارے ہی ہیں۔ ہمارے پیسوں سے خریدے گئے ہیں…… ان کا تعلق اکبر سے ہے…… اور اکبر ہم ہی میں سے ایک تھا۔

دفعتاً ایک آواز نے مجھے بُری طرح چونکایا۔ میں اس آواز کو بہ آسانی پہچان سکتا تھا، یہ تاجور کے چھوٹے بھائی اسفند کی آواز تھی۔ وہ ''آپی…… آپی'' کہہ کر بلا رہا تھا پھر اس کی آواز دروازے کے بالکل پاس سے آئی۔ وہ شازیہ کی چھوٹی بہن سے کہہ رہا تھا۔ ''آپی…… یہ چائے کی پتی۔ آپ نے ابھی منگوائی تھی ناں۔''

''اوہو، تم اتنی ٹھنڈ میں بھاگے ہوئے آئے ہو۔ وہ تو گزارا ہو گیا تھا۔'' شازیہ کی بہن نے جواب دیا۔

شازیہ نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''اسفند سے ملنا چاہیں گے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے مدھم آواز میں کہا۔ ''بلکہ دین محمد صاحب کے گھر میں کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے کہ میں یہاں آیا تھا۔'' میں نے تاکید کرنے والے انداز میں فقرہ مکمل کیا۔

شازیہ کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو چمکنے لگے۔ وہ بولی۔ ''چاچا دین محمد اور چاچی کا بہت بُرا حال ہے۔ ان کو لگتا ہے کہ انہوں نے تاجور کا بیاہ نہیں کیا بلکہ اس کو دیس نکالے کی سزا دے دی ہے۔ وہ بہت اُچے لوگ ہیں۔ اب ان کا اصلی روپ سامنے آ گیا ہے۔ باجی تاجور کا شوہر چاچا، چاچی کی بہت بے عزتی کرتا ہے۔ ایک دفعہ اس کے بڑے بھائی نے چاچے کو ٹھڈے تک مارے ہیں۔ وہ خود بیمار پڑا ہوا ہے لیکن پھر بھی اس کو ترس نہیں آتا، چاچا، چاچی کو باجی تاجور سے ملنے تک نہیں دیتا۔''

میں نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ''شازیہ! چاچے دین محمد نے یہ بلا خود ہی تو اپنے گلے ڈالی ہے۔ تمہیں یاد ہی ہوگا، تاجور کے ماموں مولوی حبیب اللہ سمیت ہم سب نے کتنا زور لگایا تھا کہ وہ تاجور کا ہاتھ اس بڑے شخص کے ہاتھ میں نہ دیں لیکن وہ اپنی مرضی کر کے رہے تھے۔''

''اب بہت پچھتا رہے ہیں وہ۔ ہر وقت روتے

رہتے ہیں۔ کچھ بیمار بھی ہیں۔ آپ کی بات بھی کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ حبیب اللہ کی طرح وہ بھی سچا تھا مگر میں نے اسے بے عزت کر کے گھر سے نکال دیا۔ اب وہ آپ سے بھی معافی مانگنا چاہتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "شازیہ! ابھی اُن سے ملنے کا وقت نہیں آیا لیکن میری بات یاد رکھنا، ابھی اس گاؤں میں کسی کو میری آمد کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلنا چاہیے۔"

شازیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ میرا زخمی ہاتھ گرم چادر کے نیچے تھا۔ چادر سرکی تو اس پر شازیہ کی نظر پڑ گئی۔ وہ متفکر نظر آنے لگی۔ "شاہ زیب بھائی! آپ کے ہاتھ کو کیا ہوا؟"

میں اُسے کیا بتاتا کہ کیا ہوا؟ اور اگر میں بتا بھی دیتا تو کیا وہ یقین کر لیتی؟ کیا کوئی بھی یقین کر لیتا۔ یہ اکیسویں صدی تھی، یہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا زمانہ تھا مگر یہاں میری آنکھوں کے سامنے ایسے واقعات رونما ہو رہے تھے جن پر یقین کرنا بہت مشکل تھا۔ میرا دھیان ایک بار پھر شازیہ کے دولھے اکبر اور اس کی معروفیات کی طرف چلا گیا۔ پرندوں والی بات نے میرے اندر ہلچل سی مچائی ہوئی تھی۔ میں اس حوالے سے کسی نتیجے تک پہنچنا چاہتا تھا۔ لاہور کے قریب مضافاتی علاقے میں بلند چھتوں والی جس عمارت کے اندر ہاناوانی فروکش تھی وہاں میں نے ایک دن رنگین طوطوں کی چہکاریں سنی تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا تھا کہ وہ طوطے اپنے اسی مستقر سے پرواز کر کے خونریز کارروائی کرتے ہیں۔ اگر ان طوطوں کا تعلق واقعی اکبر سے تھا تو پھر عین ممکن تھا کہ اکبر بھی وہیں کہیں موجود ہو۔

میں نے جیکٹ کی جیب سے ہزار ہزار والے آٹھ دس نوٹ نکالے اور سامنے تپائی پر رکھ دیے۔ "شازیہ! اس سے گھر کا خرچہ چلاؤ۔ بالکل بے فکر رہو۔ میں بڑی جلدی اکبر کا پتا چلاتا ہوں۔ تم دیکھنا چند روز میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ سسک پڑی۔ "نہیں بھائی! آپ نے پہلے ہی بہت کچھ کیا ہے، یہ تو ہماری قسمت کی خرابی ہے کہ......"

"بس اب چپ ہو جاؤ۔" میں نے اسے پیار سے ڈانٹا۔ "اگر میری جگہ سیف ہوتا تو کیا تم پھر بھی ایسی باتیں کرتیں؟"

تینوں بہنوں کو تسلی تشفی دے کر، میں جیسے خاموشی سے آیا تھا ویسے ہی واپس آگیا۔

☆☆☆

اب میں ایک بار پھر بلند و بالا چھتوں اور اونچے دروازوں والی اسی عمارت میں تھا جہاں ہاناوانی اپنی حشر سامانیوں کے ساتھ موجود تھی مگر وہ اس عمارت میں کہاں تھی؟ اس بارے میں ابھی تک کوئی اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔ وہ جیسے سات پردوں کے پیچھے چھپی رہتی تھی۔ شام سے ذرا پہلے ایک بار پھر پُراسرار روشنیوں والے اسی ہال میں میری طلبی ہوئی جہاں چھت پر بے شمار چمگادڑیں ایک طویل جھالر کی صورت میں لٹکی رہتی تھیں۔ سارا ماحول وہی تھا جو اس سے پہلے بھی میں کئی بار دیکھ چکا تھا۔ میرے ہاتھ بھی اسی طرح آئنی ہتھکڑی میں تھے جس طرح پہلے ہوتے تھے۔ وہ مجھے اپنے تئیں ٹرانس میں لے چکی تھی، اس کے باوجود میرے حوالے سے کوئی رسک لینے کو تیار نہیں تھی۔

میں ایک بار پھر اس کے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا اور وہ مجھے غنودگی کی حالت میں لا کر انجکشن دے رہی تھی۔ یہ ایک طرح سے میری تنویمی کیفیت کو "ری نیو" کرنے کا عمل تھا۔ اس عمل میں وہ پہلے جیسی شدت نہیں تھی جس میں ست رنگا بھنور میری نگاہوں کے سامنے آتا تھا اور اس کی ناقابلِ مزاحمت کشش مجھے اپنی طرف کھینچتی تھی۔

وہ پوچھ رہی تھی۔ "داؤد بھاؤ کو مارنے سے پہلے تم نے اس سے راوی فارم کا بھولا ہوا راستہ نہیں پوچھا؟"

"سوری مادام! اس منحوس کی شکل دیکھ کر میرے حواس مختل ہو گئے تھے۔ میرا دھیان اس طرف گیا ہی نہیں لیکن......"

"لیکن کیا؟"

"راوی فارم کا نقشہ کچھ کچھ میری نگاہوں کے سامنے ابھر رہا ہے۔ مجھے لگا ہے کہ...... شاید اگر ایک بار اور میں اس علاقے میں پہنچوں تو فارم کا راستہ ڈھونڈ لوں۔"

"اب اس کی ضرورت نہیں۔" ہاناوانی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "ہم نے اسنوکر کلب سے بھاؤ کے ایک کارندے کو پکڑا تھا، اس نے راوی فارم تک پہنچا دیا ہے لیکن وہاں جانے کا اب فائدہ نہیں، قسطینا اور سجاول سمیت سب لوگوں کو کہیں اور پہنچا دیا گیا ہے۔"

"یہ تو اچھا نہیں ہوا۔" میں نے ایک معمول کے غنودہ لہجے میں جواب دیا۔

"لیکن تمہیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے لیے ایک اور اچھی خبر ہے۔ تمہارا ایک اور مکار دشمن اس وقت تمہارے اردگرد پایا جا رہا ہے۔ یہ کمینگی اور ہٹ دھرمی میں اپنی مثال آپ ہے۔ تم اسے بہت اچھی

طرح جانتے ہو۔''

اس کے ساتھ ہی سامنے لگی اسکرین پر ایک تصویر ابھری۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔ یہ تاجور کے والد چوہدری دین محمد کی تصویر تھی۔ وہ سفید پگڑی باندھے ایک ٹریکٹر کے قریب کھڑے تھے۔ ہاناوانی بولی۔ ''یہی وہ شخص ہے ایسٹرن! جس نے تمہاری محبوبہ کو ہمیشہ کے لیے تم سے دور کیا۔ یہ تمہارے اور تاجور کے ملاپ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ دولت اور اثر رسوخ کے لالچ میں اس نے تاجور کو ایک ایسے شخص کے ہاتھوں میں سونپ دیا جو اسے زرخرید لونڈی جتنی اہمیت بھی نہیں دیتا۔ تمہاری تاجور کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اور جو کچھ آئندہ ہوگا، وہ اسی شخص کا سیاہ کارنامہ ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہی ایسٹرن؟''

''آپ...... ٹھیک کہہ رہی ہیں...... مادام۔'' میں نے اونگھتے ہوئے سے لہجے میں کہا۔

''اس بندے کو تو تمہاری ہٹ لسٹ میں سب سے اوپر ہونا چاہیے تھا۔ یہ باپ نہیں دشمن ہے...... بلکہ دشمن سے بھی بڑھ کر ایک سانپ...... جس نے اپنی ضد کا پھن پھیلایا اور تمہاری محبت کو ڈس لیا......'' وہ سحر انگیز لہجے میں بڑی روانی سے بولتی چلی جا رہی تھی۔ ایک بار پھر، برین واشنگ کا وہی عمل ہو رہا تھا جس سے میرا واسطہ پہلے بھی اس طلسمی ماحول میں پڑ چکا تھا۔ میں اسی طرح کا مغلوب اور مطیع ردِعمل ظاہر کر رہا تھا جس طرح کا ہاناوانی مجھ سے چاہتی تھی۔

میرے ہاتھ پشت پر آہنی ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے تھے اور میری دونوں جانب دو مسلح گارڈ موت کے فرشتوں کی طرح موجود تھے، ورنہ دل تو یہی چاہتا تھا کہ اسی جگہ اس عورت کے ٹکڑے کر دیے جائیں۔

پندرہ بیس منٹ بعد میں پھر اپنے لگژری کمرے میں تھا۔ وہ جب بھی مجھے تنویمی عمل سے گزارتی تھی، میں اس عمل کے بعد دو ڈھائی گھنٹے تک خود کو حالتِ غنودگی میں ہی ظاہر کرتا تھا۔

میں اپنے بستر پر چت لیٹا تھا۔ ہیجان خیز لباس میں ملبوس دراز قد شاروا اپنے نرم ہاتھوں سے میری پیشانی دبا رہی تھی۔ خود کو اس حسین بلا سے دور رکھنے کے لیے اب ایک کارگر بہانہ میرے ہاتھوں میں آ چکا تھا۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ ایک عرصہ شراب نوشی سے دور رہا ہوں لیکن اب خود کو دوبارہ اس شغل کے لیے مجبور پاتا ہوں۔ معمولات میں اس تبدیلی نے معدے میں کچھ اینٹھن پیدا کر رکھی ہے۔ رات کو یہ اینٹھن زیادہ ہو جاتی ہے جس کے لیے دوا لے رہا ہوں اور یہ بات کچھ ایسی غلط بھی نہیں تھی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اس جنس زدہ عورت سے دور رہنے کے لیے میں اس معاملے کو بڑھا چڑھا کر بیان کر رہا تھا۔

وہ اپنی لانبی انگلیوں سے میری پیشانی کا مساج کرتی رہی اور میرے کانوں میں اپنی جدید طرز کی چوڑیوں کی کھن کھناہٹ پہنچاتی رہی اور میں اس کی قربت اور اس کی چوڑیوں کی کھن کھناہٹ سے ہزاروں میل دور اپنے ہی خیالوں سے نبردآزما رہا۔ اب ہاناوانی مجھے ایک ایسی آزمائش میں ڈال رہی تھی جس سے گزرنا میرے لیے پل صراط پر چلنے سے زیادہ مشکل تھا۔ وہ مجھے ایک ایسے شخص کی جان لینے کے لیے کہہ رہی تھی جو تاجور کا والد تھا...... اس کے لیے محترم ترین ہستی...... اور یقیناً میرے لیے بھی چاچا دین محمد کی زندگی اور سلامتی کی بے حد اہمیت تھی۔ میں ایسا کیونکر کرسکتا تھا...... لیکن اگر نہ کرتا تو پھر وہ روپ عیاں ہوتا تھا جو میری زندگی اور میرے ساتھ بہت سی زندگیوں کا ضامن تھا۔ میں شدید ترین کشمکش سے دوچار تھا۔ بار بار یہ بات دل میں آ رہی تھی کہ کسی بہت بڑی مصیبت میں پڑنے سے پہلے پہلے میں کسی طرح اس عورت کا خاتمہ کر دوں۔

مگر کیسے؟

وہ میرے حوالے سے بے حد...... بے حد محتاط تھی۔

اگلے روز میں صبح سویرے اٹھا۔ میرے پہلو میں شاروا بے سدھ پڑی تھی۔ اسے اس کی بے ترتیب حالت میں چھوڑ کر میں نے سلیپر پہنے اور اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔ میرے کمرے سے باہر نکلنے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ میں دس پندرہ منٹ اس عمارت کی طویل راہداریوں میں گھومتا رہا اور اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا کہ ہاناوانی اس وسیع عمارت کے کس حصے میں پائی جاتی ہوگی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ مختلف جگہوں پر مجھے کوئی ایک درجن مسلح گارڈز ملے۔ یہ سب کے سب جاماجی اور نیوٹی کی گرے فورس کے خطرناک لوگ تھے۔

ایک جگہ گرے فورس کی کیپٹن فرزہ سے سامنا ہوگیا۔ اس نے کڑی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ایسٹرن! آپ کہاں گھوم رہے ہیں؟''

''جاننا چاہ رہا ہوں کہ قابلِ صد احترام مادام ہاناوانی اس عمارت میں کہاں قیام رکھتی ہیں؟''

''وہ یہاں نہیں ہوتیں۔ بس بوقتِ ضرورت تشریف لاتی ہیں۔'' کیپٹن نے ترت جواب دیا۔ ''کیا آپ کو کوئی مسئلہ درپیش ہے؟''

UrduBooks.pk

"مسئلہ یہی ہے کہ میں اُن کے آس پاس رہنا چاہتا ہوں۔"

"آپ اُن کے آس پاس ہی ہیں۔" کیپٹن نے جواب دیا۔ لہجے میں رکھائی تھی۔

وہ بالکل اٹینشن حالت میں کھڑی تھی۔ میں نے اس کے گال کو چھوتے ہوئے کہا۔ "آپ ذرا "ریلیکسڈ" ہو کر کھڑی ہوا کریں۔ اس طرح تھک جاتی ہوں گی۔"

اس کا چہرہ گل رنگ ہو گیا مگر اس نے جواب میں کوئی سخت لفظ نہیں کہا۔ "میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟" اس نے اسی طرح تن کر کھڑے، رسمی انداز میں پوچھا۔

"جو میں چاہتا ہوں وہ آپ کر نہیں سکتیں کیونکہ آپ اس وقت یونیفارم میں ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ آپ کے ساتھ کہیں بیٹھ کر لنچ کیا جائے۔"

اس نے آنکھوں کی پُتلیاں اوپر چڑھائیں۔ "لگتا ہے کہ آپ رات کو ٹھیک سے سو نہیں سکے اس لیے آپ کے دماغ کو خشکی چڑھ گئی ہے۔ ابھی ناشتے کا ٹائم بھی نہیں ہوا اور آپ لنچ کی بات کر رہے ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ جا کر اپنی نیند پوری کر لیں۔"

اس کے ساتھ ہی وہ ایڑیوں پر گھومی اور نیم روشن کوریڈور میں اوجھل ہو گئی۔ تاہم جاتے جاتے وہ ایک خوفناک گارڈ کو میری طرف سے چوکس رہنے کا اشارہ کر گئی تھی۔

پتا نہیں کیوں میری چھٹی حس گواہی دے رہی تھی کہ کیپٹن فرزہ شاید ٹھیک ہی کہہ رہی ہے، ہاناوانی اس عمارت میں موجود نہیں تھی۔ وہ بوقتِ ضرورت یہاں آتی تھی۔ میں بظاہر پُرسکون تھا اور خوشگوار موڈ میں دکھائی دے رہا تھا لیکن میرا دماغ گھڑدوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ ہاناوانی کہاں تھی؟ اسے کیسے ڈھونڈا جا سکتا تھا؟ کیسے جہنم واصل کیا جا سکتا تھا؟ وہ ہمیں بہت نقصان پہنچا چکی تھی اور ابھی پتا نہیں کتنا پہنچانے والی تھی۔

پھر میرا دھیان اپنے جانِ جگر فخر کی طرف چلا گیا۔ وہ بھی ہاناوانی کی بدنگاہی کا شکار ہو چکا تھا۔ وہ اس کے شکنجے میں تھا۔ اس نے جس طرح دوبدو مقابلے میں مجھ پر بے رحم حملے کیے تھے، وہ کوئی بھولنے والی بات نہیں تھی...... اور اس سے پہلے مجھے ہاناوانی کے جال تک لانے والا بھی تو وہی تھا۔ اب پتا نہیں وہ کس حال میں تھا؟ میرا دل اس کے لیے غم سے بھر گیا اور میں اس وسیع عمارت کی راہداریوں اور غلام گردشوں میں اس کی سن گن لینے لگا۔

ہاناوانی کی طرح فخر کا بھی مجھے یہاں کوئی کھوج نہیں ملا۔ کیا وہ بھی ہاناوانی کے ساتھ کہیں اور تھا؟ تب یکایک ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ یہ پرندوں کا وہی مدھم سا شور تھا جو ایک دن پہلے بھی مجھے سنائی دیا تھا۔ چوں چوں کی وہ بے شمار آوازیں جن کا تعلق میرے اندازے کے مطابق رنگین طوطوں سے تھا اور جو جمع ہو کر ایک ہلکے سے شور کی شکل اختیار کر جاتی تھیں۔ صبح کے ان اولین لمحات میں چونکہ ہر طرف سناٹا تھا اس لیے یہ شور زیادہ واضح تھا۔ ایک پہریدار کی نظر بچا کر میں ایک تنگ راہداری میں گھس گیا۔ یہاں بہت کم روشنی تھی اور کچھ گرد و غبار بھی تھا۔ لگتا تھا کہ یہ ایک متروک راستہ ہے۔ پرندوں کے شور کا تعاقب کرتا ہوا میں ایک ایسے گول کمرے میں پہنچا جہاں شور بالکل صاف سنائی دیتا تھا۔ تقریباً پندرہ فٹ کی بلندی پر یا شاید اس سے بھی زیادہ اونچا ایک ادھ کھلا روشن دان تھا جہاں سے یہ آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ ہلکی سی بُو بھی محسوس ہوتی تھی جو کبوتروں، طوطوں، مرغیوں سے وابستہ ہوتی ہے۔ میں نے گول کمرے کا دروازہ اندر سے لاک کیا اور زخمی ہاتھ کے باوجود کسی نہ کسی طرح روزن تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے بازوؤں کے زور پر خود کو اوپر اٹھا رکھا تھا اور ایک بڑے مستطیل کمرے میں جھانک رہا تھا۔ یہاں کے منظر نے میرے چودہ طبق روشن کر ڈالے۔ چھوٹے بڑے پنجروں کی کئی چار منزلہ قطاریں تھیں، ان میں رنگین پروں والے سیکڑوں طوطے بند تھے اور بلبوں کی روشنی میں پھدکتے دکھائی دیتے تھے۔ وہ خوب صورت تھے لیکن کسی نے انہیں بہت خوفناک بنا ڈالا تھا۔

پندرہ بیس درجن طوطے ہال کمرے کے فرش پر بھی دکھائی دیتے تھے لیکن وہ بالکل ساکت تھے۔ وہ اپنے پروں کو بھی بالکل حرکت نہیں دے رہے تھے، جیسے بیٹھے بیٹھے سو گئے ہوں۔ ان کے عین درمیان کوئی موجود تھا۔ وہ آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ دوسری جانب تھا۔ وہ بالکل برہنہ تھا...... وہ بھی بے حرکت تھا۔

کہیں یہ...... اکبری تو نہیں؟ میرے اندر کی حیرت میں سے ایک سوال ابھرا۔

مجھے اپنے اس سوال کے جواب کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ مجھے روزن سے اسی طرح لٹکے قریباً دو منٹ ہی ہوئے تھے جب بے حرکت طوطوں کے درمیان بیٹھے فرد کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اسے پہچاننے میں زیادہ دیر نہیں کی۔ وہ اکبری تھا۔ شازیہ کا

دولھا...... سیف کا بہنوئی۔

وہ بالکل برہنہ تھا۔ میں لرز کر رہ گیا۔ اس کی آنکھیں، اس کی آنکھیں ہی نہیں لگتی تھیں۔ اس کی آنکھیں ہلکی براؤن تھیں مگر اس وقت وہ اتنی سفید نظر آرہی تھیں جیسے ان آنکھوں میں سنگ مرمر کی پُتلیاں ”فٹ“ ہوں۔ اس کا چہرہ گہرا سرخ اور بے حد تمتمایا ہوا تھا۔ وہ ننگے سر ننگے پاؤں ایک بغلی دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کے اردگرد فرش پر موجود پرندے اس قدر ساکت وجامد تھے کہ دروازے کی طرف اپنا راستہ بنانے کے لیے اکبر نے اپنے پاؤں سے انہیں دائیں بائیں ہٹایا۔ وہ بے جان چیزوں کی طرح اِدھر اُدھر لڑھک گئے۔ اکبر بغلی دروازے میں اوجھل ہوگیا۔ فرش پر موجود پرندے اسی طرح پڑے رہے۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ جانوروں کو بھی ہپناٹائز کیا جاتا ہے اور اس کے لیے IMMOBILITY کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔

کیا یہاں بھی کوئی ایسی ہی پریکٹس جاری تھی؟

اس کا جواب ہاں میں تھا مگر اچنبھے کی بات یہ تھی کہ ان پرندوں کو ”ہاناوانی“ کسی عمل سے نہیں گزار رہی تھی...... بلکہ ان کا واسطہ اکبر سے پڑا ہوا تھا۔

تو کیا اکبر اس وقت ہاناوانی کے معاون کا کردار ادا کر رہا تھا؟

اس کا جواب بھی ”ہاں“ میں ہی محسوس ہوتا تھا۔ ابھی تو صرف قیاس ہی کیا جاسکتا تھا مگر لگتا یہی تھا کہ اکبر مکمل طور پر ہاناوانی کا شکار ہوچکا ہے۔ وہ اکبر پر اتنی حاوی ہوگئی تھی کہ اس کے ذریعے اپنے معمول کو آگے ٹرانسفر کر رہی تھی۔ اب یہ پرندے اس کی ”سجیشن“ اکبر کے ذریعے قبول کر رہے تھے۔

میں جس طرح روزن سے لٹکا ہوا تھا، وہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ میری کلائیاں اور کندھے شل ہونے شروع ہوگئے تھے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ فرش پر موجود بے سدھ پرندوں میں تھوڑی بہت حرکت نظر آنا شروع ہوگئی ہے۔ میں انہیں مزید دیکھنا چاہتا تھا لیکن نیچے اتر آنا زیادہ مناسب لگا۔ میں اتر آیا اور پھر گول کمرے کا دروازہ ان لاک کرکے واپس اپنے آرام دہ کمرے میں پہنچ گیا۔

ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ ہر گزرنے والی گھڑی کے ساتھ یہ بات ثابت ہو رہی تھی کہ ہاناوانی نے یہاں اپنے ہاتھ پاؤں پھیلا لیے ہیں...... اور وہ شدید نقصانات پہنچانے کے موڈ میں ہے۔ وہ ہمارے ہی ذریعے ہمیں ہمارے ہی خون میں ڈبونے کا ارادہ کیے ہوئے تھی۔ مگر اس کے ٹرانس میں تھا، اکبر اس کے ٹرانس میں تھا اور اس کے سمجھنے کی حد تک میں بھی اس کے ٹرانس میں تھا۔ اب مجھے ایک اور سنگین ترین امتحان درپیش تھا۔ وہ تاجور کے محترم والد دین محمد صاحب کا قتل میرے ذمے لگا چکی تھی۔

اکبر کا سراپا ایک بار پھر نگاہوں کے سامنے گھومنے لگا۔ خدا کی پناہ...... اس کی آنکھیں تو اس کی آنکھیں ہی نہیں تھیں۔ بالکل سفید، جن میں ہلکا سا موتیا رنگ دکھائی دیتا تھا۔ وہ جیسے کسی اور ہی دنیا کا باسی نظر آرہا تھا۔ ایک ایسی دنیا جہاں سے اس کا پلٹ آنا ناممکن محسوس ہوتا تھا۔

وہ بدقسمت کس طرح ہاناوانی کے جال میں پھنسا؟ یہ سوال بار بار ذہن کو چوکے لگا رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی تو ابھی مہندی بھی پھیکی نہیں پڑی تھی۔ وہ سکھیرا گاؤں جیسی الگ تھلگ جگہ پر رہائش پذیر تھا۔ اس کا تو مطلب تھا کہ سکھیرا گاؤں اور چاند گڑھی جیسی جگہیں بھی ہاناوانی کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں تھیں اور وہ وہاں موجود کرداروں پر پوری نظر رکھے ہوئے ہے۔ اکبر مشینوں کی خریداری کے لیے گوجرانوالہ اور لاہور گیا تھا...... اور یقیناً وہیں پر ہاناوانی کے ہتھے چڑھا تھا۔

☆☆☆

یہ بڑی دردناک رات تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ دل سینے میں پھٹ جائے گا۔ حالات نے ایک بہت بڑے امتحان سے دوچار کردیا تھا۔ مجھے ایک ایسے شخص کی جان لینے کے لیے روانہ کیا گیا تھا جس کو میں کانٹا چبھنے کی تکلیف بھی نہیں دے سکتا تھا۔ بے شک اس محترم شخص کی وجہ سے مجھے اپنی زندگی کا سب سے بڑا صدمہ جھیلنا پڑا تھا۔ تاجور مجھ سے جدا ہوئی تھی مگر جو کچھ بھی تھا، وہ اس کا باپ تھا۔

میں یہ سوچ رہا تھا کہ جو سیف کی موت کے سلسلے میں مجھے معاف نہیں کرسکی تھی، وہ اپنے باپ کو مار دینے کے جرم میں مجھے کیسے معاف کردے گی اور وہ صرف تاجور کا باپ ہی نہیں تھا، وہ کسی کا شوہر بھی تھا۔ وہ راحیل اور اسفند کے سر کا سایہ بھی تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ میں اس آزمائش سے کیسے نکل سکتا ہوں۔ کوئی ایسا طریقہ جس سے آج رات دین محمد صاحب کی جان بچ جائے اور ہاناوانی بھی میرے حوالے سے کسی شک میں مبتلا نہ ہو۔

میں اسی کورے گاڑی میں سوار تھا جس پر داؤد بھاؤ اور خورشید والے مشن پر نکلا تھا۔ دو دھاری خنجر کے علاوہ دونوں آتشیں ہتھیار بھی میرے لباس میں موجود تھے۔ میں

جی ٹی روڈ پر تقریباً آدھ گھنٹے کا سفر کر کے گوجرانوالہ کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ یہ رات کے گیارہ بجے کا وقت تھا۔ میں یہ بات اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ ہاناوانی کہیں بھی رکنے والی نہیں ہے۔ وہ انتقام میں جنونی ہو چکی تھی۔ بالفرض محال میں دین محمد صاحب کو مار بھی ڈالتا...... یا کسی طریقے سے دین محمد صاحب کے حوالے سے ہاناوانی کو مطمئن بھی کر دیتا تو وہ فوراً مجھے اگلے امتحان میں ڈال دیتی۔ مجھے نوے فیصد یقین تھا کہ وہ داؤد بھاؤ کا وہ دوسرا ٹھکانا بھی ڈھونڈ چکی ہے جہاں بھاؤ نے راوی فارم کے بعد قسطینا، زینب اور سجاول وغیرہ کو منتقل کیا تھا (اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو وہ تفتیشی حربے استعمال کرتی۔ داؤد بھاؤ کے خفیہ ٹھکانوں کے بارے میں پوچھ پوچھ کر میری کھوپڑی پلپلی کر دیتی۔ مجھے ان سے ٹیلی فونک رابطوں کا کہتی وغیرہ وغیرہ...... مگر وہ اس حوالے سے بالکل مطمئن دکھائی دیتی تھی)

دو دن پہلے میرا موبائل فون مجھ سے واپس لے لیا گیا تھا اور اب بھی میں موبائل فون کے بغیر ہی تھا مگر موبائل فون حاصل کرنا میرے لیے چنداں مشکل نہیں تھا۔ میں نے کاموکی سے سات آٹھ میل آگے سڑک کے کنارے ایک نسبتاً سنسان جگہ پر گاڑی روکی اور ایک راہ گیر سے موبائل چھین لیا۔ وہ کوئی غریب دکان دار ہی تھا۔ شور مچانے کی اس میں ہمت نہیں تھی کیونکہ وہ میرے ہاتھ میں پستول دیکھ چکا تھا۔ میں نے کہا۔ ”پریشان نہیں ہونا برادر۔ مجبوری ہے ورنہ یہ تکلیف تمہیں نہ دیتا۔“

تین چار ہزار والا موبائل تھا۔ میں نے ہزار کے چار نوٹ اس کی جرسی کی جیب میں گھسا دیے۔ وہ ہکا بکا دیکھتا رہ گیا۔ موبائل کی چارجنگ میں نے دیکھ لی تھی۔ بیلنس کے بارے میں پوچھا تو وہ گھگیائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”چار پانچ روپے کا ہوگا جی۔“

”شاباش، تم سے یہی امید تھی...... چلو اب نکل جاؤ یہاں سے اور پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا۔“ اس نے شدومد سے اثبات میں سر ہلایا اور نکل لیا۔

سامنے ہی ایک کھوکھا شاپ نظر آ رہی تھی۔ میں نے وہاں سے ”بیلنس“ لیا اور دوبارہ کار میں آ بیٹھا۔ ظاہر تھا کہ اس شخص نے سم بند کروائی بھی تو اتنی جلدی تو نہیں کروائے گا۔ ڈرائیونگ کے دوران میں ہی میں نے قسطینا کے نمبر پر ٹرائی کیا مگر نمبر بند جا رہا تھا۔ دوسری کوشش میں نے سجاول والے نمبر پر کی۔ یہاں بیل جانا شروع ہوئی لیکن کال ریسیو نہیں ہوئی۔ میں نے پھر کوشش کی۔ اس مرتبہ تیسری چوتھی بیل پر رابطہ ہو گیا۔ دوسری طرف سے جس کی آواز آئی۔ وہ سجاول نہیں پہلوان حشمت تھے۔ ”ہیلو...... کون بولت ہے؟“ پہلوان کی پاٹ دار آواز نے میرے کان میں ”رس گھولا۔“

”آپ کو کیا لگ رہا ہے، میں کون بول رہا ہوں؟“

”اوہو، شاہ زیب...... تم؟ اوئے یار! کہاں چلے گئے تھے تم؟ اتنا پریشان ہوا ہوں میں...... کہ کبھی زندگی میں نہیں ہوا۔ اوپر سے یہ داؤد بھاؤ کی موت والا صدمہ۔ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے ”مرے کو مارے الٹا کوتوال“ میرا تو جی چاہت تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں جنگل کی طرف نکل جاؤں۔ سچ کہوت ہوں اگر کمر پر چوٹ نہ لگی ہوتی تو میں نے کہیں نکل بھی جانا تھا......“ وہ مسلسل بولتے چلے گئے۔

میں نے انہیں بریک لگاتے ہوئے کہا۔ ”اب کیا حال ہے آپ کی کمر کا؟“

پہلوان جی نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر نئی کتھا شروع کر دی۔ ”بس مجھے تو لگت ہے کہ اپنے کیے کی سزا مل رہی ہے...... میں نے ایک اصلی نابینا پر نقلی اور جھوٹا ہونے کا شک کیا۔ اس کو تھپڑ مارے۔ اب میری یہ چوٹ ٹھیک ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی ہے۔“

”آپ نے کہا تھا کہ آپ اس سے معافی مانگ لیں گے۔“

”معافی تو مانگی ہے...... اور دس بار مانگی ہے مگر لگتا ہے کہ اس نے دل سے معاف ناہیں کیا۔ دوسرے سب بھی کہوت ہیں کہ میں نے ایک نابینا پر اس طرح کا ظلم کر کے اچھا ناہیں کیا۔ یہ بات بالکل ٹھیک ہے شاہ زیب! مگر میں بھی کیا کرتا۔ تم کو بھی پتا ہے اس طرح کے کیس عام طور پر ہووت ہیں۔ لوگ اندھے بن کر بھیک مانگت ہیں۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے نابیناؤں کا ایک بڑا کرکٹ ٹورنامنٹ ہوا تھا۔ اس میں شاید سری لنکا کی ٹیم کے دو بیٹسمین پوری طرح نابینا نہیں تھے۔ انہوں نے مار مار کر دوسری ٹیم کا بھرکس نکال دیا تھا...... ہاں، بھرکس سے مجھے یاد آیا کہ پریشان ہو کر ہم سب کے دماغوں کا بھی بھرکس نکلا ہوا ہے۔ بات تھی بھی پریشانی کی۔ تم غائب ہو گئے تھے۔ ہمیں ڈر تھا کہ تم بھی تو فخر کی طرح ہوائی چیزوں کے ہتھے نہیں چڑھ گئے۔ یہ ہوائی چیزیں بڑی نامعقول ہووت ہیں۔ کب کس پر کس طرح کا وار کر جائیں، کچھ پتا ناہیں چلتا۔ مجھے یقین ہے کہ داؤد بھاؤ کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اور لالہ موسیٰ میں سجاول کے گھر کو جو آگ لگی ہے، وہ ان ہوائی چیزوں کا ہی کالا

کارنامہ ہے۔ یہ چیزیں بہت کھوچل ہووت ہیں۔ بندے پر اس طرح وار کرت ہیں کہ بندے کی عقل کی چٹنی بن جاوت ہے۔ اب دیکھو مجھے جو چوٹ لگی ہے، ایسی جگہ لگی ہے کہ میں اپنے ہاتھ وہاں تک پہنچا ہی ناہیں سکتا۔ ورنہ مجھے مالش کرنے کے لیے ایسے ایسے طریقے آوت ہیں کہ ٹوٹی ہوئی ہڈی خود کہہ اٹھتی ہے...... ماشاء اللہ، ماشاء اللہ، اور خراجِ تسکین (تحسین) پیش کرتے ہوئے خود ہی جڑ بھی جاوت ہے۔“ وہ بے تکان بولتے چلے جارہے تھے۔

میں نے بڑی مشکلوں سے انہیں روکا اور پوچھا کہ سجاول اور قسطینا وغیرہ کہاں ہیں؟

پہلوان نے ہنس کر کہا۔ ”تم نے غلطی سے جس نمبر پر کال کی ہے یہ سجاول کا ہی ہے۔ میرا اپنا فون تو چارجنگ پر لگا ہوا ہے۔ دراصل یہاں مجھے اور سجاول صاحب کو ایک ہی کمرا ملا ہوا ہے۔ سجاول صاحب واش روم میں گیا ہے بس نکلتا ہی ہووے گا۔ اب تم بتاؤ کہاں، اور کس حال میں ہو۔ تمہاری باتوں سے تو یہی لگت ہے کہ ہوائی چیزوں کا اثر تم پر ناہیں ہے اور اللہ کرے نہ ہی ہو۔ مگر جب تک میں تم کو دیکھ ناہیں لوں گا یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بھوت پریت کا میناپن کوئی ڈھکی چھپی بات ناہیں۔ ان کے طریقہ واردات کا کچھ پتا ناہیں چلتا، بس ان کی اپنی ہی ایک دنیا ہے۔ وہ کیا مشہور شعر ہے اس طرح کا...... پرواز تو دونوں کی ہے اس ایک ہی آسماں پر...... شاہیں کا جہاں اور ہے ”گرگٹ“ کا جہاں اور۔ یہ ہوائی چیزیں گرگٹ ہی کی طرح سات رنگ بدل لیتی ہیں......“

میری کوئی نیکی کام آئی اور بولتے بولتے پہلوان کو ایک دم بریک لگ گئے، فرمایا۔ ”لو بھئی، سجاول صاحب سے پہلے مسز قسطینا آگئی...... ان سے بات کرو۔“

چند لمحے تک کھٹ پٹ کی آوازیں آئیں پھر فون پر قسطینا کی کھنکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو شاہ زائب! مجھے امید تھی کہ جلد ہی تمہارا فون آئے گا۔ یہ کس نمبر سے بات کررہے ہو؟“

”بس ہے کسی کا۔ آپ بتائیں، آپ کی طرف کیا صورتِ حال ہے؟“

”صورتِ حال کی فکر تو تمہارے حوالے سے زیادہ ہے۔“ اس نے شستہ انگلش میں کہا۔ بات کرتے کرتے وہ شاید کسی دوسرے کمرے میں چلی آئی تھی۔

میں نے کہا۔ ”داؤد بھاؤ کے بارے میں پتا چل گیا ہوگا؟“

”ہاں شاہ زائب! بے حد افسوس ہوا...... لیکن جتنا افسوس ہوا پھر اتنی ہی خوشی بھی ہوئی۔ اسی روز دوپہر کو داؤد بھاؤ کا فون آگیا۔“ وہ رازداری کے انداز میں بولی۔

”یعنی آپ کو پتا چل گیا ہے۔“

”داؤد بھاؤ نے ہی سب کچھ بتایا ہے لیکن یہ اطلاع صرف اور صرف مجھ تک ہی محدود ہے۔ حتیٰ کہ ابھی سجاول کو بھی کچھ پتا نہیں۔ داؤد کے اپنے قریبی ساتھی بھی لاعلم ہیں۔ وہ روپوش ہوچکا ہے۔“

”وہ اس صورتِ حال کو ہینڈل کرلے گا۔ جہاندیدہ اور ہوشیار شخص ہے۔“

”ہوشیاری تو تمہاری بھی کچھ کم نہیں، اگر واقعی ویسا ہے جیسا داؤد بھاؤ نے بتایا ہے تو پھر تم سپرمین ہو۔ اور تمہارا انگوٹھا ایک سپرمین کا انگوٹھا ہے۔ بظاہر سب کچھ ناقابلِ یقین لگتا ہے لیکن تم سے کچھ بھی بعید نہیں۔“ میں سمجھ گیا کہ قسطینا کس واقعے کی طرف اشارہ کررہی ہے۔ یقیناً یہ سب کچھ اسے بھاؤ سے ہی معلوم ہوا تھا۔

”لیکن اس وقت یہ سپرمین سخت مصیبت میں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اسے اپنا کردار نبھانے کے لیے سخت امتحان سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ فون پر زیادہ کچھ نہیں بتا سکتا، تھوڑے کہے کو بہت سمجھیں اور دعا کریں۔“

”فخر کے سلسلے میں بھی بہت پریشانی ہے۔“ قسطینا نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”ایسی ایک پریشانی تو آپ کی طرف بھی ہے۔ میرا مطلب فارس جان سے ہے۔ کچھ پتا چلایا نہیں؟“

”ابھی تک تو نہیں۔ امید پر دنیا قائم ہے۔“ وہ حوصلے سے بولی پھر ذرا توقف سے کہنے لگی۔ ”کیا تم ڈرائیونگ کررہے ہو؟“

”ہاں قسطینا! اس وقت آپ کو صرف خبردار کرنے کے لیے فون کیا ہے، مجھے لگتا ہے کہ باناوانی کو آپ کے اس دوسرے ٹھکانے کا علم بھی ہوچکا ہے۔ وہ کسی بھی وقت اس ٹھکانے پر حملہ آور ہوسکتی ہے۔ آپ، سجاول، پہلوان جی، زینب اور ولید وغیرہ اس کی ہٹ لسٹ میں ٹاپ پر ہیں۔“

”اس بات کا ہمیں بخوبی احساس ہے شاہ زائب! یہ جگہ بہت محفوظ ہے...... شاید راوی فارم سے بھی زیادہ محفوظ۔ یہاں بھاؤ نے حفاظت کا بھی بہت کڑا انتظام کیا ہے۔ پرندوں کے حوالے سے بھی یہاں سیکیورٹی موجود ہے۔ کھڑکیوں، روزنوں پر جالیاں لگائی گئی ہیں اور شاٹ گنز کا انتظام ہے۔“

میں نے قسطینا سے ان کے موجودہ ٹھکانے کے بارے میں نہیں پوچھا۔ اس نے بھی نہیں بتایا۔ وہ جانتی تھی کہ سیکیورٹی کے نقطۂ نظر سے اس بارے میں خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔

میں قسطینا کے بعد سجاول سے بھی تھوڑی سی بات کرنا چاہتا تھا مگر اچانک چارجنگ ختم ہو جانے سے سلسلۂ کلام منقطع ہو گیا۔ اب میں گوجرانوالہ سے آگے نکل چکا تھا۔ قرب وجوار میں ہلکی دھند اتر آئی تھی۔ یہ رات کے قریباً بارہ بجے کا عمل تھا۔ میں گاہے بگاہے اپنے عقب سے بھی باخبر رہنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس امر کا اندیشہ ذہن میں موجود رہتا تھا کہ کہیں ہاناوانی نے میری نگرانی کا انتظام نہ کر رکھا ہو۔ بہر حال ابھی تک یہ اندیشہ، اندیشہ ہی رہا تھا۔

دین محمد کے حوالے سے میں کیا کروں گا؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ اس سے پہلے میں فیض محمد کو فون کر کے خورشنہ اور اس کے بچے کو اپنی زد سے نکال چکا تھا۔ یہی حربہ دین محمد کی نسبت استعمال کیا جاتا تو ہاناوانی فوراً شک کا شکار ہو جاتی۔ (میرا اندازہ تھا کہ ایک دو باتیں اسے پہلے بھی میرے حوالے سے چونکا چکی ہیں)

ایک آپشن یہ بھی تھا کہ میں دین محمد صاحب کو کہیں غائب کر ڈالوں...... اور یہ ظاہر کروں کہ وہ مارے گئے ہیں لیکن پھر ”ڈیڈ باڈی“ کہاں سے فراہم ہوتی؟ کیا میں کسی غیر متعلق شخص کی جان لیتا اور اس کی لاش کو شیطان زادے کی لاش کی طرح مسخ کر ڈالتا؟ یہ بھی ممکن نہیں لگ رہا تھا۔ ایک آپشن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ دین محمد یا اُن کا کوئی ملازم ”کامیاب دفاع“ کرتا اور میں زخمی ہو کر پسپا ہو جاتا وغیرہ وغیرہ۔

میں کئی زاویوں سے سوچ رہا تھا مگر آج رات جو کچھ ہونے والا تھا، وہ بالکل مختلف اور ناقابلِ قیاس تھا۔ وہ میرے لیے زندگی کا ایک تلخ تجربہ بننے والا تھا۔

رات کے قریباً دو بجے تھے جب میں نے کورے گاڑی پہلے کی طرح گاؤں کے بالکل پاس درختوں کے جھنڈ میں کھڑی کی اور یخ بستہ تاریکی میں دیواروں کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا دین محمد صاحب کے گھر کے سامنے پہنچ گیا۔ کہیں دور سے چوکیدار کی سیٹی سنائی دی اور اس نے کسی پختہ دیوار سے لاٹھی ٹکرا کر زور سے آواز پیدا کی۔ آوارہ کتوں نے کچھ دیر شور مچایا اور پھر خاموشی چھا گئی۔

میں نے آٹھ فٹ اونچی بیرونی دیوار پھلانگی اور اندر کود گیا۔ دارج داراب سے تاجور کا رشتہ طے ہونے کے بعد اس گھر کو ایک اچھی بھلی جدید حویلی کی شکل دے دی گئی تھی۔ میری معلومات کے مطابق یہاں باقاعدہ گارڈز ہوا کرتے تھے مگر اب چونکہ سارے حالات ریورس ہو چکے تھے اس لیے اس کوٹھی نما حویلی پر بھی زوال آچکا تھا۔ نئے ماڈل کی شاندار کار کی جگہ کھٹیچر سی ایف ایکس سوزوکی یہاں کھڑی تھی۔

میں چابیوں کا ایک گچھا اور ایک ماسٹر کی بھی لے کر آیا تھا۔ تھوڑی سی کوشش سے میں اندرونی دروازہ کھولنے میں کامیاب ہوا اور اندر پہنچ گیا۔ لاؤنج نما کمرے کی لائٹ آن تھی۔ اردگرد کے کمروں میں اس لائٹ کے سبب ہلکی روشنی موجود تھی۔ ایک کمرے میں چچی اپنے دونوں بیٹوں راحیل اور اسفند کے ساتھ سوئی ہوئی تھی۔ میں نے ہولے سے اسفند کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دروازہ بند کر کے راہداری کی دوسری جانب اس کمرے میں چلا گیا جہاں دین محمد صاحب اپنے کمرے میں سو رہے تھے۔ انہوں نے پگڑی اتار کر میز پر رکھی ہوئی تھی۔ اسی میز پر ان کی کچھ دوائیں وغیرہ بھی پڑی تھیں۔ دواؤں والی اس میز کے پاس ہی حقہ بھی دھرا ہوا تھا۔ کمرے میں بس وہی ہلکی سی روشنی تھی جو لاؤنج کی لائٹ سے پیدا ہوتی تھی۔ کمرے کے پردوں کی بوسیدگی سے اس کوٹھی نما حویلی کے بدلے ہوئے حالات پر تھوڑی سی روشنی پڑتی تھی۔

میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے لاک کر دیا...... ابھی تک میں کسی فائنل نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے؟ میری نگاہیں اب تھوڑی روشنی میں بھی دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں۔ میں نے دھیان سے دین محمد صاحب کا چہرہ دیکھا۔ پھر جلدی سے ان کے پاس بیٹھ گیا اور ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ یہ ٹھٹھری ہوئی رات اپنے بطن میں ایک ہولناک اتفاق چھپائے ہوئے تھی اور یہ اتفاق میرے سامنے تھا...... دین محمد صاحب کی روح پرواز کر چکی تھی۔ وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔ میں نے ان کی کلائی اور گردن ٹٹول کر ان کی نبض ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کی اور پھر سر پکڑ کر بیٹھا رہ گیا۔

اگلے دو منٹ میں کسی ڈاکٹری معائنے کے بغیر ہی میں حتمی طور پر جان چکا تھا کہ دین محمد صاحب چل بسے ہیں۔ اندازہ یہی تھا کہ انہیں دل کا دورہ پڑا ہے۔ وہ جس انداز سے بیڈ پر پڑے تھے، پتا چلتا تھا کہ انہوں نے اٹھ کر میز کی طرف ہاتھ بڑھانے کی کوشش کی جہاں دوائیں پڑی تھیں لیکن ناکام ہوئے اور بیڈ کے بالکل دائیں کنارے پر کروٹ کے بل لیٹے رہ گئے۔

ایک بڑا...... بہت بڑا واقعہ رونما ہو چکا تھا، لیکن اس چھت کے نیچے رہنے والے باقی مکین بالکل بے خبر تھے۔ میں نے کھڑکیوں کے پردے اچھی طرح برابر کر دیے اور باتھ روم کی لائٹ آن کر کے دروازہ تھوڑا سا کھول دیا تا کہ کمرے میں

ہلکی روشنی رہے۔ میرا دماغ گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ سینے میں رنج تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک یہ سوچ بھی سر اٹھا رہی تھی کہ...... کیا میں موجودہ صورتِ حال کو کسی طور اپنے حق میں استعمال کر سکتا ہوں؟ یہ ایک سفاک اور انسانیت سوز سوچ تھی لیکن جن حالات نے مجھے گھیرا ہوا تھا وہ اس سے زیادہ سفاک اور انسانیت سوز تھے۔

میرے اندر سے ہی جیسے ایک خاموش آواز ابھری۔ ”تم ایسے بے رحم انداز میں کیسے سوچ سکتے ہو، یہ شخص جو تمہارے سامنے مرا پڑا ہے بالکل غیر بھی ہوتا تو اس حالت میں تمہارے لیے قابلِ احترام تھا لیکن یہ تو غیر بھی نہیں ہے۔ یہ تاجور کا باپ ہے، یہ اسفند اور راحیل کا باپ ہے۔ یہ چچی کا شوہر ہے......“

دوسری آواز نے کہا۔ ”لیکن یہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ جو کچھ تم سوچ رہے ہو، اس سے اسے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ ہاں اس سے دوسرے اور بہت سے لوگوں کا بھلا ہو جائے گا اور اس بھلے میں اس محترم شخص کے اپنے بھی شامل ہوں گے۔“

پہلی آواز نے کہا۔ ”ایک بار پھر سوچ لو شاہ زیب! تصور کرو جب یہ راز کھلے گا تو تاجور پر کیا گزرے گی۔ وہ قیامت تک اور قیامت کے بعد بھی تمہیں معاف نہیں کرے گی۔“

کچھ دیر تک یہ کشمکش جاری رہی پھر میں آخری فیصلے پر پہنچ گیا۔ یہاں سے میری واپسی کی پلاننگ مکمل تھی۔ میرے بریٹا پسٹل پر سائلنسر چڑھا ہوا تھا۔ میں نے دین محمد صاحب کی سرد پیشانی پر بوسہ دیا اور پھر دو تین فٹ کے فاصلے سے دو گولیاں ان کے سر اور ایک سینے میں اتار دی۔ ان کا بے جان جسم بیڈ پر تین بار اچھلا اور پھر پہلے کی طرح ساکت ہو گیا۔ میں نے تیزی کے ساتھ کمرا چھوڑ دیا۔

کمرے سے نکلنے اور گاڑی تک پہنچنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ سائلنسر لگے ہتھیار سے جو آواز آتی ہے وہ رات کے سناٹے میں کافی نمایاں ہوتی ہے۔ اس آواز کے بعد مجھے دین محمد صاحب کے گھر میں کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دی تھیں۔ عین ممکن تھا کہ اہلِ خانہ یا ملازمین میں سے کوئی جاگ گیا ہو۔ اب دین محمد صاحب کی موت کی خبر آناً فاناً پھیلنے والی تھی۔

میں جلد ہی گاڑی کو پختہ سڑک پر لے آیا۔ ہتھیار میں نے گاڑی کے اندر ہی ایک نہایت محفوظ خانے میں چھپا دیے تھے۔ دل و دماغ میں ہلچل تھی، حالات کی سنگینی اور مسلسل ٹینشن نے بالآخر دین محمد صاحب کی جان لے لی تھی۔ لگتا یہی تھا کہ انہیں دل کا دورہ پڑا ہے یا برین ہیمرج ہوا ہے مگر ان کی موت اب یقیناً قتل کا رنگ اختیار کرنے والی تھی۔ میں نے انہیں تین گولیاں ماری تھیں۔ یقینی بات تھی کہ زخموں سے کچھ نہ کچھ خون بھی رِسا ہوگا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کا معاملہ بعد کا تھا۔ عین ممکن تھا کہ رپورٹ میں موت کی اصل وجہ کا پتا چل جاتا اور یہ بھی ممکن تھا کہ نہ چلتا۔ دورہ پہلے پڑا ہے یا گولیاں پہلے لگی ہیں، اس کا تعین زیادہ آسان نہیں ہوتا۔ میں آج کے مشن کے حوالے سے ہاناوائی کی نگاہوں میں تقریباً سرخرو تھا۔ میں نے دین محمد صاحب کو ان کے گھر میں گھس کر ”قتل“ کر دیا تھا۔

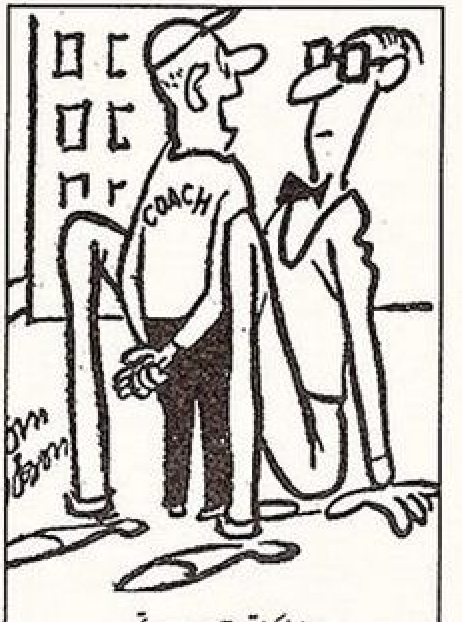

واہ! کیا قد و قامت ہے، تم
باسکٹ بال کیوں نہیں کھیلتے؟

دفعتاً میں بے طرح چونک گیا۔ مجھے اپنے عقب میں کچھ فاصلے پر پولیس کی موبائل گاڑی کی گھومتی ہوئی نیلی روشنی دکھائی دی۔ وہ تیزی سے نزدیک آرہی تھی۔ یہ خطرناک تھا۔ دین محمد کی لاش پر فائر کیے مجھے پچیس تیس منٹ ہی...... ہوئے تھے۔ اتنی جلدی پولیس کا حرکت میں آجانا قرین قیاس نہیں تھا...... مگر ناممکن بھی نہیں تھا۔ گشتی پولیس کو فون پر اطلاع ہو جائے تو وہ فوراً حرکت میں آجاتی ہے اور پھر مجھے علم ہوا کہ عقب میں آنے والی دو گاڑیاں ہیں۔ میرا اور ان کا درمیانی فاصلہ دو فرلانگ سے زیادہ تھا لیکن تیزی سے کم ہو رہا تھا۔

میری سمجھ میں اور تو کچھ نہیں آیا، میں نے کار کی ہیڈ لائٹس آف کر دیں اور یہی وقت تھا جب میری نگاہ کھیتوں کے درمیان بائیں جانب اونچے اور گھنے سرکنڈوں پر پڑی۔ ذہن میں آنے والے ایک تیز رفتار خیال کے تحت میں نے کورے کار کو پھرتی سے ان سرکنڈوں کی طرف موڑ دیا۔ ان کی بلندی بارہ تیرہ فٹ سے کم نہیں ہوگی۔ چھوٹے سائز کی کورے کار جیسے ان سرکنڈوں میں دفن ہو کر رہ گئی۔ تاریکی میں ہیڈ لائٹس کی حرکت سے اندازہ ہوتا تھا کہ دونوں گاڑیاں جو یقیناً پولیس ہی کی تھیں، تیزی سے قریب پہنچ رہی ہیں۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ وہ کہیں آس پاس رک جاتی ہیں، یا سیدھا آگے نکل جاتی ہیں۔ یہ ایک دو منٹ کا انتظار تھا لیکن بے حد کٹھن تھا۔ سینے میں دل شدت سے دھڑک رہا تھا اور پھر گاڑیاں سرکنڈوں کے عین سامنے پہنچ گئیں۔ دونوں پولیس کی پیٹرولنگ ڈبیکو تھیں۔ جب میں نے گاڑیوں کو وہیں پر رکتے دیکھا تو میرے اندیشے حقیقت کا روپ دھارنے لگے۔

ایک پولیس افسر کی بھاری بھرکم آواز ہوا کے دوش پر تیر کر مجھ تک پہنچی۔ ''اوئے یہاں ہی روک لو۔ کوندل سے بھی کچھ نکل آئے۔''

دوسرے شخص نے کہا۔ ''سر جی! نہر کا کنڈا ہے، ٹھنڈ بڑی لگتی ہے یہاں۔''

''اوئے ٹھنڈ کے پُتر، گرمی تو پھر تجھے تیری ووہٹی ہی دے سکتی ہے۔ ایسا کر کہ مہینے کی چھٹی لے لے، اس گرم انگیٹھی کی ڈیوٹی دیا کر رات دن۔''

تیسرے شخص نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''انسپکٹر صاحب کوئی لمبی سی تار ہونی چاہیے بجلی کی۔ ڈیڑھ دو فرلانگ ہو تو تھانے والا ہیٹر سیدھا اس نہر تک پہنچ جایا کرے۔''

کوئی بلند آواز میں ہنسا اور پھر دونوں گاڑیوں سے دس بارہ اہلکار نکل آئے۔ دو تین کے ہاتھوں میں ٹارچیں بھی تھیں۔

مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ یہ پولیس پارٹی میرے پیچھے نہیں لگ رہی تھی بلکہ یہ لوگ اس نہر کے کنارے پل کے سامنے ناکا لگانے پہنچے تھے۔ بہرحال اب تو جو ہونا تھا، ہو چکا تھا۔ یہ لوگ مجھ سے صرف تیس چالیس قدم کے فاصلے پر موجود تھے۔ اب کم از کم ان کے نکلنے تک تو میں یہاں سے نہیں نکل سکتا تھا۔ کئی دفعہ بندے سے اندازے کی غلطی ہو جاتی ہے جو ساری پلاننگ کو درہم برہم کر دیتی ہے۔

ان لوگوں نے نہر کے پل کے سامنے باقاعدہ ناکا لگا لیا۔ غالباً انسپکٹر اور سب انسپکٹر وغیرہ تو گاڑیوں میں بیٹھے رہے، ماتحت عملے نے سرد ہوا میں ڈیوٹی سنبھال لی۔ ایک شخص کی آواز آئی۔ ''حوالدار خوشی کہاں فوت ہو گیا ہے، اس سے کہو تھوڑی سی آگ ہی جلا لے، ٹھنڈ واقعی زیادہ ہے۔''

ان لوگوں کے طور اطوار سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ یہاں لمبا قیام کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ ایک خصوصی ناکا لگتا تھا۔ (سردی بھی معمول سے زیادہ تھی۔ میرے انگوٹھے میں ہلکا درد ہو رہا تھا)......

میرا یہ اندازہ اگلے ایک گھنٹے میں بالکل درست ثابت ہو گیا۔ یہ ایک خصوصی ناکا تھا...... اور اس کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی تھی۔ بیڈ روم میں دین محمد صاحب کو تین فائر لگنے کا معاملہ راز نہیں رہا تھا لیکن حیرت اور دلچسپی کی بات یہ تھی کہ اس واقعے کو ایک ڈیڑھ گھنٹا گزر جانے کے باوجود یہ پولیس پارٹی اب تک یہی سمجھ رہی تھی کہ چودھری دین محمد شدید زخمی ہیں...... اور اسپتال میں ان کی جان بچانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

گاہے بگاہے پولیس کی ایک گاڑی میں واکی ٹاکی کا شور بھی سنائی دیتا تھا اور پارٹی انچارج جس کا نام وحید شاہ تھا بلند آواز میں گفتگو کرتا تھا۔

اسی دوران میں ایک موٹر سائیکل سوار اہلکار موقع پر پہنچا اور اس نے وحید شاہ کو اطلاع دی۔ ''بُری خبر ہے جی، چودھری دین، اللہ بیلی ہو گیا ہے...... بلکہ ڈاکٹرز نے کہا ہے کہ وہ مرا ہوا ہی اسپتال آیا تھا۔''

سب انسپکٹر نے بیزاری سے کہا۔ ''جب سر وچ دو گولیاں وڑی ہوں تو بندہ مرا ہوا ہی اسپتال پہنچتا ہے۔''

وحید شاہ بلند آواز میں پکارا۔ ''چلو بھئی، سارے الرٹ ہو جاؤ اب...... اور خوشی محمد تو دو کانسٹیبل لے کر پل کی پرلی طرف چلا جا۔ آنکھیں اور کن کھلے رکھنے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ ڈی ایس پی صاحب بھی اب راؤنڈ لگانے والے ہوں گے۔''

اس پولیس پارٹی سے میرا فاصلہ بہت کم تھا، میں کورے گاڑی کے اندر بیٹھا تھا اگر مجھے کھانسی یا چھینک وغیرہ بھی آ جاتی تو یہ لوگ شک میں مبتلا ہو سکتے تھے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اب میں یہاں سے حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ سرکنڈوں میں احتیاط سے چل کر پیدل آگے جایا جا سکتا تھا مگر اس میں بھی خطرات تھے۔ میں نے گاڑی کے شیشے چڑھائے اور فی الوقت وہیں دبکے رہنا مناسب سمجھا۔ ایک لحاظ سے میرا یہاں رکنا شاید درست ہی ثابت ہوا تھا۔ یقینی بات تھی کہ علاقے میں اس طرح کی مزید چیکنگ بھی ہو رہی

ہوگی۔ میں کسی جگہ پھنس سکتا تھا۔

ناکے پر گاہے بگاہے کسی سائیکل یا موٹر سائیکل سوار کو روک لیا جاتا تھا اور شناختی کارڈ وغیرہ چیک کر کے دو چار سوالات کیے جاتے تھے۔ کچھ بے گناہوں کو گالیاں اور ایک ٹریکٹر سوار کو تھپڑ بھی پڑے۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ چودھری دین محمد کی موت کی خبر بڑی تیزی سے پھیل گئی ہے جو کچھ بھی تھا، اس علاقے میں چودھری دین محمد کی ایک اہمیت تھی۔ وہ داراب فیملی کے رشتے دار بن چکے تھے۔ پولیس کی ان ساری پھرتیوں کے پیچھے یقیناً یہ وجہ بھی تھی۔

اب رات کے چار بج چکے تھے۔ اس کے باوجود میں محسوس کر رہا تھا کہ سکھیر اگاؤں کو جانے والی اس سڑک پر آمدورفت ہو رہی ہے۔ عام حالات میں تو شاید رات کے اس پہر یہ سڑک سنسان ہی ہوتی مگر اب موٹر سائیکلز کے علاوہ چند گاڑیاں بھی نظر آئی تھیں۔ ان گاڑیوں کا رخ سکھیر اگاؤں کی طرف ہی تھا۔ ایک جیپ پر قریبی گاؤں ''وارث منڈی'' کا چودھری اور چودھرائن بھی سکھیر اگاؤں کے رخ پر جاتے دکھائی دیے۔ یقیناً یہ لوگ چودھری دین محمد کی اچانک موت کی خبر سن کر ہی جا رہے تھے۔

ڈیڑھ دو گھنٹے اسی طرح گزر گئے اور پھر رات کی تاریکی میں مدھم اجالے کی آمیزش ہونے لگی۔ میں اسی طرح کورے گاڑی میں بیٹھا تھا اور شیشے چڑھا رکھے تھے۔ مجھے امید تھی کہ اجالا پھیلتے ہی یہ ناکا ختم ہو جائے گا اور میں یہاں سے نکل سکوں گا۔

قریباً آدھ گھنٹا مزید گزرا۔ اب قرب و جوار کے مناظر نگاہوں کے سامنے اجاگر ہونا شروع ہو گئے تھے۔ بہرحال مجھے نیلگوں آسمان اور بلند و بالا سرکنڈوں کے سوا کچھ خاص دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں بہت احتیاط کے ساتھ گاڑی سے اتر آیا۔ چھینا ہوا موبائل فون میں نے آف کر رکھا تھا۔ بریٹا پسٹل گاڑی کے خفیہ خانے سے نکال کر جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا تھا۔ چند قدم آگے چلا تو سڑک کا ایک بالکل مختصر سا حصہ دکھائی دینے لگا۔ دو پرائیویٹ گاڑیاں رکی ہوئی تھیں۔

بڑی توند والے انسپکٹر وحید شاہ نے ایک گاڑی سوار سے پوچھا۔ ''ہاں جی، کتھے جانا ہے آپ نے؟''

گاڑی کی پچھلی نشست سے کسی نے بوجھل آواز میں کہا۔ ''میں مولوی حبیب اللہ ہوں......''

''اوہو سوری...... سوری جی۔ میں آپ کو دیکھ نہیں سکا۔ بہت افسوس ہوا ہے، جی بہت افسوس ہوا ہے۔'' وحید شاہ نے فدویانہ انداز میں کہا۔

پھر اپنے حوالدار سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اوئے خوشی محمد۔ چل ایک گڈی لے کر مولوی جی کے ساتھ جا۔ گاؤں کی حد تک چھوڑ کے آنا۔''

مولوی حبیب اللہ نے منع کیا مگر اس نے اصرار کے ساتھ ایک گاڑی ان کے ساتھ روانہ کر دی۔

مولوی صاحب کی آواز کافی دنوں بعد سنی تھی۔ تاہم شکل اب بھی نہیں دیکھ سکا تھا۔ وہ تاجور کے ماموں تھے اور تاجور کو داراب کے پنجۂ ستم سے بچانے کے لیے انہوں نے اپنی سی پوری کوشش کی تھی۔ میرے دل میں ان کا ایک مقام پیدا ہو گیا تھا۔ مولوی صاحب آگے بڑھ گئے۔ میں واپس کورے میں آن بیٹھا...... اور بغیر آواز پیدا کیے دروازے بند کر لیے۔ میرا یہ اندازہ درست نکلا کہ ناکا ختم ہونے والا ہے۔ مولوی حبیب اللہ صاحب کے جاتے ہی پولیس پارٹی نے بھی اپنا ڈیرا اٹھایا اور نہر کے ساتھ ساتھ کچے راستے پر شمال کی طرف نکل گئے۔

میرا تصور مجھے بہت سے تکلیف دہ منظر دکھا رہا تھا۔ چچی کی آہ و زاری اور سینہ کوبی، اسفند اور راحیل کا اپنے باپ کی موت پر دہاڑیں مار کر رونا، تاجور کی حالتِ زار اور بہت کچھ۔ میں نے ایک طویل ٹھنڈی سانس لی اور گاڑی اسٹارٹ کرنے اور سرکنڈوں سے نکلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ میری منزل پھر لاہور کے مضافات میں باناوانی کا ''آستانہ'' تھی۔

ابھی میں گاڑی اسٹارٹ کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ناگاہ میری نظر آسمان کی طرف اٹھ گئی۔ نیلا آسمان صاف نظر آ رہا تھا مگر اس آسمان پر جو کچھ دکھائی دیا، اس نے مجھے سرتاپا ہلا دیا۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا اور لرز گیا۔ یہ پرندے تھے...... یہ انہی رنگین پروں والے طوطوں کا جھنڈ تھا جو اس سے پہلے تین دفعہ موت بن کر لوگوں پر جھپٹ چکے تھے اور یہ کوئی چھوٹا جھنڈ نہیں تھا، اس میں سیکڑوں طوطے تھے۔

''یا اللہ خیر!'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اس کے ساتھ ہی میرے دل نے پھر گواہی دی کہ یہ کوئی عام جھنڈ نہیں ہے یہ وہی خاص جھنڈ ہے جو دہشت اور ہلاکت کی علامت بنا ہوا ہے۔

اس جھنڈ کا رخ سکھیر اگاؤں کی جانب ہی تھا اور ابھی چند منٹ پہلے مولوی حبیب اللہ بھی سکھیر اگاؤں کے رخ پر گئے تھے۔ کیا یہ جھنڈ مولوی حبیب اللہ کے تعاقب میں

یہاں پہنچا تھا؟ میری سمجھ میں اور تو کچھ نہیں آیا، میں نے کورے اسٹارٹ کی، اسے سرکنڈوں والی گیلی زمین سے نکالا اور حتی الامکان رفتار سے مولوی صاحب والی گاڑی کی طرف لپکا۔ یہاں سے سکھیرا گاؤں کا فاصلہ چودہ پندرہ میل سے کم نہیں تھا...... اور میرا اندازہ یہی تھا کہ مولوی صاحب والی دونوں گاڑیوں نے ابھی بمشکل تین چار میل کا فاصلہ طے کیا ہوگا۔ کورے میرا پورا ساتھ دے رہی تھی۔ سڑک میں کھڈے تھے، وہ دو دو فٹ فضا میں اچھل رہی تھی اور دوڑتی چلی جارہی تھی۔ ڈرائیونگ کے ساتھ ساتھ میں بار بار آسمان کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا......

پرندے مجھ سے کچھ آگے تھے، وہ تیز رفتاری سے پرواز کررہے تھے اور ان کی بلندی پہلے سے کچھ کم ہوگئی تھی۔ صبح کے دودھیا اجالے میں مجھے ان گاڑیوں کی دھول نظر آنا شروع ہوگئی جو مولوی صاحب کی گاڑی کے ساتھ ہاکے سے روانہ ہوئی تھیں۔ ان میں ایک گاڑی پولیس کی بھی تھی۔ یعنی یہ کل تین گاڑیاں تھیں۔ پرندوں کی بلندی کم ہوتے دیکھ کر میرے اندیشے بڑھ گئے، کہیں وہ جارحیت پر آمادہ تو نہیں ہورہے تھے۔

اگلے دس پندرہ سیکنڈ میں میرا یہ خوف بالکل درست ثابت ہوا۔ میں نے ان خونی پرندوں کو اچانک ان تینوں گاڑیوں پر حملہ آور ہوتے دیکھا۔ وہ شہد کی مشتعل مکھیوں کی طرح گاڑیوں پر جھپٹے تھے۔ مولوی حبیب صاحب والی سفید ٹویوٹا کار سب سے آگے تھی۔ میں نے اسے بُری طرح لہراتے اور پھر ایک درخت سے ٹکرا کر الٹتے دیکھا۔ پیچھے آنے والی کار بھی بُری طرح لہرا رہی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی بھی کوئی کھڑکی کھلی ہوئی ہے اور خونی طوطے اس کے اندر گھسنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ یہ گاڑی بُری طرح گھومی اور ایک کھیت میں جا گھسی۔

میں نے اپنی گاڑی کے شیشے اچھی طرح چڑھا لیے تھے۔ جب میں موقع پر پہنچا تو مجھے ایک دلدوز منظر نظر آیا۔ پولیس کی موبائل بھی رک چکی تھی۔ خوشی محمد نامی حوالدار اور اس کے دو کانسٹیبل جنونی طوطوں کی زد میں تھے۔ طوطوں نے ان کو تقریبا چھپا لیا تھا۔ تنومند حوالدار بُری طرح لوٹ پوٹ ہورہا تھا اور ساتھ ساتھ فائرنگ بھی کرتا چلا جارہا تھا مگر یہ بالکل بے سود فائرنگ تھی۔

وہ کانسٹیبل جسے وحید شاہ نے نوبیاہتا کہا تھا، زمین پر گر پڑا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے طوطوں کو نوچ نوچ کر پھینک رہا تھا لیکن جتنے وہ نوچتا تھا، اس سے دوگنا مزید آجاتے تھے۔ وہ چلّا رہا تھا۔ ''بچاؤ...... بچاؤ......'' اس کی پکار دردناک تھی۔

میں نے کھڑکی کا شیشہ تھوڑا سا نیچے اتارا اور مشین پسٹل کا بیرل باہر نکال دیا۔ میں نے انگلی ٹریگر پر رکھی ہوئی تھی مگر میں کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ یہ بے بسی سی بے بسی تھی...... زندگی میں شاید پہلی بار ایک ایسی سچویشن سے پالا پڑ رہا تھا جس میں میری ساری فائٹنگ اسپرٹ بے فائدہ تھی، آتشیں ہتھیار کسی کام کے تھے اور نہ مارشل آرٹ کی مہارت۔ یہ چھوٹے چھوٹے خوش رنگ طوطے میری نگاہوں کے عین سامنے تین چار افراد کی جان لے رہے تھے مگر میں دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتا تھا۔

مولوی حبیب صاحب کے ساتھیوں میں ایک باریش شخص دوڑتا ہوا میرے پاس سے گزرا۔ بیس پچیس طوطے اس سے بھی چمٹے ہوئے تھے۔ وہ اس کی آنکھوں پر حملہ آور تھے اور اس کی شہ رگ نوچ رہے تھے۔ قریب ہی ایک بارشی جوہڑ کی جھلک نظر آرہی تھی۔

میں نے اس شخص کو مخاطب کیا اور پکار کر کہا۔ ''سامنے پانی ہے، اس میں کود جاؤ۔''

اس نے میری آواز سنی اور اپنا رخ جوہڑ کی طرف کیا لیکن جوہڑ کے کنارے پر وہ گر پڑا۔ پھر اس سے اٹھا نہیں گیا۔ درجنوں مزید طوطے اس پر ٹوٹ پڑے۔ یہ قیامت صغریٰ کا منظر تھا۔ مولوی صاحب والی گاڑی تناور درخت سے ٹکرا کر پہلو کے بل الٹ گئی تھی۔ میں کورے کو چلا کر اس گاڑی کے بالکل پاس لے گیا۔ اس کی جو کھڑکیاں ٹوٹی تھیں، وہ زمین کی طرف تھیں۔ باقی کھڑکیاں سلامت تھیں۔ طوطے ان کھڑکیوں پر جھپٹ رہے تھے مگر اندر نہیں جاسکتے تھے۔ میں نے عقبی اسکرین کی طرف سے دیکھا۔ مجھے مولوی حبیب صاحب کا خونچکاں چہرہ نظر آیا۔ شدید تصادم کے سبب ان کی روشن پیشانی کا ایک حصہ زخمی اور پچکا ہوا نظر آتا تھا۔ گردن بھی عجیب انداز سے ایک سائڈ پر ڈھلکی ہوئی تھی۔ میرے سینے میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ تاجور کے غمگسار اور ہر دلعزیز ماموں اب زندہ نہیں ہیں۔ جنونی طوطے وزنی پتھروں کی طرح کورے گاڑی کی باڈی اور اس کے شیشوں سے ٹکرا رہے تھے......

خونریزی اور بربریت کے خلاف
صف آرا نوجوان کی کھلی جنگ
باقی واقعات آیندہ ماہ پڑھیے

دوہرا جرم

تسکین رضا

کوئی بھی... جرم کرتے وقت کسی کو مار دو تو وہ قتل خود بخود سنگین جرم بن جاتا ہے... اب جان بچانے کے لیے سرزد ہوئے جرم کی جو بھی توجیح پیش کی جائے... قانون کے محافظوں کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوتی... ایک ایسے ہی الجھے کیس کی تفتیش و تفصیل... جرم کی نوعیت سمجھ سے باہر تھی تو مجرم کا سراغ کیسے ملتا... مگر مجرم کہیں نہ کہیں اپنے جرم کا سراغ دے ہی جاتا ہے...

اس مجرم کی تلاش کا قصہ جو دوہرے جرم کا مرتکب تھا......

ٹیڈ مور چالیس فٹ کی بلندی پر چڑھ کر نیا وینائل سائن بورڈ لگا رہا تھا۔ اس نے کیبل کو ڈھیلا کیا اور پرانے سائن بورڈ کے چاروں کنارے کھولنے لگا پھر اس نے پہلی بار نیچے دیکھا کہ اگر وہ اس سائن بورڈ کو چھوڑ دے تو وہ کہاں جا کر گرے گا۔ چالیس فٹ نیچے اسے ایک قطار میں چھتیں، چمنیاں، کچرے کے ڈرم، ان سے باہر نکلا ہوا کچرا......”

اس نے فوراً ہی اپنا سیل فون نکال لیا اور سوچنے لگا کہ اسے فوری طور پر نو گیارہ کو اطلاع دینی چاہیے یا پہلے وہ

اونچائی سے لاش کی کچھ تصویریں لے لے۔

جب سراغ رساں سارجنٹ ڈونگر نے اپنی کار فیئرمونٹ مال کی عقبی گلی میں کھڑی کی تو اس سے پہلے ہی کورونرز آفس کا تحقیقاتی افسر وہاں پہنچ چکا تھا اور جائے وقوعہ کا معائنہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے لیپ ٹاپ میں ضروری معلومات ریکارڈ کر رہا تھا۔ جائے وقوعہ کے گرد زرد فیتہ لپیٹ دیا گیا تھا اور اس کے باہر کچھ راہ گیر متجسس نگاہوں سے ترپال میں لپٹی ہوئی لاش دیکھ رہے تھے۔

کورونرز آفس سے آئے ہوئے ٹم اسٹیمی نے رسمی انداز میں ڈونگر کا استقبال کیا اور اسے ایک پلاسٹک کی تھیلی پکڑا دی جس میں مرنے والے کا بٹوا، چابیاں اور سیل فون تھا۔

”آفیسر کیمرون کو ایک چوری کے سلسلے میں جانا پڑ گیا۔“ اس نے کہا۔ ”اس نے تمہارے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا ہے۔“

ڈونگر کے سبھی ساتھی جانتے تھے کہ پٹرول وومن بلو ڈوین کیمرون اسے پسند کرتی ہے جس سے ڈونگر کو خفت ہوتی تھی۔

”اور یہ کیا ہے؟“ ڈونگر نے پوچھا۔

”کیمرون نے اس شخص اسکپ ٹیڈ مور کا بیان لیا تھا جس نے لاش دریافت کی۔ وہ چالیس فٹ بلندی پر سائن بورڈ پوسٹر لگا رہا تھا۔“

اس بیان پر ایک نظر ڈالنے کے بعد ڈونگر نے مرنے والے کے پرس کا معائنہ کیا جس میں چوالیس ڈالر تھے۔ اس کی شناخت پہلے ہی کینٹ رولنگ کے نام سے ہو چکی تھی۔ عمر چھیالیس سال اور اس کی رہائش ویسٹ اپ کے مضافات میں تھی جہاں وہ ایک ہول سیل ٹائر ڈسٹری بیوشن میں سیلز ریپریزنٹیٹو تھا۔ اس کی بیوی سے علیحدگی ہو چکی تھی جو اس وقت کسی دوسری ریاست میں رہائش پذیر تھی۔ اس کے سینے میں اوپر کی جانب گولیوں کے دو نشان تھے اور اس کی قمیص کے سامنے والے حصے پر خون جم گیا تھا۔

”آلۂ قتل؟“

اسٹیمی نے صاف رومال سے اپنے ماتھے کا پسینا صاف کیا اور بولا۔ ”مجھے ابھی تک کوئی ہتھیار نہیں ملا۔ زخموں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس پر درمیانے بور کی ہینڈ گن سے انتہائی قریب سے فائر کیا گیا ہے۔ زمین پر کہیں بھی خون کا قطرہ نظر نہیں آیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے کسی اور جگہ گولی مار کر لاش یہاں پھینک دی گئی ہے۔“

”اسے مرے ہوئے کتنی دیر ہوئی؟“

”تقریباً آٹھ سے بارہ گھنٹے۔“

ڈونگر نے وہاں جمع ہونے والوں کو دیکھا۔ ”تم میں سے کوئی یہاں قریب میں رہتا ہے؟“ لیکن کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لگتا تھا کہ وہ اسکیموز سے مخاطب ہے۔

اس نے اپنی کار ایک بغلی سڑک پر کھڑی کی اور پارکنگ لاٹ کے قریب مکانوں پر دستک دینا شروع کی کیونکہ ان پرانے مکانوں کی گھنٹیاں عموماً کام نہیں کرتی تھیں۔ پہلے مکان سے ایک معمر شخص برآمد ہوا جس کے سر کے بال اور شیو بڑھی ہوئی تھی۔

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ میں نے کوئی غیر معمولی آواز سنی ہو۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ تیس سال پہلے جب یہ مال بننا شروع ہوا تب سے ہی مشکل میں ہیں۔ وہاں کی روشنیاں رات بھر جلتی ہیں۔ ہر دو تین منٹ بعد ایک کار ہارن بجاتی آتی ہے اور جیٹ جہاز کی طرح پارکنگ میں کھڑی ہو جاتی ہے۔ پوری فیملی ایک ساتھ اترتی ہے اور چاروں دروازے ایک ایک کر کے دھڑام سے بند ہوتے ہیں پھر ڈرائیور ریموٹ سے انہیں مقفل کرتا ہے اور جیسے ہی اس کار کے پاس سے کوئی گزرے تو ہارن بجنا شروع ہو جاتا ہے۔“ اس کے بعد ڈونگر نے جس سے بھی پوچھا، اس نے یہی شکایت کی۔

وہ اپنی کار میں واپس آیا اور رولنگ کے سیل میں موجود ڈیٹا دیکھنے لگا۔ بعض اوقات کسی سیل فون کی چھان پھٹک کرنے سے اس کے مالک کے بارے میں ذاتی معلومات، تعلقات اور رجحان کا پتا چل جاتا ہے لیکن رولنگ کا سیل فون پرانے ماڈل کا تھا اور اس میں اس کے کاروباری نوعیت کے پیغامات کے سوا کچھ نہیں ملا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بے کیف تنہا زندگی گزار رہا تھا یا وہ اتنا محتاط تھا کہ فوری طور پر ذاتی مواد صاف کر دیتا تھا۔

رولنگ کے مالک کو فون کے ذریعے اس کی موت کی اطلاع دی گئی۔ اس نے روایتی انداز میں اظہارِ افسوس کیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ وہ کوئی مثالی ملازم نہیں تھا اور بیماری کے بہانے اکثر چھٹی کر لیتا تھا۔ اس نے شبہ ظاہر کیا کہ شاید اس کی وجہ کثرتِ مے نوشی تھی۔ البتہ وہ یہ نہیں بتا سکا کہ رولنگ گزشتہ شب فیئرمونٹ مال کے علاقے میں کیا کر رہا تھا اور اسے قتل کیوں کیا گیا اگر اس کا محرک ڈکیتی نہیں تھی۔

”کیا تمہیں اس کی کار مل گئی؟“ گیرٹ گریوز نے

پوچھا۔

”ابھی صرف چابیاں ملی ہیں۔ کون سی کار تھی؟“

گریوز نے کار کے بارے میں معلومات اور رجسٹریشن نمبر بتادیا۔ ”دراصل یہ میری کار ہے جو میں نے کمپنی کو کرائے پر دے رکھی ہے۔ جب تمہیں کار مل جائے تو مجھے مطلع کر دینا۔ میں کسی کو بھیج کر منگالوں گا۔“

ڈولنگر نے پارکنگ لاٹ میں کھڑی ہوئی کاروں کے درمیان گھوم پھر کر دیکھا اور پانچ منٹ سے بھی کم وقت میں اسے رولنگ کی نئے ماڈل کی اسپورٹس کار مل گئی۔ کار کے دروازے مقفل تھے۔ ڈولنگر نے ہاتھوں پر دستانے چڑھائے اور رولنگ کی چابی کی مدد سے دروازہ کھولنے کے بعد اس کی اچھی طرح تلاشی لی لیکن پچھلی سیٹ کے فرش پر چار عدد اورنج ٹریفک کنٹرول کون اور ٹائروں کے کیٹلاگ سے بھرے ہوئے بکس کے علاوہ اسے کچھ نہ ملا۔

جب وہ پارکنگ لاٹ سے واپس آیا تو فارنسک لیبارٹری سے لیفٹیننٹ کیسٹرل بھی جائے وقوعہ پر پہنچ چکا تھا۔ ترپال کے نیچے ڈھکی ہوئی لاش کی پوزیشن بتا رہی تھی کہ کیسٹرل نے اپنے معمول کے مطابق لاش کی پچاس ساٹھ تصویریں لی ہیں اور اب وہ چہرے پر ماسک اور ہاتھوں پر دستانے چڑھائے ایک لوہے کے ڈرم میں پڑی ہوئی چیزوں کو چھانٹ رہا تھا۔ ان میں خالی ڈبے، سگریٹ کے پیکٹ، خالی کارٹن اور بارش میں بھیگے ہوئے اخبار شامل تھے۔

ڈولنگر نے دیکھا کہ اسٹیمی اپنی وین میں بیٹھا نوٹ پوسٹ کر رہا ہے اور ساتھ ہی کلاسیکل موسیقی کی ایک سی ڈی سن رہا ہے۔ اس نے اسٹیمی کو رولنگ کی کار کے بارے میں بتایا۔

”کار میں خون نہیں تھا؟“

”مجھے نظر نہیں آیا۔ کیسٹرل چاہے تو وہاں جا کر دیکھ سکتا ہے۔“

اسٹیمی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اسے ابھی ہیڈ کوارٹر سے فون موصول ہوا ہے کہ وہ یہاں کا کام ختم کر کے ایڈیسن پہنچے جہاں ایک چوری کی واردات ہوئی ہے۔ شاید وہ کار کے معائنے کے لیے کسی اور کو بھیجیں۔“

جب اسٹیمی لاش کو مردہ خانے لے جانے کا انتظام کر رہا ہے تو ڈولنگر نے سیکنڈ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر فون کر کے اب تک کی کارروائی کے بارے میں آگاہ کیا اور پھر لنچ کرنے چلا گیا۔ ابھی وہ فارغ نہیں ہوا تھا کہ اسے پٹرول وومن کیمرون کا فون موصول ہوا۔

”سارجنٹ! میں فیئر مونٹ مال سے مغرب میں تین بلاک دور ایڈیسن اسٹریٹ پر موجود ہوں۔ یہاں چوری کی واردات ہوئی ہے۔ گزشتہ شب ایک خالی مکان سے تانبے کا پائپ چوری ہوا ہے۔ لیفٹیننٹ کیسٹرل کا خیال ہے کہ تانبے کی چوری کے علاوہ اور بھی کچھ ہوا ہے۔“

”مثلاً کسی کا قتل؟“

”سارجنٹ تم بہت تیز ہو۔“

وہ مکان ایڈیسن اور ویلز کے کونے پر واقع تھا۔ ڈولنگر نے اپنی گاڑی کیمرون کی کروزر اور کیسٹرل کی وین کے سامنے پارک کی۔ مکان کا رنگ اڑ چکا تھا اور پورچ کی سیڑھیاں بھی ٹوٹی ہوئی تھیں۔ البتہ لان کی گھاس تازہ تازہ کاٹی گئی تھی۔ اس کے سامنے والے حصے پر برائے فروخت کا بورڈ لگا ہوا تھا۔

پورچ میں آفیسر کیمرون ایک سنہرے بالوں والی عورت سے باتیں کر رہی تھی۔ کیمرون نے اس کا تعارف ٹیمی لی ونٹر کے نام سے کروایا جو رئیل اسٹیٹ ایجنٹ تھی اور اس مکان کو فروخت کرنے کی ذمے داری اسے ہی سونپی گئی تھی۔

کیمرون نے کہا۔ ”یہاں آکر معلوم ہوا کہ چور صرف پائپ ہی نہیں بلکہ سینٹرل ائر کنڈیشننگ سے تانبے کی ٹیوب بھی کاٹ کر لے گیا ہے۔“

”جو پہلے سے ہی کام نہیں کر رہا۔“ مس ونٹر نے کہا۔ ”اس مکان کے فروخت نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔“

”کیا اس کا مالک کوئی مقامی ہے؟“ ڈولنگر نے پوچھا۔

”ٹیکساس کا ایک بینک اس کا مالک ہے۔ اس کے اصل مالک کی ملازمت ختم ہوگئی تھی۔ اور وہ... باقی قسطیں ادا نہیں کر پا رہا تھا۔ اس نے یہ مکان بینک کو واپس کر دیا اور انہوں نے اسے فروخت کرنے کی ذمے داری ہمیں سونپی ہے۔“

کیمرون نے ڈولنگر کو واردات کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ میٹ وینڈیک جسے مس ونٹر کی فرم نے لان اور مکان کی دیکھ بھال کے لیے رکھا تھا۔ وہ آج صبح لان کی گھاس کے کاٹنے کے لیے آیا۔ وہ اپنا کام تقریباً ختم کرنے والا تھا کہ اس نے دیکھا تہ خانے کی ایک کھڑکی ٹوٹی ہوئی ہے۔ تحقیق کرنے پر اس نے دیکھا کہ تہ خانے کی سیڑھیوں کا بیرونی دروازہ کھلا ہوا ہے اور تانبے کا تمام پائپ غائب

ہے۔"

مس ونٹر اور پبلک سیفٹی کو اطلاع دینے کے بعد وہ اپنے دوسرے کام پر چلا گیا لیکن دوپہر میں کسی وقت کھڑکی کی مرمت کرنے آئے گا۔"

"کیا کچھ اندازہ ہے کہ یہ واردات کس وقت ہوئی ہوگی؟"

"یہ کارروائی رات میں ہوئی ہے۔" مس ونٹر نے کہا۔ "کیونکہ میں کل سہ پہر میں ایک پارٹی کو مکان دکھانے لائی تھی۔ اس وقت تک سب کچھ ٹھیک تھا۔"

"قرب و جوار میں کسی نے کوئی آواز نہیں سنی۔" کیمرون نے کہا۔ "پڑوس میں رہنے والے میاں بیوی دونوں ہی اونچا سنتے ہیں۔"

"کیسٹرل نے اب تک کیا معلوم کیا؟"

"وہ مٹی، زنگ اور پھپھوندی کے نمونے لینے کے بعد تمہیں خود ہی وضاحت سے بتائے گا۔"

وہ ایک میٹر ریڈر کو اپنی جانب آتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ اس نے بیس قدم چل کر پانی کے میٹر کی ریڈنگ لینا چاہی پھر مایوسی سے سر ہلا دیا۔

"کیا ہم تمہاری کچھ مدد کر سکتے ہیں؟" ڈونگر نے پوچھا۔

"مجھے اس وقت سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ تم نہیں بتا سکتے۔" اس نے کلپ بورڈ دیکھتے ہوئے کہا۔ "میرے ریکارڈ کے مطابق تمہارا پانی بند ہو چکا ہے۔ میں شرطیہ کہتا ہوں کہ کسی نے تانبے کا پائپ نکال لیا ہے۔"

اس کے شناختی کارڈ پر ہیڈن ہیری ڈسٹرکٹ آپریشن منیجر لکھا ہوا تھا۔

"تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔" ڈونگر نے کہا۔ "وہ سارا پائپ لے گئے ہیں۔"

ہیری اپنا ہیلمٹ ٹھیک کرتے ہوئے بولا۔ "جب میں نے سڑک پر کروزر کھڑی دیکھی تبھی سمجھ گیا تھا کہ تم اسی لیے آئے ہو۔ اس خالی مکان کا پانی مئی سے بند ہے۔ کیا یہ مکان تمہارا ہے میڈم؟"

مس ونٹر نے رٹی رٹائی کہانی سنانا شروع کر دی۔ ہیری نے سنجیدگی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "تمہیں معلوم ہے کہ جیسے ہی یہ اطلاع ہمارے دفتر پہنچے گی وہ مجھے واٹر ڈپارٹمنٹ کی املاک کو پہنچنے والے نقصان کا تخمینہ لگانے کے لیے بھیجیں گے۔ کیوں نا میں یہ کام ابھی کر لوں؟"

"ٹھیک ہے لیکن ابھی شہادتیں جمع کرنے والا ٹیکنیشن یہاں کام کر رہا ہے۔"

"نہیں، وہ یہاں نہیں ہے، کیسٹرل لیونگ روم سے باہر آتے ہوئے بولا۔ وہ اپنی وین سے کوئی چیز لینے جا رہا تھا۔

"کیا یہ ممکن ہے کہ یہ میٹر ریڈر املاک کو پہنچنے والے نقصان کا تخمینہ لگا سکے؟"

"میں سمجھتا ہوں کہ اس میں کوئی ہرج نہیں۔" کیسٹرل اس میٹر ریڈر کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہاں سے کسی چیز کو ادھر ادھر نہ کرنا۔"

ہیری نے اپنا آلہ اور کلپ بورڈ پورچ میں چھوڑا، اور ڈونگر کے ساتھ عقبی صحن کی طرف چل دیا۔ یہ مکان اور گلی کے درمیان ایک خالی قطعہ تھا جہاں کسی زمانے میں گیراج ہوا کرتا تھا۔ وہاں انہیں سیڑھیوں پر ایک دروازہ نظر آیا جو نیچے تہ خانے میں جا رہی تھیں۔

پہلے تو تہ خانے کی خنکی سے انہیں تازگی محسوس ہوئی لیکن بعد میں انہیں وہاں کی مرطوب اور بدبودار فضا ناگوار گزرنے لگی۔ تہ خانے کی چھت میں لگے ہوئے بلبوں کی روشنی ناکافی تھی۔ اس لیے کیسٹرل نے بیٹری سے چلنے والا فلڈ لیمپ وہاں رکھ دیا تھا۔

ہیری نے اپنا ہیلمٹ اتارا، اور نپے تلے قدموں سے تہ خانے کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک مارچ کرتا رہا۔ اس نے ایک ایک کونا دیکھ لیا۔

"انہوں نے ایک انچ پائپ بھی نہیں چھوڑا۔ کیا تم پراپرٹی ایجنٹ ہو؟"

"پبلک سیفٹی۔" ڈونگر نے اپنا بیج دکھایا۔

"پھر تم مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہو گے۔ لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ ابھی بھی سوگز کے قریب ہیوی گیج کاپر الیکٹریکل موجود ہے جو سینٹرل ائرکنڈیشنر کے ڈرائر سے منسلک ہے، جب انہیں دوبارہ ضرورت ہوگی تو وہ اسے بھی لینے آئیں گے۔"

میٹر ریڈر اپنے کام میں لگ گیا۔ جب کیسٹرل کام ختم کر کے آیا تو ڈونگر تہ خانے کے عقب میں اس کھڑکی کا معائنہ کر رہا تھا جہاں سے چوروں نے اندر آنے کا راستہ بنایا۔ کھڑکی کے ایک پٹ پر بڑی مہارت سے پلاسٹک ٹیپ لگائی گئی تھی تاکہ چھناکے کی آواز سے ہونے والا شور دب جائے اور ٹوٹے ہوئے دروازے سے وہ کسی بوری پر چڑھ کر اندر داخل ہو سکیں۔ انہوں نے سیڑھیوں سے باہر جانے والے دروازے کی چٹخنی بھی کھول دی تھی تاکہ گلی میں کھڑے

www.PakDigest.Com

ہوئے ٹرک یا وین تک چوری کا سامان لے جانے میں آسانی ہو۔

”تمہیں کوئی خاص بات معلوم ہوئی؟“ ڈولنگر نے پوچھا۔

کیسٹرل نے فیتے سے فرش کے باہر نکلا ہوا پائپ ناپا اور بولا۔ ”انہوں نے ایک خراب کٹر سے پائپ کاٹا ہے۔ اور کٹر کو پائپ پر گھمانے کے بجائے اس طرح آگے پیچھے چلایا جیسے ڈائی سے چوڑیاں بناتے ہیں۔ اسی طرح وہ دوسری جگہ بھی کر چکے ہیں اور وہاں بھی انہوں نے کھڑکی پر لگانے کے لیے ایسا ہی ٹیپ استعمال کیا تھا۔“

”گویا تمہیں ان چوروں کے بارے میں ایک اور ثبوت مل گیا۔“

”ہاں، لیکن پہلے مجھے وہ پائپ تلاش کرنا ہے جو چوری ہوا ہے۔ اس کے بعد ان لوگوں تک پہنچنا ہے جنہوں نے یہ پائپ کاٹا ہے۔ میں اس پائپ کی تلاش میں روزانہ مقامی اسکریپ یارڈ کا چکر لگا سکتا ہوں۔ وہ اس طرح کا پائپ پلمبروں، ٹھیکے داروں، چھوٹی کمپنیوں اور چوروں سے لیتے ہیں۔“

”وینڈی کا کہنا ہے کہ تمہیں اس کے علاوہ بھی کچھ ملا ہے؟“

کیسٹرل نے فلڈ لیمپ کی روشنی باہر جانے والی سیڑھیوں کے نزدیک فرش پر لگے ہوئے وینائل ٹائل پر ڈالی۔ ”فرش کا یہ حصہ حال ہی میں رگڑ کر صاف کیا گیا ہے۔ مجھے ابھی تک کلورین بیچ کی بو آ رہی ہے۔ میں نے ٹائلوں کے درمیانی خلا سے مٹی کے جتنے بھی نمونے نکالے ان میں خون کی آمیزش نظر آ رہی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ یہ انسانی خون ہے اور کتنا پرانا ہے جب تک لیبارٹری سے اس کا ٹیسٹ نہ ہو جائے لیکن اس کی موجودگی سے ایسا لگتا ہے کہ یہاں سے فیئر مونٹ مال تک ایک سرخ لکیر جا رہی ہے۔“

”لیکن قاتل کون ہے اور پائپ کہاں گیا؟“

سراغ رساں لیفٹیننٹ سارس اوبرن نے اپنا سیل فون نکالا اور ڈولنگر کا نمبر ملاتے ہوئے کہا۔ ”کیا ہو رہا ہے؟“

”اس وقت میں اور لیفٹیننٹ کیسٹرل ایک خالی مکان میں ہیں جہاں سے تانبے کا پائپ چوری ہوا ہے اور اس واردات کا تعلق قتل سے بھی ہو سکتا ہے۔“

”تمہارے پاس کوئی شہادت ہے؟“

”ہم اس ٹیوب کٹر کی تلاش میں ہیں جس کے بارے میں کیسٹرل کا خیال ہے کہ جو پائپ چوری ہوا، وہ اسی سے کاٹا گیا تھا۔“

”سادہ سی بات ہے۔“

”اتنی سادہ بھی نہیں۔ یہ کٹر اس شخص کے ٹول باکس سے برآمد ہوا جو اس مکان کی دیکھ بھال اور لان کی صفائی کے لیے آتا ہے اور اسی نے نقب زنی کی اطلاع دی تھی۔ کیسٹرل کو اسی پر شبہ ہے لیکن......“

”تم قانون سے اچھی طرح واقف ہو۔ کیا تم دونوں میں سے کسی نے اس کا ٹول بکس کھول کر دیکھا کہ اس میں کیا تھا؟“

”نہیں، کیسٹرل اس وقت کھڑکی کی تصویریں لے رہا تھا جہاں سے چور اندر داخل ہوا۔ اسی وقت وہ شخص اپنے ٹرک میں سے کچھ اوزار نکال کر لایا اور باقی ماندہ کام شروع کر دیا۔“

”اگر کیسٹرل سمجھتا ہے کہ وہ اس چوری میں ملوث ہے تو تمہارے پاس اسے پکڑنے کی وجہ موجود ہے۔ یہ قتل والا کیا معاملہ ہے؟“

”بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے میں اسے پکڑ لوں۔ اگر اس نے ٹول بکس بند کر دیا تو وہ کٹر ہماری نظروں سے اوجھل ہو جائے گا۔“

وینڈیک نیا پٹ لگانے سے پہلے کھڑکی کی چوکھٹ صاف کر رہا تھا۔ اس نے غور ہی نہیں کیا کہ کب اس نے ٹول بکس سے کٹر نکالا اور اسے فرش سے نکلے ہوئے پائپ پر رکھ کر اس کا زاویہ دیکھنے لگا۔

ڈولنگر نے کاریگر سے کہا۔ ”کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ پائپ کٹر تمہارے ٹول بکس میں کیسے آیا جس سے اس پائپ کو کاٹا گیا ہے؟“

وینڈیک نے آستین سے اپنا پسینا پونچھا اور بولا۔ ”بالکل بتا سکتا ہوں۔ جب میں صبح یہاں آیا تو یہ کٹر فرش پر پڑا ہوا تھا اور سارا پائپ غائب تھا۔“

”اور تم نے اسے قبضے میں لے لیا۔“

وینڈیک نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، مجھ سے یہ غلطی ہوئی۔“

”حیرت ہے کہ تم نے یہ بات پہلے نہیں بتائی جبکہ تمہیں یہ سوچنا چاہیے تھا کہ اس کے ذریعے ہمیں چوروں کو شناخت کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔“

”تم سوچ رہے ہو کہ میں نے پائپ چرایا ہے۔ مجھے کھڑکی کے راستے اندر آنے کی کیا ضرورت تھی جبکہ میرے

UrduBooks

پاس مکان کی چابیاں ہیں۔"

"ہم تمہارے ٹرک کی تلاشی لینا چاہیں گے۔"

وینڈ یک ناراض ہوتے ہوئے بولا۔ "کیا اس کے لیے تمہیں کسی وارنٹ کی ضرورت نہیں۔"

"جب تک یہ ٹرک مکان کے سامنے کھڑا ہوا ہے۔ اس وقت تک یہ بھی جائے وقوعہ کا حصہ ہے اور اس کا معائنہ کرنا ہمارے ساتھ ساتھ تمہارے حق میں بھی بہتر ہوگا تاکہ کسی ثبوت کے ہونے یا نہ ہونے کی تصدیق ہوجائے۔"

"ٹھیک ہے تم اپنی تسلی کرلو۔ تمہیں ٹرک میں کچھ نہیں ملے گا۔" یہ کہہ کر وینڈ یک نے جیب سے چابیاں نکال کر ڈولنگر کے حوالے کردیں۔ انہوں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ وہ چوری سے کہیں زیادہ سنگین جرم کا ثبوت تلاش کررہے ہیں۔

وینڈ یک کا ٹرک ویلز کے کونے پر کھڑا ہوا تھا۔ اس میں ایک گھاس کاٹنے کی مشین، فائبر گلاس کی سیڑھی اور عمارت کی مرمت میں استعمال ہونے والا متفرق سامان تھا۔ انہیں وہاں سے تانبے کے پائپ کا ایک ٹکڑا بھی نہیں ملا لیکن کارگو والے حصے کے فرش پر براؤن دھبوں کو ٹیسٹ کرنے سے موقع پر ہی معلوم ہوگیا کہ وہ خون تھا۔

ڈولنگر اور کیمرون واپس تہ خانے میں آئے جہاں وینڈ یک کام ختم کرنے کے بعد صفائی میں مصروف تھا۔ انہوں نے اسے حقائق سے آگاہ کیا۔

"تمہارے پاس اس مکان کی چابی ہے۔" ڈولنگر نے کہا۔ "تمہارے قبضے سے وہ اوزار برآمد ہوا جو غالباً پائپ کی چوری میں استعمال ہوا تھا۔ یہاں سے تین بلاک کے فاصلے پر ایک آدمی کی لاش ملی ہے جسے گولی مار کر ہلاک کیا گیا۔ یہاں اور تمہارے ٹرک میں خون کے نشانات دیکھے گئے ہیں۔ یہ خونی لکیروں کا ایک باریک جال ہے اور تم اس میں بالکل فٹ نظر آرہے ہو۔ اب میں تمہارے حقوق پڑھ کر سنا رہا ہوں۔ اس وقت تم خاموش رہوگے۔"

یہ کہنے کے بعد اس نے پائپ چوری کرنے اور قتل کے شبہے کے الزام میں وینڈ یک کو گرفتار کرنے کی کارروائی شروع کردی۔ جس وقت ڈولنگر اور کیمرون اپنی کارروائی کررہے تھے تو کیسٹرل لان میں خون کے دھبے اور گلی میں ٹائروں کے نشان تلاش کررہا تھا۔

جیسے ہی وینڈ یک کو سیکنڈ ڈسٹرکٹ ہیڈکوارٹر لایا گیا۔ اس کے چند منٹ بعد ہی اس نے ایک معروف وکیل پیٹر کی خدمات حاصل کرلیں جو بڑے سے بڑے مجرموں کو رہا کروانے میں شہرت رکھتا تھا۔ جب ڈولنگر کو اس کی آمد کی اطلاع ملی تو اس نے ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر وہ کیس اوبرن کے حوالے کردیا۔ انہوں نے پندرہ منٹ میں شواہد کا جائزہ لیا پھر انہوں نے وکیل سے تحقیقاتی کمرے میں ملاقات کی۔ وہ وقت ضائع کیے بغیر مطلب کی بات پر آگیا۔

"میرا موکل قسم کھانے کے لیے تیار ہے کہ اس نے زندگی میں کبھی کوئی ہتھیار استعمال نہیں کیا۔ میں مطالبہ کرتا ہوں کہ اس کے ہاتھوں کا فوراً معائنہ کرایا جائے اور اس پر سے قتل کا الزام واپس لیا جائے۔"

"تمہارے موکل پر ابھی قتل کا الزام عائد نہیں کیا گیا جب تک کہ لیبارٹری سے نمونوں کی تصدیق نہ ہوجائے۔ ہم نے اسے چوری کے الزام میں گرفتار کیا ہے۔"

"یہ ایک اور بے بنیاد الزام ہے۔ جب تک کہ تم چرائی ہوئی چیزیں اس کے قبضے سے برآمد نہ کرلو جو تم کبھی نہیں کرسکوگے۔ میں آج سہ پہر میں اس کا پولی گراف ٹیسٹ کروانا چاہتا ہوں۔ اس سے پہلے کہ تم اس کے دماغ میں اپنی مرضی کی باتیں ڈال دو۔"

سہ پہر میں وینڈ یک کو فرسٹ ڈسٹرکٹ ہیڈکوارٹر لے جایا گیا جہاں کیمیائی ٹیسٹ کے بعد اس کے ہاتھوں پر گن پاؤڈر کے ذرات نہیں پائے گئے۔ کیسٹرل کا کہنا تھا کہ چھ گھنٹے گزر جانے کے بعد اس طرح کے ٹیسٹ کا نتیجہ منفی آتا ہے۔ بہرحال اس بنیاد پر وینڈ یک کی ضمانت ہوگئی۔

اگلے دن کے اخبارات میں چوری کی خبر تو شائع نہیں ہوئی البتہ قتل کا ذکر نمایاں طور پر کیا گیا۔ صبح چھ بجے پوسٹ مارٹم کے دوران پیتھالوجسٹ نے رولنگ کے سینے سے اعشاریہ بتیس کے دو خول نکالے جن کی وجہ سے اس کے دل اور بڑی شریانوں کو نقصان پہنچا تھا۔ زخموں کے گرد جمع ہونے والے پاؤڈر سے اندازہ ہو رہا تھا کہ دونوں گولیاں بہت قریب سے چلائی گئی تھیں تاہم دیگر رپورٹس ابھی نہیں آئی تھیں۔

لیکن اس ابتدائی رپورٹ کے ساتھ ہی اسٹیمی نے ایک اور نوٹ بھیجا تھا جس میں لکھا تھا کہ مردہ خانے میں ہونے والے ٹیسٹ کے دوران رولنگ کے دائیں ہاتھ پر بارود کے ذرات پائے گئے۔ خودکشی خارج از امکان تھی۔ تاہم اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ رولنگ فائرنگ کے تبادلے کے دوران مارا گیا۔ اسے گولی چلانے کا موقع نہ مل سکا اور اس سے پہلے ہی حملہ آور نے فائر کھول دیا۔

کیسٹرل کو کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے یا تہ خانے میں کسی اور جگہ انگلیوں کے نشانات نہیں ملے لیکن لیبارٹری

میں ہونے والے ٹیسٹ سے اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ تہ خانے اور وینڈیک کے ٹرک پر جو انسانی خون کے دھبے پائے گئے وہ رولنگ کے خون کے نمونوں سے مل رہے تھے لہٰذا اب اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ پائپ کی چوری اور قتل آپس میں منسلک تھے اور وینڈیک ان دونوں جرائم میں پوری طرح ملوث تھا۔

اس کے علاوہ جب اس کا پرانا ریکارڈ دیکھا گیا تو وہ کسی طرح بھی ایک مہذب شہری کے معیار پر پورا نہیں اترتا تھا۔ اسے کئی بار ٹریفک کی خلاف ورزی اور امن وامان میں خلل ڈالنے پر جرمانہ ہوا اور اسے دو مرتبہ چھوٹی چھوٹی چوریاں کرنے پر سزا بھی ہوچکی تھی۔

ایک اور رپورٹ میں کیسٹرل نے کھڑکی کی تصویر بھی لگائی تھی اور یہ انکشاف بھی کیا تھا کہ چور نے اندر داخل ہونے سے پہلے ٹوٹے ہوئے شیشے میں جس جگہ ٹیپ لگایا وہاں سے ایک کریڈٹ کارڈ کے سائز کا ٹکڑا غائب تھا اور لگتا یہی ہے کہ جس جگہ ٹیپ لگایا گیا وہاں پہلے سے گولی کا سوراخ موجود تھا اور کیسٹرل نے بڑے اعتماد سے کہا تھا کہ یہ گولی تہ خانے کے اندر سے چلائی گئی تھی۔

‘‘مجھے یہ پہیلی سمجھ میں نہیں آئی۔’’ اوبرن نے کہا۔ ‘‘کب اور کیسے تہ خانے کی کھڑکی میں یہ سوراخ بن گیا؟’’

‘‘ہوسکتا ہے کہ یہ گزشتہ پچاس سال سے وہاں ہو۔’’ ڈونگر نے کہا۔

‘‘پھر اس جگہ ٹیپ کیوں لگایا گیا اور وہ سوراخ والا شیشے کا ٹکڑا کہاں غائب ہوگیا۔ کسی شخص نے یہ چھپانے کے لیے اس شیشے کے ٹکڑے کو وہاں سے ہٹا دیا کہ اس میں کوئی گولی کا سوراخ تھا۔’’

‘‘ٹھیک ہے جس کسی نے یہ سوراخ بنایا اگر وہ پہلے سے مکان میں موجود تھا تو پھر انہیں کھڑکی میں نقب لگانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟’’

‘‘یہی بات تو میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔ ممکن ہے کہ ہمیں ایک بار پھر وینڈیک سے بات کرنی پڑے۔’’

جب وہ لنچ کے بعد ہیڈ کوارٹر واپس آئے تو اوبرن کو اپنے کمپیوٹر اسکرین پر ٹیپ کی مدد سے چپکایا ہوا ایک سبز رنگ کا تہ شدہ کاغذ ملا۔ اس نے اسے کھول کر دیکھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ کس نے یہ نوٹ یہاں پہنچایا۔ اس نے یہی بہتر سمجھا کہ اس میں اپنا دماغ کھپانے کے بجائے وہ خود ہی معلوم کرے۔ اس نے اپنا سروس ریوالور چیک کیا اور واٹر اسٹریٹ کی جانب روانہ ہوگیا۔

عمارت پر کارمیلا بیوٹی سیلون کا بورڈ آویزاں تھا لیکن اوبرن گلی کی طرف سے اس کے عقب میں گیا اور اس نے ایک لوہے کے دروازے پر دستک دی لیکن جواب نہیں آیا۔ پھر تیسری دستک پر دروازہ اچانک کھل گیا۔ ایک طویل قامت عورت نے اپنا ہاتھ باہر نکال کر اسے نیم تاریک کمرے میں کھینچ لیا اور دروازہ زور سے بند کردیا۔

بیوٹی پارلر کا وہ کمرا شیمپو، کنڈیشنر، خضاب اور دیگر متفرق آئٹمز سے بھرا ہوا تھا۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ مہاگنی کی الماری تھی جس میں کئی مذہبی مجسمے اور فریم شدہ تصویریں رکھی ہوئی تھیں۔ شیشے کے رنگین گلوبوں میں منت مانی ہوئی موم بتیاں روشن تھیں اور انہی سے کمرے میں تھوڑی بہت روشنی ہورہی تھی۔

کارمیلا نے ایک پلاسٹک ایپرن پہن رکھا تھا اور اس کے ایک بازو کے نیچے ربر کے دستانے دبے ہوئے تھے۔

‘‘سوپی’’ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ‘‘تم اپنے آپ کو پولیس آفیسر کہتے ہو لیکن تمہیں ابھی تک یہ اندازہ نہیں ہوسکا کہ ان اور رنج کون کا مطلب کیا ہے؟’’

اوبرن نے صبح کی خبروں میں رولنگ کی کار کی ویڈیو دیکھی تھی۔ اس نے کہا۔ ‘‘رولنگ ٹائروں کے کاروبار سے وابستہ تھا۔’’

‘‘ٹائروں کا کاروبار میرے جوتے کی نوک پر۔ یہ کام وہ دن میں کرتا تھا۔ رات میں وہ کسی روشن پارکنگ لاٹ میں خالی جگہ تلاش کرتا۔ یہ کون وہاں اس ترتیب سے رکھتا جیسے معلوم ہو کہ وہ پارکنگ کی پریکٹس کررہا ہے جس طرح بچوں کو ڈرائیونگ لائسنس دینے سے پہلے ان کا امتحان لیا جاتا ہے۔’’

‘‘لیکن وہ حقیقت میں پارکنگ کی پریکٹس نہیں کررہا ہوتا تھا۔’’

‘‘اوہ، بالکل نہیں۔’’

‘‘کیا وہ کسی چھوٹے کاروبار کے لیے دکان جما رہا تھا؟’’

‘‘اب تم بات کی تہ تک پہنچ گئے لیکن باقی کام تمہیں خود کرنا ہوگا۔ تم اپنے طور پر یہاں سے باہر جاسکتے ہو۔ اب مجھے کام کرنا ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ پیسے کہاں بھیجتے ہیں۔ نقد، چیک نہیں۔’’

‘‘ڈانیا۔ وہ ابھی تک ویسٹ ہیمپٹن میں ہی ہے؟’’

‘‘ہاں اور پوری طرح کنٹرول میں ہے۔’’

اوبرن گلی میں جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس سے پہلے کہ وہ وہاں تک پہنچتا۔ کارمیلا اس کے

پیچھے پیچھے آئی اور اس کا دایاں کندھا پکڑ کر پیچھے کی طرف اس طرح کھینچا کہ وہ گرتے گرتے بچا۔

”ایک بات یاد رکھنا سونی۔ میں نے تمہیں کبھی نہیں دیکھا اور نہ ہی تم مجھ سے کبھی ملے۔ ایک بات اور سن لو۔ اگر میری پوتی کو کوئی نقصان پہنچا تو میں تمہیں نہیں چھوڑوں گی۔“

رولنگ کے سابقہ ریکارڈ سے کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوئی تو اوبرن نے اس کا مکمل پس منظر جاننے کی خواہش ظاہر کی پھر اس نے کیسٹرل کو فون کر کے پوچھا۔

”اب رولنگ کی کار کہاں ہے؟“

”یہیں، گیراج کے ایک کونے میں کھڑی ہوئی ہے۔“

”کیا میں تم سے کہہ سکتا ہوں کہ اسے ایک دفعہ اور چیک کرلو۔“

تین بجے سے پہلے کیسٹرل نے رولنگ کی کار کے بارے میں رپورٹ دینے کے لیے اوبرن کو فون کیا۔ اس نے جب فالتو ٹائر کو نکالا تو اس کی سائڈ میں اسے ایک کٹاؤ نظر آیا جیسے کسی چیز کو رکھنے کے لیے جگہ بنائی گئی ہو۔ ٹائر کے اندر سے آف وائٹ کرسٹل کے ذرات ملے جو کوکین کے تھے۔

ابھی تک منشیات کے کاروبار اور تانبے کے پائپ کی چوری میں تعلق جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے رولنگ کے مالک گریوز کی کال موصول ہوئی۔

”میں نے تھوڑی دیر پہلے خبروں میں اپنی کار دیکھی ہے۔ میں اسے کب اور کہاں سے منگوا سکتا ہوں؟“

”ہم اس کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہیں۔ کیا تم پانچ بجے سے پہلے شہر آسکتے ہو؟“

”یقیناً، کیا کار کو کوئی نقصان پہنچا ہے؟“

”نہیں، لیکن ہم اس کے کچھ حصے ثبوت کے طور پر اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں۔“

”سمجھ گیا۔“ پھر ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ”کون سے حصے؟“

”جب تم یہاں آؤ گے تو بتاؤں گا۔“

ان کے درمیان ساڑھے چار بجے کا وقت طے ہوا۔ اوبرن نے اسے ہدایت کی کہ وہ کار کی لیز کے کاغذات ساتھ لے کر آئے۔ اور اسے پبلک سیفٹی گیراج کا پتا بتادیا۔ پھر اس نے ڈرگ انفورسمنٹ کے دفتر فون کیا اور مائیکل کے بارے میں پوچھا۔

ٹھیک ساڑھے چار بجے گریوز ایک سرخ ٹرک کے ذریعے مقررہ جگہ پر پہنچ گیا۔ اس ٹرک پر اکانومی ٹریڈرز کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اوبرن اسے گیراج کے اندر لے گیا اور بولا۔

”کیا میں تمہارا ڈرائیونگ لائسنس اور لیز کے کاغذات دیکھ سکتا ہوں؟“

اس کی شناخت کی جانچ کرنے کے بعد اوبرن نے اسے مائیکل کے سامنے کردیا۔

”پبلک سیفٹی کو اس بات کا واضح ثبوت ملا ہے۔“ مائیکل نے کہا۔ ”کہ تمہاری کار منشیات کی غیر قانونی تجارت میں استعمال ہوتی رہی ہے۔ تم اس بارے میں کیا کہو گے؟“

گریوز حیران رہ گیا۔ ”ایسا نہیں ہوسکتا۔ یہ کار مستقل رولنگ کے استعمال میں تھی۔“

”اس کا فالتو ٹائر کاٹا گیا تو اس کے اندر کوکین کے ذرات تھے۔“ مائیکل نے کہا۔ ”تم اس کار کے مالک ہو۔ اس لیے یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ تم اس بارے میں کچھ نہ کچھ جانتے ہو گے۔“

”میں کچھ نہیں جانتا۔ دیکھو آفیسر! میں نے شاید پوری زندگی میں یہ کار تین مرتبہ چلائی ہوگی۔ تمہارا کہنا ہے کہ یہ منشیات کی تجارت میں استعمال ہو رہی تھی تو یہ کام رولنگ ہی کر رہا ہوگا اور وہ اب مرچکا ہے۔“

”جی جناب۔ اس لیے تمہیں میرے ساتھ دفتر چلنا ہوگا۔“ مائیکل نے کہا۔ گریوز کا ڈرائیونگ لائسنس ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔

”کیا ہم بعد میں کوئی وقت طے کرسکتے ہیں؟“ گریوز نے کار کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے پینتالیس منٹ بعد ایک سیلز کانفرنس میں شرکت کرنی ہے۔“

مائیکل نے اپنی جیکٹ کے بٹن کھولے اور تھوڑا سا ایک طرف کو اس طرح مڑا کہ کندھے پر لٹکا ہوا اس کا سروس ریوالور نظر آنے لگا۔ ”ہم ابھی جا رہے ہیں جناب۔“

اگلے روز صبح گیارہ بجے ڈونلز کو پیٹرول وومن کیمرون کا پیغام موصول ہوا۔

”کیا یہ نام جانا پہچانا نہیں لگتا؟“ اس کے ساتھ جو خبر منسلک تھی اس کے مطابق ولموٹ کے رہائشی ہیڈن ہیری کو پیر کی شام میکر میموریل اسپتال میں داخل کیا گیا۔ اس نے زیادہ مقدار میں منشیات لے لی تھی۔ ولموٹ پبلک سیفٹی ڈپارٹمنٹ سے معلوم ہوا کہ وہ منشیات دراصل میں کوکین تھی۔ ایک پڑوسی نے اسے اس کے گیراج میں پانچ بجے کے قریب بے ہوش دیکھا۔ ہیری نے سختی سے منشیات لینے کی تردید کی جو کہ واضح طور پر اس کے جسم میں منہ کے ذریعے لی گئی تھی۔

اوبرن اور ڈونلز دوپہر کے وقت اسپتال گئے۔ ہیری غنودگی کے عالم میں لیٹا ہوا تھا۔ اس کی ناک پر آکسیجن کا

نئے سال کا تحفہ خوب صورت اور پُراثر تحریروں سے مرصع جنوری 2019ء کا دلکش شمارہ

گھر کے ہر فرد کے لیے

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

رفعت سراج کے خوب صورت انداز و بیان کا عکاس سلسلے وار ناول

یہ کہاں بچیں کہ دل ہے کا دل نشیں اختتام

افشاں آفریدی اور **سحر ساجد** کے نئے سلسلے وار ناول ایک نئے انداز میں

حیا بخاری...... **محبت لفظ ہے لیکن** کی کہانیاں سمیٹتے ہوئے

دُردانہ نوشین خان...... کا اچھوتا موضوع پر لکھا مُنی ناول...... **صُفہ**

عقیلہ حق اور **شبینہ گل** کے دلفریب ناولٹ

شمع ہدایت میں پڑھیے **اختر شجاعت** کا ایک اور پُراثر تحقیقی مضمون پردہ پوشی...... **صفتِ الٰہی**

پاکیزہ کے مہمان میں

شائستہ زرّیں لائی ہیں اداکار

وہاج علی اور بیگم **ثنا وہاج** کی

زندگی کے حسین راز

اس کے علاوہ

شمیم فضل خالق، نزہت جبیں ضیا، اسما طاہر و دیگر رائٹرز کی حسین کاوشیں

اس کے ساتھ ساتھ مثبت معلو [illegible] آپ کی خوش ذوقی کی نذر

UrduPDFBooks.pk

ماسک اور بائیں کلائی پر نلکی لگی ہوئی تھی۔ اسٹینڈ پر کھانے کی ٹرے رکھی ہوئی تھی جسے کسی نے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

ہیری نے ایک آنکھ کھول کر دیکھا۔ ”کیا تم ڈیوٹی پر ہو یا مجھے دیکھنے آئے ہو؟“

ڈونگر نے اوبرن کا تعارف کروانے کے بعد پوچھا۔ ”کیا ہوا تھا؟“

”کاش مجھے معلوم ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ کسی نے میرے کھانے میں کچھ ملا دیا تھا لیکن ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اگر میرے کھانے میں کوئی چیز شامل ہوتی تو میں گھر تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔“

”تم نے دوپہر کا کھانا کب کھایا؟“

”تم سے ملنے کے آدھ گھنٹے بعد۔ میں نے اپنی کار میں ہی لنچ کیا تھا۔“

”تم وہ کھانا کہاں سے لائے تھے؟“

”میں اپنا کھانا گھر سے لاتا ہوں۔ اس میں ٹرکی، چپس، سیب اور سوڈا تھا۔“

”کیا وہ کھانا صبح سے تمہاری کار میں مقفل تھا؟“

”کار محکمے کی ہے۔ اس کی دوسری چابی دفتر میں ہوتی ہے۔“

”کچھ اندازہ ہے کہ تمہارے ساتھ کون ایسا کرنا چاہتا ہے؟“

”نہیں۔“

”کسی کو زہر دینے کے لیے کوکین ایک غیر معمولی انتخاب ہے۔“ اوبرن نے کہا۔ ”کیا تم کسی ایسے شخص کو جانتے ہو جو منشیات استعمال یا فروخت کرتا ہو۔“

”اگر کوئی ایسا شخص ہے تو اس نے مجھے ابھی تک اس بارے میں نہیں بتایا۔“

ہیڈ کوارٹرز واپس آنے کے بعد انہوں نے پائپ کی چوری اور قتل کے بارے میں تمام دستیاب معلومات اکٹھی کیں اور ان پر غور و فکر کرنے بیٹھ گئے۔ رونگ کے خون میں کوکین کی تو نہیں البتہ الکحل کی معمولی مقدار پائی گئی تھی۔ جب اوبرن وہ تصویریں دیکھ رہا تھا جو کیسٹرل نے تہ خانے میں لی تھیں تو اس کی توجہ ایک چیز پر مرکوز ہو گئی۔ اس نے تین تصویریں منتخب کیں اور انہیں ایک قطار میں میز پر رکھ دیا۔

”یہ کیا ہے فرنز؟“

”مجھے تو ایک دیوار کی طرح لگ رہی ہے۔“

”لیکن یہ تہ خانے کی بیرونی دیوار نہیں ہے۔ اس کا اوپری حصہ کیلوں کے ذریعے چھت کی کڑیوں سے جڑا ہوا ہے۔ مجھے تو یہ پارٹیشن وال لگتی ہے اور اس کے پیچھے ضرور کچھ ہوگا۔“

ڈونگر کافی دیر تک ان تصویروں کو غور سے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ ایک خالی دیوار ہے اور اس میں کوئی دروازہ نہیں ہے۔“

”اس پراپرٹی ایجنٹ سے فون کر کے معلوم کرو۔“

ٹیسی ونٹر نے تصدیق کی کہ بارہ سال قبل اس مکان میں کچھ تبدیلیاں کی گئی تھیں جن میں ایک باتھ روم اور کچن کے برابر میں ایک کمرے کا اضافہ شامل تھا۔ اس کے پاس ان کاموں کے لیے سٹی انجینئر سے منظور شدہ نقشہ بھی موجود تھا۔

جب انہوں نے اس کے دفتر پہنچ کر وہ نقشہ دیکھا تو معلوم ہوا کہ مکان کی بنیادوں کو بڑھا کر اس پر تہ خانے کی عقبی دیوار اور اس کی جگہ ایک پارٹیشن وال تعمیر کی گئی تھی اور ان دونوں کے درمیان تین ضرب بارہ کا ایک خلا تھا۔ انہوں نے مس ونٹر کو رسید دے کر مکان کی چابی حاصل کر لی۔

انہوں نے کیسٹرل اور ایجنٹ مائیکل کو بھی اس دیوار کا معائنہ کرنے کے لیے بلا لیا تھا۔ اس دیوار کے پیچھے سے گیارہ عدد کوکین کے جگ برآمد ہوئے۔ اوبرن کے پوچھنے پر مائیکل نے بتایا کہ فی الوقت گیرٹ گریوز کو چھوڑ دیا گیا ہے تاہم اس پر ان کی نظر ہے۔

دوسری صبح بارش ہو رہی تھی جس کی وجہ سے میٹ ونڈیک کام پر نہیں گیا۔ جب وہ اس کے گھر پہنچے تو وہ ٹی وی اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ ڈونگر نے اس سے پوچھا۔ ”گزشتہ روز تم نے اپنے وکیل کو بتایا تھا کہ تم نے زندگی میں کبھی گن نہیں چلائی پھر نہیں کیسے معلوم ہوا کہ رونگ کو گولی ماری گئی تھی؟“

”یقیناً میں نے کسی سے سنا ہوگا۔“

”بالکل نہیں، تحقیقات کرنے والوں میں سے کسی نے بھی تمہیں یا تمہارے وکیل کو یہ نہیں بتایا کہ رونگ کیسے مارا گیا۔“

”میں نے فرض کر لیا تھا کہ ایسا ہی ہوا ہوگا۔“

”تم نے کچھ فرض نہیں کیا۔ تم جانتے تھے کہ وہ گولی سے ہلاک ہوا تھا کیونکہ تم ہی اس کی لاش کو تہ خانے سے مال کی پارکنگ لاٹ تک لے کر آئے تھے۔“

”صبر صبر...... یہ میں نے کب کیا؟“

”جیسے ہی تم نے لاش دیکھی۔ پیر کی صبح تقریباً تین چار بجے کے قریب۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد جب کسی شخص نے وہاں سے پائپ چوری کیا؟ رونگ کو گولی ماری اور کھڑکی پر

UrduBooks.pk

ٹیپ لگا کر نقب زنی کا تاثر دیا اور پائپ کٹر چھوڑ کر چلا گیا۔“

”اور میں صبح کے تین چار بجے وہاں کیا کر رہا تھا؟“

”شاید رولنگ سے ملنے اور اس سے اپنا حصہ وصول کرنے......“

”کیسا حصہ؟ میرا رولنگ سے کیا لینا دینا؟“

”تم نے اسے تہ خانے کی دیوار کے پیچھے خلا میں کوئین کا اسٹاک رکھنے کی اجازت دی تھی۔“ اوبرن نے کہا۔ ”غالباً اس کا کوئی کرایہ طے ہوا ہوگا۔ جب تم نے دیکھا کہ اس نے اپنے آپ کو گولی ماری ہے تو تمہیں جلدی میں لاش کو وہاں سے ہٹانا پڑا۔“

”ٹھیک ہے۔ میں نے اسے بغلی دروازے کی چابی عاریتاً دی تھی۔“ وینڈیک نے اعتراف کیا۔ ”لیکن میں کوئین کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“

”یہ دیکھنا ابھی باقی ہے۔ تمہارے ٹرک میں اس کے خون کے دھبے ملے ہیں۔ اس لیے ہم تمہیں اس کی لاش منتقل کرنے کے الزام میں گرفتار کر رہے ہیں کیونکہ یہ بھی ایک جرم ہے اور اگر اس میں قتل کے بارے میں ثبوت چھپانا، انہیں تبدیل یا ضائع کرنا بھی شامل ہوجائے تو یہ ایک سنگین جرم بن جاتا ہے۔“

سہ پہر تین بجے کے قریب اوبرن لیبارٹری میں کیسٹرل کے پاس گیا اور بولا۔ ”کیا تم میرے اور ڈونگر کے ساتھ ایک جگہ جانا پسند کرو گے۔ میں اپنے ایک مفروضے کی جانچ کرنا چاہتا ہوں۔“

”اگر کیپٹن نے مجھے اس کا اختیار دیا۔“

”وہ میری ذمے داری ہے۔“

فرینکلے اوپن یارڈ ہفتے کے چھ دن صبح آٹھ سے شام چھ بجے تک کھلا رہتا تھا۔ ڈونگر اور اوبرن وہاں چار بجے کے قریب پہنچ گئے۔ یارڈ کے مالک نے وارنٹ کے بغیر اسٹاک کی تلاشی دینے پر اعتراض کیا لیکن انہوں نے اسے یقین دلایا کہ انہیں جس چیز کی تلاش ہے اگر وہ مل گئی تب بھی وہ اس پر چوری کا مال رکھنے کا الزام عائد نہیں کریں گے بشرطیکہ وہ انہیں بتادے کہ اس نے یہ سامان کس سے خریدا۔

فرینکلے نے انہیں پہننے کے لیے ہیلمٹ اور دستانے دیے اور وہ پائپوں کے ڈھیر، ٹیوبوں، تاروں کے کوائل، ناکارہ بوائلر، ڈکٹ پائپ، ہر سائز اور قسم کے پرزوں کے ڈھیر کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ چند ہی منٹ بعد کیسٹرل کو تانبے کے پائپوں کی وہ لاٹ مل گئی جس کا سرا اس کٹنگ ٹول سے مل رہا تھا جو وینڈیک کے پاس سے برآمد ہوا تھا۔

فرینکلے نے اپنے دو آدمیوں سے پوچھنے کے بعد فائل میں سے اس آدمی کے ڈرائیونگ لائسنس کی فوٹو کاپی انہیں دکھائی جس نے دو روز قبل یہ پائپ انہیں فروخت کیا تھا۔ وہ ڈلموٹ کا رہائشی چارلس کولبرٹ تھا۔ لائسنس کا معائنہ کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کی مدت چار سال پہلے ختم ہوگئی ہے۔ بیورو آف موٹر وہیکلز سے معلوم کرنے پر پتا چلا کہ خود چارلس کولبرٹ اس سے بہت پہلے دنیا سے رخصت ہوچکا ہے۔

فرینکلے نے تسلیم کیا کہ اس نے ڈرائیونگ لائسنس کی فوٹو کاپی کرنے سے پہلے اسے سرسری انداز میں دیکھا اور لائسنس پر لگی ہوئی تصویر کا اس شخص کے چہرے سے بغور موازنہ نہیں کیا جس نے یہ لائسنس اسے دکھایا تھا لیکن اس نے چارلس کولبرٹ کا نام پہچان لیا۔ وہ شخص جو کوئی بھی تھا لیکن اس کے ٹرک پر کولبرٹ پلمبنگ اینڈ پینٹنگ، لکھا ہوا تھا جبکہ زرد صفحات میں ایسی کسی کمپنی کا نام درج نہیں تھا۔ فرینکلے نے ڈرائیونگ لائسنس کی ایک اور فوٹو کاپی کروا کر انہیں دے دی اور ان کے مانگنے پر تانبے کے پائپ کے دو چھوٹے ٹکڑے بھی کیسٹرل کے ذخیرے میں جمع کرنے کے لیے دے دیے۔

جمعے کی صبح ڈونگر اور اوبرن، ہیری سے ملنے اس کے گھر گئے۔ ڈونگر نے رسماً اس کی صحت کے بارے میں دریافت کیا اور پھر مطلب کی بات پر آگیا۔ ”پیر کے روز تم نے ہمیں بتایا تھا کہ تم اس مکان میں واٹر ڈپارٹمنٹ کی املاک کو پہنچنے والا نقصان چیک کرنا چاہ رہے تھے جہاں سے پائپ چوری ہوا۔ کیا یہ درست ہے؟“

”ہاں، میں نے یہی کہا تھا۔“

”جبکہ تم اچھی طرح جانتے تھے کہ تہ خانے میں پانی کے محکمے کی کوئی تنصیبات نہیں تھیں۔ تمہارے وہاں جانے کی وجہ کچھ اور تھی۔“

”وہ کیا؟“

”تم وہ کٹر تلاش کر رہے تھے جو تم ایک رات پہلے پائپ چرانے اور رولنگ کو قتل کرنے کے جوش میں وہاں چھوڑ آئے تھے۔“

”ایک منٹ، صبر کرو۔“

ڈونگر نے اس کے حقوق پڑھ کر سنانا شروع کر دیے۔

”فرینکلے کے لوگوں نے بتایا کہ وہ عام طور پر ڈرائیونگ لائسنس غور سے نہیں دیکھتے۔ تم نے جو لائسنس دکھایا وہ چار سال پہلے ختم ہوچکا تھا لیکن انہوں نے ٹرک کا نمبر نوٹ کرلیا جس پر کولبرٹ پلمبنگ اینڈ پینٹنگ لکھا ہوا تھا جو اب تمہارے

نام پر رجسٹرڈ ہے اور تمہارے گیراج کے برابر والے شیڈ میں کھڑا ہوا ہے۔''

ہیری نے کشن سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ''تم لوگوں نے اس کا کھوج لگا ہی لیا۔''

''ہمیں اسی کام کی تنخواہ ملتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تم کولبرٹ کے لیے کام کرتے ہو اور یہ ٹرک بھی وہیں سے لے کر آئے تھے۔ ہمارے پاس یہ ثبوت بھی ہے کہ تم نے ایڈیسن اسٹریٹ سے پائپ چوری کرنے کے لیے جو ناقص کٹر استعمال کیا اسی کی مدد سے تم نے گزشتہ چند ماہ میں تین دوسرے مکانوں میں بھی پائپ چوری کیا۔ فرینکلے کے ریکارڈ سے پتا چلتا ہے کہ تم ہر واردات کے دو روز بعد اسکریپ پائپ اسے فروخت کر دیتے تھے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ پیر کے روز بیماری کا بہانہ بنا کر تم ڈیوٹی پر نہیں گئے اور ایڈیسن اسٹریٹ یا کسی اور جگہ سے میٹر ریڈنگ نہیں جمع کروائی۔''

ہیری نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن فوراً ہی سختی سے بند کر لیا۔

''واٹر ڈپارٹمنٹ میں تمہارے کام کی نوعیت ایسی ہے کہ تمہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ کن گھروں کا پانی بند ہے۔'' اوبرن نے کہا۔ ''تم یہ وردی پہن کر کسی بھی پرائیویٹ پراپرٹی میں بلا روک ٹوک داخل ہو سکتے ہو۔ تم ایسے مکانوں کو بھی چیک کر سکتے ہو جو برائے فروخت یا کرائے کے لیے خالی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ شاید میں نے اِدھر اُدھر سے تھوڑا پائپ کاٹا ہو۔''

ڈولنگر نے بریفنگ کیس کھولتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس تمہاری گرفتاری کا وارنٹ ہے۔ تم پر چوری کی چار وارداتوں کا الزام ہے۔ برائے کرم کھڑے ہو جاؤ اور اپنے دونوں ہاتھ دیوار پر رکھ لو۔ میرے پاس اس گھر کے گیرج اور شیڈ کی تلاشی کا بھی وارنٹ ہے۔ ہم چاہیں گے کہ تم ہمیں تمام مقفل جگہوں کی چابیاں دے دو۔''

وہ ایک روز قبل شیڈ کی کھڑکی سے کمپنی کا ٹرک دیکھ چکے تھے۔ جامع تلاشی کے دوران انہیں ٹرک سے پلاسٹک کی بوتل میں سفید کرسٹل اور دو ہینڈ گن ملیں جو کار گو والے حصے کے فرش کے نیچے ٹول باکس میں چھپائی گئی تھیں۔

ہیری ابھی تک پاجامہ اور سلیپرز پہنے ہوئے تھا۔ وہ بے بسی کے عالم میں کھڑا انہیں ثبوتوں پر لیبل لگاتے اور پیک کرتے دیکھ رہا تھا۔

''ان میں سے کس ریوالور سے تم نے کھڑکی کے شیشے میں سوراخ کیا تھا؟'' اوبرن نے پوچھا۔

''یہ سوراخ اس کے ریوالور سے ہوا تھا۔ وہ عین اس وقت اندر آیا جب میں ٹرک میں پائپ رکھنے والا تھا۔ اس نے میری ہیڈ لائٹ کو نشانہ بنایا۔'' دوسرا اعشاریہ بتیس کا ریوالور تھا جس سے رولنگ کی زندگی کا خاتمہ ہوا۔

''اس سے پہلے تم کھڑکی پر ٹیپ لگا چکے تھے۔''

''ہاں جب میں وہاں پہنچا تو میں نے تمام دروازے چیک کیے اور میں نے دیکھا کہ تہ خانے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں اسی دروازے سے اندر گیا لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا۔ اس کی وجہ سے میں نے شیشہ توڑ کر وہاں ٹیپ لگا دیا تاکہ یہ معلوم ہو کہ میں وہاں سے اندر داخل ہوا تھا۔''

''اور شیشے کا وہ ٹکڑا وہاں سے ہٹا دیا جس میں گولی سے سوراخ ہوا تھا۔ ہمیں کوکین کے بارے میں بتاؤ۔''

''یہ کوکین اس کے پاس تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ کیا ہے لیکن میں اسے چکھے بغیر نہ رہ سکا۔''

''مجھے یقین نہیں۔'' اوبرن نے کہا۔ ''ہم تم پر کینٹ رولنگ کے قتل کا الزام عائد کر رہے ہیں۔''

وہ بے چین ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اسے آتے دیکھا تو گھبرا گیا۔ پہلے اس نے مجھ پر گولی چلائی۔ عین اسی وقت میں نے بھی اپنے دفاع میں فائر کیا اور وہ گر پڑا۔ بالکل اس طرح جیسے تم کرتے اگر وہ تم پر فائرنگ کرتا۔''

''اگر جرم کرتے وقت تم کسی کو مار دو تو یہ قتل خود بخود ایک جرم بن جاتا ہے۔'' ڈولنگر نے وضاحت کی۔

انہوں نے اسے لباس تبدیل کرنے کی مہلت دی اور اسے اپنے ساتھ لے کر روانہ ہو گئے۔ مختلف وجوہات کی بنا پر اسے جیل میں بند کرنے میں کچھ دیر لگ گئی۔ اوبرن اس موقع سے فائدہ اٹھا کر وینڈیک سے ملنے چلا گیا جسے اس نے اتفاقاً رولنگ کے قاتل کے بارے میں بتا دیا۔

ایک گھنٹے بعد وہ اور ڈولنگر جیل سے رخصت ہو رہے تھے کہ وکیل پیٹر آتا ہوا دکھائی دیا۔ ''میرا خیال ہے کہ تمہیں بالآخر ایک ایسا شخص مل ہی گیا ہے جس پر تم یہ قتل ڈال دو۔'' وہ اپنی مخصوص لومڑی جیسی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''اس پر انحصار مت کرنا۔ اگر اس نے میری خدمات حاصل کر لیں تو تم کچھ بھی ثابت نہیں کر سکو گے۔''

''اس نے ایک نہیں بلکہ دو جرم کیے ہیں اور یہ تمہارے لیے آسان کیس نہیں ہوگا۔ ویسے بھی میں کوئی کچا کام نہیں کرتا۔'' اوبرن نے کہا اور منہ پھیر کر چل دیا۔

* * *

UrduBooks.pk

بنّے بھائی

منظر امام

بعض شخصیت ایسی سحر انگیز ہوتی ہیں کہ ہر کوئی ان کی طلسماتی کشش کا اسیر ہو جاتا ہے... اور کچھ ایسے ہونق... اور مخبوط الحواس شخصیت کے مالک ہوتے ہیں کہ لوگ ان کے سائے سے بھی کتراتے ہیں... زیر نظر کہانی بھی کچھ ایسے ہی خواص رکھنے والے شخص کا احاطہ کرتی ہے... جو بیک وقت دونوں خوبیوں پر پورا اترتے تھے... ایک وقت آیا کہ محلے کی تمام دوشیزائیں ان پر فریفتہ ہوگئیں...

لبوں پر تبسم بکھیر دینے والے بنّے بھائی کی دلچسپ حکمت عملی کا فسانہ......

بنّے بھائی ایک ہونق سے انسان تھے۔

اسی سے اندازہ لگالیں کہ وہ اتنے بے تکے نام کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے اور پھر بھی مزے میں تھے۔

جب ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان کا نام دریافت کیا۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ ”جی، میرا نام بنّے بھائی ہے۔“

”آپ کا نام بنّے ہوگا۔ بھائی تو آپ مجھے بتا رہے ہیں۔“

”نہیں یار، میرا نام ہی بنّے بھائی ہے۔“ انہوں نے بتایا۔ ”میرے ابا نے یہی نام رکھا تھا۔“

”اور خود آپ کے ابا آپ کو کیا کہہ کر پکارتے تھے؟“

”ظاہر ہے بنّے بھائی کہتے تھے۔“

”یعنی آپ کے ابا بھی آپ کو بھائی بولتے تھے؟“

”صرف بھائی نہیں بلکہ بنّے بھائی۔ اماں بھی بنّے بھائی بولتی تھیں۔“

تو ایسے تھے بنّے بھائی۔ ان کو زندگی میں صرف ایک

UrduBooks.pk

بات کا دکھ تھا کہ کوئی اب تک اُن کو سمجھ نہیں سکا ہے۔

”ارے نہیں بنے بھائی آپ تو بہت سیدھے سادے انسان ہیں۔ آپ کو سمجھنا کیا مشکل ہے؟“

”بھائی، میں کسی خاتون کی بات کر رہا ہوں۔“ بنے بھائی نے شرماتے ہوئے کہا۔ ”کسی خاتون نے آج تک نہیں سمجھا۔“

میں نے یوں ہی چھیڑنے کے لیے پوچھا۔ ”بنے بھائی، آپ نے کبھی کسی سے اظہارِ محبت کیا یا نہیں؟“

”ایک بار نصیبو سے کیا تھا۔“ بنے بھائی نے بتایا۔

”کون نصیبو؟“

”ارے وہی شگن دھوبی کی بیوہ۔ بے چاری کے دن بہت مشکل سے گزر رہے ہیں۔ مجھے جب یہ پتا چلا تو میں بے قرار ہو گیا۔ میں نے یہ بھی سنا کہ کبھی کبھی تو اس کے گھر کھانا بھی نہیں پکتا تو اور بھی افسوس ہوا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے محبت کا اظہار کیسے کروں؟ پھر میں نے اپنے ایک دوست سے مشورہ کیا۔ اس نے بتایا کہ اپنی محبت کا یقین دلانے کے لیے اس کے لیے پھول لے جاؤ۔ چلو یہاں تک تو مشورہ غنیمت تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ پھول کس موقع پر دیے جائیں۔“

”گھر جا کر دے دیتے؟“

”بھائی اب میں اتنا بے وقوف بھی نہیں تھا کہ اس کے گھر پہنچ جاتا۔ تم کو تو معلوم ہی ہوگا کہ اس کا ایک چھوٹا سا بچہ بھی ہے۔“

”ہاں، جانتا ہوں میں۔“

”مجھے معلوم ہوا کہ وہ ہر شام اپنے بچے کو لے کر سامنے والے پارک میں جاتی ہے۔ بس ترکیب سمجھ میں آ گئی۔ میں نے اس دن اس کے لیے بازار سے تحفے خریدے اور شام کے وقت پارک پہنچ گیا اور سیدھا اس کے پاس گیا۔ میرے دونوں ہاتھوں میں شاپرز تھے۔ میں نے اس کے پاس جا کر کہا۔ ”میری طرف سے یہ تحفے قبول کر لیں۔ اس نے بہت حیران ہو کر مجھے دیکھا اور شاپرز لے کر تحفے دیکھنے لگی پھر اس نے ناراض ہو کر وہ شاپر میرے منہ پر پھینک دیے اور شور کرنے لگی۔ لے جاؤ، اپنے تحفے۔ مجھے نہیں چاہئیں۔ کیا مجھے بھکارن سمجھ رکھا ہے؟“

”بنے بھائی، آخر آپ نے اسے کیا دے دیا تھا؟“

”بھائی سب کام کی چیزیں تھیں۔ ایک کلو پیاز، دو کلو آلو، ایک کلو ٹماٹر، ہری مرچیں، وغیرہ۔ اور ایک پھول بھی رکھ دیا تھا۔“

”حد ہو گئی آپ کو یہ سب دینے کی کیا ضرورت تھی؟“

”بھائی صرف پھول لے کر وہ کیا کرتی۔ سبزیوں کو پکا کر ایک ہفتہ تو گزار ہی سکتی تھی لیکن وہ تو ناراض ہو گئی۔ بھلائی کا تو زمانہ ہی نہیں رہا۔“

تو ایسے تھے بنے بھائی۔ اب ایسے آدمی کو اکیلا تو رہنا ہی تھا۔ کون ان کی طرف مائل ہوتا۔

محلے والوں نے ان کی بے وقوفی کی اور بھی کئی داستانیں سنا دیں۔

محلے میں تنویر نام کا ایک بندہ تھا اس نے پولیس کی نوکری کر لی تھی۔ وہ ایک شریف آدمی تھا۔ بنے بھائی نے ایک دن اس سے کہا۔ ”بھائی تنویر! تمہاری ترقی کیوں نہیں ہوتی؟“

”کیسی بات کرتے بنے بھائی، ابھی نوکری کو صرف ایک سال ہوا ہے۔ ابھی سے ترقی کیسے ہو جائے گی؟“

”نہیں ہونی چاہیے۔ ضرور ہونی چاہیے۔ تم جیسے شریف آدمی کی تو ہر سال ترقی ہونی چاہیے۔ میں نے سنا ہے کہ جو پولیس والا کوئی کارنامہ انجام دے، اس کی ترقی ہو جاتی ہے۔“

”ہاں، یہ تو ہے لیکن کارنامہ کیا ہو؟“

”اس کا بندوبست کر دوں گا۔“ بنے بھائی نے کہا۔ ”تم اطمینان رکھو اور دیکھتے جاؤ۔“

پھر یہ ہوا کہ بنے بھائی نہ جانے کہاں سے ایک ناجائز پستول لے کر آ گئے۔ انہوں نے وہ پستول تنویر کے سامنے کرتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ دیکھو تنویر بھائی، یہ ایک ناجائز اسلحہ ہے۔ یعنی بغیر لائسنس کے۔“

”ارے یہ کہاں سے لے آئے بنے بھائی، یہ تو بہت بڑا جرم ہے۔ جاؤ پھینک دو اس کو، یا واپس کر دو۔“

”تنویر، یہ میں تمہاری حالت پر ترس کھا کر لایا ہوں۔“ بنے بھائی نے بتایا۔

”میری حالت پر ترس کھا کر؟ میں نہیں سمجھا۔“

”تم نے یہ پستول مجھ سے برآمد کیا ہے۔“ بنے بھائی نے کہا۔ ”میں کسی خطرناک ارادے سے یہ پستول لے کر بازار میں گھوم رہا تھا۔ تم نے دیکھ لیا اور میری تلاشی پر تم نے یہ پستول برآمد کر لیا۔“

”بنے بھائی، ایسا تو کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔“

”ارے بھائی سمجھا کرو، تم کو یہ کہنا ہے اور میں بھی اقرار کر لوں گا کہ ایسا ہی ہوا ہے۔“

”لیکن کیوں؟“

”ارے بھائی تمہاری ترقی ہو جائے گی اور کیا ہوگا؟“

تو ایسے تھے بنے بھائی۔ ہمدردی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور اسی چکر میں خود ان کی بھی کئی بار ٹھکائی ہو چکی

تھی۔ صورت شکل ایسی تھی کہ اس سے بہتر تھا کہ صورت شکل ہی نہ ہو۔

اکیلے انسان تھے، کہا جاتا ہے کہ ایک بار ان کی اماں نے کسی لڑکی سے ان کا رشتہ طے کر دیا۔ رشتے کے بعد جب اس لڑکی نے ایک بار بنّے بھائی کو دیکھا تو مارے صدمے کے خودکشی کر لی۔

بنّے بھائی بہت دنوں تک اس نہ ہونے والی کے دکھ میں بیمار پڑے رہے پھر آہستہ آہستہ زندگی کی طرف لوٹ آئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ ذریعۂ معاش کیا ہوتا ہے۔ انہوں نے اس قسم کا کوئی بکھیڑا ہی نہیں پالا تھا۔

ان کے کچھ رشتے دار کھاتے پیتے لوگ تھے۔ انہوں نے بنّے بھائی کا وظیفہ باندھ رکھا تھا۔ کسی سے دو ہزار مل جاتے تھے۔ کوئی تین ہزار دے دیتا تھا۔ سب ملا کر پندرہ سولہ ہزار مہینہ ہو جاتا تھا۔ ان کے لیے اتنا ہی بہت تھا۔

دو کمروں کا ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ جو اُن کے ابا چھوڑ گئے تھے۔ ان کے گھر میں بجلی تو تھی لیکن وہ رات میں بجلی نہیں جلاتے تھے۔ دن میں جلاتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ دن میں بجلی جلانے سے بل بہت کم آتا ہے۔

ایک دن میری دوست انجم نے مجھ سے کہا۔ ”یہ اس محلے کے بنّے بھائی کس مزاج کے انسان ہیں؟“

”کیوں کیا بات ہو گئی؟“

”انہوں نے میرے گھر اپنا رشتہ بھیجا تھا۔“ انجم نے بتایا۔

”کیا اپنے لیے تمہارا رشتہ مانگا ہے؟“

”ہاں بھئی، وہی تو بتا رہی ہوں۔“ انجم نے کہا۔ ”ان کے پڑوس میں ایک خاتون رہتی ہیں۔ ان کا ہمارے یہاں آنا جانا ہے۔ وہی بنّے بھائی کے کہنے پر رشتہ لے کر آئی تھیں۔“

”وہ آدمی شاید پاگل ہو گیا ہے۔“ میں جھنجلا کر بولا۔

”کیوں؟ اس میں پاگل پن کی کیا بات ہے؟“ انجم شرارت آمیز لہجے میں بولی۔ ”دل ہی تو ہے۔ موصوف نے مجھے کہیں دیکھ لیا تھا۔ بس دل آ گیا اب دل کا کیا بھروسا کسی پر بھی اور کسی بھی وقت آ جائے۔“

”چلو اچھا ہے، کر لو شادی۔“

”عجیب پاگل آدمی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”انسان کو اس قسم کی حرکت کرتے ہوئے سوچ لینا چاہیے۔“ انجم نے یکدم پینترا بدلا۔

”ارے اس میں سوچنے والی کون سی بات ہے۔ دل تو دل ہی ہوتا ہے۔“

”بکواس مت کرو۔ اور ہاں کل رات کو گھر آ جانا۔ امی نے تمہارے لیے کباب بنانے کا پروگرام بنایا ہے۔“

انجم سے میرا رشتہ ہونے... والا تھا۔ ابھی تک باقاعدہ کوئی گفتگو تو نہیں ہوئی تھی لیکن اس کے گھر والوں کا میری طرف بہت جھکاؤ تھا۔ ایک دو بار اشارہ بھی دے چکے تھے۔ انجم بہت اچھی لڑکی تھی۔ خوب صورت تو تھی ہی۔ اس کے علاوہ بہت سمجھ دار تھی۔ اس نے تعلیم بھی اچھی خاصی حاصل کر رکھی تھی۔ خود سوچیں، جب ایسی لڑکی کے لیے بنّے بھائی جیسے کا رشتہ آ جائے تو میری کیا کیفیت ہو سکتی ہے۔

اس محلے میں اور بھی لڑکیاں تھیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک. جیسے۔ نادرہ۔ وہ کسی کالج میں پڑھتی تھی۔ ایک نمبر کی تنک مزاج۔ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔ محلے کے کئی لڑکوں کی ٹھکائی کر چکی تھی۔

اسما۔ اس لڑکی کا بھی جواب نہیں تھا۔ اس کے والد کسی کالج میں پروفیسر تھے۔ خود بھی بہت پڑھی لکھی تھی۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔

ایک اور بھی تھی' زلیخا۔ پورا محلہ اس سے ڈرتا تھا۔ گالیاں دینے میں اس کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ محلے کے لونڈے اس کو دیکھ کر کترا کر گزر جاتے۔ وہ بے تحاشا گالیاں دینے لگتی تھی۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی تھیں۔

اور کمال کی بات یہ تھی کہ بنّے بھائی ہر ایک کو آزما چکے تھے۔ یعنی ہر ایک کے یہاں اپنی شادی کا پیغام بھیج چکے تھے لیکن ہر ایک نے برا بھلا کہہ کر انہیں انکار کر دیا تھا۔ بے چارے کی حالت پر کبھی کبھی افسوس بھی ہوتا تھا۔

محبت کے ترسے ہوئے انسان کو کسی کے آنچل کا سہارا مل جائے تو اس کی زندگی کے دن بدل جاتے ہیں۔

ایک بار مرزا صاحب راستے میں مل گئے۔ ”ارے بھائی، بنّے بھائی کیسے ہیں؟“ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

”کئی دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”خیریت تو ہے نا؟“

”میں نے سنا ہے کہ اُن کی طبیعت خراب ہے۔“

”اچھا اسی لیے دکھائی نہیں دیے۔ شام کو دفتر سے واپس آ کر دیکھ لوں گا۔“

”ہاں، ضرور چلے جانا۔“

بنّے بھائی کا مکان میرے گھر سے قریب ہی تھا۔ میں دفتر سے سیدھے ان کے گھر پہنچ گیا۔ ان کی ایک خاصیت یہ بھی تھی کہ وہ جب... گھر میں ہوتے، دروازہ کھلا ہی رکھتے تھے۔ اس وقت بھی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے دستک دی تو اندر سے بنّے بھائی کی آواز آئی۔ ”آ جائیں، دروازہ کھلا ہوا ہے۔“

میں اندر کمرے میں داخل ہوگیا اور کمرے میں داخل ہوتے ہی جو کچھ میں نے دیکھا۔ اس نے میرے ہوش اُڑا دیے۔ نادرہ بنّے بھائی کے سرہانے بیٹھ کر ان کا سر دبا رہی تھی۔ جی ہاں وہی نادرہ جو ایک نمبر کی تنک مزاج تھی اور ناک پر مکھی بھی نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔ وہی اُن کا سر دبا رہی تھی۔

مجھے دیکھ کر وہ ذرا گڑبڑا تو گئی لیکن اس نے اپنا کام جاری رکھا۔

میری حیرت کی انتہا نہیں رہی تھی۔ ابھی میں حیران ہی ہو رہا تھا کہ اسما داخل ہوئی۔ وہی لڑکی جو بہت خوب صورت تھی جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ وہ ایک بڑے سے باؤل میں کچھ لے کر آئی تھی۔

”یہ لیں میں آپ کے لیے یخنی بنا کر لائی ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”پھر مجھے دیکھ کر چپ ہوگئی۔

”ارے کوئی بات نہیں۔ یہ اپنے ہی آدمی ہیں۔“ بنّے بھائی نے کہا۔ ”تم یخنی پلا دو۔“

میرا خیال تھا کہ مجھے حیرت سے خودکشی کر لینی چاہیے۔ ایسا منظر دیکھنے کو مل رہا تھا... جس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

محلے کی دو خوب صورت لڑکیاں بنّے بھائی کی خدمت میں لگی ہوئی تھیں۔ ایک سر دبا رہی تھی۔ دوسری یخنی پلا رہی تھی۔

اور بنّے بھائی نواب کی طرح لیٹے ہوئے دونوں سے خدمت لے رہے تھے۔

”ہاں بھائی، تم نے میری طبیعت کی خرابی کا سنا ہوگا؟“ بنّے بھائی نے یخنی پیتے ہوئے مجھ سے پوچھا پھر اسما کی طرف دیکھا۔ ”یہ کیا بے کار کی یخنی بنا کر لائی ہو۔ اس میں نمک زیادہ ہوگیا ہے۔“

”سوری، ویری سوری۔“ اسما نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ ”میں آئندہ اس کا خیال رکھوں گی۔“

ابھی میں حیرت سے مرنے ہی والا تھا کہ اچانک زلیخا داخل ہوگئی۔ وہی ایک نمبر کی منہ پھٹ۔ جس سے پورا محلہ ڈرتا تھا جو گالیاں دیا کرتی تھی۔ وہ بھی کچھ بنا کر لائی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا لیکن کوئی پروا ہی نہیں کی۔

وہ بنّے بھائی کے پاس پہنچ کر بولی۔ ”یہ لو ڈیئر، تمہارے لیے کسٹرڈ بنا کر لائی ہوں۔“

آپ سوچ سکتے ہیں کہ میرا کیا حال ہو رہا ہوگا۔ میں بار بار خودکشی کے امکانات پر غور کرنے لگا تھا۔

”پہلے میں ان کو یخنی پلا دوں۔ پھر تم ان کو اپنا کسٹرڈ کھلا دینا۔“ اسما نے تنک کر کہا۔

یہ لیں ان دونوں کے درمیان ایک طرح کی رقابت کا سا سلسلہ شروع ہوگیا تھا اور کس کے لیے؟ بنّے بھائی کے لیے۔

زلیخا نے کسٹرڈ کھلانے کی کوشش ہی کی تھی کہ انجم بھی کمرے میں آگئی۔ اس کے ہاتھ میں بھی ایک پلیٹ تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ بُری طرح ٹپٹا گئی۔

”ارے آپ بھی یہاں ہیں؟“ اس نے خود کو سنبھال کر پوچھا۔

”ہاں، میں بھی ہوں اور تم کیا لائی ہو بنّے بھائی کے لیے؟“

”میں ان کے لیے حلیم بنا کر لائی ہوں، ان کو حلیم بہت پسند ہے۔“

اب تو میری خودکشی کے امکانات بڑھ چکے تھے۔ ایک محاورہ یاد آ گیا تھا۔ ایک انار سو بیمار۔ لیکن یہاں اس محاورے کی ایسی کی تیسی ہوگئی تھی۔ بنّے بھائی کے یہاں محاورہ ہو رہا تھا۔ ”ایک بیمار سو انار۔“

مجھ سے اب وہاں رہنا مشکل ہو رہا تھا اسی لیے میں بنّے بھائی سے اجازت لے کر اس کمرے سے باہر آ گیا۔

ایک آگ سی لگی ہوئی تھی۔ میں جو کچھ بھی دیکھ رہا تھا، وہ مجھے پاگل کرنے کو بہت تھا۔

دو چار دنوں کے بعد بنّے بھائی سے راستے میں ملاقات ہوئی۔ اب وہ بالکل ٹھیک ہو چکے تھے۔

مجھ سے برداشت نہیں ہوا... تو میں نے پوچھ لیا۔ ”بنّے بھائی، یہ کیا چکر ہے۔ یہ محلے کی ساری لڑکیاں آپ پر مہربان کیوں ہوگئیں؟“

”میاں تم کو بتا ہی دوں تو زیادہ اچھا ہے۔“

”ہاں، بتا دیں۔“

”بھائی تم روشن کو جانتے ہو؟ وہی جو میرے پڑوس میں رہتی ہے۔“

”ہاں جانتا ہوں۔“

”میں نے تماشائے اہلِ کرم دیکھنے کے لیے اس سے یہ کہہ دیا تھا کہ میرا پانچ کروڑ کا بانڈ نکل آیا ہے۔ انہوں نے محلے کے ہر اس گھر میں یہ خبر اُڑا دی جس گھر میں جوان لڑکیاں ہیں۔ بس لڑکیوں نے میری عیادت کے لیے میرے گھر آنا شروع کر دیا اور اب میں اس محلے کو چھوڑ کر جا رہا ہوں۔“

”وہ کیوں؟“

”اس لیے کہ یہ بھانڈا تو پھوٹنا ہی ہے، پھر کیا ہوگا؟“

اور اس وقت مجھے پتا چلا کہ بنّے بھائی بے وقوف نہیں تھے۔ بلکہ ہم سب بے وقوف تھے اور آج تک ہیں۔ ہم سے تو اتنا بھی نہیں ہوتا کہ اس قسم کی کوئی افواہ ہی اُڑا دیں......

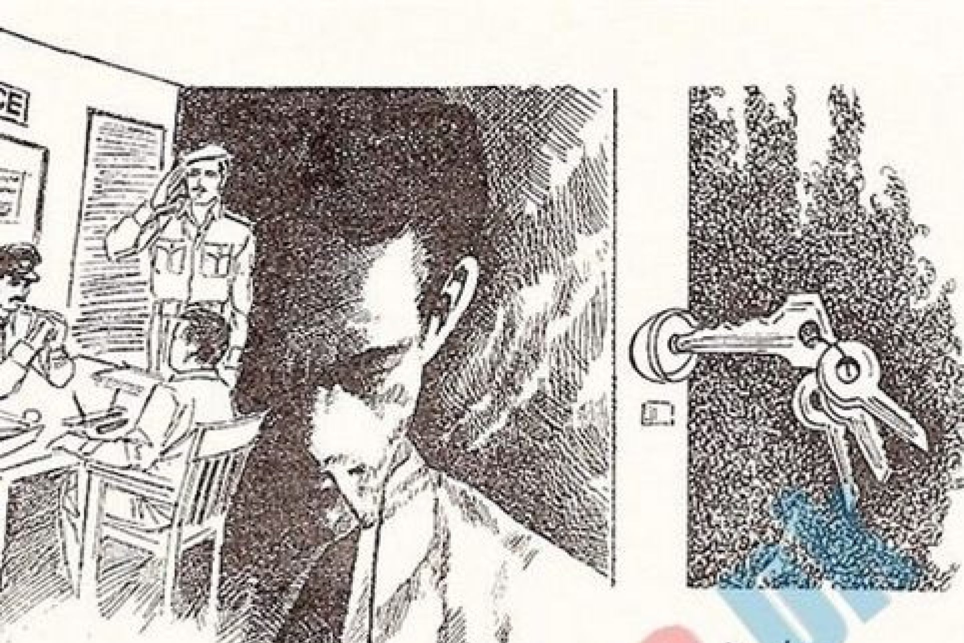

ٹیڑھی انگلی

محمد فاروق انجم

گھریلو الجھنیں اور معاشی مسائل بعض اوقات ایسی گتھیوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں کہ جتنا سلجھانے کی کوشش کرو... اسی قدر الجھتی چلی جاتی ہیں... متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے ایک ایسے ہی شخص کی مشکلات... غمِ روزگار نے ہر سو بکھیری دل فریبی سے اسے بددل کر دیا تھا... دفتری امور دلجمعی اور ایمانداری سے ادا کرنے کے باوجود اس کی حوصلہ شکنی ہو رہی تھی... جن مراعات کا حق دار تھا، وہ نہیں مل رہی تھیں...

تلخ حقائق کا مقابلہ کرنے والے معاملہ فہم کا منطقی اقدام...

رات آدھی سے زیادہ گزر گئی تھی اور زاہد کی آنکھوں میں نیند کا نام و نشان نہیں تھا۔ وہ بار بار کروٹیں بدل رہا تھا۔ اس کا چہرہ پریشان اور دماغ میں کئی سوچوں کے انبار اسے اپنے بوجھ تلے دبائے جا رہے تھے۔ بیڈ پر اس کی بیوی فوزیہ نیند کی آغوش میں اس سے بے خبر تھی کہ اس کا شوہر کس کیفیت سے گزر رہا ہے۔

زاہد کا دل گھبرا رہا تھا اور صبح ہوتے ہی اسے جن مسائل کا سامنا کرنا تھا ان کے بارے میں سوچ کر وہ اور بھی پریشانی

کی دلدل میں دھنستا جا رہا تھا۔ وہ مضطرب ہو کے اٹھ گیا اور سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر اسی طرح بیٹھنے کے بعد بھی جب چین نہ ملا تو وہ لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

رات کا آخری پہر تھا جب اسے نیند نے آلیا۔ ابھی سورج طلوع ہو رہا تھا جب فوزیہ نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے آواز دے کر اسے جگا دیا۔ فوزیہ کی آہستہ اور ہلکی آواز پر ہی اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

''کیا ہوا......؟'' زاہد نے گھبرائی آواز میں پوچھا۔

''مالک مکان آیا ہے۔'' فوزیہ نے بتایا۔

یہ سن کر زاہد کا چہرہ ایک دم سے پریشان ہو گیا۔ فوزیہ نے زاہد کو رات ہی مطلع کر دیا تھا کہ آج مالک مکان یہ کہہ کر گیا ہے کہ میں مسلسل آ رہا ہوں اور زاہد مجھے مل نہیں رہا ہے اس لیے میں فجر کی نماز پڑھتے ہی گھر آؤں گا۔

''وہ آ گیا ہے؟ اب کیا بہانہ کروں؟'' زاہد نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''اب کوئی بہانہ نہیں ہو سکتا ہے اس لیے بہتر ہے کہ تم اس سے مل لو۔'' فوزیہ نے مشورہ دیا۔

زاہد نے کچھ سوچا اور اٹھ کر منہ ہاتھ دھونے چلا گیا۔ منہ ہاتھ تولیے سے خشک کرنے کے بعد وہ ذرا سا دروازے پر چلا گیا۔ سامنے مالک مکان کھڑا تھا۔ زاہد کو دیکھتے ہی وہ مسکرایا اور بولا۔

''میں جب بھی گھر آتا ہوں، آپ سے ملاقات نہیں ہو پاتی۔ آپ صبح کام پر چلے جاتے ہیں اور رات گئے واپس آتے ہیں اس لیے میں نے مناسب یہ سمجھا کہ آپ سے فجر کی نماز کے بعد ملاقات کر لوں اس وقت تو آپ گھر پر مل ہی جائیں گے۔''

''آج کل آفس میں کام کا بہت بوجھ ہے۔'' زاہد بولا۔

''ایک بات تو بتائیں زاہد میاں۔ آپ اتنا کام کرتے ہو۔ اور پھر بھی یہ کہتے ہو کہ میری تین ماہ سے تنخواہ رکی ہوئی ہے۔ جب تنخواہ مل نہیں رہی تو کام کس خوشی میں کیے جا رہے ہو؟'' مالک مکان نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اب میں کیا کروں۔ نوکری چھوڑتا ہوں تو نئی نوکری ملنا آسان نہیں ہے۔ میرا باس کہتا ہے کچھ پرابلم چل رہے ہیں، بس جلدی ساری تنخواہ مل جائے گی۔'' زاہد نے کہا۔

''زاہد میاں...... میرا دو ماہ کا کرایہ رکا ہوا ہے۔ اب اس کا کیا کرنا ہے؟'' مالک مکان اپنی اصل بات کی طرف مڑا۔

''بس چند دن انتظار کر لیں۔ میری تین ماہ کی تنخواہ مل جائے گی اور میں آپ کا کرایہ ادا کر دوں گا۔''

''چند دن سے آپ کی کیا مراد ہے؟ میرا مطلب ہے کہ میں کتنے دن رک جاؤں...... چار دن...... سات دن......؟ مجھے ذرا وضاحت کر دیں...... آپ میرے اچھے کرائے دار ہیں، اس لیے میں سخت رویہ اپنانے کے بجائے پیار محبت کا راستہ نکال رہا ہوں۔''

''چند دن سے میری مراد ہے کہ یکم آنے میں آٹھ دن باقی ہیں۔ مجھے میرے باس نے کہا ہے کہ وہ اس یکم کو میرے سارے واجبات ادا کر دے گا۔'' زاہد نے کہا۔

''اب بات واضح ہو گئی ہے۔ میں یکم کے بجائے دو تاریخ کو آؤں گا۔ اگر آپ نے دو ماہ کا کرایہ ادا کر دیا تو ٹھیک ہے...... ورنہ آپ کے دیے ہوئے ایڈوانس میں سے دو ماہ کا کرایہ کاٹ کر باقی رقم آپ کو دے دوں گا اور آپ دو دن کے اندر اندر میرا یہ مکان خالی کر دیں گے...... دیکھیں زاہد میاں یہ میرا دوٹوک فیصلہ ہے۔ میرے اس فیصلے پر آپ چپ چاپ عمل کر لیں گے تو اچھا ہوگا۔ ورنہ مجھے سخت رویہ اپنانا پڑے گا اپنا مکان خالی کرانے کے لیے......'' مالک مکان نے سپاٹ لہجے میں دوٹوک کہہ دیا۔

''دیکھیں آپ......'' زاہد نے کچھ کہنا چاہا تو مالک مکان نے اپنا ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا اور کہا۔

''اب ہماری دو تاریخ کو ملاقات ہو گی۔'' وہ اتنا کہہ کر چلا گیا اور زاہد اپنا افسردہ چہرہ لیے دروازے میں کھڑا رہا۔ فوزیہ دروازے کے پیچھے کھڑی دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔ جب زاہد اندر آیا تو فوزیہ نے کہا۔

''اب کیا کرنا ہے؟''

''آج باس سے دوٹوک بات کروں گا۔'' زاہد بولا۔

''مجھے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ سارے اسٹاف کو تنخواہیں وقت پر مل رہی ہیں، ایک تم ہی ہو جس کی تنخواہ اس نے تین ماہ سے روکی ہوئی ہے...... اصل وجہ ہے کیا؟''

''یقین کرو فوزیہ مجھے خود بھی نہیں پتا۔ میں اپنا سارا کام ایمانداری سے کرتا ہوں۔ وقت پر جاتا ہوں اور وقت پر آتا ہوں۔ بلکہ باس مجھے روک لیتا ہے اور کوئی نہ کوئی مزید کام نکال کر دے دیتا ہے۔ میں جب بھی ان سے بات کرتا ہوں کہ آپ نے میری تنخواہ کیوں روکی ہوئی ہے تو گول سا جواب دے کر میرے سوال کو دائیں بائیں کر دیتا ہے۔'' زاہد نے بتایا۔

''پلیز آج اچھی طرح سے پوچھ لینا کہ اصل وجہ کیا ہے۔

UrduBooks.pk

بجلی کا بل آچکا ہے اور اس کی پرسوں آخری تاریخ ہے۔ گھر کا راشن بھی تقریباً ختم ہو چکا ہے اور......"

"پلیز اور کچھ مت بتانا، ورنہ میرا دل رک جائے گا۔" زاہد پریشان ہو کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ فوزیہ بھی اداس سی ہو کر ایک طرف بیٹھ گئی۔

زاہد کو واقعی اس بات کا علم نہیں تھا کہ اس کا باس سلطان احمد اس سے کیوں خار کھائے بیٹھا ہے۔ زاہد جب بھی اپنی تنخواہ کے بارے میں دریافت کرتا تھا، اس کا باس اسے گول سا جواب دے دیتا تھا۔

"کچھ مسائل ہیں...... اس لیے چند لوگوں کی تنخواہیں بروقت ادا نہیں ہو رہی ہیں، ان میں تم بھی ہو لیکن بے فکر رہو جلدی سارے واجبات ادا ہو جائیں گے۔"

زاہد ان مسائل کے بارے میں کچھ تقاضا کرتا، یا یہ کہتا کہ جہاں تک اس کے علم میں ہے صرف اسی کی تنخواہ رکی ہوئی ہے تو باس اس کی طرف آنکھیں نکال کر دیکھتا اور اسے گھورتے ہوئے کہتا۔ "میری بات پر یقین نہیں ہے......؟"

زاہد اس ڈر سے چپ ہو جاتا کہ اگر اسے باس کھڑے کھڑے نوکری سے نکال دے تو وہ کیا کرے گا، نوکری ملنا کونسا آسان کام ہے اس لیے وہ چپ ہو جاتا۔

یہ حقیقت تھی کہ باس نے صرف اسی کی تنخواہ روکی ہوئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ضدی، گھمنڈی، حسن پرست، عاشق مزاج اور کسی بھی لمحے کرخت لہجے کا مالک بن جانے والا باس، اس شام ایک ریسٹورنٹ میں اپنی دوست کے ساتھ براجمان پیار و محبت کی باتوں میں مشغول تھا کہ اچانک اس ریسٹورنٹ میں زاہد داخل ہوا اور کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔

اس ریسٹورنٹ میں زاہد کا ایک دوست کام کرتا تھا وہ اسی سے ملنے آیا تھا۔ باس نے زاہد کو دیکھ لیا لیکن یہ سچ تھا کہ زاہد کے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہو سکا تھا کہ اس کا باس اپنی دوست کے ساتھ اس ریسٹورنٹ میں موجود ہے۔ ایک گھنٹے کے بعد اپنے دوست سے ملاقات کر کے زاہد اس جگہ سے چلا گیا۔

جب باس اپنے گھر پہنچا تو اس کی بیوی کی قہر برساتی نگاہیں باس کو تیز چھری کی طرح نوچ رہی تھیں۔ اس کی بیوی نے اپنے شوہر سے پوچھا کہ تم آج کس لڑکی کے ساتھ ریسٹورنٹ میں تھے؟

باس نے یہ سنا تو اس کا خیال سیدھا زاہد کی طرف چلا گیا۔ باس نے بہت صفائی دینے کی کوشش کی لیکن اس کی بیوی نے اپنا موبائل فون اس کے سامنے کرتے ہوئے بتایا۔

"یہ دیکھو! مجھے کسی کا میسج آیا تھا کہ تم اس ریسٹورنٹ میں اپنی بیٹی کی عمر کی لڑکی کے ساتھ ہو۔"

باس نے کوشش کی کہ کسی طرح سے وہ اس نمبر کو پڑھنے میں کامیاب ہو سکے جس نمبر سے اس کی بیوی کو میسج آیا تھا لیکن اس کی بیوی نے زیادہ دیر اپنا موبائل فون اس کے سامنے نہیں رکھا۔ اس کے بعد دونوں میں خوب لڑائی ہوئی اور اس کی بیوی نے میکے جانے کی دھمکی دے دی۔ باس نے بمشکل اپنی بیوی کو ٹھنڈا کیا اور اس سے وعدہ کیا کہ وہ آئندہ کبھی ایسی حرکت نہیں کرے گا۔ اپنے شوہر سے کئی وعدے لینے کے بعد اس کی بیوی کا موڈ کسی حد تک ٹھیک ہوا۔

اب باس کو یقین تھا کہ یہ میسج زاہد نے کسی طرح سے اس کی بیوی کا نمبر لے کر میسج کیا ہے۔ جبکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ باس کی بیوی کا بھائی اتفاق سے اس ریسٹورنٹ میں تھا اور اس نے دونوں کو دیکھ کر اپنی بہن کو میسج کیا تھا اور تاکید کی تھی کہ اس کا نام نہ آئے۔

اس کے بعد باس نے اپنی دوستوں کے ساتھ ملاقات کے لیے اس سے بھی دور دراز کے ریسٹورنٹ تلاش کر لیے تھے لیکن باس کے دل میں زاہد کے لیے غصہ بھر گیا تھا۔ اسی غصے کی پاداش میں باس نے پہلے اس کی تنخواہ روکی اور پھر اس پر کام کا بھی بوجھ بڑھا دیا کہ سارا اسٹاف چلا جاتا اور زاہد کو کام کے لیے رکنا پڑتا۔ زاہد کو معلوم بھی نہیں تھا کہ باس کی کس غلط فہمی کا شکار ہو کر وہ اس کے قہر کا لقمہ بن رہا ہے۔

زاہد اپنے بستر پر لیٹ گیا لیکن اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس کی پریشانی بڑھ گئی تھی۔ وہ اٹھا اور تیار ہو کر چند لقمے کھا کر آفس چلا گیا۔

جب وہ آفس پہنچا تو اس وقت کوئی بھی نہیں آیا تھا اور چوکیدار میز کرسیاں صاف کر رہا تھا۔ باس ایک چوکیدار سے ہی کام لیتا تھا۔

"آج آپ جلدی آگئے صاحب؟" چوکیدار نے پوچھا۔

"کل کا کچھ کام رہتا تھا۔ سوچا جلدی جا کر پہلے اسے ختم کر دوں۔" زاہد نے کہہ کر اپنے کندھے سے اپنا بیگ اتار کر ایک طرف رکھا اور کام میں مصروف ہو گیا۔ اس کے بعد اسٹاف آنا شروع ہو گیا اور پھر معمول کا کام شروع ہو گیا۔

زاہد نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ آج باس سے دوٹوک بات کر کے اپنی تنخواہ لے کر رہے گا۔ سارا دن وہ اپنے آپ کو باس کے ساتھ بات کرنے کے لیے تیار کرتا رہا اور سوچتا رہا کہ اسے باس کو کیا کہنا ہے۔

آفس ٹائم ختم ہو گیا اور اسٹاف چھٹی کر کے جانے لگا۔

زاہد کی میز پر ابھی بھی کام پڑا تھا اور باس نے حکم دیا تھا کہ وہ اسے ختم کر کے جائے گا۔ باس کا آج ایک لڑکی کے ساتھ ڈنر تھا اس لیے وہ اطمینان سے اپنے کمرے میں براجمان اپنے موبائل فون پر ویڈیو گیم کھیلتے ہوئے وقت گزار رہا تھا۔

سات بج گئے تھے۔ ہال میں بہت سی کرسیوں اور میزوں کے بیچ اپنی جگہ پر زاہد بیٹھا کام کر رہا تھا۔ چوکیدار باہر دروازے پر بیٹھا تھا اور باس اندر اپنے موبائل فون پر جھکا ہوا تھا۔ پھر اس نے وقت دیکھا اور اپنا موبائل فون ایک طرف رکھ دیا۔

باس نے دراز کھولی اندر سے ہزار اور پانچ پانچ ہزار والے نوٹ نکالے اور انہیں گننے لگا۔ وہ ان نوٹوں کو الگ الگ گڈیوں میں ایک طرف رکھ رہا تھا۔ جونہی وہ نوٹ گن کر فارغ ہوا دروازے پر ہلکی دستک ہوئی اور باس کے منہ سے نکل گیا۔

''یس......''

دروازہ کھلا اور زاہد اندر آ گیا۔ اسے دیکھتے ہی باس نے جلدی سے میز پر رکھے پیسے دراز میں رکھ دیے اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے ناگوار لہجے میں پوچھا۔

''کیا بات ہے؟''

''آپ سے ایک ضروری بات کرنی تھی۔'' زاہد بولا۔

''ضروری بات کل کریں گے ابھی میں ایک جگہ جا رہا ہوں۔'' باس نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

''سر مجھے مالک مکان نے مکان خالی کرانے کی دھمکی دے دی ہے۔ میری جیبیں خالی ہو گئی ہیں اور میں بہت پریشان ہوں برائے مہربانی مجھے میرے بقایاجات ادا کر دیں۔''

''اس بارے میں ہم کل بات کریں گے ابھی مجھے جلدی ہے۔'' باس بولا۔

''سر میں بہت مجبور ہوں۔''

''میں بھی تو مجبور ہوں۔ اسی وجہ سے تنخواہیں رکی ہوئی ہیں۔''

''صرف میری تنخواہ روکی ہوئی ہے آپ نے، جبکہ باقی سارے اسٹاف کو وقت پر تنخواہیں مل رہی ہیں۔''

''تم پرسوں مجھ سے اس بارے میں بات کرنا۔ میں کوئی حل نکالتا ہوں بلکہ پرسوں بھی نہیں...... پرسوں بھی میری اہم میٹنگ ہے...... میں فری ہو کر اسی ہفتے کسی بھی دن تم کو اس بارے میں بات کرنے کے لیے بلا لوں گا۔ ابھی تم جاؤ۔''

''سر آپ سمجھنے کی کوشش کریں، میرے گھر میں بھوک ڈیرے ڈال رہی ہے اور آپ میری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کر رہے۔'' زاہد کو باس کی بات سن کر غصہ تو بہت آیا لیکن اس نے اپنے غصے کو قابو میں رکھتے ہوئے پوری کوشش کی کہ اس کے لہجے سے اس کے اندر کا غصہ عیاں نہ ہونے پائے۔

باس نے اس کی طرف گھور کر دیکھتے ہوئے دانت پیس کر کہا۔ ''تمہاری مجبوریاں کیا ہیں، مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے، میں نے تم سے کہہ دیا ہے کہ اگلے ہفتے تم سے تمہارے واجبات کی بات کروں گا...... اب تم چھٹی کرو اور چلے جاؤ۔''

''سر......'' زاہد نے کہنا چاہا۔

باس فوراً بولا۔ ''میں نے کہا کہ تم جاؤ۔''

زاہد ناچار باس کے سامنے کھڑا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کیا کرے۔ مکان کے کرائے سے لے کر مالک مکان کی دی ہوئی وارننگ اور گھر کے اخراجات اسے سب کچھ یاد آنے لگا۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس موقع پر اگر وہ اپنے باس سے الجھتا جاتا تو وہ نوکری اور اپنے واجبات سے بھی شاید ہاتھ دھو بیٹھتا۔ اس کے پاس ایک ہی راستہ بچتا تھا وہ اس وقت چپ چاپ چلا جائے اور کل باس کا موڈ ٹھیک ہونے پر پھر اپنی بات نرم لہجے میں باس کو سمجھانے کی کوشش کرے...... شاید اس کے باس کے دل میں اس۔ کے لیے رحم پیدا ہو جائے اور اس کا مسئلہ حل ہو جائے۔

زاہد کمرے سے باہر نکلا اور جونہی اس نے دروازہ بند کیا، اس نے ہال پر نظر دوڑائی...... نیم روشن ہال میں میز کرسیاں اور خاموشی کا راج تھا۔ اس وقت یہاں اس کے علاوہ باس اور چوکیدار تھا۔ ایک عجیب سا خیال زاہد کے دماغ میں آیا اور اس کا دل زور سے دھڑکا...... وہ مجبور اور باس کی ہٹ دھرمی کے عتاب میں تھا اور جس خیال نے اسے چونکا دیا اس خیال پر عمل کر کے وہ اپنی انگلی ٹیڑھی کر کے ہی گھی نکال سکتا تھا۔ یہ اس کے پاس بہترین موقع تھا۔ وہ بغیر کوئی ثبوت چھوڑے کام کر سکتا تھا۔

ابھی زاہد سوچ ہی رہا تھا کہ اس کے عقب سے کمرے کا دروازہ کھلا اور باس کی کرخت آواز نے اسے چونکا دیا۔

''جاتے ہوئے چوکیدار کو میرے پاس بھیج دینا......''

حکم دیتے ہی باس نے دروازہ بند کر دیا۔

زاہد تیزی سے اپنی میز کے پاس گیا۔ اس نے جلدی جلدی اپنا سامان اپنے بیگ میں ڈالا اور بیگ کندھے پر لٹکا کر باس کے کمرے کی طرف بڑھا۔ باس کے کمرے کے

دائیں جانب دیوار میں ایک شیشہ لگا ہوا تھا جس سے وہ آرپار دیکھتا تھا۔

باس نے اپنے کمرے کی لائٹ بند کر دی تھی اور ہلکی روشنی کمرے میں پھیل رہی تھی۔ زاہد دیوار کے ساتھ چپک گیا اور ذرا سا سر نکال کر اس نے ایک آنکھ سے شیشے کے اندر دیکھنا شروع کر دیا۔

باس اپنی کرسی کے پیچھے ایک الماری کو ہٹا کر اندر موجود سیف میں وہ روپے رکھ رہا تھا۔ روپے رکھنے کے بعد اس نے سیف کو لاک کیا اور الماری آگے کر دی۔ اب کوئی بھی دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس الماری کے پیچھے سیف بھی ہے۔ باس نے سیف کی چابیاں ایک شیلف میں رکھیں، چند کتابوں میں سے ایک کتاب نکالی، وہ بظاہر کتاب کی طرح تھی لیکن وہ ایک بکس تھا۔ باس نے اسے کھولا اندر وہ چابیاں رکھیں اور وہ بکس ان کتابوں میں رکھ دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بھی ایک کتاب ہی ہو۔

زاہد اس جگہ سے ہٹ گیا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ اسٹول پر چوکیدار بیٹھا تھا۔ زاہد نے جاتے ہی کہا۔

”تم کو باس اندر بلا رہے ہیں۔“ زاہد نے کہہ کر آگے قدم بڑھا دیے۔ چوکیدار اپنی جگہ سے اٹھا اور اندر چلا گیا۔ زاہد نے گردن گھما کر چوکیدار کو اندر جاتے دیکھا اور اسی جگہ سے وہ پلٹ کر دروازے تک آیا اور اس نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ ہال نیم روشن تھا۔ اسے چوکیدار کہیں دکھائی نہیں دیا۔ اس کی دانست میں چوکیدار یقیناً اس وقت باس کے کمرے میں ہوگا۔ زاہد تیزی سے اندر گیا اور ایک میز کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ وہ میز اس جگہ تھی کہ زاہد وہاں سے چھپ کر باس کے کمرے اور باہر کی طرف جانے والے دروازے پر نظر رکھ سکتا تھا۔

زاہد کا دل گھبرا رہا تھا اور اس کے چہرے پر خوف مترشح تھا۔ وہ میز کے پیچھے اپنے آپ کو سمیٹ کر بیٹھا تھا۔ اس کی نگاہیں بدستور باس کے کمرے کی طرف تھیں۔

تھوڑی دیر کے بعد چوکیدار، باس کا دفتری بیگ اٹھائے باہر نکلا تو اس کے پیچھے ہی باس بھی دکھائی دیا۔ دونوں دروازے کی طرف چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد بھی زاہد اس جگہ براجمان رہا اور اب اس کی نگاہ باہر جانے اور اندر آنے والے دروازے کی طرف تھی۔

دس منٹ کے بعد چوکیدار پھر اندر آیا۔ اس نے باس کے کمرے کا دروازہ لاک کیا اور چابی ایک مخصوص جگہ پر رکھی اور باہر نکل گیا۔ زاہد نے اس خاموشی میں باہر والے دروازے کے قفل میں چابی گھومنے کی آواز سنی اور تھوڑی دیر مزید اسی جگہ بیٹھنے کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازے کی طرف دیکھتا رہا۔ آفس کا چوکیدار آفس مقفل کر کے چلا جاتا تھا اور پھر اس عمارت کے چار چوکیدار نیچے براجمان ہوتے تھے۔

اچھی طرح سے تسلی کرنے کے بعد زاہد تیزی سے اس جگہ کی طرف گیا جہاں چوکیدار نے چابی رکھی تھی۔ چابی نکال کر اس نے باس کے کمرے کا دروازہ کھولا، اندر جا کر اس نے وہ کتاب نکالی اندر سے سیف کی چابی ہاتھ میں پکڑ کر اس نے کتاب میز پر رکھی اور الماری ہٹا کر اس نے سیف کھولا تو اس کی خیرہ نگاہیں اسی جگہ منجمد ہو گئیں۔ سیف میں ہزار ہزار کے نوٹوں کی کئی گڈیاں تہ در تہ رکھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف کچھ گڈیاں پانچ پانچ ہزار کے نوٹوں کی بھی تھیں۔ کانپتے ہاتھوں اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ زاہد نے پانچ ہزار کے نوٹوں کی ایک گڈی اٹھالی۔

زندگی میں پہلی بار وہ ایسا کر رہا تھا۔ ایسا کرنے کے لیے اسے باس نے ہی مجبور کیا تھا۔ اگر اس کا باس اسے وقت پر تنخواہ دے دیتا تو اسے ٹیڑھی انگلی نہ کرنا پڑتی۔ اب جب اس نے ٹیڑھی انگلی کر ہی لی تھی تو اس نے سوچا، کیوں نہ وہ کچھ زیادہ وصول کرلے۔

پانچ ہزار کے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اس نے اپنی جیب سے رومال نکال کر اپنی انگلیوں کے نشان صاف کیے، سیف مقفل کرنے کے بعد الماری آگے کر دی۔ وہاں سے بھی اس نے اپنی انگلیوں کے نشان صاف کیے، اور جب اس نے چابی اس کتاب نما بکس میں رکھ کر اسے شیلف میں رکھ دیا تب بھی اس نے اچھی طرح سے اپنی انگلیوں کے نشان صاف کر دیے تھے۔

وہ کمرے سے باہر نکل کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور دل کی دھڑکن منتشر تھی۔ گھبراہٹ اور خوف سے اس کا جسم لرز رہا تھا۔ پانچ ہزار کے نوٹوں کی گڈی اس کے سامنے پڑی تھی۔

زاہد نے وہ سب تو کر لیا تھا۔ اب وہ یہ سوچ رہا تھا وہ اس گڈی کو کہاں رکھے؟ صبح دروازہ چوکیدار کو ہی کھولنا تھا۔ زاہد نے سوچا تھا جب چوکیدار دروازہ کھول کر باس کے کمرے کا دروازہ کھولے گا تو وہ اس وقت باہر نکل جائے گا۔ اس عمارت کی سیڑھیاں پیچھے کی طرف بھی اترتی تھیں جہاں سے آنے جانے والوں کا بہت کم گزر ہوتا تھا۔ وہ اس جگہ سے نیچے جا کر کسی جگہ بیٹھ کر ناشتا کرے گا۔ اور آفس ٹائم سے پہلے

آفس میں ایسے ہی آجائے گا جیسے وہ گھر سے روزانہ آتا تھا۔ کسی کو کوئی شک نہیں ہوگا۔

اب مسئلہ یہ تھا اگر باس نے اسی دن سیف کھول کر دیکھ لیا اور پانچ ہزار کے نوٹوں کی ایک گڈی غائب دیکھ کر وہ جانے کیا قدم اٹھائے؟ اس کی تفتیش کا کیا طریقۂ کار ہوگا؟ کس پر اس کا شک جائے گا؟ وہ کیا کرے گا؟ کسی بھی غیر متوقع صورتِ حال سے نمٹنے اور اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ نوٹوں کی گڈی اس کے پاس نہ ہو۔

زاہد نے سوچا وہ فوزیہ کو میسج کر کے صبح اس وقت باہر بلالے جب وہ اس عمارت سے نکلے گا اور وہ پیسے فوزیہ کو دے دے۔ لیکن پھر اس نے سوچا اب جانے چوکیدار کس وقت دروازہ کھولتا ہے۔ آفس ٹائم شروع ہونے سے ایک گھنٹا پہلے، یا اس سے کم وقت پر......؟ وہ فوزیہ کو بلالے اور وہ خود اس جگہ سے نکل نہ سکے۔

زاہد ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ وہ ایک دم چونکا اور ڈر سا گیا۔ اس کے موبائل فون میں سرسراہٹ ہو رہی تھی۔ فوزیہ کی کال تھی۔ اس نے فون کان کو لگایا ہی تھا کہ دوسری طرف سے آواز آئی۔

''آپ آئے نہیں ابھی تک......؟''

''آج آفس میں کام زیادہ ہے۔ شاید میں رات بھر نہ آسکوں۔'' زاہد نے جواب دیا۔ اس کا لہجہ دھیما تھا۔

''پیسہ تو ایک بھی نہیں ملتا اور کام وہ چوبیس گھنٹے لیتا ہے۔'' فوزیہ بگڑ کر بولی۔

''میری تنخواہ کا واؤچر بن گیا ہے۔ صبح میرے سارے پیسے مل جائیں گے۔'' زاہد نے بتایا۔

''کیا واقعی؟'' فوزیہ خوش ہوگئی۔

''ہاں واقعی......اب تم فون بند کرو، مجھے جلدی سے کام ختم کرنا ہے۔ میں تم کو کال کروں گا۔'' زاہد نے کہہ کر خود ہی فون بند کردیا۔ اس کا دماغ بہت سی سوچوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب وہ کیا کرے؟

اچانک اس کے موبائل فون پر پھر سرسراہٹ ہوئی۔ اسکرین پر فوزیہ کا نام تھا۔ اس نے فون کان کو لگا کر سرگوشی کی۔

''بولو کیا بات ہے؟''

''میں کہہ رہی تھی کہ صبح آتے ہوئے ناشتا بھی لے آیئے گا۔'' دوسری طرف سے فوزیہ نے کہا۔

''صبح تم ناشتا نہیں بناؤ گی؟''

فوزیہ بولی۔ ''کئی ہفتوں سے ہم نے باہر کا ناشتا نہیں کیا۔ کل آپ کو پیسے مل جائیں گے تو باہر کا ناشتا کرلیں گے۔ ویسے بھی کل سنڈے ہے۔''

''کل سنڈے ہے؟'' یہ سنتے ہی زاہد ایسے اُچھلا جیسے زمین میں کرنٹ آگیا ہو۔ اس کو خیال ہی نہیں رہا تھا کہ کل اتوار ہے اور آفس بند ہے۔ اس کے جسم میں بے چینی دوڑنے لگی۔ اس کا مطلب تھا کہ کل آفس کا دروازہ نہیں کھلے گا اور وہ اندر ہی قید رہے گا۔

''تم اتنا حیران کیوں ہوگئے ہو؟'' فوزیہ نے پوچھا۔

''کک...... کچھ نہیں...... میں تم کو بعد میں کال کرتا ہوں۔'' زاہد نے مضطربانہ انداز میں فون بند کردیا۔ اتوار کی چھٹی نے اسے پریشان کردیا تھا۔ ایک دم وہ آفس کے کچن میں چلا گیا۔ وہاں خشک دودھ، چائے کی پتی، چینی اور تھوڑے سے بسکٹ پڑے تھے۔ پینے کے لیے پانی وافر تھا۔ اس جگہ رہ کر اس کا گزارہ تو ہوسکتا تھا لیکن جب وہ گھر نہیں جائے گا تو فوزیہ پریشان ہوجائے گی۔ اس لیے اب اس کو بتانا ضروری ہوگیا تھا۔ اس نے سوچا وہ فوزیہ کو حقیقت سے آگاہ کردے، تاکہ دونوں اس معاملے میں اپنی اپنی جگہ محفوظ رہ سکیں۔

فوزیہ کو کال کرنے سے قبل زاہد نے سوچا اگر وہ فوزیہ کو سب کچھ بتادے گا تو وہ پریشان ہوجائے گی اور اسے آفس سے نکالنے کے لیے جانے ایسا کیا قدم اٹھائے کہ وہ پھنس جائے۔ اگر وہ پھنس گیا تو اس کا باس جو اس سے پہلے ہی نالاں ہے وہ نہ جانے اس پر کیا سنگین الزام لگادے؟ اس طرح وہ ایسی مصیبت میں گرفتار ہوجائے گا جس سے نکلنے کا اسے راستہ نہیں ملے گا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی تھی کہ فوزیہ اکیلی تھی۔ وہ پریشانی میں کچھ بھی ایسا کرسکتی تھی جس سے زاہد کے لیے مشکل کھڑی ہوسکتی تھی۔ لہٰذا زاہد نے فیصلہ کیا وہ فوزیہ کو کچھ نہیں بتائے گا اور خود ہی اس جگہ سے نکلنے کی کوشش کرے گا۔

زاہد کے علم میں تھا اس آفس میں آنے اور جانے کے دو دروازے تھے۔ ایک عقب میں جو ہمیشہ مقفل رہتا تھا اور دوسرا دروازہ سامنے کی طرف تھا جس طرف سے سارا اسٹاف آتا جاتا تھا۔

زاہد عقب والے دروازے کے پاس گیا اور اس کا ہینڈل گھما کر دیکھا وہ مقفل تھا۔ جو کھڑکیاں تھیں ان پر لوہے کی گرل لگی ہوئی تھی۔ زاہد نے اچھی طرح سے دیکھ لیا وہ اس جگہ قید ہوکر رہ گیا تھا۔ اس کے لیے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ زاہد پریشان سا ایک طرف بیٹھ گیا۔ اسی سوچ بچار اور فکر

پریشانی میں کافی وقت گزر گیا۔ اس کی جیب میں پڑا اس کا موبائل فون بیٹری ختم ہو جانے سے چپ ہو گیا تھا۔ زاہد روزانہ موبائل فون گھر سے ہی چارج کر کے لاتا تھا، یہاں اس کے پاس اس کا چارجر بھی نہیں تھا۔ فی الحال زاہد اس بات سے بے خبر تھا کہ اس کا موبائل فون بند ہو گیا ہے۔ وہ اس جگہ سے نکلنے کا راستہ تلاش کر رہا تھا جو اسے نہیں مل رہا تھا۔

☆☆☆

صبح کا سورج طلوع ہو چکا تھا۔

فوزیہ منہ ہاتھ دھو کر باتھ روم سے باہر نکلی تو اس نے متلاشی نگاہوں سے پہلے پورے کمرے کو دیکھا اور پھر اس کی نگاہیں دیوار پر لگی گھڑی پر چلی گئیں۔ دن کے دس بج کر پانچ منٹ ہو گئے تھے۔ اس گھر کی ایک چابی زاہد کے پاس بھی تھی۔ فوزیہ کا خیال تھا کہ زاہد اب تک آ چکا ہوگا اور اس نے ناشتا کچن میں رکھ دیا ہوگا لیکن اس کے خیال کے برعکس ایسا نہیں ہوا تھا۔

فوزیہ نے پہلے سارے گھر کی تلاشی لی اور اس کے بعد متفکر انداز میں اپنے موبائل فون سے زاہد کا موبائل نمبر ملایا جو مسلسل بند جا رہا تھا۔ فوزیہ نے کبھی اس کے آفس کے ٹیلی فون نمبر پر کال نہیں کی تھی۔ اس کی کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی جب بھی ان دونوں کو ایک دوسرے سے کوئی بات کرنی ہوتی تھی تو وہ اپنے اپنے موبائل فون سے کر لیتے تھے۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، فوزیہ کی پریشانی دو چند ہوتی جا رہی تھی۔ اس دوران وہ کئی بار زاہد کے فون پر کال کر چکی تھی لیکن وہ بند جا رہا تھا۔ اب تو فوزیہ کو گھبراہٹ بھی ہونے لگی تھی اور دل میں کئی طرح کے خیالات بھی جنم لینے لگے تھے۔

آفس میں زاہد نے ساری رات پریشان اور سوچتے ہوئے کبھی نیند کے ساتھ جھولتے ہوئے گزار دی تھی۔ دن کے نو بجے تھے جب اس نے یہ سوچ کر کہ وہ سب کچھ فوزیہ کو بتا کر یہ کہے گا کہ وہ اس کے لیے یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ تلاش کرے، اس وقت وہ مایوس ہو گیا جب اس نے دیکھا کہ اس کا موبائل فون بند پڑا ہے۔ اپنے آفس کے فون سے وہ فوزیہ کو اس وقت کال کر کے کوئی ثبوت نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ زاہد ناچار پہلے سے بھی زیادہ پریشانی کے عالم میں دائیں بائیں دیکھنے لگا کہ اب وہ کیا کرے؟

فوزیہ ہاتھ میں موبائل فون لیے ادھر اُدھر ٹہل بھی رہی تھی اور پریشانی میں سوچ بھی رہی تھی کہ وہ کیا کرے۔ اچانک وہ کمرے میں گئی اس نے بیڈ کے ساتھ والی دراز کھولی اور اندر

دبا دو

ایک خاتون ایک دکان میں داخل ہوئیں۔ وہاں انہوں نے نکیلی چونچ والی عجیب و غریب چڑیا دیکھی۔ دکاندار سے اس کی بابت دریافت کیا۔ دکاندار نے بتایا۔ ”اس کا نام ”سم سم“ ہے اور اس کی نسل علی بابا کے زمانے سے چلی آ رہی ہے۔“

”یہ کرتی کیا ہے؟“ خاتون نے پوچھا۔

دکاندار نے کوئی جواب دینے کے بجائے چڑیا سے کہا۔ ”میز دبا دو۔“ چڑیا میز پر جا بیٹھی اور چند لمحوں میں پوری میز کو ہڑپ کر گئی۔ خاتون یہ دیکھ کر حیران رہ گئی اور چڑیا سے کہا۔

”کرسی دبا دو۔“ چڑیا کرسی بھی کھا گئی۔ خاتون نے کہا۔ ”میں یہ چڑیا ضرور خریدوں گی۔“ دکاندار نے وجہ پوچھی تو خاتون نے جواب دیا۔

”شام کو میرا شوہر تھکا ماندہ گھر آئے گا تو میں اس کو بتاؤں گی یہ چڑیا جس کا نام ”سم سم“ ہے۔ اس کی نسل علی بابا کے زمانے سے چلی آ رہی ہے۔ اس کے بعد وہ بستر پر دراز ہو کر کہے گا، ذرا میرے پیر تو دبا دو۔“

تحمل حسین حیدری، پنڈ دادن خان

نیا اُمیدوار

راشن ڈپو پر دو عورتیں لڑ پڑیں، ایک نے کہا۔ ”تمہارا میاں مر جائے۔“ دوسری نے بھی اسے دہرایا۔

ایک صاحب جو ان کی باتیں بڑے غور سے سن رہے تھے آگے بڑھ کر بولے۔ ”محترم خواتین جس کا میاں پہلے مر جائے ...... مجھے اطلاع ضرور دے۔“

ایک عورت نے غصے میں پوچھا۔ ”تم کون ہوتے ہو؟“

جواب ملا۔ ”میں بیوہ سے شادی کرنے کا زبردست حامی ہوں۔“

ٹنڈو آدم سے آدم خان

سے ایک ڈائری نکال کر اس کے صفحے الٹنے لگی۔ اس کی متلاشی نگاہیں ہر صفحے پر مرکوز تھیں۔ وہ ایک صفحے پر رک گئی اس نے ایک نمبر پر اپنی انگلی رکھی اور دوسرے ہاتھ سے وہ نمبر اپنے موبائل پر پش کرنے لگی۔ پھر اس نے ڈائری ایک طرف رکھی اور موبائل فون کو کان سے لگا لیا۔ بیل جا رہی تھی۔ جونہی رابطہ ہوا دوسری طرف سے ایک مردانہ آواز اس کی سماعت میں پڑی، تو فوزیہ جلدی سے بولی۔

"آپ ناصر بھائی بول رہے ہیں؟"

"جی ناصر بات کر رہا ہوں۔"

"میں زاہد کی مسز بات کر رہی ہوں۔"

"جی بھابی کیا حال ہے آپ کا؟" دوسری طرف سے ناصر مزید مؤدب ہو گیا۔ ناصر آفس میں زاہد کے ساتھ کام کرتا تھا اور اس کے ساتھ اس کی اچھی دوستی بھی تھی، چند بار وہ زاہد کے گھر بھی آیا تھا۔

"میں بہت پریشان ہوں۔ زاہد ابھی تک آفس سے گھر نہیں آئے۔" فوزیہ نے جلدی سے کہا۔

ناصر کی تشویش بھری آواز آئی۔ "زاہد آفس سے واپس نہیں آیا؟"

"رات مجھے ان کی کال آئی تھی کہ آفس میں بہت کام ہے اور باس نے اسے روک لیا ہے اس لیے وہ صبح ہی آئے گا۔" فوزیہ نے کہا۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں تھی۔ جس وقت میں آفس سے نکل رہا تھا تو زاہد بھی چلنے کی تیاری میں تھا۔" ناصر کے بتانے پر فوزیہ اور بھی گھبرا گئی۔

"پھر انہوں نے مجھے یہ کیوں کہا تھا کہ وہ آفس میں مصروف رہیں گے اور صبح آئیں گے؟"

"آپ اُن کے موبائل فون پر کال کریں۔"

"ان کا موبائل فون مسلسل بند جا رہا ہے۔ مجھے بہت گھبراہٹ ہو رہی ہے۔" فوزیہ کا دل دھڑکنے لگا۔

"آپ فکر نہیں کریں، میں آپ کی طرف آتا ہوں۔" ناصر نے کہہ کر فون بند کر دیا۔ فوزیہ کو گھبراہٹ اور عجیب سے خیالات نے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ وہ مضطرب سی کمرے میں کبھی دائیں اور کبھی بائیں چل رہی تھی۔

☆☆☆

ناصر کا گھر قریب ہی تھا وہ بیس منٹ میں فوزیہ کے پاس پہنچ گیا۔ فوزیہ نے اسے پھر وہ بات بتائی جو زاہد نے اسے فون پر کہی تھی۔ ناصر نے بھی اس کے فون پر کال کی لیکن اس کا فون بند تھا۔

فوزیہ نے ناصر کی طرف دیکھ کر خوفزدہ لہجے میں کہا۔ "زاہد کو باس نے کچھ ماہ سے تنخواہ بھی نہیں دی تھی۔ گھر میں بہت پریشانی چل رہی تھی۔ مکان کا کرایہ اور دوسرے اخراجات کا زاہد پر بہت پریشر تھا۔ زاہد نے کہیں......" فوزیہ نے جان بوجھ کر اپنا جملہ مکمل نہیں کیا تھا۔

"نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔" ناصر نے جلدی سے فوزیہ کے خیال کو رد کر دیا۔

"پولیس کے پاس چلیں؟"

"میرا خیال ہے ہم باس کے گھر چلتے ہیں۔ شاید انہوں نے زاہد کو روک لیا ہو۔ لیکن زاہد کا فون تو بند نہیں ہونا چاہیے تھا۔" ناصر خود کلامی کے انداز میں سوچتے ہوئے بول رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ "آپ رکیں میں آفس سے پتا کر کے آتا ہوں۔"

ناصر اسی وقت اپنی بائیک پر آفس چلا گیا۔ اس ساری عمارت میں مختلف کمپنیوں کے دفاتر تھے۔ مین گیٹ کا جنگلا بند تھا اور اندر ڈیوٹی پر مامور ایک چوکیدار اپنی کرسی پر بیٹھا تھا۔ وہ پرانا چوکیدار تھا اور تقریباً اس جگہ کام کرنے والے لوگوں کو پہچانتا تھا۔

"ہمارا آفس تو نہیں کھلا؟"

"کوئی بھی آفس نہیں کھلا۔ سب بند ہیں۔" چوکیدار نے جنگلے کے پاس آ کر بتایا۔

"ہمارے آفس میں زاہد کام کرتا ہے، آفس بند ہونے کے بعد اسے آپ نے جاتے ہوئے دیکھا تھا؟" ناصر نے سوال کیا۔

"میری دن کی ڈیوٹی ہے۔ یہ تو رات والے ہی بتا سکتے ہیں۔" چوکیدار نے جواب دیا۔

تسلی کرنے کے بعد ناصر واپس فوزیہ کے پاس آیا۔ فوزیہ سن کر اور بھی پریشان ہو گئی۔ اس کا دھیان بار بار اس طرف ہی جا رہا تھا کہ باس کے رویّے کی وجہ سے کہیں زاہد نے کوئی غلط قدم نہ اٹھا لیا ہو۔ ناصر بھی سوچ رہا تھا زاہد نے ایک، دو بار اس سے تنخواہ نہ ملنے اور اپنے مسائل کا تذکرہ کیا تھا۔ ناصر کے دماغ میں بھی اس سوچ نے جنم لیا تھا کہ جب انسان پر دباؤ بہت زیادہ بڑھ جائے تو وہ کوئی بھی انتہائی قدم اٹھا سکتا ہے۔

"میرا کزن انسپکٹر ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم اُس کے پاس چلتے ہیں۔" ناصر سوچنے کے بعد بولا۔ وہ وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسی وقت ناصر نے اپنے کزن انسپکٹر کو فون کیا تو عام تعطیل کی وجہ سے وہ گھر میں ہی تھا۔ اس نے دونوں کو

اپنے گھر بلا لیا۔ دونوں اس کے گھر پہنچ گئے اور انسپکٹر عدیل کو انہوں نے ساری صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔

”مجھے لگتا ہے کہ زاہد نے خدانخواستہ کچھ کر لیا ہے......
ان پر بہت بوجھ تھا۔ واجبات نہ ملنے کی وجہ سے زاہد بہت پریشان تھے۔“ فوزیہ نے ساری بات بتائی تو...... روتے ہوئے اس کا جسم کانپ رہا تھا اور لگتا تھا جیسے وہ ابھی گر جائے گی۔

”آپ حوصلہ رکھیں میں ابھی اور اسی وقت ذاتی طور پر تفتیش کرتا ہوں۔“ انسپکٹر عدیل نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

انسپکٹر عدیل نے ناصر سے اس کے باس کا نمبر لیا اور نمبر ملا کر فون کان سے لگا لیا۔ جونہی رابطہ ہوا انسپکٹر عدیل بولا۔

”میں انسپکٹر عدیل بول رہا ہوں۔“

”جی فرمایئے۔“ زاہد کا باس اس وقت مزے سے اپنے گھر میں براجمان تھا۔ انسپکٹر عدیل کا نام سنتے ہی باس ایک دم چونکا۔

”آپ کے آفس میں زاہد نام کا ایک شخص کام کرتا ہے، وہ کل رات سے اپنے گھر نہیں پہنچا۔“

”اب میں کیا کہہ سکتا ہوں کہ وہ کہاں ہے۔ آفس ٹائم ختم ہونے کے بعد وہ کہاں جاتے ہیں اور کیا کرتے ہیں، یہ میری ذمے داری نہیں ہے۔“ باس نے دھیمے لہجے میں بات کی۔

”آپ صحیح فرما رہے ہیں لیکن آپ نے اپنے اس ورکر کی چند ماہ سے تنخواہ نہیں دی تھی۔ اس لیے آپ پر کچھ ذمے داری بنتی ہے۔ آپ کے تنخواہ نہ دینے پر کہیں اس نے کوئی انتہائی قدم تو نہیں اٹھا لیا......“

یہ سن کر باس ایک دم سے گھبرا گیا۔ ”نہیں، میں نے تو اسے کل رات ساری تنخواہ دے دی تھی۔ اس کے جو واجبات تھے وہ ادا کر دیے تھے۔“

”آپ اس وقت کہاں ہیں؟“

”میں...... اس وقت راستے میں ہوں، مجھے ایک جگہ پہنچنا ہے۔“ باس نے سوچتے ہوئے کہا حالانکہ وہ اپنے گھر میں بیٹھا تھا۔

”میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”ملنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔“ باس نے جلدی سے کہا۔

”میں ابھی ملنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے آپ کے آفس میں ملاقات ٹھیک رہے گی۔“ انسپکٹر عدیل بولا۔

”آج تو چھٹی ہے۔“

”آفس تو کھل سکتا ہے۔“

”کل ملاقات کر لیتے ہیں، آپ میرے آفس آجایئے گا۔“ باس نے کہا۔

”آپ کے پاس آدھا گھنٹا ہے۔ مجھے آدھے گھنٹے کے اندر اندر اپنے آفس میں پہنچ کر کال کریں، میں آج ہی ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ معاملہ کچھ گمبھیر ہے، ایک شخص کی گمشدگی کا معاملہ ہے۔“ انسپکٹر عدیل نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

باس کے جسم میں ہلچل برپا ہو گئی۔ وہ جانتا تھا انسپکٹر نے اسے آفس میں ملنے کے لیے کیوں کہا تھا۔ انسپکٹر وہ ریکارڈ دیکھنا چاہتا تھا جس سے ثابت ہو کہ اس نے زاہد کے واجبات ادا کر دیے ہیں۔

باس نے اپنے آفس کی چابیاں جو کہ اس کے پاس ہی ہوتی تھیں، انہیں لیا اور اپنی کار کی طرف دوڑ لگا دی۔ مضطرب، بے چین اور بے قرار باس اپنے آفس کی عمارت میں پہنچا تو وہاں موجود چوکیدار نے جنگلا کھول دیا۔ باس لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

زاہد ایک کرسی پر پریشان بیٹھا سوچ رہا تھا کہ وہ اس جگہ سے کیسے باہر نکلے۔ پانچ لاکھ روپے فی الحال اس نے اپنے بیگ میں رکھے ہوئے تھے۔ اچانک اسے دروازے کے پاس آہٹ سنائی دی۔ زاہد نے جلدی سے اپنا بیگ لیا اور اسٹور روم کی طرف دوڑ لگا دی۔ اسٹور روم میں جاتے ہی اس نے دروازہ بند کیا اور اتنا کھلا رکھا کہ وہ باہر دیکھ سکے۔

زاہد نے دیکھا، باس اندر آیا ہے اور اس نے دروازہ مقفل کر کے تیز تیز قدم اپنے کمرے کی طرف بڑھا دیے۔

باس کی میز کی دراز میں کئی دن سے زاہد کے واجبات کی ادائیگی کے کاغذات تیار تھے۔ باس کے دستخط ہونے تھے اور اس کے بعد زاہد کو اس کے واجبات کی ادائیگی ہو جانی تھی۔

باس نے وہ فائل نکال کر دیکھی اور اس فائل کو ریک میں رکھی دوسری فائلوں میں رکھ دیا۔ پھر وہ باہر نکلا اور زاہد کی میز کے پاس چلا آیا۔ اس نے زاہد کی میز کی دراز کھول کر اندر رکھے کاغذات کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور وہاں سے ہٹ کر ابھی وہ اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا کہ دروازے کو کسی نے زور سے بجایا۔ زاہد دروازے میں رخنہ رکھے کھڑا تھا اور باہر دیکھ بھی رہا تھا اور حیران بھی تھا۔

باس نے دروازہ کھولا تو زاہد ایک دم سے چونک گیا۔ ناصر کے ساتھ اس کی بیوی فوزیہ اور ایک اجنبی شخص تھا۔

انسپکٹر عدیل نے اپنا ہاتھ باس کی طرف بڑھا کر اپنا

نام اور عہدہ بتاتے ہوئے مصافحہ کیا تو زاہد کو علم ہوا کہ فوزیہ پولیس کو لے کر آئی ہے۔ ''آپ سے آپ کے آفس میں ملنے کا مقصد یہ تھا کہ... میں دیکھ سکوں آپ نے زاہد کے سارے واجبات واقعی ادا کر دیے ہیں، کیونکہ آپ نے مجھے ابھی فون کال پر بتایا تھا کہ آپ نے سارے واجبات ادا کر دیے ہیں۔''

''ہاں ہاں، میں نے رات ہی زاہد کو اس کے سارے واجبات ادا کر دیے تھے۔'' باس نے ایک دم سے کہا۔

''آپ کے پاس زاہد کو ادائیگی کے کاغذات تو ہوں گے...... مجھے دکھائیں۔'' انسپکٹر عدیل نے کہا۔

''وہ تو آپ کو کل ہی مل سکتے ہیں کیونکہ ریکارڈ اکاؤنٹنٹ کے پاس ہوتا ہے۔'' باس کی کوشش تھی کہ وہ اپنے لہجے کو پُراعتماد رکھے۔

''یہ جھوٹ بول رہے ہیں، انہوں نے ان کو ایک پیسہ نہیں دیا ہوگا، وہ بہت پریشان تھے۔ پیسہ نہ ملنے کی وجہ سے زاہد نے...... جانے کیا کر لیا ہوگا...... وہ رات سے غائب ہیں۔'' فوزیہ بولی۔

''میری بیٹی میں سچ کہہ رہا ہوں، میں نے سارے واجبات ادا کر دیے تھے۔ اب میرے پاس یہاں آفس میں کوئی رقم موجود نہیں ہے...... میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ میرے پاس آفس میں کیش بالکل نہیں ہوتا ورنہ میں تم کو ابھی بھی رقم دے سکتا تھا...... پھر جب انسپکٹر صاحب کل اکاؤنٹنٹ سے زاہد کو کی گئی ادائیگی کا ریکارڈ دیکھیں گے تو آپ سب کو یقین آ جائے گا کہ میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' باس کی زبان مٹھاس سے بھری ہوئی تھی۔

''اگر آپ کے پاس یہاں رقم ہوتی تو آپ زاہد کی مسز کو رقم کیوں دیتے؟ کیونکہ بقول آپ کے آپ زاہد کو اس کے واجبات ادا کر چکے ہیں۔''

''اگر میرے پاس یہاں رقم ہوتی ... تو میں مسز زاہد کو اس لیے دیتا تاکہ وہ ضمانت کے طور پر رکھ لیتیں۔ جھوٹ ثابت ہونے پر وہ رقم ان کی ہو جاتی اور سچ سامنے آنے پر یہ مجھے میرے دیے ہوئے پیسے واپس کر دیتیں...... لیکن میرے پاس آفس میں ایک پائی بھی کیش نہیں ہوتی۔ ورنہ میں ایسا ہی کرتا جیسا میں کہہ رہا ہوں۔'' باس کی کوشش تھی کہ وہ ان سب کو کسی بھی طرح سے مطمئن کر دے۔ وہ انسپکٹر عدیل کے سامنے ایسا بننے کی کوشش کر رہا تھا کہ انسپکٹر عدیل کو یقین آ جائے کہ باس ایک نرم دل انسان ہے۔

''مجھے ان کی بات کا یقین نہیں ہے۔ انہوں نے اگر زاہد کو واجبات دے دیے ہوتے تو وہ سیدھا گھر آتے۔'' فوزیہ بولی۔

''میری بیٹی میں آفس ٹائم کے بعد کسی کا ذمے دار نہیں ہوں کہ وہ کہاں جاتا ہے اور کیا کرتا ہے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ میں نے ایک ایک پائی زاہد کو دے دی تھی۔ کل آپ آ کر ریکارڈ چیک کر لیں۔'' باس کا لہجہ پہلے سے بھی زیادہ پُراعتماد ہو گیا۔

انسپکٹر عدیل کچھ سوچنے کے بعد بولا۔ ''کل میں کتنے بجے آپ کے پاس آ جاؤں؟''

''آپ دس بجے آ جائیں۔'' باس نے جلدی سے کہا۔

''میں کل دس بجے آ جاؤں گا۔'' انسپکٹر عدیل نے کہہ کر اپنا کارڈ باس کو دیتے ہوئے کہا کہ اسے زاہد کے بارے میں اگر کوئی بھی خبر ملے تو وہ فوراً اس سے رابطہ کر سکتا ہے۔ اس کے بعد انسپکٹر عدیل نے ان دونوں کو چلنے کا اشارہ کیا۔ دونوں اس کے پیچھے باہر نکل گئے، حالانکہ فوزیہ کا دل نہیں چاہ رہا تھا، وہ باہر جائے۔ وہ چاہتی تھی، انسپکٹر عدیل کچھ سختی کا مظاہرہ کرتے ہوئے باس سے حقیقت جاننے کی کوشش کرے کہ زاہد کہاں ہے لیکن اسے باہر جانا پڑا۔

ان سب کے باہر جاتے ہی باس نے اپنے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ بکھیری اور بولا۔ ''انسپکٹر صاحب کل جب آپ آفس آئیں گے تو آپ کو مکمل ریکارڈ ملے گا...... ایسے ریکارڈ تیار کرانا میرے لیے کوئی مشکل نہیں ہے...... یہ بھی اچھا ہوا زاہد کہیں چلا گیا ہے...... میرے پیسے بچ گئے......'' وہ کہہ کر ہلکی ہنسی کے ساتھ ہنسا لیکن باس کو اپنی ہنسی جلدی ہی روکنی پڑی۔ اسے اپنی گردن کے پاس کوئی سخت چیز محسوس ہوئی۔ باس نے جونہی گردن گھمائی، وہ چونک گیا۔ اس کے عقب میں زاہد کھڑا تھا۔

''تم یہاں......''

''حرکت نہیں کرنا ورنہ گولی مار دوں گا۔'' زاہد نے پھنکارتی ہوئی آواز کے ساتھ کہا۔ حالانکہ زاہد نے ہاتھ میں پنسل پکڑی ہوئی تھی اور باس اسے پستول کی نال سمجھ کر ڈر گیا۔

''دیکھو کوئی ایسی ویسی حرکت مت کرنا...... ورنہ......'' باس نے گھبرائی آواز میں کہا۔

''ورنہ کو چھوڑیں.... صاحب...... آپ اپنے کمرے میں چلیں۔'' زاہد نے کہہ کر باس کو ہلکا سا دھکا دیا اور وہ اس کے آگے چلنے لگا۔ زاہد نے پنسل اس کی گردن کے ساتھ لگائی ہوئی تھی۔ زاہد کے ایک ہاتھ میں رسی بھی تھی جو وہ اسٹور روم سے ساتھ لے کر آیا تھا۔

جونہی باس کمرے میں پہنچا زاہد نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ ''کوئی حرکت نہیں اور کوئی آواز نہیں...... ورنہ گولی

UrduBooks.pk

گردن کے آر پار ہو جائے گی......"

باس کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ڈر کر چپ رہا۔ زاہد نے اس کے ہاتھ پیچھے کی طرف باندھ دیے اور پھر اسے کرسی پر بٹھا دیا۔

زاہد نے باس کے سامنے ہی کتاب نما بکس سے چابی نکال کر وہ تجوری کھولی اور باس کی خیرہ آنکھوں کے سامنے اندر سے ساری رقم نکال کر اپنے بیگ میں رکھی اور اسے اچھی طرح سے بند کر کے کپڑے سے اپنی انگلیوں کے نشان ختم کرنے کے بعد وہ باس کے پاس جا کر بولا۔

"آپ نے میرے واجبات ادا نہیں کیے تو مجھے ٹیڑھی انگلی کرنی پڑی...... اور اس ٹیڑھی انگلی سے اب میں سب کچھ سمیٹ کر جا رہا ہوں۔"

"تم کو کیسے پتا کہ میں رقم یہاں رکھتا ہوں؟" باس نے حیران کن لہجے میں پوچھا۔

"مجھے اور بھی بہت کچھ پتا ہے۔ اب میں جا رہا ہوں۔" زاہد نے اپنا بیگ کندھے سے لٹکایا اور جانے کے لیے دروازے کے پاس پہنچا تو رک کر بولا۔ "میں نے رسی اتنی مضبوط نہیں باندھی...... تھوڑی سی کوشش کریں گے تو رسی کھل جائے گی۔"

"میں پولیس کو سب بتا دوں گا۔" باس کانپتی آواز میں بولا۔

زاہد مسکرایا۔ "ضرور بتائیے گا کہ میں آپ کے آفس سے آپ کی رقم لے گیا ہوں۔"

زاہد کہہ کر باہر چلا گیا۔ باس جلدی سے کوشش کرنے لگا کہ اس کی رسی کھل جائے۔ کچھ کوشش کے بعد رسی اور بھی ڈھیلی ہو گئی اور وہ اپنے آپ کو رسی سے آزاد کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ بھاگتا ہوا باہر نکلا۔ اس نے باہر کا دروازہ مقفل کیا اور لفٹ کی طرف بھاگا۔

لفٹ سے .... باس نیچے گیا، پھر گیٹ کی طرف چل پڑا اور اسی اثنا میں زاہد ایک طرف سے نکل کر باس کے پیچھے چلنے لگا۔ بلڈنگ کا چوکیدار ایک طرف کھڑا گلاس میں پانی بھر رہا تھا۔ جیسے ہی باس باہر نکل کر اپنی کار کی طرف بڑھا، زاہد دوسری طرف نکل گیا۔

☆☆☆

پریشان اور غمگین فوزیہ جب گھر پہنچی تو وہ چونک پڑی۔ سامنے زاہد مزے سے براجمان سیب کھا رہا تھا۔ زاہد اسے دیکھ کر مسکرایا۔ فوزیہ فوراً اس کی طرف بڑھی۔

"تم کہاں چلے گئے تھے......؟ کہاں سے آ رہے ہو؟ جانتے ہو میں کتنی پریشان تھی۔" فوزیہ نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

زاہد نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنے پاس بٹھاتے ہوئے بولا۔ "مجھے سارے پیسے مل گئے تھے۔ میں نے مالک مکان کو اس کے سارے پیسے دے دیے۔ گھر کا بہت سا راشن خریدا...... میں نے کچھ اور بھی خریداری کی اور مجھے ایک دوست مل گیا...... وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا اور دیر ہو گئی...... ایک بات اور...... میں نے سارے پیسے لینے کے بعد... وہ نوکری بھی چھوڑ دی ہے۔ بڑا گھٹیا انسان تھا۔"

"تمہارا فون کیوں بند تھا اور تم نے رابطہ بھی نہیں کیا...... میں کتنی پریشان تھی۔" فوزیہ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

زاہد نے پیار بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولا۔ "اب ساری پریشانیاں ختم...... اب کوئی پریشانی نہیں...... تم پُرسکون ہو جاؤ اور ساری اذیت بھول جاؤ......" زاہد نے فوزیہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اسے اس بات کا بالکل بھی ڈر نہیں تھا کہ اس کا باس پولیس کے پاس جا کر اس کے خلاف کوئی رپورٹ لکھوا سکتا ہے۔

زاہد کا آفس انسپکٹر عدیل کے تھانے کی حدود میں تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ انسپکٹر عدیل کے پاس جا۔ ...

زاہد سوچ کر دل ہی دل میں مسکرایا۔

ایسا ہی ہوا...... باس نے اسی وقت انسپکٹر عدیل کو فون کیا اور اس کے پاس جا پہنچا۔ جب وہ انسپکٹر عدیل کے سامنے براجمان تھا تو وہ سوچ رہا تھا کہ وہ کیا بتائے؟

وہ کیسے بتائے کہ زاہد اس کے آفس میں آیا تھا اور اسے باندھ کر اس کے آفس کے خفیہ خانوں سے اس کا سارا کیش نکال کر لے گیا...... کیونکہ اس نے تو خود کہا تھا کہ اس کے آفس میں ایک پیسہ بھی نہیں ہوتا...... وہ اپنے آفس میں بالکل بھی کیش نہیں رکھتا...... یہ اس نے ایک ذمے دار پولیس آفیسر کے سامنے کہا تھا اور اس کے گواہ وہاں پر دو افراد اور بھی موجود تھے۔

"آپ چپ بیٹھے ہیں...... کیا بات ہے...... کیوں آئے ہیں آپ؟" جب باس کچھ نہ بولا تو انسپکٹر عدیل نے پوچھا۔ باس نے ناچار انسپکٹر عدیل کی طرف دیکھا اور مریل سے انداز میں بولا۔

"مجھے زاہد کی بہت فکر ہو رہی تھی اس لیے پتا کرنے آ گیا کہ اس کا پتا چلا...... میرا خیال ہے کہ مجھے چلنا چاہیے...... ہاں مجھے چلنا چاہیے......" باس اپنی جگہ سے اٹھا اور چل دیا۔ انسپکٹر عدیل اس کی طرف دیکھتے ہوئے حیران تھا کہ لگتا ہے باس جیسے اپنے حواس میں نہیں ہے۔

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط نمبر: 57

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناث آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بن جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

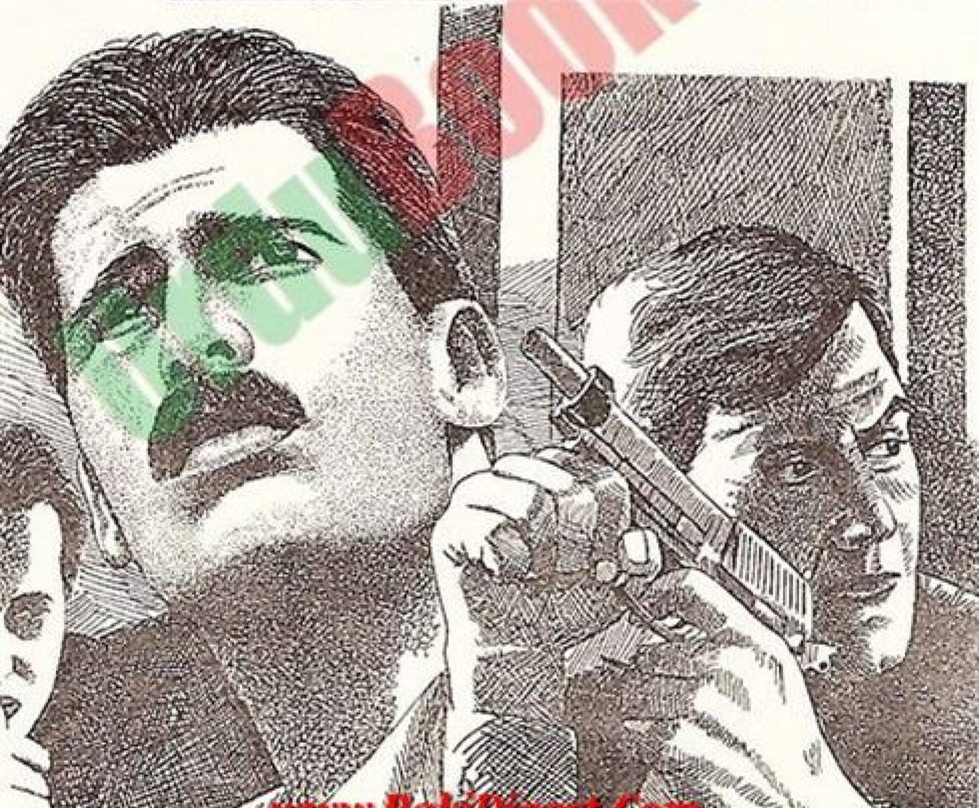

urdubooks.pk

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں ہی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ، سوتیلی ماں کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہو گئی۔ شہزی کی دوستی وہاں ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہو گئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب لکھوا اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کبیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دست راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازع عرصے سے چل رہا تھا۔ کبیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا۔ زہرہ بانو، شکیل شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش تھی۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ ''اپیکزم'' کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہو جاتی ہے۔ عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اپیکزم کا سربراہ لولووش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دست راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر فیک شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولووش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولووش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک تو وہ تنیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولووش کا ٹارگٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنے ماں باپ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطن عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیو ٹمسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھگوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اپیکزم اور بلیو ٹمسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں۔ شہزی، کبیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کبیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہو جاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ سی آئی اے میں ٹائیگر فیک کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر فیک کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولووش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دست راست سے جی کوپارا، شہزی کو ٹائیگر فیک سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنا لیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، ہشام جھنگلکری سے ہوتی ہے جو بھی اپیکزم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ ہشام اسے پاکستان میں موہن جودڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہو چکا ہے اور لولووش اور سی جی بھگوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوپارا کی بوٹ میں بلیو ٹمسی کے چندر ناتھ، شیام اور کوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیو ٹمسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیو ٹمسی کے چیف سی جی بھگوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہو گئی تھی کہ وہ ایک محب وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھگوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اپ بری قصاب، سے جی کوپارا اور اس کے ساتھی بھوک کو بے بس کر دیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہو جاتے ہیں۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل مڈبھیڑوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوپارا اور چندر ناتھ حملہ کر دیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھگوانی تھا، ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک ریتا نامی لڑکی کو تنگ کر رہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کر رہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔ ریتا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں ریتا کے باڈی گارڈ وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ کے ایل ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ تھا۔ شہزی، ریتا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ریتا شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیو ٹمسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیو ٹمسی کے ہیڈ کوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی جی بھگوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھگوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے

مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کمیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی "انڈیمان" پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں سے تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔ بھوانی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس اثنا میں کورنیلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو "کل منجارو" پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہو جاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات نانا شکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا اسمگلر تھا۔ نانا شکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور نانا شکور کے ہمراہ کل منجارو کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ نانا شکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ چنائی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہو چکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کر دیتے ہیں۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کر کے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے نانا شکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس سناٹے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ وہ ایک نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حدِ نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے کیونکہ ہر طرف سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو تھے۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ منیجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچا لیتی ہے۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کر کے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں برمی مسلم گروپ کا مجاہد نو لا ان پر حملہ کر دیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم برمی مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کر دیتا ہے، پھر نارتھ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں کل منجارین سے ٹاکرا ہو جاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کر لیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ مفادات کے لیے کل منجارین سے مل کر جاوا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی ڈارک کیسل سے موٹر بوٹ کے ذریعے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر بُرد کر کے طلسم نور ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پھر ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں دونوں ملکوں کے کوسٹ گارڈز سے نمٹتے اپنی سرزمین پاکستان پہنچتے ہی زہرہ بانو سے رابطہ کرتا ہے۔ ملتان جانے سے پہلے لاڑکانہ پہنچ کر بشام کی بیوہ ارم سے ملتا ہے۔ وہاں کا زمیندار شاہنواز خان جو پہلے بھی ہیرا چوری کر چکا تھا اب دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں بشام کی بیوہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شہزی وغیرہ کی آمد پر شاہنواز خان دھوکے سے بشام کے قتل اور اس کی بیوہ ارم کے اغوا کے جرم کی رپورٹ کرا دیتا ہے۔ پولیس اول خیر اور کمیل دادا کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ شہزی کو شاہنواز خان اپنا قیدی بنا کر لے جاتا ہے۔ اچانک رات کے سناٹے میں خطرناک ڈاکو پریل چانڈیو حویلی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ واپسی میں شاہنواز کی بیٹی سونہزیں بھی ساتھ ہوتی ہے جو اس کی محبوبہ ہے۔ جاتے ہوئے پریل، شہزی کو بھی اپنے اڈے پر لے جاتا ہے۔ اسی رات پریل کا نائب لائق ماچھی لانچ میں آ کر سازش کرتا ہے اور پریل کو غائب کرا کر خود سردار بن بیٹھتا ہے اور سونہزیں کو تاوان کے لیے قبضے میں کر لیتا ہے۔ شہزی، لائق ماچھی کے ساتھی عارب خان کو قابو کر لیتا ہے۔ شہزی، پریل کو بچا لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پریل، شہزی کا احسان مند ہوتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شہزی کے ساتھیوں اور سونہزیں کو چھڑانے کے لیے تھانے پر حملہ کر دیتا مگر رینجرز کی اینٹی ڈکیت فورس وہاں پہلے سے موجود تھی۔ مقابلے میں پریل اور اس کے ساتھی مارے جاتے ہیں۔ شہزی اور اس کے ساتھی رینجرز کی تحویل میں چلے جاتے ہیں۔ شہزی، میجر وسیم کو اپنے بارے میں تمام حقائق سے آگاہ کرتا ہے۔ میجر وسیم، شہزی پر اعتماد کرتے ہوئے بھاری نفری کے ساتھ شاہنواز کے خفیہ ڈیرے پر ریڈ کر کے طلسم نور ہیرا برآمد کر لیتے ہیں۔ اس مہم کے بعد شہزی اپنے ساتھیوں سمیت بیگم ولا کا رخ کرتا ہے جہاں شہزی کے والدین اور زہرہ کی نگاہیں منتظر تھیں۔ پاکستان پہنچ کر شہزی کو پتا چلتا ہے کہ عارفہ، نوید سابچے والا کی قید میں ہے۔ عارفہ کو رہائی دلا کر نوید کو قانون کے شکنجے میں دے دیتا ہے۔ پھر زہرہ کے تعاون اور ماں باپ کی دعاؤں کے سائے میں عابدہ کی رہائی کے لیے کمیل دادا اور شکیلہ کے ساتھ نئے مشن پر امریکا روانہ ہوتا ہے۔ طیارہ ابھی پاکستانی حدود میں تھا کہ شہزی کا ٹاکرا وزیر جان سے ہوتا ہے۔ مگر شہزی، وزیر جان کو چکما دے کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور ایک تھائی لڑکی ساپچی سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ وہاں ایک شاپنگ مال میں کچھ دہشت گرد حملہ آور ہوتے ہیں اور لوگوں کو یرغمال بنا کر اپنے قیدی چھڑانا چاہتے ہیں۔ ان کا سرغنہ شہزی کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ جو کاپاکو کا آدمی ہے۔ ایک مقام پر وزیر جان سے پھر ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ شدید لڑائی کے بعد وزیر جان کو تہِ آب کر کے اپنے ازلی دشمن سے چھٹکارا پا لیتا ہے۔ وزیر جان کے خاتمے کے بعد کاپاکو کے ہرکارے شہزی کو بے ہوش کر کے پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ کاپاکو شہزی کی بہادری کا قائل ہو جاتا ہے اور خالص سونے کا گوتم بدھ کا مجسمہ جو پہلے ہی بینکاک میوزیم سے چرا لیا گیا تھا اب اسے امریکا پہنچانا تھا۔ اور اس کے لیے کاپاکو شہزی کا انتخاب کرتا ہے اور امریکی ایجنٹ روڈلف کے ساتھ امریکا روانہ ہوتا تھا کہ اسپیکٹرم کے ایجنٹوں سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ روڈلف ہر قدم پر اس کا ساتھ دیتا ہے اور بالآخر ایک طویل ساتھ دینے کے بعد روڈلف مارا جاتا ہے۔ روڈلف کی دوست یاسمین کے ساتھ شہزی امریکا روانہ ہوتا ہے۔ کوہارا یہاں بھی شہزی کا پیچھا نہیں چھوڑتا اور طیارہ ہائی جیک کر لیتا ہے اور طیارے کو سوریافہ کے صحرا میں اتارنا چاہتا ہے مگر فیول ختم ہونے کے باعث طیارے کو کریش لینڈنگ کرنا پڑتی ہے۔ یہاں شہزی سے دو بدو لڑائی میں کوہارا جہنم واصل ہو جاتا ہے۔ اور بالآخر شہزی کا جہاز شکاگو ایئرپورٹ پر لینڈ کرتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

اسٹاری...... کے الفاظ ہی نہیں، اس کے لہجے نے بھی مجھے حیران و پریشان کر دیا۔ اچھا بھلا دوستانہ ماحول اور ہم آہنگی والی فضا محض ایک آنے والی فون کال سے منتشر ہو گئی تھی...... کیوں......؟

تب ہی ایک خیال برق کی طرح میرے ذہن میں چمکا...... ابھی میں نے اسے مسز بینسفورڈ کی پُراسرار ہلاکت اور ٹائیگر فیگ وغیرہ سے اپنے چند گھنٹے پہلے ہونے والے ٹکراؤ سے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔ ممکن تھا کہ اسٹاری کو کسی ذریعے سے فون پر مطلع کیا گیا ہو کہ کورکوران جیل کی لیڈی چیف وارڈن مسز بینسفورڈ المعروف مادام کلر ہلاک کر دی گئی ہے۔

لہٰذا اب لامحالہ اسٹاری اس کی موت کی خبر سن کر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ اس کے افسر کی ہلاکت میں ہمارا ہی ہاتھ ہے۔

بات کی تہ تک پہنچنے کے باوجود میں نے انجان بنتے ہوئے دانستہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

”کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں؟ ہم نے ایسی کوئی غیر قانونی حرکت نہیں کی......؟“

اس نے بدستور اسی طرح برہمی سے میری طرف گھورتے ہوئے اپنا سیل فون دوبارہ، قدرے جھک کر سائڈ ٹیبل پر رکھا اور پھر سیدھا ہو کر چند قدم میری جانب بڑھا۔

”جھوٹ بولو گے تو ہمارے دوستانہ تعلقات شدید طور پر متاثر ہوں گے، مسز بینسفورڈ سے لاکھ میرے اختلاف سہی لیکن جہاں قانون کی بات ہو گی، وہاں میں دوستوں کے ساتھ بھی رعایت نہیں کروں گا۔“

”اوہو......! تم شاید مسز بینسفورڈ کی ہلاکت کی بات کر رہے ہو؟“ بالآخر میں نے کہا۔

”ہلاکت نہیں قتل...... ایک پولیس افسر کا قتل...... ایک بھیانک جرم ہے۔“ وہ تیز نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

”تمہارے پاس آنے سے پہلے میرا اسی کی رہائش گاہ پر جانے ارادہ تھا۔“ میں نے بھی نہایت سنجیدگی سے کہا...... ”لیکن...... یہاں کا ماحول غیر متوقع طور پر ایسا بن گیا کہ میرے کچھ بتانے سے پہلے ہی تمہاری فون کال آ گئی۔“

اس کے بعد میں نے اسے جے بی سی سمیت ٹائیگر فیگ سے ٹاکرے کے بارے میں تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ مزید اسے یہ بھی بتا دیا کہ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس کی رہائش گاہ پر نقب لگا چکا تھا ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی کسی نے اسے ہلاک کر ڈالا تھا، اسی لیے ہم نے تمہاری طرف کا رخ کیا۔

یہ سن کر اسٹاری کے مضحکہ خیز سر والے چھوٹے سے چہرے پر برہمی کے بجائے الجھن آمیز سوچوں کا جال سا بن گیا۔

”دیکھو مسٹر اسٹاری...... تم ایک ضمیر پرست پولیس افسر ہو۔“ اس بار شکیلہ نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”اس بارے میں تمہاری سوچ بھی ایک قابل لحاظ عمل ہے۔ عابدہ کے ساتھ غلط ہوا اور ہو رہا ہے۔ ہماری جنگ صرف ان بے ضمیر لوگوں کے ساتھ ہے جو حقائق کی سولی اپنے گلے سے اتار کر دوسرے کے سر دینا چاہتے ہیں۔ لہٰذا مسٹر اسٹاری! سچ اور حق کا راستہ روکنے والے ہماری راہ کھوٹی کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً آتے رہیں گے اور ہمیں بھی انہیں منہ توڑ جواب دیتے ہوئے مقابلہ کرنا پڑے گا۔“

”اور...... یہ بات بھی مت بھولنا اسٹاری!“ میں نے بھی گرہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے صرف اپنے ذاتی مفادات کے لیے تمہاری محبوب بیوی اور معصوم بیٹی کو بھی ہلاک کر ڈالا۔ تمہیں اس کا اب تک بہ خوبی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اس سارے خطرناک کھیل کے پیچھے صرف اور صرف جیوش لابی ہے، چاہے وہ جے بی سی کے روپ میں ہو یا پھر ٹائیگر فیگ ہو۔“

”اسپیکٹرم بھی......“ کھبیل دادا نے پہلی بار لب کشائی کی۔

”یقیناً۔“ میرے اور شکیلہ کے منہ سے تائیدی لفظ برآمد ہوا۔

”میں تم لوگوں کی بات سمجھ رہا ہوں۔“ بالآخر اسٹاری نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ امریکی مشنری اور عام آدمی اس خطرناک کھیل کی زد میں نہیں آنا چاہیے۔“

”گیہوں کے ساتھ گھن بھی پستا ہے مسٹر اسٹاری! کسی بڑے اور عظیم نیک مقصد میں ایسے لوگ زد میں آ ہی جاتے ہی جن کا اس کھیل سے دور کا بھی علاقہ نہیں ہوتا۔“ کھبیل دادا نے مدبرانہ لہجے میں اسٹاری سے کہا۔ تاہم پھر میں نے بھی اس سے کہا۔

”جے بی سی کے ایجنٹ نے ہمیں تمہارے متعلق کچھ سوچ کر ہی بتایا تھا کہ تم اس معاملے کی حقیقت سے پوری طرح واقف ہو۔ اسی لیے ہم نے یہاں کا رخ کیا تھا مگر

ہمیں تم سے ملاقات کے بعد اندازہ ہوا کہ تمہاری سوچ ان سے یکسر مختلف ہے۔ تم نے ثابت کر دیا کہ یہاں بھی ایک باشعور طبقہ موجود ہے جو غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح کہتا ہے۔“

”اچھے بُرے سب جگہ ہوتے ہیں، پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں...... خیر!“ استاری بولا۔ ”ٹریسی یہاں موجود ہے۔ میں ذرا جا کر صورتِ حالات کا جائزہ لیتا ہوں۔ اس کے بعد ہی عابدہ کی تلاش سے متعلق کوئی مشترکہ لائحہ عمل تیار کرتے ہیں۔ تم لوگ میری واپسی کا یہیں پر انتظار کرو۔“

استاری یہ کہہ کر ہماری صورتیں دیکھنے لگا جیسے وہ ہمارے اثباتی جواب کا منتظر ہو جبکہ کبیل دادا اور شکیلہ کی نگاہیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

”مجھے تمہاری بات پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن کیا تم اتنی تسلی دے سکتے ہو مجھے کہ عابدہ کے متعلق ہماری مدد کر سکو کہ وہ اس وقت کہاں اور کن لوگوں کی گرفت میں ہو سکتی ہے؟“

”ضرور......“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اسی لیے تو ابھی میں نے کہا کہ میری واپسی کا انتظار کرو...... میں ذرا چیف وارڈن والے معاملے میں ضابطے کی کارروائی سے جان چھڑا کر لوٹ آؤں۔ جب تک ٹریسی تمہاری خدمت کے لیے یہاں موجود ہے۔“ پھر ذرا ٹھہر کر دوبارہ بولا۔

”بلکہ ایسا کرنا تم لوگ آرام کر لینا، مجھے لوٹنے میں دیر بھی ہو سکتی ہے۔ ہو سکا تو صبح ہی تازہ دم ہو کر گفتگو کی جائے۔“

ٹریسی سے اس کی مراد وہی جوان اور خوبرو لڑکی تھی۔

”او کے مسٹر استاری! ہم پھر ادھر ہی تمہارا انتظار کرتے ہیں۔“

استاری تھوڑی دیر بعد وردی پہنے، سروس ریوالور کا ہولسٹر لگائے رخصت ہو گیا۔

ٹریسی سے ہمیں پتا چلا کہ استاری نے حال ہی میں اس سے شادی کی تھی۔ وہ خود ایک معمولی سی ویٹریس تھی۔ اس کی ڈیوٹی جس بار کاؤنٹر میں تھی وہاں اکثر استاری آیا جایا کرتا تھا۔ جب اس کی بیوی اور بیٹی کو قتل کیا گیا تو وہ وہیں آ کر جام پر جام لنڈھاتا اور اپنا غم غلط کیا کرتا تھا، ٹریسی کو اس پر ترس آتا تھا۔ بہ قول اسی کے کئی بار یوں بھی ہوا کہ زیادہ پی جانے کی صورت میں ٹریسی ہی کو اسے سنبھالنا پڑتا تھا۔ پھر غم زدہ استاری، ٹریسی سے اپنا دکھ شیئر کرنے لگا۔ اس کے بعد دونوں میں انڈر اسٹینڈنگ بڑھی۔ ٹریسی کا بھی دنیا میں کوئی نہیں تھا، سوائے ایک بوائے فرینڈ کے، اس نے بھی اسے دغا دے دیا ہے اس کے بعد اس نے استاری سے شادی کر لی۔ اب وہ ”ورکنگ لیڈی“ کے بجائے مکمل طور پر ایک ”ہاؤس وائف“ تھی۔

ٹریسی کی اچھی میزبانی سے ثابت ہو رہا تھا کہ وہ ایک اچھی ساتھی بھی ہو گی۔ تاہم وہ عام سی لڑکی تھی۔ تھوڑی ڈرپوک بھی۔ شاید اس میں اس کی کم عمری کا بھی دخل ہو۔

اس نے مجھے اچھی سی کافی پلائی تھی جبکہ کبیل دادا اور شکیلہ نے اس کے ساتھ وہسکی شیئر کی۔

ہم تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے، اس کے بعد ٹریسی ہمیں شب بخیر کہہ کر اپنے بیڈ روم میں چلی گئی اور ہم جاگتے رہے، مقصد ہمارا یہی تھا کہ شاید استاری جلد لوٹ آئے مگر رات کافی بیت جانے اور کچھ نیند کے بوجھل پن کے سبب ہم بھی لیٹ گئے۔

☆☆☆

اگلے دن صبح دس بجے ہم جاگ اٹھے۔ ٹریسی سے معلوم ہوا کہ استاری صبح پانچ بجے آ گیا تھا۔

ہم غسل وغیرہ کر کے تازہ دم ہو گئے۔ ٹریسی نے بتایا کہ استاری ناشتے کی میز پر ہمارے منتظر ہیں۔ یہ اعلان کرنے کے بعد وہ ایک کھڑکی کی طرف گئی اور اس کا پردہ سرکا دیا۔ وہاں سے تازہ دھوپ کی کرنیں اندر در آئیں۔

یہی وہ وقت تھا جب بالکل غیر ارادی طور پر ہی میری نظر کھلی کھڑکی پر پڑی۔ سامنے واقع مذکورہ........ دوسری منزل کی کھڑکی پر مجھے ایک سیاہ اور سفید اسکارف میں ملفوف عورت کھڑی دکھائی دی۔ وہ شاید کوئی ”نن“ (راہبہ) تھی۔ وہ ایک ٹک اسی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ مجھے اس کی جس بات نے چونکایا تھا، وہ اس کا ایک دم کھڑکی سے ہٹ جانا تھا۔ یوں جیسے چوروں کا سا انداز ہوتا ہے۔ میں اندر سے کھٹکا۔

”باہر کا نظارہ بعد میں کر لینا شہزی! بھوک لگ رہی ہے، آ جاؤ پہلے ناشتا کر لیں۔“ اچانک کبیل دادا نے مسکرا کر مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اس نے مجھے کھڑکی کی طرف گھورتا دیکھ لیا تھا۔

”تم دونوں چلو میں ابھی آتا ہوں۔“ میں نے کبیل دادا اور شکیلہ سے کہا۔ وہ ٹریسی کے ساتھ چلے گئے۔

اس کے بعد میں چند قدم اور سرکا اور کھڑکی کا ایک

UrduBooks.pk

پٹ ذرا سا بھیڑا۔

وہ دوبارہ نمودار ہوئی۔ دونوں عمارتوں کا درمیانی فاصلہ کچھ زیادہ نہ تھا۔ میں اب بھڑے ہوئے ایک پٹ کی آڑ سے اسے بغور دیکھنے لگا۔

اس کے چہرے کے نقوش خاصے تیکھے تھے۔ چہرہ سرخی مائل گورا تھا۔ ایک بات نے مجھے تھوڑا چونکایا تھا۔ اس کے چہرے پر روایتی راہباؤں والا ٹھہراؤ پن اور خاموش سی بے نام اداسی والے وہ تاثرات قطعاً محسوس نہیں ہوئے جو ایک راہبہ کا خاصہ ہوتا ہے، بلکہ اس کی جگہ اس کے چہرے اور آنکھوں کی تیزی میں کھوج کی سی کیفیت تھی۔ جیسے وہ کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ یکدم ہی میں کھڑکی کے سامنے آگیا اور وہ مجھے دیکھتے ہی وہ فوراً کھڑکی سے غائب ہوگئی۔

میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ رینگ گئی اور میں کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آگیا۔

ناشتے کی میز پر ہم اکٹھے ہوئے۔ اس کے بعد کافی پی گئی اور الگ سے نشست جمائی گئی۔ ٹریسی اپنے گھریلو امور میں مشغول ہوگئی، جبکہ ہم آپس میں باتیں کرنے لگے۔

اسٹاری نے سگریٹ سلگائی اور ایک گہرا کش لے کر بولا۔ ''مسز بینسفورڈ سے ملاقات کے لیے آنے والے جن تین رکنی افراد کو دیکھا کرتا تھا، وہ میرے لیے یکسر اجنبی تھے، لیکن ایک ایسا آدمی میری نظروں میں اسی لیے اٹک گیا جو بعد میں کبھی اکیلا یا پھر کبھی ایک ساتھی کے ساتھ آیا کرتا تھا۔ میری نظروں میں اس کے اٹک جانے کی ایک اور وجہ بھی تھی کہ...... وہ خاصا مغرور اور غصیلے مزاج کا آدمی تھا۔ میں نے اسے مسز بینسفورڈ سے تیز کلامی کرتے بھی سنا تھا۔ اس آدمی کے بارے میں مجھے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی بڑی شے ہے، ورنہ مادام کلر کا لقب پانے والی مسز بینسفورڈ کے سامنے کوئی بھی اونچی آواز میں بات کرنے کی جرات نہیں کرسکتا ہے وہ تو اپنے افسروں کے سامنے بھی منہ پھٹ مشہور تھی۔ اس کی وجہ اس کی وہ دس سالہ کارکردگی تھی جو اس نے کورکوران جیسی خطرناک جیل میں انجام دیتے ہوئے بڑے بڑے نامی گرامی مجرموں کو نکیل ڈال رکھی تھی۔

کیونکہ اس سے پہلے جو چیف وارڈن تھی، وہ ان ڈھیٹ اور اڑیل قیدیوں کی فحش گوئی، روز کی آپس میں لڑائیوں اور ہنگاموں سے سخت عاجز آکر اپنا تبادلہ کہیں اور کروا چکی تھی، حالانکہ اس کے کریڈٹ میں بھی ایسا بہت کچھ تھا جس کی بنا پر اسے کورکوران جیسی بدنام زمانہ جیل بھیجا گیا تھا۔

خیر اس کے بعد مسز بینسفورڈ کو بھیجا گیا اور اس نے آتے ہی تمام قیدیوں کو ایسی نکیل ڈالی کہ وہ اس کے نام سے خوف زدہ رہنے لگے۔ کورکوران جیل کی ساری بدنامی دُھل گئی اور مادام کلر کی ہر جگہ واہ واہ ہونے لگی۔ خیر یہ تو برسبیل تذکرہ رہا۔''

اسٹاری اتنا کہہ کر چند ثانیوں کے لیے رکا، میری نظریں اس کے خوبانی جیسے سرد والے چہرے پر جمی رہیں۔ وہ آگے بولا۔

''میں بتا رہا تھا کہ جو لوگ عابدہ کو خفیہ طور پر جیل سے لے جانے کے لیے مسز بینسفورڈ کو رضامند کرنے یا اس سے ساز باز کرنے کے لیے آتے تھے، ان میں سے ایک آدمی سے میرا بعد میں اچانک سامنا ہوا تھا جو میری نظروں میں اٹکا رہا تھا۔ اس اکھڑ مزاج آدمی کا نام گون برگ ہے۔ یہ اپنے دو رکنی وفد کو لیڈ کرتا تھا۔''

''تمہیں اس ساری حقیقت کا کیسے علم ہوا تھا مسٹر اسٹاری؟'' شکیلہ نے سوال کیا۔ ''میرا مطلب ہے گون برگ وغیرہ اور عابدہ سے متعلق؟ کیونکہ بقول تمہارے، یہ سب تم سے خفیہ رکھا جا رہا تھا؟''

''خفیہ صرف اس حد تک تھا کہ ابھی انہوں نے عابدہ سے متعلق رازدارانہ طور پر مسز بینسفورڈ تک ہی معاملات رکھے تھے۔ ظاہر ہے یہ معاملہ ایسا تھا کہ میری بھی اپنی حیثیت کورکوران میں کم نہیں تھی۔'' وہ جواب میں بولا اور آگے بتانے لگا۔

''مسز بینسفورڈ کو ان لوگوں نے خطیر رقم دینے کا لالچ دیا تھا۔ ممکن ہے دھمکیاں بھی دی ہوں۔ ویسے رشوت اور بدعنوانی کے معاملات میں مسز بینسفورڈ کم نہیں تھی۔ ان کی مسز بینسفورڈ کی رہائش گاہ میں بھی خفیہ میٹنگز وغیرہ ہوتی رہتی تھیں۔ جب لامحالہ یہ بات میرے علم میں آئی اور میں نے رخنہ اندازی کی تو گون برگ نے مجھے بھی پیسوں کا لالچ دیا، میں نے ان کی پیشکش ٹھکرا دی۔ نتیجے میں ان لوگوں نے میرے ساتھ کیا کیا، وہ میں تم لوگوں کو بتا چکا ہوں۔''

''تم گون برگ کے بارے میں بتا رہے تھے؟'' میں نے اسے یاد دلایا۔

''ہاں!'' وہ بولا۔ ''اس دن کے بعد سے ہی میں اس تگ و دو میں تھا کہ کم از کم میں انہیں پہچاننے کی استطاعت تو حاصل کرلوں کہ آخر یہ لوگ ہیں کون؟ جبکہ مبینہ طور پر یہ لوگ خود کو ایک حساس ادارے کے رکن بتاتے تھے۔ ابھی

میں ان کے بارے میں کھوجنے کی کوشش میں تھا کہ اچانک ایک کلب میں مجھے گون برگ دکھائی دے گیا۔ میں اس کے پیچھے لگ گیا اور جلد... ہی میں نے ان لوگوں کی حقیقت جان لی۔

یہ لوگ درحقیقت مشترکہ طور پر جیوش بزنس کمیونٹی اور سی آئی اے کے ایک ایڈوانس گروپ ٹائیگر فیگ سے تعلق رکھتے تھے۔ سی آئی اے کا یہ ونگ (ٹائیگر فیگ) دراصل اندرونِ خانہ یہودیوں اور اسرائیل کے عظیم تر خفیہ مفادات کے لیے کام کر رہا تھا۔ اس لیے کہ ان کا سربراہ بھی جس کا نام باسکل ہولارڈ ہے، ایک امریکی نژاد یہودی ہے۔''

استاری اتنا بتا کر خاموش ہوا پھر اس نے کسی غیر مرئی نقطے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے پُرغور لہجے میں مزید کہنا شروع کیا۔

''میں نے ان کا معاملہ بگاڑا تو گون برگ نے مجھے لالچ دیا اور دھمکی بھی مگر میں نے مسز ہینفورڈ کے برعکس ان کی پیشکش ٹھکرا دی اور دھمکی کی بھی پروا نہیں کی۔ اس کے چند روز بعد...... ہی میرے ساتھ یہ حادثہ ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ میری بیوی اور بیٹی کو ہلاک کرنے والا ماسٹر مائنڈ گون برگ ہی ہے۔ میں اس کے پیچھے لگا اور اس کی حقیقت جانی تو غصے کا شکار ہو گیا، کیونکہ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ یہ ایک لمبا کھیل ہے، اگر میں ان کے پیچھے لگا تو یہ میرا ابھی میری بیوی اور بیٹی جیسا حشر کرنے میں دیر نہیں کریں گے۔ یہ دھمکی بھی مجھے انہوں نے دے رکھی تھی لیکن جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ بیوی اور بیٹی کے مرنے کے بعد مجھے اپنی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی اور اب بھلا میں ان کی راہ کیوں سیدھی کرتا؟ میں نے فیصلہ کیا کہ انہیں اب انتقامی طور پر ہی سہی عابدہ کے سلسلے میں کامیاب نہیں ہونے دوں گا، مگر پھر میں نے سوچا کہ اس طرح تو میں بھی ہلاک کر دیا جاؤں گا، یہ اپنا کام پھر بھی کر جائیں گے۔ تو کیوں نا کوئی اور چال چلی جائے۔ لہٰذا میں نے بظاہر ان کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے۔

عابدہ غائب کر دی گئی۔ میں ان کی کھوجنا میں لگ گیا لیکن جیسے ہی مجھے ان کی حقیقت کا علم ہوا میں اپنا دل مسوس کر رہ گیا۔ کیونکہ یہ تو واقعی امریکا کے حساس ادارے سے تعلق رکھتے تھے۔ کسی کو بھی موت کے گھاٹ اتار کے اسے ملکی مفاد کا نام دیتے تھے۔ حالانکہ مفاد اس میں صرف اسرائیل اور یہودیوں کا کارفرما ہوتا تھا۔

پھر بھی میں نے گون برگ کا ٹھکانا، اس کے رابطے، کہاں آتا جاتا ہے، سب جانچ لیا۔ یہ ایسا آدمی ہے، جو ٹائیگر فیگ کے سربراہ باسکل ہولارڈ پر بھی حکم چلانے کا اختیار رکھتا ہے کیونکہ باسکل ہولارڈ کو ٹائیگر فیگ کا سربراہ بنانے میں جے بی سی کا ہی ہاتھ ہے اور وہ انہی کے مفادات کے لیے کام کرتا ہے، جبکہ خود گون برگ جے بی سی کے سربراہ کا نائب ہے اور جے بی کمیونٹی میں اسے نمبر دو کی حیثیت حاصل ہے۔''

وہ اتنی تفصیل بتا کر چپ ہوا تو میں خاموش نہیں رہ سکا۔ ''ہم م م...... اس کا مطلب ہے گون برگ اب ہمارا اصل ٹارگٹ ہوا جو آنسہ خالدہ اور عابدہ کے بارے میں مجھے ٹھیک ٹھیک بتا سکتا ہے۔''

''بالکل......'' استاری بولا۔

''مجھے ابھی اس کا پتا اور اس کے ٹھکانوں کے بارے میں بتاؤ جہاں اس کے معمولات گزرتے ہیں۔'' میں نے فوراً کہا۔ عابدہ کی بازیابی کے سلسلے میں اصل آدمی کا پتا چلتے ہی میرا رُواں رُواں متحرک ہو گیا تھا۔

''ریلیکس...... مسٹر شہزی! ریلیکس......'' استاری بولا اور ٹریسی کو آواز دی، پھر کبیل دادا اور شکیلہ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''کون سی پیو گے تم دونوں......؟''

اتنے میں ٹریسی آگئی۔

''مالٹ وسکی......'' کبیل دادا نے کہا۔

''اور...... برنچ واٹر بھی، کیوبس کے ساتھ......'' شکیلہ نے بھی گرہ لگائی۔

''اور...... مسٹر شہزی! آپ کیا لیں گے؟'' ٹریسی نے ہلکی مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا۔

''زحمت نہ ہو تو پتا والا دو ایک کپ......'' میں نے کہا۔ (پتا وا ایک قسم کی چائے تھی) وہ چلی گئی۔

کچھ ثانیوں کے لیے گفتگو میں وقفہ آیا تو میرے ذہن میں پھر وہی گرجا کی کھڑکی والی جوان اور حسین راہبہ گھوم گئی۔

''جب تک تم اس کے ٹھکانے تک پہنچنے کی کوشش کرو گے، وہ تمہارے سر پر پہنچ جائے گا۔'' اچانک استاری نے میری طرف دیکھ کر کہا اور میں چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''اس نے اپنی حفاظت اور اپنی ریکی کرنے والوں کے پیچھے درجنوں آدمی چھوڑ رکھے ہیں جو سب کے سب تربیت یافتہ ایجنٹ ہیں، ان میں کوئی تمہیں بارٹینڈر کے روپ میں ملے گا تو کوئی حسین ویٹرس کے روپ میں۔ حتیٰ

کے کسی فٹ پاتھ یا چوراہے پر کھڑا خاموشی سے گٹار بجاتا ہوا بیگر (فقیر) بھی...... جیسے انہیں یہ بھنک پڑے گی کہ تم گون برگ کا پوچھتے پھر رہے ہو، وہ محتاط ہو جائیں گے۔"

"میرا خیال اس طرح کے رسک تو ہمیں لینا ہی پڑیں گے۔" شکیلہ نے بہ ظاہر عام سے لہجے میں کہا مگر میں اس کے چہرے کے تاثرات اور لب و لہجے میں چھپی خفیف سی لرزش کو محسوس کیے بنا نہ رہ سکا۔ یہی بات یہی تھی کہ خود میں بھی گون برگ کی اس قدر محتاط پسندی پر اندر سے پریشان سا ہوا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ اسٹاری، گون برگ کو کوئی ہوا بنا کر پیش کر رہا تھا مگر وہ اس کا زخم کھایا ہوا تھا اور اسے جانتا تھا۔

"تم پھر کیسے بچے رہے؟" اچانک جانے کس خیال کے تحت کبیل دادا نے اسٹاری سے کہا۔ "تم بھی تو گون برگ کی ریکی کرتے رہے۔ جبھی تو اس کے مختلف ٹھکانوں سے واقفیت حاصل ہوئی ہے تمہیں؟"

کبیل دادا کا سوال برمحل تھا لیکن میں نے دیکھا اسٹاری کے چہرے پر اسرار بھری مسکراہٹ عود کر آئی تھی جس کی تہ میں تلخی کا شائبہ محسوس ہوا۔ وہ اسی لہجے میں بولا۔

"اسی لیے تو یہ سب تم سے کہہ رہا ہوں۔ کیونکہ اس بدبخت نے ایک دن اچانک میرے رُوبرو آ کر جارحانہ انداز میں اپنی اور میری ناک سے ناک ملا کر بڑے زہریلے لہجے میں دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے دوبارہ اس کی ریکی کرنے کی ذرا سی بھی حماقت کی تو...... لمحے کی بھی دیر کیے بغیر میری ذات ماضی کا حصہ بن جائے گی۔"

اسٹاری کے اس جواب کے بعد ایک دم کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

اتنے میں ٹریسی آ گئی۔ اس کے ہاتھوں میں بڑی سی ٹرے تھی۔ وہ اس نے بیچ میں رکھی تپائی پر رکھ دی۔ اپنے شوہر کے لیے وہ شمپین کا پیگ بنا لائی تھی جو اس نے اسے تھما دیا۔ کبیل دادا اپنے اور شکیلہ کے لیے مالٹ وہسکی کے پیگ بنانے لگا۔ میں نے کپ اٹھا لیا۔

اسٹاری نے ایک گھونٹ بھرا اور اسی وقت اس کا سیل گنگنایا۔

"پلیز ڈارلنگ!" اس نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے ٹریسی سے کہا۔

"شیور۔" وہ مسکرائی اور سیل اٹھا کر اسے تھما دیا۔

"ہیلو۔" اس نے سیل اپنے کان سے لگاتے ہوئے گمبھیر آواز میں کہا دوسرے ہی لمحے اس کا چہرہ متغیر کر رہ گیا۔ ہم تینوں کی نظریں اس کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔

میں نے دیکھا، اس کے چہرے کی ساری گمبھیرتا دوسری جانب سے ہونے والی ایک ذرا سی آواز پر فرو ہو چکی تھی اور اب اس کی جگہ خوف اور تشویش نے لے لی۔ اس کا چہرہ بھی یکایک پسینے سے تر ہو گیا، چھوٹی چھوٹی آنکھیں پھٹ سی گئیں۔

یہی نہیں اس کے ایک ہاتھ میں تھما ہوا شمپین کا بلوریں پیگ بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا، تپائی سے ٹکرایا اور چھناکے سے ٹوٹ کر کرچیوں کی صورت قالین پر بکھر گیا۔

"نن...... نہیں...... وہ...... وہ...... میری بیوی کے کچھ رشتے دار ہیں۔ تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے مسٹر گون!" اس نے جواب میں کپکپاتے جملے ادا کیے اور اس کے منہ سے گون...... سنتے ہی میرے کان کھڑے ہو گئے، اعصاب اس قدر تن گئے کہ چٹختے محسوس ہونے لگے۔ شکیلہ کی آنکھیں مزید کشادگی کا منظر پیش کرنے لگیں جبکہ کبیل دادا کے چہرے پر یکایک سناٹا طاری ہو گیا۔

"نن...... نہیں تو، مسٹر گون! مم...... میں تو بالکل ٹھیک ہوں، کک...... کچھ نہیں ٹوٹا۔ آ...... آپ ایسا کریں آ کر تصدیق کر لیں۔" اسٹاری کی حالت بدستور پتلی ہو رہی تھی۔ کہاں تو میں اسے ایک دبنگ افسر سمجھے ہوئے تھا مگر گون برگ سے بات کرتے ہوئے وہ ایک دم بھیگی بلی نظر آنے لگا۔ یوں جیسے اس کی جان نکلی جا رہی ہو۔

اس کے جواب پر میں نے یہ اندازہ ٹھیک لگایا تھا کہ دوسری جانب گون برگ نہ صرف اس کی حالتِ غیر سے بلکہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرنے والے شیشے کے گلاس کے ٹوٹنے کی آواز بھی سُن چکا تھا۔

دوسری جانب سے شاید آخری بار اس سے کچھ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا گیا اور اسٹاری...... نے سیل فون تپائی پر رکھا اور اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ہمیں خاموشی اختیار کرنے کا اشارہ کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا، پھر کھڑکی کی جانب لپکا، اسی طرح دوسری کھڑکی کی طرف گیا اور پردہ ذرا سا ہٹا کر باہر جھانکا۔ اس کے بعد واپس ہماری جانب بڑھا۔

اس دوران میں میرا دل ایک خیال سے تیزی سے دھڑکنے لگا۔ گرجا کی کھڑکی والی جوان راہبہ کا چہرہ ایک بار پھر میری نظروں کے سامنے گردش کرنے لگا تھا۔

وہ بُری طرح بوکھلایا ہوا اور حواس باختہ ہو رہا تھا۔ اسی لہجے میں بولا۔ "اس کم بخت نے تو میری رہائش گاہ کی بھی ریکی کر رکھی ہے۔ اس کے آدمیوں نے اسے بتا دیا ہے

UrduBooks.PK

کہ چند افراد یہاں موجود ہیں۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے مسٹر استاری؟" میں نے کہا۔ "مگر تمہیں اتنا حواس باختہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ گون کو کچھ نہیں معلوم کہ یہاں تمہارے اور تمہاری بیوی کے علاوہ اور کوئی لوگ بھی موجود ہیں، لیکن تم نے اس کے خوف میں یہ بتا ڈالا کہ اس کے گرگوں کی رپورٹ درست ہے۔"

میری بات سن کر استاری کا منہ کھل گیا۔

"تت...... تمہیں بھلا اس بات کا کیسے اندازہ ہوا؟"

"شاید تم پر گون برگ کا کچھ زیادہ ہی خوف سوار ہے مسٹر استاری!" میں نے کہا۔ ان حالات میں میرا یوں طمانیت بھرا انداز استاری کو ہی نہیں بلکہ کیبل دادا اور شکیلہ کو بھی چونکا گیا تھا۔

"ہاں! وہ ایسا ہی قسائی نما ایک شیطانی گھوسٹ ہے۔" استاری قدرے جھلا کر بولا۔ "لیکن میں خوف زدہ نہیں ہوں، میں اُسے مار کے مرنا چاہتا ہوں۔"

"مایوسی کی باتیں مت کرو استاری!" میں نے اس کا حوصلہ بڑھانے کی غرض سے کہا۔ "تم اس سے انتقام بھی لو گے اور زندہ بھی رہو گے۔ اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ گون برگ کو کیسے یہ پتا چلا کہ یہاں تمہارے اور ٹرسکی کے علاوہ اور کون لوگ ہیں۔ سب میرے ساتھ آؤ۔"

کہتے ہوئے میں اس کمرے میں آ گیا اور سامنے والی کھڑکی دکھائی۔ وہاں اب کوئی نہیں تھا اور کھڑکی بند تھی۔

"تمہارے اس ڈپلیکس کی بہت پہلے سے نگرانی کی جاتی رہی ہے۔" میں نے اس کھڑکی سے باہر اشارہ کرتے ہوئے استاری سے کہا۔ "جیسا کہ تم نے ابھی بتایا کہ گون کے جاسوس کیڑوں مکوڑوں کی طرح دیواروں سے چپکے ہوئے رہا کرتے ہیں، ابھی ناشتے سے پہلے سامنے گرجا والی کھڑکی پر میں نے ایک جوان اور حسین راہبہ کو مشکوک انداز میں اس طرف گردن جھکا جھکا کر دیکھتے پایا تھا۔"

میں نے کھڑکی بند کر دی اور ان کی طرف گھوما۔

"اب مجھے یہ بتاؤ گون برگ نے تمہیں کیا جواب دیا ہے؟" "ابھی میں نے اس سے اتنا ہی پوچھا تھا کہ اچانک کال بیل بجی۔ ہم سب چونک گئے۔"

"گھبرانے کی ضرورت نہیں۔" میں نے ہولے سے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ پھر استاری کی طرف دیکھ کر سوال دہرایا۔

"وہ...... وہ...... اپنا کوئی آدمی یہاں بھیجنے کا کہہ رہا

کیا آپ
لبوب مقوی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے۔ اعصابی کمزوری دور کرنے۔ ندامت سے نجات، مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے۔ کستوری، عنبر، زعفران جیسے قیمتی اجزاء سے تیار ہونے والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ یعنی ایک انتہائی خاص مرکب خدارا...... ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے اور خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کیلئے۔ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ آج ہی صرف ٹیلیفون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی منگوالیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی طبی یونانی دواخانہ)
ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383
فون صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک کریں

تھا، شش...... شاید وہی آیا ہو۔'' اسٹاری بولا۔

''او کے۔ تم جاؤ اور دروازہ کھولو، ہم سب اسی طرح آرام سے لاؤنج میں بیٹھتے ہیں جیسے تھوڑی دیر پہلے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ٹریسی تم بھی آؤ، ڈرو نہیں، معاملہ خراب ہوا تو میں اور میرے ساتھی سنبھال لیں گے۔''

ہم سب لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئے۔ اسٹاری دروازے کی طرف بڑھا۔ میں نے سب کو نارمل نظر آتے رہنے کی تاکید کرتے ہوئے لجاجت سے کہا۔

''دیکھو! یہاں کوئی خون خرابا نہ ہونے دینا، جو کچھ ہو وہ ہونے دینا، مجھ پر بھروسا رکھو میں بعد میں صورتِ حال سنبھال لوں گا۔''

میں نے پُرسوچ انداز میں ہونٹ بھینچ کر اپنے شانے اچکا دیے اور کبیل دادا اور شکیلہ کو آنکھ کا مخصوص اشارہ کر دیا۔ پھر ہم بیٹھ گئے۔ میں دانستہ کرسی کو ایسے رخ پر کر کے بیٹھ گیا تھا کہ دروازے پر بھی نگاہ رکھ سکوں۔

اسٹاری نے دروازہ کھولا۔ میں اپنی کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بظاہر کھلنڈرے انداز میں پھیل کر بیٹھ گیا اور اسٹاری کی چھوڑی ہوئی خالی کرسی پر اپنی ایک ٹانگ مخصوص انداز میں رکھ لی۔ تاکہ بوقتِ ضرورت اسے ٹانگ کے ہی زور پر اچھال سکوں۔ ساتھ ہی میں نے اپنے دائیں ہاتھ کی انگشتری میں پہنی ہوئی سانپ والی انگوٹھی کو یونہی چھیڑا اور جیب میں رکھے سنہری بھونرے کی موجودگی کا اطمینان کیا۔

میرے یہ دونوں خلائی ہتھیار اپنی پیاس بجھانے کے لیے تیار تھے۔

کبیل دادا اور شکیلہ کی نظریں دروازے پر جیسے ثبت ہو کر رہ گئی تھیں۔

''جب تک میں کوئی حرکت نہ کروں، تم دونوں اسی طرح کیل ہو کے بیٹھے رہنا۔'' میں نے ان دونوں سے سرسراتی سرگوشی میں کہا۔ ٹریسی کو میں نے آنکھ کے اشارے سے کمرے میں بھیج دیا تھا۔

یکایک ماحول میں کھنچاؤ اور سنسنی کی سی فضا طاری ہو گئی۔

اسٹاری نے دروازہ کھولا اور اس نے جیسے اندر در آنے والے کو فوراً ہی چند قدم پیچھے ہٹ کر راستہ دیا، اگلے ہی لمحے ایک شخص غڑاپ سے اندر داخل ہوا۔ اس نے کوٹ پتلون اور سر پر ہیٹ پہن رکھا تھا۔ وہ ایک دراز قامت اور قدرے چوڑے شانوں والا آدمی تھا۔ اس کے انداز و اطوار سے چابک دستی اور نہایت محتاط پسندی ہویدا تھی۔

ہم تینوں اس کی طرف گردن گھما کر بناوٹی حیرت سے تکنے لگے۔ اس کا ایک ہاتھ کوٹ کی اندرونی جیب کی طرف رینگ گیا۔ میری سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پر جیسے نسیں تک دھڑکنے لگیں۔

وہ اسی طرح کھڑا ایک ٹک ہم تینوں کو گھورنے لگا اور ہم بھی اسی طرح اس کی طرف اجنبی سی حیرت سے تکتے رہے۔ اس کا کوٹ کی اندرونی جیب کی طرف رینگتا ہوا ہاتھ وہیں ٹھہر چکا تھا۔

''کون ہو تم لوگ؟'' اس کا انداز تحکمانہ تھا۔

''بروجر! گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ایک ذمے دار ادارے کے افسر ہیں، میری طرح انہیں شبہ ہوا کہ کچھ لوگ یہاں......''

''یو شٹ یور ہول......'' اس آدمی نے اسٹاری کو جھڑک کر چپ کرا دیا اور ماؤتھ (منہ) کی جگہ ''ہول'' کا لفظ حقارت کے اظہار میں استعمال کیا۔

اسٹاری نے میری طرف دیکھ کر جو کہنے کی کوشش چاہی تھی، میں اس کا اشارہ بھانپتے ہی اس نوارد سے بولا۔

''میں بروجر ہوں اور اپنی کزن ٹریسی سے ملنے آیا ہوں۔'' میں نے ہموار لہجے میں کہا۔

''اور یہ کون ہیں دونوں......؟'' اس آدمی نے بارعب آواز میں پوچھا۔ اس کا اشارہ کبیل دادا اور شکیلہ کی طرف تھا۔

''یہ میرے دوست ہیں، مسٹر پاشا اور وہ خاتون ان کی گرل فرینڈ ہیں، مس لیلیٰ۔'' میں نے ہموار آواز میں کہا۔

میں نے دانستہ کبیل دادا اور شکیلہ کو غیر ملکی ظاہر کیا تھا۔

ایک تو وہ دونوں لگتے بھی ایشیائی مسلم تھے جبکہ میرا معاملہ اور تھا۔ مگر وہ سوٹ پوش میرے لہجے کو بھی تاڑ کر چبھتی ہوئی آواز میں بولا۔

''لہجے سے تو تم بھی غیر ملکی لگتے ہو؟''

''میں لندن میں پیدا ہوا، پھر تھوڑا عرصہ یہاں رہا۔'' میں نے جیسے ان کے سامنے سبق رٹنا شروع کر دیا۔ ''ٹریسی کی شادی کے بعد میں نوکری وغیرہ کے سلسلے میں دوبارہ لندن چلا گیا۔ وہاں نوکری کی مگر تنخواہ کی مد میں ٹیکس اس قدر زیادہ پے کرنا پڑا تھا کہ ایک دوست کے مشورے سے دیگر گوروں کی طرح مڈل ایسٹ چلا گیا، وہاں تنخواہ زیادہ تھی اور ٹیکس نہ ہونے کے برابر اس کے بعد......''

''بکواس بند کرو اپنی اور تینوں اپنے ہاتھ کھڑے کر

کے دیوار کی طرف منہ کرلو۔‘‘

وہ میری تقریر پر چیختا ہوا بولا اور خوفناک نال والا پستول نکال لیا۔ میں نے بھویں سکیڑ کر اس کے پستول کا جائزہ لیا۔ وہ اے ٹو یوزی تھا۔ ایک خطرناک پستول اس کی نال لمبی تھی بلکہ سائلنسر لگا کر لمبی کی گئی تھی۔ وہ اس نے ایک طرف ہم تینوں پر تان لی پھر دوسرے ہاتھ کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے اپنے کوٹ کا کالر چھو کر منہ قریب کیا اور جلدی سے شارٹ لینگویج میں کچھ کہا۔

اس کے چند ہی لمحوں بعد کمرے میں مزید دو افراد آگئے۔ ان دونوں کو دیکھ کر یقیناً میں ہی نہیں وہاں موجود سب ہی چونکے تھے کیونکہ وہ مرد عورت تھے۔ مرد کسی چرچ کے ’’پادری‘‘ والے لباس میں تھا جبکہ اس کے ساتھ کھڑی خوبصورت سی عورت نے سر سے پاؤں تک راہباؤں والا چغا اوڑھ رکھا تھا۔

ایک جھٹکے سے اپنے دونوں ہاتھوں کو مخصوص حرکت دے کر دونوں نے ہی اپنے اپنے لبادے اتار کر نیچے گرا دیے۔

ان کے اندر سے اب دو چست و چالاک افراد نمایاں تھے۔ عورت کو دیکھ کر میں پہلے ہی ایک سرد سی سانس بھر کر رہ گیا تھا۔ یہ وہی گرجا کی کھڑکی والی ’’نن‘‘ تھی۔

’’مسی! پہلے اس لڑکی کی تلاشی لو۔‘‘ ایک نے تحکمانہ انداز میں اپنی راہبہ والی ساتھی سے کہا۔ وہ آگے بڑھی اور شکیلہ کو پیچھے سے دبوچ کر ایک طرف لے گئی اور اس کی جامہ تلاشی لے ڈالی۔ پھر دراز قامت ساتھی کی طرف دیکھ کر نفی میں سر ہلا دیا۔ مجھے اس آدمی پر گون کا شبہ ہوا تھا، میں الجھ سا گیا۔

’’اوکے......!‘‘ اس نے کہا اور دوسرے ساتھی سے تحکمانہ بولا۔

’’روبڈ! اس گرانڈیل آدمی کی تلاشی لو۔‘‘ اس کا اشارہ کبیل دادا کی طرف تھا پھر کبیل دادا نے بھی اپنی تلاشی دے دی۔

’’ہم......‘‘ دراز قامت نے ہنکاری بھری اور یوزی کی نال سے میری طرف اشارہ کیا تو وہ آدمی اب کبیل دادا کو چھوڑ کر میری جانب بڑھا۔

میری تلاشی کے دوران وہ سنہری بھونرا اس کے ہاتھ لگنا یقینی امر تھا۔ پھر کیا ہونے والا تھا......؟ یہ ہر گزرتے لمحات کی اسرار بھری سرگوشی کہہ رہی تھی کہ اب وہی کچھ ہونے والا تھا جس کی منت استاری نے مجھ سے کر رکھی تھی۔

لیکن میرا دھیان اس چوڑے شانوں والے یوزی تھامے شخص کی طرف بھی لگا ہوا تھا کہ کہیں یہ گون برگ ہی تو نہیں؟ جبکہ استاری یقیناً اسے جانتا ہوگا مگر...... وہ اس کے بارے میں مجھے ابھی بتا نہ سکا تھا۔

وہی ہوا...... میری تلاشی لینے کے دوران وہ بھونرا اس کے ہاتھ لگ گیا۔ وہ اس نے اپنی انگلیوں میں پکڑ کر اپنے چہرے کے قریب کیا اور آنکھیں سکیڑ کر بہ غور دیکھنے لگا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ اسے الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا اور میں جانتا تھا کہ اگر اس کی کسی انگلی نے بھونرے کے بائیں پر کو چھولیا اور وہ ذرا سا بھی ’’پش‘‘ ہو گیا تو وہ کس قدر بھیانک اور اذیت ناک موت کا شکار ہو سکتا۔

’’یہ کیا شے ہے؟‘‘ اس نے مجھ سے دریافت کیا۔

’’یہ......‘‘ میں نے کہتے ہوئے اپنا ایک ہاتھ چھونے کے انداز میں بھونرے کی طرف بڑھایا تو اس نے جھڑک کر مجھے حرکت کرنے سے روک دیا۔

’’یہ میری گرل فرینڈ کی نشانی ہے۔‘‘

’’کیا ہے روبڈ؟‘‘ معاً یوزی والے نے بلند آواز سے اپنے ساتھی کو پکارا۔

’’پتا نہیں کیا شے ہے یہ۔‘‘ روبڈ نے بہ ظاہر بے ضرر مگر دنیا کے خطرناک ترین ہتھیاروں میں شمار ہونے والے اس عجیب اور انوکھے ہتھیار کو چند قدم آگے بڑھ کر اسے تھما دیا۔ مجھے بدستور دیوار کی جانب منہ کیے کھڑے رہنے کا حکم ملا۔

اب شاید وہ یوزی والا...... اس سنہری بھونرے کو اپنے ہاتھ میں لیے دیکھ رہا تھا اور میری کنپٹیاں سنسناتی رہیں۔ میرا منہ بدستور دیوار کی طرف تھا۔

اچانک مجھے روبڈ کی بوکھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔

’’کک...... کیا ہوا تمہیں......؟‘‘ اس نے شاید یوزی والے کو مخاطب کیا تھا۔

’’اوہ...... مائی گاڈ!...... ووف! تمہیں یہ کیا ہو رہا ہے؟‘‘ یہ متوحش سی آواز ان کی ساتھی مسی کی تھی اور ووف شاید وہی یوزی والا تھا اور ان کی متحیرانہ آوازوں نے پل کے پل مجھے یہ باور کرا دیا تھا کہ ووف کی کسی انگلی نے بھنورے کے بائیں پر کو نہ صرف چھولیا تھا بلکہ اسے نادانستگی میں ہلکا سا دبا بھی دیا تھا۔

میں پلٹا اور ایک متوقع منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ یوزی والا ووف...... ہنوز وہ بھونرا اپنے ایک ہاتھ میں پکڑے، اسے اپنے چہرے اور آنکھوں کے قریب کیے ایک

UrduBooks.pk

ٹک تکتے رہنے پر مجبور ہو چکا تھا اور اس کی آنکھیں پھیل چکی تھیں۔

بھونرے کے پر برق رفتاری سے متحرک ہو چکے تھے۔ اس کی مہیب بھنبھناہٹیں ووف...... کی دماغی نسوں اور غیر مرئی دوڑتی رو...... کو اپنے مسمرائزڈ پاور سے جھنجوڑنے لگی تھیں، آنکھیں پھٹنے کے قریب ہو گئی تھیں، اس کے دونوں ساتھی روبڈ اور مسی خود اس اچانک اور عجیب و غریب صورت حال سے بوکھلائے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ پھر یوزی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گری اس کے بعد بھونرا بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ پھر وہ خود اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی کنپٹیاں دبائے فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

روبڈ اور مسی اسے سنبھالنے کی کوشش میں تھے۔ استاری کا منہ حیرت کے شدید ترین تاثرات سے کھلا ہوا تھا۔

اسی وقت روبڈ پھرتی کے ساتھ میری جانب متوجہ ہوا اور اس کا ایک ہاتھ اپنے کوٹ کے اندر بڑھا، بعین یہی حرکت گویا خطرہ محسوس کرتے ہی مسی نے بھی کرنی چاہی تھی کہ پھر مجھ سمیت کبیل دادا اور شکیلہ کو بھی حرکت میں آنا پڑا۔

شکیلہ نے اپنی جگہ سے اچھل کر مسی پر کسی وحشی جنگلی بلّی کی طرح جھپٹا مارا تھا اور اسے کوئی ہتھیار نکالنے کا موقع دیے بغیر اس سمیت زمین بوس ہوتی چلی گئی۔ کبیل دادا اور میں نے بیک وقت روبڈ کو ایک ہی جست میں جا دبوچا اور پستول نکالتے اور باہر آتے آتے وہ روبڈ کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

اسی وقت میری سماعتوں نے مسی کی گھٹی گھٹی مگر اذیت ناک چیخ سنی، بالکل ایسی ہی چیخ جو ہوش و حواس سے بیگانہ ہونے سے صرف ایک ثانیے کے لیے حلق سے امڈتی ہے۔

ادھر میں نے اپنے دائیں ہاتھ کا ایک عدد پنچ روبڈ کی ناک پر رسید کر کے اسے کبیل دادا کے لیے کمزور کر کے چھوڑا اور خود جھک کر، ووف کے ہاتھ سے چھوٹ کر قالین پر گرے ہوئے بھونرے کو اُچک لیا۔

ووف...... شاید اس مہلک بھونرے کی زد میں آ چکا تھا بلکہ ”شکار“ ہو چکا تھا۔ بھونرے کی ننھی منی آنکھوں مگر قدرے ابھرواں آنکھوں سے مترشح ہونے والی اَن دیکھی مہلک لہروں نے ووف کی دماغی نسیں چٹخا ڈالی تھیں۔ اب اس کے منہ، کان اور ناک سے خون کی لکیریں بہہ نکلی تھیں۔

اسی وقت کبیل دادا نے شاید کوئی داؤ آزمایا تھا اور روبڈ مجھ سے آن ٹکرایا۔ اگلا لمحہ میرے دائیں بازو کے حرکت میں آنے کا تھا، میں نے اسے دبوچا اور انگوٹھی اس کی گردن سے لگا کر مخصوص حرکت دی۔ اس پر نگینے کی جگہ لگے ہوئے سانپ کے پھن نے مہلک شعاعوں سے ڈس لیا۔ روبڈ کا جسم پل کے پل بے حس و حرکت ہو گیا۔

ادھر مسی شکیلہ کے قابو میں نہیں آ رہی تھی، حالانکہ اس کی ہیئت کذائی بتا رہی تھی کہ شکیلہ نے اس کی اچھی خاصی دھنائی کر ڈالی۔ اگرچہ شکیلہ بھی نڈھال سی ہو رہی تھی اور اس کے نچلے ہونٹ سے خون بہہ رہا تھا۔ شاید یہ مسی کے پاؤں کی کسی ضرب کا شاخسانہ تھا۔

پھر ایک موقع پر جب میں نے کبیل دادا کو شکیلہ کی مدد کے لیے اشارہ کیا تو اس نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ وہ مسی کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اس نے شکیلہ کو موقع پاتے ہی ایک ٹھوکر رسید کی کہ وہ کبیل دادا سے جا ٹکرائی، وہ اسے سنبھالتے رہ گیا جبکہ مسی نے راہِ فرار اختیار کی اور لومڑی کی طرح دروازے کی جانب جست بھری۔

مسی کی یہ ایسی بہ سرعت حرکت تھی کہ میں بھی اسے دروازے کی طرف گویا ہوا کی رفتار سے جاتے دیکھتا رہ گیا۔

پھر بھی وہ وقت تھا جب ہلکی ”چزز“ کی آواز ابھری اور مسی کے حلق سے برآمد ہونے والی آخری چیخ بڑی کرب ناک تھی۔ گولی اس کی گردن میں شہ رگ کو چیر گئی تھی۔ وہ کسی چھپکلی کی طرح چٹ سے گری اور ٹھنڈی پڑ گئی۔

استاری کے ایک ہاتھ میں پستول نظر آ رہا تھا۔ اس کی نال سے دھوئیں کی لکیر لہراتی دکھائی دی۔ اس نے موقع پاتے ہی ووف کے سائلنسر لگے پستول سے مسی کو گولی مار دی تھی۔

”میں یہ سب نہیں چاہتا تھا مگر افسوس......“ وہ بوجھل پن سے بولا اور ایک کھڑکی کی جانب بڑھا، وہاں سے اس نے ذرا سا پردہ ہٹا کر نیچے کہیں جھانکا اور پھر بولا۔

”ان کی لاشوں کو اب خفیہ طور پر ٹھکانے لگانا ہو گا۔ لیکن......“ اس نے اپنی بات قطع کرتے ہوئے میری جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”مسٹر شہزی! یہ اس ووف کے ساتھ تم نے کیا کیا تھا؟“ اسے ابھی یاد آیا تھا مگر میں اسے بھونرے والی کارستانی بتانا نہیں چاہتا تھا، کندھے اچکا کر انجان بن کے بولا۔

”میں کیا جانوں؟ شاید اسے دل کا دورہ پڑا ہو۔“

UrduBooks.pk

مرحبا
SINCE 1975
مرحبا اسپغول
کیونکہ صحت ہے انمول
PAKISTAN'S No. 1 SELLING ISPAGHOL BRAND
MARHABA ISPAGHOL HUSK
FECAL BULKING AND CHOLESTEROL LOWERING NATURAL FIBROUS DIET AND DRUG
MARHABA ISPAGHOL HUSK
ISPAGHOL

MARHABA LABORATORIES (PVT.) LTD.

/marhabalaboratoriespk | UAN: 111-152-152 | www.marhaba.com.pk

www.PakiDigest.Com

''نہیں، وہ تمہاری جیب سے برآمد ہونے والی کوئی شے غور سے دیکھ رہا تھا، تب ہی اس کی یہ حالت ہوئی تھی اور...... اور یہ روبذ بھی بالکل عجیب ہی طریقے سے تمہارے ہاتھوں مرا۔''

''ہاں! وہ تو اس کا ساتھی روبذ بھی دیکھ رہا تھا جس نے وہ شے میری جیب سے برآمد کی تھی، اسے تو کچھ نہیں ہوا تھا؟ مگر بعد میں، میں نے اس کی رگ حساس مسل ڈالی تھی۔'' میں نے تاویل دی۔ وہ الجھ گیا۔ اسی موقع پر کبیل دادا نے بات آئی گئی کرتے ہوئے اس سے کہا۔

''مسٹر استاری! ہمیں بلا دیر اپنا کام نمٹانا ہوگا۔''

اس کی بات پر وہ اپنی الجھن سے چونکا اور بولا۔

''آں...... ہاں! میں گاڑی نکالتا ہوں۔ تمہارا کوئی ایک ساتھی میرے ہمراہ چلے گا، یہاں دس بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک جھیل ہے، ان لاشوں کو وہیں پھینکنا ہوگا۔''

''کبیل دادا! تم اس کے ساتھ جاؤ۔ ہم اِدھر ہی رکتے ہیں۔'' میں نے کبیل دادا کی طرف دیکھا۔ اس نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی تھی۔

استاری کی بیوی ٹریسی ہراساں نظر آرہی تھی، مگر استاری نے اسے تھوڑا جھڑکتے ہوئے حوصلہ دیا اور اس سے کچھ کہا، وہ قریب کے کمرے میں چلی گئی۔

''ذرا کمزور دل کی مالک ہے، سہم گئی ہے بے چاری!'' استاری نے قدرے خجالت سے کہا۔

''میری کوشش تھی کہ اس میں سے کوئی ایک زندہ رہتا۔'' میں نے تبصرہ کیا۔

''اس کا کیا فائدہ تھا؟ وہ بعد میں ہمارے لیے مصیبت بن سکتا تھا۔'' استاری نے کہا۔

''ہم اس سے عابدہ وغیرہ کے متعلق کچھ اگلوانے کی کوشش کرتے۔''

''ان میں سے کوئی بھی تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔'' استاری بولا۔ ''میں نے تمہیں بتایا تو ہے کہ عابدہ اور آنسہ خالدہ کے متعلق صرف ایک ہی شخص حقیقت اُگل سکتا ہے اور وہ ہے گون برگ......''

''ہم......'' میرے منہ سے پُرسوچ انداز میں برآمد ہوا۔ ''مگر وہ ہمیں کہاں ملے گا؟'' میں نے آخر میں اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''ویسے تم اس کے ٹھکانے کے بارے میں بتا تو رہے تھے کہ یہ مصیبت نازل ہوگئی؟''

''ریلیکس!'' وہ بولا۔ یہ شاید اس کا تکیہ کلام تھا پھر قالین پر بے ڈھنگے انداز میں پڑی ان لاشوں کو تکتے ہوئے پُرخیال لہجے میں بولا۔

''انہیں رات میں ہی ٹھکانے لگانا ہوگا لیکن...... تب تک کوئی مصیبت نہ کھڑی ہو جائے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے تفکر آمیز انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

''کسی کو کیا معلوم کہ یہاں کیا ہوا ہے؟'' میں نے کہا۔ ''ابھی انہیں کم از کم یہاں سے کسی اور کمرے میں تو پھینک دیا جائے۔'' میں نے مشورہ دیا۔ وہ میری جانب غور کرنے کے انداز میں دیکھنے لگا اور میری بات سے اتفاق کرتے ہوئے اس نے اثبات میں ہی اپنے سر کو جنبش دی۔

اس کے بعد ہم تینوں نے اس کی مدد کی اور لاشوں کو اسٹور نما کمرے میں ڈال دیا۔

استاری نے ٹریسی کو آواز دے کر اسے مشروب لانے کا کہا اور ہم ایک بار پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ میں نے کہا۔

''مسٹر استاری! میں اور شکیلہ گون برگ کی تلاش میں نکل جاتے ہیں۔ کبیل دادا اِدھر ہی تمہارے ساتھ رکے گا۔''

''نہیں۔'' اس نے شاید کچھ نیا منصوبہ سوچنے کے انداز میں خیال انگیز لہجے میں کہا۔

''تم میں سے اب کوئی بھی یہاں زیادہ دیر نہیں رک سکتا۔ میں تمہیں گون برگ کے اہم ٹھکانے کا پتا بتا دیتا ہوں۔ اس کے ساتھ تم مجھے اپنا پتا بتاؤ کہ تم سے کہاں اور کب ملا جاسکتا ہے؟''

''لیکن لاشیں......؟'' کبیل دادا نے اس سے سوالیہ انداز میں کہا۔

''وہ میں خود ہی رات کے کسی درمیانے پہر جھیل میں جاکر پھینک آؤں گا، ممکن ہے انہیں مجھے...... سمندر کے کسی خلیجی حصے میں ہی غرق کرنا پڑے۔'' اس نے کہا اور بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولا۔ ''کیونکہ جھیل سے لاشیں برآمد ہونے کا خطرہ ہوگا۔''

''تمہاری بات صحیح ہے مگر استاری! یہ کام تم اکیلے کرلو گے؟'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''کرلوں گا۔'' اس نے اعتماد سے جواب دیا۔ اتنے میں ٹریسی ٹرے اٹھالائی۔ انہوں نے ایک ایک پیگ چڑھا کر جیتے ہوئے اعصاب شکن لمحات کی کشاکشی کو کم کیا اور میں کھڑکی کی طرف چلا گیا۔

میں نے ذرا باہر جھانکا تو نیچے سب کچھ معمول کے مطابق رواں دواں نظر آیا، مطمئن ہو کر میں واپس ان کی

UrduBooks.pk

جانب پلٹنا۔

استاری نے گون برگ کے کم و بیش تین ایسے ٹھکانوں کی نشان دہی کر ڈالی جہاں اس کی موجودگی متوقع ہو سکتی تھی۔

''ایک تو ریڈ بار نامی کیسینو تھا، جو اس کے بھائی ڈیوڈ کی ملکیت تھا۔ دوسرا ٹھکانا اس کا ''سی برڈ'' نامی ایک لگژری لانچ تھی جہاں وہ عموماً اپنی ایک اطالوی گرل فرینڈ ہیلنا کے ساتھ ویک اینڈ گزارتا تھا۔ تیسرا ٹھکانا وہ تھا جو اس کا ''رین بسیرا'' کہلاتا تھا۔

''یہ فرینسو کے ویسٹ میں ساحلِ سمندر کے کنارے ایک قدرے اونچی پہاڑی پر واقع ہے۔''

یہ بتاتے ہوئے وہ ذرا رکا تو میں جوش سے بولا۔ ''ہمیں پہلے اسی جگہ اسے دیکھنا ہوگا۔ کیونکہ یہ اس کی رہائش گاہ ہے۔''

''وہ یہاں کم ہی ملتا ہے۔'' استاری بولا۔ ''میں جب اپنی بیوی اور بیٹی کے ظالمانہ قتل پر اس سے انتقام لینے کے لیے پاگل ہو رہا تھا تو سب سے پہلے میں نے اس کی اسی رہائش گاہ کا رخ کیا تھا مگر وہ وہاں نہ ملا، جبکہ وہ مجھے اپنے اول الذکر دونوں ہی ٹھکانوں پر زیادہ نظر آیا تھا مگر افسوس میں اس کے خلاف کوئی خفیہ کارروائی نہ کر پایا، وہ بے حد خطرناک اور چھلاوا صفت آدمی ثابت ہوا بلکہ جیسا کہ میں نے بتایا، الٹا اس نے مجھے ٹریس کر لیا اور پھر خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے کر چھوڑ دیا۔''

''ہم......'' میں نے ہونٹ بھینچ لیے لیکن اپنی جگہ میرا یہ فیصلہ اٹل رہا کہ جے بی سی کے اس اہم ایجنٹ گون برگ کو میں سب سے پہلے اس کے پہاڑی ٹھکانے پر ہی تلاشنے کی کوشش کروں گا۔

اس کے بعد ہم نے اپنا ذرا حلیہ درست کیا اور حسبِ سابق ایسا ہی لباس زیبِ تن کیا جس سبب ہمیں فوری طور پر کوئی پہچان نہ سکے۔ یہ سب ہمیں ٹریسی کی راہنمائی میں ایک لمبے چوڑے وارڈ روب سے دستیاب ہو چکا تھا۔

مسی اور روبڈ کے ساتھ مقابلے کے دوران کمبیل دادا اور شکیلہ کو خراشیں آئی تھیں، ان پر مرہم اور سوفٹ جیل لگا کر ان کے ''ہوشربا'' تاثرات'' کو سرجیکل پلاسٹر شیٹ سے مخفی کرنے کی سعی کی تھی۔

کھانا کھانے کا کوئی موڈ نہیں ہو رہا تھا مگر استاری نے زبردستی ہمیں جیسے تیسے کچھ فاسٹ فوڈ ٹائپ کی شے اوون میں گرم کروا کر ٹھسا دی تھی۔

اس کے بعد استاری نے ہمیں گون برگ کی مختلف پوز میں کچھ تصاویر دکھائیں۔ میں اس کی تصویر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میرے تصور میں گون برگ جس قدر سفاک اور ظالمانہ مزاج کا آدمی تھا، شکل و صورت بھی اس کی نہایت کرخت اور مکروہ ہوگی مگر اس کے برعکس وہ ایک خوبرو اور جوان شخص نظر آتا تھا۔ صحت بھی اس کی قابلِ رشک تھی اور قد و قامت کا بھی وہ دراز تھا۔ بال ہلکے کرلی اور چھوٹے تھے۔ رنگ گورا اور آنکھیں ہلکی سبز نظر آتی تھیں۔

دو ایک تصویریں اس کی گرل فرینڈ کی بھی تھیں جو اس کے ساتھ تقریباً چپک کر کھڑی تھی۔ وہ خاصی سبک رو اور پُرکشش لڑکی تھی۔

میں نے احتیاطاً ان میں سے دو تین تصاویر.... جو کافی کلوز اپ تھیں، اپنی جیب میں رکھ لیں۔

پھر طے شدہ لائحہ عمل کے مطابق ہم تینوں استاری کے ہاں سے روانہ ہو چکے تھے۔

☆☆☆

کیلی فورنیا واحد امریکی ریاست ہے جہاں کا موسم معتدل رہتا ہے۔ زیادہ تر امریکی باشندے اسی ریاست میں رہنے کو ترجیح دیتے تھے، یہاں لیونگ اسٹائل بھی بہترین تھا۔ اسی مناسبت سے یہاں کی ٹیکس شرح بھی دیگر امریکی ریاستوں سے زیادہ تھی۔

بہرکیف...... آج کل یہاں سردی کا موسم تھا مگر سرِدست بارش اور برف باری کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔

کمبیل دادا نے پینٹ شرٹ پر ایک لمبا رین کوٹ ڈال لیا تھا جو اس کے دراز اور قدرے کسرتی بدن پر بڑا بھلا محسوس ہوتا تھا۔ اس پر مستزاد سر پہ ہیٹ تھا جو اسے کوئی پرائیویٹ ڈیٹیکٹو ظاہر کرتا تھا۔ شکیلہ نے یورپیائی طرز کی بالکل اسکن ٹائٹ اونی لیگنگ پر کھلے گلے والی سلیولیس اور اس پر گولڈن کلر کا سویٹر پہن لیا تھا۔ بالوں کا رنگ اس نے سنہری اور لینس لگا کر آنکھوں کا رنگ نیلا کر لیا تھا۔ وہ خاصی حسین اور پُرکشش نظر آ رہی تھی۔ جبکہ میں نے موٹی سیاہ جینز پر ڈارک بلیو ہاف آستین کی شرٹ اور اوپر اس کے ٹروچنگ جیکٹ چڑھا لی تھی۔ ہاتھوں میں دستانے پہن لیے تھے۔ بہت محتاط انداز میں مگر... بہ ظاہر کھلنڈرے پن کے ساتھ ہم استاری کے ہاں سے روانہ ہوئے اور باہر نکلتے ہی ہم نے کیب کروالی۔

سہ پہر سے کچھ آگے کا وقت ہو چلا تھا، سردی اور آسمان پر چھائے ہوئے کالے بادلوں کی وجہ سے...... تاریکی کا گمان ہوتا تھا۔ سڑکیں صاف اور روشن تھیں۔

ہم فریسنو کے ویسٹ میں اترے اور ٹیکسی والے کو کرایہ دے کر فارغ کر دیا۔ یہاں تو جیسے ہر طرف میلہ لگا ہوا تھا۔ حالانکہ یہ ویک اینڈ نہ تھا ...... مگر ساحل پر ایک جشن کا سا سماں بندھا ہوا تھا، جلد ہی عقدہ کھل گیا کہ یہ کسی شادی کی پارٹی کی تقریب تھی۔ ساحل پر روشنیوں کا سیلاب امڈا پڑا تھا۔ اس سرد موسم میں شادی کی یہ تقریب جو کسی ہوٹل یا ہال میں منعقد ہونی چاہیے تھی، یہاں ساحل کی سرد مرطوب سمندری ہواؤں میں منائی جا رہی تھی۔

اس تقریب پر شادی کا گماں یوں ہوا کہ خوش نما اور دیدہ زیب سفید براق لباس میں دلہن اور سیاہ کوٹ سوٹ میں اس کا دولھا ساتھ ساتھ کھڑے مہمانوں سے ملتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

”حیرت کی بات ہے، ایسی سخت سردی میں ساحل کے کنارے شادی کی پارٹی؟“ کمیل دادا کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”یہ امریکی ہیں، ان کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی ہے۔“ شکیلہ نے مسکرا کر تبصرہ کیا۔

”یہ لوگ بس انجوائے کرتے ہیں، ہماری طرح موسموں کا خیال نہیں ہوتا۔“ میں نے کہا۔ ”ایسے میں یہ لوگ شراب اور کباب دونوں کے مزے لیتے ہیں۔“

ہم ذرا رک کر اس طرف دیکھنے لگے۔ سب مہمان سوٹ بوٹ میں ملبوس نظر آ رہے تھے، ان میں بچے بھی تھے، انہوں نے گرم کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ عورتیں اور بوڑھے بھی تھے۔ جگہ جگہ آگ کے اسٹینڈ اپ آتش دان، بھڑکتے چولھے اور باربی کیو کے اسٹینڈ پر شعلوں اور چنگاریوں میں ...... بھنتے گوشت کے پارچے ...... کباب اور بھانت بھانت کی بوتلوں کے کریٹ، سب ہی کچھ نظر آ رہا تھا۔

ایک طرف قدرے کھلی جگہ پر گاڑیاں بھی قطار میں لگی ہوئی تھیں۔ کہیں دور و قریب کچھ لانچیں اور بحری جہاز بھی لنگر انداز تھے۔

ہم اس سے توجہ ہٹا کر اس راستے پر ہو لیے جو اسٹاری کے بتائے ہوئے پتے کے مطابق گون برگ کی رہائش گاہ تک جاتا تھا، مگر ابھی چند قدم ہی آگے بڑھے تھے کہ اچانک ہمیں اپنے عقب میں کسی گاڑی کی تیز ”چیزنگ“ کی آواز سنائی دی۔

ہم تینوں ٹھٹک کر رکے اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک شاندار سی چمچماتی کار خاصی تیز رفتاری سے کوئی موڑ کاٹ کر ہماری طرف لپک رہی تھی۔

میری عقابی نظروں نے اس میں صرف دو افراد کو بیٹھے دیکھا تھا، ایک ڈرائیونگ سیٹ پر مرد اور دوسری پر ایک جوان عورت ...... دونوں کسی بات پر منہ پھاڑے ہنس رہے تھے اور انہیں اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ ہم ان کی تیز رفتار کار کی زد میں آ سکتے تھے۔

انہیں شاید معلوم تھا کہ جب تک وہ ہمارے قریب پہنچیں گے، ہم ایک دم ہٹ جائیں گے اور ایسا ہوا بھی۔

کار ہمارے قریب سے ”زن“ کی آواز کے ساتھ گزرتی چلی گئی اور پھر یک دم اس کے ٹائر چرچرائے۔ وہ رکی اور دائیں جانب اسی راستے پر مڑ گئی جہاں ہمارے اندازے کے مطابق شادی کی تقریب ہو رہی تھی۔

”عجیب باسٹرڈ لوگ تھے، راہ چلنے والوں کا خیال ہی نہیں کرتے ...... ذلیل ......!“ کمیل دادا غصے سے بڑبڑایا، شکیلہ کا بھی منہ بنا ہوا تھا لیکن ...... میرے چہرے پر سناٹے اترے ہوئے تھے اور میں یک ٹک اسی کار کو گھورے جا رہا تھا جو اب اسی جگہ پر جا رکی تھی جہاں اور بھی گاڑیاں ایک ترتیب سے کھڑی تھیں۔

”تمہیں کیوں سانپ سونگھ گیا شہزی؟“ اچانک کمیل دادا نے میری جانب دیکھ کر کہا۔

”اس مست بے فکر جوڑے پر اپنا خون جلانے کا کوئی فائدہ نہیں۔“ شکیلہ نے بھی مسکرا کر مجھ سے کہا۔

”اتنا ہی غصہ آ رہا ہے تو کیا خیال ہے، ابھی چل کر اُن دونوں کو دیکھ لیتے ہیں۔“ کمیل دادا نے جارحانہ انداز میں کہا۔

”یہ تو اب کرنا ہی پڑے گا ......“ میں نے بدستور اسی جانب گھورتے ہوئے دانت پیس کر کہا تو شکیلہ کے منہ سے حیرت کے عالم میں نکلا۔

”کیا واقعی؟“

”ہاں! اس لیے کہ شاید تم دونوں نے صرف خود کو کار کی ٹکر سے بچانے کی کوشش کی تھی اور یہ دیکھنے سے قاصر رہے کہ اس میں ہمارا شکار موجود تھا۔“ میں نے جیسے سنسناتے لہجے میں کہا اور ان دونوں کے منہ حیرت سے کھل گئے۔

”کک ...... کیا کہہ رہے ہو تم شہزی؟“ کمیل دادا نے بھی اسی سمت دیکھتے ہوئے غیر یقینی انداز میں پوچھا۔ ”تمہارا مطلب ہے اس کار میں گون برگ موجود تھا؟“

”ہاں!“

”تم نے کیسے اتنی جلدی پہچان لیا شہزی؟ ابھی تو اس کا ہم سے سامنا ہی نہیں ہوا ہے؟“ شکیلہ نے سوالیہ نگاہوں

UrduBooks.pk

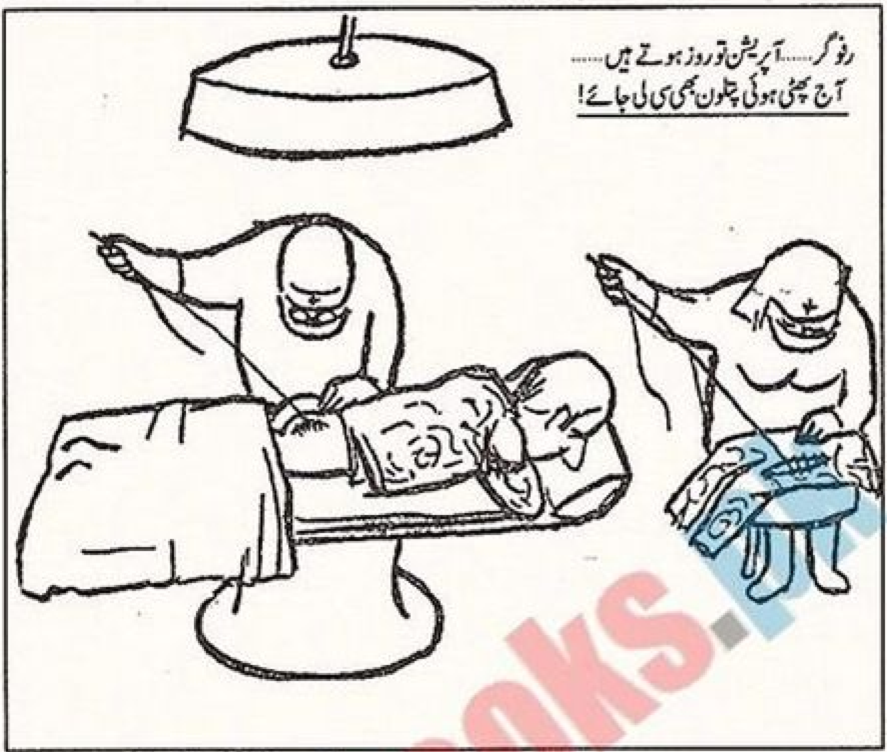
رفو گر..... آپریشن تو روز ہوتے ہیں.....
آج پھٹی ہوئی پتلون بھی سی لی جائے!

UrduBooks.pk

سے میری طرف دیکھا۔

”یہ سوال اگر کبیل دادا مجھ سے کرتا تو اور بات تھی لیکن افسوس شکیلہ تم ایک پاور ایجنٹ ہونے کے ناتے اپنی نگاہ کی تیزی کو محدود رکھتی ہو۔“ میں نے اس سے کہا۔

میری اس بات پر شکیلہ کچھ خفیف سی نظر آنے لگی البتہ کبیل دادا مجھ سے بولا۔

”کیوں اس بے چاری کو ڈانٹ رہے ہو یار شہزی؟ محض چند تصاویر کے سہارے اور اتنی تیزی سے کوئی کس طرح کیسے کسی کو پہچان سکتا ہے۔ ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس کے سر پر کوئی سوار ہو تو اسے ہر روپ میں وہی نظر آتا ہے۔“

”اس میں غلطی کے امکان کو میں بھی نظر انداز نہیں کر سکتا، کبیل دادا......!“ میں نے کہا۔ ”لیکن...... حقیقت یہی ہے کہ میں اس کی اطالوی گرل فرینڈ ہیلنا کو بھی پہچان رہا ہوں۔“

”او میرے خدا......“ اچانک شکیلہ کے منہ سے نکلا۔ ”اگر ایسا ہی ہے تو شہزی! تم غلطی پر نہیں ہو سکتے، پھر یہی ہمارا شکار ہوگا۔“

”اتنی جلد اور وہ بھی اتفاقیہ سامنا ہو جائے گا، حیرت ہے مجھے۔“ کبیل دادا بولا۔ ”لیکن اگر ایسا ہے تو یہ بھی یاد رکھنا شہزی! گون برگ ہمیں نہیں تو تمہیں تو پہچان سکتا ہے۔“

”مجھے بھی اس خدشے کا احتمال ہے۔“ میں نے کہا۔ اس کی بات میں رد نہیں کر سکتا تھا۔ جیسا کہ مذکور ہوا یہ ممکن تھا کہ گون برگ مجھے شہزاد احمد خان شہزی کی حیثیت سے پہچان سکتا تھا۔ کیونکہ اب تک میرے دشمنوں نے میری تصویر اپنے خاص خاص عہدے داروں اور گرگوں میں خفیہ طور پر تقسیم کر دی ہوگی۔ اس پر مستزاد دشمنوں کو میری امریکا آمد کا علم بھی ہو چکا تھا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ ان کے پاس میری پرانی تصویر ہو سکتی تھی۔ جس میں میرے چہرے پر مونچھیں اور ہلکی داڑھی تھی۔ تھائی لینڈ اور فیلا کے سفر سے مصر تک کے بعد میں بالکل کلین شیو ہو گیا تھا۔ بال بھی میرے گھنے، بڑے اور کرلی ٹائپ تھے، جنہیں میں نے بدل کر بالکل چھوٹے اور سولجر کٹ اسٹائل میں ترشوا لیے تھے، یوں حقیقی نگاہ اور تصویر کے حوالے سے دیکھا جاتا تو میری شبیہ کافی بدل گئی تھی۔ یعنی فوری پہچانے میں نہیں آ سکتی تھی۔

مٹھی بھر یہودیوں نے اس وقت پوری دنیا کے امن کو یرغمال بنا رکھا تھا۔ اسٹاری کی باتوں سے اس امر کی بھی تصدیق ہوتی تھی کہ یہودی تھوڑی تعداد میں ہونے کے باوجود آکٹوپس کی طرح پھیلے ہوئے تھے اور امریکی حکام ان کے فرمان کے تابع رہتے تھے، اس قدر کہ انہیں کلیدی عہدوں پر فائز کیا گیا تھا۔ امریکا میں جتنی بھی فارماسیوٹیکل کمپنیاں تھیں، ان کے مالکان یہودی تھے جو اُن دواؤں میں ایک مارفین اور ہیڈرین کی قسم کا عنصر شامل کرتے تھے جن سے امریکی ایک نشے کی سی کیفیات سے دوچار رہتے تھے، بالخصوص وہ جو کسی طویل بیماری کی وجہ سے ایسی ادویات کا استعمال جاری رکھنے پر مجبور تھے۔

”اب یہ بتاؤ کہ پھر اس تقریب میں کیا بن بلائے مہمانوں کی طرح شریک ہونا پڑے گا؟“ بالآخر کبیل دادا بولا۔

”وہ دیکھو......“ میں نے ایک طرف اشارہ کیا۔ جہاں گاڑیاں پارک تھیں، اسی طرف ایک اور بڑے سے ہارڈ بورڈ کی دیوار سی بنی ہوئی تھی، وہاں کچھ باوردی ویٹرز آتے جاتے نظر آئے۔ ان میں ویٹریس بھی تھیں۔

”کیا ہے وہاں؟“ کبیل دادا بولا۔ ”وہاں تو خدمت گاروں کے ٹولے کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا۔“

”یہی ہمارے کام آئیں گے۔“ میں نے کہا۔ ”ہم ان میں سے دو مرد اور ایک عورت کو اغوا تشکیل کریں گے اور ان کا روپ دھار لیں گے۔“ میں نے راہ سجھائی۔

”غلط......“ کبیل دادا نے میری تجویز سے اختلاف کیا۔ ”اس میں پکڑے جانے کے امکانات روشن ہیں، کیونکہ ان بیروں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں نظر آرہی کہ ہم تینوں کو ان کے ساتھی نہ پہچان سکیں۔ اتنی آسانی سے ہاتھ آئے ایک اہم شکار کے لیے یہ منصوبہ بندی ناقص رہے گی، وہ بدک جائے گا اور واویلا الگ مچے گا۔“

”میرا خیال ہے شہزی! دادا ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ شکیلہ نے اس کی تائید کی۔ میں بھی کچھ سوچنے پر مجبور ہوگیا۔

”میرا خیال ہے ادھر ہی کہیں قریب میں بیٹھ کر وقت گزارا جائے، بڑے شکار کے لیے طویل اور صبر آزما انتظار پہلی شرط ہوتی ہے۔“ کبیل دادا نے اپنا مشورہ دیا۔

”تمہارا مطلب ہے کہ ہم اس تقریب کے اختتام کا انتظار کریں اور یہ بھی کہ کون برگ کب یہاں سے رخصت ہو کر کہاں جاتا ہے پھر اس کے تعاقب میں لگ جائیں؟“ میں نے کبیل دادا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”یہی بہتر رہے گا۔“

میں نے رسٹ واچ پر نظر ڈالی اور بولا۔ ”جانتے ہو اس میں کتنا وقت برباد ہو جائے گا؟ ابھی چار بج رہے ہیں۔ یہ فنکشن تقریباً بارات گھنٹے تک جاری رہے گا۔“

”چلو فرض کرو یہ بھی کر لیا جائے مگر کبیل دادا! ہمارے پاس اپنی کوئی گاڑی بھی تو نہیں ہے۔ کیب کروانے میں بھی وقت لگ سکتا ہے۔“ شکیلہ بولی۔

ان دونوں کی باتوں نے مجھے اُلجھا دیا۔ تب میں نے سوچا کہ یہ ایک ہی آدمی کا کام ہے، میں خود کسی طرح اس ”ویڈنگ پارٹی“ میں جا گھسوں اور اپنے شکار کو کسی طرح پھانس کر یہاں تک لے آؤں مگر یہ میں محض سوچ رہا تھا۔ ایسا کرنا کتنا آسان ہو سکتا تھا، اس بارے مجھے کوئی اپنی کامیابی کا بھی اندازہ نہ تھا۔

ہم تھوڑا اور آگے بڑھے۔ پارٹی کی رونقیں عروج پر تھیں۔ ڈانس بھی ہو رہا تھا اور موسیقی بھی گونج رہی تھی، جام بھی لنڈھائے جا رہے تھے۔ مجھے ایک چمکتا ہوا بورڈ دکھائی دیا۔ جس میں دولھا دلہن کا نام اور ان کی شادی کی تاریخ درج تھی۔

”مسٹر اینڈ مسز بورسن کلائیڈ۔“ یہ نام از خود میرے ذہن میں اٹک کر رہ گیا۔ تاہم میں کوئی ایسی راہ نکالنے کی سوچ رہا تھا کہ اس تقریب میں آخر کس طرح ”گھسا“ جائے۔

لہٰذا ابھی میں انہی خطوط پر غور کر رہا تھا کہ اچانک دھماکا ہوا۔ ہم تینوں چونکے۔ ساحل کی جانب کسی نے فلش فائر کیا تھا جو اونچائی میں جا کر پھٹا تو ہر سُو پھلجھڑیاں چھوٹ گئیں۔

ہم نے بے اختیار اپنے سر جھٹک کر گہری سانس خارج کی، وہاں تالیوں اور خوشیوں بھرے قہقہوں کا شور بھی ابھرا۔

میں نے ایک گہری سانس لی، ابھی ہم سے کوئی ٹھیک فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ اچانک ایک اور دھماکا ہوا۔ ہم نے سرسری انداز میں پھر اس طرف دیکھا، وہاں ایک دم شور مچ گیا۔ پہلے ہمیں بھی یہی گمان ہوا کہ یہ بھی شاید اس رنگارنگ تقریب کا کوئی حصہ ہے لیکن جلد ہی عقدہ کھلا کہ اب کہ ایسا نہیں تھا، لوگ اب وہاں افراتفری کے عالم میں اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔

ابھی ہم حیرت سے یہ منظر دیکھ ہی رہے تھے کہ ایک اور دھماکا ہوا اور میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔

"یہ تو گولیاں چل رہی ہیں۔" میں نے کہا۔ تب ہی میں نے دو افراد کو گرتے دیکھا اور چند مرد اور عورتوں کو روتے ہوئے ان گرے ہوئے افراد کی طرف لپکتے دیکھا، ایک شخص بھاگ رہا تھا اور کچھ سرپھرے جوان اسے پکڑنے کے لیے اس کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔

پھر اچانک ہی اور گولی چلی، ہماری ہک دک نظروں نے اس پستول بدست کو ساحلی ریت پر گرتے دیکھا، اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے لوگ ایک دم رک گئے۔ جس نے اس پستول بدست کو گولی ماری تھی وہ ان کے درمیان سے نمودار ہوا تھا جو گرے ہوئے دو افراد کے گرد جمع تھے۔

میرے اور وہاں تفریح کے لیے آئے ہوئے دیگر لوگ اس طرف کو لپکے تھے۔

"آؤ، ان میں رلنے ملنے کا یہ بہترین موقع ہے۔" میں نے کہا اور ہم بھی محض تماشیوں کی طرح ان کے بیچ شامل ہو گئے اور...... میری نظریں تیزی سے گردوپیش کا جائزہ لینے لگیں۔

صاف لگتا تھا کہ کسی بات پر بدمزگی ہونے کے سبب کسی نے مشتعل ہو کر گولی چلا دی تھی۔ جس نے گولی چلائی تھی، اسے بھی گولی ماردی گئی تھی۔

ہر طرف ایک چیخ و پکار مچ گئی تھی اور بچے رونے لگے تھے، وہ خوف زدہ ہو کر اپنی ماؤں سے جا لپٹے تھے۔ چند کمزوردل کی خواتین تو بے ہوش ہی ہو گئی تھیں۔

ہم اس طرف لپکے جہاں چند غصیلے لوگ اب اس آدمی کے ساتھ دست و گریبان ہونے کی کوشش کر رہے تھے جس نے جوابی فائرنگ کی تھی۔

ہم قریب پہنچے تو یکلخت میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ وہ لوگ جس آدمی سے گرما گرمی کر رہے تھے، وہ میرا شکار...... یعنی گون برگ...... تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھما ہوا تھا اور...... وہی پستول اب اس نے ان پر تان لیا تھا۔

"خبردار! کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرے گا، ورنہ گولی ماردوں گا۔" گون برگ وحشیانہ برہمی سے بولا۔

مجھے اس کی وہ اطالوی حسینہ گرل فرینڈ نظر نہیں آ رہی تھی، وہ نجانے کہاں غائب تھی۔ ادھر میرے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ میں اب بھی اسے تصویر کے حوالے سے پہچان رہا تھا اور وہ وہی تھا۔

پل کے پل میرے ذہن میں خیال ابھرا، اس سے بہترین موقع مجھے اور نہیں مل سکتا تھا۔ تقدیر نے گویا مجھے آپ ہی شکار پر ہاتھ ڈالنے کا سنہری موقع دے دیا تھا۔

اس کی طرف بڑھنے والے لوگ اس کا جارحانہ انداز دیکھ کر ایک دم رک گئے تھے۔ تب ہی میں نے اس پر جست بھری۔ وہاں کسی کو بھی کسی سے بھی ایسی کارروائی کی بالکل توقع نہ تھی اور شاید نہ ہی گون برگ کو بھی ہو سکتی تھی کہ وہاں ایک عام سی تقریب میں کوئی ایسی "میکینیکل" حرکت بھی کر سکتا ہے۔

اسی وقت کوئی عورت چیخی، میں گون برگ پر گرا، میرے ہاتھ کا ایک مخصوص وار اس کے پستول پر پڑا، وہ چھوٹا اور گون برگ کو میں لیتا ہوا ریت پر گرا۔ اس نے گرتے ہی میرے پیٹ پر گھٹنا رسید کر دیا۔

مجھے اس سے اسی پھرتی کی توقع تھی، میں اس درد کو اسی جوشِ غیظ کی آگ میں پگھلا کر پی گیا کہ یہی وہ شخص تھا جو مجھے عابدہ اور آنسہ خالدہ کے پُراسرار "غیاب" کے بارے میں بتا سکتا تھا۔ اسی سبب میں نے اس پر حملہ کر کے اپنا جسم اکڑا لیا تھا۔ ضرب کی شدت قدرے کم ہوئی تھی۔

میں نے اس کی ٹھوڑی پر گھونسا رسید کر دیا۔ اس کے بھی جسم میں گویا پارہ دوڑ رہا تھا، اس نے بہ سرعت اپنے دونوں گھٹنے سکیڑ کر اپنی ٹانگوں کے زور پر پیٹ پر جمائے مجھے خود سے اچھالنے کی کوشش چاہی مگر اس کے روایتی داؤ سے میں خود کو اس طرح بچا گیا کہ ایک دم تڑپ کر اپنے جسم کو کچھ یوں خم دیا کہ کافی حد تک اس کی ٹانگوں کا زور ہوا میں صرف ہو گیا اور میری ایک لات نصف دائرے میں گھومی، میرے مضبوط بوٹ کی ٹو اس کی کنپٹی پر پڑی۔

پہلی بار میں نے اس کے حلق سے برآمد ہوتی چیخ کی آواز سنی۔ ایسے وقت میں کبیل داوا اور شکیلہ "تماشائی" بن جاتے تھے، اس میں میری ہی ہدایت کارفرما تھی۔

یہ میری لڑائی کا اصول تھا کہ اگر میں مدِمقابل پر حاوی ... ہونے کی کوشش میں ہوتا تو میرا کوئی ساتھی درمیان میں کود کر صورتِ حال کو میرے بجائے مدِمقابل کے حق میں کر سکتا تھا، ماسوائے مجھے خطرے میں نہ دیکھتے۔

لیکن ہوا اس کے الٹ...... میرے ساتھی تو نہیں البتہ وہ جوشیلے جوان مرد یہ دیکھ کر کہ ایک ہی آدمی حملہ آور سے نبردآزما ہے، جوشِ غیرت میں وہ بھی کود پڑے اور یہاں میرا معاملہ بگڑنے لگا۔

گون برگ کو اب تک اندازہ ہو ہی چکا ہو گا کہ اس کے مدِمقابل بھی اس کی ٹکر کا آدمی ہے، اس پر یقیناً وہ حیران بھی ہوا ہو گا، کیونکہ یہاں تقریب کے شرکا سب عام افراد

تھے۔ اُن سے میری جیسی فائٹنگ کی امید نہیں رکھی جا سکتی تھی۔

گون برگ نے بیچ میں کودنے والے ایک جوان مرد کو چارہ بنا لیا۔ اگرچہ میرے بوٹ کی ٹو نے اس کی کنپٹی چٹخا دی تھی مگر وہ کم بخت غضب کی قوتِ برداشت رکھتا تھا۔ اس اذیت کو پیتے ہی اس نے سنبھالا لیا اور اول الذکر شخص کو دبوچ کر میری طرف اچھال دیا، نیز اس کے دیگر شرکا ساتھی مرد بھی میرے آڑے آ گئے، یوں گون برگ نے راہِ فرار کا راستہ اختیار کیا اور وہ ایک کو مجھ پر دھکیل کر اٹھ دوڑا۔

"اس کے پیچھے دوڑو......" میں کبیل دادا اور شکیلہ کی جانب دیکھ کر چلایا۔ وہ حرکت میں آ گئے۔

ساحل پر اب ہماری "دوڑ" لگ گئی۔ گون برگ دیوانوں کی طرح دوڑے جا رہا تھا اور ہم اس کے پیچھے تھے۔ میں تو پہلے ہی اس سے نبرد آزمائی کے دوران ذرا تھکا تھکا سا تھا، اسی لیے میرے دوڑنے کی رفتار میں وہ تیزی نہ تھی لیکن کبیل دادا اور شکیلہ گون برگ کے تعاقب میں مجھ سے آگے نکل گئے۔

ایک موقع پر کبیل دادا نے ہی اسے چھاپ لیا۔ اس نے اس کے قریب پہنچتے ہی اس پر جست لگا دی تھی۔ دونوں گرے۔ عقب سے شکیلہ نے بھی رہی سہی کسر پوری کر دی۔ میں بھی ہانپتا کانپتا قریب پہنچ گیا۔

تب تک کبیل دادا اور شکیلہ اسے انٹا غفیل کر چکے تھے۔ اس بھاگا دوڑی میں ہم پارکنگ تک آن پہنچے تھے۔

میں نے انہیں شکار کو سنبھالے رکھنے کا کہا اور ایک کار کے دروازے کے ساتھ فنکاری کرتے ہوئے اسے کھولا تو اس کا الارم بج اٹھا۔ میں نے کوئی پروا نہ کی اور انہیں اشارہ کیا۔ وہ دونوں بے سدھ گون برگ کو دبوچے کار کی پچھلی سیٹ پر جا بیٹھے۔

میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور اس کے اسٹیئرنگ کے نیچے وائرنگ پینل کے ساتھ لمحہ بھر کی چھیڑ چھاڑ کی تو کار کا انجن بیدار ہو گیا۔

کار اسٹارٹ ہونے کی دیر تھی اور ہمارے شکار سمیت وہاں سے رفو چکر ہونے کی۔

فریسنو کے علاقے سے ابھی ہم بہ مشکل اپنے ٹھکانے والے راستے پر ہی تھے کہ اچانک عقب سے پولیس سائرن کی آواز گونجتی سنائی دی۔

"شہزی! بلیو کاپ پیچھے لگ چکے ہیں۔ یہ ہمیں آسانی سے نہیں چھوڑیں گے۔" شکیلہ نے عقب سے مجھے خبردار کیا۔ میں نے رفتار بڑھا دی۔ تاہم شکیلہ کی بات غلط نہ تھی۔ ٹریس ہوتے ہی اور بھی نجانے کتنی پولیس گاڑیاں ہمارے تعاقب میں لگ سکتی تھیں۔ شکار تو آسانی سے ہاتھ آ گیا تھا مگر اب سنبھالا نہیں جا رہا تھا۔

میں نے تیزی سے ایک موڑ کاٹا اور کار کو ایک سروس روڈ میں اتار کر ایک گلی میں گھس گیا۔ عقب میں چیختی چلاتی ہوئی پولیس کار بھی سمع خراش آوازوں میں چیزنگ کرتی ڈولتی گلی میں داخل ہو گئی۔

اس قدر جلد ان کے قریب آ جانے پر بلاشبہ مجھے حیران ہی ہونا چاہیے تھا۔ میں نے سختی سے اپنے دانت بھینچ لیے کہ جبڑے کی ہڈیاں ابھر آئیں۔ بیک ویو میں پولیس کار سرخ نیلی گردشی بتیاں گھماتی دوڑتی نظر آ رہی تھی۔

میرے اعصاب تنے ہوئے تھے اور ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ گلی سے میں ایک اور سڑک پر نکل آیا اور اپنی کار کی کھڑکیوں سے میں نے دائیں بائیں سر گھما کر دیکھا تو بائیں جانب مجھے یہی سڑک دائیں سمت مڑ کر مین روڈ پر جاتی دکھائی دی، جہاں ہیوی ٹریفک تھا۔

ابھی میں اس طرف اسٹیئرنگ کاٹ ہی رہا تھا کہ پیچھے پولیس کار نے ٹکر مار دی۔ ہماری کار کو زبردست جھٹکا لگا اور وہ بائیں جانب مڑتے مڑتے گول گھوم گئی۔

میرا سر اسٹیئرنگ سے ٹکتے ٹکتے بچا تھا اور شکیلہ تو بے چاری اس زوردار جھٹکے کے بل پر پچھلی سیٹ سے اگلی سیٹ پر نصف حد تک الٹ آئی، اس کے حلق سے غیر ارادی طور پر چیخ بھی خارج ہو گئی تھی جبکہ کبیل دادا نے اپنے ڈیل ڈول اور ہوشیاری کے ساتھ خود کو سیٹ پر کیل کر رکھا تھا۔

پولیس کار سے فائر ہوا۔ ہماری کار کا عقبی شیشہ ٹوٹنے کی آواز ابھری، مجھ سمیت کبیل دادا گولی چلنے کی آواز کے ساتھ ہی نیچے جھک گئے مگر بدقسمتی سے شکیلہ اس کی زد میں آ گئی، اس لیے کہ وہ اچھل کر اگلی سیٹ کی پشت گاہ پر نصف دھڑ تک جھک آئی تھی اور اسے ہنوز سنبھلنے کا موقع نہ مل سکا تھا، گولی اسے کہیں لگی اور اس کے حلق سے اٹھنے والی چیخ نے میرے اوسان خطا کر دیے۔ اپنی ساتھی کی تکلیف نے میرے اندر غیظ آلود جنون سا بھر دیا۔

"کبیل! شکیلہ کو سنبھالو......" میں چلایا۔ اور دوسری گولی چلی تو میں نے اسٹیئرنگ پر دونوں ہاتھوں کی گرفت مضبوط رکھتے ہوئے بریک لگاتے ہی ریورس گیئر ڈالا اور ایکسلیریٹر دبا دیا۔ کار کے پہیے چرچرائے اور وہ تیزی کے ساتھ پولیس کار سے ٹکرائی۔

UrduBooks.pk

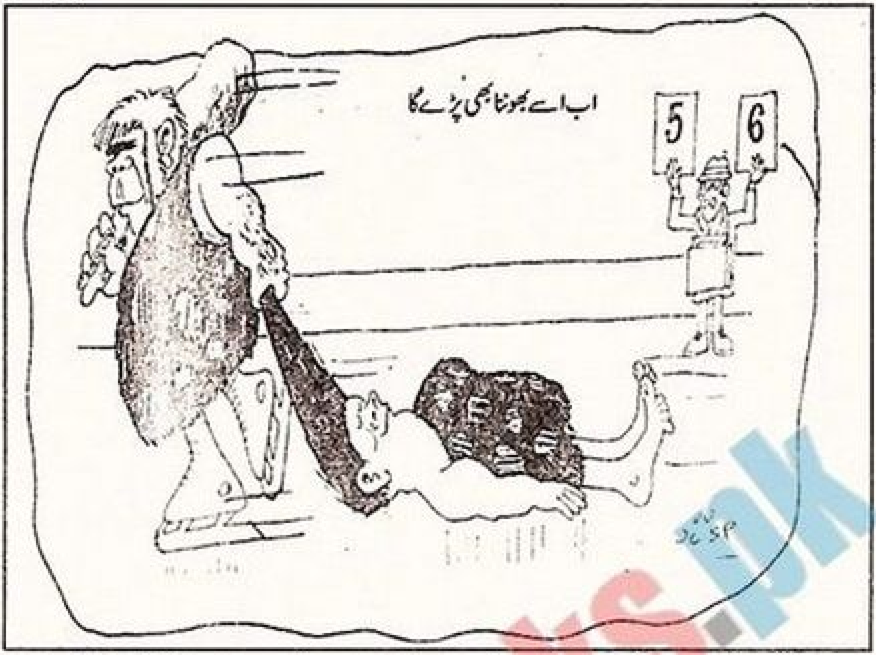
اب اسے بھوننا بھی پڑے گا
5
6

دوسری گولی نے میری کار کی ونڈ شیلڈ اُڑا دی تھی۔ بیک ویو میں مجھے ایک تگڑا پولیس والا کھڑکی سے باہر سر اور ہاتھ نکالے میری کار کا بدستور نشانہ باندھے ہوئے تھا، اب اس کی کوشش ٹائر پر گولی چلانے کی تھی، لیکن ادھر ہماری گاڑی کے پچھلے بمپر کے ان کی کار کی باڈی سے ٹکرانے پر وہ مڑ گئی اور میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ گیئر بدل کر ایک طوفانی انداز کا یوٹرن لیا تو اچانک ایک پُر شور بھونپو بنکارنے کی آواز ابھری۔ جس نے ایک لمحے کے لیے مجھے دہلا دیا۔

ایک ہیوی ٹریلر ٹرک مست ہاتھی کی طرح جھومتا جھامتا سامنے سے نمودار ہوا، پولیس کار میرے پیچھے تھی، دائیں جانب چیختی چلاتی دوسری گاڑیاں تھیں جن کا میں نے راستہ روک رکھا تھا۔ بائیں جانب یہ ہیوی ٹریلر نجانے کہاں سے اچانک ہی نمودار ہو گیا تھا۔ مجھے فوری فیصلہ کرنا تھا۔

”نیچے جھک جاؤ اور شکیلہ کو بھی نیچے کر لو۔“ میں چلّایا اور اسٹیئرنگ گھما کر کار کو سیدھے رخ پر کر لیا۔ پولیس کار سے اب کوئی فائر نہیں ہوا، شاید وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ میں اب ٹریلر سے ٹکرانے ہی والا ہوں اور بادی النظر میں یہی کچھ نظر بھی آ رہا تھا۔

میری کار نے ڈرفٹنگ کی اور پھر طوفانی رفتار سے ٹریلر سے ٹکرائی، میں ... تب تک نیچے سر کر چکا تھا، کار کو ایک جھٹکا لگا، رفتار بڑھانے کا موقع چونکہ مجھے نہیں مل سکا تھا اسی لیے میری اس ”ٹرک“ میں تھوڑی کسر باقی رہ گئی۔

کار کی چھت ٹوٹنا ہی تھی، تاہم میں کار سڑک سے خاصے اوپر تک اٹھے ہوئے ٹریلر کے نیچے سے پوری طرح نہیں نکال پایا اور...... اس کے دیوہیکل ٹائروں سے کار ٹکرا گئی۔ میری آنکھیں پھیل گئیں، کبیل دادا نے بھی یقیناً یہ مرگ آسا منظر دیکھا ہوگا اور جان گیا تھا کہ اب ہم سب کار سمیت ٹریلر کے دیوہیکل ڈبل ٹائروں تلے کچل کر اذیت ناک موت سے ہمکنار ہونے ہی والے تھے، اسی سبب میں نے اس کے منہ سے دعائیہ برآمد ہوتی آواز سنی۔

”او...... میرے خدا......!“

پولیس کار بھی رک گئی تھی۔ وہ بھی شاید یہ منظر دیکھنے کو بے تاب تھے۔

کٹھن اور آخری لمحات میں کوئی ایک پل ایسا چھپا ہوتا ہے جہاں امید کی آخری کرن موجود ہوتی ہے، میں نے اسی ٹمٹماتی لو کی مدھم ہوتی روشنی میں بقا کی سعی کو مرنے نہیں دیا۔

ٹریلر چونکہ تب تک کافی حد تک اپنی رفتار آہستہ کر چکا تھا مگر رکا نہیں تھا، اس کے ڈرائیور نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ رکے گا نہیں، کیونکہ اس صورت میں زیادہ نقصان کا احتمال ہوتا اور وہ آس پاس کے کسی اوپن ایئر ریسٹورنٹس میں گھس جائے گا یا فٹ پاتھ پر چڑھ کر الٹ جائے گا، چونکہ کار

والے مجرم تھے، جن کے تعاقب میں پولیس لگی ہوئی تھی، انہیں ہلاک کرنا جائز تھا۔

یوں وہ نہیں رکا اور اس نے رفتار بڑھا دی۔ میری کار اس کے ٹائروں سے ٹکرائی، اگلا بونٹ زد میں آتے آتے رہ گیا اور میں نے کار کو ہلکی بریک لگا کر اسٹیئرنگ اسی رخ پر گھمایا جس رخ پر ٹریلر گامزن تھا اور میری کار اس کے ''لیول'' میں آگئی۔

میری کار ٹریلر کے نیچے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھی لیکن میں جانتا تھا کہ یہ چند لمحاتی موقع تھا اگر میں ٹریلر کے نیچے سے جلد ہی اپنی چھت اڑی ہوئی کار نہیں نکال لیتا تو ایک جاں گسل حادثہ یقینی تھا۔

پولیس والے یقیناً ہک دک رہ گئے ہوں گے، اول تو ان کی سمجھ میں ہی نہ آیا ہوگا کہ یہ میں کر کیا رہا تھا۔ وہ یقیناً تصور میں سین کونری یا راجر مور جیسی بونڈ زیرو زیرو سیون کی کسی مووی کو حقیقت میں دیکھ کر سکتے میں آگئے ہوں گے۔

چونکہ ہماری کار کی چھت اڑی ہوئی تھی اور ہمارے سروں پر ٹریلر کے نچلے حصے کی کھڑکتی ہوئی ساری مشینری دماغ کو بری طرح جھنجھنائے دے رہی تھی۔ ٹریلر کے دائیں بائیں گاڑیاں آتی جاتی نظر آرہی تھیں۔ یقیناً کسی نے بھی یہ حیران کن مگر جان لیوا اور خطرناک منظر دیکھا ہوگا تو اپنی کار سنبھالے رکھنا اس کے لیے مشکل ہو گیا ہوگا۔

ابھی میں کار کو جلد سے جلد ٹریلر کے نیچے سے نکالنے کا موقع تاک ہی رہا تھا کہ اسی وقت ٹریلر نے دائیں جانب موڑ کاٹا اور میں نے بائیں جانب...... یہ بہت بہتر ہوا۔ یہ سچ ہی ہے، ہمتِ مرداں مددِ خدا...... میں اپنے اندر کی امید اور بقا کی جستجو سے مایوس نہیں ہوا تھا۔ چند لمحوں کے ان جاں گسل لمحات نے میرے اعصاب شل کر ڈالے تھے۔

''حیرت انگیز...... شہزی! اپنی زندگی کے حیرت انگیز لمحات سے گزر رہا ہوں میں آج......'' کبیل دادا کی تحیر آمیز آواز ابھری۔

''شکیلہ کیسی ہے دادا......!'' میں نے اسٹیئرنگ پر گرفت مضبوط رکھتے ہوئے ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے پوچھا۔

''شکر ہے گولی نازک مقام پر نہیں لگی، اس کے بائیں بازو کے آر پار ہو گئی ہے۔'' اس نے جیسے مجھے مژدۂ جانفزا سنایا۔

''مم...... میں ٹھیک ہوں شہزی! میری فکر نہ کرو، تم نے تو آج اتنی خطرناک ڈرائیونگ کر کے مجھے بھی حیرت میں ڈال دیا۔'' یہ شکیلہ کی آواز تھی۔ بھرائی ہوئی پُرآزار...... زخمی ہونے کے باوجود وہ بے چاری بھی شاید پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سب دیکھتی رہی تھی۔

میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ میرا ذہن مسلسل سوچنے میں لگا ہوا تھا۔ کار کی چھت غائب تھی، ہماری اپنی حالت عجیب مضحکہ خیز ہو رہی تھی۔

مجھ سے راستوں کا بھی کوئی تعین نہیں ہو پا رہا تھا۔ اجنبی جگہ، پرایا دیس کے مصداق میں چند ایک جانے پہچانے راستے بھی بھٹک گیا۔

پولیس کار کو میں لامحالہ طور پر ڈاج دینے میں کامیاب رہا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ یہاں کی پولیس اور ٹریفک پولیس نیٹ ورک کس قدر فعال اور جدید خطوط پر منظم کیا گیا تھا، آٹو ٹریکنگ کی مدد سے...... وہ ہمیں چھاپنے کی کوشش کر سکتی تھی۔

ایسا ایک مشورہ کبیل دادا نے بھی یہی سوچ کر مجھے دیا تھا کہ اس کار سے اب جلد از جلد پیچھا چھڑانا لازمی تھا۔

''لیکن میں راستہ بھول رہا ہوں میری راہنمائی کرو۔'' میں نے کہا۔ کبیل دادا، شکیلہ کے زخمی بازو پر کسی کپڑے کی پٹی باندھ چکا تھا تاکہ کم سے کم جریانِ خون ہو۔ کبیل دادا میری راہنمائی کرتا گیا۔

''جب تک منزل پر نہیں پہنچ جاتے، ہم کار کو نہیں چھوڑ سکتے کبیل! جبکہ ایسے میں شکیلہ زخمی ہے اور ایک اہم شکار بھی ساتھ ہے ہمارے۔''

''چلتے رہو......'' کبیل دادا نے فوراً جواب میں کہا۔ ''اس کم بخت کو بھی ہوش آرہا ہے، منزل پر تم سب اتر جانا، میں فوراً کار سے چھٹکارا پانے کے لیے اسے کہیں دور لے جا کر چھوڑ کے لوٹ آؤں گا دوبارہ۔''

مجھے اس کی تجویز اچھی لگی۔

گون برگ نے ہوش میں آتے ہی تیزی سے مچلنا شروع کر دیا مگر کبیل دادا کے ہتھوڑے نما ہاتھ کے ایک ہی وار نے اسے پھر دنیا و مافیہا سے غافل کر دیا۔

''دھیان رہے دادا! یہ مرے نہیں۔'' میں نے کسی خدشے سے متنبہ کیا۔

''بہت سخت جان ہے یہ ذلیل!'' وہ بولا۔ ''بے فکر رہو۔ اتنی جلدی مرنے والا نہیں خبیث!''

مزید نصف گھنٹے بعد ہم اپنے رہائشی کنٹینر پر پہنچ گئے۔ شکیلہ نے زخمی ہونے کے باوجود خود کو سنبھالے رکھا تھا اور مقدور بھر وہ ہمارا ساتھ بھی دے رہی تھی۔

مثلاً میں نے کار ایک جگہ روکی، اس نے اتر کر دروازہ کھولا پھر میں اور کبیل دادا بے ہوش گون برگ کو اندر کنٹینر میں لے آئے۔

کبیل دادا کو میں نے فوراً روانہ کر دیا اور اس تاکید کے ساتھ کہ وہ اپنا خیال رکھے اور کسی بھی تعاقب یا مشکوک آدمی کا دھیان واپسی کے وقت بھی رکھے۔

وہ چلا گیا۔

گون برگ کی جامع تلاشی لینے کے بعد میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس کا سیل فون آف کر دیا۔ اگرچہ اسے آف کرنے میں بھی کوڈ درکار تھا اسی لیے میں نے اس کی بیٹری نکال کر اسے بیکار بنا دیا تھا، خدشہ اغلب تھا کہ اس کا سیل فون لوکیشن پر ہو اور اس کا کوئی ساتھی اس کی تلاش میں یہاں نہ پہنچ جائے۔

اس کے بعد میں نے شکیلہ کے بازو کے زخم کا جائزہ لیا۔ شکر تھا کہ ہڈی فریکچر ہونے سے محفوظ رہی تھی اور گولی بھی آر پار ہو گئی تھی۔

میں نے اس میں مرہم بھر دیا اور پٹی کر دی۔ کچھ پین کلر تھی وہ بھی میں نے اسے دے دی۔ اس کی حالت کچھ سنبھلی تو میں نے اس سے کہا کہ وہ گرم دودھ پی لے۔

وہ کچن کی طرف چلی گئی۔

میں گون برگ کے پاس سے برآمد ہونے والی ایک ایک اشیا کا بہ غور جائزہ لینے لگا۔

اس میں اس کے سیل فون کے علاوہ والٹ، جس میں رقم تھی اور کچھ کاغذات اور کریڈٹ کارڈز وغیرہ تھے۔ اس کے علاوہ رومال اور ووڈکا کی چپٹی بوتل تھی۔

میں نے کارڈز کا جائزہ لیا اور اس کا آئی ڈی کارڈ دیکھا۔ اس میں اس کا نام وہی لکھا تھا۔ گویا میری عقابی نظروں نے دھوکا نہیں کھایا تھا۔ یہ گون برگ ہی تھا۔

مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ ساحل پر شادی کی اس پارٹی میں آخر اس کے ساتھ ہوا کیا تھا کہ اس کی گرل فرینڈ ماری گئی اور خود اس نے ایک قتل بھی کر ڈالا؟ پتا نہیں یہ اس کا اپنا کون سا ذاتی گورکھ دھندا تھا؟ خیر! مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی، اگر تقدیر نے میرے مشن کے ایک اہم مرحلے کا قضیہ یوں شارٹ کٹ میں ہونا لکھا تھا تو مجھے اس بات کی خوشی ہی تھی، اگرچہ بعد میں یہی آسان معاملہ اچانک پولیس کے کود پڑنے پر کافی سنگین صورت بھی اختیار کر گیا تھا اور ہم سب اس تگ ودو میں اس بھاری ٹریلر کے نیچے کچلتے کچلتے بھی بچے تھے۔

شکیلہ نے گرما گرم کافی تیار کر لی تھی۔

”ارے! تم نے کیوں زحمت کر ڈالی۔ زخمی ہو تم! میں بنا لیتا۔“ میں نے اس سے کہا تو وہ مسکرا کر بولی۔

”میں پاور ایجنٹ ہوں شہزی!“ وہ جواب میں ہلکی مسکراہٹ سے بولی۔ ”ایسے چھوٹے موٹے زخم کھا کر تمہارا کیا خیال ہے کہ میں چارپائی پکڑ لوں۔ لو پیو۔ اور اس مردود کا جلد منہ کھلوانے کی کوشش کرو تاکہ...... ہم عابدہ کے لیے کچھ پیش رفت کر سکیں۔“

میں نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ سے کافی کا مگ لیا اور کنٹینر کے فرش پر رسن بستہ حالت میں آڑے ترچھے پڑے گون برگ کو گھورتے ہوئے کافی کے گھونٹ بھرنے لگا۔ وہ اب ایک بار پھر رفتہ رفتہ کسمسا رہا تھا۔

اس کی کنپٹی مضروب نظر آ رہی تھی اور وہاں سے تھوڑا بہت بہتا ہوا خون قدرتی طبی عمل کے تحت خشک ہو کر پپڑی سی جمانے لگا تھا۔

میں نے قریب تپائی پر رکھے کانچ کے ادھ بھرے پانی کے جگ کو ایک ہاتھ سے اٹھا کر بے سدھ پڑے گون برگ کے چہرے پر انڈیل دیا۔ اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں اور کھانسنے لگا، ساتھ ہی اپنے ہاتھوں پیروں کے جکڑ بندوں سے آزاد ہونے کے لیے جھٹکے کھانے لگا۔

”ہوش میں آجاؤ گون برگ! ابھی تمہارے لیے بس اتنا ہی کافی ہے۔“ میں نے کہا اور کرسی پر بیٹھے بیٹھے ڈرامائی انداز میں اس پر ذرا جھک گیا۔ کافی کا مگ ہنوز میرے ایک ہاتھ میں تھما ہوا تھا۔

اس نے میری آواز پر یک دم مچلنا موقوف کر دیا اور ایک تک میری طرف اور کبھی شکیلہ کو گھورنے لگا۔ اس حوالے سے تو وہ ہمیں پہچان ہی گیا تھا کہ ہم وہی تھے جنہوں نے شادی والی پارٹی میں اسے دبوچا تھا مگر یہ ابھی اندازہ نہیں ہو پایا تھا کہ وہ مجھے ”شہزی“ کے حوالے سے پہچانا تھا یا نہیں۔

”مم...... میں...... ڈنشا...... کو زندہ نہیں چھوڑوں گا، نہیں جانتے تم میں کون ہوں۔ کیا ہوں۔ اس نے...... اس نے ہیلنا کو قتل کر کے اپنے خاندان کی موت پر دستک دے دی ہے۔“

میں اس کی بات پر چونکا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ہمیں شادی کی پارٹی کے ”حملہ آوروں“ کی حیثیت سے تو پہچان گیا تھا مگر مجھے ”شہزی“ کی حیثیت سے ابھی نہیں پہچان پایا تھا۔ گویا اس کا دھیان اور طرف تھا اگرچہ میں نے

بھی اپنا بہروپ کسی قدر بدلے ہوئے رکھنے کی کوشش چاہی تھی، تاہم کسی بھی وقت پہچان لیے جانے کا احتمال اپنی جگہ موجود تھا۔

بہرکیف...... ایسے ہی دشمنوں کی غفلت اور ''کم علمی'' سے میں فائدہ اٹھانے کا موقع فوراً ''اچک'' لیتا تھا۔ اس کی یقیناً کسی ''ڈنشا'' نامی آدمی کے ساتھ کوئی دشمنی چلی آرہی تھی۔

لہٰذا میں نے اسے دھوکے میں ہی رکھنے کا ارادہ کرتے ہوئے پہلے اسے دکھانے کی خاطر ایک الجھی ہوئی نظر قریب کھڑی شکیلہ کے چہرے پر ڈالی اور پھر گون برگ کی طرف دیکھ کر قدرے چونکتے ہوئے انداز میں بولا۔

''کیا مطلب؟ کیا تم بھی......؟'' میں نے دانستہ فقط اتنا کہہ کر اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ''ہم تو تمہیں ڈنشا کا آدمی سمجھے تھے؟'' میں نے آخر میں چالاکی سے کہا۔

حسبِ توقع وہ الجھ گیا اور اسی لہجے میں مستفسر ہوا۔

''کیا مطلب، تم بھی......؟''

''یعنی تم بھی ہماری طرح ڈنشا کے ڈسے ہوئے ہو؟''

میری بات پر اسے ایک جھٹکا لگا، بولا۔

''تو کیا تم لوگ اس کے ساتھی نہیں ہو؟''

''ہرگز نہیں۔ ہم تو پیروٹ ڈسکی کے آدمی ہیں۔ اسی نے ہمیں خفیہ اطلاع دی تھی کہ ڈنشا آج مسٹر اینڈ مسز بورن کلائیڈ کی شادی کی تقریب میں شرکت کے لیے آئے گا۔ اس نے اپنے کسی دشمن کو نشانہ بنانا ہے، وہ دشمن شاید تم تھے۔''

مذکورہ شادی کی تقریب اس چمکتے دمکتے بورڈ پر دیدہ زیب نیون سائن کے الفاظ مجھے ذہن نشین تھے۔ جس میں دولہا دلہن کا نام لکھا تھا۔ یوں میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا۔

''یہ پیروٹ ڈسکی کون ہے؟ میں نے اس کا نام پہلی بار سنا ہے اور تمہیں میرا نام کیسے پتا چلا؟'' اس نے آنکھیں سکیڑ کر میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''اور...... یہ تم نے مجھے اس طرح پھر باندھا ہوا کیوں ہے؟ کھولو مجھے...... میرا جسم درد کررہا ہے۔''

''ڈنشا کا دشمن نمبر ایک......'' میں نے اس کے دوسرے سوال کو نظر کردیا۔ پھر اس کا آئی ڈی کارڈ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرادیا۔

''بھاڑ میں جائے...... چلو اب کھولو مجھے۔'' گون برگ غصیلے لہجے میں بولا۔

مجھے اس کے غرور پر حیرانی ہوئی۔ اسے اپنی قوت کا کس قدر گھمنڈ تھا کہ وہ اس حالت میں بھی تحکمانہ انداز اختیار کیے ہوئے تھا۔

''ہمارا ٹارگٹ ڈنشا تھا اور ڈنشا کے شکار تم...... لیکن یہ تمہاری گرل فرینڈ بلینا کیوں ماری گئی؟''

''وہ کراس فائرنگ میں ماری گئی، نشانہ میں ہی تھا۔ ایک اور بھی بے گناہ مارا گیا۔''

''ہم......'' میرے منہ سے نکلا اور یہ سارا جال پھیلانے کے بعد اس کے ''تار'' کھینچنے کا موقع تلاشنے لگا تو اس نے ایک بار پھر غصے سے کہا۔

''میں کہتا ہوں میرے ہاتھ پاؤں کھولو۔ اب میں تم سے کوئی دوسری بات نہیں کرسکتا۔ تمہاری ہماری کوئی دشمنی نہیں ہے، اب یہ غلط فہمی ختم ہوچکی۔''

میں اس کی بات پر دل ہی دل میں ہنسا۔ اُسے اگر میری حقیقت معلوم ہوجاتی تو اس کے چودہ طبق روشن ہوجاتے۔

''اوہو...... سوری......!'' کہتے ہوئے میں نے فوراً اس کے ہاتھ پاؤں کھول دیے۔ مرہم پٹی کا سامان موجود تھا، میں نے دانستہ شکیلہ کو آنکھ کا خفیف اشارہ کردیا تھا، وہ اب تک میرے پہلے ہی ''ڈائیلاگ'' کا مطلب سمجھ چکی تھی کہ میں اپنے ''شکار'' کے ساتھ کیا گیم کھیل رہا تھا۔

اس نے دلنشین مسکراہٹ کے ساتھ گون برگ کی خراشوں پر ڈھیرے ڈھیرے مرہم لگانا شروع کردیا، جب وہ فارغ ہوئی تو میں نے کہا۔

''ڈارلنگ! ہمارے مہمان کو ڈرنک پیش کرو، ابھی تو میں نے ان سے ڈنشا کے بارے میں اور بھی باتیں کرنی ہیں۔'' وہ اسی طرح مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

''ڈنشا سے متعلق اور کیا باتیں جانتے ہو تم؟'' اس نے ایک کرسی پر پشت ٹکا کر بیٹھتے ہوئے میری جانب گھور کے پوچھا۔

میں نے ہولے سے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور اپنے بچھائے ہوئے جال کا ایک تار کھینچتے ہوئے پہلا ٹرمپ پتا پھینکا۔

''شاید تم جانتے ہو کہ ڈنشا کیسی فطرت کا مالک ہے، ایک نمبر کا دھوکے باز، لالچی اور اپنے ذاتی مفاد کی خاطر دوستوں کی پیٹھ میں خنجر بھونکنے والا آدمی ہے۔''

میں دانستہ اتنا کہہ کر رکا، ساتھ ہی کن انکھیوں سے

UrduBooks.PK

ماہنامہ

سرگزشت

کا ایک اور
معرکۃ الآرا خاص شمارہ

خود ساز نمبر

ان شخصیات کے کھٹے میٹھے تجربات
جن کی جگمگاتی زندگی میں کبھی اندھیرا ہی اندھیرا تھا

* * *

ان افراد کی سبق بھری سرگزشت
جن کے لیے زندگی کبھی سزا تھی، فاقے ان کا مقدر تھے

* * *

ان معروف شخصیات کا احوال
جنہوں نے اپنی زندگی خود تعمیر کی، زندگی کی مشکلات کو زور بازو
سے پرے دھکیلا اور آج لاکھوں کروڑوں میں کھیل رہے ہیں

بہت جلد یہ خاص شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہوگا

ایک ایسا شمارہ جسے آپ اپنی لائبریری میں محفوظ رکھیں گے
آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر اپنی کاپی مختص کرالیں

UrduBooks.pk

میں نے اس کے چہرے کے تاثرات بھی بھانپنے کی کوشش چاہی کہ آیا اس پر میری ان فرضی باتوں پر کتنا اثر ہو رہا ہے؟ حالانکہ ڈنشا فرضی کردار نہیں تھا، اور میں اس سے ملا تو کجا اس کا نام تک پہلے نہیں سنا تھا۔ یہ تو گون برگ کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا اور یوں میرے ذہن کو ایک نیا گل کھلانے کا موقع ملا تھا۔

ہاں! البتہ پیروٹ ڈسکی میرا تخلیق کردہ ایک فرضی کردار ضرور تھا جو میں نے ڈنشا کے حوالے سے تراشا تھا۔ چال بے حد گہری تھی اور خطرناک بھی، لیکن گون برگ جیسوں کے ساتھ عموماً ایسی ہی ''زگ زیگ'' انداز کی چالیں کارگر رہتی ہیں۔

بہرکیف...... میں نے دیکھا کہ وہ میری بات غور سے سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں ذرا ٹھہر کے آگے کہنا شروع ہوا۔

''تمہیں شاید یہ سن کر حیرت ہو کہ ڈنشا اور پیروٹ ڈسکی آپس میں کبھی دوست تھے۔ ابھی حال ہی کی بات ہے، ڈنشا سے ہماری دشمنی کی ابتدا ہوئی، ایک ایشیائی غیر ملکی نے جو تھائی لینڈ کے راستے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ امریکا وارد ہوا تھا، میں پیروٹ ڈسکی کا نائب ہوں، ہمارا دھندا بھی ڈنشا سے ملتا جلتا ہی ہے (ایسا میں نے اس قیافے کی بنیاد پر کہا تھا کہ ڈنشا بھی کوئی انڈر گراؤنڈ کرمنل یا گینگسٹر ہی ہو سکتا تھا جس کی گون برگ کے ساتھ مبینہ طور پر دشمنی چلی آ رہی تھی)۔''

''تم کسی غیر ملکی کے بارے میں بتا رہے تھے؟'' اس نے بھویں سکیڑ کر مجھے یاد دلایا۔ اس سے اس کی دلچسپی کا مجھے اندازہ ہوا اور میں نے اپنے ترکش سے تیر نکالنے شروع کر دیے۔

''وہ غیر ملکی درحقیقت ایک پاکستانی تھا۔ وہ یہاں اپنی عابدہ نامی کسی ساتھی لڑکی کو تلاشنے آیا تھا۔ اس کے لیے اس نے ہماری خدمات لیں۔''

''اس غیر ملکی کا نام کیا تھا؟'' اس نے جلدی سے بے چینی کے ساتھ پہلو بدل کر سوال کیا۔

''شہزادا احمد خان شہزی۔ وہ پاکستانی ہے۔'' میں نے دھڑکتے دل سے اپنا نام بتایا، گویا اس کی کمزور رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

ایک دوسرے کو ڈاج دینے کی یہ نازک اور سنگین صورت حالات اب فیصلہ کن موڑ پر آ چکی تھی۔ میں نے اس کے چہرے پر کچھ ایسے تاثرات ابھرتے تاڑ لیے تھے جیسے وہ پہلے ہی اس امر کا اندازہ لگا چکا ہو کہ وہ ''غیر ملکی'' جس نے مبینہ طور پر پیروٹ ڈسکی سے ڈیل کر لی تھی، وہ گون کے علم میں تھا۔

میں نے اسے بُری طرح چونکتے محسوس کیا۔ پھر میری طرف تکتے ہوئے اس نے اگلا سوال کیا۔

''کیا تم مجھے اس پاکستانی غیر ملکی کے ٹھکانے کا پتا بتا سکتے ہو؟''

''میرا سوال اب بھی وہیں ہے دوست!'' میں نے معنی خیز مسکراہٹ سے کہا۔'' میں جواب دینے کے بجائے ایک بار پھر جان بوجھ کر سانس لینے کو رکا۔ میں نے محسوس کیا گون برگ کی اب بھویں ہی نہیں اس کی آنکھیں بھی سکڑنے لگی تھیں، میری طرف اور میری بات کو بڑے دھیان سے سننے کے انداز میں اس کی گردن نے بھی ہلکا جھٹکا کھایا تھا۔

میں بہ خوبی یہ اندازہ کر سکتا تھا کہ یہ ''موضوع'' اس کے لیے کس قدر ''اہم'' تھا۔

اسی وقت کنٹینر کا دروازہ بجا۔ میری گفتگو فیصلہ کن موڑ پر تھی اور ایسے میں کچھ بھی ہو سکتا تھا، یا گون برگ مجھ پر حملہ کر دیتا یا پھر میری بات سنتا رہتا، آخرالذکر بات کا زیادہ امکان تھا اور وہی ہوا۔

دستک کی اس بے ہنگم سی آواز پر ہم سب ہی چونکے تھے، شاید کبیل دادا اپنا ''کام'' نمٹا کر لوٹ آیا تھا۔ میں نے اپنی بات قطع کرتے ہوئے شکیلہ کی طرف دیکھا اور معنی خیز انداز کا ایک مخفی اشارہ بھی کر دیا کہ وہ کبیل دادا کو تازہ صورت حالات سے ''بریف'' کر ڈالے۔

''یہ کون آیا ہے؟'' گون برگ نے اپنی محویت سے قدرے چونک کر مجھ سے پوچھا۔

''ڈونٹ وری اباؤٹ اٹ...... میرا ہی ساتھی ہے۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔'' میں نے سلسلہ کلام وہیں سے جوڑا۔

''اس غیر ملکی کو اپنی ساتھی عابدہ ہی کی نہیں بلکہ ایک خاتون رپورٹر آنسہ خالدہ کی بھی تلاش تھی جو ایک لبنانی عورت تھی۔ باس نے مجھے یہ کام سونپا، یہ ہمارے لیے ایک مشکل کام تھا۔ مگر ڈنشا نے اسے پیروٹ ڈسکی کے ساتھ کرنے کی ڈیل ففٹی پرسنٹ پر کر ڈالی۔'' میں نے دانستہ ابھی لمبی چھلانگ مارنے سے احتراز برتا تھا، ابھی آنسہ خالدہ کے بارے میں بھی پتا چل جاتا تو بھی کافی کامیابی کے نزدیک پہنچا جا سکتا تھا۔ کیونکہ آنسہ خالدہ اور بعد میں سوزی والی آخرالذکر اطلاع کے مطابق آنسہ خالدہ نہ صرف عابدہ کے دوران جیل کے پُراسرار راز سے پردہ ہٹا چکی تھی بلکہ

عابدہ کہاں اور کن لوگوں کی گرفت میں تھی، یہ بھی اسے معلوم ہو چکا تھا۔

”تو کیا اس حرام زادے! ڈنشا کو ان دونوں عورتوں کا پتا چلا؟“ گون نے اچانک سوال کیا۔ میں نے بھانپتی نظروں سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس کی آنکھیں قدرے پھیل گئی تھیں اور گردن اکڑ گئی تھی، پیشانی پر سلوٹوں کا جال سا بن گیا تھا۔

”اسے کچھ پتا نہ تھا۔“ میں نے کہنا شروع کیا۔ ”اس نے صرف مدد کی ہامی بھری تھی اس لیے کہ اس کا انڈر گراؤنڈ مافیا گینگ بہت وسیع تھا۔ پھر اس نے عابدہ کا تو نہیں البتہ آنسہ خالدہ کا پتا چلا لیا۔ کیونکہ وہ سب جانتی تھی۔“

یہاں میں رکا۔ گون برگ کی آنکھیں پھیلتی جا رہی تھیں۔ چہرے پر ایک جوش کی سرخی کے علاوہ اس کی آنکھوں سے عجیب سی الجھن بھی نمایاں تھی۔ حسب توقع میرے لمحہ بھر کو ٹھہرنے پر وہ ایک بے چین... سی پریشانی سے بولا۔

”ت...... تو کیا انہوں نے آنسہ خالدہ کو برآمد کر لیا؟“

”ہاں!“ میں نے مختصراً کہا۔

خالدہ سے متعلق میری دروغ گوئی فوری طور پر یہ ظاہر کر سکتی تھی کہ آیا وہ بے چاری ابھی زندہ بھی تھی یا نہیں۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو گون برگ میرا جھوٹ پکڑ سکتا تھا اور میرے لیے یہ اذیت ناک انکشاف کرتا کہ خدانخواستہ آنسہ خالدہ کو جے بی سی یا ٹائیگر فینگ کے بھیڑیوں نے ہلاک کر ڈالا ہے۔ لیکن اس نے کچھ نہیں کہا، وہ چپ رہا۔ میرے بولنے کا منتظر تھا۔ شاید وہ وضاحت سننے سے پہلے کچھ کہنا نہیں چاہتا تھا۔

لہٰذا جب اس نے ایسا کوئی انکشاف نہ کیا تو میں نے کہا ”آنسہ خالدہ کو بہ قول...... ڈنشا کے اس نے بازیاب تو کرا لیا اور اس کے ذریعے عابدہ کا بھی پتا لگا لیکن وہ جن لوگوں کے حوالے تھی، ان سے مقابلہ ہمارے گروہ کے لیے ناممکن تھا، ڈنشا نے ہم سے ڈیل کی وہ یہ کام کر سکتا ہے، بشرطیکہ اسے ایڈوانس کے طور پر ڈیل کی نصف ادائیگی کر دی جائے، باس پیروٹ نے وہ اسے کر دی، لیکن جلد ہی پتا چلا کہ آنسہ خالدہ کو نہیں اس نے درحقیقت اپنے ہی گروہ کی کسی ساتھی لڑکی کو آنسہ خالدہ بنا کر پیش کیا تھا، جسے ہم پہچان گئے کہ یہ ہماری مطلوبہ تھی ہی نہیں اور مزید یہ کہ ڈنشا کا دعویٰ ہی جھوٹ نکلا۔ اس پر ڈنشا نے یہی عذر پیش کیا کہ وہ بھی دھوکا کھا گیا ہے اور ڈیل میں نفع نقصان ہے، یوں وہ نصف رقم ہم سے کھا کر بیٹھ گیا۔“

یہ سارا سفید جھوٹ بڑی صفائی سے بتانے کے بعد میں خاموش ہو گیا لیکن میں اپنی چال کے مطابق اس کی ”سوئی“ جہاں اٹکانا چاہتا تھا، وہ مقصد میرا پورا ہو چکا تھا۔ یعنی غیر ملکی ”شہزی“ اور اس کے ساتھی۔

ادھر میرے مخصوص اشارے پر شکیلہ، کبیل دادا کو دوسرے رہائشی گوشے میں لے گئی تھی، تاہم مجھے معلوم تھا ان دونوں نے ہم پر نظر ضرور رکھی ہوگی تاکہ کسی ”گڑبڑ“ کی صورت میں وہ دونوں فوراً میری مدد کو کود سکیں۔

میری بات سن کر گون برگ کے چہرے پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ ابھری تھی۔ جس کا ایک طرف تو واضح مطلب یہ تھا کہ وہ میری باتوں میں آ رہا تھا اور دوسرا مطلب لامحالہ یہی ہو سکتا تھا کہ آنسہ خالدہ کے سلسلے میں اسے اس بات کی پوری تسلی تھی کہ وہ انہی کی گرفت میں تھی یوں میری جھوٹی بات ازخود یہی ثابت ہوئی تھی کہ ڈنشا نے ہمیں دھوکا دیا تھا۔

دراصل بعض حالات اور موقع محل ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں جھوٹ یا آدھا سچ بولا جائے تو اس کے تیر ٹھیک ٹھیک نشانے پر بیٹھتے ہیں۔ میرا خیال ہے یہی کچھ میرے اور گون برگ کے بیچ ہو رہا تھا۔

تاہم ابھی تک گون برگ نے آنسہ خالدہ کے بارے میں خود سے کچھ نہیں بتایا تھا۔ ابھی میری منزل اندھیرے میں تھی۔

”لیکن جلد ہی صرف مجھے اس حقیقت کا علم ہو گیا کہ ڈنشا ہمارے ساتھ ڈبل کراس کر رہا تھا۔“ میں نے اسے کھولنے کی غرض سے کہا۔

”اس نے آنسہ خالدہ کو بازیاب کروا لیا ہے اور ہمارا نصف حصہ کھانے کے بعد اب وہ شہزی کے ساتھ خفیہ ڈیلنگ کرنا چاہتا ہے لیکن ہم نے اسے شہزی اور اس کے ساتھیوں سے ابھی نہیں ملوایا ہے۔ یہ صرف میرے اور باس پیروٹ ڈسکی کے علم میں ہے اور ان کا خفیہ ٹھکانا بھی ہمیں پتا ہے لہٰذا ڈنشا نے مجھے لالچ دے کر ساتھ ملانے کی کوشش کی ہے کہ اگر میں یہ خفیہ ڈیل... اس سے کروا دوں تو وہ مجھے پانچ لاکھ امریکن ڈالر دے گا۔“

”تم نے پھر کیا فیصلہ کیا؟“ گون برگ نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے جیسے سانس روک کر

یہ پوچھا تھا۔ میں جانتا تھا کہ جب تک اس کے مطلب کی بات جاری رہے گی، وہ دھیان میں لگا رہے گا۔ میں نے جواب میں کہا۔

”سوچ تو میں بھی یہی رہا ہوں کہ ڈنشا کی ایک میٹنگ شہزی اور ان کے ساتھیوں سے کروا ہی دوں۔ یہ غداری تو ہوگی، لیکن مجھے پروا نہیں، پیسا تو مل جائے گا نا مجھے بہت سارا۔“ میں نے خود کو لالچی ظاہر کیا۔

”ڈنشا کی بات ہرگز مت ماننا۔“ وہ ایک دم جوش سے بولا۔ ”وہ تم سے جھوٹ بول رہا ہے، کیونکہ آنسہ خالدہ اس کے قبضے میں نہیں ہے۔“ بالآخر وہ کھلنے لگا۔ ”شہزی“ اس کے لیے بہت ”نجی“ موضوع تھا۔

”تمہیں اس قدر کیونکر یقین ہے؟ بھلا تمہارا ان سے کیا لینا دینا؟“ میں نے ”معصومانہ“ سی حیرت سے کہا۔

”اس بات کو چھوڑو۔“ وہ ایک ہاتھ اور اپنا سر ایک ساتھ جھٹکتے ہوئے بولا۔ اپنے مطلب کی بات پر آتے ہی وہ پُرجوش اور بے چین سا ہو گیا تھا۔ ”اگر میں تم سے یہ کہوں کہ ڈنشا کے بجائے یہ ڈیل تم مجھ سے کرلو اور میں تمہیں اس سے زیادہ رقم دوں گا، تم شہزی اور اس کے ساتھیوں کے ٹھکانے اور رابطے کے بارے میں مجھے بتا دو تاکہ میں خود ان سے آنسہ خالدہ کے سلسلے میں ڈیل کرلوں تو تمہارا جواب کیا ہوگا؟“

اس کی بات سن کر میرا دل اندر یکبارگی زور سے دھڑکا۔ اب بھی واضح نہیں ہو پایا تھا کہ آنسہ خالدہ زندہ بھی تھی یا نہیں، تاہم میں اب تک اسے جتنا کھولنے میں کامیاب رہا تھا، اتنا تو مجھے بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ابھی ان خبیثوں کی خوفناک بربریت کا شکار نہیں ہوئی تھی۔

لہٰذا میں نے اسے اپنی چال میں پھنسانے کا جو ”گراؤنڈ“ بنایا تھا، اس کے بل پر بولا۔ ”ٹھیک ہے مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ تمہیں اس پاکستانی غیرملکی شہزی سے کیا دلچسپی ہے۔ اگر تم مجھے ڈنشا سے زیادہ معاوضہ دینا چاہتے ہو تو یہ ڈیل میں تم سے کرلیتا ہوں، ڈنشا پر تو یوں بھی مجھے کوئی بھروسا نہیں رہا لیکن اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تم مجھ سے کوئی دھوکا نہیں کر رہے ہو؟“

”میں تمہارے اطمینان کے لیے ابھی فی الحال عابدہ کا تو نہیں البتہ آنسہ خالدہ کا دیدار تمہیں کروا دوں گا اور بولو؟“

میرا دل خوشی سے بلیوں اچھل پڑا، ابھی میرے لیے یہی کافی تھا لہٰذا میں اس مسرت کو دباتے ہوئے دکھاوے کی حیرت سے بولا۔

”کیا واقعی؟“

”ہاں! اچھا ہو تو ابھی چلو میرے ساتھ۔“

”اچھا!! اگر تم میری یہ تسلی کر ڈالو تو میں بھی تمہیں اسی وقت شہزی اور ان کے ساتھیوں سے ڈیل کروا دیتا ہوں اور تم سے اپنا انعام لے کر چلتا بنوں گا۔“

”کھڑے ہو جاؤ پھر۔“ اس نے ایک دم اپنی جگہ چھوڑ دی۔ میں بھی کھڑا ہو گیا۔

میں نے اس کا مختصر اجنبی سامان اسے لوٹا دیا۔

”میں اپنے ساتھیوں کو بتا کر آتا ہوں، پھر تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“ میں نے اس سے کہا۔

اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن ذرا جلدی۔ آج ہی یہ معاملہ نمٹانا ہے۔“

میں نے دوسرے کمرے میں آکر کبیل دادا اور شکیلہ سے صرف چند سیکنڈوں کی ملاقات کی۔ وہ دونوں دروازے سے کان لگائے کھڑے تھے۔ اُن کے چہرے جوشِ مسرت سے تمتما رہے تھے۔

”تم نے تو کمال کر دیا شہزی......!“ دونوں ہی دھیمی سرگوشی میں بیک وقت بولے۔

”ششش......“ میں نے ان دونوں کو گھورتے ہوئے انگلی ہونٹوں پر رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ جوشِ مسرت میں وہ بھلا بیٹھے تھے کہ دوسری طرف کس قدر خطرناک دشمن موجود تھا۔

میں نے انہیں جلدی سے اپنے محتاط تعاقب کی ہدایت کی اور پھر دوسرے گوشے میں آکر گون برگ کے ساتھ باہر نکل گیا۔

ایسا نہیں تھا کہ مجھے اپنی کامیابی کا یقین نہیں آرہا تھا، مجھے یقین تھا اس لیے کہ یہ چال ایسے بروقت حالات اور موقع محل میں چلی گئی تھی جس کا ”منظرنامہ“ ازخود تیار ہو چکا تھا اسی لیے گون برگ جیسے گھاگ شخص کو بھی کسی چالاکی یا چال کا شبہ اور شائبہ تک نہیں ہوا تھا۔

ہم دونوں نے مین شاہراہ پر آکر کیب کروائی اور نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

پیش آئندہ اور متوقع حالات کی کشاکشی کا میں تصور بخوبی کرسکتا تھا۔ وہاں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ گون برگ مجھے ”ڈینی“ ہی سمجھ کے سہی، ”شہزی“ وغیرہ کے بارے میں اگلوانے کے لیے دھوکے سے یرغمال بنا سکتا تھا یا پھر واقعی آنسہ خالدہ کو جیتا جاگتا مجھے دکھا کر میرے ساتھ ”معاملہ

UrduBooks.pk

داری'' کی بات کرتا۔

کیب نامعلوم منزل کی جانب گامزن تھی اور میں گاہے بگاہے عقبی منظر پیش کرنے والے مرر میں یہ دیکھنے کی تسلی کرتا کہ کبیل دادا اور شکیلہ کس ہوشیاری سے ہمارے تعاقب میں تھے؟

کیلی فورنیا کی سڑکوں پر شبنمی رات اتری ہوئی تھی۔ نیون سائن بورڈ تو سرِشام ہی جگمگانا شروع کر دیتے۔ ٹریفک معمول کے مطابق رواں تھی۔

گون برگ میرے مقابل ہی پسنجر سیٹ پر بیٹھا تھا۔

عابدہ کی جستجو و تلاش میں یہ میری طویل و کٹھن مسافتیں تھیں جن کی منزل ایک مگر راستے ہزار تھے جو نامعلوم بھی مگر میرے ہی بنائے ہوئے تھے، انہی میں ایک اپنے ذہن رسا سے بنائے ہوئے راستے پر میں گامزن تھا۔

اگر گون برگ کو اصل حقیقت معلوم ہو جاتی کہ وہ کسی ''ڈپی'' کو نہیں بلکہ ایسے شخص کو اس کی منزل کے نشان تک لے جارہا ہے، تو وہ مجھے اس طرح آرام سے کیب میں لے جانے کے بجائے میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر یا ہوش و حواس کی دنیا سے بے گانہ کر کے ہی لے جاتا، منزل کی طرف نہیں کسی ٹارچر سیل میں۔

لیکن اس سے اس کے سر پر ایک ہی دُھن سوار تھی۔ میں نے اس کی کمزور رگ کو ایسے موقع محل پر چھیڑا تھا کہ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی محدود ہو کر مجھ سے جلد از جلد ''شہزی'' کے حصول تک رہ کر ختم ہو گئی تھی۔ چاہے بعد میں وہ مجھے یعنی ڈپی کو دھوکے سے ہلاک کر دیتا۔

سارے راستے میں ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا لیکن اجنبیت کی اپنی چند مروجہ مشکلات ہوتی ہیں، یہ علاقہ تو کیا شہر خرابہ بلکہ ملک خرابہ بھلا میں پہلے کب دیکھا تھا؟

بہرکیف...... جتنا کچھ یاد رکھ سکا، وہ کرتا رہا، لیکن میں ابھی تک ٹریفک کے اس رواں ہجوم میں کسی کیب وغیرہ میں متعاقب کبیل دادا اور شکیلہ کی جھلک تک نہ دیکھ پایا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ مجھے نگاہ میں نہ رکھیں ہوں، مگر میں انہیں تلاشنے سے شاید قاصر رہا تھا کہ گون برگ جیسا آدمی میرے ہم رکاب تھا۔

کیب مضافات میں آگئی، یہاں آبنوسی پہاڑیوں کا سلسلہ تھا۔ اگرچہ آبادی کے آثار دیدہ زیب اور قیمتی لکڑیوں کے کاٹیج نما مکانوں کی صورت میں یہاں بھی نظر آرہے تھے، تاہم شہر کی نسبت یہاں زیادہ تر سناٹے کا ہی

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 1200 روپے
امریکا کینیڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 10,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 9,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔
رابطہ: مرزا شریف فون نمبر 0301-2454188
سرکولیشن منیجر: سید منیر حسین 0333-3285269
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35804200-35804300

راج تھا۔

ایسے ہی وقت میں گون برگ نے اپنے سیل فون پر کسی سے بات کی۔ وہ بہت دھیمے لہجے میں اور مختصراً الفاظ استعمال کر رہا تھا۔ سردی کے سبب کار کی کھڑکیوں کے شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ لیکن پھر بھی کار کے محدود ماحول میں گونج کی سی فضا طاری تھی، ڈرائیور بھی کوئی من چلے مزاج کا آدمی تھا اس نے اسٹیریو ڈیک پر کوئی ہلکی موسیقی لگا رکھی تھی اور سیل پر بات کرتے ہوئے گون برگ نے بھی اسے ٹوکنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی کہ وہ اسے بند کرنے کا کہتا۔ شاید وہ خود بھی یہی چاہتا تھا، کہ کوئی اس کی فون پر ہونے والی گفتگو نہ سن سکے۔ اس نے اضافی آوازوں کی ''مداخلت'' سے بچنے کے لیے اپنا ایک ہاتھ دوسرے کان پر رکھ دیا تھا۔

ادھر میں خود یہ اندازہ کر کے کہ منزل قریب تھی، وہ شاید اپنے ساتھیوں کو کوئی ہدیت دے رہا تھا، یہ بڑا رسک لیا تھا میں نے۔ لیکن چال میری بالکل سیدھی تھی۔ گڑبڑ کا امکان بس اتنا ہی تھا کہ گون برگ مجھے دھوکا... کرتا جس کی مجھے پوری امید بھی تھی، یعنی اس بات کا قوی امکان تھا کہ اس کے اندر بھی کھچڑی پک رہی ہو کہ وہ مجھے شہزی کی حیثیت سے نہ سہی مگر ''ڈینی'' کی حیثیت سے ہی کیا خبر یہ ارادہ رکھے ہوئے ہو کہ مجھ سے ڈیل کیے بنا دھوکے سے یرغمال بنا کر ''شہزی'' وغیرہ کے بارے میں اگلوانے کی کوشش کرتا اور تشدد کی راہ سے بھی نہیں چوکتا۔ ہر زاویے سے حالات اس وقت غیر یقینی ہی تھے۔

کوئی دو ایک کلومیٹر چھوٹی بڑی خاکستری پہاڑیوں کے اس سلسلے میں سفر کے بعد گون برگ نے جس مقام پر کیب روکنے کا حکم دیا تھا، اسے دیکھ کر مجھے سخت اچنبھا ہوا تھا۔ اس لیے کہ میری توقع کے برخلاف ہم کسی ویران مقام پر تھے۔

کیب رک گئی۔ گون برگ نے مجھے اترنے کا کہا۔

میں محتاط انداز میں نیچے اتر آیا۔ اس نے کیب ڈرائیور کو کرایہ ادا کر کے چلتا کر دیا۔ میں نے ذہنی طور پر خود کو اب ہر طرح کے ممکنہ خطرے کے لیے تیار کر رکھا تھا۔ یہ احساس میرے جوش اور کوہ شکن حوصلوں کو تقویت بخش رہا تھا کہ میں آنسہ خالدہ کی بازیابی کے لیے ایک کامیاب پیش رفت کر چکا ہوں اور اب بس! کچھ ہی دیر میں، آنسہ خالدہ سے پہلی بار میرا آمنا سامنا ہونے والا ہے۔

ایک خدشہ تھا کہ آنسہ خالدہ مجھے پہچان سکتی تھی۔ کیونکہ میں اس کے ساتھ کمپیوٹر پر ویڈیو چیٹنگ کر چکا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو میں اسے اشارہ کر سکتا تھا یا پھر وہ خود بھی بات کی تہ تک پہنچ سکتی تھی۔

لیکن اس وقت میرے دل کو بے چینی سی لگ گئی جب گون برگ مجھے ایک بالکل ویران اور اندھیرے مقام میں لے کر اترا تھا۔

''کیا یہاں ہم غلطی سے اتر گئے ہیں؟'' بالآخر مجھ سے نہ رہا گیا۔

''ہم بالکل صحیح جگہ اترے ہیں۔'' گون نے جواب دیا۔ نجانے کیوں مجھے اس کا لہجہ خاصا گمبھیر محسوس ہوا۔ اس کا جواب مبہم سا تھا۔

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ سامنے سے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نمودار ہوئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک کار ہمارے قریب آن رکی۔ اس کے اندر سے دو افراد برآمد ہوئے۔ ان کی حرکات وسکنات سے مخصوص قسم کی چابک دستی جھلکتی تھی۔

دونوں نے مودبانہ انداز میں آگے بڑھ کر گون برگ کو جھک کر تعظیم پیش کی اور میری جانب محض ایک اچٹتی سی نظر ڈالی۔

اس کے بعد ایک نے کار کا اگلا دروازہ کھولا۔ گون برگ اس میں سوار ہو گیا۔ دوسرا پھرتی سے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ والے دروازے کی طرف لپکا، پہلے والے نے مجھے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کے کار میں سوار ہونے کا اشارہ کیا اور میرے سوار ہوتے ہی خود بھی براجمان ہو گیا۔ کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ آنے والے غیر یقینی حالات کو محسوس کر کے میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔

مجھے میرے سوال کا جواب مل چکا تھا اسی لیے میں خاموش تھا۔ اس نے فون کر کے اپنے آدمیوں کو یہاں بلا لیا تھا وہ شاید ضرورتاً ہی محتاط رہنے کا قائل تھا۔

چند فرلانگ کی ڈرائیو کے بعد کار دائیں جانب ایک تنگ سی مگر پختہ سڑک کی جانب مڑ چکی تھی۔

میرے خیال کے مطابق کبیل داد اور شکیلہ پیچھے یا دور کہیں رہ گئے تھے۔ یوں بھی وہ اس ویران سڑک پر خود کو نظروں سے مخفی ہی رکھنا چاہتے ہوں گے، اس طرح تعاقب کا راز افشاں ہو سکتا تھا اور بنا بنایا سارا کھیل بھی بگڑنے کا اندیشہ تھا۔

مذکورہ سڑک پر مڑتے ہی وہ کسی پہاڑی پر عمودی جاتی محسوس ہوئی اور کار بھی اسی سمت پر مناسب رفتار سے دوڑتی چلی گئی۔

UrduBooks.pk

اب ہمارے دائیں بائیں تاریک سا بنجر ویرانہ اور بے ہنگم سے سرمئی ہیولے تھے، جو شاید قدرتی جھاڑ جھنکاڑ اور ٹنڈ منڈ سے خشک درختوں کے ہیولے ہوسکتے تھے۔

اسی پہاڑی کی چوٹی پر وہ ایک شاندار عمارت تھی۔ جو مجھے رقبے اور حجم کے لحاظ سے کم از کم پانچ سو یارڈز تک تو محیط دکھائی دیتی تھی۔ وہاں روشنی تھی۔ عمارت کی چھت پر شاید ہیلی پیڈ بھی بنایا گیا تھا کیونکہ وہاں مجھے کسی چاپر کا اگلا حصہ اور پنکھے کی جھلک نظر آئی تھی۔ ایک دو گاڑیاں بھی باہر گیٹ کے موجود تھیں۔

وہاں دو گن مین سے آدمی چست لباس پہنے مستعد کھڑے تھے۔ فضا میں عجیب سی خاموشی گھلی ہوئی تھی اور تاریک آسمان پر محاق کا چاند دور کہیں جھکا ہوا تھا۔ کالے بادلوں کی آوارہ ٹولیاں تاروں کے جھرمٹ کی ضوفشانی کو پوری طرح چھپانے سے قاصر نظر آتی تھیں۔

کار اسی گیٹ کے قریب جا رکی تھی مگر کار اور اس میں سوار کو پہچان کر ان دونوں اسلحہ پوش محافظوں نے کوئی حرکت نہ کی تھی۔ وہ اسی طرح مستعد اور چوکس کھڑے، گاہے بہ گاہے گرد و پیش پر نگاہ ڈالے ہوئے تھے۔

گیٹ خاص قسم کی دھات سے بنا ہوا تھا اور اس کی بناوٹ میں نفاست تھی۔ وہ خودکار انداز میں دائیں جانب سلائڈ ہوتا چلا گیا۔

ہم چاروں اندر داخل ہوگئے۔ گون برگ آگے تھا اور اس کے ہمراہ ایک آدمی جبکہ دوسرا میرے ساتھ تھا اور ہم ان کے عقب میں چلتے ہوئے ایک پختہ روش سے عمارت کے مرکزی دروازے پر پہنچے۔

میں بہ ظاہر دزدیدہ مگر غور سے گرد و پیش کا جائزہ لیتا جا رہا تھا۔ اندر داخل ہوتے سے مجھے دائیں بائیں فینسی ریلنگ اور سنگ مرمر کے قدمچوں والے زینے ذرا بل کھاتے ہوئے اوپری منزل کی طرف جاتے نظر آئے تھے۔

ہم .... شاہ بلوط کے ایک موٹے مگر دیدہ زیب دروازے سے ہوتے ہوئے، جو گون برگ کے قریب پہنچتے ہی خودکار انداز میں کھلتا چلا گیا تھا، اندر داخل ہوگئے۔

یہ ایک بڑا ہال تھا۔ فرش پر دبیز قالین اور نہایت بیش قیمت اشیا اور آرائش جدیدیت سے آراستہ و پیراستہ یہ ایک آرام دہ اور پرتعیش نشست گاہ تھی۔ جس کی چھت قدرے بلند تھی اور اس پر پانچ دیدہ زیب فانوس جھول رہے تھے، درمیان والا فانوس مقابلتاً بڑا تھا۔ باقی چار اس کے دائیں بائیں چھت کے کونوں کے قریب ایک مناسب فاصلے پر تھے۔

فرنیچر قیمتی اور آرام دہ تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ آنسہ خالدہ کو ایسی جگہ پر یرغمال بنا کر رکھا گیا ہوگا؟ میرے ذہن میں تو کسی سیلن زدہ سی بوسیدہ جگہ کا تصور تھا۔

”کیا واقعی آنسہ خالدہ یہاں موجود تھی؟“ میرے ذہن میں ابھرا۔

مجھے ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھنے کا کہا گیا۔ گون میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ تین افراد مودبانہ انداز میں اس کے قریب آن کھڑے ہوئے۔ ایک کو اس نے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ اس کے چہرے کے آگے جھکا۔ گون برگ نے اس کے کان میں کچھ کہا۔

اچانک ہی ماحول کچھ ایسا لگا جیسے ابھی کچھ ہونے والا ہو۔ وہ آدمی اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے سیدھا ہوا اور اپنے ساتھ ایک اور کو بھی آنے کا اشارہ کرتے ہوئے ایک کونے والے دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

گون برگ میری جانب گھورے جا رہا تھا پھر بولا۔

”آنسہ خالدہ کو تم دیکھتے ہی پہچان تو لوگے نا؟“

”بالکل۔“ میں نے یقینی لہجے میں جواب دیا لیکن اندر میرے اب زبردست دھکڑ پکڑ مچی ہوئی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر بعد آنسہ خالدہ کو میرے سامنے پیش کیا جانے والا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی کیا حالت ہوسکتی تھی؟ اس کی دلی و ذہنی کیفیات کا مدوجزر اپنی جگہ لیکن خدشہ مجھے یہی دامن گیر تھا کہ کہیں وہ جوشِ مسرت و حیرت کے اظہار تلے کوئی بے وقوفی نہ کر جائے، اگرچہ وہ خود ایک ذہین اور دلیر مجاہدہ تھی۔ عین ممکن تھا کہ اس بے چاری کو ان خنزیر نسل یہودیوں نے کچھ زیادہ ہی ٹارچرائزڈ کیا ہو اور وہ ایسی مرگ آسا کی سی کیفیات میں مبتلا ہو کہ اس بات کا دھیان ہی نہ رہے اور وہ مجھے پہچان کر بے اختیار حسرت و یاس تلے پکار بیٹھے۔

”تم کچھ سوچ رہے ہو؟“

اچانک گون برگ کی آواز نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میرا انداز بھی بے دھیانی میں ایسا ہی چونکنے والا تھا کہ جیسے میری کوئی چوری پکڑلی گئی ہو۔

”ہاں! میں دراصل یہ سوچ رہا تھا کہ ایسی شاندار جگہ پر تو تم نے اپنے قیدی کو بڑے ٹھاٹ باٹ سے رکھا ہوگا۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے بدستور یوں اپنی جانب گھورتے رہنے سے ادراک ہوتا تھا کہ وہ میرے جواب سے کچھ خاص مطمئن نہیں ہوا تھا۔

”ہم م م م......“ اس نے گمبھیر سی ہنکاری بھری۔

میری بے چینی کچھ سوا ہوئی۔

اچانک ایک آدمی باہر سے اندر داخل ہوا۔ یہ اُن دونوں میں سے نہیں تھا جو گون برگ کے حکم پر کونے والے دروازے کے اندر داخل ہوئے تھے بلکہ یہ ان میں سے ایک تھا جو باہر دو اسلحہ پوش مستعدی کے ساتھ کھڑے تھے۔ اس نے ایک عجیب سی نظر مجھ پر ڈالی اور پھر قدرے جھک کر اس نے گون برگ کے کان میں کچھ کہا۔ میری نظریں بھی ان دونوں کا جائزہ لینے میں محو تھیں۔ اس آدمی کی نظروں میں جانے ایسا کیا تاثر میں نے محسوس کیا تھا کہ میری چھٹی حس نے مجھے ایک نئی اور نامعلوم سی بے چینی میں مبتلا کر دیا۔

میں نے دیکھا، اس آدمی کی بات سن کر گون برگ نے میری جانب استہزائیہ مسکراہٹ اور قدرے سنسناتی نظروں سے گھورا تھا پھر اپنے ایک ہاتھ کا اسے مخصوص اشارہ کیا۔ وہ واپس لوٹ گیا۔

”تم نے مجھے کیا سمجھ رکھا تھا مسٹر ڈینی؟“ اس گن مین کے دوبارہ دروازے کی جانب پلٹتے ہی گون برگ نے مجھ سے بڑی زہریلی سرسراہٹ تلے ....کہا اور میرا اندر بُری طرح کھٹک گیا۔ پہلا چور خیال جو میرے ذہن میں ابھرا تھا، وہ یہی تھا کہ میرا شاید بھانڈا پھوٹ چکا ہے۔

پھر اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ کہتا، وہ اسی لہجے میں دوبارہ بولا۔ ”میرا نام گون برگ ہے جانتے ہو ناں؟ میں جہاں جاتا ہوں یا جہاں سے لوٹتا ہوں وہاں میرے ساتھی بھوتوں کے سائے کی طرح ہر طرف سے مجھے گھیرے ہوئے ہوتے ہیں۔“

یہی وہ وقت تھا جب اس نشست گاہ نما ہال کا دروازہ کھلا اور میں سامنے کا منظر دیکھتے ہی تقریباً اچھل پڑا اور میرا دل جیسے رک رک کر دھڑکنے لگا۔

چار مسلح افراد کبیل دادا اور شکیلہ کو بیدردی سے گھسیٹتے ہوئے اندر لے کر آئے اور ہمارے سامنے انہیں فرش پر گون برگ کے قدموں کے قریب ڈال دیا۔

میری پھٹی پھٹی نظریں ان دونوں پر جمی رہ گئی تھیں جو لہولہان اور بے سدھ سے فرش پر آڑے ترچھے پڑے تھے۔ پھر ایسے ہی وقت میں میرے کانوں میں استاری کے الفاظ گونجنے لگے جو اس نے مجھ سے اس مردود گون برگ کے متعلق کہے تھے۔

شہزی......! اس نے اپنی حفاظت اپنی ریکی کرنے والوں کے پیچھے درجنوں آدمی چھوڑ رکھے ہیں جو سب کے سب تربیت یافتہ ایجنٹ ہیں، ان میں کوئی تمہیں بارٹینڈر کے روپ میں ملے گا تو کوئی حسین ویٹریس کے روپ میں۔ حتیٰ کہ کسی فٹ پاتھ یا چوراہے پر کھڑا خاموشی سے گٹار بجاتا ہوا بیگر (فقیر) بھی...... جیسے ہی انہیں یہ بھنک پڑے گی کہ تم گون برگ کا پوچھتے پھر رہے ہو، وہ محتاط ہو جائیں گے۔“

”کی کی...... یہ سب کیا ہے مسٹر گون برگ؟“ میں یک دم طیش کے مارے اٹھ کھڑا ہوا، کچھ تسلی ہوئی تھی مجھے کہ یہ معاملہ کچھ اور تھا کہ ابھی میرا ”بھانڈا“ نہیں پھوٹا تھا۔

”بیٹھ جاؤ آرام سے ڈینی!“ گون برگ کا لہجہ موت کی طرح سرد تھا۔ اس کے آدمیوں نے اپنے ہتھیاروں کا رخ میری جانب کر دیا تھا۔

میں اس کی جانب غصے سے گھورتا ہوا دوبارہ بیٹھ گیا۔

”میں تمہاری اس حرکت کو کیا نام دوں؟ جو تم نے کی ہے؟“ وہ پھر موت جیسی سفاکانہ سرسراہٹ سے بولا پھر مجھے دیکھتے ہوئے بولا ”تم نے اپنے ہی آدمی پیچھے لگا دیے؟“

”اس میں میری کسی بدنیتی کا دخل نہیں تھا مسٹر گون!“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

صورتِ حالات کسی اور حوالے سے ایک دم سنگین اور نازک تر ہو گئی تھی۔

”ایسا میں نے اپنے تحفظ کی خاطر کیا تھا۔ کیونکہ ہو سکتا تھا کہ تم مجھے اپنے ٹھکانے پر لا کر کسی قسم کا نقصان پہنچا سکتے تھے۔“ میں نے ایک روایتی سا عذر پیش کرتے ہوئے اس سے کہا۔

”اچھا لگا مجھے تمہارا یہ جواب......“ وہ سنگین سی مسکراہٹ تلے بولا اور پھر اسی وقت کونے والا دروازہ کھلا۔

میری تشویش زدہ سی نظریں ہنوز قالین پر بکھرے ہوئے انداز میں زخمی اور نیم بے ہوش پڑے کبیل دادا اور شکیلہ پر جمی ہوئی تھیں اور ان کی ہیئت کذائی دیکھ کر میرا اندر جلنے لگا تھا کہ اچانک گون برگ کی گونج دار آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔

”وہ دیکھو ڈینی! آنسہ خالدہ تمہارے سامنے ہے، اب شاید تمہیں مجھ سے ڈیل کرنے کی تسلی ہو جانی چاہیے۔“

میں نے اس کی بات سن کر اپنی گردن مذکورہ سمت گھمائی اور سامنے کا منظر دیکھتے ہی میرا چہرہ دھواں دھواں ہونے لگا۔ ایک چپ کی سی کیفیت، منحوس چمگادڑ کی طرح پھڑ پھڑاتی ہوئی جیسے میرے چہرے پر آن چپکی تھی......

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

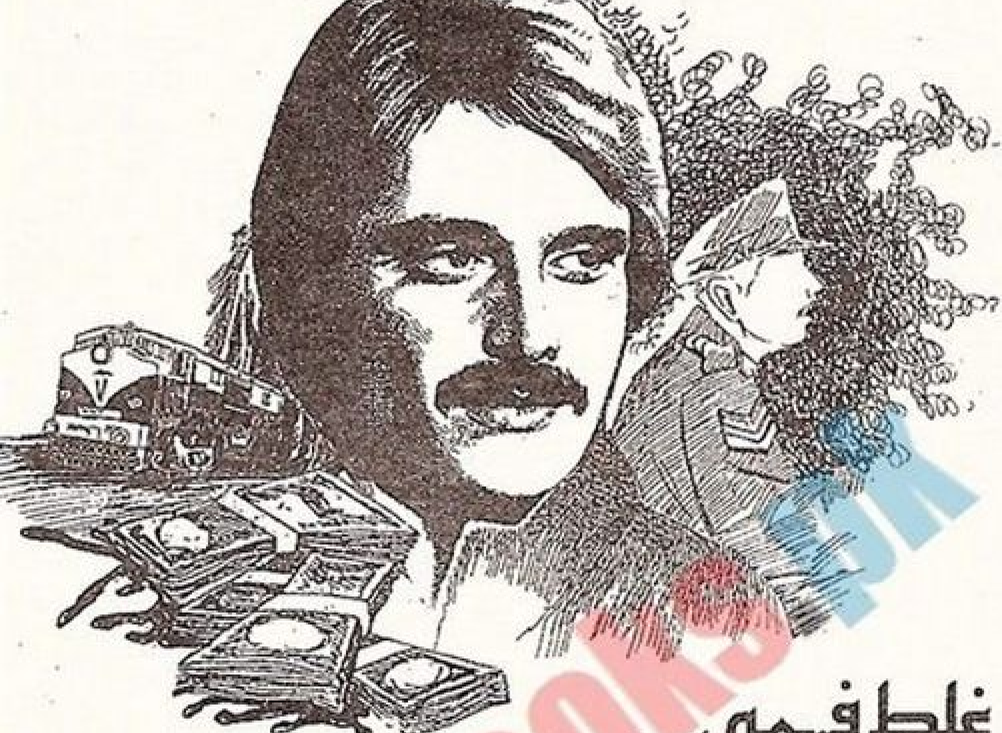

غلط فہمی

اعتزاز سلیم وصلی

زندگی میں ایسے لمحے اپنی جھلک ضرور دکھلاتے ہیں جنہیں فیصلے کی گھڑی کی سند حاصل ہوجاتی ہے... ایک ایسے ہی شخص کا قصۂ عبرت جس کا کوئی دشمن نہ تھا... اور غمگسار بھی کوئی نہ تھا... وہ اپنی کشتی کا خود ہی نگہبان تھا... لہروں پر ڈولتی اس کشتی کو غرق بھی کرسکتا تھا اور ساحل تک لے جانے کی قوت بھی رکھتا تھا... اس کے باوجود کشمکش ... ٹکرائو... ہیجان... فراموش نہ کردینے والے احساسات نے اسے ہتھیار اٹھانے پر مجبور کردیا... ایسا ہتھیار جو صرف ایک بار استعمال ہوتا ہے مگر اسے ساری زندگی ڈھونا پڑتا ہے۔

نظریۂ زندگی کی جنگ میں الجھی...... ہم جولی سے بھرپور کہانی کے پیچ و خم......

اس کی زندگی ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ صبح پانچ، چھ بجے سونا، رات کے اندھیرے میں اٹھنا، کوئی گاہک تلاش کرکے بنگلے پر لانا...... گاہکوں کی خدمت کرنا۔ انہیں ’’مال۔‘‘ کی خصوصیات بتانا۔ صبح واپس چھوڑ کر دوبارہ سو جانا۔ وہ ہمیشہ خدا سے شکوہ کرتا رہتا۔ ’’یا خدا، اس زندگی سے اچھا تھا کہ تو مجھے لڑکی ہی بنا دیتا، کم از کم اس بنگلے میں تو عزت ہوتی میری۔‘‘ اور یہ سچ تھا۔ وہ بدقسمت تھا جو ایسے گھر میں پیدا ہوا جہاں لڑکے کا کوئی کام نہ تھا۔ یہاں صرف

UrduBooks.PK

پیشہ ور لڑکیاں تھیں جو امیر گھروں کے گاہکوں کے لیے مخصوص تھیں۔ ایسا ہی ایک امیر زادہ فرزانہ پر عاشق ہوا۔ خوب کیش کیا گیا فرزانہ کے حُسن کو...... مگر جاتے جاتے امیر زادہ تمام تر احتیاط کے باوجود ایک عدد تحفہ بادشاہ کی صورت میں دے گیا۔ نام کے برعکس بادشاہ کا کام غلاموں جیسا تھا۔ اس کی پیدائش کے ایک سال بعد فرزانہ نے بنگلے کی مالکن سے کہا۔

''آنٹی اسے پھینک دیتے ہیں کہیں، کام خراب کر دے گا یہ۔ اسے سنبھالوں یا کام پر توجہ دوں؟'' لیکن بنگلے کی مالکن روبینہ چالاک عورت تھی۔ اپنے پیسے کے زور پر اس نے فرزانہ اور اس جیسی آٹھ دس لڑکیوں کو بازارِ حسن سے خرید کر اس بنگلے میں رکھا ہوا تھا جہاں یہ کاروبار چل رہا تھا۔ اس نے ان لڑکیوں کو آداب سکھائے تھے۔ روایتی ناز نخرے سے ہٹ کر انہیں ہائی سوسائٹی میں رہنے کے رنگ ڈھنگ بتائے تھے۔ اپر کلاس کے لوگ جو سکون اور پرائیوسی چاہتے تھے...... ان کے لیے یہ ٹھکانا بہترین تھا۔ ایک رات میں لاکھوں لٹا کر بھی یہ گھاٹے کا سودا نہ تھا...... رہی بات اس دھندے کے غیر قانونی ہونے کی تو قانون ان پیسے والوں کی جیب میں ہوتا ہے...... کیا قانونی یا غیر قانونی......

''نہیں فرزانہ، اسے ہم سنبھال لیں گے۔ بچہ بڑا ہو کر سارے کام سنبھالے گا۔ ہماری عمر نکلی جا رہی ہے۔ کسٹمرز سے ڈیل کرنا اب ہمارے لیے مشکل ہے...... یہ سارے کام بادشاہ کرے گا۔'' ایک سال کے بچے کے مستقبل کا فیصلہ آنٹی روبینہ نے کر دیا تھا۔ بادشاہ کو پانچ سال کی عمر میں اسکول میں داخل کروایا گیا۔ اسکول کے رجسٹر میں بھی ولدیت کے خانے میں آنٹی روبینہ کے مرحوم شوہر کا نام لکھا گیا۔ یہ شہر کا بہترین اسکول تھا۔ ساتھ ساتھ اس کی ٹریننگ اور اپنے ''شعبے'' کے متعلق معلومات بھی ملتی رہیں۔ وہ پڑھنے میں تیز تھا۔ اب وہ ماسٹرز کر چکا تھا اور کہیں جاب کرنا چاہتا تھا...... مگر ایک دن روبینہ نے اسے اپنے پاس بلایا۔

''بادشاہ تمہیں جاب کی ضرورت نہیں، اب وقت آگیا ہے کہ تم کام سنبھال لو...... امیر لوگوں سے میرے تعلقات ہیں، ان سے تم بھی واقف ہو جاؤ، ہوٹلوں میں جاؤ...... دوست بناؤ لیکن اپر کلاس سے نیچے کا کوئی دوست کبھی نہ بنانا...... یہ مڈل اور غریب ہمیشہ عزت کے چکر میں ہوتے ہیں۔'' پوری بات سننے کے بعد بادشاہ نے جواب دیا۔

''آنٹی، میں یہ کام نہیں کرنا چاہتا۔ یہ حرام کی کمائی کھانا میرے بس سے باہر ہے۔ میں محنت کر کے اپنی کمائی کھاؤں گا۔'' اس کا جواب سن کر آنٹی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اگلے ہی لمحے ان کا ہاتھ گھوما اور ''چٹاخ'' کی آواز کے ساتھ بادشاہ کا گال سرخ کر گیا۔

''تم بھی اسی حرام کی کمائی سے جوان ہوئے ہو...... اور تمہارے منہ سے یہ حرام، حلال والی باتیں اچھی نہیں لگتیں......'' بادشاہ نے مٹھیاں بھینچ لیں۔

''یہاں پیدا ہونا میری مرضی نہیں تھی مگر اب میں جو کروں گا اپنی مرضی سے کروں گا......''

''لے جا اپنا سامان اور نکل جا یہاں سے...... تجھے تعلیم دلوانا ہمارا قصور تھا...... اور یہ پکڑ پیسے۔'' اس نے ہزار ہزار کے کئی نوٹ اس کی طرف پھینکے۔ ''جب پیسوں کی ضرورت ہو یہاں آجانا اور جب دنیا تجھے دھتکار دے تب ہمارے قدموں پر گر کر معافی مانگ لینا۔ انتظار کریں گے تیرا۔'' جوان خون تھا بادشاہ کا۔ زمانے کی تلخیوں سے کب واقف تھا وہ؟ اس نے پیسے اٹھائے، سامان سمیٹا اور نکل گیا۔

☆☆☆

پولیس اسٹیشن میں صبح دس بجے انسپکٹر اسد کسی سوچ میں گم تھا جبکہ پاس ہی کرسی پر فاروق خاموش بیٹھا تھا۔ کچھ دیر پہلے ایک کیس کے سلسلے میں ان کی آپس میں بحث ہو رہی تھی جو کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ختم ہو گئی۔ انسپکٹر اسد روایتی پولیس والوں کے برعکس تھا۔ وہ ہر کیس کی پوری ذمے داری سے تفتیش کرتا تھا۔ وہ ذہین اور ایماندار شخص تھا۔ اچھے سلوک کی وجہ سے نچلا عملہ اسے بہت پسند کرتا تھا۔ یہ ملازمت اس کا شوق تھا ورنہ وہ شہر کے مشہور بزنس مین کا بیٹا تھا جس کا کاروبار پورے شہر میں پھیلا ہوا تھا۔ اسد سے بڑا بھائی امریکا میں جاب کرتا تھا۔ کمرے میں چھائے اس سکوت کو موبائل فون نے توڑا۔ اسد نے بیزاری سے سیل فون اٹھایا اور بولا۔ ''یار فاروق یہ سم کمپنی والے ساری آفرز کی تفصیل مجھے کیوں بھیجتے ہیں؟''

''پتا نہیں سر، میرے پاس بھی روزانہ بیسیوں میسج آتے ہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا لیکن اسد کے چہرے کے تاثرات بدل چکے تھے۔ میسج کمپنی والوں کا نہیں تھا۔ اس نے بلند آواز میں میسج پڑھا۔

''انسپکٹر اسد، ریلوے اسٹیشن سے تقریباً دو کلومیٹر دور ریل کی پٹری پر ٹائم بم فکس ہے۔ ٹھیک بیس منٹ بعد

UrduBooks.pk

وہاں سے ٹرین گزرے گی...... اور اسی وقت بم پھٹ جائے گا۔ اگر لوگوں کی جانیں بچانا چاہتے ہو تو ٹرین روک لو یا پھر بم ناکارہ کروادو، یاد رکھو...... صرف بیس منٹ۔“

”اچھا مذاق ہے۔“ فاروق ہنسا۔

”یہ مذاق نہیں۔ میسج کا نمبر شو نہیں ہو رہا، کسی ویب سائٹ کا نام آرہا ہے۔ ریلوے اسٹیشن یہاں سے کتنی دور ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”تقریباً پندرہ منٹ کا فاصلہ ہے۔“

”گاڑی نکالو......“ اسد تیزی سے اٹھا۔ ”ہمیں ٹرین رکوانی ہے کسی بھی طرح۔“ وہ یکدم کھڑا ہوا اور اپنی گاڑی کی چابی نکال کر اسے دی۔ فاروق بھاگتا ہوا باہر نکلا اور گاڑی نکال کر گیٹ پر لے آیا۔ گاڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ راستے میں اسد نے بم ڈسپوزل اسکواڈ کو کال کی اور انہیں جلد سے جلد ریلوے اسٹیشن پہنچنے کا کہا......

ٹھیک بارہ منٹ بعد وہ ریلوے اسٹیشن پر تھے جہاں ایک شخص کرسی کے سرے سے ٹیک لگائے اونگھ رہا تھا۔ فاروق نے آگے بڑھ کر اسے جھنجوڑا۔ سامنے دو پولیس والوں کو دیکھ کر وہ چونک گیا۔

”خ خ...... خیریت سر جی؟“

”نہیں، ٹرین کس وقت آئے گی؟“

”آٹھ سے دس منٹ تک۔“

”اسے ہر صورت روکنا ہے۔“

”ناممکن، وہاں کوئی ایسا شخص موجود نہیں جس سے رابطہ کیا جاسکے اور نہ ہی راستے میں کہیں اور کوئی اسٹیشن ہے۔“

”کسی بھی طرح اسے روکنا ہے۔ راستے میں بم لگا ہوا ہے۔“ اسد نے زور دے کر کہا۔ سامنے موجود شخص چونک اٹھا۔

”ہاں، یاد آیا...... میرے کزن کو آج آنا تھا...... اگر وہ اس ٹرین میں ہے تو رکوا سکتے ہیں۔“ اس نے جیب سے موبائل نکالا۔ دوسری کوشش میں کزن سے رابطہ ہو گیا۔ اگلے چند منٹ میں ٹرین ہنگامی طور پر روک لی گئی تھی۔ بم ڈسپوزل اسکواڈ بھی پہنچ چکا تھا مگر اتنے وقت میں بیس منٹ پورے ہو چکے تھے...... اور...... پہلا دھماکا...... بم بلاسٹ......

☆☆☆

بادشاہ نے نوکری کی تلاش شروع کر دی تھی۔ وہ پُرجوش تھا اور جلد نوکری ڈھونڈ کر آنٹی روبینہ کو کچھ کر کے دکھانا چاہتا تھا۔ فلیٹ کرائے پر لے کر اس نے دوسرے دن ہی نوکری کی تلاش شروع کر دی مگر اتنی آسانی سے نوکری ملتی ہوتی تو آدھی عوام بے روزگاری کا رونا کیوں روتی؟ اگلے چند ماہ اس نے کئی دفتروں کے دھکے کھائے۔ ہر جگہ سفارش یا خاندان کا حوالہ جو کہ دونوں چیزیں اس کے پاس نہیں تھیں۔ پیسے تیزی سے کم ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ایک وقت کا کھانا کھا کر فلیٹ کے مالک کی باتیں سن کر اسے اپنا بنگلا یاد آنے لگا تھا۔ وہاں زندگی کی ہر سہولت موجود تھی مگر اس کی غیرت نے واپس جانا گوارا نہ کیا۔ اور پھر ایک شام اسے فلیٹ سے نکال دیا گیا۔ دو دن سامنے والے پارک میں سونے کے بعد سردی کی وجہ سے بخار چڑھ گیا۔ سرکاری اسپتال میں ایک روپے کی پرچی لے کر چیک اَپ کروایا اور واپس روبینہ کے پاس جانے کا سوچنے لگا۔ پاس ہی دو دن پرانا اخبار پڑا تھا۔ اس نے اٹھا کر جابز کے اشتہار دیکھنا شروع کر دیے۔ اس کی نظر سب سے نیچے موجود اشتہار پر پڑی۔ یہ ڈرائیور کی نوکری کا اشتہار تھا۔ شرائط وغیرہ پڑھ کر اس نے قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا۔ پچھلے چند ماہ میں یہ پہلا موقع تھا جو اس نے ڈرائیور جیسی نوکری کے لیے سوچا تھا ورنہ وہ تو خواب میں خود کو کسی بڑے بنگلے کا افسر ہی دیکھتا تھا۔ اس نے ڈرائیونگ سیکھی تھی اور ڈرائیونگ لائسنس بھی تھا۔ دوسرے دن وہ دیے گئے ایڈریس پر پہنچ گیا۔ یہ بس اڈے کے پاس ہی ایک تیسرے درجے کا ہوٹل تھا جس کے مالک سے اس نے اشتہار میں دیے گئے شخص کے بارے میں پوچھا۔

”اشفاق صاحب کہاں ملیں گے؟“

”کیا کام ہے؟“ اس نے آنکھوں کے ذریعے بادشاہ کا ایکسرے کیا۔

”اشتہار دیکھا تھا ڈرائیور کی نوکری کے لیے۔“

”اچھا اچھا بیٹھو...... میں ہی اشفاق ہوں۔“ اس نے پاس پڑی کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ بیٹھ گیا۔ ”نام کیا ہے تمہارا؟ ڈرائیونگ لائسنس دکھاؤ اور اپنے متعلق بتاؤ کہاں سے ہو؟ اس سے پہلے کہیں نوکری کی یا نہیں؟“ ایک ہی سانس میں اشفاق نے کئی سوال پوچھ لیے اور پاس کھڑے چھوٹے کو چائے کا بھی کہہ دیا۔

”بادشاہ نام ہے میرا۔ اسی شہر سے ہوں اور کوئی تجربہ نہیں۔“ اس نے بیگ سے ڈرائیونگ لائسنس نکال کر دیا۔ اسے دیکھنے کے بعد اشفاق کے منہ سے بلند آواز میں ”ہم“ نکلا۔ اتنے میں چائے آگئی۔

"اچھا تو بادشاہ سلامت...... میں بھی کچھ بتا دوں۔ میں نے ایک ویگن خریدی ہے جو میں اڈے پر لگانا چاہتا ہوں، اس کی ڈرائیونگ کے لیے ویسے تو کسی ماہر بندے کی ضرورت ہے مگر میں تمہیں بھی نوکری دے سکتا ہوں۔ ایک ماہ۔ تک آزمالوں گا اگر کام کر سکے تو...... تنخواہ باقاعدہ نہیں بس ایک دن میں جتنے پھیرے تم نے یہاں سے صادق آباد کے لگا لیے، اس حساب سے تمہارا کمیشن بن جائے گا......"

اس نے مزید تفصیل بتائی۔ کام مشکل تھا مگر بادشاہ کے پاس کوئی دوسرا آپشن نہیں تھا۔ اس نے یہیں نوکری کا فیصلہ کر لیا۔ اگلے چند ماہ میں روٹین بن گئی۔ وہ سارا دن شہر سے صادق آباد اور صادق آباد سے سواریاں لے کر واپس شہر آتا۔ شام ہوتے ہی ہوٹل میں بیٹھ جاتا۔ یہاں طرح طرح کے لوگ تھے۔ نچلے درجے کے جرائم پیشہ، بسوں کے ڈرائیور، کنڈیکٹر اور انہی بسوں میں کھانے پینے کی چیزیں بیچنے والے 'چھوٹے' جو عمر میں واقعی۔۔ چھوٹے تھے لیکن ان کی باتیں سن کر بادشاہ حیران رہ جاتا...... وقت گزر رہا تھا اور ان سب کی صحبت بادشاہ پر اثر دکھا رہی تھی۔

☆☆☆

ٹائم بم کب اور کس نے ٹرین کی پٹڑی پر فکس کیا تھا، یہ معلوم نہ ہو سکا۔ اسد دن رات اس کیس پر کام کر رہا تھا۔ اس دن اگر وہ اس میسج کو مذاق سمجھ کر نظرانداز کر دیتا تو یقیناً کئی قیمتی جانیں ضائع ہو جاتیں۔ اس کے دماغ میں دو سوال گردش کر رہے تھے۔ نمبر ایک، ٹائم بم فکس کرنے کا مقصد کیا تھا؟ نمبر دو، اسے ہی کیوں اطلاع دی گئی؟ ان سوالات کا جواب ڈھونڈنے کے لیے اس نے کام شروع کر دیا۔ اس کی چھٹی حس خطرے کی گھنٹی بجا رہی تھی۔ سب سے پہلے اس نے وہ ویب سائٹ ٹریس کی جس کے ذریعے اس کے نمبر پر میسج آیا تھا۔ یہ عام سی ویب سائٹ تھی جو اپنے یوزر کو کسی بھی نمبر پر مفت میسج کرنے کی سہولت دیتی تھی۔ یہاں لاگ ان ہونے کے لیے ای میل کی ضرورت تھی نہ ہی موبائل نمبر کی۔ بس انٹرنیٹ کنکشن ہونا ضروری تھا۔ اس معاملے میں اسد نے سائبر کرائم یونٹ کی مدد حاصل کی اور اگلے چند دنوں میں ہی اس نے وہ نیٹ کیفے ڈھونڈ لیا جہاں سے انٹرنیٹ استعمال کر کے اسے میسج کیا گیا تھا۔ اس وقت کیفے کا مالک اس کے سامنے بیٹھا تھا جو پولیس انسپکٹر کو دیکھ کر کچھ پریشان نظر آ رہا تھا۔

"آپ کے پاس انٹرنیٹ استعمال کرنے والوں کا کوئی ریکارڈ ہوتا ہے؟" اسد نے سوالات کا آغاز کیا۔

"جی ہوتا ہے۔ ہم وقت کے حساب سے پیسے لیتے ہیں تو اندراج کرنا پڑتا ہے۔"

"او کے، مجھے آج سے چار دن پہلے صبح دس سے گیارہ بجے کے درمیان انٹرنیٹ استعمال کرنے والوں کی تفصیل درکار ہے۔" مالک نے اثبات میں سر ہلایا اور کمپیوٹر پر جھک گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھایا۔

"جی اس وقت دو افراد ہمارا انٹرنیٹ استعمال کر رہے تھے۔ ایک میرا بھائی تھا چھوٹا جو کہ آن لائن کچھ پیسے کمانے والی ویب سائٹ چلاتا ہے۔ دوسرا شخص کوئی شاہد خان تھا۔"

"اس کی کوئی اور تفصیل؟"

"کچھ خاص نہیں، بس نام ہی لکھا ہے اور یہ شخص پہلی بار آیا تھا یہاں...... اس کے علاوہ اس کا ریکارڈ میں کہیں نام نہیں۔" اسد کو مایوسی ہوئی۔ اس نے 'شاہد خان' کے حلیے کے متعلق پوچھا مگر وہ کچھ خاص نہ بتا سکا۔ واپس پولیس اسٹیشن پہنچ کر وہ بیٹھا ہی تھا کہ فاروق آ گیا۔

"سر جی آپ تو مشہور ہوتے جا رہے ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کے ہاتھ میں اخبار دکھائی دیا۔

"کیوں؟"

"آپ نے ٹرین کو جس طرح بم سے بچایا ہے اس کارنامے کی تفصیل اخبار میں لگی ہے۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا اخبار دکھایا۔ اسد کو حیرت ہوئی۔

"پر یار میڈیا تک بات کیسے پہنچی؟"

"یہ ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں سر جی۔"

"نہیں...... جتنی تفصیل یہاں لکھی گئی ہے اتنی تو کسی صورت نہیں معلوم ہو سکتی...... اور مجھ تک ٹائم بم والی اطلاع میسج کے ذریعے پہنچی تھی اس بات کا صرف تمہیں پتا تھا یا مجھے۔ ظاہر ہے ہم دونوں میں سے تو کوئی اخبار کے نمائندے تک نہیں پہنچا۔ اس کا مطلب ہے یہ خبر میسج بھیجنے والے نے اخبار تک پہنچائی ہے...... ذرا نمبر ملاؤ.... اخبار والوں کا۔" فاروق نے سر ہلاتے ہوئے اخبار پر دیا گیا رابطہ نمبر ملایا۔ اگلے پندرہ منٹ میں تصدیق ہو گئی۔ یہ پوری خبر اسی ویب سائٹ سے ایڈیٹر کے نمبر پر میسج کے ذریعے بھیجی گئی تھی جس سے اسد کو میسج ملا تھا۔

"اس نے ٹائم بم فکس کیا...... اور بیس منٹ پہلے مجھے اطلاع بھیجی...... پھر پوری بات کی تفصیل اخبار کو بھیج دی، مطلب وہ یہ چاہتا تھا کہ یہ خبر لوگوں میں بھی پھیلے۔ کیا مقصد ہے اس شخص کا؟"

"ایک ہی مقصد ہو سکتا ہے سر۔"

"کیا؟"

"خوف پھیلانا......" اور خوف واقعی پھیل رہا تھا۔

☆☆☆

زندگی خوشگوار ہو گئی تھی۔ وقار حسن کی نامکمل زندگی کو شہلا نے مکمل کر دیا۔ کب سے وہ تنہا گھوم رہا تھا، باپ کے بعد ماں نے کبھی اس کی کمی محسوس نہ ہونے دی مگر ماں کے بعد والدین کی کمی کوئی پوری نہ کر سکا۔ شہلا اس کے ماموں کی بیٹی تھی جو دوسرے شہر میں رہتے تھے۔ جب بھی وقار دوسرے شہر جاتا، اس کا زیادہ وقت شہلا کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ ان کی پسندیدگی کسی سے پوشیدہ نہ تھی اور نہ ہی کسی کو اس پر اعتراض تھا لیکن ماموں اور ممانی کی خواہش تھی کہ وقار پہلے کچھ بن جائے اور وقار نے پولیس فورس جوائن کر لی۔ یہ اس کا بچپن کا شوق تھا جو پورا ہوا۔ جس دن اسے پہلی تنخواہ ملی، اسی دن ماں نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ وقار کے آنسو کئی دن تک نہ رکے لیکن زندگی زیادہ دیر کسی کو خوش رکھ سکتی ہے نہ ہی دکھی۔ دو ماہ بعد وقار اور شہلا کی شادی ہو گئی۔ زندگی میں رنگ آ گیا۔ شادی کے پانچ ماہ بعد وقار کو پولیس کے اسپیشل یونٹ کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ اسے شہلا سے تین ماہ کے لیے دور ہونا پڑا۔ شہلا عام بیویوں کے برعکس اپنے شوہر کی خوشی میں خوش تھی اس لیے اس نے اعتراض نہ کیا۔ ٹریننگ سے واپس آنے کے دو ماہ بعد ہی ان کے خوشیوں بھرے گھر کو کسی کی نظر لگ گئی۔

کچھ دنوں سے وقار کو مسلسل بخار تھا۔ اس نے چیک اَپ کروایا اور باقاعدگی سے میڈیسن استعمال کی مگر کچھ فرق نہ پڑا۔ اس صبح جب وہ اٹھا تو اس کے منہ سے خون.... آ رہا تھا۔ وقار پریشان ہو گیا۔ اس نے ایک ڈاکٹر کے مشورے سے ٹیسٹ کروائے۔ اس دن جب وہ ٹیسٹ کا رزلٹ لے کر ڈاکٹر کے پاس گیا تو رپورٹس پڑھ کر ڈاکٹر شہریار کے چہرے پر پریشانی کی جھلک دکھائی دی۔

"وقار تمہارے ساتھ کوئی اور آیا ہے؟"

"نہیں، میری بیوی گھر پر ہی ہے، میں نے اسے ان رپورٹس کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔" اور پھر وہ گہری سانس لے کر بولا۔ "اگر کوئی پریشانی کی بات ہے تو مجھے بتا دیں۔ پولیس والا ہوں برداشت کرنے کا حوصلہ ہے مجھ میں......"

"وقار، تمہیں کینسر ہے۔ لاسٹ اسٹیج۔ بہت کم وقت ہے تمہارے پاس۔" اس نے دھماکا کیا۔ "میں حیران ہوں تمہیں اب تک پتا کیوں نہیں چلا۔" وقار کو لگا کمرے کی چھت اس پر آن گری ہے۔

"کک...... کتنے دن ہیں میرے پاس؟"

"تین سے چار ماہ، مستقل علاج کرواؤ تو کچھ مزید بڑھ سکتے ہیں آٹھ ماہ تک۔" اس لمحے شہلا کی صورت اس کی نظروں میں گھوم رہی تھی۔

"مگر یہ کیسے ہو گیا؟ میں نے کبھی کچھ ایسی غلط چیزیں استعمال نہیں کیں...... نہ مجھے چھوٹی سے چھوٹی بیماری لگی ہے کبھی......"

"یہی باتیں مجھے حیران کر رہی ہیں...... خدا کی مرضی کہہ سکتے ہیں۔" ڈاکٹر شہریار نے مایوسی سے سر ہلایا۔ وقار نے رپورٹس لیں اور گھر چلا آیا۔ اس نے شہلا سے یہ خبر چھپانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ تین دن مسلسل اس کے سوالات سے تنگ آ کر آخر ایک رات اس نے شہلا کو بتا دیا۔ وہ دیر تک روتی رہی۔

"ہم باہر چلے جاتے ہیں کسی اور ملک، وقار وہاں علاج ہو جائے گا کینسر کا۔"

"کروڑوں خرچ ہوتے ہیں...... اتنے پیسے کہاں سے لائیں گے؟"

"سب کچھ بیچ دیتے ہیں۔ تم سے زیادہ کچھ قیمتی نہیں۔" وہ روتے ہوئے اس سے لپٹ گئی۔ اگلے چند روز میں انہوں نے یورپ کے کئی ممالک میں کینسر کے علاج سے متعلق تفصیل اکٹھی کرنی شروع کر دی۔ انہیں کم سے کم پانچ کروڑ روپے کی ضرورت تھی اور اتنی بڑی رقم اکٹھی کرنا ان کے لیے تقریبا ناممکن تھا۔ وقار اب باقاعدگی سے مسجد جاتا اور اللہ سے دعائیں مانگتا۔ اس کی فیلڈ ایسی تھی کہ ہر لمحہ موت سے سامنا ہوتا مگر اب اسے اپنے مرنے کا وقت پتا تھا اور وہ شہلا کو تنہا چھوڑ کر مرنا نہیں چاہتا تھا۔

اس دن بھی جب وہ فجر کے وقت مسجد خالی ہو جانے کے بعد سجدے میں گر کر اللہ سے اپنی زندگی مانگ رہا تھا تو کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ یہ مسجد کے امام صاحب تھے اور علاقے کی مشہور شخصیت بھی۔ پاکستان کے علاوہ بیرونی ممالک میں بھی اکثر جاتے رہتے تھے لیکن بے انتہا سادہ طبیعت کے مالک تھے۔

"کیا بات ہے بیٹا، کچھ دنوں سے دیکھ رہا ہوں بہت پریشان دکھائی دیتے ہو؟" وقار ان کے نرم لہجے کے سامنے زیادہ دیر ٹھہر نہ سکا اور انہیں سب بتا دیا۔ پوری بات سننے کے بعد وہ مسکرائے اور بولے۔

"مرنا تو سب کو ہے۔ پولیس والے ہو اور اس بیماری

سے مر جاؤ گے تو کیا ہوا؟ ہر لمحہ گولیوں کا سامنا کرتے ہو کوئی گولی کسی وقت بھی مار سکتی ہے تمہیں، مگر کینسر کی موت اور گولی کی موت میں ایک فرق ضرور ہو گا۔" وقار نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ "گولی کی موت سے تم شہید ہو گے۔ مدتوں یاد رکھے جاؤ گے لیکن کینسر کی موت سے نہیں۔ اس لیے اپنے بچ جانے والے تین چار ماہ میں کچھ ایسا کرو کہ لوگ ہمیشہ تمہیں یاد رکھیں...... کچھ خاص بہت خاص، تمہاری بیوی باہر نکلے تو لوگ اسے کہیں، وہ ہے وقار حسن کی بیوہ جس نے فلاں کام کیا تھا اور ایسا آج تک کوئی نہیں کر سکا۔" ان کی باتیں وقار کے دل پر اثر کر رہی تھیں۔

"آؤ میرے ساتھ، تمہیں کچھ دکھاتا ہوں۔" وہ وقار کو لے کر مسجد کے ساتھ بنے مدرسے میں چلے گئے۔ یہاں ایک کمرے میں تین بچے بیٹھے تھے۔ ان تینوں کی عمر دس سے بارہ سال تھی۔

"یہ بھی مریض ہیں تمہاری طرح۔ ان کے پاس بھی چھ سات ماہ کا عرصہ ہے۔ تمہارے علاج کے لیے پانچ کروڑ کی ضرورت ہے ان کے علاج کے لیے سات سے آٹھ کروڑ۔ میں پیسے اکٹھے کر رہا ہوں لیکن پورے نہیں ہو رہے۔ ان بچوں نے اس زندگی میں ابھی کچھ نہیں دیکھا...... لیکن یہ اپنی بیماری سے لاعلم ہیں تو یہ پریشان بھی نہیں۔ اس لیے اگلے چند ماہ کینسر کو بھول جاؤ صرف کچھ کر دکھانے...... پر توجہ دو۔" وقار وہاں سے چلا تو اس کے دل میں جذبہ ابھر چکا تھا...... کچھ کر دکھانے کا۔

☆☆☆

بادشاہ کو زندگی کی دوڑ میں شامل ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ اس کی قسمت نے ایک بار پھر اسے چکر دیا۔ اس رات اسے صادق آباد سے واپسی میں دیر ہو گئی۔ وہ اکتوبر کی سرد رات تھی۔ کچھ دیر پہلے ہونے والی بارش اور ٹھنڈی ہوا نے موسم خوشگوار بنا دیا تھا۔ فرنٹ سیٹ پر اس کے ساتھ ایک لڑکی اور پانچ چھ سال کی عمر کا لڑکا بیٹھے تھے۔ نجانے کیوں وہ خوفزدہ دکھائی دیتے تھے۔ ویگن سنسان علاقے سے گزر رہی تھی جب اچانک ایک بائیک نے تیز رفتاری سے اسے کراس کیا اور سامنے آ کر رک گئی۔ بادشاہ نے دیکھا، اس کے ہاتھ میں ٹرپل ٹو تھی اور رخ فرنٹ سیٹ کی طرف تھا۔ اس نے جان بچانے کی فطری کوشش کی اور سر نیچے جھکا لیا۔ ایک پورا برسٹ اس کے ساتھ بیٹھی لڑکی اور بچے کو آ لگا۔ ان کے جسم سے بہنے والا خون سیٹ کو سرخ کر گیا۔ کام نمٹا کر موٹر سائیکل سوار آگے چل دیا مگر بادشاہ کی زندگی عذاب میں ڈال گیا۔ دہرے قتل کی اس واردات میں پولیس نے اسے بھی ملوث سمجھ لیا۔ وہ قتل تو خاندانی دشمنی کا نتیجہ تھا مگر بادشاہ کے ساتھ پولیس کا سلوک کس دشمنی کا نتیجہ تھا، یہ بادشاہ کو پتا نہ چل سکا۔ مسلسل چار دن اسے بے پناہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا...... مگر اعتراف نہ کروا سکے۔ وہ پانچواں دن تھا...... جب بادشاہ زندگی سے مایوس ہو کر زمین پر پڑا تھا۔ لباس کے نام پر چند چیتھڑے باقی تھے جو اس کے جسم کو ڈھانپنے میں ناکام نظر آ رہے تھے۔ باتوں کی آواز نے اسے سر اٹھانے پر مجبور کیا۔ اس نے سامنے دیکھا۔ حیرت کے سمندر نے اسے نگل لیا تھا۔ سامنے روبینہ آنٹی کھڑی تھی۔ اس کے ساتھ ایک سپاہی ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ روبینہ نے ایک نظر اسے دیکھا اور دوبارہ سپاہی سے باتوں میں مصروف ہو گئی۔ وہ اسے پکارنا چاہتا تھا مگر نجانے کیوں کچھ نہ بول سکا۔ ایک گھنٹے بعد جب اسے تھانے سے رہائی ملی تو وہ بے یقینی سے سب کے چہرے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک سادہ لباس میں وہ روبینہ آنٹی کی کار میں آ بیٹھا۔ اس نے طنزیہ نظروں سے بادشاہ کو دیکھا تھا۔ "دیکھ لیا دنیا کا حال، بے قصور تھے پھر بھی تشدد کا نشانہ بن رہے تھے۔ اتنا پڑھ کر بھی جاب ملی تو ڈرائیور کی...... ہم عمر میں تم سے بڑے ہیں۔ تجربہ زیادہ ہے ہمارا...... ہم سب اونچ نیچ جانتے ہیں۔ کہنا مان لیتا تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔"

"آپ یہاں تک کیسے پہنچیں؟" شرمندگی سے جھکے سر کے ساتھ، کافی دیر سے ذہن میں گردش کرنے والا سوال بادشاہ کی زبان پر آ گیا۔

"یہاں کا سب انسپکٹر آتا رہتا ہے ہمارے پاس۔ پہچانتا تھا تمہیں...... اسی نے خبر دی۔ کوئی انسپکٹر اسد ہے جس نے شک کیا ہے تم پر۔ قاتلوں میں سے ایک بندہ اکثر وہاں ہوتا تھا ہوٹل پر۔ اس نے تفتیش کی تو کڑی سے کڑی مل گئی اور تمہیں اٹھا لیا گیا۔ اب بھی نہیں چھوڑنے والا تھا...... کچھ اوپر سے سفارشیں کروائی ہیں۔ ایم پی اے صاحب نے تمہاری ضمانت دی ہے پھر جا کر بات بنی ہے۔" آنٹی روبینہ نے مزید تفصیل بتائی۔ "اب کیا کہتا ہے ہمارے پاس رہنا ہے یا پھر آوارہ گردی شروع کرنی ہے۔" اس نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

"میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں۔" یہ شکست کھائے ہوئے شخص کے الفاظ تھے جس نے اپنا طرز زندگی بدلنا چاہا تھا مگر ناکام رہا...... اور اس کی ناکامی کی وجہ صرف ایک شخص تھا...... "انسپکٹر اسد۔"

UrduBooks.pk

☆☆☆

اس بار ملنے والا میسج خطرناک تھا۔ اسد کے پسینے چھوٹ گئے۔ اس نے دوبارہ میسج پڑھا، لکھا تھا۔

''ٹھیک پندرہ منٹ بعد تمہارے باپ کا دوست، حسین شاہ قتل ہونے والا ہے۔ بچا سکتے ہو تو بچالو۔ یاد رکھنا صرف پندرہ منٹ۔'' اسد کے پاس حسین شاہ کا نمبر نہ تھا۔ اس نے تیزی سے اپنے باپ، ہارون احمد کا نمبر ملایا۔ بیل جاتی رہی مگر اس نے کال ریسیو نہ کی۔ وہ پولیس اسٹیشن سے نکل کر باہر بھاگا اور گاڑی میں بیٹھتے ہوئے ہارون احمد کے آفس کا نمبر ملایا۔ کال سیکریٹری نے ریسیو کی اور جواب دیا۔

''سر ایک میٹنگ میں مصروف ہیں پندرہ منٹ بعد کال کیجیے گا۔''

''میں اسد بات کررہا ہوں ابھی میری پاپا سے بات کرواؤ، جلدی۔'' وہ چیخا۔ گاڑی ہوا سے باتیں کررہی تھی۔

''اوکے سر، ویٹ آمنٹ پلیز۔'' سیکریٹری کی دوبارہ آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی کال کٹ گئی۔ شاید ہارون کی طرف سے ڈسٹرب نہ کرنے کی سختی سے ہدایت کی گئی تھی۔ اسد کے منہ سے سیکریٹری کے لیے بے شمار گالیاں نکل رہی تھیں۔ حسین شاہ کا آفس آدھے گھنٹے کے فاصلے پر تھا۔ اسد بے خبر تھا کہ وہ آفس میں ہیں یا نہیں۔ وہ تقریباً بیس منٹ میں وہاں پہنچ گیا مگر تب تک دیر ہوچکی تھی۔ نامعلوم شخص کی گولی حسین شاہ کی کھوپڑی میں سوراخ کرچکی تھی۔ پولیس پارٹی اسد کی آمد کے پندرہ منٹ بعد پہنچی۔ گولی سامنے والی عمارت کی چھت سے چلائی گئی تھی۔ فاصلہ دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ حسین شاہ کو اسنائپر کے ذریعے نشانہ بنایا گیا ہے۔ لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا کر اسد کرائم سین کے عملے کے ساتھ مصروف ہوگیا۔ شام کو جب وہ واپس پولیس اسٹیشن پہنچا تو اس کے چہرے پر الجھن کے تاثرات تھے۔ اس شخص کا مقصد ابھی تک اسد کی سمجھ میں نہیں آسکا تھا۔ ویب سائٹ ٹریس کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ سیکیورٹی کیمرے بھی قتل سے صرف ایک گھنٹا پہلے خراب کیے گئے تھے۔ وہ جو کوئی بھی تھا بہت چالاک تھا۔ میڈیا پر شور مچا ہوا تھا۔ افسران کی کال سن سن کر اس کا سر درد کرنے لگا۔ اس نے کام سمیٹا اور گھر چلا گیا۔ دوسری صبح ایک اور خبر اس کی منتظر تھی۔ قاتل نے اپنا کام کردکھایا تھا۔ اخبار کے پہلے صفحے پر الفاظ نمایاں تھے۔

''نامعلوم شخص کا ایک اور وار۔ پولیس کو پیشگی اطلاع دے کر ملک کے مشہور بزنس مین حسین شاہ کو قتل کردیا گیا۔'' خبر کی تفصیل میں ٹائم بم اور قتل کے...... واقعات کی تفصیل اور ان کا تعلق ثابت کیا گیا تھا۔ پولیس اسٹیشن کے سامنے میڈیا کے کئی نمائندے کھڑے تھے جو اسد سے بات کرنا چاہتے تھے مگر اسد نے انکار کردیا۔

''یہ لوگ اس کا کام آسان کررہے ہیں۔ میں جلد اس تک پہنچ جاؤں گا مگر جس طرح یہ میڈیا خوف پھیلا رہا ہے اب اس کو اپنا مشن مکمل کرنے میں آسانی رہے گی۔''

''مگر اس کا مشن ہے کیا سر؟'' فاروق نے اسد کی آنکھوں میں جھانکا جہاں الجھن دکھائی دیتی تھی۔

''یہ کوئی ایسا شخص ہے جو مجھے اچھی طرح جانتا ہے اور ابھی تک مجھ سے ایک قدم آگے ہے۔''

''کوئی نفسیاتی قاتل؟''

''نہیں، وہ اتنی پلاننگ سے قتل نہیں کرتے...... اگر نفسیاتی قاتل ہوتا تو اذیت دے کر مارتا، کوئی نہ کوئی نشان ضرور چھوڑتا۔ مجھے لگتا ہے ایک دو اور لوگوں کو مارنے کے بعد یہ اپنا مقصد سامنے لائے گا۔''

''اتنی دیر میں ہم کیا کرسکتے ہیں؟''

''انتظار۔''

''مزید لوگوں کے مرنے کا؟''

''ابھی شروعات ہے۔ پہلا وار...... پریشر برداشت کرو یہ ابھی ہمیں مزید الجھائے گا۔'' مگر دباؤ بڑھ رہا تھا۔ شام تک کئی ٹی وی چینل پر اسد اور قاتل کی خبریں گردش کرتی رہیں۔

☆☆☆

بادشاہ کی پرانی زندگی لوٹ آئی تھی۔ ایک بار پھر وہی روٹین اور وہی کام جس سے اسے نفرت تھی۔ آٹھ دس ماہ بنگلے پر کام کرنے کے بعد اسے محسوس ہوا کہ یہ کام جاری رکھا تو وہ نفسیاتی مریض بن جائے گا۔ اس نے ایک دن روبینہ آنٹی سے اجازت لی اور شمالی علاقوں میں گھومنے نکل گیا۔ اس نے ایک ماہ کا کہا تھا مگر اس کی واپسی دو ماہ بعد ہوئی......

آنٹی روبینہ نے پرانا بنگلا بیچ دیا تھا۔ نیا بنگلا ڈیفنس میں تھا اور پہلے کی نسبت شاندار تھا۔ بادشاہ نے پرانا کام سنبھال لیا۔ رفتہ رفتہ آنٹی روبینہ کا اس پر اعتماد بحال ہوگیا۔ اب وہ کئی گاہکوں سے اس کو متعارف کروا چکی تھی۔ بادشاہ کی دلی فرزانہ کی عمر ڈھل چکی تھی اس لیے وہ [illegible] اپنی زندگی کے آخری دن گزار رہی تھی......

اسے آئے دو دن ہوئے تھے جب اس کی ملاقات نور جہاں سے ہوئی۔ نور جہاں کی عمر اٹھارہ سال کی تھی اور

اسے بنگلے پر آئے ایک ماہ ہو گیا تھا مگر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ آنٹی روبینہ کسی بھی گاہک کو اس کی طرف نہیں بھیجتی تھی۔ وہ بنگلے پر موجود تمام لڑکیوں سے زیادہ خوبصورت تھی اور باتوں سے بھی پڑھی لکھی لگتی تھی۔ اس کا حسن دیکھ کر کوئی بھی اپنا دل اس کے قدموں میں رکھ سکتا تھا اور بادشاہ نے رکھ دیا تھا۔ بادشاہ نے پہلی نظر میں اسے پسند کر لیا اور کچھ وقت اس کے ساتھ گزارنے لگا۔ بنگلے کا باقی ماحول نور جہاں کو پسند نہ تھا۔ وہ بازاری نہ تھی۔ جانے آنٹی روبینہ اسے کہاں سے ڈھونڈ لائی تھی۔ چند ہی روز میں نور جہاں اور اس کی دوستی ہو گئی جو کہ آنٹی روبینہ کو پسند نہ آئی۔ ایک دن انہوں نے بادشاہ کو پاس بلا کر سرد لہجے میں کہا۔

”بادشاہ، ہمیں محسوس ہو رہا ہے تم نور جہاں سے کچھ زیادہ انبج ہو رہے ہو۔ یہ بات ٹھیک نہیں، اس لڑکی سے دور رہو۔“

”مگر وہ میری اچھی دوست ہے۔“

”اس اچھی دوست کی قیمت ادا کرنا تمہارے بس سے باہر ہے۔“

”کیا قیمت ہے؟“

”یہ بنگلا اس کے عاشق نے خرید کر دیا ہے، جانتے ہو اس کا عاشق کون ہے؟“ طنزیہ مسکراہٹ چہرے پر سجا کر اس نے بادشاہ کی طرف دیکھا۔

”نہیں، کون ہے؟“ بادشاہ نے پوچھا۔

”خان بابا۔“ اس نے انکشاف کیا۔ خان بابا کا نام سن وہ خاموش ہو گیا۔ خان بابا کا اصل نام جابر خان تھا اور وہ سرحدی علاقے کا رہنے والا تھا۔ وہ اسمگلر تھا مگر آج تک کوئی اسے پکڑ نہ سکا۔ وجہ تھی خان بابا کی دولت اور اس کی سیاسی دوستیاں۔ کئی سیاست داں اس کے علاقے میں سیر و تفریح اور شکار کے لیے جاتے تھے اور اس کی میزبانی سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ کہا جاتا تھا خان بابا ملک کا امیر ترین شخص ہے۔ بادشاہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ نور جہاں جیسی حسین لڑکی کے لیے وہ کتنی دولت خرچ کر سکتا ہے۔ ”پرانے بنگلے پر آیا تھا ایک بار، ہم نے نور جہاں کی جھلک دکھائی، دیوانہ ہو گیا۔ یہ بنگلا اس نے خرید کر دیا ہے۔ صرف پچاس لاکھ میں خریدا تھا ہم نے نور جہاں کو اور اب کروڑوں مل رہے ہیں...... اس لیے دور رہو اس سے۔ ہمیں لگتا ہے خان بابا اسے اپنی تیسری بیوی بنانا چاہتا ہے۔“

”کب؟“

”ابھی چند ماہ کے لیے یورپ کے کسی ملک گیا ہوا ہے۔ واپس آئے گا تو کرے گا شادی۔ نور جہاں کنواری ہے۔ ہم نہیں چاہتے اسے کوئی میلا کر دے۔“

”اگر چند ماہ میں، میں خان بابا جتنے پیسے دوں تو کیا نور جہاں مجھے مل جائے گی؟“ بادشاہ نے عجیب سوال پوچھا۔ روبینہ آنٹی کا قہقہہ گونجا۔

”پاگل ہو گیا ہے کیا؟ کہاں سے لائے گا اس بنگلے اور نور جہاں کی قیمت، کیا پھر کسی کی ویگن چلائے گا؟“ اس نے مذاق اڑایا۔

”میری بات کا جواب دیں۔“

”اول تو ایسا ممکن نہیں، اگر ہو بھی جائے تو ہم خان بابا کے ہاتھوں ضرور قتل ہو جائیں گے لیکن جا...... بادشاہ صرف تیری خاطر ہم اپنا اصول توڑتے ہیں۔ دو ماہ کا وقت ہے تیرے پاس، صرف سات کروڑ لے آ، اور نور جہاں کو لے جا۔“ عشق کا جنون سر پر سوار تھا۔ یہ سات کروڑ اس لمحے اسے سات روپوں کی طرح محسوس ہوئے۔

”اپنی زبان سے پھرنا مت آنٹی۔“ وہ یہ کہہ کر چلا گیا۔ اگلے چند دن بنگلے پر اپنی ’ڈیوٹی‘ دینے کے ساتھ ساتھ وہ روز اس پرانے ہوٹل میں جانے لگا جہاں وہ پہلے رہتا رہا تھا۔ یہاں اس کے کئی پرانے دوست تھے جو چھوٹے درجے کے جرائم میں ملوث تھے۔ اس نے ان سے ٹریننگ لینی شروع کر دی۔ وہ ذہین اور پڑھا لکھا تھا جبکہ اس کے دوست اپنے کام میں ماہر مگر ان پڑھ اور جدید طریقوں سے ناواقف تھے۔ وہ پلان بنا رہا تھا اور قسمت بھی اس کے لیے پلان تیار کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

”وقار یہ کیس ہم تمہارے اور محسن کے سپرد کر رہے ہیں۔ اسد کے کام میں دخل بھی نہیں دینا اور اپنا مشن بھی مکمل کرنا ہے۔“ یونٹ کے انچارج نے اسے اپنے کمرے میں بلا کر تفصیل بتائی۔

”کیس کیا ہے؟“

”وہی نامعلوم شخص جو پہلے بتاتا ہے اور پھر واردات کرتا ہے۔ اگر وقت پر ٹرین نہ روکی جاتی تو ٹائم بم سے اس کا اڑ جانا یقینی تھا اور اس کے بعد حسین شاہ کے قتل نے بھی خوف پھیلا دیا ہے۔ میں میڈیا کو خبریں پھیلانے سے روک رہا ہوں مگر سوشل میڈیا پر پابندی لگانا ممکن نہیں۔“

”لیکن سر جہاں تک میں جانتا ہوں، اسد محکمے کا بہترین آدمی ہے۔ میں اس کے ساتھ کام کر چکا ہوں اس کے باوجود ہمیں اس کیس کی تفتیش کے لیے کیوں بھیجا جا رہا

UrduBooks.pk

ہے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''بھیجنا ضروری ہے جوان، اسد کا کردار مشکوک ہو چکا ہے۔ دونوں واقعات کی اسے پہلے خبر کیسے ہو گئی؟ نامعلوم شخص اسے ہی کیوں میسج بھیجتا ہے؟'' انچارج خود اُلجھن میں تھا۔ وقار اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''تو کیا ہم اسد کو بھی تفتیش میں شامل کریں گے؟''

''براہِ راست نہیں مگر کرنا ضرور ہے۔ کوئی پوائنٹ نہیں چھوڑنا۔'' انچارج کے کمرے سے نکل کر وہ محسن کے پاس آیا۔

''ہاں بھئی۔ تیار ہے پھر؟''

''ہاں، ابھی ہم حسنین شاہ کے قتل سے شروع کریں گے کام۔ اگر کوئی سراغ ملا تو پھر آگے بڑھیں گے۔'' وقار سر ہلاتا ہوا اس کے ساتھ چل دیا۔ وہ دونوں سادہ لباس میں تھے مگر محکمے کی طرف سے ملنے والے کارڈز ان کی جیب میں تھے۔ ٹھیک آدھے گھنٹے بعد وہ اس کی عمارت کی چھت پر تھے جہاں سے حسنین شاہ کو نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس جگہ کا کافی دیر معائنہ کرنے کے بعد ان کے ہاتھ کچھ نہ لگا۔

''میرا خیال ہے ہمیں اس کا طریقہ سمجھنا چاہیے۔ وہ کس حساب سے لوگوں کو نشانہ بنا رہا ہے۔ اگر یہاں کوئی سراغ ہوتا تو اسد ضرور تلاش کر لیتا۔'' وقار نے خیال ظاہر کیا۔ محسن نے سوچتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''اب تک دونوں واقعات صبح دس سے گیارہ کے درمیان ہوئے ہیں اور دونوں بار طریقہ مختلف تھا۔ اس حساب سے ہم اس کا طریقہ نہیں سمجھ سکتے ہاں مگر دونوں بار اسد کو پیغام ملنا اُلجھن میں ڈال رہا ہے۔''

''ہم، چلو ابھی تو شروعات ہے۔'' محسن کو اس کا لہجہ عجیب لگا۔ شام ہونے سے پہلے وہ ضروری کام نمٹا کر گھر چلے گئے۔ وقار اپنے گھر میں داخل ہوا تو شہلا کہیں باہر گئی ہوئی تھی۔ ''چلو اچھا ہے۔'' وہ بڑبڑایا اور اسٹور روم کی طرف بڑھ گیا۔ یہاں چند ٹوٹی کرسیاں اور ایک پرانی الماری پڑی تھی۔ اس نے جیب سے چابی نکال کر الماری کا تالا کھولا۔ اس میں سے سیاہ رنگ کا بیگ اٹھایا اور کمرے کی لائٹ جلا کر اس میں موجود پیسے گننے لگا۔ یہ دس لاکھ کی رقم تھی۔ اس نے دو لاکھ نکالے اور باقی وہیں رکھ دیے۔ ان پیسوں کی اسے ضرورت تھی۔ بیگ کے اوپر نیلے رنگ میں نمایاں الفاظ میں لکھا تھا۔ ''سات کروڑ''۔ الماری میں اور بھی کافی چیزیں ایک ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں جن کی یہاں موجودگی کسی کے لیے بھی حیرت کا باعث بن سکتی تھی۔ وہ پوری الماری کا معائنہ کرنے کے بعد مسکرایا اور بڑبڑایا۔

''دو لاکھ کے بدلے بہت جلد یہاں کروڑوں آئیں گے۔'' باہر جاتے ہوئے وہ اپنے اندر جوش محسوس کر رہا تھا۔ کچھ کر دکھانے کے جذبے سے سرشار تھا۔

☆☆☆

''وقت صرف پندرہ منٹ، قتل ہونے والے کا نام ہارون احمد۔ ٹھیک سمجھے تم، اگلے پندرہ منٹ میں تمہارا باپ مرنے والا ہے۔ بچا سکتے ہو تو بچا لو اسد صاحب۔'' میسج اس کے ہوش اُڑانے کے لیے کافی تھا۔ آج وہ پولیس اسٹیشن نہیں گیا تھا۔ کافی دنوں کی تھکن دور کرنے کے لیے اس نے آرام کا فیصلہ کیا تھا اور اس وقت وہ اپنے کمرے میں ہی ناشتا کر رہا تھا جب اسے قاتل کا میسج ملا۔ اس نے تیزی سے باپ کا نمبر ملایا۔ خوش قسمتی سے انہوں نے پہلی بیل پر ہی کال اٹینڈ کر لی۔ اسد اپنے کمرے سے بھاگتا ہوا باہر نکل رہا تھا اور ساتھ ہی باپ کو ہدایت دے رہا تھا۔

''ڈیڈ اگلے پندرہ منٹ آفس سے باہر نہیں آنا۔ اپنے کمرے میں ہی رہنا، میں ابھی وہاں پہنچ رہا ہوں۔'' آفس گھر سے چالیس منٹ کے فاصلے پر تھا۔ ہارون احمد حیران ہوا۔

''کیا مسئلہ ہے اسد؟ کیا ہوا؟''

''وہاں پہنچ کر تفصیل بتاتا ہوں۔ آفس میں کسی کو داخل نہیں ہونے دینا۔ اپنی جگہ نہیں چھوڑنی۔''

''او کے، پر ہوا کیا ہے؟'' انہوں نے دوبارہ پوچھا۔

''آپ کی جان کو خطرہ ہے۔ پلیز اپنے پاس کوئی سیکیورٹی گارڈ بلا لیں جلدی۔'' ہارون احمد نے کال بند کر کے گیٹ سے سیکیورٹی گارڈ کو آفس میں بلا لیا۔ گھڑی کی سوئیاں بھاگ رہی تھیں۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد...... دوسرا دھماکا۔ ایک اور ٹائم بم ایک اور لاش۔ ہارون احمد کے ساتھ سیکیورٹی گارڈ بھی مارا گیا تھا۔ اسد باپ کے آفس میں داخل ہوا تو اس کے ٹکڑوں کے سوا کچھ نہ دیکھ سکا۔ پولیس، میڈیا اور ایمبولنس کی آوازیں اسے کہیں دور سے آتی سنائی دے رہی تھیں۔ اس نے اپنی ڈیوٹی کے دوران میں کئی ایسے مناظر دیکھے تھے مگر یہاں مرنے والا اس کا باپ تھا۔ ضبط کے باوجود آنسو ٹپک ہی پڑے۔

اگلے پانچ دن اسے کوئی ہوش نہ تھا۔ غم و غصے سے اس کا بُرا حال تھا۔ اس کا بڑا بھائی فاخر امریکا سے واپس آ گیا تھا اور اب باپ کا کاروبار سنبھالنے لگا تھا۔ چھٹے دن واپس ڈیوٹی پر آ کر اس نے کام شروع کر دیا۔ اب کی بار اس کی

فرض شناسی کے ساتھ جوش اور انتقام کی آگ بھی شامل ہو چکی تھی لیکن قاتل نے اس بار بھی کوئی نشان نہ چھوڑا تھا۔ ٹائم بم آفس بند ہو جانے کے بعد فکس کیا گیا تھا۔ آفس کا چوکیدار واش روم میں بندھا پڑا تھا۔ اس کے مطابق کسی نے رات کو اس کے سر پر وار کر کے بے ہوش کر دیا تھا۔ پوری بلڈنگ میں موجود سیکیورٹی کیمروں کی ریکارڈنگ اس بار بھی غائب ملی......

اس وقت اسد پولیس اسٹیشن میں بیٹھا سامنے پڑی کاپی پر کچھ لکھ رہا تھا۔ فاروق پاس کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

”اس نے ذہانت سے منصوبہ بنایا ہے۔ اسے معلوم تھا حسین شاہ کے قتل کے بعد میں ڈیڈ کو ان کے آفس سے نہیں نکلنے دوں گا۔ اس نے مجھے استعمال کیا۔ ٹائم بم فکس کرنے کے بعد میسیج کیا۔ ٹائم بم ٹیبل کے نیچے لگایا گیا تھا...... چوکیدار کو ایک رات پہلے ہی غائب کر دیا گیا۔ مجھے لگتا ہے وہ چاہتا ہے میں اُسے ڈھونڈوں۔ ہر واردات سے پہلے وہ مجھے اطلاع دیتا ہے...... مطلب کہیں نہ کہیں اس نے میرے لیے کوئی نشان چھوڑا ہے۔“

”سراغ کیا ہو سکتا ہے؟“

”کچھ بھی...... وقت کچھ منٹ کے وقفے سے تقریباً ایک ہی ہے۔ یہ دیکھو۔“ اس نے کاپی سامنے کی۔ ”ٹرین کے لیے فکس کیا گیا ٹائم بم دس بج کر اکیس منٹ پر بلاسٹ ہوا۔ حسین شاہ دس چوبیس اور ڈیڈ کا قتل دس بائیس پر ہوا، اس کی وجہ کیا ہے؟“ اس نے دونوں ہاتھوں سے کنپٹی کو مسلا۔

”کیا یہ ممکن ہے کہ اگلی واردات دس تیئیس پر ہو؟“

”نہیں، ان تمام واقعات کا مقصد صرف اور صرف خوف پھیلانا تھا اور ایک پولیس آفیسر کو پہلے اطلاع دے کر اس کے باپ کو قتل کر کے اس نے اپنا مقصد پورا کر لیا ہے...... یہ دیکھو۔“ اسد نے پاس پڑے چند دن پہلے کے اخبارات دکھائے۔ ”اس کے علاوہ سوشل میڈیا پر بھی خبریں آچکی ہیں۔ اب وہ اپنا مقصد سامنے لائے گا۔ یہی وہ واحد چانس ہے ہمارے پاس جس کی مدد سے ہم اُسے پکڑ سکتے ہیں۔“ وہ دونوں اپنے اپنے اندازے لگا رہے تھے اور آنے والا وقت اپنی منصوبہ بندی میں مصروف تھا......

☆☆☆

اس کے سامنے لسٹ موجود تھی۔ دس افراد کی لسٹ۔ یہ اس شہر کے امیر ترین لوگ تھے۔ ان کے کاروبار شہر میں ہی نہیں بلکہ پورے ملک میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں سے کچھ لوگ بیرونِ ملک تک اپنا بزنس پھیلا چکے تھے۔ اس نے اپنے ٹارگٹ چننا شروع کر دیے۔ چار پر نیلے رنگ کی پنسل سے اور چھ پر سرخ نشان لگانے کے بعد وہ مسکرایا۔ کام اس کے لیے آسان ہوتا جا رہا تھا۔ اس لسٹ میں آخری دو نام جن پر سرخ نشان لگا تھا، وہ حسین شاہ اور ہارون احمد کے تھے۔ کچھ سوچ کر اس نے ایک گیارھویں بندے کا نام بھی لسٹ میں شامل کر لیا۔ یہ بزنس مین نہ تھا مگر ملک کے امیر ترین لوگوں میں گنا جاتا تھا۔ گیارھویں نام پر اس نے گلابی رنگ کا نشان لگا دیا۔ یہ اس کا اپنا ایجاد کردہ نشان تھا جو نہ تو منفی کا تھا اور نہ مثبت کا۔ کچھ دیر تک اس لسٹ کے ساتھ اُلجھے رہنے کے بعد اس نے گہری سانس لی اور اٹھ کر الماری کی طرف آیا۔ یہاں چار سیل فون موجود تھے۔ اس نے بلیک کلر کا سیل فون چنا اور واٹس ایپ آن کی۔ لسٹ پر پہلے نمبر پر جس شخص کا نام تھا اس پر نیلا نشان لگا تھا۔ اس نے واٹس ایپ میں سے اس کا کنٹیکٹ نمبر نکالا اور ایک ویڈیو میسیج بھیج دی۔ اپنا کام مکمل کرنے کے بعد اس نے سیل فون واپس الماری میں رکھا اور گہری سانس لے کر کھڑا ہو گیا......

☆☆☆

اسد اس وقت مسعود اکبر کے بنگلے پر موجود تھا جو... اس کے سامنے بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔

”کیا بات ہے انکل، رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ اس وقت ایمرجنسی میں یہاں بلانے کا مقصد مجھے سمجھ نہیں آرہا۔“ مسعود اکبر سے گھر میں ہونے والی گیدرنگز میں مل چکا تھا۔ وہ ہارون احمد کا اچھا دوست اور شہر کے مشہور بزنس مین میں سے ایک تھا۔ اس وقت اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات تھے۔

”یہ دیکھو۔“ اس نے جیب سے موبائل نکالا اور وہ فولڈر اوپن کیا جس میں واٹس ایپ کے ذریعے آنے والی ویڈیوز محفوظ کی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک ویڈیو پلے کی۔ یہ ”اسپیکنگ کیٹ“ کی ایپ سے بنائی گئی ویڈیو تھی۔ اس ایپ میں جو بھی الفاظ ٹائپ کیے جاتے، کیٹ اسے بول کر ریکارڈ کرتی تھی۔ یہ لوگ تفریح کے لیے استعمال کرتے تھے مگر آج اس کے ذریعے ریکارڈ ہونے والا پیغام ہرگز تفریح کے لیے نہ تھا۔ اے سی کی ٹھنڈک بھی مسعود اکبر کے ماتھے کا پسینہ خشک نہ کر سکی۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر ماتھا خشک کیا اور تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

”یہ وہی ہے ناں جس نے تمہیں میسیج بھیجے تھے؟“

اسد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”اسپیکنگ کیٹ کے مطابق

مسعود اکبر کو اگلے چوبیس گھنٹوں میں دو کروڑ روپے کا بندوبست کرنا تھا ورنہ قاتل اسے بھی ہارون احمد اور حسین شاہ کے پاس بھیج دے گا۔ پیغام میں پیسے بھیجنے کا طریقہ بھی مکمل طور پر بتایا گیا تھا۔ اسے دو کروڑ کی رقم کو ایک پرانے اسکول بیگ میں ڈال کر خود شہر سے باہر جانے والی سڑک پر لے جانا تھا جہاں بلیک میلر اس سے پیسے وصول کر لیتا۔ بلیک میلر نے اسے وائس ایپ پر آن لائن رہنے کا کہا تھا۔

”جس نمبر سے ویڈیو ملی ہے، وہ بتائیں ذرا۔“ اسد کے کہنے پر اس نے وائس ایپ اوپن کی اور نمبر لکھوایا۔ یہاں ایک بار پھر اسد کو مایوسی ہوئی۔ نمبر کینیڈا کا شو ہو رہا تھا۔ مسعود اکبر خود بھی حیران نظر آیا۔

”یہ کیسے ممکن ہے اسد۔ کینیڈا کے نمبر پر وائس ایپ ہونے کا مطلب ہے وہ یا تو کینیڈا اُڑ چکا ہے یا پھر اپنے کسی دوست سے میسج کروا رہا ہے؟“

”یہ دونوں اندازے غلط ہیں۔ وہ ہماری توقع سے زیادہ چالاک ہے اور انٹرنیٹ کا استعمال خوب کر رہا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ اس نے حیرانی سے اسد کی طرف دیکھا۔

”انٹرنیٹ پر کئی ایسی ویب سائٹس موجود ہیں جو عارضی نمبر فراہم کرتی ہیں۔ عارضی نمبر سے وائس ایپ، فیس بک، ای میل اور ٹوئٹر وغیرہ جیسی ویب سائٹس جو کہ تصدیقی کوڈ مانگتی ہیں، کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔ مجھے بھی یہ کوئی ایسا نمبر لگ رہا ہے مزید تفصیل میں دوست سے معلوم کرتا ہوں۔“ اس نے آئی ٹی کے ماہر اپنے دوست کو کال کی اور نمبر لکھوا کر تصدیق کرنے کا کہا۔ کچھ ہی دیر میں تصدیق ہو گئی۔ اسد کا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ یہ ویب سائٹ سے حاصل کیا گیا عارضی نمبر تھا جو صرف پندرہ منٹ تک استعمال کیا گیا تھا۔ اس پر لوکیشن بھی کینیڈا ہی کی شو ہو رہی تھی۔

”آئی پی ایڈریس کا پتا لگایا جا سکتا ہے؟“ مسعود اکبر نے سوال کیا۔

”اتنے کم وقت میں تقریباً ناممکن ہے اور پکڑا بھی گیا تو یہ کوئی چوری شدہ موبائل ہی ہونا ہے۔“

”پھر کیا کیا جا سکتا ہے؟“

”بلیک میلر پیسے لینے تو آئے گا۔ وائس ایپ آن ہو گا آپ کا، مجھ سے رابطہ رہے گا اور ہم آپ کے ساتھ ہوں گے۔ میرے پاس پلان ہے۔ بچ کے نہیں جائے گا اس بار۔“ اسد نے مضبوط لہجے میں جواب دیا اور اسے سمجھانے لگا۔

☆☆☆

بادشاہ نے کمرا کرائے پر لے لیا تھا۔ یہ نچلے طبقے کے لوگوں کا محلہ تھا جہاں گندگی اور غلاظت کے ڈھیر تھے۔ پھٹے پرانے کپڑے پہنے، چہرے پر میل کے ساتھ مسکینیت سجائے گلیوں میں گھومتے بچے، دلچسپی سے بادشاہ کو دیکھا کرتے تھے۔ بادشاہ یہاں ہر ہفتے کی رات کو آیا کرتا اور اپنے دو دوستوں سے مل کر پیسے کمانے کے طریقے سوچا کرتا۔ بینک ڈکیتی سے لے کر اغوا برائے تاوان اور قتل تک وہ ہر قسم کے طریقے سوچ چکا تھا مگر ابھی تک سات کروڑ کی رقم صرف ایک دو ماہ میں اکٹھی کرنے کا کوئی طریقہ بھی اسے نہیں ملا تھا۔ نور جہاں کے خوابوں نے اسے ہر حد سے گزر جانے پر مجبور کیا ہوا تھا۔ اس شام منہ میں سگریٹ دبائے وہ تینوں ایک بار پھر منصوبہ بنا رہے تھے۔ اس کے باقی دو دوست نقاش اور سکندر بھی اسی کی طرح پڑھے لکھے تھے مگر کسی نہ کسی شارٹ کٹ کی تلاش میں تھے۔

”بینک لوٹنا اب تقریباً ناممکن ہے۔ سیکیورٹی بہت سخت ہے اور ہر جگہ سیکیورٹی کیمرے لگے ہوئے ہیں۔ میں شہر کے تمام بڑے بینکوں کی تفصیل اکٹھی کر چکا ہوں۔ یہ خودکشی کے مترادف ہے۔“ بادشاہ نے سگریٹ کے دھوئیں سے فضا کو آلودہ کیا۔

”تم بڑے بینکوں کی مین برانچ کو کیوں دیکھ رہے ہو۔ کوئی چھوٹی شاخ بھی دیکھ لو ان کی۔“ سکندر نے اعتراض کیا۔

”کیا فائدہ؟ ایک دو لاکھ ملیں گے وہ بھی جان خطرے میں ڈال کر۔ کرنا ہی ہے تو کچھ بڑا کریں گے۔“ اس نے بچ جانے والی سگریٹ کو پیروں کے نیچے مسلا۔

”دوسرا آپشن اغوا برائے تاوان ہے۔ یہ کام اب آسان ہے اس پر ہم کام کر سکتے ہیں۔ کل میں تفصیل لے کر آؤں گا۔ اب مجھے دیں اجازت...... چھوٹا سا کام ہے شہر میں۔“ نقاش کھڑا ہوا اور ہاتھ ہلا کر باہر چل دیا۔ اس کے جانے کے بعد سکندر نے گہری سانس لی۔

”ایک منصوبہ ہے۔ اگر کام کرنا چاہو تو؟“

”کیا؟“ اس کے پوچھنے پر سکندر نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک لسٹ باہر نکالی۔ یہ شہر کے دس امیر ترین افراد کی لسٹ تھی۔

”یہ دس افراد ایک نامعلوم قاتل کے نشانے پر ہیں۔“

"تو کیا ہم انہیں بچائیں گے۔" اس نے طنز کیا۔

"نہیں، ہم انہیں دھمکائیں گے۔ قتل وہ کر رہا ہے فائدہ ہم اٹھائیں گے۔" سکندر کے چہرے پر دبا دبا جوش تھا۔ "سوچو...... ان افراد کو نہیں پتا کہ یہ نشانے پر ہیں مگر قاتل نے کام کیا ہے۔ یہ دیکھو۔" لسٹ کے آخر پر حسین شاہ اور ہارون احمد کے نام پر کراس لگا ہوا تھا جبکہ ایک نام گلابی رنگ سے مٹایا گیا تھا جو اب واضح نہیں ہو رہا تھا۔ "حسین اس لسٹ میں دسویں نمبر پر تھا اور سب سے پہلے قتل ہوا۔ نویں پر ہارون تھا اور وہ مارا گیا۔ اب ہم باقی لوگوں کو قاتل کے نام پر بلیک میل کر کے پیسے کما سکتے ہیں۔" بادشاہ بات سمجھ گیا۔ اس نے جوش سے سکندر کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

"واہ شہزادے۔ یہ تو شاندار آئیڈیا دیا۔"

"بس کل سے کام شروع کرتے ہیں اس پر۔"

"کل سے کیوں؟ ابھی سے کیوں نہیں؟ خان بابا آنے والا ہے اور نورجہاں کو لے جائے گا وہ۔"

"صبر کر مجنوں کی اولاد۔ پکڑے گئے تو ان دونوں کی موت کا الزام بھی ہم پر لگے گا جنہیں ہم جانتے بھی نہیں۔"

"رسک لینا ہے تو ابھی لیتے ہیں۔" بادشاہ لالچ میں آگیا تھا۔

"چل تو کہتا ہے تو ٹھیک۔" سکندر نے اس کی بات مان لی۔ "تیرے پاس کوئی سم ہے جو تیرے نام پر نہ ہو؟"

"ہاں۔ ایک ہے۔" وہ اٹھ کر اندر گیا اور سم اٹھا لایا۔ سم موبائل میں لگا کر سکندر نے نمبر ملایا۔ دوسری کوشش میں اس نے کال ریسیو کرلی۔

☆☆☆

تاروں کی جھرمٹ میں چاند بھی دکھائی دے رہا تھا۔ یہ پہلی تاریخوں کا چاند تھا جس کی کمزور روشنی زمین پر پہنچ رہی تھی۔ اسد کار کی ڈکی میں سکڑ کر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے گھٹنے چھاتی سے لگے ہوئے تھے۔ موبائل اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ میسج کا انتظار کر رہا تھا۔ کار کی ڈرائیونگ مسعود اکبر کر رہا تھا۔ اس کار کے پیچھے ایک اور کار تھی جس میں سادہ لباس پہنے فاروق اور اس کے ساتھ پولیس والے تھے جبکہ مسعود کی گاڑی کے آگے بھی ایک کار میں پولیس والے موجود تھے۔ اسد کے جسم میں سنسنی دوڑ رہی تھی۔ مسعود اکبر کے ماتھے پر آج پھر پسینہ چمک رہا تھا۔ شہر سے تقریباً بیس کلومیٹر دور آکر اس نے اپنا موبائل چیک کیا۔ واٹس ایپ آن تھا مگر کوئی میسج شو نہ ہوا۔ دس منٹ مزید اسی رفتار سے گاڑی چلانے کے بعد وہ کچھ آگے آیا تھا جب بیل بجی۔ واٹس ایپ پر کال آرہی تھی۔ اس نے اٹینڈ کی۔

"مسعود اکبر میری بات غور سے سنو۔ تمہاری کار کی پچھلی سیٹ کے نیچے ریموٹ کنٹرول بم فکس ہے۔ اگر تم نے میری کوئی بات ماننے سے انکار کیا تو میں تمہاری گاڑی کو اڑا دوں گا۔ گاڑی فل اسپیڈ پر لے جاؤ۔ پیچھے موجود پولیس کی گاڑی کو چکما دو اور پندرہ کلومیٹر بعد کچی سڑک آئے گی، اس پر مڑ جانا اور چلتی گاڑی سے ہی بیگ نیچے پھینک دینا اور خود آگے نکل جانا۔ یاد رکھنا کوئی ہوشیاری دکھائی تو صرف ایک بٹن دبانا پڑے گا مجھے۔" لہجہ مشینی تھا۔ مسعود اکبر کے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ وہ بزنس مین تھا، اس قسم کے کاموں سے اس کا آج تک واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اس نے گاڑی کی اسپیڈ بڑھائی۔ یہ جدید ماڈل کی کار تھی...... چند منٹوں میں ہی پولیس کی کار پیچھے رہ گئی۔ مسعود اکبر کے موبائل پر اسد کے میسجز اور کالز آرہی تھیں مگر اس نے توجہ نہیں دی۔ اس کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ ریموٹ کنٹرول بم کا سن کر اس کا برا حال تھا۔ پندرہ کلومیٹر دور کچی سڑک موجود تھی۔ اس نے موڑ کاٹا اور گاڑی نیچے اتار لی۔ شیشہ کھول کر اس نے بیگ اٹھایا۔ ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھال کر دوسرے ہاتھ میں بیگ اٹھا کر نیچے پھینک دیا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ چند سیکنڈ ہی لگے ہوں گے۔ اس نے اسی رفتار سے بیس پچیس منٹ کار دوڑائی اور ایک آبادی کو کراس کر کے دوبارہ مین روڈ پر آگیا۔ وہ گاڑی روک کر نیچے اترا اور بھاگتا ہوا ڈکی کی جانب بڑھا۔ ڈکی میں موجود اسد کا جھٹکوں کی وجہ سے برا حال تھا۔ وہ چھلانگ لگا کر باہر آیا اور چیخ کر پوچھا۔

"یہ کیا کیا آپ نے؟"

"گاڑی میں بم ہے اسد۔ ریموٹ کنٹرول بم۔"

یہ کہہ کر وہ گاڑی سے دور بھاگنے لگا۔ اسد نے گہری سانس لی اور آگے بڑھ کر پوری گاڑی کی تلاشی لی۔ کچھ نہ ملا۔ اس کا دل چاہا مسعود اکبر کو گولی مار دے مگر اس نے خود پر قابو رکھا۔

کچھ دیر بعد فاروق اور باقی پولیس والے بھی پہنچ چکے تھے۔ انہیں خبر ہو چکی تھی کہ مسعود اکبر کے دو کروڑ لے کر بلیک میلر غائب ہو چکا ہے۔ اسی لمحے اسد کے موبائل پر میسج ٹیون بجی۔ اس نے موبائل نکال کر دیکھا۔ ایک بار پھر ویب سائٹ کے ذریعے میسج آیا ہوا تھا۔

"چند دن بعد اگلا قتل ہوگا۔ دس تیس پر...... یاد رکھو۔ دس تیس۔" قاتل اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔ پولیس اسٹیشن پہنچنے پر ایک اور خبر اس کی منتظر تھی۔ اس بار مشہور بزنس مین صفدر خان سے پیسوں کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ طریقہ

کارسن کر اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

"یہ اس کا طریقہ نہیں ہو سکتا جس نمبر سے کال موصول ہوئی ہے۔ وہ نمبر تلاش کرو۔" "لیکن سم کسی مری ہوئی عورت کے نام نکلی۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ "یاد رکھو دس تیئیس۔" اس کے دماغ میں میسج چکرانے لگا...... دس تیئیس......

☆☆☆

خان بابا ائرپورٹ سے سیدھا اپنی شہر والی کوٹھی میں گیا۔ اس کے ساتھ باڈی گارڈز کی ایک پوری فوج تھی۔ بڑی مونچھوں کا مالک خان بابا شکل و صورت سے کوئی وڈیرا لگتا تھا۔ وہ ایک ظالم اور بے رحم شخص تھا۔ اس کے پاس جرم کے راستے سے کمائی گئی بے حساب دولت تھی۔ اس کی دو بیویاں اور چار بیٹے تھے۔ آج کل نور جہاں اس کے حواسوں پر سوار تھی۔ اپنے کمرے میں آرام کرتے ہوئے وہ نور جہاں کے بارے میں سوچ رہا تھا جب اس کے موبائل پر بیل بجی۔ یہ اس کا پرسنل نمبر تھا جو بہت کم لوگوں کے پاس تھا۔ انجان نمبر دیکھ کر اس نے کال کاٹ دی مگر نامعلوم کالر بھی مستقل مزاج شخص تھا۔ اس نے تب تک کال کرنا جاری رکھا جب تک خان بابا نے اٹینڈ نہ کر لی۔

"کون منحوس مجھے اس وقت تنگ کر رہا ہے؟" دوسری طرف سے ہیلو سنتے ہی خان بابا غرایا۔

"اپنی بکواس بند کر اور میری بات غور سے سن۔" وہ چند لمحوں کے لیے ساکت رہ گیا۔ اس لہجے میں بات کرنے والوں کے ٹکڑے وہ اپنے کتوں کو کھلایا کرتا تھا۔

"تمہیں معلوم ہے تم کس سے بات کر رہے ہو؟"

"ہاں، ایک بدنام اسمگلر جو پیسے کے زور پر معزز ترین شخص بنا بیٹھا ہے...... اپنی بکواس بند کرے گا یا تیری......" آگے گالیوں کی بوچھاڑ تھی۔ اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ "اب سن۔ اگلے چوبیس گھنٹوں میں تین کروڑ روپے ایک بیگ میں ڈال کر گرین کالج کے گیٹ پر رکھ دینا۔ ورنہ کل رات ٹھیک دس بج کر تیئیس منٹ پر تجھے اڑا دوں گا۔"

وہ حیرت سے اپنے سیل فون کی اسکرین دیکھنے لگا جہاں کال ڈس کنیکٹ ہونے کا لکھا ہوا تھا۔ وہ باہر نکلا اور چیخا۔

"دلاور خان...... دلاور خان۔" دلاور خان بھاگتا ہوا آیا۔

"کیا ہوا خان بابا؟"

"کوئی خنزیر مجھے دھمکیاں دے مارنے کی۔ مجھ سے پیسے مانگ رہا ہے...... خان بابا، مانگے اس نے۔ یہ لے اس کا نمبر اور پکڑ کر سامنے لا اسے۔" اس نے دلاور کو نمبر لکھوایا۔ وہ "جی اچھا۔" کہتا ہوا باہر بھاگا۔ اگلے چند گھنٹوں میں اس نے سرتوڑ کوشش کی مگر نمبر کی لوکیشن یا اس کا مالک ڈھونڈنے میں ناکام رہا۔ وہ اس قسم کے کاموں کا ماہر تھا لیکن اگلی شام سات بجے خان بابا کے سامنے چہرے پر مایوسی لیے کھڑا ہو گیا۔

احتیاط

عورت سے ہرگز نہ الجھو، اگر وہ دکھی ہو، الم رسیدہ ہو، بہت زیادہ خوش ہو، ناراض ہو، بیمار ہو، توانا ہو، گھر میں ہو، بازار میں ہو یا سانس لے رہی ہو!

کیونکہ

ایسی خاتون سے بحث کر کے تم عمر بھر بھی نہیں جیت سکتے۔

"اس کا پتا نہیں چل سکا خان بابا۔ یہ سم غیر قانونی ہے تصدیق بھی نہیں ہوئی اس کی۔ لوکیشن بھی نہیں نکالی جا سکتی، اس نے پورا انتظام کیا ہوا ہے۔" جس قاتل کو پولیس اور اسپیشل یونٹ، کوئی بھی تلاش نہ کر سکا، اسے دلاور کیسے کر سکتا تھا۔ خان بابا کو اس رات نور جہاں سے ملنے آنٹی روبینہ کے بنگلے پر جانا تھا۔ اپنی بڑی سی جیپ لیے رات دس بجے وہ روانہ ہو گیا۔ دلاور نے قاتل کی وارننگ کے بارے میں یاد دلایا تو وہ چیخا۔ "میں ہیجڑا نہیں جو اس کتے کے ڈر سے چھپ کر بیٹھ جاؤں۔" دس بج کر بیس منٹ پر اس کی جیپ بنگلے کے اندر داخل ہوئی اور ٹھیک دس بج کر تیئیس منٹ پر اس نے جیپ سے باہر قدم رکھا۔ سیکنڈ بھاگ رہے تھے...... گھڑی کی سوئیاں تیئیس منٹ اور چالیس سیکنڈ شو کر رہی تھیں جب گولیوں کی ایک پوری بوچھاڑ خان بابا کے سینے پر آ لگی۔ آنٹی روبینہ کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ وہ اس کا استقبال کرنے کے لیے آ رہی تھی۔ کوئی چیخا۔

"وہ بنگلے کی چھت پر ہے۔" باڈی گارڈز کی چلائی گولیاں چھت سے ٹکرائیں مگر نامعلوم قاتل غائب ہو چکا تھا...... وہ گھوم کر بنگلے کے دوسری جانب آئے۔ یہاں کوئی نہ تھا۔

☆☆☆

اسد کا دماغ اُلجھا ہوا تھا۔ وہ جلدی گھر آ گیا اور آ کر کمرے میں لیٹ گیا۔ اس کی عادت تھی جب بھی پریشان ہوتا، ڈائری اٹھا کر کچھ نہ کچھ لکھنا شروع کر دیتا۔ اس نے اپنی ڈائری اٹھائی اور یونہی بے خیالی میں پرانے ورق الٹنے

لگا۔ اپنی لکھی اوٹ پٹانگ باتیں پڑھ کر اس کا دماغ کچھ فریش ہوا تو وہ قاتل کے میسج کے بارے میں سوچنے لگا۔ 'دس تیئس'۔ اسی لمحے ڈائری کے ایک صفحے پر تاریخ لکھی نظر آئی۔ تیئس اکتوبر...... ان دنوں اس کی پوسٹنگ شہر سے باہر صادق آباد کے ایک پولیس اسٹیشن میں ہوئی تھی۔ ڈائری پر لکھا تھا۔

''ڈیئر ڈائری...... آج میں اُلجھا ہوا ہوں۔ میرا دل کہتا ہے کہ ویگن کے ڈرائیور کا قاتلوں سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ تو پڑھا لکھا نوجوان لگتا ہے مگر کچھ باتیں اس کے خلاف جا رہی ہیں۔ میرے ماتحت کا بھی یہی کہنا ہے کہ ہو نہ ہو...... قاتلوں کا اس سے تعلق ضرور ہے۔ آج اسے دو دن ہو گئے ہیں ہماری تحویل میں، نجانے کون ہے اور کدھر سے آیا ہے۔'' وہ چونک گیا۔ اس کی نظروں کے سامنے بادشاہ کا چہرہ آ گیا...... دس تیئس...... یعنی دسواں مہینہ اور تیئس تاریخ۔ وہ اچھل پڑا۔ اسی لمحے اس کے سیل فون کی بیل بجی۔ یہ فاروق تھا جس نے خان بابا کے قتل کی اطلاع دی تھی۔

''اِسے بھول جاؤ۔ ایک نام بتا رہا ہوں۔ مشہور نام ہے اُسے تلاش کرو۔ روبینہ آنٹی، بدنام ہے۔ پیشہ ور لڑکیوں سے اپنے بنگلے میں کام کرواتی ہے۔''

''سر اسی کے بنگلے پر تو قتل ہوا ہے خان بابا کا۔'' اس کی بات سن کر وہ چونک گیا۔ کڑی سے کڑی مل رہی تھی۔

''ٹھیک ہے مجھے ایڈریس سینڈ کرو، میں بھی وہاں پہنچتا ہوں۔'' اسے مزید ہدایات دے کر وہ روبینہ آنٹی کے بنگلے کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر لاش کے معائنے کے بعد اس نے خان بابا کے اہم آدمی دلاور سے بات کی۔ دلاور کا بیان سن کر اس کا شک یقین میں بدل گیا۔ بادشاہ ہی اصل قاتل تھا۔ وہ تیز قدم اٹھاتا ہوا روبینہ کے کمرے کی طرف چل دیا۔ وہ کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی اور اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات تھے۔

''بادشاہ کہاں ہے؟'' اسد کا سوال سن کر اس نے حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''تمہیں بھی ہماری طرح اسی پر شک ہے؟''

''میری بات کا جواب دو۔ مجھے شک نہیں، یقین ہے۔'' اسد غرایا۔

''وہ تین دن سے یہاں نہیں۔ اس نے کمرا کرائے پر لیا ہوا ہے۔ ہمیں پتا نہیں بتایا مگر ہم نے معلوم کر لیا۔'' اس نے ایڈریس اسد کو بتا دیا۔ اسد پولیس پارٹی کو لے کر بادشاہ کے کمرے کی طرف روانہ ہو گیا۔

کمرے کے دروازے پر رک کر اس نے دستک دی۔ کوئی آواز نہ سنائی دی۔ اس نے فاروق کو اشارہ کیا...... اس نے پیچھے ہٹ کر دروازے کو دھکا دیا۔ دروازہ لاک نہیں تھا...... سامنے کا منظر دیکھ کر اسد کے کندھے جھک گئے۔ سامنے دو لاشیں پڑی تھیں...... اس نے بادشاہ کو پہچان لیا تھا جس کے دل کے مقام پر گولی کا زخم دکھائی دے رہا تھا......

☆☆☆

''اس کا اگلا نشانہ صفدر خان یا میاں ابراہیم ہوں گے۔'' فاروق نے اسد کے سامنے لسٹ رکھی۔

''کیسے اندازہ لگایا تم نے؟''

''میرا خیال ہے اس نے پلان بنا رکھا ہے۔ جس ترتیب سے وہ چل رہا ہے اس حساب سے وہ شہر کے دس امیر ترین افراد میں سے کچھ کو قتل اور باقیوں کو قتل کی دھمکی دے کر بلیک میل کرنا چاہتا ہے۔''

''ہم...... گڈ لیکن اس لسٹ میں بادشاہ، سکندر اور خان بابا کو کہاں فٹ کرو گے؟'' اسد نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یہ لوگ اس کی پلاننگ کا حصہ تھے۔ سکندر اور بادشاہ کو اس نے استعمال کیا ہے اور وہ بادشاہ کو جانتا تھا۔ اس نے اپنے پورے پلان میں اسے مجرم ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ خان بابا کا قتل بھی اسی وجہ سے کیا۔ ایک اور وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے۔'' فاروق نے ایک دوسری لسٹ جیب سے نکالی۔ یہاں باقاعدہ نشان لگے ہوئے تھے جہاں خان بابا کا نام گلابی رنگ سے مٹا ہوا تھا۔

''یہ کہاں سے ملی؟''

''سکندر کی جیب سے۔ اب تک یہی سراغ اہم ملا ہے اسی وجہ سے ہمیں اس کی پلاننگ کا کچھ اندازہ ہوا ہے۔ میرا خیال ہے سکندر اس کا دوست تھا جس سے کام نکالنے کے بعد اس نے اسے اور بادشاہ کو قتل کر دیا۔ یہ تو ثابت ہو چکا ہے کہ صفدر کو ان دو آدمیوں نے دھمکا کر ایک کروڑ مانگے تھے...... ایک نام گلابی نشان سے مٹا ہوا ہے۔ یہ خان بابا کا نام ہو سکتا ہے...... روبینہ آنٹی کے مطابق خان بابا کی پسند پر بادشاہ کی نظر تھی یعنی بادشاہ بھی پیسے کے ذریعے نور جہاں کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس طرح ہم سب کا پورا شک بادشاہ پر رہا...... اور اس نے اپنا کام کر دکھایا۔ بادشاہ اور سکندر کو مار کر اس نے خود تک پہنچنے کے سب نشان ختم کر دیے ہیں۔''

''ایک نشان ہے۔'' اسد مسکرایا۔

"کونسا؟"

"وہ کیسے جانتا تھا کہ بادشاہ کو اکیس، بائیس، تئیس اور چوبیس اکتوبر کو پولیس نے گرفتار کر کے تشدد کا نشانہ بنایا تھا؟...... دوسری بات...... ہم پوری پلاننگ سے مسعود اکبر کے ساتھ گئے تھے مگر وہ ہر بات جانتا تھا۔" فاروق نے سر کھجایا۔

"مطلب کوئی ہمارا قریبی ساتھی ہے۔"

"بالکل اور وہ ہر بات جانتا ہے...... ہر سیکنڈ کا پتا ہے اُسے۔"

"کون ہو سکتا ہے؟"

"ڈھونڈ لوں گا جلد، فی الحال میاں ابراہیم کو اعتماد میں لے کر اسے تفصیل بتا دو...... میں تب تک ڈھونڈتا ہوں اسے۔" اسد کھڑا ہوا۔ فاروق سر ہلاتا ہوا باہر نکل گیا......

☆☆☆

میاں ابراہیم کی کوٹھی کے آس پاس سادہ لباس میں تین پولیس والے ڈیوٹی دے رہے تھے۔ ٹیرس پر کھڑے ہو کر انہیں دیکھتے ہوئے اس نے اعتماد سے سر ہلایا۔ میاں ابراہیم کا زیادہ وقت امریکا میں گزرتا تھا کیونکہ اس کا تقریباً سارا کاروبار وہیں پہ تھا۔ اپنے ملک میں بدلتے حالات کو دیکھ کر وہ اب کاروبار اپنے ملک میں بھی پھیلا رہا تھا۔ دولت ان کی نسلوں میں سفر کرتی آئی تھی۔ وہ پیدائشی امیرزادے تھے۔ کافی کا کپ منہ سے لگائے وہ کچھ سوچنے میں مصروف تھا۔ بڑھتی عمر بالوں میں سفیدی لے آئی تھی۔ اسی وقت اس کے موبائل کی بیل بجی۔ اس نے کال اٹینڈ کی۔ دوسری جانب کوئی بھرائے ہوئے لہجے میں بول رہا تھا۔

"میاں ابراہیم، ای میل چیک کرو۔" اس کے ساتھ ہی کال بند ہو گئی۔ ان کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی۔ کپکپاتے ہاتھوں کے ساتھ اس نے ای میل اوپن کی۔ یہاں ایک ویڈیو موجود تھی۔ اس نے ڈاؤن لوڈ کر کے ویڈیو چلائی۔ اسپیکنگ کیٹ اپنا مطالبہ لیے حاضر تھی۔

"کل صبح گیارہ بجے پانچ کروڑ کی رقم ایک بیگ میں ڈال کر ریلوے اسٹیشن کی پٹڑی کے ساتھ بنی چھوٹی سڑک پر آجاؤ ورنہ کل کا سورج ڈوبتا ہوا نہیں دیکھ سکو گے۔ یاد رکھو...... یہ پولیس والا جس نے تمہیں تحفظ کا یقین دلوایا ہے، یہ اپنے باپ کو نہیں بچا سکا...... تمہیں کیا بچا پائے گا؟"

ابراہیم خود سے پہلے تمام لوگوں کا حال دیکھ چکا تھا۔ میڈیا پر قاتل کی خبریں دینے پر پابندی تھی مگر سوشل میڈیا اور کاروباری حلقوں میں اس کا خوف پھیلا ہوا تھا۔ اس نے خشک ہونٹوں کو زبان سے تر کیا اور رومال نکال کر پسینہ صاف کیا۔ پانچ کروڑ بہت بڑی رقم تھی مگر اس کی جان سے زیادہ قیمتی نہ تھی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے نامعلوم شخص کا مطالبہ ماننے کا فیصلہ کر لیا۔ اسی لمحے گیٹ پر اسد کی آمد ہوئی۔ کچھ دیر بعد دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

"انکل اس نے آپ سے رابطہ کیا؟" اسد نے پوچھا۔

"نہیں......" یک لفظی جواب سن کر اس نے میاں ابراہیم کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

0301-2454188

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں
35802552-35386783-35804200
ای میل: jdpgroup@holmail.com

"اس کی لسٹ میں اب آپ کا نمبر ہے۔ میرا خیال ہے آپ اس کے لیے بڑی مچھلی ہیں اس لیے وہ دیر کر رہا ہے۔" ابراہیم خاموش رہا۔ "جب بھی آپ سے رابطہ کرے مجھے اطلاع دیجیے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" اسد بغور ان کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اسے گڑبڑ کا احساس ہوا۔

"کتنے پیسے مانگے ہیں اس نے؟" اس نے سیدھا حملہ کیا۔ وہ گڑبڑا گیا۔

"نن نہیں تو......"

"انکل ہمارے پاس لاسٹ چانس ہے اُسے پکڑنے کا۔ وہ پیسے اکٹھے کر چکا ہے۔ اپنے ٹارگٹ کے نزدیک ہے وہ۔"

"چلے جاؤ اسد۔ مجھے اپنی جان پیاری ہے۔"

"سب کو ہوتی ہے۔ آپ اپنے بعد کی لسٹ دیکھیں ابھی کچھ لوگ باقی ہیں...... وہ پکڑا گیا تو سب کو سبق ملے گا ورنہ کل کو کوئی اور اٹھے گا اور ایک لسٹ بنا کر قتل کرنا شروع کر دے گا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں آپ کو کوئی کچھ بھی نہیں کر سکے گا۔"

"اپنے باپ کو تو بچا نہیں سکے تم۔ پتا بھی تھا وہ انہیں مارنے والا ہے۔" اسد کو جھٹکا لگا۔ اس کے دماغ میں آگ بھر گئی مگر اس نے خود پر قابو رکھا۔

"ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔" وہ اتنا کہہ کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

لسٹ مختصر ہوتی جا رہی تھی۔ ابھی تک اُسے صرف ایک شخص کو مارنے کا افسوس ہوا تھا۔ 'سکندر'۔ سکندر اس کا ساتھی تھا۔ پیسے کے لالچ میں اس کے ساتھ مل گیا تھا۔ بادشاہ کو مجرم ثابت کرنے کے لیے دونوں نے مل کر پلاننگ کی لیکن آخری لمحوں میں اسے احساس ہوا کہ وہ جب تک اکیلا تھا تب تک محفوظ تھا۔ اسد کسی بھی لمحے بادشاہ کے ساتھ سکندر تک پہنچ سکتا تھا۔ مرتے وقت سکندر کی آنکھوں میں جو حیرت تھی، وہ اب تک نہ بھلا پایا تھا۔ اس نے سر جھٹک کر لسٹ کی طرف توجہ دی۔ پہلی لسٹ کہیں گم ہو چکی تھی۔ یہ اب نئی لسٹ تھی جس میں گیارہویں نمبر پر موجود خان بابا کے نام پر بھی کراس لگ چکا تھا۔ میاں ابراہیم کے نام پر نیلا نشان تھا...... خطرہ بڑھ رہا تھا۔ اس نے ابراہیم پر اختتام کرنے کا فیصلہ کیا۔ پانچ کروڑ اور ٹارگٹ پورا......

☆☆☆

میاں ابراہیم کی سیاہ رنگ کی کار ریلوے اسٹیشن کی طرف سفر کر رہی تھی۔ نامعلوم شخص کی ہدایت کے مطابق اس کے ساتھ کوئی نہ تھا۔ وہ خود ہی ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ پانچ کروڑ جو اس نے کل ہی بینک سے حاصل کیے تھے، ایک بیگ میں فرنٹ سیٹ پر پڑے تھے۔ ریلوے اسٹیشن کے ساتھ چھوٹی سی سڑک ٹوٹی ہوئی تھی۔ وہ نارمل رفتار سے اس پر سفر کرنے لگا۔ تقریباً بیس کلومیٹر آگے آنے کے بعد اس کے فون کی بیل بجی۔ اس نے دیکھا۔ اسد کی کال آ رہی تھی۔

"یہ اُلّو کا پٹھا مجھے مروائے گا۔" اس نے جھنجلا کر سوچا اور کال کاٹ دی۔ پانچ منٹ بعد دوبارہ کال آئی۔ اس بار انجان نمبر تھا۔ اس نے کچھ سوچ کر کال اٹینڈ کی۔

"میاں ابراہیم...... اگلے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ کر گاڑی روک دینا۔ باقی بات وہیں ہو گی۔" وہ آواز پہچان گیا تھا۔ اس نے کال کاٹ کر گاڑی آگے بڑھا لی......

☆☆☆

"وقار حسن قاتل ہے۔" اسد نے دھماکا کیا۔ فاروق حیرت سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

"یہ کیسے ممکن ہے سر؟ وہ تو اسپیشل یونٹ میں ہے......"

"یہ وہی ہے...... میں نے تمہیں کہا تھا ناں یہ میرا قریبی ساتھی ہے۔ صادق آباد پولیس اسٹیشن میں یہی تھا جس نے بادشاہ پر شک کر کے اس پر تشدد کروایا تھا۔ اسلحے کا استعمال، ٹائم بم...... یہ صرف وہی حاصل کر سکتا ہے اور کوئی نہیں۔"

"مگر اس پولیس اسٹیشن میں اور بھی تو لوگ ہوں گے۔"

"ہاں یہ رہا اس کا ریکارڈ۔" اسد نے اس کے سامنے صادق آباد پولیس اسٹیشن کا ریکارڈ رکھا۔ "اس وقت یہ میرا ماتحت تھا بعد میں اسپیشل یونٹ میں منتخب ہو گیا اور اب یہ قاتل والا کیس وہ اور محسن دیکھ رہے ہیں۔ وہ ہماری ہر بات جانتا تھا۔ اس لیے اسے آسانی رہی۔ کل میری ملاقات ہوئی ہے محسن سے...... قاتل خود کو ڈھونڈ رہا ہے......"

"ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں۔ اُسے گرفتار کیسے کریں گے؟"

"رنگے ہاتھوں...... ابھی مجھے اطلاع ملی ہے...... میاں ابراہیم پیسے لے کر گھر سے اکیلا نکل چکا ہے۔ اس نے میری کال بھی اٹینڈ نہیں کی۔ چلو ریلوے اسٹیشن۔ جہاں سے کہانی شروع ہوئی تھی وہیں اختتام ہو گا۔" اسد کھڑا ہوا اور تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر چل دیا۔

☆☆☆

ریلوے اسٹیشن پر رش تھا۔ ٹرین آنے والی تھی۔

میاں ابراہیم نے گاڑی روکی اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس کے موبائل کی دوبارہ بیل بجی۔

"تین منٹ بعد ایک شخص تمہارے پاس آئے گا۔ اس کو بیگ پکڑا دینا۔" وہی مخصوص لہجہ...... میاں ابراہیم نے گہری سانس لے کر خود کو پُرسکون کرنے کی ناکام کوشش کی۔ تھوڑی دیر بعد ٹرین آگئی۔ ایک شور بچ گیا۔ تین منٹ اور کچھ سیکنڈ بعد ایک قلی اس کے پاس آیا۔

"لائیے صاحب۔" ابراہیم نے اسے ایک نظر دیکھا اور بیگ پکڑا دیا۔

☆☆☆

اسد راستے میں تھا جب اس کے نمبر پر کال آگئی۔

"سر میاں ابراہیم سے بیگ لے لیا ہے ایک قلی نے۔" ساتھ ہی کال کرنے والے نے قلی کا حلیہ تفصیل سے بتایا۔

"یہ وقار نہیں۔ انتظار کرو...... وہ جلد آئے گا۔" اسد نے ہدایات کی اور گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی۔ جیسے ہی وہ ریلوے اسٹیشن پر پہنچا۔ ٹرین چل پڑی۔ سادہ لباس میں پولیس اہلکار نے اسے اشارہ کیا۔ قلی ٹرین کے دروازے سے کسی کو پیسوں والا بیگ پکڑا رہا تھا۔ نامعلوم شخص اندر تھا۔ اس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اسد بھاگتا ہوا اس کی طرف بڑھا...... ٹرین رفتار پکڑ رہی تھی۔ اس نے ہدایات کی۔

"گاڑی ٹرین کے ساتھ دوڑاؤ...... میں اندر داخل ہوتا ہوں۔ فاروق اگلے اسٹیشن پر پہنچو۔" اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ وہ بھاگتا ہوا ٹرین میں داخل ہوا۔ وقار دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے دیوانگی سے اردگرد دیکھا۔ وہ لوگوں کو دھکیلتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا جب فاروق کی کال آئی......

"سر وہ ٹرین کی چھت پر ہے...... ہم اُسے نشانہ بنا سکتے ہیں۔"

"نہیں...... اُسے زندہ گرفتار کرنا ہے......" وہ چیخا اور مسافروں کو دھکیلتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ کچھ دیر بعد دروازے پر لٹک کر وہ چھت پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ذرا سی غلطی اسے موت کے منہ میں پہنچا سکتی تھی۔ اس نے کوشش کی اور گھسٹ کر اوپر چڑھ گیا۔ اوپر وقار موجود تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا...... اس کے ہاتھ میں پسٹل دکھائی دیا۔ وہ اسد کو ٹرین میں سوار ہوتا دیکھ چکا تھا۔

"آخر تم مجھ تک پہنچ ہی گئے......" اس نے پسٹل کا رخ اس کی طرف کیا۔

"کیوں کیا یہ سب وقار......" اس نے دکھ سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ حیرت انگیز طور پر اپنا توازن قائم کیے ہوا تھا جبکہ اسد چھت پر لیٹا ہوا تھا......

"میں نے سوچا مرتے مرتے کچھ نیا کر جاؤں...... یہ سارے پیسے میں بچوں کے علاج کے لیے دینے والا ہوں......" اس کی ہنسی میں دیوانگی محسوس ہو رہی تھی۔

"تو اتنے انسانوں کو مار کر...... یہ خونی کھیل کھیل کر نیکی کمانا چاہتے تھے؟"

"بس...... مرتے تو سب ہیں...... میں کچھ انوکھا کرنا چاہتا تھا، کینسر مجھے لگنے والا تھا...... زندگی کے یہ آخری چند ماہ میں نے اپنی مرضی سے جیے...... لوگ مجھے یاد رکھیں گے۔" اس نے انگلی کا دباؤ بڑھایا۔ گولی کسی بھی لمحے اسد کے جسم میں انگارے بھر سکتی تھی۔ اسد نے ہمت جمع کی۔ ہارون احمد کے جسم کے ٹکڑے اس کی نظروں کے سامنے آگئے۔ اس نے آخری کوشش کی...... جُوا کھیلا...... بجلی کی سی تیزی سے ہاتھ میں موجود ریوالور سیدھا کیا اور گولی چلا دی۔ وقار کے جسم کو جھٹکا لگا۔ وہ لڑکھڑایا۔ پسٹل اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اسد اٹھ کر اس کی طرف بھاگا۔ اچانک وقار جھکا۔ اس نے اسد کو دھکا دیا اسد ٹرین سے نیچے جا پڑا۔ اسے گرانے کے بعد وقار نے کمر سے لٹکائے ہوئے بیگ کی زپ کھول دی۔ اور گھسٹ کر آگے بڑھا۔ خون اس کے کپڑوں کو بھگو چکا تھا۔ اس کی ہمت تھی...... جو اس نے اتنا کام کیا...... وہ گھسٹتا ہوئے آگے بڑھتا رہا۔ ٹرین اسی رفتار سے بھاگ رہی تھی...... اور پھر...... وقار نے آخری سرے پر پہنچ کر ٹرین کے سامنے چھلانگ لگا دی...... نوٹ ہوا میں اُڑ رہے تھے...... اور ٹرین وقار کے جسم کے ٹکڑے کر رہی تھی۔

☆☆☆

فون کی گھنٹی بجی۔ شہلا نے فون اٹھایا۔ "ہیلو......"

"السلام علیکم...... میں نیوٹی لیبارٹری سے نازیہ بات کر رہی ہوں۔ دو ماہ پہلے یہاں سے وقار صاحب نے رپورٹس کروائی تھیں۔ ہم معذرت چاہتے ہیں، ان رپورٹس کا رزلٹ ایک اور وقار حسن کے ساتھ تبدیل ہو گیا تھا۔ اتفاق سے ہم نام اور ہم عمر ہونے کی وجہ سے یہ الجھن پیدا ہو گئی۔ آج وہ دوبارہ رپورٹس لینے آئے ہیں تو ہمیں معلوم ہوا۔ ہم اس غلطی پر شرمندہ ہیں اور وقار صاحب کی رپورٹس ہم نے آپ کے ایڈریس پر بھیج دی ہیں وہ کلیئر ہیں......" اس کے ساتھ ہی کال بند ہو گئی۔ شہلا حیرت سے موبائل کو دیکھ رہی تھی......

جرم کی آبیاری کے لیے حالات و واقعات ہی نہیں جہالت زدہ ماحول بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ مجبوری... ذہنی پسماندگی انسان سے وہ کام بھی کروالیتی ہے جسے سوچتے ہوئے بھی کراہت آنے لگے... کرۂ ارض پر ایسی ہزاروں قومیں بستی ہیں... جو اپنی گزراوقات کے لیے ہر وہ کام کرلیتی ہیں... جس کے بدلے میں ان کی شکم سیری ممکن ہوسکے... ایسے ہی ناخواندہ معاشرے سے جڑی تحریر جو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے...

ایک معصوم بچی کی گمشدگی کا معاملہ جس میں اپنے ہی خاندان کے لوگ ملوث تھے...!

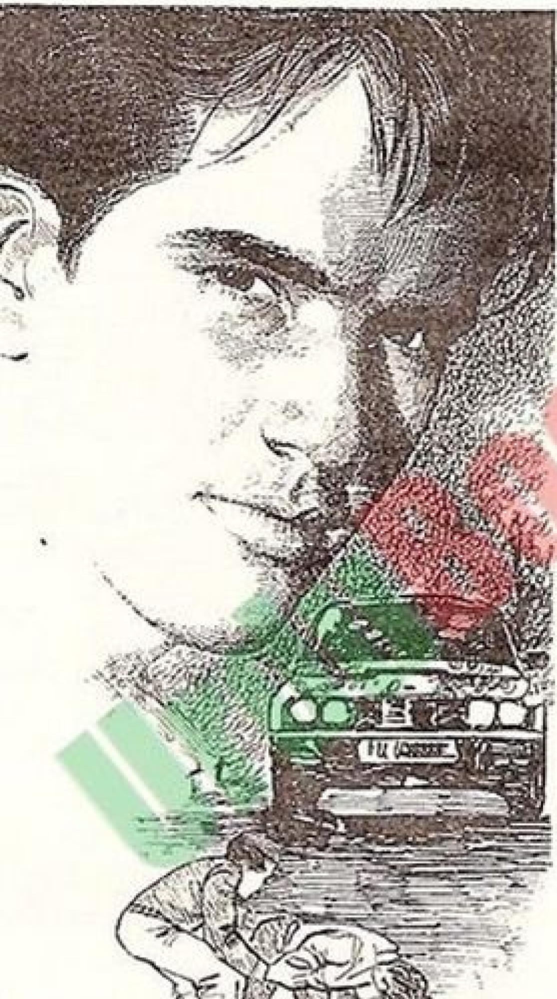

بردہ فروش

محسن ناظم

میں جانتا ہوں کہ ایکوڈور کے سارے باشندے میری طرح چھوٹی جسامت کے نہیں ہوتے۔ مثال کے طور پر کیونکا سو کلب کے گول کیپر کا قد چھ فٹ سے کچھ زیادہ ہی تھا لیکن اب تک میں جتنے بھی ایکوڈورین سے ملا؟ ان میں جولیو اور ویگا سب سے زیادہ کیم شحیم تھا۔ اس وقت وہ میرے سامنے رونی صورت بنائے بیٹھا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ دیر تک روتا رہا ہے۔

وہ میرے دفتر کے نیچے گراؤنڈ فلور پر روڈی کی

ورکشاپ میں ہیڈ مکینک کے طور پر کام کرتا تھا۔ اس کا قد چھ فٹ اور وزن دو سو پونڈ کے قریب تھا۔ وہ اچھے کھانوں، شراب اور عورتوں کا رسیا تھا۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ جولیو جیسے شخص میں عورتوں کو کیا کشش نظر آتی تھی لیکن وہ نہ صرف شادی شدہ بلکہ چھ یا سات بچوں کا باپ بھی تھا۔

''مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے ولسن۔'' اس نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔

''کیا مسئلہ ہے؟''

''میں ڈانیا کی بات کر رہا ہوں۔''

''وہ تمہاری بیوی یا کوئی گرل فرینڈ ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''میری پوتی۔''

''تمہاری پوتی؟'' مجھے یقین نہیں آیا۔ جولیو اور میں تقریباً ہم عمر تھے اور میں امریکا میں پندرہ برس گزارنے کے بعد حال ہی میں ایکوڈور واپس آیا تھا۔ لہٰذا مجھے اس حقیقت کو قبول کرنے میں کچھ دیر لگی کہ میرے آبائی شہر کیوٹا میں پینتیس سالہ شخص کا دادا بننا ایک عام بات ہے۔

''ہاں۔'' جولیو نے کہا۔ ''وہ لاپتا ہے۔'' اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ ''اسے اغوا کیا گیا ہے۔'' اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔

''کیا تم نے پولیس کو اطلاع دی؟''

جولیو نے ایک سرد آہ بھری اور دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کو درمیانی انگلی پر رگڑتے ہوئے پیسے نہ ہونے کا اشارہ کیا۔ میں جانتا تھا کہ اس کی مالی حالت کمزور ہے گو کہ روڈی اسے یہاں کے معیار کے مطابق معقول اُجرت دیتا تھا اور وہ خود بھی تیزی سے کام کر کے کچھ کمیشن حاصل کر لیتا تھا لیکن اسے شراب پینے کی عادت تھی پھر دو بیویوں اور چھ سات بچوں کا خرچ الگ۔ اس لیے اس کے پاس پولیس کو دینے کے لیے پیسے نہیں تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ وہ میری فیس کس طرح ادا کرے گا؟

''کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ یہ کام کس نے کیا ہوگا؟ ڈانیا کو کون لے گیا؟''

''میں جانتا ہوں کہ اسے کون لے گیا؟'' جولیو نے اپنے گھٹنے مضبوطی سے پکڑ لیے۔

''واقعی؟'' میں حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ''کون ہے وہ؟'' میں نے لکھنے کے لیے قلم اٹھایا۔

''میرا بیٹا۔''

''تمہارا بیٹا؟ یعنی لڑکی کا باپ؟'' یہ کہہ کر میں نے قلم واپس اپنی جگہ پر رکھ دیا۔

''ہاں۔'' جولیو کو اچانک ہی محسوس ہوا کہ یہ بتانا کتنا تکلیف دہ ہے۔ ''وہ چور اور منشیات کا عادی ہے۔ اس کی بیوی رینا تانے تنگ آ کر بیٹی یعنی میری پوتی کو ساتھ لیا اور اپنی ماں کے گھر چلی گئی لیکن کسی نہ کسی طرح میرا بیٹا منی اسے اغوا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔''

میں نے اس سے چند مزید تفصیلات حاصل کیں جو وہ دے سکتا تھا۔ اس بچی کی عمر صرف اٹھارہ ماہ تھی۔ جولیو نے مجھے اس کی جو تصویر دکھائی۔ اس میں ایک پیاری سی بادامی آنکھوں اور سیاہ بالوں والی لڑکی کیمرے کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ میں اسے بتانا چاہ رہا تھا کہ یہ کام میرے بس کا نہیں اور اس کے لیے میں کسی دوسرے باصلاحیت شخص کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں جو اس طرح کے کیس حل کرتا ہو لیکن میں ایسے کسی شخص کو نہیں جانتا تھا اور اگر میں اس کوشش میں کامیاب ہو جاتا تب بھی وہ پیسوں کے بغیر یہ کام نہ کرتا۔ یہ سب سوچ کر میں نے ایک فیصلہ کر لیا اور کھڑے ہوتے ہوئے پُرعزم لہجے میں کہا۔

''میں اسے تلاش کروں گا۔''

یہ سن کر وہ خوشی سے اچھل پڑا اور اس نے کھڑے ہو کر مجھے گلے لگا لیا جیسے میں نے مخالف ٹیم پر فیصلہ کن گول کر دیا ہو۔ جانے سے پہلے میں نے اس سے اس کے بیٹے منی کے بارے میں کچھ اور تفصیلات معلوم کر لیں۔ اس کی عمر اٹھارہ سال تھی اور اس نے شہر کے جنوب مغربی حصے میں واقع بافوس ڈسٹرکٹ کے ایک بدنام گروہ میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔

''اوہ۔'' جولیو نے پتلون کی جیب سے پلاسٹک کی چھوٹی تھیلی نکالی جو چھوٹے نوٹوں اور سکوں سے بھری ہوئی تھی۔ ان میں سے زیادہ تر پر گریس کے دھبے تھے۔ اس نے وہ تھیلی میرے ہاتھ پر رکھی اور خود واپس جانے کے لیے مڑا۔

''ایک منٹ۔'' میں نے اسے آواز دے کر روکا۔

''تم شاید اپنے بیٹے کے ٹھکانے سے واقف ہو اور میری نسبت زیادہ آسانی سے اس تک پہنچ سکتے ہو۔ پھر تم خود بافوس جا کر اسے تلاش کیوں نہیں کرتے؟ میری خدمات کیوں حاصل کر رہے ہو؟''

''مجھے نہیں معلوم کہ وہ آج کل کہاں ہوتا ہے۔ میری چھ ماہ سے اس سے بات نہیں ہوئی اور اگر وہ مل بھی گیا تو شاید میں اسے قتل کر دوں۔''

میں نے دفتر کو تالا لگایا اور بس میں بیٹھ کر چلکا بامبا کے لیے روانہ ہوگیا۔ یہ جگہ وسط شہر سے پانچ کلو میٹر کے فاصلے پر تھی اور دیکھنے میں یہ اس دنیا کا حصہ معلوم نہیں ہورہی تھی۔ مکانات سڑک سے فاصلے پر تھے اور درمیان میں چھوٹے کھیت تھے۔ کیچڑ میں لتھڑی ہوئی مرغیاں اور گلی کے آوارہ کتوں نے کچھ دور تک میرا تعاقب کیا اور پھر اپنی دلچسپی کی چیزوں کی تلاش میں لگ گئے۔

سورج غروب ہونے سے کچھ دیر قبل میں مٹی کی بیوی ریناتا کے گھر پہنچ گیا جو وہاں اپنے والدین کے ساتھ رہ رہی تھی۔ وہ گھر بھی اس علاقے کے دوسرے مکانوں کے مانند ایک ڈربا نما دو منزلہ مکان تھا جس کی پہلی منزل پر تازہ تازہ سفید رنگ کیا گیا تھا جبکہ دوسری منزل ابھی نامکمل تھی۔ اس کی دیواروں پر پلاستر اور کھڑکیوں میں شیشے لگنا باقی تھے۔

اس علاقے میں رہنے والوں کی اکثریت ترکھانوں پر مشتمل تھی جس شخص نے دروازہ کھولا وہ میرے اندازے کے مطابق ریناتا کا باپ تھا۔ اس کے کندھوں پر لکڑی کا بُرادہ دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ وہ بھی بڑھئی ہے۔ میں نے اپنا تعارف کروایا اور جولیو کا حوالہ دے کر اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔ اس نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا اور خود اپنی ورکشاپ میں چلا گیا۔

وہ ایک چھوٹا سا سجا ہوا گھر تھا جس میں ہلکا فرنیچر اور دیواروں پر تصاویر آویزاں تھیں۔ لیونگ روم کے کونے میں ایک خوب صورت الماری رکھی ہوئی تھی جو یقیناً اس کے باپ نے بنائی ہوگی۔ چولھے پر ایک بڑی سی دیگچی میں کھانا پک رہا تھا جس کی خوشبو اس کے خوش ذائقہ ہونے کا پتا دے رہی تھی لیکن اس تمام سلیقہ مندی اور گھرداری کے باوجود وہاں ایک طرح کی افسردگی چھائی ہوئی تھی۔

ریناتا اور اس کی ماں کچن ٹیبل پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ماں جینیٹ کافی خوب صورت تھی لیکن اس وقت اس کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی اور میرے حساب سے ابھی اس کی عمر نانی بننے کی نہیں تھی۔ اور ریناتا گو کہ اب وہ بھی ماں بن چکی تھی۔ اس کے سیاہ گھنے بال، بادامی آنکھیں اور اُبھرے ہوئے رخسار، وہ بالکل اپنی ماں پر گئی تھی۔

ابھی اس کی عمر اسکول جانے کی تھی۔ میں نے تصور میں اسے کندھے پر بیگ لٹکائے گھر سے اسکول جاتے اور لڑکوں کے پاس سے گزرتے ہوئے اپنی سہیلیوں سے سرگوشی کرتے دیکھا۔ ریناتا نے بتایا کہ وہ عنقریب سترہ سال کی ہونے والی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب وہ حاملہ ہوئی تو مٹی سولہ اور وہ خود چودہ سال کی تھی۔ جولیو نے اپنے بیٹے کو روڈی کی ورکشاپ میں صفائی اور پرزوں کو ترتیب سے رکھنے کے کام پر لگا دیا تھا لیکن مٹی کوئی ایسا کام کرنا چاہ رہا تھا جس میں بہت سارا پیسا ملے۔ اس نے مقامی ہائی اسکول کے طالب علموں میں کھانے پینے کی چیزیں فروخت کرنا شروع کردیں اور رفتہ رفتہ کوک، نشہ آور دواؤں یہاں تک کہ انہیں ہیروئن کا عادی بنا دیا اور وہ خود بھی اس لعنت کا شکار ہوگیا۔

’’میں نے ایک طویل عرصے تک اسے برداشت کیا۔ شاید اس سے بھی زیادہ جتنا مجھے کرنا چاہیے تھا۔‘‘ ریناتا کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس کی ماں اسے تسلی دینے کے لیے اٹھی لیکن واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔

’’میں اس سے محبت کرتی تھی۔‘‘ ریناتا نے آنسو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا پھر اس طرح میری طرف دیکھنے لگی جیسے میرے لیے کسی وجہ سے اس کی بات پر یقین کرنا ضروری ہو۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور وہ مطمئن نظر آنے لگی۔

جینیٹ نے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر باندھ لیے۔ اس کے چہرے سے ناراضی ظاہر ہورہی تھی۔ ریناتا نے اپنی ماں کی طرف دیکھا اور تلخی سے بولی۔ ’’میں جانتی ہوں کہ تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟‘‘

’’وہ شخص کبھی ہمارے مسائل سننے یہاں نہیں آیا۔‘‘ جینیٹ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’یہ بہت چھوٹی ہے اور کچھ نہیں سمجھتی۔‘‘

’’اس کی بات مت سنو۔‘‘ ریناتا چلّاتے ہوئے بولی۔ ’’میں اب بھی اس سے محبت کرتی ہوں۔‘‘

جینیٹ نے ایک گہری سانس خارج کی اور بولی۔ ’’تمہارے پاپا اور میں......‘‘ یہ کہتے کہتے وہ رک گئی اور اس طرف دیکھنے لگی جہاں سے مشینی آری چلنے کی آواز آرہی تھی۔

’’ہاں۔‘‘ اس نے طنزیہ انداز میں ماں کی طرف دیکھا اور بولی۔ ’’اور اس وقت تمہاری کیا عمر تھی جب کی گونیل پیدا ہوا تھا۔‘‘ میں نے اس کی بات سے اندازہ لگایا کہ کی گونیل اس کا سب سے بڑا بھائی تھا۔

’’تمہیں کچھ معلوم نہیں۔‘‘ جینیٹ نے ہاتھ ہلا کر اس کی تردید کی۔

ریناتا نے غصے میں آکر اسے بُرا بھلا کہنا شروع کر

دیا اور سسکیاں لینے لگی۔ اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔

جینیٹ نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا جیسے وہ اسے مارنا چاہ رہی ہو پھر آہستہ سے بولی۔ ”بہتر ہے کہ تم اسے بھول جاؤ۔“

”کیا؟ کیا کہا تم نے؟“

اب میرا مداخلت کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ مجھے اس کی کوئی پروا نہیں تھی اگر وہ ایک دوسرے کو مارنا شروع کر دیتیں لیکن اس سے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ باپ کے مرنے کے بعد میں نے اپنی ماں اور بہن کے ساتھ پرورش پائی۔ اس لیے میں ایسے مناظر سیکڑوں مرتبہ دیکھ چکا تھا اور جانتا تھا کہ ایسے موقع پر کیا کرنا ہوتا ہے۔ دونوں حریفوں کو ایک مشترکہ دشمن کے سامنے کھڑا کر دو اور اس وقت وہ دشمن میں تھا۔

”تمہیں اپنی ماں کی کچھ تو عزت کرنی چاہیے۔“ میں نے تیز لہجے میں کہا اور اس کا ردِعمل فوراً سامنے آ گیا۔ ریناٹا اپنی جگہ پر کھڑی ہو گئی اور جینیٹ اپنے اٹھے ہوئے ہاتھ کو اس طرح دیکھنے لگی جیسے وہ کسی اور کا ہاتھ ہو۔

”تم میری بیٹی سے اس طرح بات نہیں کر سکتے۔“ اس نے مجھے مطلع کیا۔ ”یہ تمہارا معاملہ نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”پھر ہمیں اپنے اصل مقصد کی طرف آنا چاہیے۔ کیا تم ڈانیا کو واپس لانا چاہتی ہو یا نہیں؟“

”بالکل۔“ جینیٹ بولی۔ ریناٹا نے بھی ہسٹریائی انداز میں تائید کرتے ہوئے سر ہلایا لیکن دونوں عورتوں کے چہرے مختلف کہانیاں سنا رہے تھے۔ ریناٹا کی آنکھوں سے خوف اور ناامیدی جھلک رہی تھی جبکہ جینیٹ کی آنکھوں میں سرد مہری اور خودغرضی نظر آ رہی تھی۔

”میں اس سے محبت کرتی تھی۔“ ریناٹا نے تیسری بار کہا۔ ”لیکن میں مزید اسے برداشت نہیں کر سکتی۔ میں اپنی بیٹی کی وجہ سے خوف زدہ تھی۔ اس لیے اسے لے کر یہاں آ گئی۔ شروع میں تو ایسا لگا جیسے وہ نہیں جانتا کہ ہم کہاں گئے ہیں لیکن ایک دن وہ یہاں پہنچ گیا۔ وہ اپنی بیٹی کو دیکھنا چاہ رہا تھا۔ شروع میں اس نے بڑی شرافت دکھائی لیکن پھر اس کا رویہ بدل گیا۔“

مٹی اور ریناٹا میں زوردار جھڑپ ہوئی اور تھوڑی دیر بعد وہ اپنی بیٹی کو ایک سلیٹی رنگ کی کار میں بٹھا کر لے گیا۔ ریناٹا کے خیال میں وہ پرانے ماڈل کی ہنڈائی تھی۔ اسے کاروں سے زیادہ واقفیت نہیں تھی البتہ اسے یہ معلوم تھا کہ جب وہ اس کے ساتھ رہ رہی تھی تو مٹی کے پاس یہ کار نہیں تھی۔

ریناٹا نے پولیس کو فون کیا۔ انہوں نے پہلے تو ہمدردی کا اظہار کیا لیکن بہت جلد وہ پولیس آفیسر اس کی آہ و زاری سے بیزار نظر آنے لگا۔ اس نے ریناٹا کی ماں سے پوچھا کہ کیا وہ دونوں شادی شدہ تھے تو اس نے نفی میں جواب دیا۔ البتہ پیدائش کے رجسٹر میں مٹی اوریگا کا نام بچی کے باپ کے طور پر درج تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ ان میں سے ایک پولیس والے نے کہا۔ ”ایک باپ ہونے کے ناتے اس کا بھی بیٹی پر ماں جتنا ہی حق ہے۔“

میں نے ان سے مٹی کی کوئی حالیہ تصویر مانگی لیکن ان کے پاس صرف ایک ہی اچھی تصویر تھی جس میں اس نے اسکول کی فٹ بال ٹیم کی وردی پہن رکھی تھی۔ ریناٹا اس کی تمام نئی تصویریں اپنے گھر میں ہی چھوڑ آئی تھی۔ اس تین سال پرانی تصویر میں اس کی شرمیلی مسکراہٹ، دانتوں میں بندھے ہوئے تار اور اطراف سے ترشے ہوئے چھوٹے بال نمایاں تھے۔

”اب تو اس میں کافی تبدیلی آ گئی ہوگی۔ کیا تم اس کی کوئی ایسی نشانی بتا سکتی ہو جس کے ذریعے میں اسے پہچان سکوں۔“

”وہ دبلا پتلا لیکن تھوڑا سا طویل قامت ہے۔“ ریناٹا نے کہا۔ ”اس نے اپنے بال چھوٹے کروا رکھے ہیں اور ہاں اس کے دائیں گال پر دو انچ کا گہرا زخم بھی ہے... گو کہ وہ بھر گیا ہے لیکن اس کا نشان موجود ہے۔“

میں نے اس سے پوچھا کہ کیا میں یہ تصویر لے سکتا ہوں تو جینیٹ نے وہ تصویر مجھے پکڑا دی لیکن میری طرف دیکھنا گوارا نہیں کیا۔ وہ کچھ ناراض لگ رہی تھی۔ میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن وہ تیزی سے اٹھ کر چولھے کے پاس چلی گئی اور ہانڈی میں چمچ چلانے لگی۔

میں پوساڈا موشیو، کے بغلی دروازے سے اندر داخل ہوا۔ میرے پاس اس عمارت کی دوسری منزل پر ایک کمرا تھا جو کبھی ایک دولت مند فیملی کا گھر رہ چکا تھا۔ میری اس کے مالک پال سے ایک میٹنگ کے دوران ملاقات ہوئی اور ہم ایک دوسرے سے امریکا میں قیام کے دوران اپنے تجربات بیان کرنے لگے۔ پال نارتھ جرسی میں مکانات بنا رہا تھا جبکہ میں سیئٹل میں ایک شیف کے طور پر بڑی تیزی سے کامیابی کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اسی تیزی سے میرا زوال بھی ہوا۔

پال اور اس کی بیوی نے اندرونِ شہر کے کاروباری مردوں اور عورتوں کو ناشتا اور دوپہر کا کھانا فراہم کرنے کی غرض سے ایک چھوٹا سا ہوٹل کھول رکھا تھا لیکن وہ ایک ایسا ہوٹل کھولنے کا خواب دیکھ رہا تھا جس میں قیام و طعام کی سہولت موجود ہو اس لیے وہ اپنے کام سے فارغ ہونے کے بعد باقی وقت عمارت کی مرمت، صفائی اور رنگ و روغن میں گزار دیتا تاکہ وہ اپنی اصلی حالت میں واپس آسکے۔ اس نے مجھے رہنے کے لیے ایک چھوٹا کمرا دے دیا تھا اور اس کے عوض میں رات کے وقت اس جگہ کی حفاظت کرتا۔

جب میں گھر آیا تو یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ اس وقت وہ کوئی کام نہیں کر رہا تھا۔ میں نے فرض کر لیا کہ وہ کسی میٹنگ میں گیا ہوگا۔ میں اس چھوٹی بچی کے بارے میں پریشان تھا جس کو تلاش کرنے کی ذمے داری مجھ پر آگئی تھی۔ میں اپنے آپ کو اس کام کے لائق اور مشکل صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تیار نہیں سمجھ رہا تھا۔ میں نے اس وقت کو کوسا جب پندرہ سال کی عمر میں پرائیویٹ سراغ رساں بننے کا خواب دیکھا تھا۔

میں نے اس احساس کو ذہن سے جھٹک کر اپنا سیل فون نکالا۔ میں تصدیق کرنا چاہ رہا تھا کہ پولیس والوں نے جو کچھ رینا تا اور اس کی ماں سے کہا وہ کس حد تک درست ہے۔

”آرتھر مورینو۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔ وہ پچھتر سالہ وکیل ڈاکٹر مورینو تھا جس کے لیے میں کبھی کبھار چھوٹے موٹے کام کر دیا کرتا تھا۔

”ڈاکٹر مورینو، میں ولسن بول رہا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے اس وقت تمہیں پریشان کیا۔“

”کوئی بات نہیں۔“ اس نے پُرسکون لہجے میں کہا حالانکہ دس بج چکے تھے اور میرے خیال میں اس وقت وہ شراب نوشی سے شغل کر رہا ہوگا۔

”میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔“ میں نے دبی زبان سے کہا۔ ”میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ۔“ یہ کہہ کر میں نے جلدی سے وہ سب کچھ بتا دیا جو پولیس والوں نے رینا تا اور جینیٹ سے کہا تھا۔

اسی تیزی سے مورینو نے بھی میرے شبہے کی تصدیق کر دی اور کہا کہ مِنّی کو بھی بچی پر اتنا ہی حق حاصل ہے جتنا کہ رینا تا کو۔

”لیکن اگر وہ باپ کی ذمے داری پوری کرنے کے قابل نہ ہو؟ مثال کے طور پر وہ نشہ کرتا ہو؟“

”ایسی صورت میں ماں عدالت میں اس کے خلاف درخواست دے سکتی ہے۔“

”لیکن اس کے پاس مقدمہ کرنے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔“

”یہاں ایسی کئی تنظیمیں ہیں جو اس کی مدد کر سکتی ہیں۔ اس وقت میں گھر پر ہوں۔ تم مجھے کل فون کرنا تاکہ میں تمہیں کچھ فون نمبر دے سکوں۔“

”شکریہ۔“

کتابوں میں پڑھا ہے کہ جس دن آپ ڈرنک نہ کریں وہ ایک اچھا دن ہوتا ہے گو کہ اس روز میں نے شراب نہیں پی تھی لیکن وہ میری زندگی کی بدترین راتوں میں سے ایک تھی۔ میں اس صدیوں پرانی عمارت میں تنہا اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا اور طرح طرح کے خیالات مجھے پریشان کر رہے تھے۔ میں نے اس رات شراب نہیں پی لیکن ٹھیک طرح سے سو بھی نہیں سکا۔

پال اور اس کی بیوی نے صبح سویرے ہی پکانا شروع کر دیا تھا۔ مجھے سوئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ برتنوں کے کھڑکھڑانے اور چھپتے توے پر ناشتے کی خوشبو سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں جانتا تھا کہ مِنّی جیسے لوگ علی الصباح بیدار نہیں ہوتے۔ اس لیے میں بھی دوبارہ سو گیا اور پھر میری آنکھ گیارہ بجے کے قریب کھلی۔

میں نے ناشتے میں انڈے اور کافی کے دو کپ لیے اور بانوس کے لیے روانہ ہو گیا۔

جولیو اور رینا تا، دونوں نے ہی بتایا تھا کہ مِنّی بُرے لوگوں کی صحبت میں رہتا ہے۔ میں نے امریکا جانے سے پہلے کسی ایسے گروہ کے بارے میں نہیں سنا تھا۔ لگتا تھا کہ بُرے لوگوں کی اصطلاح بھی منشیات فروشوں کے لیے استعمال کی جا رہی تھی۔ یقیناً مِنّی بھی اپنی نوعمری کے زمانے میں ایسا نہیں ہوگا اور اس نے حال ہی میں بُرے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا شروع کیا ہوگا۔

مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میرے بچپن میں بانوس کی شہرت ایک پارٹی ٹاؤن کی تھی گو کہ میرا نہیں خیال کہ میں نے وہاں کسی پارٹی میں شرکت کی ہو۔ میں نے بس میں بیٹھے بیٹھے ان لوگوں کے فون نمبر تلاش کرنا شروع کر دیے جن کے بارے میں جانتا تھا کہ وہ یہاں کی پارٹیوں میں شرکت کر چکے ہیں۔ ان سے فون کر کے معلوم کیا جا سکتا تھا کہ کیا اب بھی ان کا اس ٹاؤن سے کوئی تعلق ہے اور کیا وہ جانتے ہیں کہ مِنّی اور اس کے بُرے ساتھی کہاں ملتے ہیں۔

UrduBooks.pk

میں قصبے کے مرکز میں اُترنے والا واحد مسافر تھا۔ ابھی میں نے بمشکل زمین پر قدم رکھا تھا کہ ڈرائیور نے بس چلا دی اور مجھے سیاہ دھوئیں کے بادل .... تلے چھوڑ کر چلا گیا۔ یہ بتانا مشکل تھا کہ سڑک کہاں ختم ہوئی اور سینٹرل پلازہ کہاں سے شروع ہوا۔ وہ تقریباً تیس مربع میٹر کا پختہ قطعہ زمین تھا جس پر کیتھولک چرچ کے جڑواں مینار نمایاں نظر آرہے تھے۔ تین سمتوں میں یہ میدان وادی کی طرف جبکہ جنوب میں ایک پہاڑی سر اٹھائے کھڑی ہوئی تھی۔

وہاں سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ایک مدہوش شخص گرجا کی سیڑھیوں کے سامنے دونوں بازو پھیلائے لیٹا ہوا ہے۔ بچپن میں ہم ایسے لوگوں کو ٹھوکریں مارتے یا انہیں چھڑی کی نوک چبھوتے، اس کے نتیجے میں وہ اٹھ کر بیٹھ جاتے یا چلانا شروع کر دیتے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہا جب میرے ایک دوست نے ایسے ہی ایک شخص کو بار بار چھڑی چبھوئی لیکن اس نے کوئی حرکت نہیں کی اور ہم ڈر کر وہاں سے بھاگ گئے۔

میں نے اس شرابی اور گرجا دونوں پر ایک سرسری نظر ڈالی اور اس سڑک پر پہنچ گیا جس کی مجھے تلاش تھی۔ مکانات اور چھوٹی تجارتی عمارتیں سڑک کی مشرقی جانب واقع تھیں اور ان عمارتوں کے درمیان خاصی جگہ نظر آرہی تھی۔ کچھ فاصلے پر کھیت اور چراگاہیں موجود تھیں۔

سڑک کے مغرب میں دو اور تین منزلہ عمارتیں تھیں۔ میں چند نائٹ کلبوں کے سامنے سے گزرا۔ سورج بادلوں سے نکل آیا تھا اور اس کی روشنی عمارتوں کی چمکدار سطح کو منور کر رہی تھی۔ مجھے جو راستہ بتایا گیا تھا۔ اس پر چلتے ہوئے میں ایک تنگ گلی سے گزرتا ہوا ایک چوڑی سڑک پر آ گیا۔ میں عمارتوں کے سامنے سے گزرتا چلا گیا۔ اس سڑک پر بار پہلے سے کھلے ہوئے تھے۔ آگے چل کر ایک چوراہے پر کئی سائن بورڈ لگے ہوئے تھے جن پر کئی معدنی چشموں اور گرم پانی کے تالاب کے نام درج تھے جن کے لیے یہ قصبہ مشہور تھا۔

میرے دوست جیم اور میگا نے میرے لیے جگہ کی نشاندہی کر دی تھی۔ میں اس سے آخری بار اس وقت ملا جب وہ نوعمر تھا۔ آگے چل کر اس نے خوب قد کاٹھ نکالا اور ایک متاثر کن مضبوط جسم کا مالک بن گیا۔ جب اس نے مجھے اس علاقے میں محتاط رہنے کے لیے کہا تو میں نے محسوس کیا کہ مجھے اس کی بات سننی چاہیے۔

لہٰذا میں اس وقت پوری طرح چوکنا تھا جب ایک

نادیدہ محبت

چار شادی شدہ سہیلیاں گپ شپ کر رہی تھیں۔ اچانک ایک نے تجویز پیش کی کہ وہ چاروں موبائل فون پر اپنے اپنے شوہروں کو محبت بھرا پیغام بھیجیں اور دیکھیں کہ کیا جواب آتا ہے۔ چاروں نے لکھا: ڈارلنگ! مجھے تم سے بہت پیار ہے۔

ایک کے شوہر کا فوری جواب آیا۔ ’’خیریت تو ہے... کہیں تم نے کوئی خطرناک ایکسیڈنٹ تو نہیں کر دیا؟‘‘

دوسرے نے لکھا: ’’سیدھی بات کیا کرو... یہ بتاؤ کہ تمہیں کتنے پیسوں کی ضرورت ہے؟‘‘

تیسرا جواب آیا: ’’اب کیا کر دیا تم نے... اس بار میں تمہیں معاف نہیں کروں گا۔‘‘

چوتھے نے اپنی بیوی کا نمبر SAVE نہیں کیا ہوا تھا۔ وہ تجویز دینے والی کا شوہر تھا۔ اس نے لکھا۔ ’’ڈارلنگ! میں بھی آپ کو دل و جان سے چاہتا ہوں لیکن آپ نے اپنا پیارا سا نام نہیں لکھا۔ کون ہیں آپ اور کہاں رہتی ہیں؟‘‘

* * *

اشتہاری

اسکول کے بچوں کو ایک مطالعاتی دورے پر پولیس ہیڈ کوارٹر لے جایا گیا جہاں نوٹس بورڈ پر بہت سے اشتہاری مجرموں کی واضح تصاویر آویزاں تھیں۔ ان میں سے ہر ایک کی گرفتاری کرانے والے کے لیے انعامات بھی درج تھے۔

ایک بچے نے پولیس افسر سے پوچھا۔ ’’کیا پولیس واقعی ان مجرموں کو پکڑنا چاہتی ہے؟‘‘

’’بالکل... یہ خطرناک مجرم ہیں، پورا محکمہ ان کی تلاش میں لگا ہوا ہے۔‘‘ افسر نے کہا۔

’’آپ لوگوں نے انہیں اس وقت کیوں نہیں پکڑا جب آپ ان کی تصویریں اتار رہے تھے؟‘‘ بچے نے معصومیت سے پوچھا۔

کوئٹہ سے حبیب اللہ جان کی تجزیہ نگاری

UrduBooks.pk

چھوٹے قد کا دوغلی نسل کا آدمی اچانک ایک گلی سے لڑکھڑاتا ہوا باہر نکلا اور میرے راستے میں آگیا۔ میں نے اسے زور سے دھکا دیا اور وہ سامنے دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ ایک ایسی زبان میں بڑبڑانے لگا جو میری سمجھ سے باہر تھی۔ غالباً اسے میری جانب سے اس ردِعمل کی توقع نہیں تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ مجھے خوف زدہ کرکے والٹ اور گھڑی وغیرہ چھین لے گا۔ اس نے اپنے کندھے سکیڑے اور وہاں سے چل دیا۔

اس نے سڑک پار کی اور پیچھے مڑ کر دیکھا کہ کہیں میں اس کا تعاقب تو نہیں کر رہا پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا سبز دروازے والی چھوٹی سی عمارت پر پہنچ گیا جو ایک آئسکریم شاپ اور نائٹ کلب کے درمیان تھی۔ ایک سیاہ فام شخص نے دروازہ کھولا۔ اس کی عمر تیس کے قریب ہوگی۔ اس نے کام کے دوران استعمال ہونے والی پتلون اور سفید ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور ٹھنڈی ہوا چلنے کے باوجود سر پر ہیٹ رکھا ہوا تھا۔ اس نے باہر آنے سے پہلے سڑک کا جائزہ لیا اور پھر اپنے عقب میں دروازہ بند کر دیا۔

میں کچھ فاصلے پر ایک شیڈ کے نیچے رک گیا تھا گو کہ فاصلہ ہونے کی وجہ سے میں ان کی باتیں نہیں سن سکتا تھا لیکن یہ بات سمجھ میں آرہی تھی کہ وہ چھوٹا شخص کیا چاہتا ہے۔ اسے کسی قسم کی منشیات کی طلب ہو رہی تھی۔ وہ اس سے التجا کر رہا تھا اور ایک مرحلے پر تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ اس کے گھٹنوں پر سر رکھ دے گا۔

وہ سیاہ فام دونوں ہاتھ سینے پر باندھے کچھ دیر اس کی بات سنتا رہا پھر اس نے سر ہلایا اور واپس اندر جانے کے لیے مڑا۔ چھوٹے آدمی نے اس کی قمیص پکڑ لی اور سرخ ہیٹ والے نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ جیسے ہی وہ دروازے تک پہنچا تو ایک اور آدمی دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ وہ دیکھنے میں بیس بائیس سال کا لگ رہا تھا۔ اس نے نیلے رنگ کی جینز، جرسی، جیکٹ اور کیپ پہن رکھی تھی۔

اس نے کچھ کہا اور سیاہ فام نے شکست کے انداز میں ہاتھ اٹھا دیے پھر وہ اندر گیا اور چند لمحوں بعد واپس آگیا اور چھوٹے شخص کو کوئی چیز دینے سے پہلے ایک بار پھر سڑک کا جائزہ لیا۔ چھوٹا شخص تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا وہاں سے چلا گیا اور وہ دونوں بھی اپنی کچھار میں چلے گئے۔

میں اپنی پناہ گاہ سے نکلا اور سڑک پار کرکے اس گھر کے سامنے ایک ریستوران میں چلا گیا۔ میں نے اس کے عقبی حصے میں ایک میز منتخب کی جو سڑک سے دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اپنے لیے کافی کا آرڈر دیا اور ریناٹا کو فون کرنے لگا۔

وہ نوجوان مٹی ہی تھا جس نے ایتھلیٹ والا لباس پہن رکھا تھا جسے ریناٹا نے عجیب و غریب کمبی نیشن قرار دیا۔ مجھے اس قصبے میں آئے ہوئے ایک گھنٹا بھی نہیں ہوا تھا اور میں نے اس کی جگہ دیکھ لی۔ میں نے اپنی خوش قسمتی کا جشن کافی پی کر منایا۔

چند گاہک ریستوران میں آتے جاتے رہے لیکن کسی بھی مرحلے پر ان کی تعداد اتنی زیادہ نہیں ہوئی کہ عملے کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا۔ سورج غروب ہونے ہی والا تھا کہ سرخ ہیٹ والے کی شکل دوبارہ دکھائی دی۔ وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے چلا آرہا تھا۔ وہ کچھ دور آگے جاکر واپس مڑا اور ریستوران میں داخل ہوکر میرے سامنے والی میز پر بیٹھ گیا۔

”تمہیں کچھ چاہیے؟“

”کون کہتا ہے کہ مجھے کچھ چاہیے۔“

”تم مٹی کو تلاش کر رہے ہو؟“

”کون مٹی؟“ میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

میں نے مٹی کو سڑک پار کرتے ہوئے نہیں دیکھا جب تک وہ میرے سامنے نہیں آگیا۔ سرخ ہیٹ والا اسے دیکھ کر کھڑا ہوگیا اور مٹی اس کی جگہ بیٹھ گیا۔ اب مجھے اس کے دائیں گال پر زخم کا نشان صاف نظر آرہا تھا۔

”یہاں سب ٹھیک ہے۔“ اس نے اپنی نخوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ اب بھی اپنے اسکول کے زمانے کی تصویر سے بہت مل رہا تھا۔ تاہم اس کا انداز بدل گیا تھا اور وہ ایک ایسے شخص پر حکم چلا رہا تھا جو عمر میں اس سے چھ سات سال بڑا تھا۔

”جینیٹ نے تمہیں ہیلو کہا ہے۔“

”وہ مجھ پر تھوکے گی بھی نہیں چاہے میں آگ کے شعلوں میں گھرا ہوں۔“

”رہنے دو مٹی۔ صرف وہی تمہیں میرے آنے کے بارے میں اطلاع دے سکتی ہے۔“

”کیا تم پولیس والے ہو؟“

”نہیں۔“

”اگر تم پولیس والے ہو تو تمہیں بتانا ہوگا۔“ سرخ ہیٹ والے نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

”کیا جینیٹ نے تمہیں نہیں بتایا؟“ میں نے سرخ

ہیٹ والے کو نظر انداز کر کے مٹی سے کہا۔

"کیا؟"

"میں پرائیویٹ سراغ رساں ہوں۔"

"یہ کیا ہوتا ہے؟"

"لوگ گم شدہ چیزوں یا افراد کی تلاش کے لیے میری خدمات حاصل کرتے ہیں۔"

"تمہاری خدمات کس نے حاصل کیں؟"

"تمہارے باپ نے۔"

"میرے باپ نے؟" وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ اپنی کہنیاں میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ "مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ میرا باپ ہے جب تک میں تیرہ سال کا نہیں ہو گیا۔"

"تم نے جرم کا راستہ کیوں اپنایا؟ کیا تمہارا باپ تم سے محبت نہیں کرتا تھا؟" میں اس کے جذبات جگانے کی کوشش کر رہا تھا اور اس میں تھوڑی سی کامیابی بھی ہوئی لیکن ایک حد تک۔ اس نے نتھنے سکیڑے اور دوبارہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔

"میرے باپ کو بتا دینا کہ اسے ڈانیا کے بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، وہ میرے پاس بالکل خیریت سے ہے۔"

"کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں؟"

"کیا؟" اس نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا جس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"اس میں کیا مسئلہ ہے؟" میں نے پوچھا۔ "جولیو نے اسے تلاش کرنے کے لیے میری خدمات حاصل کی ہیں۔ میں صرف یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ محفوظ ہے اور اس کی مناسب دیکھ بھال ہو رہی ہے پھر میں واپس جا کر اسے رپورٹ دے دوں گا۔ اتنی سی بات ہے۔"

مجھے لگا کہ مٹی کچھ سوچ رہا ہے لیکن سرخ ہیٹ والے نے ایک قہقہہ لگایا تو اس کی محویت ٹوٹ گئی۔ مٹی کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

"تم فوراً بس پکڑو اور واپس چلے جاؤ۔ تم اپنا اور میرا وقت ضائع کر رہے ہو۔ شاید تمہارے پاس فالتو وقت ہو لیکن مجھے بہت کام کرنا ہیں۔"

میں نہیں جانتا تھا کہ اسے کون سا اہم کام درپیش ہے تبھی ایک طویل قامت درمیانی عمر کا شخص کیفے میں داخل ہوا۔ وہ دیکھنے میں ہسپانوی لگ رہا تھا لیکن ایکوڈور کا رہنے والا نہیں تھا۔ شاید اس کا تعلق ارجنٹائن

"سرداریاں"

سردار جوگیندر سنگھ نے بے روزگاری سے تنگ آ کر اپنے ایک ساتھی کی مدد سے ایک بچے کو اسکول سے واپسی پر اغوا کر لیا اور اس سے کہا کہ وہ اپنے باپ سے پانچ لاکھ روپے لے کر آئے ورنہ وہ اسے مار ڈالیں گے۔

بچے کے جانے کے بعد یکایک وہ فکر مند ہو گئے کہ بچہ رقم لانے کے بجائے گھر میں بیٹھ گیا تو ساری مہم جوئی غارت ہو جائے گی، کوڑی بھی ہاتھ نہیں آئے گی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد ان کے ساتھی نے تسلی دی کہ مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ بچہ بھی ایک سردار کا پوت ہے۔ اس کا باپ اسے رقم دے کر ضرور بھیجے گا۔

یہی ہوا۔ دو گھنٹے بعد بچے نے پوری رقم لا کر ان کے حوالے کر دی۔

**

سردار بوٹا سنگھ کی بیوی بیاہ کے تیسرے دن انہیں چھوڑ کر اپنے میکے جا بیٹھی۔ ان تین دنوں میں اس نے آنے جانے والوں کو اپنے شوہر کی بہت سی برائیاں بتائیں جو اس کے جاتے ہی پورے محلے میں گونجنے لگیں۔

"یار! تو بڑا ظالم ہے۔" ایک بے تکلف دوست نے سردار جی کو راستے میں روک کر شکایت کی۔ "نئی نویلی دلہن کو اتنا ستایا کہ بے چاری تنگ آ کر گھر سے بھاگ گئی۔"

"گرو کی قسم، یہ سب جھوٹ ہے۔ ستانا کیا، میں نے تو اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا... اسے بالکل اپنی بہن کی طرح گھر میں رکھا۔" سردار بوٹا سنگھ نے بھرائی ہوئی آواز میں اپنی صفائی پیش کی۔

**

ہانگ کانگ میں چار سردار پریشان تھے۔ ان کے پاس پیسے کی کمی نہیں تھی لیکن یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس کاروبار میں ہاتھ ڈالا جائے۔

کافی سوچ بچار کے بعد انہوں نے پیٹرول پمپ لگانے کا فیصلہ کیا۔ اس کام میں نقصان کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔

انہوں نے پیٹرول پمپ کھولا۔ ایک ہفتہ گزر گیا لیکن وہاں کوئی ایک بوند بھی خریدنے نہیں آیا۔ چاروں تشویش کے عالم میں سر جوڑ کر بیٹھے۔ آخر بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔ زمین کے ہوش ربا داموں کی وجہ سے انہوں نے ایک عمارت کی پہلی منزل پر پیٹرول پمپ کھولا تھا۔ اس معمولی سی غلطی سے سارا منصوبہ چوپٹ ہو گیا۔

جگہ موجود تھی۔ متبادل کاروبار کے طور پر ہوٹل کھولنے کا فیصلہ کیا گیا۔ کئی ہفتے گزر گئے۔ چاروں سردار باہی کھاتا سنبھال سنبھال کر تھک گئے۔ پھر اجلاس ہوا۔ اس بار یہ چھوٹی سی غلطی ہوئی کہ ہوٹل سے پیٹرول پمپ کا بورڈ اتارنا بھول گئے۔ پیٹرول پمپ میں کوئی کھانا کھانے کیسے آتا۔

بدشگونی کی وجہ سے یہ دھندا ختم کیا اور ٹیکسی کے طور پر ایک شان دار لیموزین خرید لی۔ چاروں بے چارے ہفتوں سے ہانگ کانگ کی سڑکوں کی خاک چھان رہے ہیں لیکن انہیں کوئی مسافر نہیں ملتا۔ سبب یہ ہے کہ وہ چاروں اسی لیموزین میں سوار مسافر ڈھونڈ رہے ہیں۔

انتخاب: ولید بلال، کراچی

UrduBooks.PK

سے ہو۔ اس نے سرمئی سوٹ اور ہلکے نیلے رنگ کی قمیص پہن رکھی تھی۔ اس کے چہرے پر بھی زخم کا نشان تھا۔ اس نے مٹی سے کچھ بات کرنا چاہی لیکن فوراً ہی منہ بند کر لیا کیونکہ اس وقت ریستوران میں اس کی توقع سے زیادہ لوگ موجود تھے۔

ممکن ہے کہ وہ وہاں منشیات خریدنے آیا ہو لیکن میرے خیال میں ایسا نہیں تھا پھر میری سمجھ میں سب کچھ آ گیا۔ مجھے نواہی کے اغوا پر جینیٹ کا متضاد ردِعمل یاد آ گیا۔ اس نے ریناتا سے کہا تھا۔ ”بہتر ہے کہ تم اسے بھول جاؤ۔“

”کیا تم یہاں بچی کے لیے آئے ہو؟“ میں نے پوچھا۔ میں جانتا تھا کہ میں نے سمجھنے میں غلطی نہیں کی۔ یہ سنتے ہی وہ گھوما اور کیفے سے باہر چلا گیا۔ مٹی اور سرخ ہیٹ والے نے مخالف سمت میں دوڑ لگائی لیکن میں نے سوٹ والے کے پیچھے جانے کا فیصلہ کیا کیونکہ اس کے پاس کسی ہتھیار کے ہونے کا امکان بہت کم تھا اور یہ بھی لگ رہا تھا کہ میں اس سے بہت کچھ معلوم کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

وہ میری توقع سے زیادہ تیز رفتار تھا۔ میرے اور اس کے درمیان ایک بلاک کا فاصلہ تھا۔ میں نے چلّا کر کہا۔

”پولیس۔“

اس نے اپنی کمر پر دونوں ہاتھ رکھے اور مجھے لگا کہ وہ گر جائے گا لیکن وہ فوراً ہی سنبھل گیا اور اس نے جھک کر اپنے گھٹنے پکڑ لیے۔ اس وقت تک میں اس کے پاس پہنچ چکا تھا۔

”دیکھو دیکھو۔“ اس نے احتجاجاً کہا۔ ”وہ بات نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔ میں انہیں یہ بتانے آیا تھا کہ بات ختم سمجھو۔ ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ میں اور میری بیوی......“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا لیکن مجھے اندازہ تھا کہ میرا جھوٹ زیادہ دیر نہیں چلے گا۔ اس سے پہلے سچ اگلوانا ضروری تھا۔ لہٰذا میں اسے ایک قریبی پارک میں لے گیا اور ہم ایک بینچ پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

اس نے بتایا کہ وہ ارجنٹائن کے شہر پوساداس کا رہنے والا ہے جو برازیل کی سرحد کے قریب واقع ہے۔ اس نے جو کہانی سنائی، وہ میں پہلے سے جانتا تھا یا مجھے اس کا اندازہ تھا۔ وہ اور اس کی بیوی ننھی ڈانیا کو اس کے باپ سے خریدنے پر تیار ہو گئے تھے۔ اس کے لیے اس نے گود لینے کا لفظ استعمال کیا۔

”تم نے کسی ایجنسی سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”میرا سابقہ ریکارڈ ٹھیک نہیں ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ تم بھی......“

”نہیں، اوہ میرے خدا! نہیں، میں ایسا نہیں ہوں۔ میں کبھی یہ کام نہیں کروں گا۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گیا کہ تم بچوں کی خرید و فروخت نہیں کرتے۔“

میں بلاوجہ اس شخص کے ساتھ اپنا وقت ضائع کر رہا تھا جبکہ بچی اس کے باپ کے پاس تھی جو اسے سب سے اونچی بولی دینے والے کو فروخت کرنے کا خواہش مند تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ شخص اتنی زیادہ قیمت نہ دے سکتا ہو۔

میں نے کھڑے ہو کر اس کی قمیص کو سامنے سے پکڑا اور ایک جھٹکے سے کھینچ کر اسے کھڑا کر دیا پھر بہت جلدی مجھے پوری کہانی معلوم ہو گئی۔ اس کا نام سانتیاگو رومیرو تھا۔ اسے پانچ بجے مٹی سے ملنا تھا جو اسے بچی کو دکھانے لے جاتا۔ اس دوران اس کی بیوی جینیٹ کے پاس جا کر اسے پندرہ ہزار دیتی اور جینیٹ مٹی کو فون کر کے بتاتی اور بچی کو رومیرو کے حوالے کر دیا جاتا۔

مجھے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا ملک بہت غریب تھا۔ یہاں تک کہ ہمیں بچوں کی فروخت پر معقول رقم بھی نہیں ملتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ رومیرو کے چہرے پر غرور لوٹ آیا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ میں نے اس کا گریبان چھوڑ دیا اور صورتِ حال پر غور کرنے لگا۔ ایک بچی کی زندگی داؤ پر لگی ہوئی تھی اور مجھے اس کے لیے کچھ کرنا تھا۔ میں نے اپنا سیل فون نکال لیا۔

”تم کسے فون کر رہے ہو؟“ رومیرو کے ہاتھ کانپنے لگے اور وہ بینچ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

”پولیس کو۔“ میں نے جواب دیا۔

”لیکن تم تو......“ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ پہلے تو وہ کچھ خوف زدہ ہوا لیکن فوراً ہی اس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔

”تم کتیا کی اولاد۔“ وہ غرایا اور اٹھ کر چل دیا۔ میرا تعاقب کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس لیے میں نے اسے جانے دیا اور ایک نمبر ملایا۔

میں نے جیوی موریل کو فون کیا تھا جو میرا دوست تھا

اور ایک پک اپ میں گھوم کر شہر کا ٹریفک کنٹرول کرتا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ وہ کسی اور کے مقابلے میں بہتر طور پر مقامی پولیس کی رہنمائی کرسکتا تھا۔

دوسری طرف میں خود بھی جیوی کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے دوسرا فون ریناتا کو کیا۔

”کیا میری بیٹی مل گئی؟“ اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ مجھے اس کی آواز میں ناامیدی اور خوف کی جھلک نظر آئی۔

”ابھی نہیں۔“ میں نے کہا۔ فی الحال میں اسے مٹی اور اس کی ماں کی ملی بھگت کے بارے میں نہیں بتانا چاہ رہا تھا۔ ”مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

”لیکن میں کیا کرسکتی ہوں۔“ وہ دھیمی آواز میں روتے ہوئے بولی۔ ”میں نہیں جانتی کہ مٹی کہاں ہے؟“

”تھوڑا سا دماغ پر زور دو۔ جو کچھ تم نے کل بتایا۔ اس کے علاوہ بھی کوئی بات ہے جو مٹی اور تمہاری بیٹی کو تلاش کرنے میں مدد دے سکتی ہے۔“

”میں نہیں جانتی کہ وہ کہاں ہے۔ یہ میں پہلے ہی بتا چکی ہوں۔“

”کیا اس کی کوئی گرل فرینڈ ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”تمہارا مطلب ہے طوائف؟“

”طوائف کے علاوہ بھی کوئی ہوسکتی ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ کہاں رہتی ہے؟“

”نہیں۔“

”سوچ کر بتاؤ ریناتا۔“ میں نے مایوسی سے کہا اور اسے ایک بار پھر یاد دلایا کہ کیا کچھ داؤ پر لگا ہوا ہے۔

”وہ ان میں سے کسی ایک جگہ کام کرتی ہے جہاں لوگ گرم پانی سے نہاتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کیا تم اس جگہ کا نام بتا سکتی ہو؟“

”اس پر سبز اور سفید رنگ کا بورڈ لگا ہوا ہے اور یہ اس سڑک پر ہے جو پہاڑی کی طرف جاتی ہے۔“

”اوکے۔“ میں نے کہا۔ میں جانتا تھا کہ بانوس میں اس طرح کی پچاس یا سو جگہیں ہیں اور تمام سڑکیں پہاڑی کی طرف ہی جاتی ہیں۔ ”سوچ کر بتاؤ اس بورڈ پر کیا لکھا ہوا ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم۔ شاید ایگوا یا کچھ اور۔“

میں نے سائن بورڈ دیکھنا شروع کیے۔ ان میں صرف تین ایسے تھے جن کے نام میں پانی کا لفظ شامل تھا جبکہ ان میں ایک سبز اور سفید رنگ کا تھا۔

”ایگوا بیونا؟“ میں نے پوچھا۔

”میرے خیال میں یہی ہے۔“

سائن بورڈ سے معلوم ہوا کہ وہ جگہ مغرب میں پانچ سو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ میں نے شاید زمانۂ طالب علمی میں اتنا فاصلہ پیدل طے کیا ہوگا۔ بہرحال میں نے ہمت کی اور پُرسکون انداز میں چلا گیا۔ وہ ایک چھوٹی عمارت تھی اور سڑک کے پار چھوٹی سی پارکنگ لاٹ میں ایک ہی کار کھڑی ہوئی تھی۔ سلیٹی رنگ کی پرانی ہنڈائی اور یہ شاید وہی کار تھی جس کے بارے میں ریناتا نے بتایا تھا کہ وہ مٹی کے استعمال میں ہے۔

سرخ ہیٹ والا وفادار سپاہی سینے پر ہاتھ باندھے بیرونی دروازے پر پہرا دے رہا تھا۔ میں جلدی سے پہاڑی کی طرف چلا گیا اور اس عمارت کے عقبی حصے کی جانب بڑھنے لگا۔ عمارت کی چھت پر وسط میں تین مربع میٹر کا خلا تھا تاکہ وہاں سے بھاپ خارج ہوسکے۔ میں پیٹ کے بل لیٹ کر سوراخ میں جھانکنے لگا۔ اس وقت تالاب ہی نہیں بلکہ پوری عمارت ہی خالی تھی سوائے مٹی کے جو استقبالیہ کاؤنٹر پر بیٹھی ایک جوان لڑکی سے باتیں کر رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ لڑکی کو اس کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن ڈانیا کہاں تھی؟

پھر وہ مجھے نظر آگئی۔ اس نے سفید اور گلابی لباس پہن رکھا تھا اور وہ کاؤنٹر کے عقب میں بیٹھی کھیل رہی تھی۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ مٹی اور اس کی نئی گرل فرینڈ میں کیا گرماگرمی ہو رہی ہے۔ جب وہ لڑکی اٹھی اور کمرے سے باہر جانے لگی تو میں نے محسوس کیا کہ وہ حاملہ ہے۔ مجھے متلی ہونے لگی۔ کیا مٹی اپنے نئے نفع بخش سائڈ بزنس کے لیے بچے پیدا کر رہا تھا؟

ارجنٹائن کے باشندے سے ملنے کے باوجود مجھے یہ سب کچھ ایک کھیل کا حصہ لگ رہا تھا لیکن اب مجھے اپنے ملک اور معاشرے پر غصہ آرہا تھا جو نوجوان لڑکیوں کو بچے پیدا کرنے کی اجازت دیتا ہے لیکن مجھے سب سے زیادہ غصہ مٹی پر تھا جو یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ دنیا پر حکومت کرے گا کیونکہ وہ ایک بچہ پیدا کرسکتا ہے۔ میری آنکھوں میں خون اتر آیا اور میں نے بڑی مشکل سے اپنی چیخ روکی۔

میں رینگتا ہوا چھت کے آخری کونے تک گیا جو بیرونی دروازے سے کافی فاصلے پر تھا اور فٹ پاتھ پر اتر گیا۔ مجھے وہاں ایک عقبی دروازہ نظر آیا جو مقفل نہیں تھا۔

میں اس راستے سے عمارت میں داخل ہو گیا اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

میں جانتا تھا کہ شاید ایک غلطی کر رہا ہوں۔ میں نے جیوی پر بھروسا کیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ پولیس بچی کو بحفاظت نکالنے کے لیے کوئی طریقہ اختیار کرے گی لیکن غصے نے مجھے آگے بڑھنے پر مجبور کر دیا۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا بیرونی دروازے تک پہنچا تو میں نے شیشے سے سرخ ہیٹ والے کو دیکھا جو ایک فلڈ لائٹ کے نیچے کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ ایک دروازے کے ہینڈل پر ایک چین مع پیڈ لاک لپٹی ہوئی تھی تاکہ عمارت کو بند کرتے وقت دروازہ مقفل کر دیا جائے۔

میں ایک پتھر کے ستون کے پیچھے چھپ کر بیرونی دروازے تک کا فاصلہ ناپنے لگا۔ مٹی نے ایک بے بی کیریئر میں بچی کو رکھ دیا۔ میں نے اس کے عزائم بھانپ لیے اور دوڑ کر بیرونی دروازے کے دونوں ہینڈل میں زنجیر چڑھا کر تالا لگا دیا۔ مجھے باہر سے سرخ ہیٹ والے کے چیخنے کی آواز آ رہی تھی۔

ڈانیا نے مجھے دیکھ کر رونا شروع کر دیا۔ میں نے اسے بہلانے کی غرض سے کہا۔ ”بیٹا مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔“ لیکن میں دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جولیو اور میگا کا کوئی بیٹا بگڑے ہوئے امریکی لڑکوں جیسی حرکت کر سکتا ہے۔ اس وقت مٹی نے ایسا ہی کیا۔ اس کی شکل دیکھ کر لگ رہا تھا کہ وہ ابھی رو دے گا۔ وہ مایوس نظر آ رہا تھا۔

”مجھ سے دور رہو۔“ وہ روتی صورت بناتے ہوئے بولا۔ ڈانیا نے رونا بند کر دیا تھا اور اپنے باپ کو اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے اس پر پہلی بار نظر پڑی ہو۔

”تم یہ لڑکی مجھے دے دو۔“ میں نے کہا۔ ”تاکہ میں اسے اس کی ماں کے حوالے کر دوں۔ مجھے تمہاری کوئی پروا نہیں، تم جو چاہو کرتے رہو۔“ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ میں چاہتا تھا کہ پولیس اس کی بھی اپنے انداز میں خاطر تواضع کرے۔

ہم ایک دوسرے سے دس فٹ کے فاصلے پر تھے، جیسے ہی اس نے چلنا شروع کیا تو میں بھی اس کے پیچھے لگ گیا۔ جیسے ہم دونوں ایک رسی یا زنجیر سے بندھے ہوئے ہوں۔ میری نبض تیز چلنے لگی جب میں نے دیکھا کہ وہ تالاب کی طرف جا رہا ہے۔

”رک جاؤ۔“ میری آواز میں غصہ اور خوف شامل تھا۔ ”یہ تمہارا خون ہے۔“

”بالکل ٹھیک۔“ وہ چلایا۔ ”یہ میری بیٹی ہے۔ میں نے اسے پیدا کیا۔ میں جو چاہوں اس کے ساتھ سلوک کروں۔“

اس نے سیڑھیوں پر پاؤں رکھا اور پانی میں اُتر گیا۔ تالاب میں صرف تین فٹ پانی تھا لیکن بچی کے لیے وہی بہت زیادہ تھا۔ ”پاپا۔“ وہ چلائی جب گرم پانی اس کے گھٹنوں تک آیا اور وہ اپنی ٹانگیں چلانے لگی جو پہلے ہی گرمی سے سرخ ہو رہی تھیں۔

مٹی نے پیچھے کی طرف حرکت کرنا شروع کی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تالاب کے وسط میں پانی مزید گہرا ہو جاتا ہے لیکن میرے پاس یہ جاننے کے لیے وقت نہیں تھا۔ میں بھی تالاب میں اتر گیا۔ مٹی میرے مقابلے میں جوان اور کم عمر تھا لیکن میرے اندر جوش اور غصے کی وجہ سے طاقت آ گئی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا پھر اس نے ایک آخری حربہ آزمایا۔ وہ پانی میں بیٹھ گیا اور ڈانیا کو پوری طرح پانی میں ڈبو دیا۔

”دور رہو۔“ وہ چلایا۔ ”اگر ضرورت ہوئی تو میں اسے ڈبو دوں گا۔“

میرے پورے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ میں نے تیزی کے ساتھ ایک چکر کاٹا اور اس کے عقب میں پہنچ گیا۔ میں نے اس کے سر سے ٹوپی اتاری اور بالوں کو پکڑ کر زور سے کھینچا۔ وہ بُری طرح چلایا اور اس کا سر اتنا اوپر اٹھ گیا کہ میں اپنی دائیں کلائی اس کی گردن کے نیچے ڈال کر اسے دبا سکتا۔ اسے اس لڑائی میں شکست ہوئی اور وہ پانی سے ایک نئے فرمانبردار خادم کی طرح باہر آ گیا۔ میں نے اپنے دائیں بازو کا دباؤ برقرار رکھا اور بائیں ہاتھ سے بے بی کیریئر کی رسیاں کھولنے لگا۔ جب وہ کھل گئیں تو میں نے اس کے نیچے سے نکال لیا اور بچی کو محفوظ مقام پر لے گیا۔

جب پولیس آئی تو مٹی کی گرل فرینڈ، ڈانیا کی ٹانگوں پر کریم لگا رہی تھی۔ سرخ ہیٹ والا غائب ہو چکا تھا اور مٹی اب بھی تالاب میں کھڑا ہوا تھا۔ پولیس نے اسے ہتھکڑی لگائی اور اپنے ساتھ لے گئی۔ اس کی گرل فرینڈ صدمے کی کیفیت میں کرسی پر بیٹھی اپنے پھولے ہوئے پیٹ کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے سیل فون نکالا اور رینا تا کو بچی کی بازیابی کی خبر سنا دی۔ میں جسے مشکل کام سمجھ رہا تھا۔ وہ خوش اسلوبی سے پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔

سرورق کی پہلی کہانی

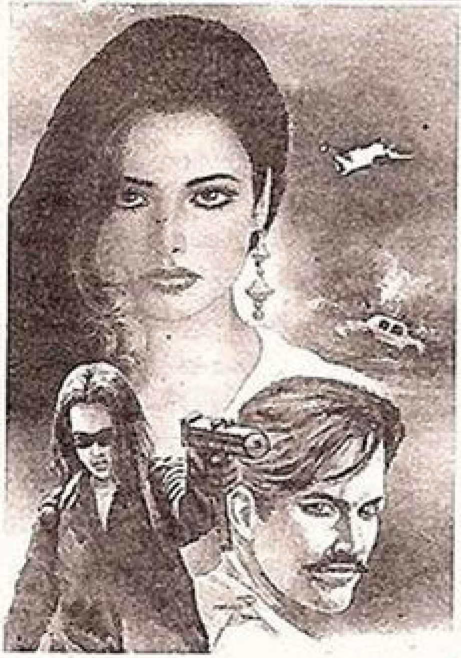

UrduBooks.pk

راہِ گم کردہ

روبینہ رشید

زندگی اور موت لمحہ بہ لمحہ ساتھ چلتی ہے۔ اس قدر خاموشی سے موت کا وار ہوتا ہے کہ حیرت زدہ کر دیتا ہے۔ خاموشی... تحیّر اور حیرت زدہ ماحول... جو پل بھر میں رونما ہوتا ہے... اور پھر پوری زندگی اس کے حصار میں بند ہو جاتی ہے... ایک مطمئن، خوش و خرم فیملی کی بھرپور لمحوں سے آغاز ہوتی کہانی... ایک ہی لمحے میں اس کی جان سے پیارے لوگ ماضی کا حصہ بن گئے... دل شکستگی... مایوسی اور دکھ و آلام نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا... تلاش و کھوج کا سلسلہ شروع ہوا تو ایک کے بعد ایک دروازہ طلسمی انداز میں بند ہوتا چلا گیا۔ وہ بند گلی میں تھا... پیاروں کے وجود کو مٹانے دینے والے دشمن ایسے حصار میں گم تھے کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔

دل و دماغ میں ہلچل مچا دینے والے واقعے کی بازگشت

وہ ایک نئی ہائی رائز بلڈنگ کے ٹاپ فلور پر بنے پینٹ ہاؤس کی شیشے سے بنی قدِ آدم کھڑکی میں کھڑا دور تک پھیلے شہر اور اس کی جگمگاتی روشنیوں کو دیکھ رہا تھا۔ یہاں سے تمام شہر اسے اپنے قدموں میں نظر آرہا تھا۔ وہ مسکرایا، چند لمحے وہاں کھڑا رہا پھر کمرے میں موجود آرام دہ مساجر صوفے پر آبیٹھا۔ اسے کسی کا انتظار تھا، فون کی گھنٹی بجی تو اس نے اسکرین پر نظر ڈالی وہاں کوئی نمبر نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ مسکرایا اور کال ریسیو کرلی۔

"تمہارا سامان لمحے بھر میں پہنچ رہا ہے۔ اس کا کوڈ "آزادی" ہے۔" دوسری طرف سے آنے والی پھٹی، پھٹی آواز نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "ہمارا کام وقت پر ہوجانا چاہیے۔"

"ہوجائے گا۔ اس بار کی نئے سال کی رات پورے شہر کے لیے سرپرائز ہوگی۔" وہ بولا...... اس کے لہجے میں اعتماد جھلک رہا تھا۔

"گڈ......" دوسری جانب سے کال کاٹ دی گئی۔

عین اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی، ایک بھاری جسامت والا شخص اس کی اجازت پاکر کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک جدید بریف کیس تھا۔ اس نے اس کے ہاتھ سے بریف کیس لیا اور سر کی حرکت سے اسے جانے کا اشارہ کیا۔ اس کے جاتے ہی اس نے بریف کیس کو سامنے رکھی میز پر رکھا اور اس پر بنے حروف تہجی میں "آزادی" کے الفاظ لکھے۔ بریف کیس کھل گیا تھا۔ اس کے سامنے ڈالرز، یورو اور پاؤنڈز کی گڈیاں تہ در تہ سجی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ چند لمحے نوٹوں پر ہاتھ پھیرتا رہا پھر اس نے بریف کیس بند کرکے اس کا کوڈ تبدیل کردیا۔ اب اس بریف کیس کا کوڈ "تباہی" تھا۔ اس نے بریف کیس الماری میں رکھا اور ایک بار پھر کھڑکی میں آکھڑا ہوا۔ اس بار اس کے چہرے پر مسکراہٹ کے بجائے سفاکی تھی۔

☆☆☆

تیمور احمد کی نگاہیں گھڑی پر جمی ہوئی تھیں۔ آج گویا وقت گزرکے ہی نہیں دے رہا تھا۔ وہ اپنی بے چینی پر دل ہی دل میں مسکرایا اور لیپ ٹاپ پر موجود ڈاکیومنٹ کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ شاندار شخصیت کا مالک تھا۔ طالب علمی کے دور میں ٹینس کا کھلاڑی رہ چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی تائی کوانڈو میں بلیک بیلٹ کا مالک تھا۔ تمام تر مصروفیات کے باوجود ورزش آج بھی اس کے روزمرہ کے معمول کا حصہ تھی۔ اس کا دوسرا پسندیدہ مشغلہ نشانے بازی تھا۔ شوٹرز کلب کے سالانہ مقابلوں میں وہ کئی سال سے جیت رہا تھا۔ اسے کلب میں جیمز بانڈ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

واحد شاہ، ہومزان لمیٹڈ کا مالک تھا۔ ہومزان لمیٹڈ ملک کی چند بڑی تعمیراتی کمپنیوں میں سے ایک تھی۔ ملک بھر میں بہت سے بڑے پراجیکٹ انہوں نے ڈیزائن اور تعمیر کیے تھے۔ تیمور اس کمپنی میں منیجر کے طور پر آیا تھا اور اب کئی سالوں سے چیف آپریٹنگ آفیسر کی حیثیت سے کام کررہا تھا۔ تیمور اپنے کام سے مطمئن اور خوش تھا۔ حالانکہ اس کا سارا بچپن فوجی بننے کی خواہش میں گزرا تھا۔ اسکول کے آخری سال میں فوج کو جوائن کرنے کا ارادہ اور مضبوط ہوگیا تھا۔ اس نے اس کا ابتدائی ٹیسٹ بھی پاس کرلیا تھا مگر والد کی اچانک وفات اور پھر ماں اور چھوٹی بہن کے تنہا رہ جانے کے خیال نے اسے اپنے خواب سے دستبردار ہونے پر مجبور کردیا۔ مالی طور پر وہ بہتر پوزیشن میں تھے۔ تیمور یونیورسٹی کے آخری سال میں تھا اور رمشا کالج میں جب اُن کی والدہ بھی اچانک چل بسیں۔ حواس قدرے بحال ہوئے تو دونوں بہن بھائیوں نے...... مکان کو بیچ کر شہر کے بہتر علاقے میں ایک اپارٹمنٹ خرید کر وہاں رہنے کا فیصلہ کیا۔ تیمور چند سالوں میں ترقی کی کئی سیڑھیاں پھلانگ چکا تھا۔ رمشا شہر کے ایک بڑے اسکول میں پرائمری کے بچوں کو پڑھا رہی تھی۔ یہ کام اس کا شوق تھا اور وہ نہایت دلجمعی سے اسے سرانجام دے رہی تھی۔

یہ رمشا ہی تھی جس کی وجہ سے نینا اس کی زندگی میں آئی۔ نینا نے اسی اسکول میں آرٹ ٹیچر کے طور پر کام شروع کیا تھا۔ وہ اور رمشا چند ہی مہینوں میں بہت قریبی دوست بن گئی تھیں۔ تیمور کی نینا سے پہلی ملاقات ایک ہنگامی صورتِ حال میں ہوئی تھی۔ اس پہلی ملاقات کا تصور اتنے سال گزرنے کے باوجود اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دیتا تھا۔ رمشا اپنی چند دوستوں کے ساتھ شہر سے ملحقہ تاریخی علاقے گھومنے پھرنے گئی تھی۔ طے یہ ہوا تھا کہ آخری روز تیمور وہاں پہنچ کر انہیں واپس لے آئے گا۔ وہاں ان کے رکنے کا انتظام بھی تیمور نے ہی ایک پرانے ریسٹ ہاؤس میں کرایا تھا۔ جب وہ انہیں لینے نکلا تو موسم قدرے ابرآلود تھا مگر شہر سے باہر نکلتے ہی موسم بالکل بدل گیا۔ وہ احتیاط سے گاڑی چلاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ دوسری طرف رمشا اور سب دوستوں نے ریسٹ ہاؤس کے قریب موجود پہاڑی پر جانے کا پروگرام بنالیا تھا۔

نینا کی طبیعت کچھ بہتر نہیں تھی اس لیے وہ ریسٹ ہاؤس میں ہی رک گئی۔ ریسٹ ہاؤس کا واحد ملازم کچھ سامان لینے نکلا تھا۔ اسے کچھ دیر میں ہی تنہائی سے گھبراہٹ سی محسوس ہونے لگی تو وہ چائے کا مگ لے کر باہر لان کی طرف نکلی، باہر آکر وہ حیرت زدہ سی ہوگئی۔ تھوڑی سی دیر میں موسم بالکل اس طرح بدل گیا تھا جیسے کسی نے جادو کی چھڑی گھمادی ہو۔ بادل تو صبح سے ہی تھے مگر اب تو یوں لگ رہا تھا جیسے شام کے سات آٹھ بج گئے ہوں۔ بارش کے ننھے

ننھے قطرے یکلخت موٹی بوندوں میں تبدیل ہونے لگے تو وہ دوڑ کر برآمدے میں آگئی۔ بارش یکدم طوفانی ہوگئی تھی۔ وہ تیزی سے اندر ہال کمرے میں بھاگی مگر اندر چھا جانے والے اندھیرے نے اسے الٹے پیروں برآمدے میں آنے پر مجبور کیا۔ بارش کا سب سے پہلا وار بجلی پر ہی ہوا تھا۔ نہ جانے ہمارا انتظام اتنا کمزور کیوں ہے کہ موسم کی ایک ذرا سی تبدیلی سب کچھ تہس نہس کر ڈالتی ہے، اس نے سوچا۔ وہ برآمدے میں کھڑی لرز رہی تھی۔

بارش کے جھکڑ طوفانی انداز میں چل رہے تھے۔ اس شور میں اچانک نینا کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے لان کے پار بنے لکڑی کے دروازے کو دھکا دیا ہو۔ اس کا پورا وجود کان بن کر رہ گیا تھا۔ 'شاید یہ لوگ آگئے ہیں۔' اس خیال نے اس کے پیروں میں نئی توانائی بھر دی اور وہ دوڑتی ہوئی برآمدے سے باہر آئی۔ تیز بارش نے چند لمحوں کے لیے اسے تقریباً اندھا کر دیا تھا مگر وہ آنکھیں مسلتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھتی گئی۔

''شکر ہے کہ تم لوگ آگئے، مجھے تو اس قدر ڈر لگ رہا تھا، اتنی دیر سے برآمدے میں کھڑے کھڑے پیر بھی دکھنے لگے تھے۔'' وہ آنکھوں پر دوپٹے کا چھجا بنانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولی۔ مگر پانی کی تیز بوچھاڑ میں دوسری جانب نظر آنے والے چہرے کو دیکھ کر اس پر ایک لمحے کے لیے سکتہ سا طاری ہوگیا۔

''کک...... کون ہیں آپ؟ یہاں اندر کیسے آئے، یہ مت کہیے گا کہ میں یہاں اکیلی ہوں یا مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' وہ خوف سے باقاعدہ لرز رہی تھی۔

''آپ...... آپ پلیز مجھے اندر آنے دیں۔ بارش بہت تیز ہے...... میں اندر آکر آپ کو ساری تفصیل بتاتا ہوں۔'' آنے والے نے قدرے ملتجیانہ انداز میں کہا۔

''جی نہیں، بالکل نہیں۔'' وہ بمشکل بولی۔ ''جائیے آپ یہاں سے۔''

''مگر میں اس بارش میں کہاں جاؤں، کچھ بھی نظر نہیں آرہا، گاڑی نے بھی جواب دے دیا ہے۔''

''مجھے نہیں معلوم مگر آپ اندر نہیں آسکتے۔'' اس نے جواب دیا اور اندر کی طرف مڑی۔

''اندر تو میں آچکا ہوں۔'' اس بار اس کا لہجہ مختلف تھا۔ ''یہاں بارش میں مزید بھیگنے کا مجھے شوق نہیں، میں برآمدے میں جا رہا ہوں۔'' وہ اس کے سامنے سے لمبے لمبے قدم اٹھاتے ہوئے برآمدے کی جانب بڑھ گیا۔ نینا ششدر سی کھڑی اسے دیکھتی رہ گئی۔

وہ برآمدے میں کھڑا اپنی جیکٹ جھٹک رہا تھا۔

''دیکھیے میں پولیس کو بلا لوں گی۔'' نینا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس بدتمیز شخص کو یہاں سے کیسے باہر نکالے۔

''آخر آپ اس طوفانی بارش میں کب تک کھڑی رہیں گی، یہاں آجائیے۔''

''آپ کس قسم کے انسان ہیں، زبردستی اندر گھس آئے اور اب ڈھٹائی کا مظاہرہ بھی کر رہے ہیں۔''

''آپ نہایت ضدی خاتون ہیں۔'' وہ اسے افسوسناک نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کب سے آپ کو سمجھا رہا ہوں چیخ چیخ کر...... مگر آپ ہیں کہ......''

یک دم بجلی کی تیز کڑک نے اس کے الفاظ کو نگل لیا۔ ایک لمحے کو یوں لگا جیسے آسمان پر تیز فلیش لائٹس لہرائی ہوں۔ نینا بے اختیار دوڑتی ہوئی برآمدے کی جانب آئی۔ وہ پہلے ہی بہت زیادہ ڈری ہوئی تھی، اس اچانک افتاد نے اسے گویا حواس باختہ کر دیا تھا۔ اس کے منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں۔ اس نے گرتے پڑتے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھیں اور اجنبی کا بازو پکڑ لیا۔ بجلی کی تیز روشنی میں وہ پہلی بار ٹھیک سے اس کا چہرہ دیکھ پائی تھی۔

''اب...... اب کیا ہوگا؟'' وہ بمشکل بولی۔

''پتا نہیں......'' اس کے لہجے اور آنکھوں میں کوئی ایسی بات تھی کہ سادہ سا جواب نینا کے جسم میں کرنٹ بن کر دوڑ گیا۔ اس نے گھبرا کے اس کا بازو چھوڑ دیا۔

''شکر ہے کہ بجلی کڑکی اور آپ کی ضد ٹوٹی۔'' اس نے اطمینان کی سانس لی۔

''آپ کس قسم کے آدمی ہیں۔ چلیے تشریف لے جائیے یہاں سے۔''

''ٹھیک ہے مگر آپ سوچ لیجیے کیسی خوفناک بارش ہو رہی ہے۔ بجلی پھر کڑکے گی، کیا پتا گر بھی پڑے۔ آپ کو اتنی دیر میں اندازہ تو ہو گیا ہوگا کہ میں بہرحال خطرناک ڈاکو یا چور نہیں ہوں۔ اگر آپ مجھے اس بھیانک طوفان میں دھکے دے کر جانے کو کہہ رہی ہیں تو میں چلا جاتا ہوں مگر پھر...... آپ اکیلی ہوں گی اور اگر میں مر مرا گیا تو اس کی ذمے دار بھی......''

''ٹھیک ہے آپ کچھ دیر رک سکتے ہیں۔'' وہ باہر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ وہ اتنا کہہ کر کونے میں رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''سنیے آپ کو ڈر لگ رہا ہے کیا......؟'' چند لمحوں بعد ہی اس نے پوچھا۔

''نہیں......'' نینا نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

''لگنا بھی نہیں چاہیے۔ میں کوئی بھوت تھوڑی ہوں۔''

''میں بھوتوں پر یقین نہیں رکھتی۔'' وہ ہمت کر کے بولی۔

''پچھلے سال بھی ایسا ہی ایک بھیانک دن تھا۔ ہر سُو خوفناک بارش ہو رہی تھی۔ میں ٹرین میں تھا اور میرے ساتھ ایک لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ بھوتوں کا ذکر آیا تو اس نے بھی یہی کہا تھا۔''

''پھر......؟'' نینا نے پوچھا۔

''پھر کیا...... حالانکہ اتنی اچھی باتیں ہو رہی تھیں مگر مجھے اس پر ثابت کرنا پڑا کہ بھوت ہوتے ہیں۔''

''کیسے......؟ یہ کیسے ثابت کیا آپ نے......؟'' نینا اب پوری طرح اس قصے کی اسیر ہو گئی۔

''مجھے غائب ہونا پڑا۔'' وہ خاصے افسوس سے بولا۔

''کیا...... کیا مطلب؟'' وہ زور سے بولی، اس کا دل ڈرم کی طرح بج رہا تھا۔

''آپ بھی یقین نہیں کرتیں نا بھوتوں پر......'' وہ اس کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

''نن، نہیں...... پلیز مجھے کچھ مت کرنا۔'' وہ چلائی اور پھر سارا منظر اس کی نظروں کے سامنے سے غائب ہو گیا۔

اسے جب ہوش آیا تو وہ وہیں برآمدے کی آرام کرسی پر لیٹی ہوئی تھی۔ ہوش میں آتے ہی اسے ساری باتیں یاد آنے لگیں تو ایک بار پھر خوف سے اس کی گھگھی بندھ گئی۔

''پلیز، مجھے آپ کا نام بھی معلوم نہیں ہے مگر آپ دوبارہ بے ہوش مت ہو جائیے گا۔ میں صرف مذاق کر رہا تھا اور یہ تو ایک پرانا بلکہ گھسا پٹا لطیفہ تھا۔ میں بالکل بھی بھوت نہیں ہوں۔'' وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

''پلیز سوری۔''

''آپ مجھے بے وقوف بنا رہے تھے۔'' نینا نے اب زور شور سے رونا شروع کر دیا تھا۔

''لیجیے یعنی اب آپ کو اس بات پر افسوس ہو رہا ہے کہ میں بھوت کیوں نہیں ہوں۔'' وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ''اچھا پلیز اب چپ ہو جائیے آئی ایم ویری سوری۔'' اس کی نگاہیں نینا کے چہرے پر تھیں۔

نینا چند لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ چند لمحے سوچنے کے بعد وہ بولی۔ ''اوکے...... آئی ایم سوری......''

''اب ہم دونوں کچھ مناسب اور مہذب انسان لگ رہے ہیں...... ویسے مجھے تیمور احمد کہتے ہیں اور آپ......؟''

''میں...... نینا شاہد خان......''

''اب تو آپ خوف زدہ نہیں نا......'' وہ اس کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔

''نہیں......'' نینا گڑبڑا گئی۔

''اچھی بات ہے، اصل میں میری بہن یہاں اپنی چند دوستوں کے ساتھ آؤٹنگ پر آئی ہوئی ہے اسی علاقے میں...... میں اسی کو پک کرنے ہی آیا تھا مگر بارش کی وجہ سے راستہ بھٹک گیا۔''

''آپ کی بہن کا نام کیا ہے؟'' نینا نے پوچھا۔

''رمشا...... رمشا احمد۔'' وہ بولا۔

''اوہ......'' نینا اچانک اچھل سی پڑی۔ ''ارے تو آپ رمشا کے بھائی ہیں۔ ہم ساتھ ہی تو آئے ہیں۔ میں اس کی دوست ہوں، وہ سب باہر گئی ہیں۔ میرے پیٹ میں درد تھا اس لیے میں رک گئی تھی۔''

''اوہ۔'' وہ یک دم ہنس پڑا۔ ''یعنی میں بھٹکتا ہوا صحیح جگہ تک آ گیا تھا اور اب تو مجھے اس حقیقت کو جان کر دگنی خوشی ہو رہی ہے۔''

''مطلب؟''

''مطلب یہ کہ اگر میں آپ کی ڈانٹ ڈپٹ سے گھبرا کر یہاں سے چلا جاتا تو نہ جانے کتنی دیر اور کہاں کہاں بھٹکتا رہتا...... اب کم از کم منزل تو مل گئی۔''

ابھی اس نے بات مکمل ہی کی تھی کہ کسی کی پکار سنائی دی۔

''نینا کہاں ہو، کہا بھی تھا کہ ساتھ چلو...... اور بارش بھی تو کیسی زبردست ہوئی ہے...... اوہ بھائی آپ......'' وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہی دوڑ کے اس کے قریب آ گئی۔ اس کے ساتھ باقی لڑکیاں بھی موجود تھیں۔ وہ سب بارش کی وجہ سے شرابور ہو رہی تھیں۔ ان سب کے آخر میں رحمت بابا تھے جنہوں نے ایک پرانی سے چھتری پکڑ رکھی تھی۔ ''آپ کب آئے؟''

''کچھ دیر ہو گئی...... یہاں تو بجلیاں کڑک رہی تھیں اور جل تھل بھی اتنی تھی کہ بس......'' تیمور، نینا کی طرف دیکھ

UrduBooks.pk

کر بولا۔

"ہاں بھائی، یہ تو ہے اچانک ہی ایسی شدید بارش ہو گئی...... آپ فون تو کر لیتے......" رمشا اپنی دھن میں بولے جا رہی تھی۔

"لیکن پھر جو کچھ میں دیکھ پایا، وہ کیسے دیکھتا۔"

"کیا...... کیا دیکھ لیا آپ نے......؟"

"دل کو غلام بنا دینے والی جھل تھل اور......"

"ہاں بارش تو زبردست ہوئی......" وہ بولی۔ "چلیں اندر چل کر چائے پیتے ہیں۔"

اس رات انہیں وہیں ریسٹ ہاؤس میں رکنا پڑا تھا۔ اگلی صبح وہ سب ساتھ ہی واپس آئے تھے۔ سنہری رنگت، چمک دار بھورے بالوں، گہری آنکھوں اور معصومیت بھرے چہرے والی نینا، تیمور کے دل میں اتر گئی تھی۔ ایک سال کے مختصر سے عرصے میں ہی نینا مسز تیمور بن کر اس کے گھر میں آ گئی اور پھر اس کے ٹھیک ڈیڑھ سال بعد پریا ان کی زندگی میں آئی۔ پریا کی آمد نے ان تینوں کی زندگیوں کو بدل ڈالا تھا۔

تیمور نے ہاتھوں کو سر سے بلند کر کے انگڑائی لی۔ یوں لگتا تھا جیسے نینا کل ہی اس کی زندگی میں آئی ہو جبکہ کل ان کی شادی کی ساتویں سالگرہ تھی۔ اس دوران میں انہوں نے رمشا کی شادی اس کی پسند سے کر دی تھی مگر اس کی شادی چل نہیں پائی اور وہ دو سال بعد ہی گھر لوٹ آئی تھی۔ نینا نے کھلے بازوؤں سے اس کا استقبال کیا تھا۔ اسے اس صدمے سے باہر نکلنے میں کچھ وقت بہرحال لگا تھا مگر اب سب کچھ نارمل تھا۔ رمشا اب بھی اسکول میں پڑھا رہی تھی جبکہ نینا نے شادی کے بعد نوکری چھوڑ دی تھی۔

"اب نکلنا چاہیے ورنہ گھر میں موجود تینوں خواتین اس کا جینا دوبھر کر دیں گی۔" اس نے سوچا اور چیزیں سمیٹتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

ایس پی اسپیشل کرائم برانچ اسد خان بریفنگ روم میں دوسری قطار کی آخری نشست پر نیم دراز تھا۔ وہ اس وقت پولیس ڈپارٹمنٹ کے خصوصی بلاک کے ایک پریزنٹیشن ہال میں تھا جہاں اس کے ساتھ مختلف تفتیشی محکموں کے بیس سے زائد افسران موجود تھے۔

کچھ دیر بعد آئی جی صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ پچاس کے پیٹے میں تھے اور نہایت چاق و چوبند نظر آ رہے تھے۔ ان کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ ان کے بیٹھتے ہی ایک دراز قامت اور بھاری جسم والے آفیسر نے روسٹرم پر آ کر مائیک سنبھالا۔

"میرا نام شاہد سعید ہے اور میرا تعلق خفیہ ایجنسی سے ہے، میں اس کیس کا انچارج ہوں۔" اس کے اشارے پر عقب میں لگی بڑی سی اسکرین روشن ہو گئی۔ "آپ میں سے اکثر لوگوں کے علم میں ہوگا کہ کل رات شہر کے مضافات میں واقع بڑی جیل میں ایک حادثہ رونما ہوا ہے۔ آپ اس اسکرین پر وہاں موجود قیدیوں کو بے ہوش پڑا دیکھ سکتے ہیں۔"

تصویر میں کافی سارے قیدی زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ کچھ بینچوں پر تھے۔ کچھ کے گرد اُن کے کھانے کے برتن گرے پڑے تھے۔ ان کی تعداد ڈیڑھ سو سے زائد نظر آ رہی تھی۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ سب کھانا کھا رہے تھے۔ اس دوران میں ہی کچھ ایسا مسئلہ ہوا تھا کہ وہ کھانا مکمل بھی نہیں کر پائے۔

"جیسا کہ آج میڈیا کو بھی بتایا گیا ہے کہ تمام ہی قیدی فوڈ پوائزننگ کا شکار ہوئے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ گارڈز میں کسی کو بھی کچھ نہیں ہوا۔"

"کیا ان سب نے بھی یہی کھانا کھایا تھا؟" اسد نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" شاہد سعید نے سر ہلایا۔ "مگر ان میں سے کسی ایک پر بھی کوئی بُرا اثر مرتب نہیں ہوا...... بات صرف یہی نہیں ہے۔" اس نے عینک اتار کر روسٹرم پر رکھی۔ "یہ وہ کہانی ہے جو سب کو بتائی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ قیدی، بے ہوش نہیں ہیں۔" وہ ایک لمحے کو رکا پھر بولا۔ "یہ تمام کے تمام لوگ مر چکے ہیں۔"

ہال میں چند لمحوں کے لیے مکمل سکوت طاری ہو گیا تھا پھر کمرا سرگوشیوں سے بھر گیا۔ اسد اس جیل کے بارے میں جانتا تھا وہاں بڑے خطرناک جرائم میں ملوث بدترین عادی اور سفاک مجرموں کو رکھا جاتا تھا۔ اس نے ہونٹ سکیڑے۔

"پلیز بات مکمل ہونے دیں۔" شاہد سعید نے کہا۔ "یہاں ہمارے ساتھ انسپکٹر صدیق موجود ہیں جو اس حادثے یا حملے کے لمحے بھر میں جیل پہنچ چکے تھے۔ یہ اس ساری کارروائی کے شاہد ہیں اور آپ کو فرسٹ ہینڈ معلومات فراہم کر سکتے ہیں۔"

"ہم نے یہ دیکھا کہ تمام قیدی کھانا ملنے کے چند لمحوں بعد ہی موت کا شکار ہو گئے بلکہ ان میں سے تو کئی نے شاید

UrduBooks.in

کھانا کھایا بھی نہیں تھا۔ دوسری بات جیسا کہ ابھی سر نے کہا ہے گارڈز میں سے کسی کو بھی کچھ نہیں ہوا ہے حالانکہ ان میں سے کئی نے وہی کھانا کھایا تھا اور سب سے عجیب بات یہ ہے کہ ہمیں اب تک کے تمام ٹیسٹ میں کھانے میں کسی قسم کے زہر یا گڑبڑ کا کوئی نشان نہیں ملا ہے۔'' انسپکٹر نے چند مزید سلائڈز دکھاتے ہوئے تفصیلات بتائیں۔

اسد اب مکمل طور پر کیس کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔ اسے ان مجرموں کی زندگی اور موت سے کچھ خاص دلچسپی نہیں تھی۔ کیونکہ اس کے خیال کے مطابق انصاف کا تقاضا پورا ہوا تھا مگر اس کیس کی پُراسراریت اسے اپنی جانب کھینچ رہی تھی۔

''یعنی آپ کے کہنے کے مطابق کھانے میں زہر نہیں تھا نہ ہی ہوا میں کسی قسم کے کیمیائی اثرات یا گیس ملی ہے؟'' پہلی قطار میں موجود ایک شخص سے افسر نے سوال کیا۔ ''میرا سوال یہ ہے کہ آپ کو کوئی ثبوت نہیں ملا؟''

''نہیں، یہ مکمل سچ نہیں ہے۔'' شاہد سعید نے جواب دیا۔ کچھ تو ہمیں ملا ہے۔ تفصیلی تلاشی میں ہمیں ہر قیدی کے تکیے کے اندر ایک ٹیگ سلا ہوا ملا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ تکیوں کی تبدیلی میں یہ فیکٹری میں ہی لگایا گیا تھا۔'' اس نے اسکرین کی جانب اشارہ کیا جہاں ایک انچ کا چھوٹا سا ٹیگ نظر آ رہا تھا جس پر انگریزی حروف میں ایم ایم (MM) لکھا صاف نظر آ رہا تھا۔ ''ہم اس کیس میں کوئی بظاہر معمولی نظر آنے والی چیز کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے نہ ہی کر رہے ہیں...... اب آپ سب کو کیس تفصیلات کی پوری فائل دی جا رہی ہے۔ یہ ایک بڑا اور حساس کیس ہے۔ ہمیں اس قتلِ عام کی وجہ، طریقہ کار کو جاننا ہے اور اس کے ذمے داروں تک پہنچنا بھی ہے مگر یہ ایک سیکرٹ کیس ہے۔ اس کے بارے میں کسی قسم کی تفصیلات کو عام نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ سب سمجھ گئے ہوں گے۔ ہمارے خیال کے مطابق ہمیں ان مجرموں کے لواحقین سے ملنا چاہیے شاید ان سے کچھ معلومات مل سکیں۔''

اسد خاموشی سے سب کچھ سن رہا تھا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ تفتیش کا آغاز غلط سرے سے کیا جا رہا تھا۔ انہیں اس ایم ایم کے ٹیگ، تکیوں کی فیکٹری اور کھانا فراہم کرنے والی کمپنی سے آغاز کرنا چاہیے۔ میٹنگ ختم ہونے سے قبل شاہد سعید نے ان سب کو ہر چیز ہیڈ آفس میں رپورٹ کرنے اور بغیر اجازت کوئی قدم نہ اٹھانے کی ہدایت کی۔

کار اسٹارٹ کرتے ہوئے اس کا ذہن کیس میں الجھا ہوا تھا اگرچہ فائل اور ہدایات کی رُو سے اسے سب سے پہلے چار افراد سے ملنا تھا جو کہ چار ہلاک شدگان سے تعلق رکھتے تھے مگر اسد خود فیصلے لینے کے لیے ہی ڈپارٹمنٹ میں مشہور بلکہ بدنام تھا۔ اس نے گاڑی گھمائی اور ایکسلیریٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔ اس کا رخ جائے وقوعہ کی طرف تھا۔

☆☆☆

''تو آخر کل کا پروگرام ہے کیا؟'' رمشا نے صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''جی ڈاڈا...... کل کیا کرنا ہے؟'' پریسا نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

''آپ بتائیں کیا کرنا چاہیے؟'' تیمور نے اسے گود میں لے کر پیار کرتے ہوئے پوچھا۔

''سالگرہ میں کیک کاٹتے ہیں، کھانا کھاتے ہیں، گھومنے جاتے ہیں اور کیا؟'' وہ سادگی سے بولی۔ ''ڈاڈا، مما کا گفٹ کہاں ہے اور مجھے بھی گفٹ لانا ہے۔''

''ارے میری جان تم تو خود ہمارا گفٹ ہو، سب سے اچھا۔'' نیتا نے آئسکریم کی ٹرے کو میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں...... پریسا کو مما کے لیے گفٹ لینا ہے۔'' پریسا دوبارہ بولی۔

''اچھا یار دے دینا، ابھی آئسکریم سے نمٹ کر سپر مارکیٹ سے لے آؤ اور ہاں آنی کے لیے بھی گفٹ لانا مت بھولنا......'' رمشا، پریسا کو چھیڑتے ہوئے بولی۔

''آپ کی برتھ ڈے نہیں ہے کل۔'' پریسا نے اپنا ننھا سا سر نفی میں ہلایا۔

'ارے تو پھر کیا ہوا؟ تم مجھے گفٹ دو، میں تمہیں لے دوں گی...... ڈن......؟''

'ڈن۔'' پریسا کھلکھلائی۔ ''مما بھی ساتھ جائیں گی ان کی پسند کا گفٹ لیں گے۔''

''رمشا تم بھی ساتھ چل رہی ہو۔'' نیتا نے کہا۔

''نیتا یار آج بہت تھک گئی ہوں۔ تم لوگوں کو ایک گھنٹا تو لگے گا۔ میں اتنی دیر میں فریش ہو جاؤں گی۔''

''ایک گھنٹا...... اتنی دیر نہیں رکوں گا میں......'' تیمور نے اعلان کیا۔

''نہیں لگے گی زیادہ دیر...... تھوڑی سی خریداری مجھے کرنی ہے اور کچھ پریسا کو...... آپ اس دوران میں سڑک سے دوسری طرف والے بڑے بک اسٹور پر ونڈو ریڈنگ کر لینا......'' نیتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''او کے میڈم...... غلام اب کیا کہہ سکتا ہے۔'' تیمور

نے مسخرے پن سے کہا۔

"ڈن ڈاڈا......" پریسا آئسکریم سے بھرے منہ سے بولی۔

☆☆☆

بڑی جیل کے اردگرد سخت سیکیورٹی نظر آرہی تھی۔ اسد خان کی گاڑی کو کئی جگہ روکا گیا۔ ہر بار اس کی شناخت پوچھی گئی۔ آخرکار آدھے گھنٹے بعد وہ متعلقہ انچارج کے سامنے پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔

"میں اس کیس پر کام کررہا ہوں اور جائے وقوعہ کا خود جائزہ لینا چاہتا ہوں۔"

"اوکے...... کہنے کی ضرورت تو نہیں مگر کسی چیز کو چھونا مت...... تم جائزہ لے سکتے ہو، ویسے یہاں اب دیکھنے کو کچھ خاص بچا نہیں ہے۔" اس کے چہرے اور لہجے میں تھکن اور بیزاری نمایاں تھی۔

وہاں سے تمام لاشیں اٹھائی جاچکی تھیں۔ باقی سب کچھ اسی طرح بکھرا ہوا تھا۔ فارنسک کی ایک ٹیم اب کچرا دانوں میں موجود اشیا کو جمع کررہی تھی۔

"میرا تو خیال تھا کہ تم لوگ اپنا کام ختم کرچکے ہوگے؟" اسد کو ان میں اپنا ایک پرانا ساتھی نظر آیا۔

"ہاں اسد کرچکے تھے مگر چونکہ کھانے کے ان سیمپلز میں ہمیں کچھ گڑبڑ نہیں ملی اس لیے ہم نے سوچا کہ ہم ہر پلیٹ میں موجود کھانے اور ڈسٹ بن سے بھی کچھ سیمپل لے چلیں۔"

"میرے خیال سے تو ہم یہ سعیِ لاحاصل کررہے ہیں۔" دوسرے اہلکار نے کندھا جھٹکا۔

"اگر کھانے میں کچھ ہوتا تو گارڈز پر بھی اثر ہونا چاہیے تھا۔"

"کیا یہ کسی خاص گیس وغیرہ کا کام ہوسکتا ہے؟" اسد نے پوچھا۔

"نہیں، ایسا ہوتا تب بھی اس کا اثر تمام لوگوں پر ہوتا۔"

وہ چند لمحے وہیں کھڑا رہا پھر کچن میں موجود جیل اہلکار کی جانب مڑا۔ وہ ذہنی طور پر منتشر نظر آرہا تھا۔ ظاہر ہے کہ موت کو اس قدر قریب سے دیکھنا آسان تجربہ نہیں تھا۔ اسد اسے دیکھ کر مسکرایا اور پھر اسے ساتھ لے کر ملحقہ برآمدے کی جانب مڑا۔

"میں تمہیں زیادہ زحمت نہیں دینا چاہتا یوں بھی تمہیں اس وقت آرام کی ضرورت ہے۔ بس یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ آج کا کھانا یہیں تیار ہوا تھا۔ سامان وغیرہ کب خریدا گیا تھا؟"

"نن نہیں، آج کا کھانا یہاں تیار نہیں ہوا۔ ہر بدھ کو تمام قیدیوں کا کھانا ایک ادارے سے آیا کرتا ہے۔"

"کیا مجھے اس ادارے کا نام مل سکتا ہے؟"

"ہاں کیوں نہیں...... مگر اس سے چھان بین ہوچکی ہے اور جب کھانے میں کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے تو اس سے زیادہ تفتیش کا فائدہ؟"

"مجھے تمہاری رائے نہیں، ان کا پتا اور نام وغیرہ چاہیے۔" اسد نے اسے گھورا۔

اگلے لمحے کھانا سپلائی کرنے والے اس ادارے کی تفصیلات اس کے فون میں محفوظ ہوچکی تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ جیل سے باہر آچکا تھا۔ وہ آج ہی اس ادارے تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اگرچہ انہیں کلیئر قرار دیا جاچکا تھا مگر پھر بھی اس کی چھٹی حس اسے اس سمت سے کام کرنے کا اشارہ دے رہی تھی۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ گاڑی اب تیز رفتاری سے شہر کی طرف واپس جارہی تھی۔

☆☆☆

تیمور نے سُپر مارکیٹ سے قدرے پیچھے گاڑی روکی...... وہاں اس وقت کافی رش ہورہا تھا۔

"لیجیے آگیا آپ کا سُپر مارٹ...... اب آپ دونوں غور سے سنیں...... آپ کو اپنا کام آدھے گھنٹے میں ختم کرنا ہے۔" وہ گویا اعلان کرتے ہوئے بولا۔

"بالکل...... جناب عالی، ہم ٹائم فریم کا خیال رکھیں گے مگر آپ بھی اپنی ونڈو ریڈنگ کے چکر میں ہمیں بھول مت جائیے گا۔" نینا اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرائی۔ تیمور اسے دیکھتا رہ گیا۔ گزرتے سالوں نے اس کی شخصیت پر کچھ زیادہ اثر نہیں ڈالا تھا۔ بس وہ ہلکی سی صحت مند ہوگئی تھی مگر وہ اسے پہلے سے زیادہ خوب صورت لگتی تھی۔ تیمور خود کو ہر روز اس کی محبت کا پہلے سے زیادہ اسیر پاتا تھا۔ سچ یہی تھا کہ شخصیت، سیرت اور اچھے دل و دماغ کا حُسن ہی محبت کو قائم رکھنے کی اصل وجہ ہوتا ہے۔ نینا نے اس کے گھر کو اور ان سب کی زندگیوں کو خوشیوں سے بھر دیا تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہیں......؟ اب ہم اتریں؟" نینا نے اس کے کندھے کو چھوا۔

"آ...... ہاں...... اور ہاں زندگی ختم ہونے سے پہلے تو تم دونوں کو بھولنے کا تصور بھی محال ہے نینا......" اس کی آواز بھاری ہوگئی۔

''اوہ...... ارے میں تو مذاق کر رہی تھی۔'' وہ اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر مسکرائی۔ ''اب آپ مسکرائیں تاکہ میں اتر سکوں اور ہاں ہمارا ٹائم اسٹور میں داخل ہونے کے بعد سے شروع ہوگا۔''

''او کے ملکۂ عالیہ......'' تیمور نے سر تسلیم خم کیا۔

اس نے سر ہلایا اور وہ دونوں ہنستی مسکراتی گاڑی سے اتر گئیں۔ تیمور کو گاڑی مزید پیچھے نکال کر پھر راؤنڈ اباؤٹ سے گھوم کر سامنے موجود بک اسٹور تک جانا تھا۔ وہ ان کے اسٹور میں داخل ہونے کا منتظر تھا۔ نینا اور پریسا ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے مارٹ کے شیشے کے بڑے سلائڈنگ ڈور تک پہنچیں۔ نینا نے مڑ کر اسے ہاتھ ہلایا اور پھر وہ دونوں اندر داخل ہو گئیں۔ ان کے اندر جانے کے بعد دروازہ بند ہوتا، اس سے قبل ہی ایک شخص اسٹور سے تیزی سے بھاگتا ہوا باہر نکلا۔ اس کی قمیص بے ترتیب ہو رہی تھی۔ چہرے پر سخت بدحواسی تھی۔ اس کی شخصیت میں سب سے واضح چیز اس کے لمبے بال تھے جو اس وقت ہوا سے اڑ رہے تھے۔ وہ تیزی سے آگے نکل گیا۔ تیمور نے بریک پر پیر رکھا۔ یک دم اسے عجیب سی گھبراہٹ نے آلیا تھا۔ وہ فوراً نینا اور پریسا کے پاس پہنچنا چاہ رہا تھا۔ بک ریڈنگ کا پروگرام کینسل کر کے اس نے دروازے کی جانب ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ فضا کان پھاڑ دینے والے زوردار دھماکے سے گونج اٹھی۔ ایک بہت بڑا دھماکا ہوا تھا جس نے اس کی بینائی کو کچھ دیر کے لیے نگل لیا تھا۔ تیز گرم ہوا کے شدید جھونکے نے تیز رفتار سیلاب کے مانند اس کی کار کو دور دھکیل دیا۔ اس کا سینہ اسٹیئرنگ وہیل سے ٹکرایا اور سر ونڈ شیلڈ میں جا کر لگا۔ اسے اپنے ہونٹوں پر خون کا ذائقہ محسوس ہو رہا تھا۔

''یہ...... یہ ہو کیا رہا ہے؟'' اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا مگر جبلت نے اسے فوری طور پر نیچے جھکنے پر مجبور کر دیا اسی لمحے کھڑکی کا شیشہ پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا۔ اس کے اردگرد گویا قیامت صغریٰ کا سماں تھا۔ تیمور کی گاڑی یکلخت اچھلی اور الٹ گئی۔ وہ بری طرح پھنسا ہوا تھا۔ اس کے سر اور سینے سے خون بہہ رہا تھا مگر وہ کسی بھی طرح کار سے باہر نکلنا چاہ رہا تھا۔ اس نے خود کو گھسیٹا اور بمشکل کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے کے درمیان سے باہر نکلنے کی کوشش کی۔ اس کوشش نے اس کے ہاتھوں، پیروں اور جسم کو زخمی کیا تھا مگر اس وقت اسے کچھ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ باہر نکل کر اس نے گہری سانس لی۔ فضا میں موجود بارود اور کیمیکل نے اس کے پھیپھڑوں میں جیسے آگ سی بھر دی۔ اس نے بمشکل خود کو گھسیٹ کر کھڑا ہونے کی کوشش کی۔ اسے ہر قیمت پر اپنے خاندان تک پہنچنا تھا۔ وہ تیزی سے مارٹ کی طرف مڑا اور ساکت ہو گیا۔ وہاں اب اسٹور موجود نہیں تھا۔ آگ کے شعلے اور گہرے سیاہ دھوئیں نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ تیمور نے آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر اس کے پیر جم سے گئے۔

''نینا...... پریسا......'' وہ پھیپھڑوں کے بل چلایا اور تیزی سے دوڑتا ہوا اس جگہ پہنچا جہاں صرف دو لمحے قبل شیشے کا سلائڈنگ ڈور موجود تھا۔ وہ اندر داخل ہو کر زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ وہ دونوں تو بس ابھی اندر داخل ہوئی تھیں...... انہیں کچھ نہیں ہوا ہوگا......'' وہ پاگلوں کی طرح ملبے میں گھس گیا تھا۔ نینا کو دھوئیں سے الرجی تھی اور پریسا...تو بہت ڈری ہوگی۔ اللہ اسے اس کی بچی سے ملا دے...... آنسو اس کا چہرہ بھگو رہے تھے۔ وہ چیخ چیخ کر ان دونوں کو پکار رہا تھا مگر اس کی ہر پکار کے جواب میں چاروں جانب سے آتی پولیس سائرن کی آواز کے سوا کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔

☆☆☆

اسد کھانا سپلائی کرنے والے ادارے کی عمارت کے باہر کھڑا تھا۔ عمارت کی پچھلی جانب تین بڑے ٹرک نظر آ رہے تھے۔ وہ ریسیپشن پر پہنچا تو وہاں ایک خاتون بیٹھی فون پر کسی سے گپ شپ کر رہی تھی۔

''ہمارے دفتر کا وقت ختم ہونے والا ہے۔ اگر آپ کو بکنگ کرانی ہے تو پلیز صبح تشریف لائیں۔'' وہ اسے دیکھ کر بولی۔

''میڈم مجھے آپ سے صرف چند سوال کرنے ہیں۔'' اس نے ایک کارڈ اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''او کے...... مگر میں شاید آپ کی زیادہ مدد نہیں کر سکوں گی۔''

''آپ کی کمپنی نے بڑی جیل میں کھانا سپلائی کیا تھا؟''

''جی جی، ہم ہر ہفتے میں ایک روز وہاں کھانا سپلائی کرتے ہیں۔ اس بدھ کو بھی کھانا بھجوایا گیا تھا۔''

''کھانا وہاں کون لے کر گیا تھا؟''

''ایک منٹ......'' اس نے مڑ کر دیوار پر لگی کیبنٹ سے فائل تلاش کی اور پھر کہا۔ ''نعمان خان اس بدھ کو وہی کھانا لے کر گیا تھا۔ اس حادثے کے بارے میں سنا ہے

میں نے...... بہت لوگ بیمار پڑے ہیں مگر شکر ہے کہ کھانے میں کچھ نہیں تھا۔ پولیس ہمارے ہیڈ آفس آئی تھی۔“

”یہ آپ کا ہیڈ آفس نہیں ہے؟“ تیمور نے پوچھا۔

”نہیں...... یہ تو ویئر ہاؤس ہے جہاں سے سپلائی ہوتی ہے۔“

”کیا میں اس نعمان خان کی کوئی تصویر دیکھ سکتا ہوں۔ اگر آپ کے پاس موجود ہو......؟“

”جی...... یہ دیکھیے ہم فائل میں پورے کوائف رکھتے ہیں۔“ خاتون نے فخریہ انداز میں فائل اس کی طرف بڑھائی۔ فائل کے سائڈ کور پر اس کی تصویر موجود تھی۔ وہ موٹے نقوش والا ایک عام سا چہرہ تھا۔ تیمور نے اسے غور سے دیکھا اور فائل واپس کردی۔

”گریٹ...... کیا یہ شخص اس وقت یہاں ہوگا؟“

”ہاں، میرا خیال ہے پیچھے ٹرک میں ہوگا۔ ابھی اس کا ڈیوٹی ٹائم ختم نہیں ہوا۔ آپ کہیں تو میں اسے یہاں بلوا لیتی ہوں۔“

”نہیں، نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے، میں خود جا کر اس سے بات کرلیتا ہوں اگر کوئی مسئلہ نہ ہو تو......“

”نہیں، نہیں۔ آپ جا سکتے ہیں۔ وہ پچھلی طرف ہے۔“ وہ مسکرائی اور پھر فون کی طرف متوجہ ہوگئی۔ اسد ریسیپشن سے نکل کر پچھلے حصے کی طرف مڑ گیا۔ دو ٹرکوں کے سامنے سے گزرنے کے بعد اسے وہ نظر آگیا، وہ ٹرک کے ٹائر کو صاف کررہا تھا۔

”تم نعمان ہو نا؟“ اسد نے اس کے قریب پہنچ کر پوچھا۔

”جی......“ اس نے سر ہلایا اور کھڑا ہوگیا۔ اس کی آنکھوں سے عیاری نمایاں تھی۔

”میں اسد خان ہوں۔ ایس پی اسد خان......“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتا ہوا بولا۔ ”مجھے تم سے کچھ سوالات کرنے ہیں۔“

”جی...... پوچھو......“

”تم نے بدھ کو بڑی جیل میں کھانا پہنچایا تھا؟“

”تو......؟“

”تو یہ کہ تم جانتے ہوگے کہ وہاں ایک حادثہ ہوگیا۔ اس دن اسی کھانے کو لے کر کافی بڑا مسئلہ پیدا ہوا ہے جو تم نے وہاں پہنچایا تھا۔“ اسد نے قدرے سختی سے کہا۔

”ہاں، میں نے سنا ہے کہ کچھ لوگ بیمار پڑ گئے ہیں مگر ہمارے کھانے میں کچھ نہیں نکلا۔“

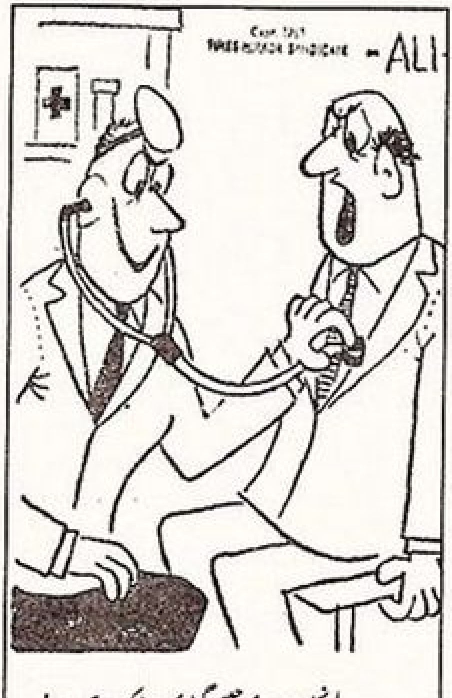

یہ دل نہیں، میری جیبی گھڑی دھڑک رہی ہے!

”بیمار نہیں...... وہ سب مر گئے ہیں نعمان، پولیس اور میڈیا شہر میں خوف پھیلنے اور گڑبڑ رکنے کے لیے اس خبر کو روکے ہوئے ہے۔“

”کیا......؟“ نعمان کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”مگر...... مگر...... انہوں نے تو کہا تھا......“ وہ کچھ کہتے کہتے اچانک رکا اور پھر مڑ کر بھاگنے لگا۔

اسد نے ہولسٹر سے پسٹل نکالا اور اس کے پیچھے دوڑا۔ نعمان اس کو جھکائی دے کر باہر کی طرف دوڑے جا رہا تھا۔ اسد بھی اس کے پیچھے بھاگا۔

”یہ...... یہ کہاں گیا؟“ اسد ہاتھ میں پستول لیے تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھا۔ نعمان کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ اچانک ایک پرانی سیاہ کار باہر آئی۔ اسد اچھل کر ایک طرف نہ ہٹ گیا ہوتا تو کار اسے ٹکر مار چکی ہوتی۔ نعمان اس کار میں موجود تھا۔ اسد دوڑ کر اپنی گاڑی تک پہنچا اور تیزی سے کار کو ریورس کرکے نعمان کے پیچھے چل پڑا، اس کا پیر ایکسلریٹر پر تھا۔ سیاہ کار کی رفتار خاصی تیز تھی۔ اسد نے پولیس ایمرجنسی نمبر پر اس کی کار کا نمبر لکھوایا۔ اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ نعمان کے اس ردِعمل نے واضح کردیا تھا

کہ گڑبڑ تھی اور بہت زیادہ تھی۔ اس گڑبڑ کا سرا اس نعمان سے ہی مل سکتا تھا۔ سڑک آگے قدرے تنگ ہوتی جارہی تھی۔ یہ کارروائی کے لیے مناسب جگہ تھی۔ اسد نے گاڑی کی رفتار تیز کی اور سیاہ کار کے قریب پہنچ کر اسے بائیں سمت دھکا دیا۔ نعمان نے کار کو بمشکل کنٹرول کیا مگر دوسری ٹکر پرانی کار کے لیے کافی ثابت ہوئی۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی آگے بڑھی اور فٹ پاتھ سے ٹکرا کر رک گئی۔ ا[illegible] نے کار روکی، پھرتی سے نیچے اتر کر سیاہ کار کے ٹائر پر فائر کر دیا۔ اب نعمان اس کے شکنجے سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ نعمان کار سے نکل گیا تھا مگر وہ اسے نظر نہیں آرہا تھا۔ اسد دونوں ہاتھوں میں پسٹل تھامے آگے بڑھا۔ اس کی ساری توجہ سیاہ کار پر تھی۔ اچانک ہلکے سے دھماکے کی آواز کے ساتھ وہ لڑکھڑا گیا، اس کی بائیں پنڈلی کے پاس سے جیسے ایک انگارا سا ٹکراتا ہوا گزر گیا تھا۔

اسد نے بمشکل خود کو سنبھالا اور کار کی سائڈ میں پناہ لی۔ یہ نعمان اس کی توقع سے زیادہ بدمعاش ثابت ہورہا تھا۔ اس نے دو قدم آگے بڑھائے۔ نعمان نے دوسرا فائر کیا جو اس کے سر پر سے گزر گیا۔ نعمان اب اس کی کار کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس کے اندازے کے مطابق وہ دروازے کے پیچھے ہی موجود تھا۔ وہ جھک کر چل رہا تھا۔

’’تین۔‘‘ اسد نے دہرایا۔ وہ تین گولیاں ضائع کر چکا تھا۔ اسد کھسکتا ہوا گاڑی کی دوسری سمت پہنچ چکا تھا۔

’’بس کھیل ختم......‘‘ اس نے اس آواز پر عقب میں دیکھا۔ نعمان اس سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا ہانپ رہا تھا۔ اس کے ریوالور کی نال اسد کی طرف تھی اور اس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔

’’دیکھو یہ مسئلے کا حل نہیں ہے۔ میں رپورٹ کر چکا ہوں، تم بچ نہیں سکو گے اس لیے بہتر ہے کہ ہتھیار ڈال دو......‘‘ وہ بولا۔

نعمان جواب میں ہذیانی طور پر ہنسا تھا۔ اسد کو صرف ایک لمحہ درکار تھا اس نے سڑک پر پڑے پتھر کو ٹھوکر سے اچھالا۔ پتھر نعمان کے پیٹ پر لگا تھا۔ اس نے گھبراہٹ میں گولی چلادی۔ اسد جھکائی دے کر پیچھے ہٹا اور نعمان کے پستول والے ہاتھ پر گولی چلائی۔ عین اسی لمحے نعمان پیچھے ہٹا اور گولی اس کے بازو کے بجائے اس کے سینے میں پیوست ہوگئی۔ وہ کٹے ہوئے شہتیر کے مانند زمین پر گر پڑا۔ اس کے سینے سے خون بہہ رہا تھا۔ اسد تیزی سے اس کے قریب آیا۔ جھک کر اس کی ناک کے سامنے اپنا ہاتھ رکھا۔

وہ مر چکا تھا۔ اس کا واحد سراغ کھو گیا تھا۔

اسد نے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ دور سے پولیس کار کا سائرن اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔

☆☆☆

تیمور نے بمشکل آنکھیں کھولیں۔ اس کے پپوٹے حد سے زیادہ بھاری ہورہے تھے۔ آنکھیں کھولتے ہی اس کو انہیں دوبارہ بند کرنا پڑا۔ اردگرد موجود روشنی نے انہیں چندھیا دیا تھا۔ اس کے سر میں دھماکے ہورہے تھے۔ اس نے ایک لمحے کے بعد دوبارہ آنکھیں کھولیں۔ وہ ایک صاف ستھرے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ سامنے ٹی وی کی طرح کی ایک اسکرین موجود تھی۔ بستر کے ساتھ بھی کئی طرح کی مشینیں اور اسکرین منسلک تھیں جن پر نشان اور لکیریں بن اور مٹ رہی تھیں۔ دروازے پر ایک نرس موجود تھی۔

’’تو میں اسپتال میں ہوں۔‘‘ یہ اس کی پہلی سوچ تھی۔

’’مگر کیوں؟‘‘ دوسری سوچ سوال بن کر آئی تھی۔ اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی مگر جسم میں اٹھنے والے شدید درد نے اس کی کوشش ناکام بنادی۔ اس کے جسم پر بینڈیجز بندھے ہوئے تھے۔ آخر اسے کیا ہوا ہے؟ کیا اس کی کار کا حادثہ ہوا ہے؟ یا وہ کہیں سے گر گیا ہے...... یا؟ اس نے ذہن پر زور ڈالا اور پھر ایک دھماکے سے اسے سب کچھ یاد آگیا۔ اس کا خاندان...... وہ سپر مارٹ...... وہ دیوانہ وار بھاگتا ہوا لمبے بالوں والا لڑکا...... آگ کا وہ گولا...... جلتی ہوئی گاڑیاں اور وہ قیامت...... نینا...... پریا......

’’نرس......نرس......‘‘ وہ بے اختیار چلایا۔

’’جی...... جی...... مسٹر تیمور...... شکر ہے خدا کا کہ آپ ہوش میں آگئے۔‘‘

’’نرس......‘‘ وہ بمشکل بول پا رہا تھا۔ اس کا منہ بالکل خشک ہورہا تھا۔ ’’میری بیوی...... میری بیٹی...... وہ کہاں ہیں؟ وہ اس مارٹ میں گئی تھیں، کیا آپ نے انہیں دیکھا ہے۔ پلیز مجھے بتایئے وہ کہاں ہیں؟‘‘

’’تیمور صاحب...... مجھے بہت افسوس ہے۔‘‘ وہ اس کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ’’سپر مارٹ میں موجود تمام افراد اس دھماکے میں جاں بحق ہوگئے ہیں۔ کاش میں آپ کو کوئی امید دلا سکتی مگر ایسا نہیں ہے۔‘‘

’’نہیں...... یہ نہیں ہوسکتا۔‘‘ وہ چلایا۔ اس کا دل پھٹا جارہا تھا۔ ’’یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اس طرح اچانک...... وہ دونوں اتنی دور کیسے جاسکتی ہیں......‘‘ اس نے ہاتھ سے لگی

نلکیوں کو گھسیٹ دیا۔

''مجھے یہ سب نہیں چاہیے مجھے نینا اور پریسا کے پاس جانا ہے...... مجھ پر مہربانی کرو اور مجھے مرنے دو......'' وہ دیوانہ وار چلا رہا تھا۔ نرس نے اس کے ہاتھوں کو پکڑنے کی کوشش کی اور بیڈ کے ساتھ لگے ایمرجنسی بٹن کو دبایا۔ چند لمحوں میں کمرا ڈاکٹرز سے بھر گیا تھا۔

☆☆☆

''تم...... ایس پی اسد خان...... ابھی اسی لمحے سے اس کیس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔'' شاہد سعید شدید غصے میں تھا۔

''کیا تمہیں یہ سب کرنے کے لیے کہا گیا تھا؟ تمہیں صرف ان افراد کے خاندان والوں سے گفتگو کرنا تھی۔ ہمیں علم ہے کہ یہ ایک سیکرٹ کیس ہے۔ اب ہمارے پاس ایک گواہ ہے جو ہمارے افسر کے ہاتھوں مارا گیا ہے، میں اس بات پر میڈیا کو کس طرح مطمئن کروں گا اور یہ نقصان کون بھرے گا؟''

''یہ کیس اتنا سادہ نہیں ہے اور میں نے صرف اپنی ڈیوٹی کی ہے۔'' اسد نے کندھے اچکائے۔

''تمہاری ڈیوٹی صرف وہ ہے جو تمہیں کرنے کو کہا جائے۔'' شاہد سعید نے کہا۔ ''فی الحال تو تمہیں اس کیس سے ہٹایا جا رہا ہے اور یہ حکم اوپر سے آیا ہے۔''

''مجھے اس سے بھی کوئی مطلب نہیں ہوتا کہ مجھے کس کیس پر رکھا جا رہا ہے اور کس پر نہیں...... مگر یہ ضرور کہوں گا کہ آپ کو اس سپلائی کرنے والی کمپنی میں مزید چھان بین کرنی چاہیے۔'' اسد نے کہا اور سیلیوٹ کر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھنے کے بعد اس نے زخمی پیر کو چند لمحے باہر ہی رکھا۔ اس کی گاڑی اس مقابلے میں کافی ٹوٹ پھوٹ گئی تھی جس کے بعد اس نے فوری طور پر کرائے کی یہ گاڑی حاصل کی تھی۔ وہ چند لمحے اسٹیئرنگ پر ہاتھ دھرے سوچتا رہا۔ اسے اس وقت کیا کرنا چاہیے؟ اس کا پہلا قدم کیا ہونا چاہیے؟ سوچتے سوچتے اس کے ذہن میں شہزاد امین کا خیال آیا۔

''یس، شہزاد امین اس کے کام آسکتا ہے۔'' اس نے سوچا۔ شہزاد ایک ماہر ہیکر تھا۔ چند سال پہلے ہیکنگ کے سلسلے میں ایک کیس میں پھنس گیا تھا تب اسد نے اس کی مدد کی تھی۔ وہ اسد کا ممنون و احسان مند تھا اور اس سے اکثر رابطے میں رہتا تھا۔ اس وقت وہ اس کی مدد کر سکتا تھا۔ اسد نے جیب سے سیل فون نکالا اور اس کا نمبر ملایا۔ چند سیکنڈز کے بعد فون پر شہزاد کی کرنگ دار آواز ابھری۔

''جی سر...... آپ کیسے ہیں؟''

''میں ٹھیک ہوں۔ آج مجھے تمہاری صلاحیتوں کی ضرورت پڑ گئی ہے۔''

''کیوں نہیں...... میری خوش نصیبی ہے۔''

''تم مصروف تو نہیں......؟''

''آپ کے لیے تو بالکل نہیں۔''

''ٹھیک ہے پھر میں تمہیں ایک گھنٹے میں کال کرتا ہوں۔'' اسد نے کال کاٹی اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

☆☆☆

تیمور کو اسپتال سے مکمل رخصت مل گئی تھی۔ چھٹی سے قبل ڈاکٹرز نے اس پر واضح کر دیا تھا کہ اسے مکمل صحت یابی میں کئی ہفتے لگ سکتے ہیں۔ اس کی تین پسلیاں ٹوٹی ہوئی تھیں جبکہ پشت اور ہاتھوں پیروں پر خاصی چوٹیں آئی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ...... ہفتے، مہینے یا سال کیا وہ تمام عمر اب ٹھیک نہیں ہو سکتا...... ڈاکٹرز کا خیال تھا کہ وہ ان چند خوش قسمتوں میں سے ایک تھا جو اس بھیانک حادثے میں بچ سکے تھے۔ تیمور ایسا محسوس نہیں کر رہا تھا۔ خوش قسمت لوگوں کو اپنے خاندان کو اپنی آنکھوں کے سامنے اس طرح موت کے منہ میں جاتا نہیں دیکھنا پڑتا...... رمشا کی حالت بھی بہت بری تھی۔

''بھائی......'' رمشا گھر میں داخل ہوتے ہی سسک اٹھی تھی۔ ''پریسا اور نینا...... ہم ان کے بغیر کیسے رہیں گے؟''

''اللہ مالک ہے رمشا......'' اس نے بہن کے سر پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اس کا اپنا دل بھر آیا تھا۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ گھر میں ہر جگہ نینا کی خوشبو تھی۔ پریسا کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اچانک دو ننھی باہیں اس کے گلے کا ہار بن جائیں گی اور ''ڈاڈا کو فول بنا دیا'' کے ساتھ اس کی کھنکتی ہنسی دکھ کی اس گہری دھند کو غائب کر دے گی۔

رمشا کو اس کے کمرے میں بستر پر لٹا کر، اور کمبل اوڑھا کر آرام کرنے کی تلقین کر کے وہ اپنے کمرے میں آگیا تھا۔ کمرے بھر میں نینا ہر جگہ موجود تھی...... وہ کرسی پر بیٹھ کر رونے لگا...... یہ کیسی قیامت ہے کسی کے لیے صرف دو جملے کی خبر مگر کسی کے لیے پوری عمر کا خاتمہ...... جیتے جی مرجانا اور پھر اپنی ہی لاش کو اپنی آنکھوں سے چلتے پھرتے دیکھنا آسان کام نہیں تھا۔ اب اسے اپنی بچی ہوئی تمام عمر اسی مشکل کے ساتھ گزارنی تھی۔

فون کی گھنٹی نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ اس نے ہاتھ کی پشت سے آنسوؤں کو پونچھا اور کال ریسیو کی۔ یہ واحد تھا۔

''تیمور خود کو تنہا مت سمجھنا، میں ہوں تمہارے ساتھ، تمہیں کچھ بھی درکار ہو تو لمحہ بھر ضائع کیے بغیر مجھے فون کرنا......'' وہ بولا۔ ''اور ہاں میں نے تمہارے لیے دوسری کار بھجوادی ہے، لڑکا نیچے چوکیدار کو چابی دے آیا ہے.... فی الحال اسے استعمال کرو۔''

تیمور نے سر ہلایا اور فون بند کر دیا۔ اگلے کئی دن اسی دھند کے جزیرے پر گزر رہے تھے۔ رمشا تمام دن نماز اور قرآن میں خود کو مصروف رکھے ہوئے تھی یا پھر بھائی کو کچھ کھلانے کی کوشش کرتی۔ دو تین دن بعد تیمور نے پہلی بار خبریں سنیں۔ ''کل شام ایک شخص پولیس ایس پی کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس حادثے کے بارے میں تفصیلات نہیں بتائی گئی ہیں۔ سُپر مارٹ والے حادثے کے بارے میں ابتدائی رپورٹیں سامنے آگئی ہیں۔'' حادثے کے متعلق خبر کے آغاز پر وہ مکمل طور پر ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''کہا جا رہا ہے کہ اس بھیانک سانحے کی وجہ اسٹور کے نیچے سے گزرنے والی گیس لائنیں تھیں۔ اس سانحے میں ڈیڑھ سو کے قریب افراد جاں بحق ہوئے ہیں اور مارٹ کی پوری عمارت غائب ہو گئی ہے۔''

دھماکے کی خبر ختم ہوتے ہی تیمور نے ٹی وی بند کر دیا۔ وہ چند لمحے خالی اسکرین کو دیکھتا رہا پھر اٹھ کر میز کے پاس گیا۔ اپنا فون اٹھایا اور پولیس اسٹیشن کا نمبر ملایا۔ اس کا دل اور دماغ دونوں اس بات پر متفق تھے کہ یہ ایک حادثہ نہیں تھا۔ عمارت سے بھاگتے ہوئے نوجوان کی تصویر اس کے تصور میں لہرا رہی تھی۔

''میں تیمور احمد ہوں، مجھے سُپر مارٹ کیس کے انچارج سے بات کرنی ہے۔''

''جی فرمایئے۔'' چند لمحوں بعد اسے کسی ذمے دار سے کنکٹ کر دیا گیا تھا۔ ''میرا نام سینئر انسپکٹر شمس الدین ہے اور میں اس کیس کی تفتیش کر رہا ہوں۔''

''جی...... میں تیمور احمد ہوں۔ میری بیوی اور بیٹی اس حادثے......'' الفاظ اچانک گویا آنسوؤں کی جھیل میں ڈوب گئے اور آواز حلق میں اٹک گئی تھی۔

''جی...... آپ زخمی تھے اسی لیے میں نے آپ کو زحمت نہیں دی...... مجھے آپ کا بیان درکار تھا۔''

''کیا میں کل صبح دس بجے آپ سے مل سکتا ہوں؟'' تیمور نے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

''جی...... بالکل آپ ضرور تشریف لایئے۔'' دوسری طرف سے جواب آیا۔

فون بند کر کے بھی تیمور گیس لائن والے مفروضے پر سوچتا رہا۔

☆☆☆

''یہ آسان کام نہیں ہے سر اور رسک تو بہت زیادہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ نے اس بارے میں سوچ لیا ہو گا۔'' شہزاد امین تیس برس کی عمر کا ایک عام سا نوجوان تھا۔

''کام مشکل سے زیادہ ٹیکنیکل ہے اور رازداری کا متقاضی بھی، اسی لیے میں نے تمہارا انتخاب کیا ہے۔'' اسد مسکرایا۔ ''تمہیں بڑی جیل سے ایک مخصوص تاریخ کا کیمرا ریکارڈ نکال کر لانا ہے۔''

''میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا ہے کہ آپ تو وہ کوریج سرکاری طور پر بھی حاصل کر سکتے ہیں پھر اسے اس انداز میں کیوں لینا چاہتے ہیں؟''

''شہزاد تمہیں ہر بات کو سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے، تم یہ کام کر سکتے ہو یا نہیں......؟ سوال صرف یہ ہے۔'' اسد نے خشک لہجے میں پوچھا۔

''میں ضرور کروں گا......ٹھیک ہے۔''

اگلے ہی روز کوریج اسد کے سامنے تھی۔ ''یہ ہیں ہمارے حفاظتی انتظامات......'' وہ دل ہی دل میں کڑھ رہا تھا۔ کسی جائز طریقے سے اگر کوئی کسی بھی وجہ سے یہ کوریج حاصل کرنے کی کوشش کرتا تو ہزار دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا اور شاید تب بھی اس کا حصول ممکن نہیں ہوتا۔ کوریج میں اس کی ہدایت کے مطابق کھانے کا ٹرک اور کھانا نکالنے کے مراحل دیکھے جا سکتے تھے۔ نعمان کے ٹرک سے کھانا اتارا جا رہا تھا۔ اس کی نمبر پلیٹ پر بھی فوکس تھا۔ سب کچھ عام معمول کے مطابق تھا۔

کوریج دیکھنے کے بعد اسد نے گہری سانس لی۔

''اس میں تو ایسا کچھ خاص نہیں ہے۔'' شہزاد بولا۔

''ہاں...... مگر اس میں نعمان کا ٹرک موجود ہے۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ بڑی جیل جانے اور آنے والی سڑک پر دونوں اطراف ہائی ریزولیشن کیمرے احتیاطی تدبیر کے طور پر لگائے گئے ہیں اور ان کا ریکارڈ ایک ماہ تک تلف نہیں کیا جاتا۔ کیا تم اس سڑک پر موجود کیمروں کے ریکارڈ تک پہنچ سکتے ہو؟ یہ سب گزشتہ سال کیا گیا ہے اور سب کچھ کمپیوٹرائزڈ ہے۔ اگر تم محکمے کی ویب سائٹ کے انتظامی

حصے میں داخل ہو جاؤ تو ریکارڈ مل جائے گا۔"

"ایک حکومتی ادارے کی ویب سائٹ میں گھس کر ریکارڈ نکالنے کا مطلب جانتے ہیں آپ؟" شہزاد نے پوچھا۔ "وہاں یقیناً کوئی سافٹ ویئر ہوگا جو اس ہیکنگ کا پتا لگا سکے گا، انسانوں سے معاملہ کرنا آسان ہوتا ہے کیونکہ وہ آپ کا ہتھیار بن جاتے ہیں۔"

"ہمیں یہ کام کسی بھی طریقے سے کرنا ہے۔"

"آپ دیکھنا کیا چاہتے ہیں۔" شہزاد نے پوچھا۔

"اس ٹرک کو جیل تک آتا ہوا اور اگر راستے میں یہ کہیں رکا ہو تو اس کی تفصیل......"

"اوکے...... میں کوشش کرتا ہوں۔"

شہزاد نے اپنا کام کر دکھایا تھا۔ نعمان کے ٹرک کی کوریج اب اسد کے سامنے تھی۔ بڑی جیل کی جانب مڑنے والی دو میل کی سڑک قدرے غیر آباد تھی۔ نعمان کا ٹرک درمیان تک پہنچ کر رک گیا۔ اسد دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ ٹرک سڑک کی ایک جانب چند لمحے کھڑا رہا پھر نعمان نیچے اترا اور اس نے انجن کو دیکھنا شروع کیا۔ ساتھ ہی وہ سیل پر کسی سے بات بھی کر رہا تھا۔ چند منٹ بعد ہی ایک دوسرا ٹرک سڑک پر نظر آیا۔ ٹرک نعمان کے ٹرک کے قریب آ کر رک گیا۔ کسی آٹومیٹک سسٹم کے تحت ٹرک کا پچھلا حصہ خود بخود کھل گیا جس کے بعد نعمان نے اپنے ٹرک میں موجود سامان اتارنا شروع کر دیا۔ کچھ ہی دیر بعد دونوں ٹرکوں میں موجود سامان میں ادلا بدلی مکمل ہو گئی۔ دوسرے ٹرک کو اس زاویے سے کھڑا کیا گیا تھا کہ ڈرائیور کو کیمرے میں نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ کام مکمل ہونے کے بعد ڈرائیور سے منسلک نشست سے کسی نے نعمان کو بلایا تھا۔ اس شخص نے جھک کر نعمان سے کچھ کہا تھا۔ اس کا چہرہ اب بھی نظر نہیں آ رہا تھا مگر اس کے لمبے سیاہ بال یہ واضح کر رہے تھے کہ وہ کوئی مرد نہیں، عورت تھی۔

"یہاں زوم کرو......" اس نے زور سے کہا۔

شہزاد نے اس منظر کو مزید واضح کر کے روک دیا۔

"اوکے...... اس ٹرک کا نمبر بھی نوٹ کرو......" اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر بعد وہ اپنے فلیٹ کی طرف واپس جا رہا تھا۔ اس کی ٹانگ میں بھی قدرے درد تھا۔ اس کا ذہن سوالات سے بھرا ہوا تھا۔ وہ عورت کون تھی؟ اس کا جیل والی واردات سے کیا تعلق ہو سکتا تھا؟

وہ جانتا تھا کہ اب اس کیس میں مداخلت اس کی نوکری کھا سکتی تھی مگر وہ اسد تھا۔ جبکہ اسے اس کیس میں بہت کچھ غلط نظر آ چکا تھا، اسے چھوڑنا اب ممکن نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اسے یہ کیس حل کرنا تھا یہی طریقہ اسے ترقی اور عزت دلا سکتا ہے۔ اسے خود کو ثابت کرنا تھا۔

☆☆☆

تیمور اس وقت انسپکٹر شمس الدین کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر کا دبلا پتلا شخص تھا جس کے سر کے سارے بال سفید تھے۔ ماتھے پر مستقل شکن موجود تھی۔ وہ ہمدردی بھری نگاہوں سے تیمور کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"اب تک کی تفتیش سے جو کچھ سامنے آیا ہے، اس سے یہی اندازہ ہو رہا ہے کہ یہ دہشت گردی کی واردات نہیں ہے۔ ہمیں وہاں کسی قسم کے بم وغیرہ کے اثرات یا بقایاجات نہیں ملے۔ ماہرین کے مطابق مارٹ کے نیچے موجود گیس لائن میں کہیں سوراخ وغیرہ ہوئے اور پھر آخرکار وہ پھٹ گئی جس سے اسٹور میں موجود بوائلر پھٹا اور دھماکا ہو گیا۔"

"آپ...... آپ کو یقین ہے کہ یہ صرف ایک حادثہ تھا؟" تیمور نے بمشکل پوچھا۔

"ہمیں وہاں سے کسی بھی قسم کے بارود کے ٹکڑے یا اثرات نہیں ملے ہیں۔ ہمیں آپ کا بیان بھی لینا ہے کیا آپ اس وقت بیان دے سکتے ہیں؟"

تیمور کی پسلیوں میں شدید درد ہو رہا تھا۔ تکلیف اتنی شدید تھی کہ سانس لینا بھی دوبھر ہو رہا تھا۔ "میں نے بک اسٹور جانے کے لیے کار ریورس ہی کی تھی کہ اچانک دھماکا ہوا اور میری کار الٹ گئی جیسے ہی میں باہر نکل پایا۔ نینا اور پریسا کو ڈھونڈنے اسٹور میں گھس گیا تھا...... مگر ہاں، ایک عجیب بات یہ تھی کہ دھماکے سے چند لمحے قبل میں نے اسٹور سے ایک شخص کو بھاگتے دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر سخت بدحواسی تھی۔"

"کیا آپ کو اس کا حلیہ وغیرہ یاد ہے؟"

"ہاں...... اس کی قمیص سفید رنگ کی تھی۔ بلیو جینز پہنے ہوئے تھا۔ اس کے لمبے سیاہ بال تھے اور اس کی عمر 25 سال کے ارد گرد تھی۔"

"اوکے...... ہو سکتا ہے کہ اس کی باڈی بھی ہمیں ملی ہو، میں اس معاملے کو دیکھوں گا۔ آپ کو کوئی اور بات یاد آئے تو پلیز ہمیں بتائیے گا۔"

تیمور نے سر ہلایا اور نشست سے کھڑا ہو گیا۔ "کیا آپ کو یقین ہے کہ یہ صرف ایک حادثہ تھا...... میرا مطلب

UrduBooks.pk

ہے کہ صرف پرانی گیس لائن پھٹنے کی وجہ سے اسے بہت سارے لوگ اپنی جانیں کھو بیٹھے ہیں؟"

"میں اس معاملے کی چھان بین میں آخری حد تک جاؤں گا مگر جو کچھ سامنے آرہا ہے، اس سے یہی نتیجہ نکل رہا ہے۔"

تیمور نے سر ہلایا اور کمرے سے باہر نکلتا چلا گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے دھواں سا چھا رہا ہے۔ کاش...... وہ اس روز ان دونوں کے ساتھ اسٹور میں چلا گیا ہوتا...... کاش وہ لوگ شاپنگ کرنے جاتے ہی نہیں...... کاش! اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

☆☆☆

ایک مسلسل تیز آواز کسی ہتھوڑے کے مانند اس کی سماعت میں سوراخ کر رہی تھی۔ اس نے سر جھٹک کر اس سے پیچھا چھڑانا چاہا مگر ممکن نہ ہو سکا بالآخر وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔

سائڈ ٹیبل پر رکھا اس کا فون مسلسل بج رہا تھا۔ اس نے منہ بنا کر ایک نظر گھڑی پر ڈالی۔ صبح کے دس بج رہے تھے۔ بالآخر اس نے فون ریسیو کر لیا۔

"اسد میں سعدیہ سلیم بول رہی ہوں، پہچانا تم نے......؟" ایک قدرے جانی پہچانی آواز نے اس کی سماعت کو چھوا۔

"سعدیہ...... ہاں، ہاں...... تم تو فرانسک میں تھیں۔"

سعدیہ کرمنالوجی میں اس کی کلاس فیلو رہی تھی پھر وہ مزید تعلیم حاصل کرنے ملک سے باہر چلی گئی تھی۔ درمیان میں دو چار بار ان کا رابطہ ہوا تھا۔ "کیسی ہو؟ کیا حال ہے؟ کیا کر رہی ہو؟"

"میں نے فون کیا ہے تو ساری تفصیلات یاد آ گئی ہیں جناب کو، ورنہ کوئی خبر ہی نہیں تھی۔" وہ بولی۔ "میرے پاس تمہارا نمبر نہیں تھا تمہاری برانچ سے لیا ہے، معلوم ہوا کہ تم بڑی جیل والے سانحے پر کام کر رہے ہو؟"

"کر رہا تھا...... فی الحال سسپنڈ کر دیا گیا ہوں۔" وہ جمائی لے کر بولا۔

"یہ بھی معلوم ہوا اور اسی سے اندازہ ہوا کہ تم ذرا بھی نہیں بدلے ہو اور اسی لیے میں نے تمہیں کال کی ہے۔ اسد میں اس وقت نیشنل فرانسک کو دیکھ رہی ہوں۔"

"واؤ۔"

"اس کیس کی تمام فرانسک تفتیش ہمارے پاس ہی آرہی ہے، مجھے اس کیس کے بارے میں کچھ نئی چیزیں معلوم ہوئی تھیں۔ میں نے سوچا کہ شاید ان کو جاننے سے تمہیں خود کو درست ثابت کرنے میں مدد مل سکے۔"

"تمہارا بہت شکریہ سعدیہ، معلوم ہوا کہ تم بھی نہیں بدلیں، طالب علمی کے دور میں بھی ہمیشہ تم دوسروں کی مدد کے لیے تیار رہتی تھیں۔" اسد نے خوش دلی سے کہا۔ "کیا معلوم ہوا ہے تمہیں؟"

"جب تمام کھانوں میں کسی چیز کے اثرات نہیں ملے تو میں نے گارڈز کے بلڈ سیمپل پر کام کیا اور مجھے خون کے ان سیمپلز سے کچھ دلچسپ معلومات ملی ہیں۔"

"گارڈز کے نمونوں سے؟ مگر انہیں تو کچھ نہیں ہوا تھا؟"

"ہاں اصل میں، میں نے یہ سوچا کہ جب لاشوں اور کھانے کے نمونوں سے کچھ نہیں مل پا رہا تو شاید ان گارڈز میں کچھ ایسا ڈھونڈ پاؤں جس کی وجہ سے وہ محفوظ رہے...... اور تم حیران ہو گے کہ مجھے کچھ ملا ہے۔"

"کیا......؟" اسد نے بے تابی سے پوچھا۔

"تمام گارڈز کے سسٹم میں ڈائی تھیلین کی مقدار ملی ہے۔ یہ دوا امیون سسٹم (قوتِ مدافعت) میں بہت اضافہ کرتی ہے۔"

"اوکے......" اسد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "تو اب سوال یہ ہے کہ انہیں قوتِ مدافعت میں اس قدر اضافے کی ضرورت کیوں تھی؟ اور کس چیز سے محفوظ رہتا تھا اور یہ بھی کہ وہ ان کے جسم میں کس طرح داخل کی گئی؟"

"اس بارے میں، میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی...... مگر اس سے ایک بات سامنے آئی ہے کہ انہیں کسی چیز کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے تحفظ دیا گیا تھا۔ کوئی ایسی چیز جو اس ڈائی تھیلین کے بالکل متضاد اثرات رکھتی ہو......" وہ سنسناتے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"یعنی تم یہ کہہ رہی ہو سعدیہ کہ اس دوا کی کوئی پارٹنر دوا ہے جو اس کی متضاد ہے اگر اچھی دوا قوتِ مدافعت کو مضبوط کرتی ہے تو اس کی الٹ دوا اسے لمحے بھر میں برباد کر سکتی ہے اور کھانے میں یا کسی اور طرح جس چیز نے قیدیوں کو موت کا تحفہ دیا، گارڈز اس سے محفوظ رہے اس کی وجہ وہی دوا بنی ہو......"

"یہی محسوس ہو رہا ہے کہ میں اس پر اور یہ دوا کس طرح قیدیوں اور گارڈز تک پہنچ سکتی ہے پر کام کر رہی ہوں۔"

"تم نے واقعی بہت اہم بات معلوم کی ہے، کیا تم میرے لیے ایک کام اور کر سکتی ہو؟ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم فی الحال اس کا ذکر ڈپارٹمنٹ میں نہ کرو...... ہمیں مضبوط شواہد کے ساتھ آگے جانا ہوگا ورنہ ایسا نہ ہو کہ تمہیں بھی کام کرنے سے روک دیا جائے۔"

"میں سمجھ سکتی ہوں۔ میں نے خود بھی سوچا ہے یوں بھی ابھی ہمیں پوری بات معلوم ہی نہیں ہے۔ تم مطمئن رہو اور محتاط بھی۔" اس نے یہ کہہ کر لائن کاٹ دی۔

☆☆☆

تیمور احمد نے گاڑی کا دروازہ کھولا مگر سیٹ پر نظر ڈالتے ہی وہ ساکت سا ہو گیا تھا۔ اس کی سیٹ پر ایک سفید لفافہ رکھا ہوا تھا اس نے چاروں جانب دیکھا۔ پارکنگ لاٹ میں سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ لفافہ اس کی لاکڈ کار کے اندر کیسے پہنچا......؟ کار کا لاک بالکل درست حالت میں تھا۔ دروازے، کھڑکیاں سب ٹھیک ٹھاک تھے۔ اس نے سر جھٹکا۔ سیٹ پر بیٹھ کر دروازہ بند کیا اور لفافے کو اٹھا کر اس کا جائزہ لیا۔ لفافہ اچھے قیمتی کاغذ سے تیار کیا گیا تھا۔ اس کے دائیں جانب ابھرے ہوئے ابھوں میں انگریزی حروف میں "ایم ایم" لکھا تھا۔ یہ ایم ایم کیا ہو سکتا ہے؟ بالآخر اس نے لفافہ کھولا۔ اس کے اندر ایک تہ کیا ہوا کاغذ موجود تھا۔ تیمور نے اسے کھولا۔ کاغذ کے عین درمیان بڑے بڑے حروف میں چار الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ "یہ حادثہ نہیں تھا۔" وہ پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کیا کوئی اسے یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ وہ دھما کا حادثہ نہیں تھا۔ وہ کوئی سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔ ایک حملہ تھا۔ اس نے کاغذ کو مٹھی میں بھینچ لیا۔ پہلے اس نے سوچا کہ اسے یہ کاغذ انسپکٹر کو دکھانا چاہیے پھر دوسری سوچ نے پہلی کو فی الحال مسترد کر دیا۔ اس وقت وہ صرف قبرستان جانا چاہتا تھا نینا اور پریسا کے پاس...... باقی سب وہ بعد میں دیکھنے والا تھا۔

☆☆☆

اسد کو شہزادامین کی کال کا انتظار تھا بالآخر اس نے خود ہی اس سے رابطے کی ٹھانی۔ "کچھ مزید معلوم ہوا۔ دوسرے ٹرک کی منزل کیا تھی اگر تم ان روڈ کیمرا کوریج کا ریکارڈ ہیک کر سکتے ہو تو یہ جاننا مشکل نہیں ہونا چاہیے۔"

"بالکل سر، ابھی کچھ ہی دیر پہلے بہت کام کی بات معلوم ہوئی ہے، میں آپ کو کال کرنے ہی والا تھا مگر کارڈ ختم ہو گیا تھا۔"

"تمہیں خرچہ مل جائے گا، خبر کیا ہے؟"

"خرچے کی بات نہیں مگر مل جائے تو بھی اچھا ہے۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔ "وہ ٹرک مضافاتی علاقے میں ہی ایک مل کے قریب رکا تھا۔ میں آپ کو اس جگہ کا پتا واٹس ایپ کر سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے کر دو تمہارا خرچ تمہیں مل جائے گا۔"

کال کاٹنے کے بعد وہ سیل کو اس وقت تک گھورتا رہا جب تک بیپ کی آواز نے میسج آ جانے کی اطلاع نہ دی۔ میسج ہاتھ میں آتے ہی وہ تیر کے مانند باہر نکلا تھا۔ اس کا سروس ریوالور اس کی جیب میں تھا۔

ایک گھنٹے میں وہ بتائی گئی جگہ پر موجود تھا۔ یہ ایک خاصی ویران جگہ تھی۔ وہ کارخانہ جس کے عقب میں وہ ٹرک رکا تھا وہاں بھی کسی انسان کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ اسد نے جیب سے موبائل نکال کر ارد گرد کی کچھ تصاویر بنائیں۔ وہ چند قدم آگے بڑھا تھا کہ اس کے پیر کے نیچے کچھ چبھا، اس نے جھک کر نیچے دیکھا وہ کسی پائل کا ٹکڑا تھا۔ اس نے اسے اٹھا کر اس کا جائزہ لیا اور پھر جیب میں ڈال دیا۔ یک دم اس کی چھٹی حس نے الارم بجایا۔ وہ تیزی سے مڑا مگر اس کے عقب میں کچھ نہیں تھا۔ اس نے آگے جانے کے لیے قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ اس کے سر پر کسی وزنی چیز کا وار لگا۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور لڑکھڑا کر زمین پر گرا، ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ زمین پر گرنے کے بعد اس نے اندھوں کی طرح ٹٹول کر پسٹل تلاش کرنے کی کوشش کی۔ اتنی دیر میں سر کے پچھلے حصے میں پڑنے والے دوسرے وار نے اسے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا۔

☆☆☆

وہ گھر پہنچا تو اندر ہر طرف اندھیرے کا راج تھا جبکہ رمشا کو گھر پر ہی ہونا چاہیے تھا۔ وہ لائٹس جلاتا ہوا آگے بڑھا۔ رمشا کہاں تھی؟ اس حادثے کے بعد سے وہ خود اپنے غم میں اس بری طرح گرفتار تھا کہ اسے رمشا کی طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہیں ملی تھی۔ وہ بھی تو دکھ کے اس سمندر میں اسی طرح سے ڈوبی ہوئی تھی۔

"رمشا کہاں ہو تم......؟" اس نے اس کے کمرے میں داخل ہو کر آواز دی۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ کچن، اسٹڈی، لاؤنج، ڈرائنگ روم وہ کہیں بھی نہیں تھی۔ تیمور کی دہشت بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے رمشا کے نمبر پر کال ملائی مگر فون بھی بند جا رہا تھا۔ آخر تھک کر وہ لاؤنج میں پڑے صوفے پر گر پڑا۔ یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا؟ اس کے ہنستے بستے گھر

کو کسی کی نظر لگ گئی تھی۔ اس کی محبت نیتا اور اس کی جان پریسا اس سے الگ ہو گئے تھے اور اب رمشا......

پریسا کا خیال آتے ہی وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے پریسا کے کمرے میں نہیں دیکھا تھا۔ ان کے جانے کے بعد وہ اس کمرے میں جانے سے گریز کرتا آیا تھا۔ رمشا، پریسا کے کمرے میں اس کے بیڈ کے قریب زمین پر آڑی ترچھی پڑی تھی۔ اس نے پریسا کے ٹیڈی بیئر کو اپنے بازوؤں میں لپیٹ رکھا تھا۔ تیمور اس کے قریب پہنچ کر ٹھٹک گیا۔ وہ شاید روتے روتے سو گئی تھی۔ گالوں پر آنسوؤں کے نشان اب بھی نمایاں تھے۔ تیمور اس کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ اپنی اس ذمے داری سے کیسے بے پروا ہو گیا تھا۔ امی، رمشا کو اس کے سپرد کر کے گئی تھیں اور وہ کیا کر رہا تھا۔ اس نے رمشا کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”بھائی......“ رمشا نے ایک لمحے بعد ہی آنکھیں کھول دیں۔ ”سب ختم ہو گیا۔“

”نہیں...... وہ دونوں چلی گئی ہیں لیکن ہمارے دل میں تو ہمیشہ رہیں گی۔“ وہ بولا۔

”مجھے بھی ان کے پاس جانا ہے بھائی...... میں نے آج بہت سوچا...... یہ گولیاں بھی نکالیں مگر پھر آپ کے خیال نے روک لیا۔“ وہ سادگی سے کہہ رہی تھی۔ اس کے الفاظ نے تیمور کو لمحہ بھر کے لیے ساکت کر دیا۔

”نہیں رمشا...... ایسا کبھی سوچنا بھی نہیں۔ یہ گناہ ہے میرے بچے۔ کیا تمہیں بھائی سے محبت نہیں ہے...... اور اگر ایسا کیا تو پریسا اور نیتا بھی خوش نہیں ہوں گی......“ وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ ”تم مجھ سے وعدہ کرو کہ اب تم ایسا کبھی نہیں سوچو گی۔“ جواب میں وہ خاموش سی اسے دیکھتی رہی تھی۔ ”چلو اٹھو منہ ہاتھ دھو کر آؤ میں پیزا آرڈر کر رہا ہوں۔“

”بھائی بھوک نہیں۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

”تب بھی، کھانا ہو گا۔“ اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس رات اس نے بہت سوچا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اسے اور رمشا کو اپنا کام شروع کرنا چاہیے۔ دل کے زخم کو اب کبھی نہیں بھرنا تھا مگر معمولات اور مصروفیات کا مرہم اسے کچھ مندمل ضرور کر سکتا تھا۔

☆☆☆

اسد کا سر گویا پھٹا جا رہا تھا۔ اس نے بمشکل آنکھیں کھولیں مگر اندھیرا اب بھی اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے دوبارہ کھولیں پھر اپنا ہاتھ اپنی ہی آنکھوں کے سامنے لہرایا مگر وہ کچھ بھی دیکھ نہیں پا رہا تھا۔

”کیا وہ اندھا ہو گیا ہے۔“ اس نے سوچا۔ پھر اس نے اٹھنے کا فیصلہ کیا اور چکراتے ہوئے سر کے ساتھ بمشکل کھڑا ہوا۔ وہ احتیاط سے ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کی یہ احتیاط ہی اس کے کام آئی۔ چند قدموں کے بعد زمین گویا ختم ہو رہی تھی۔ وہ تیزی سے پیچھے ہٹا اور زمین پر بیٹھ کر ہاتھوں سے اندازہ کر کے آگے کھسکنے لگا۔ چاروں جانب کہیں کوئی دیوار نہیں تھی۔ ہر جگہ چند قدموں کے بعد خلا سا آ جاتا تھا جیسے وہ کسی بڑی سی پلیٹ میں بیٹھا ہو۔ وہ کہاں تھا؟ یہ کون سی جگہ تھی؟ اسے یہاں کیوں لایا گیا تھا اور زندہ کیوں رکھا گیا تھا اور کیا وہ واقعی اندھا ہو گیا تھا؟ سوالات اس کے ذہن میں چکرا رہے تھے۔ اچانک ٹک کی ہلکی سی آواز نے اس کی سماعت کو چھوا اور پھر کمرا بالکل روشن ہو گیا۔ اچانک روشنی کے جھماکے نے اسے آنکھیں بند کر لینے پر مجبور کر دیا تھا مگر اس کے ساتھ اس کے اندر اطمینان کا گہرا احساس جاگا تھا۔ وہ دیکھ سکتا تھا۔ ایک لمحے کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔ آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا سا بنا کر ارد گرد کا جائزہ لیا۔ وہ واقعی ایک گول سی جگہ پر تھا مگر وہ زیادہ اونچی جگہ نہیں تھی۔ اس گول سی جگہ کے چاروں جانب اسٹیل کا فرش موجود تھا۔ اسد نے گولے سے نیچے قدم رکھنا چاہا مگر ایک زوردار جھٹکے نے اسے واپس پلٹنے پر مجبور کر دیا۔ اس گول پناہ گاہ کے چاروں جانب گویا کرنٹ دوڑ رہا تھا۔

”خوش آمدید ایس پی اسد خان......“ ایک بارعب اور بھاری آواز نے اسے چونکا دیا۔

”تم...... تم کون ہو؟ میرا نام کیسے جانتے ہو؟“ وہ بے اختیار بولا۔

”اسد صاحب آپ سے درخواست ہے کہ آپ صرف سنیں...... آپ فی الحال یہاں ایک قیدی ہیں۔ اگر آپ نے فرار ہونے کی کوشش کی تو آپ کا عمدہ لاش میں بدل جائے گا۔“ آواز ایک لمحے کو غائب ہوئی پھر دوبارہ گونجنے لگی۔ ”یہ ہمارا میگنیٹک چیمبر ہے۔ اگر آپ نے فرار ہونے کی کوشش کی تو یہ میگنیٹک ریز آپ کو مار ڈالیں گی۔“

”کک کون ہو تم لوگ؟“

”جب تک پوچھا نہ جائے بات کرنے سے گریز کریں، یہ آپ کے لیے آخری وارننگ ہے۔ یہ یہاں کا قاعدہ ہے۔ خاموش رہیں۔ فرار کی کوشش نہ کریں۔ آپ محفوظ رہیں گے...... آخر میں، میں آپ کو ایک بار پھر خوش

آمدید کہتا ہوں...... ایم ایم کی جانب سے خوش آمدید......"

اس کے ساتھ ہی خاموشی چھا گئی۔

اسد زمین پر دراز ہو گیا۔ یعنی بہرحال وہ صحیح جگہ تک پہنچ گیا تھا۔ بس اب اسے یہ جاننا تھا کہ ایم ایم کیا ہے اور اس کا بڑی جیل کے قتلِ عام سے کیا تعلق ہے؟

☆☆☆

وقت کا کام گزرنا ہے۔ خوشی سے یا تکلیف سے...... خوبی یہی ہے کہ وقت اچھا ہو یا بُرا، گزر ہی جاتا ہے۔ سُپر مارٹ کے حادثے کو دو ماہ گزر گئے تھے۔ پولیس اس کیس کو حادثہ قرار دے کر بند کر چکی تھی۔ میڈیا بھی نئے حادثوں کی کوریج میں گزشتہ کو بھول چکا تھا۔ صرف ان خاندانوں کے افراد کے لیے وہ سب اتنا ہی تکلیف دہ اور تازہ تھا۔ تیمور اور رشاد دکھ کی اس دیوار کے ساتھ جینا سیکھ رہے تھے۔ دونوں نے ہی خود کو بہت مصروف کر لیا تھا۔ اس شام بھی تیمور کافی دیر سے دفتر سے نکلا تھا۔ پارکنگ لاٹ میں اب اِکا دُکا گاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ اس کی توجہ سامنے سے گزرتی سیاہ لیکسس پر پڑی۔ اس گاڑی کو وہ کئی بار دیکھ چکا تھا۔ شاید اس کے مالک کا دفتر بھی اسی بلڈنگ میں ہو گا۔ اس نے کندھے اچکائے، اپنی کار کا دروازہ کھولا۔ بریف کیس کو اندر رکھنے کے لیے وہ جھکا تو پسنجر سیٹ پر ایک لفافہ دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ اس نے اندر بیٹھ کر لفافہ اٹھایا، اس کی توقع کے عین مطابق قیمتی کارڈ کے اس لفافے کے دائیں جانب ابھرے ہوئے امبوس میں انگریزی حروف ایم ایم کندہ تھے۔ اس لفافے میں کوئی کاغذ رکھا ہوا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اس کی جگہ کوئی سخت سی چیز تھی۔ تیمور نے لفافہ کھولا اس میں ایک پلاسٹک کے کور میں ایک ڈسک موجود تھی۔ کور کے اوپر جو الفاظ لکھے تھے۔ وہ تیمور کا دماغ اُڑانے کے لیے کافی تھے۔ اس پر لکھا تھا۔ "سپر مارٹ فوٹیج۔"

اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ وہ جلد از جلد گھر پہنچ کر یہ ڈسک دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ آنکھیں سکڑی ہوئی تھیں اور پیر ایکسلریٹر پر دباؤ بڑھاتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

اسد کے لیے دن رات ایک جیسے ہو گئے تھے۔ وہ تمام وقت اس اندھیرے کمرے میں بنی پلیٹ پر رہ رہا تھا۔ دن میں دو مرتبہ دو گارڈز اسے کھانے پینے اور دیگر ضروریات کے لیے کمرے سے باہر لے جاتے جس کے بعد اسے دوبارہ کمرے میں بند کر دیا جاتا تھا۔ ان دنوں میں کتنی ہی بار اس نے گارڈز سے بات کرنے کی کوشش کی مگر ان کی خاموشی توڑنے میں ناکام رہا۔

اس کی اب تک سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے اس طرح اغوا کرنے کی وجوہات کیا تھیں؟ اگر وہ ان کی راہ میں آ رہا تھا تو ان سیکڑوں قیدیوں کی طرح اسے قتل کیوں نہیں کر دیا گیا؟ اس وقت بھی وہ ورزش کرتے ہوئے اسی اُدھیڑبُن میں تھا کہ پہلے روز والی بھاری آواز دوبارہ کمرے میں گونجی۔ آواز کے ساتھ ہی بتیاں بھی روشن ہو گئی تھیں۔

"اسد صاحب! امید ہے آپ ٹھیک ہوں گے۔ آج میرے پاس آپ کے لیے ایک خاص بلکہ بہت ہی خاص خبر ہے اور وہ یہ ہے کہ آج آپ کو اس قید سے رہا کیا جا رہا ہے۔"

اسد ساکت کھڑا سن رہا تھا۔ اسے یقین ہو رہا تھا کہ اب یہ لوگ اسے مار ڈالیں گے۔ شاید یہ اس کی رہائی ہو یا پھر یہ کسی قسم کا مذاق بھی ہو سکتا تھا۔

"کیا آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

وہ جواب میں خاموش رہا۔

"کوئی بات نہیں، مجھے اندازہ ہے کہ اتنے دنوں کی مسلسل خاموشی کے بعد بولنا کچھ عجیب ہی لگ رہا ہو گا بہرحال اس کمرے سے تمام سیکیورٹیز ہٹائی جا رہی ہیں۔ گارڈز پانچ منٹ بعد آپ کو عمارت سے کچھ دور چھوڑ دیں گے۔ اس کے بعد اپنا راستہ ڈھونڈنا آپ کا کام ہے۔ میری طرف سے آپ کے لیے نیک خواہشات...... کوشش کیجیے گا کہ مظلوم اور بے گناہ افراد کے مددگار بن سکیں۔" ان الفاظ کے ساتھ خاموشی چھا گئی۔ اسد کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد دو گارڈز کمرے میں داخل ہوئے اور اس کے بازو پکڑ کر اسے عمارت کے بیرونی دروازے کے قریب لے آئے۔ ان میں سے ایک نے اس کی آنکھوں پر سیاہ رنگ کی پٹی باندھ دی، دوسرے نے اسے ہاتھ پکڑ کر ایک گاڑی میں بٹھایا۔ یہ کوئی بڑی گاڑی تھی کیونکہ اس کی نشستیں کار سے مختلف تھیں۔

گاڑی کچھ دیر چلتی رہی پھر رک گئی۔ گارڈز نے اسے گاڑی سے اتار دیا۔ ان کے ہٹتے ہی اس نے آنکھوں سے پٹی اتار دی۔ اتنے دنوں بعد سورج کی روشنی دیکھ کر وہ سجدے میں گر پڑا تھا۔ اسے ہرگز یقین نہیں تھا کہ وہ اس قید سے اس طرح آزاد بھی ہو سکتا ہے۔ وہ چند لمحے زمین پر پڑا رہا پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس جگہ تھا مگر یہ خوشی ہی بہت تھی کہ وہ زندہ تھا اور آزاد تھا۔ ایک

گھنٹے کے پیدل سفر نے اسے قدرے پکی سڑک کے کنارے پر پہنچا دیا تھا۔ کئی بار کی کوشش کے بعد بالآخر اسے لفٹ مل گئی تھی۔

”مجھے شہر تک لفٹ درکار ہے یا جہاں تک آپ جارہے ہوں وہاں تک بھی چھوڑ دیں تو مہربانی ہوگی۔“ وہ بمشکل بول پایا تھا۔ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر پینتیس چالیس سال کا ایک اسمارٹ شخص براجمان تھا۔ اس کی آنکھوں پر ریم لیس گلاسز تھے۔

”ضرور...... آپ کسی حادثے کا شکار ہوئے ہیں۔“ اس نے خوش دلی سے پوچھا۔

”جی ایسا ہی سمجھیں میں ایس پی اسد خان ہوں۔ ایک کیس کے سلسلے میں یہاں تھا۔“

”اوہ آپ اندر آجائیں، میرا نام سلیم فیضان ہے اور میں بین الاقوامی رسالے کے لیے کام کرتا ہوں۔ میرا موضوع ماحولیات ہے۔“

”میں آپ کا فون استعمال کرسکتا ہوں؟“ وہ اپنے چیف سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔

”تم کہاں تھے اسد! ہم نے تو یہ سمجھ لیا تھا کہ تمہیں کسی نے مار ڈالا شاید۔“ چیف اس کی آواز سن کر ابتدائی سوال جواب کے بعد بولا۔ کچھ دیر کی گفتگو کے بعد اس نے کال ختم کردی۔ شہر پہنچنے تک سلیم فیضان سے اس کی اچھی خاصی دوستی ہوگئی تھی۔ ”تم کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟“

”ہوٹل میں۔“ اس نے بتایا۔ وہ ماحولیات کے حوالے سے اس ریجن میں خاص مضامین اور تصاویر پر کام کررہا تھا اور بقول اس کے اس کا یہاں کا کام تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ وہ اب کچھ عرصے سیر و تفریح کرنا چاہ رہا تھا۔

”تم میرے گھر پر شفٹ ہوسکتے ہو، میں وہاں تنہا رہتا ہوں۔“ اسد نے اسے آفر دی۔

”یہ تو بہت اعلیٰ بات ہوگی تم جیسے دوست کا ساتھ ملا تو اچھا وقت گزرے گا اور شاید کوئی اچھی اسٹوری بھی مل جائے۔“ وہ مسکرایا۔ طے یہ پایا تھا کہ وہ فی الحال اسے چھوڑ کر اپنے ہوٹل جائے گا اور اگلے روز اسد کے گھر آجائے گا۔ گاڑی تیزی سے شہر کی جانب بڑھ رہی تھی۔ اسد فیصلہ نہیں کرپارہا تھا کہ یہ آزادی خواب ہے یا وہ قید۔

☆☆☆

تیمور آندھی طوفان کی طرح گھر میں داخل ہوا تھا۔ بریف کیس صوفے پر ڈال کر اس نے لیپ ٹاپ نکالا۔ اسکرین کے روشن ہوتے ہی اس نے ڈی وی ڈی اس میں لگادی تھی۔ وہ سانس روکے اسکرین کو گھورتا رہا۔ اسے نہیں پتا تھا کہ اب اس کے سامنے کیا آنے والا ہے مگر جو بھی تھا، اسے وہ دیکھنا ہی تھا۔ ڈی وی ڈی کے شروع ہوتے ہی اسکرین پہلے نیلی پھر دھندلائی اور پھر صاف ہوگئی۔

اب اسکرین پر جو تصویر نظر آرہی تھی۔ وہ چار حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ان چاروں میں سپر مارٹ کے مختلف حصے نظر آرہے تھے۔ اس کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے اسکرین کے نچلے حصے پر ابھرنے والی تاریخ اور وقت کو دیکھا۔ یہ دھماکے والی رات کی تاریخ اور حادثے سے تین گھنٹے پہلے کا وقت تھا۔ اسکرین پر مارٹ کا فرنٹ ڈور، مختلف ریکس، اسٹاک روم وغیرہ باری باری نظر آرہے تھے۔ لوگ خریداری میں مصروف تھے۔ سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ اچانک اس کی نظر ایک چہرے پر پڑی۔ اس نے ڈی وی ڈی کو پوز کیا اور غور سے اس حصے کو دیکھا۔ یہ وہی لڑکا تھا جسے اس نے دھماکے سے چند لمحے پہلے اسٹور سے بھاگتے دیکھا تھا۔ اس نے ویڈیو کو ری اسٹارٹ کیا۔ وہ لڑکا چاروں طرف گھبراہٹ سے دیکھ رہا تھا۔ وہ پچیس سال سے زیادہ عمر کا نہیں تھا۔ اس نے ایک کے بعد ایک کرکے مختلف اشیا ریکس پر سے لی تھیں۔ اس نے ان چیزوں کی قیمت ادا کی اور پھر وہ مارٹ سے باہر نکل گیا۔

”نہیں، یہ اس وقت موجود تھا۔“ وہ بڑبڑایا۔ اس کے بعد ڈی وی ڈی کچھ دیر بالکل خالی تھی پھر وہی لڑکا دوبارہ اندر داخل ہوا۔ اس بار وہ سیدھا مارٹ کے وسط کی طرف جارہا تھا جیسے اسے پتا ہو کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اسی لمحہ کیمرا دوسری طرف گھوم گیا تھا۔ جب وہ دوبارہ اس لڑکے پر آیا تو تیمور کو اس کے کوٹ میں کچھ چھپا نظر آیا۔ وہ اب وہاں ایک پلر پر موجود فون کے قریب کھڑا تھا۔ پہلے اس نے ریسیور اٹھا کر کسی سے بات کی پھر چاروں طرف دیکھنے کے بعد اس نے اپنے کوٹ سے ایک فون سیٹ نکالا اور اسے اسٹور کے فون کے ساتھ منسلک کردیا۔ تیمور نے اس حصے کو ری وائنڈ کیا۔ اب اسے سمجھ میں آیا کہ وہ فون پر بات نہیں کررہا تھا صرف ایسا ظاہر کررہا تھا اس دوران اس نے وہ سیٹ نکال کر اس کی جگہ دوسرا سیٹ لگا دیا تھا پھر اس نے پرانے سیٹ کو وہاں سے اٹھا کر قریبی شیلف میں چھپا دیا۔ اس کے بعد اس نے کوئی نمبر ملایا تھا مگر وہ کسی فون کے نمبروں سے زیادہ ڈیجیٹس دبا رہا تھا۔ اسی لمحے کیمرا گھوم گیا۔ تیمور سانس روکے سب دیکھ رہا تھا۔ کیمرا دوبارہ گھوما تب وہ نوجوان فون کا ریسیور رکھ چکا تھا اب اس نے فون پر

UrduBooks.pk

لگا بٹن دبایا اور تیزی سے وہاں سے نکلا۔ جلدی میں وہ سامنے سے آتی ایک معمر خاتون سے ٹکرایا جس سے وہ خود گرتے گرتے بچا مگر وہ رکا نہیں۔ نہایت تیزی سے دروازے کی جانب لپکا جہاں سے اسی وقت نینا اور پریسا ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے اندر داخل ہو رہی تھیں۔ تیمور کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ عین اسی وقت ایک زوردار جھماکا ہوا جس کے بعد اسکرین خالی ہو گئی۔

تیمور کسی ہپناٹائز انسان کی طرح اسکرین کو گھورتا رہا پھر چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپا کر رونے لگا۔ اس کا پورا جسم لرز رہا تھا۔

"تیمور۔" ایک نرم بھاری آواز نے اسے سر اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ آنسوؤں کے دھندلکے میں اسکرین پر اسے ایک شخص نظر آیا۔ وہ ایک بڑی سیاہ ایگزیکٹیو کرسی پر براجمان تھا۔ اس کے سامنے ایک بڑی سی میز تھی، پیچھے بنے بہت بڑے بک شیلف میں کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ تیمور نے ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں صاف کیں۔ اس شخص کی آنکھیں بہت روشن اور چمک دار تھیں۔ چہرے پر سرمئی داڑھی بہت باوقار لگ رہی تھی۔

"تیمور مجھے اندازہ ہے کہ تم پر کیا بیت رہی ہو گی۔ یہ سب دیکھنا آسان کام نہیں ہے۔ میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں، اس وقت میرا نام جاننا تمہارے لیے ضروری نہیں ہے، تمہیں صرف یہ جاننا ضروری ہے کہ میں تمہارا ہمدرد ہوں، مجھے تمہارے نقصان پر افسوس ہے اس کا ازالہ ممکن نہیں ہے مگر تمہیں حقیقت کا علم ہونا بھی ضروری ہے تاکہ کہیں اور کوئی دوسرا شخص تمہاری طرح اپنا خاندان کھونے سے بچ سکے۔ مارٹ میں جو کچھ ہوا، وہ کوئی حادثہ نہیں تھا جیسا کہ تم نے دیکھا۔ میں جو کہہ رہا ہوں، اسے غور سے سنو، کیونکہ تم اسے دوبارہ نہیں سن پاؤ گے۔ میں صرف تمہیں صحیح سمت کی نشاندہی کی مدد کر سکتا ہوں۔ اگر تمہیں اس ہولناک جرم کی تفصیلات جاننی ہیں تو تمہیں اس کے لیے فواد صدیقی کو ڈھونڈنا ہو گا۔ تمہیں یہ کام تنہا کرنا ہو گا۔ پولیس کی مدد لینے کی کوشش مت کرنا، وہ اس کیس کو بند کر چکے ہیں۔ تمہارا اور ہمارا تحفظ بھی اسی میں ہے۔ اب مجھے جانا ہو گا۔ فواد کو ڈھونڈو۔ وہ تمہیں وہ سب بتا سکتا ہے جو تمہیں مدد فراہم کرے گا۔" وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا پھر بولا۔ "یاد رکھو تیمور انصاف ضرور ہونا چاہیے۔" اس کے بعد اسکرین سیاہ ہو گئی۔

تیمور اب بھی ٹکٹکی باندھے اسکرین کو تک رہا تھا۔ اس کے ذہن کی پٹڑی پر سوالات کی ٹرین تیزی سے رواں دواں تھی۔ کیا پولیس کے علم میں تھا کہ یہ ایک بم دھماکا تھا؟ انہوں نے عوام اور غمزدہ خاندانوں سے جھوٹ کیوں بولا؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ اداس ہو، غصہ کرے یا دیوار میں سر مار دے۔

"بھائی......" رمشا کی آواز پر اس نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا۔ "کیا ہوا بھائی؟" وہ تیزی سے اس کے پاس آئی۔

"رمشا...... نینا اور پریسا کو مارا گیا ہے۔" وہ بمشکل بولا۔ "جان بوجھ کر اس مارٹ کو اُڑایا گیا جہاں اتنے سارے لوگ اپنے پیاروں سے جدا ہو گئے۔" اس کے الفاظ آنسوؤں میں ڈھل گئے۔ رمشا اسے دیوانوں کی طرح تک رہی تھی۔

☆☆☆

اسد اپنی شکل درست کروا کر خوب نہایا اور پھر سو گیا۔ اس کی آنکھ دروازے پر ہوتی بمباری اور مسلسل بجتی ڈوربیل کی وجہ سے بمشکل کھلی تھی۔ وہ ایک دم بستر سے کھڑا ہو گیا۔ ایک لمحے تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ کہاں ہے پھر جیسے ہی اس کے حواس بحال ہوئے، اس نے دروازے کا رخ کیا۔ وہ پوری طرح محتاط تھا اور اس کے ہاتھ میں اس کا ذاتی چھوٹا پستول دبا ہوا تھا۔

"اسد میں نے تو سنا تھا کہ لوگ گدھے گھوڑے بیچ کر سوتے ہیں مگر آپ نے تو شاید پورا اصطبل ہی بیچ ڈالا ہے۔" دروازہ کھلا تو سامنے سلیم فیضان سامان کے ساتھ کھڑا تھا۔

"اوہ تم...... اندر آ جاؤ۔" اسے دیکھ کر اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ "مگر تمہیں تو کل صبح آنا تھا......" اسد نے اندر آ کر پانی کی بوتل نکالتے ہوئے پوچھا۔

"تو کل ہو گئی ہے بلکہ کل کی دوپہر بھی ہو گئی ہے......" وہ ہنسا۔

"اوہ یعنی میں اتنے گھنٹے سوتا رہ گیا۔" اسد بھی ہنسا۔ وہ خود کو اب کافی ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

اسد کی توجہ اچانک اس اشتہا انگیز خوشبو کی طرف مبذول ہو گئی۔ اسے اپنا گھر ابھی کچھ مختلف نظر آ رہا تھا۔

"کیا سونگھ رہے ہو، ہوں تو میں مہمان مگر بھائی مہمان کے ساتھ بھی پیٹ ہوتا ہے۔ میزبان تو یہاں آ کر اتنا غافل ہو گیا تو میں نے سوچا کہ چلو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ ٹیبل پر

UrduBooks.UK

شاید تم نے انڈے ڈبل روٹی لا کر رکھے تھے۔ فریج تو خالی پڑا ہے۔ میں نے انڈوں سے ہی سینڈوچ بنائے ہیں۔ کچن کی صفائی کی ہے۔ معاف کرنا تم اچھے پولیس والے ہو گے مگر صفائی پسند بالکل نہیں ہو...... تمھیں ایک میڈ رکھنی چاہیے۔''

''کیا بات ہے تمہاری...... میں منہ دھو کر آتا ہوں بھوک تو مجھے بھی بہت لگی ہے۔'' سینڈوچ واقعی بہت اچھے تھے۔

''تم نے کہا تھا کہ تمہارا ماحولیات والا اسائنمنٹ پورا ہو گیا ہے تم چاہو تو مجھے میڈ کے طور پر جوائن کر سکتے ہو۔'' وہ اس کی تعریف کرتے ہوئے بولا۔

''اوہو مگر مسئلہ یہ ہے مسٹر ایس پی کہ تم مجھے افورڈ نہیں کر سکتے۔''

''ارے یہ کیا بات کی تم نے۔'' وہ ہنسا۔

''ویسے میں بھی اب کچھ عرصے کے لیے فارغ ہوں اگر اس دوران میں تمہارے ساتھ رہ سکوں تو واقعی بڑا اچھا رہے گا۔''

''یہ تو بہت اچھا ہو گا۔'' اسد دل سے بولا۔ اسے یہ شخص پسند آیا تھا پھر اس نے اس کی مشکل میں مدد بھی کی تھی اور اب جو کچھ اس کے ساتھ ہو چکا تھا، اس کے حوالے سے کام کے لیے اسے ایک بھروسا مند ساتھی کی ضرورت بھی تھی جس کا پولیس یا برانچ سے کوئی تعلق نہ ہو...... سلیم فیضان کے روابط تھے وہ رپورٹر تھا اور یقیناً اس کے کام آ سکتا تھا۔

☆☆☆

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بھائی......'' رمشا نے پوچھا۔ تیمور اتنی دیر میں خود کو سنبھال چکا تھا۔

''ہاں یہی سچ ہے۔ مجھے اس سے قبل بھی گاڑی میں ایک لفافہ ملا تھا جس میں لکھا تھا کہ وہ حادثہ نہیں ہے اور اب اس ڈی وی ڈی میں تو پوری ویڈیو کوریج موجود ہے۔''

''ویڈیو......؟''

''ہاں پوری ویڈیو...... یہ لفافہ دیکھو۔'' اس نے بہن کے سامنے لفافہ رکھا۔

''تو یہ سب کچھ ایک حملہ تھا سوچا سمجھا منصوبہ۔ آپ کو یہ ٹیپ پولیس کو بتانا چاہیے۔''

''ہاں مگر میں تھوڑا الجھا ہوا ہوں۔ ہم نہیں جانتے کہ یہ ایم کون ہے، یہ لوگ کون ہیں؟ یہ کیوں ہماری مدد کر رہے ہیں؟ کیا پتا انہوں نے یہ ویڈیو خود بنائی ہو ویسے یہ ہونا بہت مشکل ہے یہ اسی دن کی ویڈیو ہے اور میں نے اس لڑکے کو خود بھی اسٹور سے نکل کر بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس وقت میرے پاس اس کا نام ہے صرف......''

''کیا میں وہ ویڈیو دیکھ سکتی ہوں؟'' رمشا نے پوچھا۔

''ہاں، کیوں نہیں۔'' تیمور نے ڈی وی ڈی کو ری وائنڈ کر کے آن کر دیا مگر اس بار وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ کوریج یا کسی اور چیز کے بجائے وہاں صرف سیکرٹ مشن لکھا آ رہا تھا۔ تیمور نے اسے آف کر کے دوبارہ لگایا مگر نتیجہ وہی تھا۔ اس نے ڈی وی ڈی باہر نکالی اسے جھٹکا اور دوبارہ لیپ ٹاپ میں لگایا مگر وہ سب وہاں سے غائب ہو چکا تھا۔ تیمور پھٹی پھٹی نظروں سے لیپ ٹاپ کو دیکھ رہا تھا۔

''بھائی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے کوئی ایسی تکنیک استعمال کی ہو کہ ڈی وی ڈی ایک بار ہی دیکھی جا سکتی ہو، اس کے بعد خود بخود اریز ہو جاتی ہو۔'' رمشا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس کے الفاظ سے تیمور کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ ''ہاں انہوں نے کہا تھا کہ تم یہ صرف ایک دفعہ ہی سن سکو گے۔''

''بس پھر یہی بات ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ ہمیں پولیس کے پاس ضرور جانا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے مگر مجھے شک ہے کہ وہ اس بات پر کوئی توجہ دیں گے خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ ہمارے پاس کوئی ثبوت بھی نہیں ہے۔ پہلے بھی جب میں پہلا پیغام لے کر انسپکٹر کے پاس گیا تھا تو اس نے اسے کسی قسم کا مذاق قرار دے کر رد کر دیا تھا۔''

''پھر بھی بھائی جو ہوا ہے، اسے رپورٹ کرنا ضروری ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہمیں ان کی طرف سے مدد مل جائے۔'' رمشا کے اصرار پر ہی وہ اس وقت سینئر انسپکٹر شمس الدین کے سامنے بیٹھا تھا جس کے چہرے پر بیزاری کے اثرات نمایاں تھے۔

''دیکھیے تیمور صاحب میں جانتا ہوں کہ آپ بہت تکلیف میں ہیں۔ آپ کی بیٹی اور اہلیہ کے ساتھ جو گزری، وہ بھولنے کی بات نہیں ہے اور مجھے اس حادثے پر افسوس ہے......''

''وہ حادثہ نہیں تھا۔'' تیمور ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔

''وہ حادثہ ہی تھا۔ اس پر مکمل تفتیش ہو چکی ہے اور اب وہ کیس بند ہو چکا ہے۔ آپ خود سوچیے کہ آپ... اس خالی ڈی وی ڈی سے .... کیا ثابت کر سکتے ہیں؟ آپ کو

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

91 جہانگیر بکس

آخری معرکہ 550/-
جب سومنات کے دیوتا کے بت کو توڑنے کی باری آئی تو ہندو راجہ اور پجاری سلطان کے قدموں میں گر پڑے اور انعام اس کے وزن کے برابر سونا دینے کیلئے تیار ہیں۔ سلطان کو [illegible] نسیم حجازی کی ایک بلند تحریر

اندھیری رات کے مسافر 475/-
اندلس میں مسلمانوں کی آخری سلطنت غرناطہ کی تباہی کے فراق اور بربادی میں غداروں اور بزدلوں کی ذلت اور رسوائی کی عبرت ناک داستان

ثقافت کی تلاش 300/-
بامِ عروج ثقافت کا پرچار کرنے والوں پر ایک تحریر، جنہوں نے ملک کی اخلاقی اور روحانی قدروں کو طبلوں کی تھاپ گھنگھروؤں کی جھنکار کے ساتھ پامال کیا

قیصر و کسریٰ 625/-
ظہور اسلام سے قبل عرب و عجم کے تاریخی، سیاسی، اخلاقی تہذیبی اور مذہبی حالات، زندگی اور فرزندان اسلام کے ابتدائی نقوش کی داستان

اور تلوار ٹوٹ گئی 550/-
شیر میسور (ٹیپو سلطان شہید) کی داستان شجاعت۔ جس نے محمد بن قاسم کی غیرت، محمود غزنوی کے جاہ و جلال اور احمد شاہ ابدالی کے عزم و استقلال کی یاد تازہ کردی

گمشدہ قافلے 500/-
انگریزی استعمار شمس وقت کی عیاری، مکاری اور شکنوں کی معصوم بچوں اور مظلوم عورتوں کو خون میں نہلانے کی لرزہ خیز داستان

داستان مجاہد 300/-
[illegible] سے دو ہاتھیوں کے علاوہ 50 ہزار سوار [illegible] معرکہ کی داستان

پردیسی درخت 450/-
اسلام دشمن [illegible] جنہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے تمام اخلاقی حدود کو پامال کرنے سے بھی گریز نہ کیا

یوسف بن تاشفین 500/-
اندلس کے مسلمانوں کی آزادی کیلئے [illegible] تاریک راتوں میں امید کی مشعلیں روشن کرنے والے [illegible] کی داستان

معظم علی 475/-
اورنگزیب کی اسلام دشمنی، میر جعفر کی غداری، بنگال کی آخری حکومت کے ایک مجاہد معظم علی کی داستان شجاعت

خاک اور خون 550/-
سکھ، بربریت، انسانیت، قیامت خیز مناظر، تقسیم برصغیر کے پس منظر میں داستان خونچکاں

کلیسا اور آگ 450/-
فرڈیننڈ کی عیاری، مسلمانوں پر [illegible] اور غرناطہ اور اندلس میں مسلمانوں کی شکست کی داستان

قافلۂ حجاز 599/-
راہِ حق کے مسافروں کی ایک بے مثال داستان

محمد بن قاسم 425/-
عالم اسلام کے 17 سالہ ہیرو کی تاریخی داستان، جس کے حوصلے اور عزم [illegible]

پورس کے ہاتھی 300/-
1965 کی جنگ کے پس منظر میں [illegible] کی شکست کی داستان [illegible]

انسان اور دیوتا 450/-
ہندو سامراج کے ظلم و بربریت کی صدیوں پرانی داستان جس نے اچھوتوں کو راہ عمل اختیار کرنے پر مجبور کیا

پاکستان سے دیارِ حرم تک 300/-
ہجرت کے پس منظر میں [illegible] سفرنامہ حجاز

آخری چٹان 450/-
سلطان جلال الدین خوارزمی کی داستان شجاعت جو تاتاریوں کے سیل رواں کے لیے ایک چٹان ثابت ہوا

سو سال بعد 225/-
[illegible] اچھوتوں اور مسلمانوں کے خلاف سامراجی [illegible] کی تصویر

سفید جزیرہ 325/-
[illegible] کے کسی نامعلوم جزیرے کی داستان

شاہین 475/-
اندلس میں مسلمانوں کے نشیب و فراز کی کہانی

سبق آموز کتب سلسلہ

دو رنگی طباعت اور تصویری خاکوں سے مزین

- اقوالِ حضرت علی المرتضیٰؓ 165/-
- اقوالِ آئمہ کرامؒ 165/-
- حکایاتِ گلستانِ سعدیؒ 195/-
- اقوالِ شیخ سعدیؒ 140/-
- حکایاتِ رومیؒ 180/-
- دلچسپ و عجیب حقائق 170/-
- حکایاتِ بوستانِ سعدیؒ 199/-
- دلچسپ و حیرت انگیز باتیں 150/-
- ایمان افروز و سبق آموز سچے واقعات 180/-
- بڑے لوگوں کے روشن واقعات 165/-

جہانگیر
اُردو لغت
(جامع ترین)
[illegible] کے ساتھ اردو زبان کی پہلی لغت

جہانگیر بک ڈپو

042-35757086 022-2780128
021-32765886 051-5539609 042-37220879

آرام کی ضرورت ہے۔ دیکھیے پولیس کے پاس بہت زیادہ کام ہے، ایسے حادثات اور پھر دہشت گردی کے واقعات اور بہت کچھ...... برائے مہربانی آپ اب اس سلسلے میں مجھے پریشان کرنا بند کردیں۔“

غصہ کسی تیز لہر کے مانند تیمور کو بھگو گیا تھا مگر اس نے خود پر قابو پایا اور کھڑا ہو گیا۔ اس کے دماغ میں آندھیاں سے چل رہی تھیں۔ لوگ کس حد تک بے حس ہو سکتے ہیں، اس نے سوچا اور پولیس اسٹیشن سے باہر نکل آیا۔ گاڑی میں بیٹھا ہی تھا کہ رمشا کی کال آ گئی۔

”بھائی کیا بنا؟“

”کچھ بھی نہیں، اس نے مجھے کمرے سے نکال دیا اور کہا کہ اگر میں نے مداخلت کی تو پکڑا جاؤں گا۔“ وہ خشک لہجے میں بولا۔

”اوہ......“

”تم نے فواد کے حوالے سے کام شروع کیا، کیا تم کو لگتا ہے کہ اس کا ریکارڈ مل جائے گا؟“

”اُمید تو ہے...... مجھے آج کا دن دے دیں، میں اسی پر کام کر رہی ہوں، بھائی شام کو ملتے ہیں۔“

☆☆☆

رمشا کے ذہن میں وہ ڈی وی ڈی گھوم رہی تھی۔ آخر کوئی انہیں یہ سب کیوں بتا رہا تھا، اس سب سے کیا فائدہ تھا۔ اس کی ایک قریبی دوست پولیس کی انتظامیہ میں کام کرتی تھی۔ اس نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ شام تک پولیس ڈیٹا بیس میں اس فواد صدیقی کا ریکارڈ تلاش کر لے گی۔ اگر اس کا ہلکا سا بھی کوئی ریکارڈ ہوا تو اسے ٹریس کرنا آسان ہو جائے گا۔ رمشا خود بھی گوگل اور دوسرے طریقوں سے اسے سرچ کر رہی تھی۔ دنیا بھر میں کسی کو تلاش کرنا اس لیے اس قدر مشکل نہیں ہوتا کیونکہ وہاں لوگوں کا ڈیٹا محفوظ ہوتا ہے۔ یہ ڈیٹا ہی بنیادی سہولیات کی فراہمی کے لیے...... معلومات فراہم کرتا ہے مگر ہمارے ہاں یہ سب ابھی شروع ہی ہوا تھا۔ پولیس ڈپارٹمنٹ سے معلومات حاصل ہونے کے بعد دوسرا راستہ شناختی کارڈ کا ادارہ ہی ہو سکتا تھا۔

”ہاں بولو......“ فون کی گھنٹی بجی تو وہ اسے کان سے لگا کر بولی۔

”رمشا یہاں اس نام اور اس ایج گروپ کے تین لڑکوں کا ریکارڈ ملا ہے۔ میں تمہیں اس کا اسکین بھیج رہی ہوں۔ ریکارڈز میں ان کی تصویریں بھی ہیں شاید تم یا تمہارے بھائی انہیں پہچان سکیں۔“

”گڈ...... پلیز بھیج دو۔“ رمشا بے تابی سے بولی۔ اس نے یہ خبر اور اپنی دوست کے فراہم کردہ اسکین پرنٹ فوراً ہی تیمور کو ای میل کر دیے تھے۔

کاش انہیں وہ لڑکا مل جائے جس تکلیف، اذیت اور ذہنی اندھیرے میں وہ جی رہے تھے، اس میں کمی کے لیے یہ ضروری تھا کہ اس بربادی کے ذمے دار پکڑے جائیں اور اس کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کو تیار تھی۔

☆☆☆

تیمور گھر پہنچا تو رمشا اس کی منتظر تھی۔

”کیا ان میں سے کوئی بھی وہ نہیں ہے؟“ اس نے اس کے صوفے پر بیٹھتے ہی پوچھا۔

”کس میں سے کون؟“ تیمور نے اسے دیکھا۔

”میں نے آپ کو آج فواد صدیقی کے نام سے تین ریکارڈ بھیجے ہیں، کیا آپ نے نہیں دیکھے؟“

”نہیں تو...... اوہ ابھی دیکھ لیتے ہیں۔“ اس نے فوری طور پر اپنا لیپ ٹاپ کھولا اور تینوں ڈاکیومنٹ ڈاؤن لوڈ کیے۔ پہلا شخص قدرے کوئی موٹا نوجوان تھا۔ دوسرے پر گاڑیاں چرانے کے کئی مقدمات تھے مگر وہ لمبے بالوں والا نہیں تھا۔ تیسرے کاغذ پر تیمور کی نظریں جم گئیں، یہ سو فیصد وہی تھا۔

”یہ...... ہے وہ......“ وہ بولا۔

”اوکے، اس کا ریکارڈ پڑھتے ہیں۔“ رمشا نے کہا اور وہاں جو تحریر تھا اسے پڑھ کر وہ دونوں ہی ساکت سے رہ گئے تھے۔ فواد صدیقی کی عمر 23 سال تھی۔ وہ ایک کیمیکل کمپنی میں ملازمت کرتا تھا۔ جہاں C-4، بارودی اور پلاسٹک ایکسپلیو کے لیے خام مال تیار کیا جاتا تھا۔ اسے اسی سامان کو چرانے کے شبے میں ملازمت سے نکالا اور گرفتار کیا گیا تھا مگر بعد میں ثبوت کی کمی کی وجہ سے مختصر سزا کے بعد چھوڑ دیا گیا۔ کاغذ پر اس کا پتا تحریر تھا۔ تیمور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اسے پہلی کامیابی مل گئی تھی۔

☆☆☆

اسد پولیس ہیڈ آفس میں اپنے باس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

”تو تمہیں کچھ اندازہ نہیں کہ تمہیں کس نے اور کیوں اغوا کیا تھا؟“

”نہیں، کچھ بھی واضح نہیں ہے۔ میں اسی لیے کچھ عرصے اور چھٹی لے کر اس پر کام کرنا چاہتا ہوں تاکہ یہ جان

سکوں کہ وہ کون تھے؟''

''تمہیں اتنے دنوں بعد مزید چھٹیاں درکار ہیں، ایک پولیس افسر کو اغوا کیا گیا ہے یہ ایک ایکٹو کیس ہے۔ تم اس پر کام کر سکتے ہو اور تمہیں جو بھی معلوم ہو، وہ تم مجھے رپورٹ کرو گے سمجھ گئے نا اسد...... خود کو پریشانیوں میں الجھانا بند کرو اور شکر ادا کرو کہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا......''

اسد نے سر ہلایا۔

''دوسری بات یہ ہے۔'' انہوں نے آواز دھیمی کرتے ہوئے کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تم اب بھی جیل والے کیس کے پیچھے لگے ہو گے مگر اس بارے میں کچھ بھی سوچنے کی کوشش مت کرنا۔ وہ کیس بند ہو چکا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ تم بھوتوں کا پیچھا شروع کر دو اور یہ بتاؤ کہ یہ تمہارے ساتھ کون آدمی ہے؟''

''یہ ایک دوست ہے۔'' وہ بولا۔ ''جیل والے کیس کے حوالے سے......''

''وہ بات ختم ہو چکی ہے۔'' چیف نے ہاتھ اٹھا کر حتمی انداز میں کہا۔

باہر نکلنے تک وہ بالکل خاموش رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے اغوا کی وجہ ہی جیل کا کیس تھا اور ان دونوں چیزوں کو الگ کرنا ممکن نہیں ہے۔ وہ یہ بات چیف کو نہیں سمجھا سکتا تھا کم از کم اس وقت تو ہرگز نہیں۔ اسے اپنی بات ثابت کرنے کے لیے مضبوط ثبوتوں کی ضرورت تھی اور اس کے لیے اس کے پاس وقت بہت کم تھا۔

☆☆☆

تیمور ساڑھے آٹھ بجے گھر سے نکلا تھا۔ 25 منٹ کی ڈرائیو کے بعد وہ اس پتے والے علاقے میں پہنچ گیا تھا۔ یہاں اپارٹمنٹس اور فلیٹس کا جال سا بنا ہوا تھا۔ اسے سلور اپارٹمنٹ کو تلاش کرنے میں کچھ وقت لگا تھا۔ یہ ایک قدرے نئی عمارت تھی اور اسے دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ یہاں مکینوں کے لیے تمام تر سہولیات موجود ہوں گی۔ اسے اپنے مطلوبہ اپارٹمنٹ کی تلاش میں چند لمحے لگے تھے۔ یہ گراؤنڈ فلور پر واقع تھا۔ دروازے پر دستک دینے سے قبل اس نے گہری سانس لی۔ جیب میں پڑے اپنے 357 میگنم کو تھپتھپایا اور دروازے کے ساتھ لگی بیل کو دبا دیا۔ چند لمحوں بعد اندر سے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ دروازہ کھلا۔ اس کے سامنے ایک ساٹھ سال کی ضعیف خاتون کھڑی تھیں۔

''جی فرمائیے......'' انہوں نے باریک نحیف آواز میں پوچھا۔

''میں معذرت خواہ ہوں۔ آپ کو زحمت ہوئی۔'' تیمور گڑبڑا کر بولا۔ ''میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ فواد صدیقی اب بھی یہیں رہتا ہے یا نہیں؟''

''اچھا...... میں تو سمجھی تھی کہ فواد آ گیا۔ یہ اسی کا گھر ہے، وہ ابھی گھر پر نہیں ہے مگر تھوڑی دیر میں آ جائے گا، آپ اپنا نام بتا دیں۔ میں اسے میسج دے دوں گی۔''

''ارے نہیں میں دوبارہ آ جاؤں گا۔'' وہ یہ کہہ کر واپسی کے لیے مڑ گیا۔ اپارٹمنٹ کے مین گیٹ سے گزر کر سامنے کھڑی اپنی گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اس نے اپنی نگاہیں گیٹ پر جما دی تھیں۔ وہ اب واپس نہیں جا سکتا تھا۔ اسے اپنے سوالوں کے جواب درکار تھے۔ فواد کتنی بھی دیر سے آتا...... اسے بس اس کا انتظار کرنا تھا۔

☆☆☆

''یہ سب تو بہت دلچسپ اور کسی ایکشن فلم کے مانند ہے میرے جیسے رپورٹر کے لیے ڈریم اسٹوری ہے یہ......'' سلیم نے کہا وہ اور اسد پیزا سے انصاف کر رہے تھے۔ اس دوران اسد نے اسے بڑی جیل کیس اور اپنے اغوا سے متعلق تفصیلات بتائی تھیں۔ اسے یہ شخص پسند آیا تھا اور وہ اس پر بھروسا کرنے لگا تھا۔

''اگر اس میں سے ایک لفظ بھی باہر نکلا تو تم جانتے ہو کہ میں بغیر کسی ہتھیار کے بھی تمہاری گردن توڑ سکتا ہوں۔'' اسد نے اسے گھورا۔

''میں جانتا ہوں...... مگر جب تم یہ کیس حل کر لو گے تب یہ صرف میری اسٹوری ہو گی۔ میں ہی اسے بریک کروں گا...... بولو ڈیل؟''

''ڈیل......'' اسد نے سر ہلایا۔

''تو اب شروع کہاں سے کرنا ہے؟''

''میں شہزاد کو فون کر رہا ہوں۔'' اسد نے فون اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

''شہزاد ہاں یہ میں ہی ہوں...... میرا بھوت نہیں ہے، سنو مجھے فوری طور پر اس عورت کی تصویر درکار ہے جس کی ویڈیو تم نے کوریج سے نکالی تھی۔''

''مگر ہمارے پاس اس کا چہرہ نہیں ہے کوریج میں وہ دو ہی بار نظر آئی ہے مگر وہ بھی اس کا سر یا پشت نظر آتی ہے۔''

''ٹھیک ہے جو بھی ویڈیو تمہارے پاس ہے وہ روانہ کر دو۔''

UrduBooks.pk

”مجھے معلوم تھا کہ آپ کو کبھی نہ کبھی اس کی ضرورت پڑے گی اسی لیے سیف رکھی تھی مگر میرا خرچہ مجھے اب تک نہیں ملا۔“

”مل جائے گا اور آج ہی تمہارے اکاؤنٹ میں پہنچ جائے گا۔“ اسد بولا اور فون بند کر دیا۔ کچھ ہی دیر بعد شہزاد کی ای میل آ گئی۔ اسد نے گھر پر موجود پرنٹرز سے اس کے پرنٹ بھی نکال لیے۔

”یہ تصویر تمہاری کیا مدد کر سکتی ہے؟“ سلیم نے نہ سمجھنے والے انداز میں پوچھا۔

”یہ ایم ایم سے متعلق واحد کلیو ہے میرے پاس، میں اسے تلاش کروں گا اور یہی ہمیں آگے لے کر جائے گی۔“

اسد اب فون میں سعدیہ کا نمبر تلاش کر رہا تھا۔

”ہیلو سعدیہ! میں اسد بول رہا ہوں۔“ وہ فون ریسیو ہوتے ہی بولا۔

”اسد تم کہاں غائب ہو گئے تھے۔ میں نے تمہیں کئی بار فون کیا مگر تم سے بات ہی نہیں ہو سکی۔ ڈپارٹمنٹ کو بھی تمہارے بارے میں کوئی علم نہیں تھا......“

”یہ ایک لمبی اور دردناک کہانی ہے سعدیہ...... موقع ملے تو میں ضرور سناؤں گا مگر اس وقت تو خطرہ یہ ہے کہ کہیں ڈپارٹمنٹ ہی مجھے غائب نہ کر دے۔ تمہیں معلوم ہے نا کہ انہیں میری حکمتِ عملیاں بالکل ناپسند ہیں۔“ وہ زور سے ہنسا۔ ”اور اب مجھے ثابت کرنا ہے کہ میں کتنا عظیم ہوں۔ تم اس میں...میری کچھ مدد کر سکتی ہو؟“

”پتا نہیں۔“ وہ بھی قہقہہ لگا کر بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ تم کل صبح مجھ سے مل لو...... شاید ہم کوئی مثبت چیز سامنے لا سکیں۔“

”ٹھیک ہے کل دس بجے تمہارے آفس میں۔“ اسد نے کہا اور فون رکھ دیا۔

☆☆☆

گھڑی کی سوئیاں ڈائل کے کئی سفر پورے کر چکی تھیں۔ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب ایک پرانی چھوٹی کار گیٹ کے برابر میں رکی۔ اس میں سے ایک لڑکا نکلا جس کی عمر تیئیس چوبیس سال کے قریب تھی۔ اس نے سر پر کیپ پہن رکھی تھی مگر اس کے لمبے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس پر نظر پڑتے ہی تیمور گاڑی سے اُتر آیا۔ وہ مسلسل اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کا دل تیز تیز دھڑک رہا تھا اور غصہ اس کے جسم کی ہر نس میں دوڑ رہا تھا۔ یہ وہی تھا جسے اس نے اسٹور سے بھاگتے ہوئے دیکھا تھا اور جس نے اس ویڈیو کے مطابق موت کا وہ بازار سجایا تھا جو سیکڑوں زندگیوں کے ساتھ ساتھ اس کی ساری خوشیاں اور زندگی بھی ساتھ لے گیا تھا۔

وہ چیتے کی سی تیزی کے ساتھ لپک کر اس کے پیچھے پہنچا اور اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر اس کی گردن جکڑ لی۔ لڑکا یک دم افتاد سے خوف زدہ ہو گیا۔ اس کے ہاتھ سے چابی پھسل کر نیچے جا گری۔

”کک...... کک کون ہو تم...... کیا چاہیے؟“ وہ دونوں ہاتھوں سے تیمور کی گرفت کو اپنی گردن سے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”کیا تمہارا نام فواد صدیقی ہے؟“ وہ اس کے کان میں غرایا۔ یہ وہی تھا۔ اس کا آدھا چہرہ البتہ عجیب بلکہ زخموں کے نشانوں کی وجہ سے کٹا پٹا لگ رہا تھا۔

”تمہیں مجھ سے کیا چاہیے...... میں تو تم کو جانتا بھی نہیں ہوں۔“ فواد بولا۔

تیمور کوئی جواب دیے بغیر اسے گھسیٹتا ہوا اپنی کار تک لے گیا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر لڑکے نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی جس کے جواب میں تیمور نے اپنا گھٹنا اس کے پیٹ میں مارا تھا۔ وہ دوہرا ہو کر نیچے گرا، اس کے بعد تیمور نے ریوالور نکال کر اس کی گردن پر رکھ دیا۔ ریوالور کا دباؤ محسوس کرتے ہی وہ ساکت ہو گیا۔

”پلیز...... پلیز گولی مت چلانا......“

”گاڑی میں بیٹھو، اسی صورت میں شاید تم زندہ رہ سکو۔“ تیمور نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ فواد کے اندر بیٹھنے کے بعد وہ بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا اور دروازہ بند کر لیا۔ ریوالور اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔

”پلیز مجھے چھوڑ دو۔ میری بوڑھی ماں میرا انتظار کر رہی ہو گی۔“

”یہ تمہیں پہلے سوچنا چاہیے تھا، سپر مارٹ کو بم سے اڑانے سے پہلے۔“

اندھیرے میں بھی فواد کا چہرہ یکدم پیلا پڑ گیا۔ ”مم میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“

”مجھ سے یہ بکواس مت کرو...... میں اس وقت وہیں تھا اور میں نے تمہیں اسٹور سے نکلتے دیکھا تھا۔“ وہ ریوالور کی نال اس کی پسلیوں میں چبھوتے ہوئے بولا۔ فواد نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ ”تم جو بھی جانتے ہو اور جو کچھ وہاں ہوا تھا، مجھے سب جاننا ہے۔ اگر اس میں ذرا سی غلطی ہوئی تو

UrduBooks.pk

میں تمہیں یہیں گولی مار کر پھینک دوں گا۔'' تیمور نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

فواد اب کانپ رہا تھا۔ اس نے رونا شروع کر دیا۔ ''میں نے...... میں نے بم نہیں بنایا تھا۔ وہ کسی اور کا کام تھا۔ میں نے انہیں C-4 سپلائی کیا تھا۔ انہوں نے مجھے اس کام کے پانچ لاکھ روپے دیے تھے اور کہا تھا کہ اگر میں اس بم کو اسٹور میں لگا دوں تو پانچ لاکھ اور ملیں گے۔ پلیز مجھے مارنا نہیں، مجھے پیسوں کی بہت ضرورت تھی۔ میری ماں کا آپریشن تھا اور ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اگر فوری آپریشن نہ ہوا تو وہ نہیں بچ سکیں گی۔''

''وہ کون لوگ ہیں؟'' تیمور دانت کچکچا کر بولا۔ ''مجھے ان کا نام بتاؤ۔''

''مجھے ان کا نام نہیں معلوم۔ وہ مجھے ایک الگ سیل فون پر کال کرتے ہیں۔ یہ فون انہوں نے میرے گھر کے دروازے پر رکھا تھا۔'' اس نے قمیص کی جیب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ تیمور نے اس کی جیب سے ایک عام سا فون برآمد کیا۔

''اور اگر تمہیں ان سے رابطہ کرنا ہو تو......؟''

''انہوں نے کہا ہے کہ میں پچھلی جانب سے پارک کی ایک مخصوص بینچ پر بیٹھ جایا کروں۔ یہ اس وقت کرنا ہوتا ہے جب مجھے ان سے بات کرنی ہو یا کوئی کام ہو۔ اس کے لیے ایک مخصوص دن اور وقت طے ہے۔ منگل کے روز صبح نو بجے...... وہ مجھے اس کے ایک گھنٹے بعد کال کرتے ہیں۔''

''اوہ...... پھر تو یہ بہت ہی اچھا ہے۔'' تیمور نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''اب تقریباً منگل شروع ہو گیا ہے۔ ہم یہیں صبح ہونے کا انتظار کریں گے۔ اس کے بعد تم اس بینچ پر بیٹھو گے اور اگر تم نے اس دوران میں کوئی بھی غلطی کی۔ کوئی بھی غلطی تو میں تمہیں جہنم رسید کرنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگاؤں گا...... سمجھ گئے نا؟''

فواد نے سر ہلایا۔ تیمور نے گاڑی کے ڈیش بورڈ سے رسی نکالی اور فواد کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے۔ اس کے بعد گاڑی کے دروازے لاک کر کے خود اگلی نشست پر آ بیٹھا، ریوالور اس کی گود میں موجود تھا۔

☆☆☆

''تم بالکل نہیں بدلے ہو۔'' سعدیہ، اسد کو دیکھ کر مسکرائی۔ ''بلکہ پہلے سے زیادہ اسمارٹ اور طاقتور لگ رہے ہو۔''

''تم بھی تو نہیں بدلی ہو۔'' وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔ ''تو اب بتاؤ تم کیا جاننا چاہتے ہو۔'' ابتدائی گفتگو کے بعد سعدیہ نے پوچھا۔ اس کا کمرا ایک بڑی لیب کا حصہ تھا۔ اس کی میز مائیکرو اسکوپ، سلائڈز، ٹیمپلو اور اسی قسم کی چیزیں موجود تھیں۔

''تم جانتی ہو کہ میں بڑی جیل کے کیس پر کام کر رہا تھا۔ اسی دوران مجھے اغوا کر لیا گیا۔ اتنے دنوں میں، میں یہ نہیں جان سکا کہ مجھے اغوا کرنے والے تھے کون...... انہوں نے مجھے وہاں رکھا اور پھر چھوڑ دیا۔''

''اوہ...... چلو شکر ہے کہ تم بخیریت واپس آ گئے۔''

''میں اب بھی اسی کیس کے حوالے سے کام کر رہا ہوں۔''

''مگر وہ کیس بند کر دیا گیا تھا نا...... میں نے تمام تفصیلات اور معلومات ڈپارٹمنٹ کے حوالے کر دی تھیں۔'' سعدیہ نے سر ہلایا۔ ''پھر بھی میرا خیال ہے کہ میری فائل میرے پاس ہے......'' اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ لیب کے داہنی حصے میں رکھے کیبنٹ کی دوسری دراز کھول کر اس نے ٹیگ دیکھے اور پھر مطلوبہ فائل باہر نکال لی۔

''سعدیہ کیا تمہیں اس دوا کی متضاد دوا کا علم ہو گیا تھا؟ کیا لاشوں میں اس کے اثرات ملے تھے؟''

''نہیں، مگر زیادہ تحقیق میں ایک دلچسپ شواہد سامنے آیا تھا۔ وہ جوان سب کے تکیوں میں ایم ایم کا ٹیگ ملا تھا، وہ کسی ایسے کپڑے کے بنے ہوئے تھے جسے ہم کوشش کے باوجود نہیں سمجھ سکے۔ وہ آہستہ آہستہ ہوا میں گھل جاتے ہیں۔ ہمارے پاس اب شاید اس کے چند دھاگے رہ گئے ہوں۔''

''عجیب بات ہے۔'' اسد دھیرے سے بولا۔ ''کیا یہ فیبرک زہریلا تھا؟''

''ہم نے اسے اس حوالے سے چیک نہیں کیا کیونکہ اس کا شمار کھانے کی چیزوں میں نہیں ہوتا مگر یہ ایک اچھا آئیڈیا ہے۔'' وہ سوچتے ہوئے بولی۔ ''اگر اس میں ایسے کوئی اثرات پائے گئے تو یہ پہیلی حل ہو سکتی ہے۔'' وہ تیزی سے کھڑی ہوئی اور کمرے سے باہر نکل گئی، اس کا رخ تہ خانے کی طرف تھا۔ جب وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں میٹل کا ایک چھوٹا سا بکس تھا۔ اس نے بکس کھول کر انہیں دیکھا، خاص پلاسٹک میں سفید رنگ کے چند دھاگے موجود تھے۔ ''ہمارے پاس بس یہی ٹکڑے بچے ہیں، ہم اس پر ٹیسٹ کر سکتے ہیں۔''

''یہ تو بہت زبردست بات ہے، اس میں کتنا وقت لگے گا؟''

UrduBooks.pk

''تین سے چار گھنٹے...... تم چاہو تو انتظار کرسکتے ہو یا پھر واپس آجانا۔''

''ٹھیک ہے ہمیں ایک دو کام نمٹانے ہیں۔ اس کے بعد میں یہیں واپس آتا ہوں۔''

''تم بہت خاموش ہو......؟'' سلیم نے باہر نکلتے ہوئے اسد سے پوچھا۔ وہ اس تمام گفتگو کے دوران بالکل خاموش رہا تھا۔

''میں ایک بات سوچ رہا ہوں...... آخر اس قدر مشکوک صورتِ حال کے باوجود ڈپارٹمنٹ نے اس کیس کو بند کیوں کردیا۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اس آفیسر کو ڈھونڈنا ہوگا جسے سعدیہ کے ادارے کی جانب سے معلومات فراہم کی گئی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ اس نے رپورٹنگ میں کچھ ہیر پھیر کیا ہے۔''

''اور ہم اسے کیسے ڈھونڈیں گے؟''

''سوچ رہا ہوں ابھی کچھ کلیئر نہیں ہے۔'' وہ مسکرایا اور آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

سورج نکل آیا تھا، موسم کافی بہتر تھا۔ تیمور نے ہلکی سی انگڑائی لی۔ اس کی نظریں پچھلی نشست پر موجود فواد کی طرف تھیں۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور وہ مسلسل کانپ رہا تھا۔

''گھبراؤ مت...... اگر تم نے میری بات مانی تو تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔'' تیمور نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ ''تم خوش قسمت ہو کہ میں نے تمہیں دیکھتے ہی قتل نہیں کردیا۔ کیا تمہیں اندازہ ہے کہ اس دھماکے کی وجہ سے کتنے لوگوں کی جانیں گئی ہیں؟''

''انہوں نے مجھے کہا تھا کہ وہ صرف اسٹور کے مالک کو ڈرانا چاہتے ہیں، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ پورے اسٹور کو اڑا دیں گے۔'' وہ تھوک نگل کر بولا۔

''میں اس بات پر یقین نہیں کرسکتا۔'' تیمور نے سر ہلایا۔ ''تمہیں معلوم تھا کہ وہ بم ہے؟''

''یقین کریں سر کہ میں سب کچھ نہیں جانتا تھا۔ انہوں نے تو مجھے بھی مار ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے صرف بم کو ایکٹی ویٹ کیا تھا، ریموٹ ان کے ہاتھ میں تھا۔ انہوں نے بتائے گئے وقت سے بہت پہلے اسے دبا دیا اور میں بھی بہت زخمی ہوگیا میرا آدھا چہرہ زخموں سے بھر گیا تھا۔ اور اب یہ ہمیشہ کے لیے ایسا ہوگیا ہے۔'' وہ اُداسی سے بولا۔

''خیر اب تمہارے پاس موقع ہے کہ تم ان کو اس دھوکے کی سزا دے سکتے ہو۔ تم میری مدد کرو، میں تمہیں نہیں ماروں گا۔ اگر تم نے بھاگنے کی، انہیں خبردار کرنے یا ایسی کوئی اور حماقت کے بارے میں سوچا بھی تو تم نہیں بچو گے...... سمجھ گئے نا؟'' فواد نے جواب میں سر ہلایا۔ تیمور نے گھڑی کی طرف دیکھا، نو بجنے والے تھے۔ اس نے گاڑی سے اُتر کر پچھلی نشست کا دروازہ کھولا اور جھک کر فواد کے ہاتھ اور پیر کھول دیے۔ اس کے بعد اس نے اس کے بٹوے سے شناختی کارڈ، لائسنس اور کریڈٹ کارڈز نکال لیے اور پھر اس کی طرف دیکھا۔

''میں تمہاری شناخت کی سب چیزیں اپنے قبضے میں لے رہا ہوں، اگر تم نے کوئی غلط حرکت کی یا بھاگ گئے تو میں یہ سب کچھ پولیس کو دے دوں گا اور تم یہ دعا کرنا کہ تم مجھ سے پہلے پولیس والوں کے ہتھے نہ چڑھو ورنہ شاید تمہیں زیادہ پچھتانا پڑے گا۔''

''میں نہیں بھاگوں گا...... میں ان لوگوں کو اس دھوکے کا بدلہ دینا چاہتا ہوں۔ انہوں نے مجھے بھی ٹھکانے لگانے کی کوشش کی تھی جس کی وجہ سے میرا چہرہ ہمیشہ کے لیے بگڑ گیا ہے۔''

''شکر کرو تم زندہ ہو...... میرا خاندان نہیں بچ سکا تھا۔'' وہ بھاری آواز میں بولا۔ ''نو بج رہے ہیں باہر نکلو اور اپنی مخصوص بینچ پر جا کر بیٹھو۔ میری نظریں تم پر ہی رہیں گی۔ تمہیں عموماً کتنی دیر بیٹھنا پڑتا ہے؟''

''دس منٹ کے قریب، پھر میں اٹھ جاتا ہوں اور گھنٹے بھر میں ان کا فون آجاتا ہے۔''

فواد کار سے نکلا اور بینچ پر جا کر بیٹھ گیا۔ تیمور پارک کی دوسری جانب ٹہلنے لگا وہاں ایک شخص اپنے کتے کو ٹہلا رہا تھا اور چند لوگ جاگنگ میں مصروف تھے۔ کچھ دیر چل کر اس نے فاصلے پر بنی ایک ایسی بینچ کا انتخاب کیا جہاں بیٹھ کر وہ فواد پر نظر رکھ سکے۔ ہوا اس کی پسلیوں کے زخم کو تازہ کررہی تھی۔ فواد کے عقب میں پارک کی دوسری جانب ایک چار منزلہ عمارت تھی تیمور اس کی تمام گیلریز کا جائزہ لے رہا تھا۔

اچانک تیسری منزل پر اس نے شیشے کا دروازہ کھلتے اور اس سے ایک پستہ قامت اور مضبوط جسامت والے شخص کو گیلری میں آکر سگریٹ جلاتے اور اردگرد کا جائزہ لیتے دیکھا۔ جب اس کی نظر بینچ پر بیٹھے فواد پر پڑی، وہ واضح طور پر اچھل سا پڑا اور تیزی سے اندر چلا گیا۔ چند لمحوں بعد وہ واپس گیلری میں آیا تھا مگر اس بار اس کے ہاتھ میں ایک فون تھا، وہ کسی سے بات کررہا تھا۔ تیمور نے فواد کی طرف دیکھا مگر وہ فون پر بات نہیں کررہا تھا۔ وہ چند لمحے وہیں کھڑا رہا

تھا پھر دوبارہ اندر چلا گیا تھا۔ اس نے شیشے کا دروازہ بھی بند کر لیا تھا۔ تیمور اس گیلری پر نظر رکھے ہوئے تھا مگر کئی منٹ گزرنے کے باوجود وہ باہر نہیں آیا۔ دس منٹ پورے ہوتے ہی تیمور گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ چند لمحوں بعد فواد بھی کار کے پاس آ گیا تھا۔ وہ پچھلی نشست کی طرف بڑھا تھا کہ تیمور نے پسنجر سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ فواد کے بیٹھتے ہی اس نے کار چلا دی۔ وہ گھوم کر پارک کی دوسری طرف پہنچ گئے تھے۔ یہ اس عمارت کا داخلی راستہ تھا جس کی تیسری منزل پر اس نے اس شخص کو دیکھا تھا۔ ان کی کار عمارت کے دروازے سے کچھ فاصلے پر تھی جب تیمور نے اسی شخص کو عجلت میں باہر نکلتے اور ایک پک اپ ٹرک میں گھستے دیکھا۔ تیمور نے سوچے سمجھے بغیر کار کو اس کے پیچھے لگا دیا تھا۔ فواد بالکل خاموش تھا۔ اچانک اس کے فون کی گھنٹی بجی۔ تو وہ دونوں چونک گئے۔ تیمور نے فون اٹھا کر فواد کی جانب بڑھایا۔ اس نے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں سوالیہ نشان موجود تھا۔

’’یہ وہی ہیں......‘‘ فواد نے کہا اور تیمور کے اشارے پر اسپیکر کھول کر فون ریسیو کیا۔

’’تمہیں کیا چاہیے؟‘‘ دوسری طرف سے بھنچی ہوئی آواز میں پوچھا گیا۔

’’مجھے پیسے چاہئیں۔‘‘

’’اور وہ کس خوشی میں؟‘‘

’’تم نے کہا تھا کہ بم کو سیٹ کرنے کے بعد تم مجھے مزید پانچ لاکھ روپے دو گے، مجھے وہ پیسے درکار ہیں یا پھر تم چاہ رہے ہو کہ میں یہ ساری باتیں پولیس اسٹیشن جا کر کروں۔‘‘ تیمور اسے دیکھے جا رہا تھا۔

’’ہمارا خیال تھا کہ تم مر چکے ہو۔ تم نے اتنے دنوں سے رابطہ کیوں نہیں کیا تھا؟‘‘

’’میں اسپتال میں تھا اور تم جانتے ہو کہ کیوں؟ میں جانتا ہوں کہ تم نے دھماکے کا غلط وقت بتایا تھا تاکہ میرا قصہ بھی ختم کیا جا سکے۔‘‘ اس کا لہجہ تلخ ہو رہا تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے کانپنے والا لڑکا نہیں لگ رہا تھا۔

’’زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لڑکے خاموشی سے میری بات سنو۔ تمہیں وہ کیمپ گراؤنڈ یاد ہے نا جہاں ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی؟‘‘

’’وہیں جہاں تم نے مجھے وہ بم دیا تھا؟‘‘

’’ہاں، تم وہاں سے تھوڑا آگے جاؤ گے۔ وہاں تمہیں سیدھے ہاتھ پر ایک کچی سڑک ملے گی۔ اس پر دو میل کا سفر تمہیں ایک کچے کیبن تک لے آئے گا۔ مجھے شام کے سات بجے وہیں ملو، وہاں تمہارا حساب بے باق کر دیا جائے گا۔‘‘

’’ٹھیک ہے......‘‘ اس نے کہا اور لائن بے جان ہو گئی۔ اس نے فون تیمور کی جانب بڑھایا جس نے سر کے اشارے سے اسے فون اپنے پاس ہی رکھنے کو کہا۔

’’وہ تمہیں مار ڈالیں گے۔‘‘ دو لمحے بعد تیمور بولا۔

’’ہاں، مجھے بھی یہی لگ رہا ہے...... میں یہی سوچ رہا ہوں کہ کیا کرنا چاہیے۔‘‘

پک اپ ٹرک اب بھی ان کے آگے تھا۔

’’یہ تو اسی طرف جا رہا ہے۔‘‘ فواد سڑک کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

’’کس طرف؟‘‘ تیمور نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

’’کیمپ گراؤنڈ کی طرف......‘‘ وہ بولا۔

تیمور خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔ بیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد ٹرک سیدھے ہاتھ پر مڑ کر غائب ہو گیا۔ تیمور سیدھا آگے چلتا چلا گیا۔ کچھ آگے جا کر اس نے یوٹرن لیا۔ اب اس کا رخ شہر کی طرف تھا۔

کیا مصیبت ہے...... جب دفتر میں کام زیادہ ہوتا ہے تو تمہیں کسی دوسری عورت کے خواب آنے لگتے ہیں...... مجھے کیا پتا میری جیب میں کیا لٹک رہا ہے!

UrduBooks.pk

☆☆☆

ٹھیک پانچ بجے وہ دونوں پھر سعدیہ کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے جو ایک مائیکرو اسکوپ سے آنکھ چپکائے ہوئے تھی۔ انہیں دیکھ کر وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر فاخرانہ مسکراہٹ تھی۔

”مجھے لگتا ہے کہ تم نے کوئی خاص بات دریافت کی ہے بالکل کولمبس جیسی مسکراہٹ ہے۔“ اسد اسے دیکھ کر مسکرایا۔

”بالکل...... دل تھام کر سنو، اس کپڑے کے سیمپل میں کوئی زہریلا عنصر نہیں ہے مگر جب میں نے اسے ڈیپلی اسٹڈی کیا تو معلوم ہوا کہ بنیادی طور پر یہ کپڑا ہی نہیں ہے۔“ اس نے مائیکرو اسکوپ لینس سے نظر آنے والے سفید دھاگے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”تو پھر یہ کیا ہے؟“ سلیم نے پوچھا۔

”یہ پلاسٹک ہے جس میں ایک ایسا ایسڈ ملا ہوا ہے جو اسے بہت ہی آہستگی سے تحلیل کرتا ہے۔ اس کے فضا میں ایسے اثرات پھیل جاتے ہیں جن کو جانچا نہیں جا سکتا اور اس پر سر رکھ کر سونے والا اس کی ہوا میں رات بھر سانس لیتا ہے۔“

”اوہ تو اس گیس کی وجہ سے قیدیوں کی موت واقع ہوئی ہے مگر وہ اس وقت سو تو نہیں رہے تھے؟“ اسد نے ایک ابرو اٹھا کر پوچھا۔

”نہیں اس کی وجہ سے نہیں کیونکہ یہ نان ٹوکیک ہے۔ میں نے اس پر مزید کئی ٹیسٹ کیے ہیں۔ جانتے ہو اسے کس چیز نے ان کے لیے مہلک بنایا ہے؟“

اسد نے نفی میں سر ہلایا۔

”بوٹ کوئی نے۔“ جب وہ دونوں چند لمحے کچھ نہ بولے تو سعدیہ نے کہا۔ ”شاید تم بھول گئے ہو، یاد کرو میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ہر دوا کی ایک متضاد دوا ہوتی ہے۔“

”ہاں......“ اسد نے سر ہلایا۔

”تو یہ بوٹ کوئی اس دوا کا تضاد ہے جو گارڈز کے خون کے نمونوں میں پائی گئی تھی اور یہ اس کے متضاد عمل کرتی ہے۔“ ”جہاں تک میں سمجھی ہوں، کھانے میں بوٹ کوئی کو ہی انجیکٹ کیا گیا تھا۔ چونکہ یہ ان سارے قیدیوں کے سسٹم میں موجود تھی لہٰذا اس کھانے کو کھاتے ہی وہ فوری کارڈیک اریسٹ کا شکار ہو گئے۔“

”یہ کیسے ثابت ہوتا ہے؟“

”آسانی سے، میں نے ان دونوں ڈرگز سے اس کا تجربہ بھی کیا ہے، جس کسی نے یہ واردات کی تھی، اس نے مکمل ہوم ورک کیا تھا۔“

”اوہ۔“ اسد سیٹی بجا کر رہ گیا۔

”میرے پاس ایک بری خبر بھی ہے، اس سارے تجربوں کے بعد اب میرے پاس اس فیبرک کا ایک مکمل دھاگا بھی نہیں بچا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے پاس اپنی تفتیش کے سوا کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہیں ہے۔“

”درست کہہ رہی ہو۔ ہمیں اس کے لیے گواہ اور ثبوت درکار ہے اور ہمیں یہ بھی جانچنا ہے کہ اس کے پیچھے کون ہے۔ یہ جانے بغیر یہ سب ایک اچھی کہانی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھے گا۔“ اسد بولا۔ ”کہیں نہ کہیں معلومات کو چھپایا گیا ہے تم نے یہ فائل کس کو دی تھی؟“

”میں نے سرفراز کو، سرفراز یہاں کام کرتا ہے۔ اس نے یہ فائل ڈپارٹمنٹ کو دی تھی مگر تم اس پر شک نہیں کر سکتے، وہ ایک ایماندار شخص ہے۔“

”آپ یہ اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہیں؟“ سلیم نے پوچھا۔

”میں اسے دس سالوں سے جانتی ہوں اور اس پر اعتماد کرتی ہوں۔“ سعدیہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”اوکے......“ اسد اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے بولا۔

”میں اس کے باوجود اس سے ملنا چاہوں گا۔ میں اس سے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ڈپارٹمنٹ میں اس نے کس کو یہ فائل دی تھی اور کس کس کی اس تک رسائی تھی۔ کیا وہ ابھی موجود ہے؟“

”نہیں، تم کل اس سے مل سکتے ہو، آج وہ ڈینٹسٹ کے پاس گیا ہے اور وہاں سے گھر چلا جائے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ اسد کچھ سوچ رہا تھا کہ اچانک اس کے فون کی گھنٹی بجی۔ اسکرین پر شہزاد کا نمبر چمک رہا تھا۔ اسد اس کے پیسے اس کے بینک میں ڈال چکا تھا۔ اس نے کال کاٹ دی، ایک لمحے بعد فون پھر بج اٹھا۔

”بولو۔“ اس نے بالآخر کال ریسیو کرلی۔

”سر آپ کے لیے ایک اچھی خبر ہے...... اسی سڑک پر ایک اور کیمرے کی کوریج سے آپ کے شکار کی پوری تصویر مل گئی ہے تھوڑی سی دھندلی ہے مگر اسے پہچانا جا سکتا ہے۔“ شہزاد پرجوش لہجے میں بولا۔

”واقعی......“ اسد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”تم وہ مجھے ای میل یا ٹھہرو، واٹس ایپ کر دو اگر ممکن ہو تو......“

UrduBooks.ink

’’سعدیہ کیا تم میری ایک مدد اور کر سکتی ہو۔ یہ کام میں خود کر سکتا ہوں مگر اس کے لیے مجھے کل کا انتظار کرنا پڑے گا۔ میرے پاس ایک تصویر آرہی ہے۔کیا تم ڈپارٹمنٹ کے ڈیٹا بیس میں اسے چیک کر سکتی ہو؟‘‘

’’ہاں یہ ہو سکتا ہے، ہم چونکہ فرانسک کے ذمے دار ہیں تو ہمارا ایکسس صرف مجرموں کے ہی نہیں ڈپارٹمنٹ اور دیگر سیکرٹ محکموں کے افسران کے ڈیٹا بیس تک ہے، وہ تم نہیں کر سکو گے۔‘‘

’’مان گیا آپ کو......‘‘ وہ مسکرایا، ہلکی سی ٹون نے وائس ایپ پیغام کا اعلان کیا۔ اسد نے فون آن کیا۔ اسکرین پر سیاہ زلفوں والی حسینہ کا چہرہ نظر آرہا تھا۔ وہ ٹرک میں بیٹھی ہوئی تھی مگر زاویہ ایسا تھا کہ وہ مکمل طور پر نظر آرہی تھی۔ وہ نہایت خوب صورت تھی مگر اس کے حسن میں ایک عجیب سی پُراسراریت موجود تھی۔ اسد چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر ہلکی سی سیٹی بجا کر وہ پیغام سعدیہ کے فون پر بھیج دیا۔ تصویر ملتے ہی وہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی تھی۔ پندرہ منٹ بعد اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگایا۔

’’کسی ریکارڈ میں یہ چہرہ موجود نہیں ہے، اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کوئی پیشہ ور مجرم نہیں ہے اور دوسرے یہ کہ یہ اب تک پکڑ میں نہیں آئی ہے۔‘‘

’’او کے......‘‘ اسد اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔’’ایک منٹ سعدیہ تم نے ابھی کہا تھا کہ تم ڈپارٹمنٹ اور دیگر سیکرٹ محکموں کے ڈیٹا بیس تک جا سکتی ہو؟‘‘

’’ہاں مگر اس کے لیے مجھے وجوہات بتانا ہوتی ہیں۔‘‘ وہ بولی۔

’’اور اگر تم اس کے بغیر یہ کام کرو تو؟‘‘

’’اگر پکڑی گئی تو کیس ہو جائے گا۔‘‘

’’تم نہیں پکڑی جاؤ گی۔ میرا مطلب ہے ایک تو تم اتنی ماہر ہو اور پھر... مابدولت یعنی اسد خان کی کلاس فیلو ہو۔‘‘

’’واہ بھئی ہماری صلاحیت کا کریڈٹ بھی آپ جناب کو ملے گا۔‘‘ سعدیہ نے آنکھیں دکھائیں۔

’’پلیز مجھے یہ آنکھیں دکھانے کے بجائے ریکارڈ ڈیٹا کو دکھاؤ اور اپنی صلاحیت ثابت کرو۔‘‘

’’او کے، تمہارے لیے یہ بھی سہی، میں دل سے چاہتی ہوں کہ تم خود کو صحیح ثابت کر سکو۔‘‘

’’شکریہ سعدیہ......‘‘ اسد دل سے بولا۔

سعدیہ اپنے لیپ ٹاپ پر جھکی ہوئی کمانڈز ٹائپ کر رہی تھی۔ کئی جگہ پاس ورڈز ڈالنے کے بعد اس نے تصویر لوڈ کر دی تھی۔ دس منٹ کی تلاش کے بعد بالآخر اسکرین پر پوزیٹو میسج جگمگایا تھا۔

’’اوہ گاڈ......‘‘ اسد کھڑا ہو گیا۔’’شیبا سکندر...... یہ وہی ہے، یہ تصویر والی عورت ہی ہے۔‘‘

’’یہ انٹیلی جنس سے وابستہ رہی ہے اور اپنے شعبے میں سینئر اور بہت کامیاب قرار دی جاتی ہے۔ اس کے بائیو کے مطابق یہ ایک بڑے مشن کے دوران دہشت گردوں کے حملے میں ہلاک ہو چکی ہے۔ اس کی لاش بہرحال نہیں مل سکی تھی۔ اس کے مطابق یہ بہترین نشانہ باز تھی۔ بہت سارے کامیاب مشن اس کے کریڈٹ پر ہیں۔‘‘

’’مجھے لگتا ہے یہ زندہ ہے اور اب نہ جانے کس کے لیے کام کر رہی ہے۔ سعدیہ تم نے بہت بڑا کام کیا ہے۔ جیسے ہی مجھے اور کوئی اطلاع ملے گی میں تمہیں ضرور بتاؤں گا۔‘‘

’’ضرور...... یہ سب بہت پُراسرار ہے اس کی تہ تک پہنچنا ضروری ہے مگر ایک بات جو سمجھ میں آرہی ہے، وہ یہ ہے کہ وہ صرف مجرموں کو ہی نشانہ بناتے ہیں، بے گناہوں کو شکار نہیں کرتے۔‘‘

’’ہاں......‘‘ اسد یہ جملہ سن کر ٹھٹک گیا۔

’’واقعی ایم ایم نے اسے بھی اتنے دن قید میں رکھ کر آزاد کر دیا تھا۔

☆☆☆

تیمور کی گاڑی کیمپنگ گراؤنڈ کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر تھا۔ فواد پسنجر سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کافی کا گلاس تھا۔

’’تم تیار ہو؟‘‘ تیمور نے فواد کی طرف دیکھا۔

’’جی سر......‘‘ اس نے کافی کا سپ لیتے ہوئے کہا۔

تیمور نے اگنیشن میں چابی گھمائی۔ اس وقت میں اس نے کچھ تیاریاں کی تھیں۔ اس کی کار کی ڈکی میں اس وقت ایک بیلچہ، رسیاں، بڑے ٹیپ، پلاسٹک، پیٹرول سے بھرا ہوا کین، ڈکی میں موجود تھا۔ اس کی جیب میں لائٹر موجود تھا۔ وہ اسموکر نہیں تھا مگر لائٹر کے ساتھ اس نے سگریٹ کا ڈبا بھی خرید لیا تھا کچی سڑک پر مڑتے ہی اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا کچھ دیر بعد انہیں دور بنا لکڑی کا کاٹیج نظر آنے لگا تھا۔ تیمور کی کار بے آواز انداز میں چل رہی تھی۔ کاٹیج سے کچھ پہلے جھاڑیوں کے جھنڈ کے ساتھ تیمور نے کار روک لی تھی۔

’’تمہیں یہیں رک کر نگرانی کا کام کرنا ہے۔ اگر مجھے

UrduBooks.pk

تمہاری ضرورت ہوگی تو میں تمہیں کال کروں گا۔ تم بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔"

فواد نے خاموشی سے سر جھکا لیا تھا۔

تیمور نے دوبارہ کاٹیج کی طرف کھسکنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر میں وہ کاٹیج کے قریب پہنچ گیا۔ کاٹیج کے باہر وہی صبح والی پک اپ اور ایک اور گاڑی موجود تھی۔ وہ ان کے پاس سے گزرتا ہوا چھوٹے سے پورچ میں داخل ہوا، کاٹیج کا اندرونی دروازہ اب اس کے سامنے تھا۔ اس نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا، ایک گہری سانس لی اور اندر داخل ہو گیا۔ سامنے میز کے ساتھ وہی ٹرک والا تھا جسے اس نے بالکونی میں دیکھا تھا۔ دوسرا گنجا اور طویل القامت تھا۔ اس کے چہرے پر ماتھے سے الٹے گال تک زخم کا واضح نشان تھا۔

"ہلنا مت ورنہ میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔" تیمور غرایا۔ دونوں نے اضطراری طور پر ہاتھ بلند کر دیے۔ "اور تم...... فوراً کاؤچ کے پیچھے سے سامنے آجاؤ ورنہ یہ ریوالور ان دونوں کی چھٹی کر دے گا۔" تیمور نے تیسرے شخص کو صوفے کے پیچھے گھستے دیکھ لیا تھا۔

"مم میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔" وہ مہین سی آواز میں بولا جو اس کی بھاری بھرکم جسامت پر مضحکہ خیز سی لگ رہی تھی۔

"تم بھی یہاں کرسی پر آکر بیٹھو اور ہاتھ اوپر کر لو۔" تیمور نے کہا۔ "اوہ تو تم کوئی نیا بم بنا رہے ہو۔" اس کی نظر ان کے سامنے رکھی میز پر پڑی چیزوں پر پڑی۔

"اپنے ہتھیار نکال کر یہاں رکھ دو۔"

اس نے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ چند لمحوں میں صوفے پر پانچ ریوالور، چاقو وغیرہ کا ڈھیر لگ گیا تھا۔ وہ بڑی تابعداری سے ہتھیار رکھ کر اپنی جگہ پر لوٹ گئے تھے مگر تیمور جانتا تھا کہ وہ صرف موقع کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس نے انہیں گھورنے کے ساتھ کمرے کا جائزہ لیا۔ ہال نما اس کمرے کے ساتھ ہی ایک اوپن کچن اور غالباً باتھ روم موجود تھا۔ کچن میں اسٹوو پر ایک بڑی کیتلی میں پانی ابل رہا تھا شاید وہ چائے یا کافی کی تیاری کر رہے تھے۔ تیمور اپنی جگہ سے ہلا اور اس نے دوسرے ہاتھ میں ابلتے ہوئے پانی کی کیتلی پکڑ لی۔ پھر وہ ٹیبل کی طرف واپس آیا۔

"اب میں پہلا سوال کرنے جا رہا ہوں، مجھ سے جھوٹ بولنے کی کوشش مت کرنا۔ کیا تم لوگوں نے ایک نوجوان فواد سے C-4 چوری کروایا تھا؟"

"ہاں...... ہاں ہم نے کیا تھا۔" وہ خوف زدہ لہجے میں بولا۔

"ہوں...... سوال نمبر دو، تم لوگوں نے بم بنایا اور پھر اس بچے سے اسے اس اسٹور میں لگوایا تھا؟"

"تو ہمیں سمجھ کیا رہا ہے؟" بھاری جسامت والے نے یکدم غوطہ کھایا اور صوفے پر رکھے ہتھیاروں میں سے ایک پسٹل اٹھانے کی کوشش کی مگر اس کی انگلیاں پسٹل سے ٹکرانے سے پہلے ہی تیمور نے ٹریگر دبا دیا تھا، گولی لگتے ہی وہ ڈکرایا اور اپنا ہاتھ پکڑ کر ناچنے لگا۔ اس کے ہاتھ سے خون بہت تیزی سے بہہ رہا تھا۔ دو لمحے بعد وہ وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔

"کیا تم مرنا چاہتے ہو؟" تیمور نے مہین آواز والے سے حتمی انداز میں پوچھا۔ اس نے زمین پر پڑے اپنے ساتھی کو دیکھتے ہوئے نفی میں گردن ہلائی اور بولا۔

"ہاں ہم نے اس بم کو پلانٹ کیا تھا۔"

"اب آخری سوال......" تیمور بمشکل خود پر قابو رکھے ہوئے تھا۔ "ریموٹ کس کے ہاتھ میں تھا؟ کس نے وہ بم اڑایا تھا؟"

کمرے میں سکوت طاری تھا۔ تیمور نے پسٹل زخمی ہاتھ والے کی گردن پر رکھا۔

"کیا وہ تم تھے نا......؟" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ تیمور نے پک اپ والے کی طرف دیکھا۔ اس کا سر اور گردن پر آبلے نظر آ رہے تھے۔ اس نے بمشکل نفی کا اشارہ کیا۔

"یعنی وہ تم تھے۔" تیمور مہین آواز والے کی طرف مڑا۔ "تم میری بیوی اور بیٹی کے قاتل ہو...... تم نے یہ کیوں کیا تھا؟"

"ہم...... ہمارا دھندا ہے یہ......" وہ دھیرے سے بولا۔ "پیسے کے لیے......"

تیمور کے تھپڑ نے اسے الٹا دیا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ان سب کے ٹکڑے کر دے مگر وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے جیب سے رسی نکالی اور ان تینوں کو ایک دوسرے کو سختی سے باندھنے کا حکم دیا۔ جب وہ ایک دوسرے کو باندھ چکے تو تیمور نے مہین آواز والے کو کرسی کے ساتھ باندھا۔ اس نے سلنڈر کی پن نکال دی۔ سس کی آواز سے گیس نکلنا شروع ہو گئی تھی۔ بندھے ہوئے تینوں افراد کے چہرے سفید پڑ گئے۔ تیمور نے ان کی طرف دیکھا

اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس نے ماچس جلائی اور جلتی تیلی کو ڈبے میں واپس ڈال دیا جب تمام تیلیاں جلنے لگیں تو اس نے ڈبیا کو کھڑکی سے اندر پھینکا اور تیزی سے کار کی طرف دوڑ لگا دی۔ انصاف کا تقاضا پورا ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اسد ابھی کافی پینے کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ سلیم کو آج اپنے رسالے کے حوالے سے کچھ کام تھا۔ وہ صبح سے ہی کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ اسد کافی پی کر نکلا تو اسے سرفراز کا خیال آیا۔ وہ دو روز سے اس سے ملنا چاہ رہا تھا مگر وہ دفتر سے جلدی چلا گیا تھا۔ اب وہ سعدیہ سے پتا لے کر اس کے گھر جا رہا تھا۔

پتا ایک متوسط علاقے کا تھا۔ سرفراز کا مکان اسے آسانی سے مل گیا تھا۔

”میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں ایس پی صاحب کہ آپ اس وقت مجھ سے کیا جاننا چاہ رہے ہیں؟“

”مجھے تم سے ایک کیس کے بارے میں تھوڑی سی معلومات درکار ہیں۔“

”کس کیس کے بارے میں؟“ اس نے ابرو چڑھا کر پوچھا۔

”بڑی جیل والے کیس کے بارے میں۔ مجھے اس بارے میں کچھ نئی باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ اس کی فائل تم نے ہیڈ آفس پہنچائی تھی۔“

”ہاں غالباً...... جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، میں نے فائل ڈی ایس پی فیروز شاہ کو پہنچا دی تھی۔ ڈپارٹمنٹ میں وہی اس کیس کو دیکھ رہے تھے۔ مگر یہ کیس تو بند ہو چکا ہے۔ اب آپ کو اس میں کیا نئی بات ملی ہے؟“

”ہاں کچھ نئے شواہد سامنے آئے ہیں جن کی وجہ سے کیس ری اوپن ہونے کی امید ہے۔“

”اس حوالے سے اگر کچھ بھی تعاون درکار ہو تو آپ مجھے یاد کر سکتے ہیں۔“ سرفراز نے کہا۔

اسد اس کے بعد وہاں سے نکل آیا تھا۔ ڈی ایس پی فیروز سے ملاقات اگلے روز ہی ممکن تھی مگر نہ جانے کیوں اس کی چھٹی حس کچھ اور ہی کہہ رہی تھی۔

اسے یقین تھا کہ سرفراز اس سے کچھ نہ کچھ چھپا رہا تھا۔

☆☆☆

اسد کے جاتے ہی سرفراز نے فون پر ایک نمبر ڈائل کیا۔ دو بیل جانے کے بعد فون ریسیو کر لیا گیا۔

”میں نے تمہیں کہا تھا کہ مجھے فون نہ کیا کرو۔“ دوسری طرف سے سرسراتی ہوئی آواز آئی۔

”میں جانتا ہوں مگر ابھی ابھی ایس پی اسد خان میرے پاس آیا تھا۔“

دوسری طرف سکوت سا طاری ہو گیا۔ ”میں نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ انویسٹی گیشن کا انچارج کون تھا، میں نے اسے فیروز شاہ کا نام بتا دیا ہے۔ اسے اس بات کا گمان بھی نہیں ہے کہ وہ فائل کبھی ڈپارٹمنٹ نہیں پہنچی۔“

”بکواس مت کرو اور اس معاملے سے بالکل الگ رہو۔ جو فائل تمہارے دفتر میں موجود ہے، اسے ابھی وہاں سے غائب کر دو...... یہ تمہارا کام ہے اور اسے فوری طور پر ہر قیمت پر ہو جانا چاہیے۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ مری ہوئی آواز میں بولا۔ دوسری جانب سے فون بند کر دیا گیا تھا۔ سرفراز آہستگی سے اپنے کمرے میں آیا۔ اس کی بیوی بستر پر نیم دراز تھی۔ وہ چند لمحے اس سے باتیں کرتا رہا پھر ضروری کام کا کہہ کر گھر سے باہر نکل گیا۔ وہ سیدھا اپنے دفتر... پہنچا تھا جو اس وقت بند ہو چکا تھا۔ لہٰذا خود کو کیمرے سے بچاتے ہوئے وہ لیب میں پہنچ گیا۔ ٹارچ کی روشنی میں اس نے مطلوبہ فائل تلاش کی اسے بغل میں دبایا اور سب کچھ پہلے جیسی صورتِ حال میں لا کر دفتر سے نکل گیا۔ گھر پہنچنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آیا اور اس نے الماری کھولی۔ اس نے الماری میں موجود چھوٹا سا سیف کھولا اور فائل کو اس میں چھپا دیا۔ اس کی بیوی گہری نیند میں تھی۔ وہ ایک لمحے اسے دیکھتا رہا پھر اس کے برابر میں لیٹ گیا۔ وہ ہر بات بھول جانا چاہتا تھا مگر ذہن نئے سے تانے بانے بن رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا، نادیدہ نگاہیں اسے گھور رہی ہیں۔

☆☆☆

تیمور گاڑی سے چند قدم کے فاصلے پر تھا کہ کالج سے دھماکے کی آواز بلند ہوئی۔ اس نے مڑ کر دھڑا دھڑ جلتے ہوئے کالج کو دیکھا۔ پھر تیزی سے اپنی کار کی طرف بڑھا۔ کار کے سامنے پہنچ کر وہ ٹھٹک کر رہ گیا تھا۔ فواد سیٹ پر الٹا پڑا ہوا تھا۔ اس کی گردن پر گولی کا نشان تھا جس سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ گاڑی سے باہر لٹکا ہوا تھا۔ تیمور دوڑ کر اس کے قریب پہنچا مگر اس کی بے نور آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اب اسے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔

تیمور کو دھچکا سا لگا تھا وہ صرف ایک دن سے اسے جانتا تھا۔ وہ بھی نینا اور پریسا کی موت کے ذمے داروں میں شامل تھا۔ وجہ چاہے کچھ بھی رہی ہو مگر تیمور کے دل میں اس کے لیے ایک نرم کونا پیدا ہو چکا تھا۔

وہ زیادہ دیر وہاں نہیں رک سکتا تھا۔ اس نے فواد کی لاش کو گاڑی سے نکال کر جھاڑیوں کے قریب لٹایا اور کار کو دوڑاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اسی لمحے پیچھے اسے مزید دو بلاسٹ سنائی دیے تھے شاید آگ نے باہر کھڑی گاڑیوں اور ٹرکوں کو بھی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ آگ کی خاصیت یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنی لپیٹ میں آنے والی ہر چیز کو خاکستر کر دیتی ہے۔ ہر اچھی یا بری چیز کو......

☆☆☆

وہ رات بہت دیر سے سویا تھا مگر اس کے باوجود وقت پر اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ کسلمندی سے کروٹیں بدلتے ہوئے اس نے عادت کے مطابق ریموٹ اٹھایا اور ایل سی ڈی آن کر دیا۔ صبح کی خبریں چل رہی تھیں۔ وہ چینل بدلنے ہی والا تھا کہ سماعت سے ٹکرانے والی نیوز کاسٹر کی آواز نے اس کے ہاتھ کو ساکت کر دیا۔

”نیشنل فرانسک سے تعلق رکھنے والے ایک افسر آج صبح اپنے گھر میں مردہ پائے گئے، انہیں سر میں گولی مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔ ان کے ساتھ ان کی اہلیہ کو بھی گولی ماری گئی ہے تفصیلات جلد ہی آپ کی معلومات کے لیے پیش کی جائیں گی۔“

اسد اچھل کر بستر سے کھڑا ہو گیا۔ سرفراز کے بیان میں کچھ گڑبڑ تھی مگر اسے اس طرح قتل کر دیا جائے گا، یہ اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

تسلیم رات واپس نہیں آیا تھا۔ اسے اتنے دنوں میں اس کے ساتھ کی کافی عادت ہو گئی تھی۔ اس نے کندھے اچکائے اور تیار ہونے لگا تھوڑی ہی دیر میں اس کی کار کا رخ سرفراز کے گھر کی طرف تھا جہاں پولیس اور دیگر افراد کے ساتھ سعدیہ بھی موجود تھی۔ اس کی آنکھیں بھاری ہو رہی تھیں جیسے وہ کافی دیر روتی رہی ہو لاشیں وہاں سے لے جائی جا چکی تھیں۔ فرانسک کی ٹیم شواہد جمع کر رہی تھی۔

اس کی ٹیم اب الماری کی تلاشی لے رہی تھی۔ الماری سے انہیں ایک سیف کے سوا کوئی خاص چیز نہیں مل سکی تھی۔ سعدیہ سیف کے ڈھکن کو کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”لاؤ یہ مجھے دو، مجھے اس کا میکنزم معلوم ہے۔“ اسد نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے سیف لیا اور اسے دھیمے سے اندر کی جانب کھینچ کر دبایا اس کا ڈھکن کھل گیا۔ اندر نظر پڑتے ہی سعدیہ اور وہ دونوں چونک گئے تھے۔ سیف میں سعدیہ کی دفتری فائل موجود تھی۔ اسد نے سعدیہ کی جانب دیکھا جو حیرت سے فائل کو تک رہی تھی۔ پھر اس نے معذرت خواہانہ انداز میں اسد کو دیکھا اور فائل کو سیف سے نکال لیا۔

☆☆☆

تیمور کی کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی۔ اس کا دل بہت عرصے بعد کچھ سکون محسوس کر رہا تھا مگر دماغ عجیب کشمکش کا شکار تھا۔ ایک ہی دن میں اس کے ہاتھوں سے چار انسانوں کی موت واقع ہوئی تھی۔ پانچویں کی موت میں اس کا ہاتھ نہیں تھا مگر جان سے تو وہ بھی گیا تھا۔ فواد کی ماں اب اس کی ذمے داری تھی۔ تیمور نے فیصلہ کیا۔ گاڑی کو وہ سیدھا اپارٹمنٹ کے نیچے اپنے گیراج میں لے گیا جہاں اس نے پانی اور پیٹرول سے اس کی اچھی طرح صفائی کر دی تھی۔ گھر پہنچ کر اس نے اپنے خون آلود کپڑوں سے جان چھڑائی فریش ہو کر وہ لاؤنج میں داخل ہوا ہی تھا کہ اسے وہاں کوئی کھڑا ہوا نظر آیا۔ اسے پہلے اس پر رمشا کا گمان ہوا مگر وہ تو ایک دن کے لیے اسکول کے بچوں کو ایک ٹرپ پر لے کر گئی ہوئی تھی۔ پھر یہ کون ہو سکتا ہے؟ اس نے سوچا پھر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کی پشت پر پہنچا۔ اس نے اس کی گردن کو گرفت میں لیا ہی تھا کہ وہ گویا پھسل کر اس کی گرفت سے نکل گیا۔ تیمور نے گھوم کر اسے کک مارنی چاہی مگر اس نے کسی ماہر استاد کی طرح وہ کک اپنے ہاتھوں پر روک لی۔

”تیمور...... ایک لمحہ رکیے۔“ وہ اس کے حملوں کو روکتے ہوئے بولی۔

”کون ہو تم؟ اور تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہے؟“ وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔

”میں آپ کے بارے میں سب جانتی ہوں اور میں یہاں آپ کی مدد کرنے آئی ہوں، کیا ہم چند لمحے بات کر سکتے ہیں؟“

”شیور......“ تیمور نے آگے بڑھ کر کمرے میں روشنی کی۔ اور اسے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ تیس سال کے لگ بھگ نظر آ رہی تھی اور بہت خوب صورت تھی۔ اس خوب صورتی میں پُراسراریت کی جھلک تھی۔

”بولو۔“ تیمور کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ لڑکی مارشل آرٹ کی ماہر تھی۔ یعنی یہ کوئی عام شخصیت نہیں تھی۔

''میرا نام شیبا ہے۔ میں نے ہی تمہیں وہ ویڈیو پہنچائی تھی۔ اس سے پہلے تمہاری کار میں وہ کارڈ بھی میں نے ہی رکھا تھا۔''

''تم کالی لیکسس چلاتی ہو؟'' تیمور نے اچانک پوچھا۔

وہ جواباً مسکرائی۔ ''تم ہماری توقعات سے زیادہ ذہین ہو اور آج کی کارکردگی کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ نہ صرف ذہین، بہادر اور عقلمند بلکہ تمہیں برائی سے نمٹنا آتا ہے اور اسی لیے تمہارا انتخاب کیا گیا ہے۔''

''انتخاب...... تم کیا کہہ رہی ہو...... تم ہو کون؟''

''میں ایم ایم سے تعلق رکھتی ہوں۔ مشن محافظ...... ہم انصاف پر یقین رکھتے ہیں اور اس بات پر بھی کہ انصاف کے بغیر دنیا نہیں چل سکتی...... میں تمہیں کسی سے ملانا چاہتی ہوں۔ کیا تم چلنے کے لیے تیار ہو؟''

☆☆☆

اسد کافی دیر سے بلامقصد ڈرائیونگ کررہا تھا۔ اس کا ذہن بُری طرح الجھا ہوا تھا۔ سرفراز کی موت کے بعد صرف وہ ایک تصویر تھی جس کی شناخت ہوجانے کے باوجود وہ اسے تلاش نہیں کر پارہا تھا۔ دفتر سے وہ تقریباً معطل ہی تھا۔ سرفراز کے قتل کے بعد سے سعدیہ سے بھی اس کی بات نہیں ہوئی تھی۔ بالآخر اس نے ایک ریسٹورنٹ کے پاس کار روک لی۔ ریسٹورنٹ تقریباً خالی ہی تھا۔ وہ آرڈر دے کر بیٹھا ہی تھا کہ ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔

''میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں۔'' اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کا دل گویا حلق میں آگیا۔

''وہ...... وہ ہی تھی...... شیبا سکندر...... جسے وہ کب سے ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔

☆☆☆

رمشا اسکول میں تھی۔ آج وہ سب بہت مصروف تھے۔ ٹیچر پیرنٹس میٹنگ والا دن ہمیشہ بہت تھکا دینے والا ثابت ہوتا تھا۔ اگرچہ۔۔ چھٹی ہوچکی تھی مگر وہ اپنا کام مکمل کرنے کے چکر میں رکی ہوئی تھی۔ جب وہ اسکول سے نکلی تو شام ڈھلنے لگی تھی۔ رمشا کے پاس اپنی کار موجود تھی۔ گھر بھی اسکول سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس نے پارکنگ سے کار نکالی اور سڑک پر آگئی۔ اسکول سے ایک گلی آگے چاکلیٹ شاپ تھی۔ یہ جگہ پریا کو بہت پسند تھی۔ اکثر وہ تھیں سے اس کے چاکلیٹ لے کر جایا کرتی تھی۔

پریا کی یاد ایک سرد آہ بن کر اس کے لبوں پر آگئی تھی۔

سگنل پر اس نے گاڑی روکی اور آنکھ میں بھر آنے والے آنسو کو ہاتھ کی پشت سے صاف کیا ہی تھا کہ اچانک پسنجر سیٹ کا دروازہ کھلا اور ایک درشت چہرے والا شخص گاڑی میں بیٹھ گیا۔

''کک...... کون ہو تم...... اُترو نیچے۔'' وہ ہذیانی انداز میں بولی۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے اپنا دروازہ کھول کر گاڑی سے اترنے کی کوشش کی مگر اگلے ہی لمحے اسے ساکت ہوجانا پڑا۔ اس کی پسلی میں کچھ چبھا تھا۔

''یہ پستول ہے چلتا ہے تو جان لے لیتا ہے۔ سکون سے گاڑی چلاؤ...... سگنل بھی کھل گیا ہے۔'' برابر میں بیٹھا ہوا شخص دھیمی آواز میں غرایا۔

''مم مگر تم کون ہو؟ کیوں میری گاڑی میں آئے ہو......؟'' وہ رونے والی ہورہی تھی۔

''میرا انٹرویو لینے کی کوشش بہت مہنگی پڑسکتی ہے کیا تم مرنا چاہتی ہو؟''

''نن...... نہیں۔'' وہ بولی۔

''بس تو پھر خاموشی سے ڈرائیو کرو......'' وہ اس کے حکم کے مطابق چپ ہوگئی تھی۔ مگر ذہنی انتشار میں ڈرائیونگ بہت مشکل لگ رہی تھی۔ نہ جانے اب ان کے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ وہ اس کے کہنے کے مطابق اب قدرے ویران علاقے میں نکل آئی تھی۔

''گاڑی روکو......'' وہ غرایا۔

''آں...... یہاں......'' اس نے کہنا چاہا مگر ریوالور کی نال کے ٹہوکے پر اس نے گاڑی روک دی۔ انہیں وہاں کھڑے ایک منٹ ہی گزرا تھا کہ سامنے سے ایک دوسری کار آتی نظر آئی جیسے ہی وہ کار قریب آئی اچانک اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ اس نے دھندلائی نظروں سے اس شخص کو دیکھا مگر اسی لمحے اس نے ریوالور کے دستے سے اس کے سر پر دوسرا وار کیا۔ اس کے بعد وہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھی تھی۔

☆☆☆

اسد اور تیمور دونوں ایک بہت بڑی اسٹڈی میں ایک شاندار میز کے سامنے رکھی دو قیمتی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے والی نشست پر وہ موجود تھے۔ سرخ و سفید چہرہ دراز قامت اور مناسب جسامت کے ساتھ وہ ایک متاثر کن شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے صحت مند

چہرے پر سفید بال اور چھوٹی سی سفید داڑھی ان کے وقار میں اضافہ کر رہی تھی۔

"میرا نام ابراہیم عبداللہ ہے مگر یہاں سب مجھے "بگ بی" کے نام سے پکارتے ہیں فلموں والے امیتابھ والا بگ بی نہیں۔" وہ مسکرائے۔ "اصل میں میرے ساتھی مجھے بڑا بھائی مانتے ہیں...... تم دونوں چاہو تو تم بھی یہ کہہ سکتے ہو۔ پہلے تو میں تم دونوں کو یہاں خوش آمدید کہتا ہوں اور مبارک باد بھی پیش کرتا ہوں کیونکہ اس کمرے تک آنے کے لیے غیر معمولی شخصیت کا ہونا ضروری ہے اور تم دونوں ہی نے اپنے کمال اور اوصاف سے مجھے متاثر کیا ہے تم دونوں بہادر ہو، ایماندار ہو اپنے شعبے کا کام کرنا چاہتے ہو اور حق کے لیے لڑ سکتے ہو۔"

"مگر آپ کون ہیں؟" تیمور نے پوچھا۔ "اور یہ مشن محافظ کیا ہے؟ آپ نے ہمیں یہاں کیوں بلایا ہے؟"

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے حساب سے آپ کی یہ تنظیم یا ادارہ سیکڑوں قیدیوں کے قتل عام میں ملوث ہے۔" اسد بولا۔ "اگرچہ اسے حادثہ قرار دیا جا رہا ہے مگر وہ حادثہ نہیں تھا۔"

"تم درست کہہ رہے ہو اسد...... وہ حادثہ نہیں تھا بلکہ وہ پوری قوم کو بہت بڑے حادثے سے بچانے کے لیے مجبوری میں اٹھایا گیا قدم تھا مگر اس میں بھی انہی لوگوں کو نشانہ بنایا گیا تھا جو مانے ہوئے مجرم تھے۔ ہم نے بے گناہوں کو کوئی تکلیف نہیں پہنچنے دی۔"

"مگر یہ کیوں کیا گیا؟ اور اس کی تفتیش کیوں نہیں ہوئی؟" اسد نے پوچھا۔

"مشن محافظ ملک کو درپیش خطرات سے نمٹنے کے لیے بنایا گیا ہے اس میں صرف ایماندار اور بہت باصلاحیت لوگوں کو ہی شامل کیا جاتا ہے۔ ملکی سلامتی اور شہریوں کی حفاظت ریاست کا سب سے بڑا فرض ہے۔ بسا اوقات جانتے بوجھتے قوانین اور دیگر قواعد کی وجہ سے اصل مجرم بچ جاتے ہیں ہم اس فرض میں مدد کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ ہم کافی دنوں سے ایک گروہ کے پیچھے ہیں۔ انہیں دشمن ممالک کی مدد اور پشت پناہی حاصل ہے اور وہ ملک میں گڑبڑ پھیلانا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے بڑی جیل کے قیدیوں کو فرار کرانے کی مکمل تیاری کر لی تھی۔ اگر اس روز وہ واقعہ پیش نہ آتا تو ملک بھر میں اب تک دھماکوں، قتل و غارت گری کا جال بچھ چکا ہوتا۔" وہ دھیمی آواز میں کہہ رہے تھے۔

"جہاں تک تفتیش کی بات ہے تو ہم تو ملکی بقا کے لیے کام کر رہے ہیں۔ سیکرٹ مشن اور سیکرٹ ایجنٹس کا نام سنا ہے نا تو ہمارے بہت سے اچھے سیکرٹ ایجنٹ رہے ہیں جیسے ہماری افسر شیبا...... اور ہم تم دونوں کو بھی اپنے ساتھ شامل کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے کام کے ساتھ تم بھی ایم ایم کا حصہ ہو گا اور اپنے خفیہ مشن پر کام کرتے رہو گے اگر تم چاہو تو......"

"اور اگر نہ چاہیں......؟" اسد نے پوچھا۔

"تو اس ملاقات کو بھول جانا اور بس۔" وہ مسکرائے۔

"میں آپ کے ساتھ ہوں۔" تیمور جواب تک چپ تھا بالآخر بولا۔ "میں اپنا خاندان دہشت گردی کے ایک واقعے میں کھو چکا ہوں آپ کی مدد سے میں انصاف کر پایا ہوں۔ میرے کسی کام سے اگر دوسرے انسان اس دکھ سے بچتے ہیں تو میں حاضر ہوں۔"

"جیتے رہو......" وہ مسکرائے۔ "اور تم ڈیئر ایس پی...... تم سوچنے کا وقت لینا چاہتے ہو؟"

"نہیں......" اسد نے کہا۔

"پھر......؟"

"نیا مشن جاننا چاہتا ہوں۔" وہ مسکرا دیے۔

"میں جانتا تھا اچھی روحیں اچھی روحوں کو پہچان لیتی ہیں۔ یہ ہمارا ملک ہے اس کی حفاظت ہم سب پر لازم ہے پھر وہ کہیں بھی کسی بھی شکل میں ہو سکتی ہے۔ ایک درخت لگا کر، راستہ صاف کر کے، اصول و قاعدوں کی تعمیل کر کے یا دہشت گردوں کی بیخ کنی کر کے...... میں خوش ہوں بہت......" انہوں نے ان دونوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "شیبا تمہیں رابطے کے طریقے بتا دے گی میری صرف ایک درخواست ہے۔ اس سب کے بارے میں کسی سے...... کسی سے بھی ذکر نہ کرنا...... چاہے وہ تمہارا کتنا ہی قریبی کیوں نہ ہو اس طرح تم ان کی حفاظت کرو گے۔"

☆☆☆

"تم کہاں غائب تھے چار دن سے۔" اسد نے سلیم سے پوچھا۔ وہ ابھی ابھی گھر آیا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ مسلسل جاگتا رہا ہے۔

"ڈیڈ لائنز اور اسائنمنٹ...... یہ ہمارے کام کا حصہ ہے، ایک اسائنمنٹ پورا نہیں ہو پایا تھا۔ اس چکر میں لگا ہوا تھا۔"

QALBI

قلبی

شہد • لہسن • ادرک • لیمن جوس • سرکہ سیب

دل کا علاج

NO SIDE Effect

قلبی بچوں اور بڑوں کیلئے یکساں مفید

خوشگوار ذائقے کے ساتھ

قلبی خون میں کولیسٹرول کو کم کرتا ہے

قلبی خون میں لوتھڑے بننے سے روکتا ہے

قلبی دل کے دورے سے محفوظ رکھتا ہے (ان شاء اللہ)

قلبی کے استعمال سے بائی پاس کی ضرورت نہیں رہتی

قلبی کے مسلسل استعمال سے دل کی بند شریانیں کھل جاتی ہیں

قلبی جوڑوں کے درد اور دائمی قبض کیلئے انتہائی مفید ہے

قلبی جسم کو خوبصورت اور اسمارٹ بناتا ہے

قلبی دل، دماغ اور جگر کو طاقت دیتا ہے

قلبی جسم کو خوبصورت اور اسمارٹ بناتا ہے

قلبی باضمے کو ٹھیک کرتا ہے (ان شاء اللہ)

فرینا کھائیے جان بنائیے

فرینا سپر گولڈ

صحت بنائیں
خوبصورت نظر آئیں

جسم کو مضبوط، طاقتور اور خوبصورت بنانیوالی غذا

قدرتی طور پر قلیل عرصے کے استعمال سے جسمانی طور پر مضبوط طاقتور بنانے والی حیرت انگیز غذا جو پھلوں کے مربہ جات، مغزیات اور غذائی قدرتی اجزاء سے تیار کردہ ہے مرد و خواتین، بوڑھے جوان سب کیلئے مفید ایک ایک چمچ صبح، دوپہر، شام ہمراہ پانی یا دودھ لیں اور ہمیشہ تندرست اور فٹ رہیں۔ فرینا سپر گولڈ بھرپور فوری قوت کیلئے

زرد چہرہ، خون میں سرخ ذرات کی کمی، غذا جزو بدن نہ بنتی ہو، صحت گرتی جاتی ہو، جسم ہڈیوں کا چلتا پھرتا ڈھانچہ، دبلا پتلا، پچکے گال، گرتے بال، جسمانی کمزوری، دماغی و اعصابی، جنسی کمزوری، تھکاوٹ، بھوک کی کمی جیسے امراض کیلئے مفید و مجرب ہے۔

ڈیلر ☆ خواجہ میڈیکل سٹور بالمقابل ایمپریس مارکیٹ صدر کراچی ☆ عرفان قادری جڑی بوٹی 10 بابر مارکیٹ لانڈھی 3 کراچی ☆ رفیق ٹریڈرز اینڈ دوائی مصطفیٰ دواخانہ رسالہ روڈ حیدر آباد ☆ خالد برادرز مدنی سٹریٹ سکھر ☆ سندھ ہربل ہومیو قدیر روڈ تحلہ سکھر ☆ کلاسک ہومیو مسجد روڈ کوئٹہ ☆ راوی دواخانہ اوگی ☆ مونگا پنسار مین بازار لیاقت آباد ☆ لاہور ملت دواخانہ گھنٹہ گھر پشاور ☆ ضیا ہومیو سٹور سکندر پورہ پشاور ☆ ناصر دواخانہ 20 صدر لائن پشاور صدر ☆ سٹی ڈرگ سٹور جی ٹی روڈ مینگورہ ☆ امجد پنسار مری روڈ ایبٹ آباد ☆ خالد دواخانہ صرافہ بازار ایبٹ آباد ☆ بادشاہ دی ہٹی بوہڑ بازار راولپنڈی ☆ زمان دواخانہ روہتاس روڈ جہلم ☆ / الرحمٰن دواخانہ 2 نور باوا گوجرانوالہ ☆ قدیمی دواخانہ کچہری بازار سرگودھا ☆ شاہی طبی دواخانہ چنیوٹ بازار فیصل آباد

مشورہ V.P ڈیلر کے بارے میں معلومات کیلئے 0300-6389463

YouTube Deva Herbal [illegible] deva@vahoo.com

UrduBooks.pk

”چلو اچھا ناشتا کرلو......“ اسد نے اس سے کہا۔

”تم سناؤ کیا چل رہا ہے، کہاں تک پہنچا کیس؟ اس عورت کے بارے میں کچھ معلوم ہوا؟“ سلیم نے پوچھا۔

”ہاں......“ اسد آگے کہنے والا تھا کہ بگ بی کی تنبیہ یاد آگئی۔ ”چل رہا ہے کام...... ویسے سچ پوچھو تو اب میں اس میں دلچسپی کھوتا جارہا ہوں۔ اس کے بجائے دہشت گردی کی اتنی وارداتیں ہورہی ہیں ان پر توجہ مرکوز کرنے کی کوشش کررہا ہوں۔“ اسد کی بات پر سلیم نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایسا کچھ تھا کہ اسد اسے دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

تیمور سخت پریشان تھا۔ رمشا کی کوئی خبر نہیں مل رہی تھی۔ بالآخر اس نے شیبا سکندر سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ اس کی بات سن کر ایک لمحے کو خاموش رہ گئی۔ اس کے بعد اس نے آدھے گھنٹے کی مہلت مانگی تھی۔ وہ اس وقت اس کے فون کا منتظر تھا۔ فون کی گھنٹی بجی تو اس نے لپک کر پہلی بیل پر کال ریسیو کی۔

”تیمور، ہماری اطلاعات کے مطابق اسے اغوا کرلیا گیا ہے۔“ وہ بولی۔

”اغوا...... رمشا کو......“ تیمور نے بمشکل کہا۔

”ہاں، ہمیں اس حوالے سے کچھ خبریں ملی ہیں۔ بگ بی نے کہا ہے کہ تم پریشان مت ہو...... آج ہی رمشا کو تلاش کرلیا جائے گا پوری ٹیم کو اس حوالے سے فعال کردیا گیا ہے...... تم بنگلے پر پہنچو۔“ اس نے یہ کہہ کر کال کاٹ دی تھی۔

☆☆☆

سلیم فیضان گہری نیند سے جاگا تھا۔ اس نے بازو پھیلا کر انگڑائی لی۔ کمرے کا ایل سی ڈی آن تھا شاید وہ ٹی وی دیکھتے دیکھتے سوگیا تھا۔ اس کی گھڑی میں صبح کے ڈھائی بج رہے تھے۔ وہ ذہنی طور پر مکمل فعال تھا اور اسے معلوم تھا کہ اسے اب کیا کرنا تھا۔ وہ بستر سے نکلا۔ فریج کھول کر ٹھنڈا پانی پیا پھر اس نے اسد کے کمرے میں جھانکا۔ اس کا دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا اور وہ بستر پر گہری نیند سو رہا تھا۔

”وقت آگیا ہے......“ اس نے اپنے آپ سے کہا پھر وہ اپنے کمرے میں واپس آیا۔ اس نے اپنا بیگ نکالا اور اس میں ہاتھ ڈال کر ایک ریوالور نما ہتھیار برآمد کیا۔ اس کی نال قدرے لمبی تھی۔ اس نے اسے اونچا کرکے اس کا جائزہ لیا وہ بہت خوب صورت ہتھیار تھا۔ دوسروں کو بے بس کر دینے والا ہتھیار...... اس نے اسے ہونٹوں سے لگایا اور اسد کے کمرے کی طرف چل دیا۔ اس کے کمرے ہو گروہ اس کے قریب پہنچا۔ ایک نظر اسد کے خوا ے پر ڈالی اس کے سینے کا نشانہ لیا اور گولی چلادی۔

☆☆☆

اسد کی آنکھ کھلی تو اس کا سر بُری طرح گھوم رہا تھا۔ سینے میں بھی شدید تکلیف تھی۔ وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں بند تھا مگر وہ یہاں کیسے پہنچا اسے کچھ یاد نہیں تھا۔ وہ اپنے بستر پر سویا تھا اور اب اس کی آنکھ یہاں کھلی تھی۔ نہ جانے اس واقعے کو کتنا ٹائم ہوا تھا۔ اس نے سوچا۔ وہ چند لمحے بستر پر پڑا رہا پھر بمشکل اٹھ کر کھڑا ہوا۔ چند لمحوں بعد اس کے حواس بحال ہوگئے۔ تو وہ دروازے کی جانب مڑا...... اچانک اسے برابر والے کمرے سے کسی کی سسکیاں لینے کی آواز آئی۔ وہ ایک لمحے کو ٹھٹکا اتنی دیر میں آواز بند ہوگئی تھی۔ اس نے دروازے کو کھولنا چاہا، وہ باہر سے بند تھا۔ اس نے کچھ سوچا پھر دروازے پر ہاتھ مارنے لگا۔ چند لمحوں بعد اسے باہر سے قدموں کی آہٹ سنائی دی پھر دو مسلح گارڈ کمرے میں داخل ہوئے۔

”کون ہو تم لوگ...... میں کہاں ہوں؟“ ان کو دیکھ کر اس نے پوچھا۔

”مہمان خانے میں ہو۔“ ان میں سے ایک نے کہا۔

”بکواس بند کرو شور کیوں مچا رہے ہو؟“ دوسرے نے اپنے ساتھی کو گھورتے ہوئے اسد سے کہا۔ ”چپ چاپ بیٹھو ورنہ بُری طرح پیش آؤں گا۔“

”مجھے باتھ روم جانا ہے۔“ اسد کو فوری طور پر یہی بہانہ سوجھا تھا۔

”لے کر جا بھائی اس کو......“ دوسرے گارڈ نے بیزاری سے کہا۔ اسد پہلے گارڈ کی معیت میں باہر بنے باتھ روم تک پہنچا۔ گارڈ دروازے تک اس کے ساتھ تھا۔ اس وقت وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ اسد جانتا تھا کہ کمرے میں بند ہونے کے بعد اسے موقع ملنا مشکل تھا اس لیے اسے اس وقت کا فائدہ اٹھانا تھا۔ باتھ روم کا دروازہ کھول کر اس نے گارڈ کو پکارا۔

”یہ یہاں پر کیا ہے؟“

”کیا ہے وہاں؟“ وہ تیزی سے آگے آیا، اسد کے لیے ایک موقع ہی کافی تھا۔ اس نے اس کی گردن پر ہاتھ کی مخصوص ضرب لگائی اور وہ بے ہوش ہوکر گر پڑا۔ اسد نے اسے باتھ روم میں بند کیا اور باہر نکلا دوسرا گارڈ اسی کمرے

UrduBooks.PK

کے دروازے کے باہر کھڑا تھا۔ اسد آہستگی سے اس کی پشت پر پہنچا اور اس کے منہ پر ہاتھ جما کر اسے کمرے میں گھسیٹ لیا۔ گردن پر مخصوص دباؤ نے اسے بھی لمحے بھر میں بے ہوش کر دیا تھا۔ اسے اپنے بستر پر ڈال کر وہ مڑا ہی تھا کہ اسے پھر سسکیوں کی آواز سنائی دی برابر والے کمرے میں یقیناً کوئی قیدی عورت موجود ہے اس نے سوچا۔ وہ کمرے سے باہر نکلنے لگا تھا کہ اس کے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا۔ وہ دوبارہ مڑا اور اس نے گارڈ کی یونیفارم اتارنا شروع کی۔ چند لمحوں میں وہ گارڈ کی یونیفارم اور ماسک پہن کر تیار تھا۔ وہ لپک کر کمرے سے نکلا اور برابر والے کمرے میں گھس گیا وہاں اندھیرا تھا۔

”یہاں کون ہے؟“ اس نے آواز دبا کر پوچھا۔ ”میں پولیس والا ہوں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔“

”میں...... میں ہوں یہاں۔“ ایک نرم نسوانی آواز اندھیرے میں گونجی پھر وہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی سامنے آ گئی۔ وہ ایک خوب صورت عورت تھی مگر اس وقت اس کے چہرے پر آنسوؤں کے نشان تھے اور بال بکھرے ہوئے تھے۔

”انہوں نے مجھے اغوا کیا ہے۔“ وہ بمشکل بولی۔

”مجھے بھی مگر اب ہمیں یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنا ہے۔“ وہ بولا۔

”کیا ہم نکل سکیں گے؟“ اس نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

”کوشش تو کریں گے۔“ اسد بولا۔

وہ دونوں آگے پیچھے کمرے سے نکلے تھے۔ کوریڈور میں شاید وہ ہی دو گارڈ تعینات تھے جنہیں اسد نے بے ہوش کر دیا تھا۔ وہ دونوں تیزی سے داخلی دروازے تک پہنچے اور باہر نکل گئے۔ اب وہ کھلے برآمدے اور پھر لان ٹائپ جگہ کے درمیان پہنچ گئے تھے۔

”رکو......“ اسد نے سرگوشی کے انداز میں کہا اور دیوار کے کونے سے دوسری طرف جھانکا وہاں ایک گارڈ موجود تھا۔ اس کی گن دیوار کے سہارے رکھی ہوئی تھی اور وہ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اسد آگے بڑھا تو اس نے اسے دیکھ لیا اور تیزی سے گن کی طرف بڑھا۔ اسد نے چیتے کی طرح اس پر چھلانگ لگائی پھر اس کے منہ پر ہاتھ جما تو گردن کو پوری طاقت سے موڑ دیا۔ کڑ کی ہلکی سی آواز کے ساتھ وہ بے حس و حرکت ہو کر زمین پر جا گرا۔ اسد نے اسے کھینچ کر دیوار سے لگا کر بٹھا دیا اور اس کی گن اٹھالی۔

”آپ بندوق چلا سکتی ہیں؟“ اس نے مڑ کر خاتون سے پوچھا۔

”ہاں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”میرے بھائی کو ہتھیاروں کا شوق ہے مگر میرا نشانہ بہت بُرا ہے۔“

”کوئی بات نہیں آپ گن کو پکڑیں اگر کوئی مسئلہ ہو تو ٹریگر دبا دیجیے گا۔“ وہ بولا۔

وہ دونوں آگے پیچھے چل رہے تھے کہ اچانک سائرن بجنا شروع ہو گیا۔

”انہیں ہمارے فرار کا علم ہو گیا ہے شاید۔“ وہ بولی اس کی آواز خوف سے لرز رہی تھی۔

”شاید۔“ اسد نے جواب دیا۔ وہ دونوں ایک بڑی جھاڑی کے پیچھے چھپ گئے تھے۔

”آپ کا نام کیا ہے؟“ اسد نے اچانک پوچھا۔

”رمشا۔“ وہ بے ساختہ بولی۔ اسے اسد کے ان حالات میں اس سوال پر حیرت ہوئی تھی۔

”میں اسد ہوں۔“ وہ بولا۔

”ہم یہاں سے کیسے نکلیں گے......؟“ اس نے اسد کی توجہ اصل مسئلے کی طرف دلانے کی کوشش کی۔

”اللہ کی رضا اور کوشش سے۔“ وہ مسکرایا۔ وہ جھاڑی سے باہر نکلا۔ وہ جانتا تھا کہ ان کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے مگر وہ کس طرف جائے یہ وہ بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

”ہالٹ۔“ اچانک ایک آواز نے اس کے قدم پکڑ لیے...... اس کے سامنے دو گارڈز کھڑے تھے اور ان کی بندوقوں کا رخ ان دونوں کی طرف تھا۔

☆☆☆

”ٹیم تیار ہے بگ بی۔“ شیبا نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ”مخبر کی مصدقہ خبر کے مطابق وہ شمالی حصے میں موجود ہیں ہم نے ان کی کمین گاہ کو ٹریس کر لیا ہے۔“

”ہم وہاں تک کیسے جائیں گے؟“ تیمور نے پوچھا۔

”ہیلی کاپٹر سے...... یہ جدید ہیلی کاپٹر بالکل خاموش ہیں تم، شیبا، حامد اور صفدر تم چاروں کو جانا ہے اور کامیاب لوٹنا ہے۔“ بگ بی نے کہا۔

”جی بگ بی۔“ وہ سب ایک ساتھ بولے تھے اور کمرے سے نکل گئے تھے۔

☆☆☆

اسد کو بُری طرح پیٹا گیا تھا اور پھر اس کے کمرے میں ڈال دیا گیا۔ اسے اس تکلیف سے زیادہ فکر رمشا کی ہو رہی تھی۔ نہ جانے ان لوگوں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہو

گا۔ اس نے سوچا۔ اسے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ وہ بمشکل کھڑا ہوا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا دروازے تک گیا۔ اس نے جیسے ہی ہینڈل گھمایا، دروازہ کھل گیا۔ وہ حیرت سے پیچھے ہٹ گیا۔ ”یہ کیسے ممکن ہے۔“ اس نے سوچا پھر اس نے دروازے کو دوبارہ کھولا اور کوریڈور میں جھانکا وہاں دو گارڈز موجود تھے۔ شاید انہیں اس سے دوبارہ اس ہمت کی امید نہیں تھی۔

”باس آگئے ہیں؟“ گارڈز آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔

”ہاں، ان دو قیدیوں کے چکر ہی میں آئے ہوں گے۔ اب دیکھو آج کیا ہو۔“ دوسرا بولا۔ ”وہ تو ابھی بے ہوش پڑا ہو گا، طبیعت سے کوٹا ہے اسے۔“

وہ دونوں مطمئن تھے۔ اسد کمرے کے دروازے سے نکل کر دیوار سے کسی چھپکلی کے مانند چپک کر رینگ رہا تھا۔

”میں چیک کر لیتا ہوں اس کو۔“ ایک گارڈ بولا تو وہ مقفل دروازہ کھول کر کمرے میں گھس گیا۔ حواس بحال ہوئے تو کمرے میں چاروں طرف دیکھ کر اس کی سانس رک سی گئی۔ کمرے میں بارودی مواد، دستی بم اور ٹائم بم بھرے پڑے تھے۔ اس نے چند لمحے سوچا پھر ایک ٹائم بم اٹھا کر اس پر 20 منٹ کا وقت لگایا۔ ٹائمر سیٹ کر دیا۔ اسے بیس منٹ میں رمشا کو ڈھونڈ کر یہاں سے نکل جانا تھا اور اگر وہ وقت مقررہ میں یہ نہ کر پایا تب بھی وہ اس سب کو نیست و نابود تو کر ہی سکتا ہے اس نے سوچا اور کمرے سے باہر نکلنے کے لیے دروازہ کھولا عین اسی وقت لاؤڈ اسپیکر پر ایک زوردار آواز گونجی۔

”اسد تم جہاں بھی ہو باہر آجاؤ...... ورنہ یہ جو لڑکی ہے نا رمشا...... اسے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔“ اسد اپنی جگہ جم کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مڑ کر بم کی جانب دیکھا جو لمحہ لمحہ انجام کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پھر گہری سانس لی۔ ٹائمر والے بم کو بارودی مواد کے نیچے چھپا کر وہ دونوں ہاتھ بلند کر کے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

اسے فوراً باس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ رمشا وہاں پہلے سے موجود تھی۔ ”خوش آمدید اسد۔“ آواز اس کے لیے بہت جانی پہچانی تھی۔ ”بالآخر تم مجھ تک پہنچ ہی گئے۔ ایک دراز قامت ہیولا نیم اندھیرے سے ان کے سامنے آ گیا تھا۔ اسے دیکھ کر اسد کا دماغ بھک کر کے اڑ گیا۔

”تم......“ وہ سلیم فیضان کو سامنے دیکھ کر ششدر رہ گیا۔

”ہاں میں...... تمہارا سلیم...... مگر ظاہر ہے کہ یہ میرا اصلی نام نہیں ہے، میں پرویز ہوں پرویز شمشاد۔“

”مگر تم نے یہ سب کیوں کیا ہے؟ اور مجھے یہاں کیوں لائے تم......؟“

”تمہیں یہاں لانے کا مقصد معلومات حاصل کرنا ہے...... تم نے بڑی جیل والے حادثے پر کام کرنا کیوں چھوڑ دیا۔ یہ جاننا چاہتا ہوں میں...... اور وہ فائل جو سرفراز نے غائب کی تھی، وہ کہاں ہے؟ اس فائل کا پتا چاہیے مجھے...... تمہاری دوست سعدیہ بھی بہت کام کی ہے اور ہمارے بہت سے مسائل حل کر سکتی ہے۔“

”مگر تمہارا اس سب سے کیا تعلق ہے؟“ اسد وقت گزارنا چاہتا تھا۔ اس دوران اسے کوئی موقع بھی مل سکتا تھا۔

”دھندے کا تعلق ہے۔“ وہ مسکرایا۔ ”جب تم مجھے ملے وہ اتفاق تھا مگر جیسے ہی مجھے تمہارے بارے میں سب معلوم ہوا، میں نے تمہارے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا تاکہ مجھے تازہ ترین معلومات مل سکیں اور یہی ہوا بھی...... مگر تمہاری ہر معاملے میں گھسنے کی عادت نے مجھے مجبور کر دیا کہ تمہیں یہاں لے آؤں۔“

”تمہارا دھندا کیا ہے؟“

”پیسا کمانا اور کیا......؟“ وہ کمینگی سے مسکرایا۔ ”ہمیں ایک بہت بڑی ایجنسی کی طرف سے بہت بڑا کام اور سرمایہ ملا تھا۔ ہمیں بڑی جیل سے مجرم آزاد کرانے تھے اور اس کے بعد ہر طرف آتش بازی ہونی تھی مگر نہ جانے کس طرح ان ایم ایم والوں کو بھنک مل گئی اور انہوں نے گڑبڑ کر دی مگر ہمارا کام نہیں رکا۔ بڑے اسٹورز اور مارٹ اس بار ہمارا نشانہ ہیں اور ایک کامیاب واردات ہو بھی چکی ہے۔“ رمشا منہ کھولے سب کچھ سن رہی تھی۔

”وہ...... وہ دھماکا بھی تم نے کیا تھا مگر وہ تو گیس لائن کا مسئلہ تھا؟“ اسد نے پوچھا۔

”اصل میں یہاں سب کچھ خریدا جاتا ہے۔ لہٰذا ہم نے بھی تفتیش بلکہ نتیجہ خرید لیا۔“ وہ ہنسا۔ ”مگر اس کی بھاری قیمت ادا کی ہے میں نے...... میرے بھائی کو اس کے بھائی نے قتل کیا ہے۔ وہ میری واحد فیملی تھا اور اب میں اس کی واحد فیملی کو ختم کر دوں گا۔“ وہ سفاکی سے بولا۔

”تم قاتل...... تم نے نیتا اور پریا کا خون کیا ہے۔“ رمشا اچانک غرائی اور اس نے سلیم فیضان یا پرویز پر چھلانگ لگا دی۔

☆☆☆

تیمور، شیبا اور ان کے دو ساتھی خاموش ہیلی کاپٹر سے لان کے قدرے تاریک حصے میں لینڈ کر چکے تھے۔ ان کی آنکھوں پر اندھیرے میں بصارت رکھنے والے چشمے تھے۔ جسموں پر بلٹ پروف تھے اور ہاتھوں میں جدید رائفلیں تھیں۔ وہ تیزی سے اندر داخل ہو رہے تھے اور ان کے راستے میں جو بھی آ رہا تھا، وہ اسے اس جدید گن کا نشانہ بنا رہے تھے جو لمحے بھر میں انہیں ڈھیر کر رہی تھی۔

☆☆☆

سلیم نے رمشا کو زور کا دھکا دیا تھا جس سے وہ دور جا کر گری۔ اس کا چہرہ غصے سے مسخ ہو رہا تھا پھر رفتہ رفتہ اس کے تاثرات معمول پر آ گئے۔

”فکر نہ کرو رمشا...... تمہیں موت کے گھاٹ تو اترنا ہی ہے اس کے لیے اتنی تیز رفتاری دکھانے کی کیا ضرورت ہے۔“

”بکواس بند کرو...... قاتل، میرا بھائی تمہیں نہیں چھوڑے گا۔“

”اگر وہ خود بچ گیا تو...... اور ہاں میں اسے مارنے سے پہلے بتا دوں گا کہ میں تمہیں بھی مار چکا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور اس نے بالوں سے پکڑ کر رمشا کو گھسیٹنا شروع کیا۔

”اسے چھوڑ دو سلیم۔“ اسد چلایا۔ دو گارڈز نے اسے دونوں ہاتھوں سے جکڑ رکھا تھا۔

”تم نہیں جانتے اسد...... تم سب کی وجہ سے میرا کتنا نقصان ہوا ہے، میرا بھائی مارا گیا ہے، میرا معاہدہ ٹوٹ رہا ہے، کروڑوں کا نقصان ہے یہ......“ وہ پاگلوں کی طرح بولے جا رہا تھا پھر اس نے جیب سے ریوالور نکال لیا۔ ”گڈ بائے رمشا......“ وہ بولا اور اس نے ریوالور کا رخ رمشا کی طرف کر دیا۔

☆☆☆

”ہمارے ٹریکرز کے مطابق یہ سب نچلی منزل کے درمیان ہیں۔“ شیبا اپنی گھڑی میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ابھی ابھی بگ بی نے بتایا ہے کہ ان لوگوں نے ایس پی اسد خان کو بھی اغوا کیا ہے۔“

وہ تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ اچانک ایک زوردار نسوانی چیخ نے ان سب کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی...... چیخ سامنے والے کمرے سے سنائی دی تھی۔ تیمور دوڑتا ہوا کمرے میں داخل ہوا...... اسی لمحے کمرے میں کہیں ایک ہلکا سا دھماکا بھی ہوا تھا۔

☆☆☆

اس سے پہلے کہ سلیم ٹریگر دباتا، اسد نے اس پر حملہ کر دیا۔ اس نے پہلے زوردار جھٹکے سے گارڈز کو زمین بوس کیا پھر سلیم پر چھلانگ لگا دی۔ اس اچانک افتاد پر اس کے ہاتھ سے ریوالور گر گیا اور وہ دونوں بھی زمین پر گر پڑے۔ اسد نے اس کے پیٹ میں زوردار گھونسا مارا جس سے سلیم دہرا ہو کر زمین بوس ہو گیا مگر پھر گرتے ہی اس نے کمال پھرتی سے پستول اٹھا کر اسد پر فائر کر دیا۔ گولی اس کا بازو چیرتی ہوئی گزری تھی۔ اسی لمحے رمشا زور سے چلائی اور یکلخت کوئی دروازہ توڑتا ہوا اندر آیا۔

”بھائی......“ رمشا دوبارہ چلائی۔ سلیم نے کمال کی تیزی دکھاتے ہوئے رمشا کے سر پر پستول رکھ دیا تھا مگر وہ کچھ کہتا، اس سے قبل ہی اس کے ہاتھ سے پستول اڑ گیا۔ تیمور نے اس کے ہاتھ کا بالکل ٹھیک نشانہ لیا تھا۔ پستول گرتے ہی تیمور نے دوسرا فائر کیا جو اس کے سینے میں لگا تھا اور وہ کٹے ہوئے درخت کے مانند زمین پر جا گرا تھا۔

تیمور نے دوڑ کر رمشا کو اٹھایا تھا جبکہ اسد اپنا زخمی بازو دوسرے ہاتھ سے پکڑے ہوئے تھا۔

”یہاں سے فوراً نکلنا ہوگا۔“ اس نے کہا۔

”کیا مطلب......؟“ شیبا نے اس سے پوچھا۔

”ہاں یہاں بم لگا ہوا ہے، وہ کسی بھی وقت پھٹ سکتا ہے۔“ اسد کے ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ سب دروازے کی طرف دوڑے۔ لان میں ہیلی کاپٹر ان کا منتظر تھا۔ ہیلی کاپٹر کے فضا میں بلند ہوتے ہی ایک بڑا دھماکا سنائی دیا جس کے بعد نیچے صرف آگ ہی آگ نظر آ رہی تھی۔ تیمور نے ایک نظر نیچے دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے رمشا کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔

☆☆☆

اسد اور تیمور ایک بار پھر اسی وسیع و عریض اسٹڈی میں موجود تھے۔ بگ بی اپنی نشست پر تھے۔ کمرے میں شیبا بھی تھی اور رمشا بھی۔ یہ ان کی اس فتح کا چھوٹا سا جشن تھا اور ان کی نئی شناخت کا تعارف بھی۔

ریکارڈ کے مطابق تیمور احمد، ایس پی اسد خان اور رمشا احمد اغوا کی اس واردات میں بم کے دھماکے میں مارے گئے تھے اب وہ ایک نئی شناخت کے ساتھ نئے مشن کے لیے تیار تھے۔ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں چمک...... کیونکہ اب ان کی زندگی کا ایک خاص مقصد تھا۔

UrduBooks.pk

حیا فروش

اسما قادری

عورت ازل سے مرد کی تابع رہی ہے... مردوں کی بنائی ہوئی دنیا نے اسے ہمیشہ اپنے مقابلے میں ثانوی حیثیت دی ہے... اپنی مرضی کی تنی رسی پر اسے چلنے کا حکم دیا... جبکہ تمام تر رشتے احترام... ایک دوسرے کے ساتھ تعاون اور سہارے کی بنیاد پر مستحکم و جڑے رہتے ہیں۔ ایک سیدھی سادی... بھولی بھالی لڑکی کے گرد گھومتی کہانی... جو ازل سے ہوتا آیا ہے... اسی ڈگر پر چلتی آج کے دور میں بھی دھوکے اور فریب میں آجاتی ہے۔ زندگی کو آسان کرنے والے سائنسی و جدید آلات زندگی کو بے رنگ بھی بنا دیتے ہیں۔ انہی تقاضوں سے ہم آہنگ ایک تیز رفتار کہانی۔

پرل گروپ کا ایک اور شاندار کارنامہ......سالگرہ نمبر پر بطورِ خاص

"ارے...... وہ دیکھو، وہ لڑکی کیا کر رہی ہے؟"

دسمبر کا مہینہ تھا اور ہزار نخروں کے بعد سردی نے بالآخر اہلِ کراچی کو بھی اپنی جھلک دکھا ہی دی تھی۔ اہلِ کراچی اس جھلک پر ہی خوش رنگ برنگے سوئٹرز، پل اوور اور جیکٹیں ذوق و شوق سے زیب تن کر کے، راتوں کو پنکھا چلا کر موٹے موٹے کمبل اور لحاف اوڑھ کر اور کافی کے سنگ ڈرائی فروٹ ٹونگ کر اپنے طور پر سردی سے لطف اندوز ہونے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ چند نازک مزاجوں نے سردی کی سوغات نزلہ زکام وغیرہ کو گلے لگا کر موسم پر تہمت لگانے کا اہتمام بھی کر دیا تھا اور محکمہ تعلیم بھی اپنے شیڈول کے مطابق سردیوں کی تعطیلات کا اعلان کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو چکا تھا۔ بہرحال جیسی بھی اور جتنی بھی سہی سردی آ گئی تھی لیکن اس کی آمد کو خاطر میں نہ لا کر یا پھر اسے پوری طرح انجوائے کرنے کے چکر میں وہ چاروں ساحل سمندر پر پہنچی ہوئی تھیں اور ساحل پر ننگے پیر ٹہلتے ہوئے آئس کریم سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ ان جیسے دیوانے بہت کم ہوتے ہیں اس لیے اس وقت ساحل تقریباً خالی پڑا تھا اور ان کے علاوہ چند ایک ہی لوگ نظر آ رہے تھے۔ ایسے میں مہ پارہ کی نظر اس لڑکی پر پڑی اور وہ باقی ساتھیوں کو متوجہ کرنے کے لیے ہاتھ سے ایک سمت اشارہ کرتے ہوئے زور سے چلائی۔

"یہ تو لگتا ہے خودکشی کرنے جا رہی ہے۔" ان تینوں نے بھی لڑکی کو دیکھ لیا تھا اور لبنیٰ نے خیال پیش کرنے میں پہل کی۔ لڑکی سمندر میں خطرناک حد تک آگے جا چکی تھی۔ اس وقت وہ تنہا فرد تھی جو پانی میں اتری ہوئی تھی۔ ان چاروں نے بھی دیوانے پن کے باوجود سردی کی اتنی لاج تو بہرحال رکھی تھی کہ پانی میں بھیگنے سے احتراز کیا تھا اور صرف ساحل پر ہی چہل قدمی کر رہی تھیں۔

"ہمیں اسے بچانا ہو گا ورنہ وہ کامیاب ہو جائے گی۔" روشی نے فیصلہ کرنے میں پہل کی اور لباس پہنے

ہوئی ہلکی جیکٹ اتار کر پھینکنے کے بعد اس سمت دوڑی جس سمت سیاہ چادر اوڑھی وہ لڑکی اونچی اونچی موجوں میں خود کو گم کرتی جا رہی تھی۔ روشی کے فوراً بعد ہی عروج نے بھی اس کی تقلید میں سمندر میں چھلانگ لگادی۔ وہ دونوں اچھی تیراک تھیں اس لیے پیچھے رہ جانے والی مہ پارہ اور لبنیٰ کو ان کے ڈوب جانے کا تو خدشہ نہیں تھا البتہ وہ اس بات کے لیے تشویش میں مبتلا تھیں کہ آیا وہ دونوں لڑکی کو بچا کر لانے میں کامیاب ہو پاتی ہیں یا نہیں۔ روشی نے پہل کی تھی اس لیے وہ پہلے لڑکی کے قریب پہنچ گئی۔ اس وقت تک لڑکی اتنی آگے جا چکی تھی کہ اس کے لیے خود کو سنبھالنا ممکن نہیں رہا تھا۔ سمندر کی موجوں نے اس کے قدم اکھاڑ کر اسے ڈبکیاں کھانے پر مجبور کردیا تھا۔ روشی نے اس کا بازو تھام کر اسے سنبھالنے کی کوشش کی تو وہ بُری طرح اس کے ساتھ چمٹ گئی۔ روشی کو فوراً احساس ہوگیا کہ وہ ایک بنیادی غلطی کر چکی ہے۔ ڈوبتے ہوئے شخص کو بچانے کے لیے سب سے پہلے بچانے والے کو اس بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ خود کو اس شخص کی گرفت سے دور رکھے ورنہ ڈوبنے والا اپنے ساتھ اسے بھی لے ڈوبتا ہے۔ روشی کے ساتھ یہی ہو رہا تھا۔ وہ جو کچھ لمحے قبل خودکشی کے لیے سمندر میں اتری تھی۔ موت کی بُو سونگھ کر ہی اتنی دہشت زدہ ہوگئی تھی کہ زندگی کی آرزو میں پیر تسمہ پا کی طرح اس سے لپٹ گئی تھی۔ اس صورتِ حال میں روشی کے لیے تیرنا تو دور کی بات خود کو بچانا بھی محال ہوگیا تھا لیکن عروج کے بروقت پہنچ جانے سے اس کی جان اس مصیبت سے چھوٹی۔ عروج نے ڈوبتی ہوئی لڑکی کے پہلو میں دو تین ضربیں لگا کر اسے روشی کو چھوڑنے پر مجبور کیا اور خود اسے بالوں سے پکڑ کر ساحل کی طرف لے جانے کی کوشش کرنے لگی۔ اسے اپنی اس کوشش میں کامیابی حاصل ہوئی۔ روشی بھی خود کو سنبھال کر اس کے ساتھ شامل ہوگئی تھی اور لڑکی کو باہر لانے میں اس کی مدد کر رہی تھی۔ ان دونوں نے اسے لے جا کر ساحل پر بٹھایا اور خود بھی قریب بیٹھ کر گہرے گہرے سانس لینے لگیں۔ لڑکی بے ہوش نہیں ہوئی تھی لیکن خوف سے نیم جان لگ رہی تھی۔ یقینی طور پر اس نے سمندر کا کافی پانی بھی نگل لیا تھا اور اب ابکائیاں سی لے رہی تھی۔ وہ اچھی شکل و صورت کی بمشکل سولہ سترہ سالہ لڑکی تھی جس کے جسم پر موجود گلابی شلوار قمیص اس کے مڈل کلاس ہونے کی گواہی دے رہی تھی اس نے جو سیاہ چادر اوڑھ رکھی تھی وہ لہروں کے ساتھ ہی بہہ چکی تھی اور جسم کے ساتھ چپکا گلابی لباس اس کے نوخیز جسم کو چھپانے سے زیادہ دکھانے کا کام کر رہا تھا۔ مہ پارہ اور لبنیٰ مل کر اسے طبی امداد دینے لگیں۔

’’خیریت کیا مسئلہ ہے؟ کیا اس لڑکی نے خودکشی کی کوشش کی ہے؟‘‘ وہ چاروں پوری طرح لڑکی کی طرف متوجہ تھیں اس لیے ان دو لڑکوں کی آمد کا احساس اس وقت ہوا جب وہ بالکل ان کے سروں پر پہنچ چکے تھے۔ ان لڑکوں کو وہ پہلے بھی دیکھ چکی تھیں۔ وہ ان سے خاصی دور تھے اور ساحل پر فٹ بال کھیل رہے تھے۔ کھیل میں محو ہونے کی وجہ سے ہی یقیناً وہ ذرا تاخیر سے اس طرف متوجہ ہوئے تھے اور اب ان کے سر پر کھڑے ہونے والے واقعے کی تفصیل جاننے کے خواہش مند نظر آ رہے تھے۔

’’کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ ہماری ساتھی ہے۔ اسے سمندر بہت پسند ہے اسی لیے جوش میں ذرا زیادہ آگے نکل گئی تھی۔ تھینک گاڈ ہماری نظر پڑ گئی اور ہماری ان ساتھیوں نے اسے ڈوبنے سے بچالیا۔‘‘ مہ پارہ نے لڑکی کی کم عمری، خوب صورتی اور کم حیثیتی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے لڑکوں کو چ

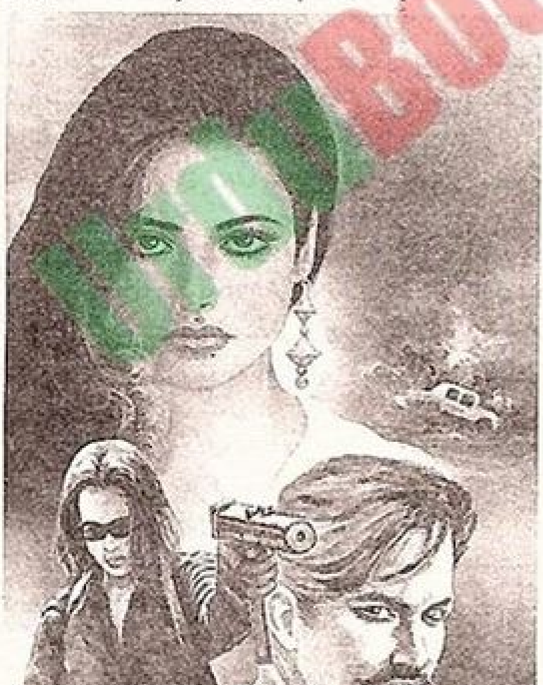

UrduBooks.pk

سے آگاہ نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور جھٹ سے بہانہ تراش دیا۔

"یہ...... آپ کی ساتھی ہے؟" سوال پوچھنے والے لڑکے کے لہجے میں بے یقینی غلط نہیں تھی۔ موسم کی مناسبت سے جینز ٹی شرٹ اور ہلکی جیکٹوں میں ملبوس ان چاروں کے ہر انداز سے ان کی کلاس کا اندازہ ہو رہا تھا اور لڑکی کے بارے میں بھی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ سفید پوش طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔

"آپ کو اس کے ہماری ساتھی ہونے پر کوئی اعتراض ہے کیا۔" جارحیت ہی بہترین دفاع ہے کہ مقولے پر عمل کرتے ہوئے مہ پارہ نے فوراً ہی اپنے تیور جارحانہ کر لیے جبکہ لبنیٰ غیر محسوس طور پر اس زاویے سے آکھڑی ہوئی کہ لڑکوں کی نظروں اور لڑکی کے درمیان حائل ہوگئی۔ اس نے محسوس کرلیا تھا کہ سردی اور خوف سے کانپتی لڑکی کی کپکپاہٹ میں ان لڑکوں کی نظروں نے اضافہ کردیا ہے۔

"اعتراض تو کوئی نہیں، بس ہم ذرا قانون پسند شہری واقع ہوئے ہیں اور ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر یہ خودکشی کی کوشش ہے تو پولیس کو اس بارے میں آگاہ کیا جائے۔" دوسرا جو اب تک خاموش کھڑا تھا۔ چہرے پر خبیث سی مسکراہٹ سجا کر بولا۔

"نائس! ہمارے ملک کو ایسے ہی نوجوانوں کی ضرورت ہے۔ آپ ہمیں اپنے نام، ایڈریس اور موبائل نمبر نوٹ کروادیں۔ ہمارے فادر ہوم منسٹری میں ہوتے ہیں۔ انہیں آپ جیسے فرض شناس جوانوں کے بارے میں جان کر اچھا لگے گا۔" روشی اور عروج کی ٹی شرٹس بھی گیلی ہو کر جسم سے چپک گئی تھیں اس لیے انہوں نے لڑکوں کی آمد کے ساتھ ہی گیلے کپڑوں پر ہی جیکٹیں چڑھالیں اور پھر عروج نے بہن کا ساتھ دیتے ہوئے بڑے ٹھنڈے انداز میں موصوف پر چڑھائی کی۔ ایک تو ہوم منسٹری کا حوالہ اوپر سے ان چاروں کے نہ دبنے اور نہ ڈرنے والے تیور۔ لڑکے کی مسکراہٹ خودبخود ہی سکڑ گئی اور چہرے پر خباثت کے بجائے شرافت بلکہ مسکینیت ٹپکنے لگی۔

"ہم صرف آپ لوگوں کی مدد کے خیال سے اس طرف آئے تھے۔ اگر آپ سمجھتی ہیں کہ آپ اپنے طور پر ہی اس سچویشن کو زیادہ بہتر طور پر ہینڈل کرسکتی ہیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ ویسے بھی ہمیں اسنوکر کی پریکٹس کے لیے کلب پہنچنے کی جلدی ہے۔" جس لڑکے نے گفتگو کا آغاز کیا تھا اسی نے بات سنبھالی اور پھر دونوں وہاں سے رفوچکر ہو گئے۔ ان دونوں سے جان چھڑانے کے بعد وہ چاروں لڑکی سمیت اپنی گاڑیوں کی طرف بڑھ گئیں۔

☆☆☆

"ہاں تو بے بی، اب شروع ہو جاؤ اور بتاؤ کہ قصہ کیا ہے اور دیکھو سب کچھ سچ سچ بتانا ورنہ ہم کسی پولی گراف مشین سے کم نہیں ہیں۔ ایک سیکنڈ میں پکڑ لیتے ہیں کہ اگلا ہمارے ساتھ سچ بول رہا ہے کہ جھوٹ۔" گرم گرم بھاپ اڑاتی مہکتی کافی حلق سے نیچے اتری تو سردی کے ماروں کے حواس بحال ہوئے اور سب سے پہلے روشی نے کڑے تیوروں سے سوال جواب کا سلسلہ شروع کیا۔ اس نے صرف سردی ہی نہیں جھیلی تھی بلکہ اس کی ہمدردی میں ڈوبتے ہوئے بھی بچی تھی اس لیے اس پر سب سے زیادہ اپنا حق سمجھ رہی تھی۔

"میں جھوٹ نہیں بولتی جی، میرے اباجی نے ہمیشہ مجھے سچ بولنے کی نصیحت کی ہے اور میں اباجی کی ہر بات مانتی ہوں۔" اس نے سخت برا مانتے ہوئے روشی کی بات کا جواب دیا تو وہ سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گئی۔ شکل سے نہایت معصوم دکھائی دینے والی الھڑ مٹیار تو اس کے رعب میں آنے کے لیے قطعی تیار نہیں تھی۔ روشی کی ایسی گت بنتے دیکھ کر باقی تینوں مسکرانے لگیں۔

"تمہارا نام کیا ہے میڈم!" ساتھیوں کی مسکراہٹ کو نظرانداز کرتے ہوئے اس نے نئے سرے سے اپنے سوالات کو ترتیب دیا اور اسے فوراً بے بی سے میڈم کے درجے پر ترقی دے دی۔

"جی زیب النسا لیکن سب زیبی کہتے ہیں۔" اس نے شان بے نیازی سے جواب دیا۔

"کون سب؟ عرب کے شہزادے، ہالی ووڈ کے اسٹارز یا اقوام متحدہ کے مندوبین؟" روشی کو اس کی بے نیازی بے حد کھلی، کافی کے ساتھ دو عدد بوائل انڈے اور گاجر کا حلوا نوش کرنے کے بعد وہ بڑی شاداں و فرحاں بیٹھی تھی۔ عمر کم تھی لیکن قد کاٹھ اچھا تھا اس لیے لبنیٰ کا لباس اور سوئٹر اسے بالکل فٹ آیا تھا اور اس لباس میں اس کی شخصیت ہی بدل کر رہ گئی تھی۔ اگر وہ زبان بند کر کے بیٹھی رہتی تو کسی کو اندازہ بھی نہیں ہوتا کہ وہ کس طبقے کی لڑکی ہے۔

"وہ سب کون ہوتے ہیں جی مجھے زیبی کہہ کر پکارنے والے۔ مجھے تو میرے اباجی اور جان پہچان والے زیبی کہتے ہیں۔" واہ کیا شان تھی۔ اتنی اونچی اونچی شخصیات کی محترمہ کی نظر میں یہ اوقات تھی کہ وہ انہیں خود کو "زیبی" کہہ کر پکارنے کی اجازت دینے کے لیے تیار نہیں تھی اور اس فکر

میں مطلق مبتلا نہیں ہوئی تھی کہ یہ سارے لوگ انہیں جانتے بھی ہیں یا نہیں۔

”سب باتوں کو جانے دیجیے محترمہ زیب النسا اور یہ بتائیے کہ آپ وہاں سمندر میں کس مشغلے میں مصروف تھیں کہ جان کے لالے پڑ گئے اور ہمیں آپ کو بمشکل وہاں سے نکال کر لانے کی جدوجہد کرنی پڑی۔“ اس بار عروج میدان میں اتری اور اپنے تئیں اس سے ایک سیدھا سادہ سوال کیا۔

”آپ نے میرے بال بہت بے دردی سے کھینچے تھے جی۔ پتا نہیں کتنے ٹوٹ گئے ہوں گے۔ میں نے بڑی محنت کر کے خالص سرسوں کے تیل اور جڑی بوٹیوں کے استعمال سے اپنے بالوں کو اتنا لمبا اور خوب صورت بنایا ہے۔ میرے بالوں کو ذرا بھی کچھ ہو جائے تو مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے۔“ اس نے عروج کو بھی صاف ناک آؤٹ کر دیا اور وہ اس کے لمبے اور چمکیلے سیاہ بالوں کو گھور کر رہ گئی۔ بالوں کو مکمل خشک کرنے کے لیے اس نے انہیں باندھا نہیں تھا اور اس کے خوب صورت بال انہیں تسلیم کرنے پر مجبور کر رہے تھے کہ ان بالوں نے اس کی خوب صورتی میں چار چاند لگا رکھے ہیں۔

”تم سمندر میں ڈوب جاتیں تو تمہاری ہڈیوں بوٹیوں پر شارک مچھلیاں دعوت اڑا رہی ہوتیں اور تمہارے ان خوب صورت بالوں کی وگ کسی وہیل کے سر پر سجی ہوتی۔ سنا ہے میمل (Mammal) ہونے کے ناتے وہ انسانوں سے قریبی رشتے داری کی دعوے دار ہے۔“ مہ پارہ نے اس کی نفسیات کو سمجھتے ہوئے اس سے ایسی بات کہی جس کا اس پر خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ لرز کر بولی۔

”ہائے اباجی! یہ میں اپنے ساتھ کیا کرنے چلی تھی۔ آپ نے اپنی حق حلال کی کمائی سے مجھے اس لیے تو نہیں پالا کہ میں مچھلیوں کی دعوت کے کام آؤں۔“

”اباجی کی حلال کی کمائی کو تو تم خود حرام موت مر کے ٹھکانے لگانے چلی تھیں۔ اب کیا بیٹھی اُن کے نام کی دہائیاں دے رہی ہو۔“ مہ پارہ نے اسے ڈپٹا۔

”تو پھر کیا کرتی جی اس کے سوا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”دیکھو پیاری! تم ہمیں تفصیل سے اپنے حالات سے آگاہ کرو پھر ہم تمہیں بتا سکیں گے کہ تمہارے پاس خودکشی کے سوا اور کون کون سے راستے ہیں۔“ اس بار مہ پارہ نے اپنے لہجے کو ذرا نرم کیا تو وہ تفصیل بتانے پر آمادہ ہو گئی۔ وطنِ عزیز کے بیشتر نوجوانوں کی طرح آنسہ زیب النسا بھی سوشل میڈیا کے نشے میں مبتلا تھی۔ کم علمی اور کم عمری ان چیزوں کے استعمال کو زہرِ قاتل بنا دیتی ہے۔ زیبی کی بھی فیس بک پر ایک لڑکے سے دوستی ہوئی اور پھر دوستی نے ایسی دیوانگی کی صورت اختیار کر لی کہ وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر اس لڑکے کے پیچھے کراچی آ پہنچی۔

”تم دونوں ایک دوسرے کو اتنا پسند کرتے تھے تو تم اس سے کہتیں کہ رشتہ لے کر تمہارے گھر آئے۔ بقول تمہارے وہ بہت اچھا ہے تو تمہارے اباجی کو بھی اچھا لگتا اور وہ تمہیں عزت سے اس کے ساتھ رخصت کر دیتے۔“ کسی لڑکے کے پیچھے گھر سے بھاگنے والی حرکت سے زیادہ بے ہودہ اور احمقانہ فعل شاید ہی کوئی محسوس ہوا ہو اس لیے روشی نے فوراً اس پر تنقید کی۔

”اباجی نہیں مانتے جی! وہ اسکول میں ٹیچر ہیں اور انہیں بڑا شوق تھا کہ میں بھی ٹیچری کروں۔ میرے اتنے رشتے آتے تھے لیکن انہوں نے اماں سے صاف کہہ رکھا تھا کہ جب تک زیبی پڑھ لکھ کر استانی نہیں لگ جاتی، اسے بیاہنا نہیں ہے۔ اُدھر جاوید کی اماں کو بھی اس سے زیادہ اس کی بہنوں کو بیاہنے کی فکر تھی۔ انہوں نے جاوید سے کہہ رکھا تھا کہ بہنوں کے فرض سے فارغ ہونے سے پہلے اپنے بارے میں سوچنا بھی نہیں۔ اب آپ ہی بتائیں ہم دونوں اتنا انتظار کیسے کر سکتے تھے۔ ہمیں تو ایک دوسرے کے بنا ایک ایک دن بھاری تھا۔ اسی لیے جاوید نے مجھ سے کہا کہ تم کراچی آ جاؤ۔ ہم دونوں کورٹ میرج کر کے اپنی دنیا الگ بسا لیں گے۔“ وہی کم عمری کی جذباتی نادانی تھی۔

”پھر کیا ہوا؟ تم اپنی دنیا الگ بسانے کے بجائے سمندر میں ڈوبنے کیوں چل پڑیں۔“ لبنیٰ نے پوچھا۔

”میں پہلی بار کراچی آئی تھی باجی تو مجھ سے گڑبڑ ہو گئی۔ جاوید نے مجھ سے کہا تھا۔ ڈرگ روڈ اسٹیشن پر اترنا میں لانڈھی اسٹیشن پر جا اتری۔ وہاں میں پورے چار گھنٹے جاوید کا انتظار کرتی رہی بعد میں پتا چلا کہ غلط اسٹیشن پر اتر گئی ہوں تو رکشے میں ڈرگ روڈ اسٹیشن پر چلی گئی۔ وہاں جاوید کو بہت ڈھونڈا لیکن وہ نہیں ملا۔ بے چارہ میرے انتظار سے مایوس ہو کر سمجھا ہو گا کہ میں اس کے بلانے پر آئی ہی نہیں۔“

”تو اُسے فون کیوں نہیں کیا اللہ کی بندی؟“ عروج نے گویا اس کی عقل کا ماتم کیا۔

”فون کیسے کرتی جی! میرا موبائل کل رات ہی پانی میں گر کر خراب ہو گیا تھا۔ کل شام کے بعد سے میری جاوید

سے بات ہی نہیں ہوئی پر ہمارا سارا پروگرام طے تھا تو میں صبح سویرے گھر سے نکل گئی۔ میں نے تو یہی سوچا تھا کہ اسٹیشن پر اتروں گی تو جاوید مجھے اور میں جاوید کو پہچان لوں گی لیکن سب گڑبڑ ہوگئی۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''تمہیں جاوید کا موبائل نمبر تو یاد ہوگا۔ کسی پی سی او وغیرہ سے اسے فون کرلیتیں۔''

''نہیں جی، یہ میری بڑی کمزوری ہے۔ اپنے سوا مجھے کسی کا نمبر یاد ہی نہیں رہتا۔''

''حال دیکھو ان بی بی کا......جس کے لیے سارے زمانے کو ٹھوکر مار کر آئی ہیں، اس کا فون نمبر تک یاد نہیں۔'' روشی نے اس کی حالت پر افسوس کا اظہار کیا۔

''جاوید نہیں مل سکا تھا تو واپس اپنے گھر لوٹ جاتیں۔ سمندر میں ڈوبنے کی کیا تُک بنتی تھی؟'' مہ پارہ نے اسے گھورا۔

''نہیں جی واپس کیسے چلی جاتی؟ اباجی کے نام خط لکھ کر نکلی تھی۔ انہیں بتادیا تھا کہ آپ کو چھوڑ کر جارہی ہوں۔ مجھے معلوم ہے آپ کے بنا جینے میں مجھے بہت تکلیف ہوگی لیکن مجبوری ہے کہ جس کی خاطر آپ کو چھوڑ کر جارہی ہوں، اس کے بغیر تو جی ہی نہیں سکتی۔''

''یہ کسی ڈرامے یا ناول کے ڈائیلاگ لگتے ہیں۔'' یہ سن کر عروج نے خیال آرائی کی۔

''جی ایک ناول میں پڑھے تھے۔'' اس نے شرما کر اعتراف کیا تو وہ چاروں ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ کر رہ گئیں۔ ذہنی طور پر اتنی ناپختہ، کم عمر اور حسین لڑکی اگر ان کے بجائے کسی اور کے ہاتھ لگ جاتی تو اس کا کیا حشر ہوتا وہ قطعی نہیں جانتی تھی۔ اس کی کم عقلی پر افسوس کرتے ہوئے انہوں نے اس سے چند مزید سوالات کر کے اس کے بارے میں جو معلومات حاصل کیں ان کے مطابق وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ میٹرک کا امتحان دیا تھا لیکن دو پرچوں میں فیل ہوگئی تھی اور آج کل اس کے والد اس پر سپلیمنٹری امتحان کی تیاری کرنے کے لیے زور دے رہے تھے۔ غریب پرائمری اسکول ٹیچر کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کی بیٹی عشق کے پرچے دے رہی ہے۔ انہوں نے اس سے اس کے گھر کا پتا جاننا چاہا لیکن وہ بتانے سے صاف انکاری ہوگئی۔

''دیکھو بی! تمہارے لیے سب سے مناسب یہی ہے کہ تم اپنے گھر واپس چلی جاؤ۔ اگر تمہیں ڈر ہے کہ تمہارے واپس جانے پر تمہارے ماں باپ تمہارے ساتھ مار پیٹ اور سختی کریں گے تو ہم خود تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔ ہم تمہارے اباجی کو سمجھائیں گے کہ تمہیں معاف کردیں۔ تم اپنے گھر میں رہ کر سنجیدگی سے پڑھنا لکھنا۔ چار پانچ سال میں تعلیم بھی مکمل ہوجائے گی اور جاوید بھی بہنوں کے فرض سے فارغ ہوجائے گا تو پھر تم دونوں شادی کرلینا۔ زندگی اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے، اتنی سی بات کے لیے اسے داؤ پر لگا دینا کوئی عقل مندی نہیں ہے۔'' مہ پارہ نے اپنے طور پر اسے بہت رسان سے سمجھایا لیکن وہ سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

''نہیں جی! واپس تو میں نہیں جاؤں گی۔ اباجی سے نظر ملانے کی ہمت نہیں ہے مجھ میں۔'' اس نے صاف انکار کیا اور ان چاروں کے بہت سمجھانے پر بھی اپنے انکار پر جمی رہی۔

''اچھا تو پھر ہم تمہیں دوبارہ سمندر پر لے جا کر چھوڑ دیتے ہیں۔ تم دوبارہ خودکشی کی کوشش کرلینا۔'' اس کی ہٹ دھرمی پر جھنجلا کر روشی نے جلے کٹے انداز میں تجویز پیش کی۔

''ڈوب کر مرنے میں تو بہت تکلیف ہوتی ہے جی۔ بندے کا سانس رکنے لگتا ہے۔ آپ مجھے مرنے کا کوئی آسان طریقہ بتادیں۔'' اس نے کچھ ایسی معصومیت سے یہ بات کہی کہ ان چاروں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ بے چاری معصوم لڑکی کو محبت میں ناکامی کے بعد مرنے کے سوا کوئی حل ہی نظر نہیں آرہا تھا لیکن موت کو قریب سے دیکھ لینے کے بعد اس کی تکلیف سے خوف زدہ بھی تھی۔

''دیکھو بی بی مسئلہ یہ ہے کہ خودکشی کے ہر طریقے میں بندے کو تکلیف بھی ہوتی ہے اور اس کا سانس بھی رکتا ہے اس لیے تم اس خیال کو چھوڑ کر اپنے بارے میں کچھ اور سوچو تو ہم بھی تمہاری مدد پر غور کرسکتے ہیں۔'' مہ پارہ نے اپنی ہنسی ضبط کر کے اسے مشورہ دیا۔

''جی میں تو یہی سوچ سکتی ہوں کہ کسی طرح جاوید مل جائے تو میں اس کے ساتھ چلی جاؤں۔ آپ کسی طرح اسے ڈھونڈ کردے دیں۔'' اس کی فرمائش سے ظاہر تھا کہ ابھی دماغ سے عشق کا بخار اترا نہیں ہے۔ اترتا بھی کیسے۔ وہ پُراعتماد تھی کہ اس کے عاشق نے اسے دھوکا نہیں دیا ہے اور جو غلطی ہوئی ہے اس سے ہوئی ہے لیکن وہ اس کے لیے جاوید کو تلاش کرتیں تو کیسے؟

''میں اپنے موبائل پر تمہارا فیس بک اکاؤنٹ کھولتی ہوں۔ ہوسکتا ہے اس کے ذریعے سے رابطہ ہوجائے۔'' اچانک ہی روشی کو خیال آیا تو وہ پُرجوش ہوگئی۔ شکر تھا کہ

UrduBooks.pk

زیبی کو اس سلسلے میں مطلوب معلومات یاد تھیں۔ اس لیے وہ مقصد میں کامیاب رہی۔ اکاؤنٹ کھولتے ہی اس کے سامنے اِن باکس میں بھیجا گیا جاوید کا ایک پیغام سامنے آ گیا۔ اس نے پیغام میں لکھا تھا۔

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم ماسٹر ایوب کی بیٹی ہو۔ میں لاکھ شیطان سہی مگر اپنی زندگی میں آنے والے واحد فرشتے کو دکھ نہیں پہنچا سکتا۔ تم کل ہرگز بھی اپنے گھر کو نہیں چھوڑنا، یہ میرا تم سے آخری رابطہ ہے۔ اب سے میرا تمہارا ہر تعلق ختم۔“ یہ پیغام خاصا معنی خیز تھا اور رات بارہ بجے کے بعد بھیجا گیا تھا جسے زیبی موبائل ناکارہ ہو جانے کی وجہ سے نہیں پڑھ سکی تھی۔ روشی نے انگلیوں کو اوپر نیچے جنبش دیتے ہوئے نوٹ کیا کہ زیبی نے کل رات نو بجے سے پہلے جو آخری پوسٹ ڈالی تھی، وہ ایک باریش مرد کی تصویر تھی جس کے نیچے بڑا بڑا آئی لو یو سو مچ ابا جی، لکھا ہوا تھا۔ ظاہر ہے اپنے اتنے محبت کرنے والے باپ کو اس طرح چھوڑ کر جانے کے خیال سے اس کے اندر گلٹ تھا اور وہ غیر ارادی طور پر خود کو اور انہیں یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ ان سے بہت محبت کرتی ہے۔ زیبی کا فیس بک اکاؤنٹ چیک کرتے ہوئے اس نے جاوید کو بھی چیک کیا۔ پروفائل پکچر میں اس نے سلمان خان کی تصویر ڈالی ہوئی تھی۔ ذاتی معلومات کے حوالے سے وہی باتیں تھیں جو سب کی تقریباً یکساں ہی محسوس ہوتی ہیں۔ ان معلومات اور چند پوسٹس کے علاوہ سب کچھ Hidden (چھپا ہوا) تھا اس لیے اس کے بارے میں کوئی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ زیبی کے اِن باکس میں البتہ اس کے بہت سے پیغامات مل گئے تھے جن سے ظاہر تھا کہ ان کے درمیان دھواں دھار عشق چل رہا تھا۔ وہ لفظوں کا ایسا جادوگر تھا کہ زیبی جیسی لڑکی کے پاس اس کے لیے دیوانہ ہو جانے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ اِن باکس میں ہی اسے جاوید کی ایک تصویر بھی مل گئی۔ تصویر ساحل پر کھینچی گئی تھی اور عام سے پینٹ شرٹ میں ملبوس ہونے کے باوجود وہ بہت خوبرو لگ رہا تھا۔ تاثرات بھی شریفانہ تھے۔

اس نے زیبی کو جو آخری پیغام بھیجا تھا، وہ کچھ عجیب سا تھا۔ پیغام سے یہ بات تو سمجھ آ رہی تھی کہ کسی نہ کسی طرح وہ نہ صرف زیبی کے والد سے واقف تھا بلکہ انہیں کسی وجہ سے اپنا محسن بھی تسلیم کرتا تھا اس لیے جب زیبی نے اپنی پوسٹ میں ان کی تصویر ڈالی تو انہیں پہچاننے کے بعد اس نے زیبی کو کراچی بلانے کا فیصلہ بدل کر اسے پیغام بھیج دیا جو زیبی موبائل ناکارہ ہو جانے کی وجہ سے بدقسمتی سے نہیں دیکھ سکی۔ اس پیغام میں جاوید نے اپنے لیے شیطان کا لفظ استعمال کیا تھا۔ اب یہ ندامت کا اظہار تھا یا وہ سچ کوئی بُرا انسان تھا اس بارے میں اندازہ لگانا مشکل تھا۔ شکل سے تو بہرحال وہ ایک شریف لڑکا ہی لگ رہا تھا۔ روشی نے پہلے ان تینوں کو یہ سب دکھایا پھر اپنا موبائل بے چین اور آس بھری نظروں سے اپنی طرف دیکھتی ہوئی زیبی کے سامنے کر دیا۔ جاوید کا پیغام پڑھ کر اس کی آنکھیں بھیگ گئیں پھر بولی۔

”یہ میری بدقسمتی تھی کہ میں اس کا یہ پیغام نہیں پڑھ سکی اور گھر سے نکل گئی لیکن اب میرے پاس اس کے سوا کوئی گنجائش نہیں ہے کہ میں کسی طرح جاوید تک پہنچ جاؤں۔ اسے پتا چلے گا کہ میرے ساتھ کیا مسئلہ ہوا ہے تو وہ مجھے سہارا دینے پر راضی ہو جائے گا۔“ زیبی کا ذہن کسی طرح بھی جاوید سے دستبرداری پر راضی نہیں تھا۔ اس احمق پر غصہ آنے کے باوجود وہ اسے ظالم دنیا کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتی تھیں چنانچہ اس معاملے کو کسی منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے کمربستہ ہو گئیں۔

☆☆☆

”وہ مارا، یہ دیکھو میں نے اسے ڈھونڈ لیا۔“ روشی کی چہکتی ہوئی آواز سن کر مہ پارہ اور لبنیٰ اس کے قریب آ گئیں۔ انہوں نے زیب النسا کی مدد کا بیڑا اٹھانے کے بعد سب سے پہلے جاوید کی تلاش کا کام شروع کر دیا تھا۔ اس مقصد کے لیے روشی مخصوص سافٹ ویئرز کو استعمال کرتے ہوئے جاوید کو اس کی تصویر کے ذریعے تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی جبکہ عروج نے Phishing کی مدد سے اس کا فیس بک اکاؤنٹ ہیک کرنے کا مشن سنبھالا ہوا تھا۔ ان چاروں میں عروج کمپیوٹر کے استعمال میں سب سے ماہر تھی اور اسی نے روشی کو بھی ہدایات دے کر کام پر لگایا تھا۔ اب یہ اتفاق تھا کہ شاگرد، استاد پر بازی لے گئی تھی اور کامیابی نے اس کے قدم پہلے چومے تھے۔

”لاؤ، مجھے دکھاؤ۔ میں چیک کرتی ہوں۔“ عروج سب سے آخر میں اپنی جگہ سے اٹھ کر آئی اور اسکرین پر نظر ڈالتے ہوئے روشی کے قریب اپنی جگہ بنائی۔ اگلے ہی لمحے اس کی انگلیاں کی بورڈ پر روانی سے چل رہی تھیں اور جاوید کے بارے میں بہت سی معلومات ان کے سامنے کھل چکی تھیں۔

”یہ تو بہت بڑا کام ہو گیا۔ اب ہم آرام سے اس بندے کو پکڑ لیں گے۔“ عروج کی پشت پر کھڑی لبنیٰ نے

اسکرین کی طرف دیکھتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا۔ ان چاروں میں وہی اس مسئلے کے حل کے لیے سب سے زیادہ پریشان تھی کہ زیبی کو اس نے اپنے گھر میں رکھا ہوا تھا۔ اس مقصد کے لیے اسے اپنی ممی سے جھوٹ بھی بولنا پڑا تھا کہ زیبی ملازمہ ناہید کی کزن ہے اور کام کی تلاش میں گاؤں سے آئی ہوئی ہے تو اس نے اسے ٹرائی پر رکھ لیا ہے۔ اس کی ممی مسز مونا یوسف ہمیشہ بہت چھان بین کے بعد ملازم رکھتی تھیں لیکن نگو کے حوالے کی وجہ سے انہوں نے زیبی کے بارے میں زیادہ سوال جواب نہیں کیے تھے۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آج کل وہ بہت مصروف تھیں۔ تقریباً پورا دن ہی گھر سے باہر گزار کر آتی تھیں تو ان میں اتنی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ کسی مسئلے پر زیادہ مغزماری کرسکیں۔

"انشاء اللہ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ تم ذرا زیبی سے کہہ کر کافی تو بنوالو دماغ کھپا کھپا کر سر میں درد ہو گیا ہے۔" عروج نے انگلیوں کی مدد سے اپنی کنپٹیاں دبائیں۔ وہ لوگ صبح سے ہی اس کام میں جتی ہوئی تھیں اور اب کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔

"زیبی بی کو کہاں آتی ہے کافی بنانی۔ کافی بھی چائے کی طرح بناتی ہے وہ بھی شیرے والی چائے۔ میں ناہید سے کہتی ہوں۔" لبنیٰ کے لہجے میں ہلکی سی بیزاری تھی۔ زیبی کو سمجھا بجھا کر اسے ملازمہ کی حیثیت سے اپنے گھر میں رکھنا اس کے لیے بڑا امتحان ثابت ہو رہا تھا۔ وہ تعلق تو غریب گھرانے سے رکھتی تھی لیکن شاید اکلوتی ہونے کی وجہ سے والدین نے اسے ہتھیلی کا چھالا بنا رکھا تھا جب ہی اسے کام کاج کا زیادہ سلیقہ نہیں تھا اور ان کے گھر میں ایسی ملازمہ کی گنجائش نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا کہ ممی کو جیسے ہی فرصت ملی اور ان کی نظروں میں اس کی کارکردگی آئی وہ فوراً اسے پروانۂ رخصت پکڑا دیں گی۔ ابھی تو وہ ناہید سے کہہ سن کر کسی نہ کسی طرح کام چلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"تمہیں کوئی کامیابی نہیں ملی کیا؟" مہ پارہ نے عروج کو مسلسل کنپٹیاں دباتے دیکھ کر پوچھا۔

"نہیں یار! دوسری طرف بھی کوئی ایکسپرٹ ہے اور اس نے سیکیورٹی کا ٹھیک ٹھاک انتظام کر رکھا ہے۔ میں کئی بار کوشش کرنے کے باوجود اس کا اکاؤنٹ ہیک نہیں کر پا رہی۔" عروج نے اپنی ناکامی کا اعتراف کیا۔

"چلو کوئی بات نہیں۔ ایک طرف اگر ناکامی ہوئی ہے تو دوسری طرف کافی کچھ ہاتھ آ گیا ہے۔ اس کی مدد سے کچھ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔" مہ پارہ نے اسے تسلی دی۔ تھوڑی دیر میں کافی آ گئی تو وہ چاروں کافی پیتے ہوئے اپنے آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں گفتگو کرنے لگیں۔

اس بات کو ان سب نے شدت سے محسوس کیا تھا کہ زیبی کو میسج بھیجنے کے بعد جاوید ایک بار بھی لاگ اِن نہیں ہوا تھا۔ پتا نہیں وہ زیبی سے بچ رہا تھا یا اس کے ساتھ کوئی مسئلہ ہو گیا تھا۔ بہرحال جو بھی بات تھی، معاملے کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے اس تک پہنچنا ضروری تھا۔

"ہم ایک کام سے جا رہے ہیں۔ تم کچن کے کاموں میں ناہید کا ہاتھ بٹا دینا لیکن زیادہ بات چیت کی ضرورت نہیں ہے۔" کافی پینے کے بعد وہ گھر سے باہر جانے کے لیے تیار تھیں اور باہر نکلنے سے قبل لبنیٰ نے زیبی کو بلا کو یہ ہدایت دی تھی۔

"میں کہاں زیادہ بولتی ہوں جی لیکن وہ باجی ناہید سوال ہی اتنے کرتی ہیں کہ بندہ بولنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔" اس نے نہایت معصومیت سے سارا ملبا ناہید پر ڈال دیا۔

"جو بھی بولنا سوچ سمجھ کر بولنا۔ ناہید ممی کی پکی جاسوس ہے۔ اسے کوئی بھنک پڑ گئی نا تو تم اس گھر سے باہر ہو گی۔" لبنیٰ نے اسے ڈرایا۔

"اچھا جی! میں ایسا کروں کہ کچھ بولوں گی ہی نہیں۔" وہ سچ مچ ڈر گئی۔ اس کی سادگی پر مسکراتے ہوئے وہ چاروں اپنے مشن پر روانہ ہو گئیں۔ جاوید کے متعلق ان کے پاس جو معلومات تھیں، ان کے مطابق وہ ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ میں رہتا تھا۔ یہ لگژری اپارٹمنٹ نہیں تھے اور زیادہ تر متوسط طبقے کے لوگ یہاں رہتے تھے۔ ماحول مناسب تھا اور صفائی کا بھی معقول انتظام تھا۔ جاوید کے اپارٹمنٹ پر تالا لگا ہوا تھا۔ آس پڑوس سے انہیں جاوید کے متعلق جو معلومات حاصل ہوئیں اُن کے مطابق وہ ایک شریف لڑکا تھا جو کئی ماہ سے وہاں رہ رہا تھا لیکن کسی کو اپنے متعلق شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ ایک دو کھوجی خواتین نے اس سے اس کی فیملی کے بارے میں بھی معلومات لے رکھی تھیں جن کے مطابق وہ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا اور اس کے والدین فوت ہو چکے تھے۔ اپنی ذاتی محنت سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ ایک اچھی فرم میں ملازمت کر رہا تھا۔ باقی رشتے داروں کے بارے میں اس نے بتایا تھا کہ وہ گاؤں میں رہتے ہیں اور اس کا ان سے زیادہ ملنا جلنا نہیں ہے۔ چند ایک دوستوں یا دفتری ساتھیوں کے سوا کسی کو اس کے فلیٹ پر آتے جاتے نہیں دیکھا گیا تھا۔

"بندے کے شریف ہونے کی گواہیاں ملی ہیں لیکن

1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

پھلبہری

تمام جلدی بیماریوں کا موثر اور بے ضرر علاج

STEROIDS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

ایوارڈز
ہولڈر

اجمل زیدی ہربل کے دورہ پاکستان کا مستقل پروگرام

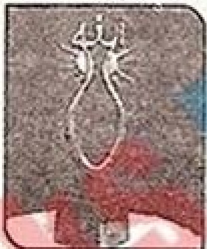

ASIAN EXCELLENCE
PERFORMANCE AWARD

AWARD OF
BEST ACHIEVEMENT

AWARD
PILLAR OF LEUCODERMA

اسلام آباد

9-اپریل تا 30 مئی
9-اگست تا 30 ستمبر
9-دسمبر تا 30 جنوری

مستقل پتہ

مکان نمبر 62، سٹریٹ نمبر 20، سیکٹر G-8/1
مرید چوک (تعلیمی چوک) اسلام آباد
فون (051)32331725
موبائل 0300-8566188

لاہور

14-فروری تا 27 فروری
14-جون تا 27 جون
14-اکتوبر تا 27-اکتوبر

قیام

گلف سینٹر
آفس نمبر 16
فیروزپور روڈ مزنگ چونگی
نزد الائیڈ بینک لاہور
موبائل نمبر 0300-8566188

پشاور

یکم فروری تا 11 فروری
یکم جون تا 11 جون
یکم اکتوبر تا 11-اکتوبر

قیام

ہوٹل امین
جی ٹی روڈ نزد بشیری چوک پشاور شہر
موبائل: 0300-8566188

ملتان

28 مارچ تا 6-اپریل
28 جولائی تا 6-اگست
28 نومبر تا 7 دسمبر

قیام

ہوٹل سلور سینڈ
ریلوے روڈ نزد چوک عزیز ہوٹل ملتان
فون: 62-4518061 (061)
4582803 (0300-8566188)

کراچی

13-مارچ تا 27 مارچ
13-جولائی تا 27 جولائی
13-نومبر تا 27 نومبر

قیام

فورچون سینٹر
آفس 706، 7 فلور شاہراہ فیصل
نرسری اسٹاپ بینک
الفلاح اور ایم سی بی
موبائل 0300-8566188

میں اسے کلیئر قرار نہیں دے سکتی۔ آج کل شرفا کے بھیس میں بھی بڑے بڑے چالاک مجرم چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ جاوید کا ایک جھوٹ تو ویسے بھی ہمارے سامنے آ گیا ہے۔ اس نے زیبی سے کہا تھا کہ اس کی امی، بہنوں کی شادی سے فارغ ہوئے بغیر اس کی شادی کے لیے تیار نہیں ہوں گی لیکن یہاں تو سرے سے کوئی فیملی ہی نہیں ہے جس سے لگتا ہے کہ وہ شروع ہی سے زیبی کو دھوکا دے رہا تھا۔'' جاوید کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے بعد مہ پارہ نے اپنی رائے دینے میں پہل کی۔

''وہ سچا ہے یا جھوٹا...... ہمیں اس تک پہنچنا تو ہے تاکہ زیبی کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا جا سکے۔ جب تک اسے جاوید کے فراڈ ہونے کا یقین نہیں آئے گا، وہ اپنے گھر واپس لوٹنے کے لیے تیار نہیں ہوگی۔''

''تو پھر چلو اس کے دفتر سے معلوم کرتے ہیں کہ وہ کہاں ہے۔ وہاں سے چھٹیاں لینے کے لیے اس نے کوئی نہ کوئی وجہ بتائی ہوگی۔ شاید اس سے ہماری رہنمائی ہو سکے۔'' روشی نے تجویز دی تو وہ لوگ ایک نئے عزم کے ساتھ اس کے دفتر کے لیے روانہ ہو گئیں۔ وہاں انہیں بتایا گیا۔

''جاوید میڈیکل لیو پر ہے۔ اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور وہ اسپتال میں داخل ہے۔'' انہوں نے اسپتال کا نام اور دیگر تفصیلات معلوم کیں اور اسپتال کے لیے روانہ ہو گئیں۔ جاوید کو بھی پرائیویٹ روم میں رکھا گیا تھا۔ چھوٹا سا کمرا ایک پردے کی مدد سے دو حصوں میں تقسیم تھا۔ دونوں حصوں میں ایک جیسا سامان تھا۔ دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی پڑنے والے پہلے بیڈ پر کوئی شخص سر سے پیر تک چادر تانے سو رہا تھا جبکہ دوسری طرف خیالوں میں ڈوبا جو بندہ ساکت لیٹا ہوا تھا، وہ جاوید ہی لگ رہا تھا۔ سو فیصد جاوید قرار دینا اس لیے مشکل تھا کہ ماتھے پر بندھی پٹی اور گھنی داڑھی اس کا چہرہ واضح نہیں ہونے دے رہی تھی۔ عمر کے اعتبار سے بھی وہ اس تصویر کے مقابلے میں چند سال بڑا لگ رہا تھا جو انہوں نے فیس بک پر دیکھی تھی۔ شاید زیبی کی کم عمری کو دیکھتے ہوئے اس نے اپنی بھی کم عمری کی تصویر بھیجنا مناسب سمجھا تھا۔ (فیس بک کی شوقین زیبی ہر دوسرے روز اپنی پروفائل پکچر تبدیل کر کے اپنا نیا پوز ڈال دیتی تھی۔ ایسے میں منچلوں کا اس کی طرف متوجہ ہونا ایک لازمی بات تھی)

''ہیلو ماسٹر جاوید، ہاؤ آر یو؟'' اس کے جاوید ہونے کی تصدیق کرنے کے لیے مہ پارہ بلند آواز میں اس سے مخاطب ہوئی تو وہ اپنے خیالات سے چونکا اور اکٹھی چار لڑکیوں کو سامنے پا کر حیران نظر آنے لگا۔

''معاف کیجیے گا میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔'' حیرت کے فوری جھٹکے سے سنبھل کر وہ مہذبانہ انداز میں ان سے مخاطب ہوا۔

''ہمارا کمال دیکھیں کہ ہم نے آپ کو آپ کی چھ سات سال پرانی تصویر کی مدد سے بھی پہچان لیا۔'' عروج ذرا سا اٹھلائی۔

''جی میں سمجھا نہیں۔'' اس کی حیرت میں اضافہ ہوا۔

''ہم زیبی کی دوست ہیں اور اس کی خاطر آپ کو ڈھونڈتے ہوئے یہاں پہنچی ہیں۔'' مہ پارہ نے جواب دینے کا فریضہ انجام دیتے ہوئے اس کے تاثرات کا بغور جائزہ لیا۔ اس کے چہرے پر حیرت اور الجھن کے تاثرات ضرور تھے لیکن زیبی کے نام پر کسی شناسائی کا تاثر نہیں ابھرا تھا۔

''میں اب بھی نہیں سمجھا کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ یہ مس زیبی کون ہیں اور انہوں نے آپ کو مجھے تلاش کرنے کی ڈیوٹی کیوں سونپی ہے؟'' اس نے زبان سے بھی اپنی حیرت کا اظہار کیا۔

''یہ تو آپ نے خوب کہی؟ ایک معصوم لڑکی آپ کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر اپنی زندگی سے کھیل چکی ہے اور آپ کی تلاش میں اس بھرے شہر میں خوار ہو رہی ہے اور آپ پوچھ رہے ہیں کون زیبی......؟'' روشی کو اس کی بے نیازی پر غصہ آ گیا۔

''دیکھیں محترمہ! میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ آپ کس غلط فہمی میں مجھ تک چلی آئی ہیں لیکن میں یہ واضح کر دوں کہ میں اس قسم کا شخص نہیں ہوں کہ لڑکیوں کو ورغلاتا پھروں۔ میں ایک مہذب اور ذمے دار انسان ہوں۔'' روشی کے الزام پر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''یعنی آپ اس بات سے انکار کر رہے ہیں کہ آپ کی فیس بک پر زیب النسا عرف زیبی نامی ایک لڑکی سے دوستی تھی اور یہ دوستی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ آپ دونوں نے کورٹ میریج کا فیصلہ کر لیا تھا؟'' روشی نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر اس سے پوچھا۔

''واٹ ربش! میں آپ کو اتنا اسٹوپڈ بندہ نظر آتا ہوں جو شادی جیسا اہم معاملہ فیس بک پر نمٹائے اور کسی ایسی لڑکی کو اپنا لائف پارٹنر چوز کرے جو کسی کے لیے گھر سے بھاگ سکتی ہو۔'' اس نے اتنی نخوت سے روشی کی بات کا

جواب دیا کہ وہ چاروں چکرا کر رہ گئیں۔ واقعی زخمی حالت اور رف سے حلیے میں بھی وہ دیکھنے میں اچھا خاصا مہذب بندہ ہی لگ رہا تھا۔

‘‘دیکھیں جاوید صاحب! ہم نہیں جانتے کہ آپ کیوں زیبی سے انجان بن رہے ہیں لیکن ہم بھی بلاوجہ آپ کے پاس نہیں پہنچے ہیں۔ ہمارے پاس پورا ثبوت ہے کہ آپ کافی عرصے سے فیس بک پر اس سے رابطے میں تھے۔ آپ کے میسجز کے علاوہ آپ کی بھیجی گئی تصویر بھی اس کے ان باکس میں موجود ہے اور ہم اس تصویر کے ذریعے ہی آپ تک پہنچے ہیں۔’’ مہ پارہ نے ایک بار پھر گفتگو کی ذمے داری سنبھالی اور سنجیدگی سے اس سے مخاطب ہوئی۔

‘‘لیکن میں کسی زیبی کو نہیں جانتا۔’’ اس کی آنکھوں میں مکمل اجنبیت تھی۔

‘‘اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔ کہیں سر پر چوٹ لگنے سے یادداشت تو نہیں چلی گئی؟’’ لبنیٰ نے مہ پارہ کے کان میں سرگوشی کی تو اس نے پہلے اسے گھور کر دیکھا اور پھر روشی کو اشارہ کیا کہ وہ جاوید کو زیبی کا فیس بک اکاؤنٹ کھول کر ان باکس چیک کروائے۔ روشی نے ان باکس کھول کر جاوید کی تصویر اس کے سامنے کر دی۔

‘‘اگر آپ زیبی کو نہیں جانتے تو آپ کی تصویر اس تک کیسے پہنچی؟’’

‘‘میں نہیں جانتا کہ یہ کس کی حرکت ہے لیکن یہ بتا سکتا ہوں کہ یہ میری اسٹوڈنٹ لائف کی تصویر ہے جو ایک پکنک کے موقع پر کھینچی گئی ہے۔ اس پکنک پر بہت سارے اسٹوڈنٹس موجود تھے اور سب ہی بے دریغ ایک دوسرے کی تصویریں لے رہے تھے۔ میری یہ تصویر کس کس کے پاس ہے اور کس نے اس کا مس یوز کیا ہے، میں آپ کو بتانے سے قاصر ہوں۔’’ تصویر دیکھ کر بھی وہ ٹس سے مس نہیں ہوا اور زیبی سے ناواقف ہونے کے دعوے پر قائم رہا۔

‘‘کمال ہے، آپ زیبی کے فیس بک فرینڈز کی لسٹ میں ایڈ ہیں اور وہ واحد شخص ہیں جس سے وہ سب سے زیادہ رابطے میں رہتی تھی پھر بھی آپ اسے پہچاننے سے انکاری ہیں۔ یہ دیکھیں آپ نے کتنی پوسٹس اسے ٹیگڈ کی ہیں۔’’ روشی کی انگلیاں ایک بار پھر اسکرین پر حرکت کرنے لگیں اور اس نے موبائل اس کے سامنے کیا۔

‘‘آپ مذاق کر رہی ہیں۔ آپ کو لگتا ہے کہ یہ سلمان خان کی پروفائل پکچر والی آئی ڈی میری ہو سکتی ہے۔’’ اب اس کا انداز مضحکہ اڑانے والا تھا۔

‘‘اس آئی ڈی پر آپ کا نام ہے۔ پروفائل میں موجود معلومات خاصی حد تک آپ سے میچ کرتی ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس آئی ڈی سے زیبی کو آپ کی تصویر سینڈ کی گئی ہے پھر بھی ہماری بات کو جھٹلا کر اسے مذاق قرار دے رہے ہیں۔’’ روشی کو صدمہ ہوا۔

‘‘میں ایسا کرنے میں حق بجانب ہوں۔ آپ نے جو آئی ڈی دکھائی ہے، وہ میری نہیں ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ کسی جاننے والے نے میرا نام استعمال کر کے فیک آئی ڈی بنالی ہو لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ اگر میرا موبائل میرے پاس ہوتا تو میں اسے چیک کروا کر آپ لوگوں کو مطمئن کر سکتا تھا۔’’

‘‘آپ کے موبائل کو کیا ہوا؟ وہ آپ کے پاس کیوں نہیں ہے؟’’ مہ پارہ نے سوال کیا۔

‘‘ایکسیڈنٹ کے موقع پر جیب سے گر کر گم ہو گیا۔ اب نہیں معلوم کہ کسی دوسری گاڑی کے نیچے آ کر چکنا چور ہو گیا یا کسی اچکے کے ہاتھ لگ گیا۔ میں نے ہوش میں آنے کے بعد بیان لینے کے لیے آنے والے پولیس والے کو اس بارے میں بتا دیا تھا لیکن امید نہیں ہے کہ کچھ حاصل وصول ہو گا۔’’ وہی عمومی بداعتمادی کا مظاہرہ تھا جس پر عوام کی رائے راسخ ہو چکی تھی۔

‘‘لیکن اب زیبی کا کیا ہو گا؟ وہ تو آپ یا پھر کسی نقلی جاوید کے چکر میں اپنا گھر چھوڑ چکی ہے۔ ہم نے ایک بار تو اسے خودکشی سے بچا لیا ہے لیکن مایوسی اسے دوبارہ اس نہج پر لے گئی تو ہم کیا کر سکیں گے۔’’ مہ پارہ متفکر تھی۔

‘‘آپ ایک بار زیبی کو دیکھ تو لیں۔ شاید آپ نے اسے کبھی دیکھ رکھا ہو۔’’ لبنیٰ نے اپنے موبائل سے کھینچی گئی زیب النسا کی تصویر اس کے سامنے کی۔ اسے اب بھی تھوڑا تھوڑا سا شک تھا کہ شاید سر پر چوٹ لگنے سے بندے کی یادداشت کمزور ہو گئی ہے اس لیے کھوئی ہوئی یادداشت کو واپس لانے کے لیے ایک کوشش کی۔

‘‘مجھے اس واقعے پر افسوس ہے لیکن میں معذرت خواہ ہوں کہ اس سلسلے میں آپ سے کوئی تعاون نہیں کر سکتا۔’’ اس نے تصویر پر ایک کے بعد دوسری نظر ڈالنا بھی گوارا نہیں کیا۔

☆☆☆

‘‘اس نمونے کا میں کیا کروں یار! زیادہ دن وہ میرے گھر میں چلنے والی نہیں ہے۔ ناہید کو اس سے بہت شکایتیں ہیں اور جیسے ہی ممی کو فرصت ملی، وہ ان کے کان بھر

دے گی۔" زیبی سانپ کے منہ میں چھچھوندر کی طرح اٹک گئی تھی۔ اس کا مطلوبہ جاوید ملا نہیں تھا یا پھر مل کر انجان بن گیا تھا۔ بات جو بھی تھی، وہ اسے زبردستی کسی کے گلے نہیں ڈال سکتی تھیں اور ادھر زیبی بی بی اپنے گھر کا پتا بتانے کے لیے بھی راضی نہیں تھی اس لیے ہنوز لبنیٰ کے گھر مقیم تھی اور مشکل میں آئی لبنیٰ کانفرنس کال پر سہیلیوں کے سامنے دہائی دے رہی تھی۔

"دیکھتے ہیں۔ آج شام آکر اس سے فائنلی بات کرتے ہیں۔ اگر وہ اپنے گھر جانے پر راضی نہیں ہے تو اسے کسی اچھی شہرت رکھنے والے دارالامان بھجوا دیتے ہیں۔ فی الحال تو یہی حل آرہا ہے میرے ذہن میں۔" مہ پارہ نے سنجیدگی سے تجویز دی۔ ابھی اس تجویز پر کسی طرف سے کوئی رائے آتی، اس سے قبل ہی بوکھلائی ہوئی ناہید، لبنیٰ کے کمرے میں داخل ہوئی۔

"زیبی کو کسی نے اغوا کرلیا ہے جی۔" اس نے پھیلی ہوئی آنکھوں کے ساتھ لبنیٰ کو اطلاع دی۔

"کیا کہہ رہی ہو۔ کس نے اغوا کرلیا اور کیسے؟" سن کر لبنیٰ بھی بوکھلا گئی۔

"میں نے دیکھا تھا بی بی وہ گھر سے باہر نکلی اور تھوڑی دور کھڑی ایک گاڑی کی طرف بڑھی۔ گاڑی میں سے کوئی باہر نہیں نکلا اور زیبی کا ہاتھ کھینچ کر اسے اندر بٹھالیا۔ میرے منہ سے آواز نکلی اس سے پہلے ہی گاڑی تیزی سے نکل گئی۔" ناہید نے آنکھوں دیکھا حال سنایا۔ لبنیٰ نے اسپیکر آن کردیا تھا اس لیے وہ تینوں بھی سب سن رہی تھیں۔

"زیبی باہر کیوں گئی تھی۔ اس کا باہر کیا کام تھا؟" سب اپنی جگہ حیران تھیں۔

"کام تو کوئی نہیں تھا لیکن وہ کسی سے ملنے کے چکر میں باہر نکلی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے گھر کے فون پر کسی کی کال آئی تھی۔ کہہ رہا تھا زیب النسا سے بات کرنی ہے۔ میں نے زیبی کو بلا کر فون اسے تھما دیا پر مجھے کھوج لگ گئی تھی کہ کس کا فون آیا ہے اس لیے ڈرائنگ روم میں جا کر دوسرے فون پر اس کی باتیں سن لیں۔ فون کرنے والا کوئی جاوید تھا اور زیبی سے کہہ رہا تھا کہ جو ہوا اسے بھول جاؤ۔ اب میں نے تمہیں ڈھونڈ لیا ہے اس لیے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ تم کہیں اور رہو۔ میں تمہیں لینے آگیا ہوں، تم جلدی سے باہر آجاؤ۔ میں آپ کو بتانے آئی اس سے پہلے ہی زیبی فون رکھ کر باہر کی طرف دوڑ گئی۔ میں نے اوپر ٹیرس سے جھانک کر دیکھا تو وہ نظر آیا جو میں نے پہلے ہی آپ کو بتا دیا ہے۔"

ناہید کا جواب ان کے لیے سنسنی خیز تھا۔ جاوید جو خود زیبی کو گھر چھوڑنے سے روک کر منظر سے غائب ہوگیا تھا اب پھر ظاہر ہوا تھا اور اس نے اس بات کا بھی کھوج لگا لیا تھا کہ زیبی لبنیٰ کے گھر میں موجود ہے۔ اس کھوج کے ساتھ ہی وہ اسے اغوا بھی کرچکا تھا اور ایسا اس صورت میں ہوا تھا کہ انہیں اسپتال والے جاوید سے ملاقات کرکے آئے ابھی پورے بیں گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے۔

"مجھے لگتا ہے کہ اسپتال سے واپسی میں کسی نے ہم لوگوں کا تعاقب کیا تھا۔ گھر دیکھ لینے کے بعد لینڈ لائن نمبر تلاش کرلینا کون سا مشکل کام ہے۔ یہاں فون کرکے اس نے کنفرم کیا کہ زیبی یہیں ہے اور پھر وہ اسے باہر بلانے میں کامیاب ہوگیا۔" عروج نے فوراً اندازہ قائم کیا۔

"وہ جاوید تھا تو اسے زیبی کو اغوا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہم تو خود اسے ڈھونڈ رہے تھے کہ ملے اور ڈھنگ کا بندہ ہو تو زیبی کو اس کے حوالے کردیں۔" روشی نے حیرت کا اظہار کیا۔

"اس سے ہی سمجھ لو کہ وہ ڈھنگ کا بندہ نہیں ہے۔" مہ پارہ نے رائے دی۔

"اب ہم کیا کریں؟ ہم نے اسے سمندر میں ڈوبنے سے اس لیے تو نہیں بچایا تھا کہ وہ ذلت کے کنوئیں میں جا گرے۔" لبنیٰ جو اس سے سب سے زیادہ بیزار تھی اب سب سے زیادہ ہی اس کے لیے فکرمندی محسوس کررہی تھی۔

"مجھے لگتا ہے ہم اسپتال میں جس جاوید سے ملے تھے، اس کا اس معاملے سے تعلق ہے۔ زیبی تین دن سے تمہارے گھر تھی تو کچھ نہیں ہوا تھا لیکن جیسے ہی ہم جاوید کے پیچھے اسپتال پہنچے زیبی کو اغوا کرلیا گیا۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ جاوید جتنا معصوم بن رہا تھا اتنا معصوم ہے نہیں۔" مہ پارہ کا دماغ تیزی سے کام کررہا تھا۔

"پھر تو ہمیں سب سے پہلے جاوید کو چیک کرنا چاہیے۔" لبنیٰ نے رائے دی۔ ناہید کو اس نے پہلے ہی اشارے سے باہر جانے کا کہہ دیا تھا۔ اس کے سامنے یہ ساری گفتگو کرنے کا مطلب تھا می تک خبر پہنچنا جس کی ظاہر ہے وہ متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔

"میں اور عروج جا کر چیک کرتے ہیں۔ اسپتال ہمارے گھر سے زیادہ قریب پڑے گا۔" مہ پارہ نے مستعدی کا مظاہرہ کیا۔

"اوکے، تم دونوں چیک کرو۔ میں ذرا ناہید سے مزید معلومات حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اس کا منہ بند

رکھنے کا انتظام بھی کرتی ہوں۔ اس نے ممی کے سامنے کچھ بک دیا تو میری شامت آجائے گی۔" لبنیٰ کی فکریں ذرا زیادہ تھیں۔

"تم دونوں ہم سے رابطے میں رہنا اور کوئی رسک نہیں لینا۔" روشی نے رابطہ ختم ہونے سے پہلے ہدایت دینا ضروری سمجھی جس کے جواب میں صرف اوکے کہہ کر مہ پارہ نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

☆☆☆

"اگر جاوید اسپتال میں موجود ہوا تو ہم کیا کریں گے۔ کیا جا کر سیدھا اس کی کنپٹی پر پسٹل رکھ دیں گے کہ زیبی کو ہمارے حوالے کرو ورنہ تمہاری کھوپڑی اُڑا دیں گے؟" عروج نے تیزی سے ڈرائیو کرتی ہوئی مہ پارہ کی طرف دیکھتے ہوئے تشویش سے سوال کیا۔

"ضرورت پڑی تو یہ بھی کر گزریں گے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اس معاملے میں جاوید کے سوا ہمارے پاس کوئی دوسرا کلیو بھی نہیں ہے۔" مہ پارہ کی اپنی پیشانی پر تفکر کی لکیریں تھیں۔ بار بار بے وقوف زیبی کی حسین صورت تصور میں آرہی تھی۔

"پہلے کی طرح اب بھی وہ صاف انکار کر دے گا۔" عروج نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"پہلی بات یہ کہ وہ ہمیں اسپتال میں مل جائے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ اب تک غائب ہو چکا ہوگا۔" مہ پارہ نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے جواب دیا۔

"میرے خیال میں اس کے اپارٹمنٹ کو بھی ساتھ کے ساتھ چیک کر لینا چاہیے۔" عروج نے مشورہ دیا۔

"بالکل ٹھیک۔ تم روشی کو فون کر کے کہو کہ وہ اور لبنیٰ وہاں چلی جائیں۔" گاڑی پارک کرنے کے لیے مناسب جگہ ڈھونڈتے ہوئے مہ پارہ نے اس کی تائید کی۔

عروج موبائل نکال کر روشی سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگی اور مہ پارہ نے ایک مناسب جگہ دیکھ کر گاڑی کھڑی کر دی۔

"روشی کال ریسیو نہیں کر رہی۔ شاید کہیں بزی ہے۔ میں نے اسے میسج کر دیا ہے اور ساتھ میں لبنیٰ کو بھی کال کر دیتی ہوں۔"

روشی کے کال ریسیو نہ کرنے پر عروج نے اطلاع دی اور لبنیٰ کا نمبر سرچ کرتے ہوئے دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر نکلی۔ مہ پارہ بھی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر قدم باہر رکھ چکی تھی۔ دونوں کو قطعی اندازہ نہیں تھا کہ خطرہ ...... ان سے کتنا قریب ہے۔

"اپنی آواز بالکل بند رکھنا۔ اگر ذرا بھی شور مچایا تو گولی چل جائے گی۔" نہایت سرعت سے ان کے سروں پر پہنچ جانے والے دونوں آدمیوں نے اپنی گنز ان کے پہلوؤں سے لگا دیں اور خوفناک تیوروں کے ساتھ دھمکی سے نوازا۔

"کون ہو تم لوگ اور ہم سے کیا چاہتے ہو؟" بُری طرح دھڑکتے دل کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے مہ پارہ نے لرزتی آواز میں سوال کیا۔

"تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"اگر ہم انکار کر دیں اور شور مچا دیں؟" اس نے بہادری کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔

"اس صورت میں ہمیں گولی مار دینے کا حکم ہے۔ ہتھیاروں کی موجودگی میں کوئی ہم سے پنگا لینے کی جرأت نہیں کرے گا۔" اس کا لہجہ مزید خوفناک ہوگیا۔ مہ پارہ نے پل بھر کے لیے سوچا۔ مرحومین کی فہرست میں فوری طور پر شامل ہونا اسے مناسب نہیں لگا۔ شور مچانے کا نتیجہ بھی بالکل درست بتایا گیا تھا۔ ہتھیار کے سامنے سبھی کی گھگی بندھ جاتی ہے۔ اب بھی اسے یقین تھا کہ آس پاس موجود اِکا دُکا افراد کو اندازہ ہو چکا ہے کہ ہتھیاروں کے زور پر ان کے ساتھ کوئی کارروائی کی جا رہی ہے لیکن وہ خود کو اس معاملے سے انجان ظاہر کرنے کی اداکاری کر رہے تھے۔

"ٹھیک ہے، ہم چلتے ہیں۔" فوری طور پر مرنے کے مقابلے میں اغوا ہو جانے میں بہرحال کچھ امکانات موجود تھے اس لیے مہ پارہ نے رضامندی دے دی۔ عروج کی تو سٹی ہی گم ہو چکی تھی۔ پہلی پہلی بار اغوا ہونے کا تجربہ ہو رہا تھا اس لیے سوائے کپکپانے اور لرزنے کے کوئی خیال ہی نہیں سوجھ رہا تھا۔

☆☆☆

روشی واش روم میں تھی۔ اس نے اپنا موبائل بجنے کی آواز سنی تو قدرے عجلت میں باہر آگئی تاہم اتنی دیر میں بیل بجنا بند ہو چکی تھی۔ اس نے موبائل اٹھا کر چیک کیا۔ عروج کی مسڈ کال تھی۔ ساتھ ہی اس کا میسج بھی آیا ہوا تھا۔ اس نے پہلے میسج پڑھ لینا مناسب سمجھا۔

"ہم اسپتال پہنچ چکے ہیں۔ تم لبنیٰ کے ساتھ جا کر جاوید کا اپارٹمنٹ چیک کر لو۔" پیغام پڑھ کر اس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ اس کے ذہن میں بھی یہی بات آئی تھی کہ اگر جاوید اسپتال سے غائب ہوا تو وہ دوسری جگہ جہاں

اسے چیک کیا جا سکتا تھا، اس کا اپارٹمنٹ ہی ہو سکتا تھا۔ پیغام سے عروج کے فون کرنے کا مقصد واضح ہو گیا تھا اس لیے اس نے اسے کال بیک کرنا ضروری نہیں سمجھا اور اپنی چند ضروری چیزیں سمیٹتے ہوئے لبنیٰ سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگی لیکن دوسری طرف سے پاورڈ آف پیغام سننے کو ملا۔ اس نے لینڈ لائن نمبر ملایا لیکن لائن بزی جا رہی تھی۔

"ناہید کی بچی لگی ہو گی فون پر۔" وہ بڑبڑائی اور گاڑی کی چابیاں اٹھا کر باہر نکل گئی۔ لبنیٰ کا گھر اس کے گھر سے بہت زیادہ دور نہیں تھا اس لیے اسے وہاں پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اس کے پہنچنے پر چوکیدار گاڑی پہچان کر مستعدی سے بھاگ کر آیا اور کھڑکی پر جھک کر مؤدبانہ بولا۔

"لبنیٰ بی بی تو ابھی کہیں گیا ہے۔ آپ بولو تو ام آپ کے لیے گیٹ کھول دیتا ہے۔"

"کچھ معلوم ہے کہ کہاں گئی ہے وہ؟" روشی نے دریافت کیا۔

"ام کو نئیں ملوم بی بی۔ شاید ناہید کو خبر ہو۔ ام گیٹ کھولتا ہے آپ اندر آ کر ناہید سے ملوم کر لیتا۔"

"نہیں میں اندر نہیں آ رہی۔ تم انٹر کام پر ناہید سے میری بات کروا دو۔" روشی نے اس کا جواب سن کر کچھ سوچا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ چوکیدار حکم کا غلام تھا۔ اس نے انٹر کام پر ناہید سے اندر رابطہ کیا اور ریسیور روشی کو تھما دیا۔

"بی بی کے پاس کسی کا فون آیا تھا۔ فون سن کر وہ گھر سے نکلی ہیں۔ کہاں گئیں اس کی مجھے خبر نہیں۔" ناہید نے اس کا سوال سن کر اطلاع دی تو وہ اپنے اس خیال پر راسخ ہو گئی کہ عروج نے اس کے ساتھ ساتھ لبنیٰ کو بھی کال کر کے جاوید کے اپارٹمنٹ پہنچنے کا کہا ہو گا اس لیے وہ گھر سے روانہ ہو چکی ہے۔ اس کے حساب سے لبنیٰ کو اس پر چند منٹ کی سبقت حاصل ہو چکی تھی۔ چنانچہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر جاوید کے اپارٹمنٹ تک پہنچنے میں اس نے جلدی کا مظاہرہ کیا۔ تیز ڈرائیو کرتے ہوئے وہ وہاں پہنچی تو بلڈنگ کی پارکنگ میں نظر دوڑانے پر اسے لبنیٰ کی گاڑی کہیں دکھائی نہیں دی۔ اس نے تاخیر کی وجہ جاننے کے لیے اس کا موبائل نمبر ملایا لیکن اب بھی اسے پاورڈ آف کی گردان سننے کو ملی۔ قدرے جھنجلاتے ہوئے اس نے موبائل واپس پرس میں رکھا اور جاوید کے اپارٹمنٹ والے بلاک کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ یہ چار منزلہ عمارت تھی لیکن لفٹ کا انتظام نہیں تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ جاوید کا اپارٹمنٹ سیکنڈ فلور پر تھا اس لیے اسے زیادہ مشقت نہیں اٹھانی پڑی تھی۔ سیکنڈ فلور پر پہنچ کر اس نے جاوید کے اپارٹمنٹ کی طرف دیکھا تو یہ دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں کہ دروازے پر لگا تالا غائب ہے۔ تالا غائب ہونے کا مطلب تھا جاوید اپنے اپارٹمنٹ میں موجود ہے۔ پچھلی بار کے تجربے کی بنیاد پر اسے معلوم تھا کہ یہاں لوگ ایک دوسرے کی سرگرمیوں پر نظر رکھتے ہیں اس لیے اس بات کا امکان بہت کم تھا کہ اسے جاوید کے اپارٹمنٹ میں کوئی نقصان پہنچایا جا سکے۔ اپنے اس خیال کے تحت اس نے آرام سے دروازے کے بائیں طرف لگا گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ بٹن دباتے ہوئے وہ یہ دیکھ کر مسکرائی تھی کہ ساتھ والے اپارٹمنٹ کے دروازے سے ایک خاتون نے جھانک کر اسے تجسس سے دیکھا تھا لیکن اس سے نظریں ملنے پر قدرے کھسیا کر دروازہ دوبارہ بند کر لیا تھا۔ اس اثنا میں جاوید کے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھل چکا تھا۔ یہ دیکھ کر روشی کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی کہ دروازہ کھولنے والی خود زیبی تھی۔

"اندر آ جائیں باجی جی، آرام سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" اس کی شکل دیکھ کر زیبی نے سنجیدگی سے کہا اور خود اسے راستہ دینے کے لیے دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ روشی کا دل چاہا آرام سے بیٹھ کر بات کرنے کا کہنے والی کے منہ پر ایک جھانپڑ رسید کرے کہ خود تو مزے سے یہاں بیٹھی ہو اور ہم تمہاری فکر میں خوار ہوتے پھر رہے ہیں لیکن پھر اس نے ضبط کر لیا اور زیبی کو گھورتی ہوئی کھلے دروازے سے اندر داخل ہوئی۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے اپنی گردن پر لوہے کا ٹھنڈا لمس محسوس کیا اور زیبی کی آنکھوں سے نکل بہنے والے آنسو دیکھ کر اس کے سارے بدن میں پھریری سی دوڑ گئی۔

☆☆☆

کانفرنس کال ختم ہوتے ہی لبنیٰ کا موبائل آف ہو گیا تو اس نے بے ساختہ ہی خود کو کوسا۔ سستی کے باعث کئی بار موبائل چارجنگ پر لگانے کا خیال آنے کے باوجود اس نے اس کام کو ٹال دیا تھا اور اب چارجنگ ختم ہو جانے کے باعث موبائل آف ہو گیا تھا۔

"آپ کا فون آیا ہے بی بی!" وہ موبائل چارجنگ پر لگانے کے لیے اٹھ ہی رہی تھی کہ ناہید نے آ کر اطلاع دی۔

"کس کا فون ہے؟"

"کوئی لڑکی ہے لیکن اپنا نام نہیں بتایا۔"

''اوکے، میں دیکھتی ہوں۔ تم ذرا میرا موبائل تو چارجنگ پر لگا دو۔'' وہ موبائل ناہید کو تھماتے ہوئے کمرے سے باہر نکلی۔ اس کے سارے رابطے موبائل پر ہی رہتے تھے اس لیے اس نے اپنے کمرے میں لینڈ لائن کا ایکسٹینشن نہیں لگوایا تھا۔ اس نمبر پر ناہید کے رشتے داروں اور مسٹر اینڈ مسز یوسف کے مریضوں کے علاوہ مشکل ہی سے کسی کی کال آتی تھی اس لیے اس نے وردوسری کو نہیں پالا تھا۔

''میں زیبی بات کر رہی ہوں باجی۔'' اس نے ریسیور اٹھا کر جیسے ہی ہیلو کہا، دوسری طرف سے زیبی کی آواز سنائی دی۔

''تم کہاں ہو؟ تمہیں کس نے اغوا کیا ہے؟'' زیبی کی آواز سنتے ہی اس نے بوکھلا کر پوچھا۔

''مجھے کسی نے اغوا نہیں کیا باجی، میں اپنی مرضی سے جاوید کے ساتھ آئی ہوں لیکن مجھے خیال آیا کہ آپ میرے لیے پریشان ہو رہی ہوں گی اس لیے آپ کو اطلاع دینے کے لیے فون کیا ہے۔''

''اطلاع کی بچی! تم نے میرا بلکہ ہم سب کا دم نکال کر رکھ دیا تھا۔ تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ ہم تمہارے لیے کتنے پریشان ہو رہے ہیں۔'' لبنیٰ کو اس کی بات سن کر پتنگے لگ گئے اور بغیر تکلف کے کھری کھری سنائی۔

''سوری باجی جی! غلطی ہو گئی جی۔ آپ ایسا کریں کہ دوسری باجیوں کو لے کر یہاں میرے پاس آجائیں۔ جاوید بھی آپ لوگوں سے شرمندہ ہے جی اور مل کر معافی مانگنا چاہتا ہے۔'' زیبی بیگم کی وہی معصومیت تھی جو بندے کو اس پر زیادہ غصہ بھی نہیں کرنے دیتی تھی۔

''ایڈریس بتاؤ۔ ہم لوگ پہنچتے ہیں۔'' لبنیٰ چاہ کر بھی اپنے غصے کا اظہار نہیں کر سکی۔ ایک طرف زیبی کے معصوم لہجے پر دل پسیج گیا تھا تو دوسری طرف اس بات کا خیال آ گیا تھا کہ جاوید سے مل کر تسلی تو کرلی جائے کہ احمق زیبی نے خود کو کسی جنجال میں تو نہیں پھنسا لیا ہے۔ مل کر یہ بھی کنفرم کرنا تھا کہ یہ اسپتال میں ملنے والا جاوید تھا یا کوئی دوسرا شخص۔ اس کی فرمائش پر زیبی نے ایڈریس بتا دیا۔ یہ اسی اپارٹمنٹ بلڈنگ کا ایڈریس تھا جہاں وہ پہلے بھی جاوید کی تلاش میں جا چکی تھیں۔ ایڈریس کی وجہ سے اسے یقین ہو گیا کہ یہ وہی جاوید ہے جس سے انہوں نے اسپتال میں ملاقات کی تھی۔ ملاقات میں تو اس نے زیبی سے شناسائی سے صاف انکار کر دیا تھا لیکن بعد میں شاید انسانیت جاگ گئی تھی اور خیال آ گیا تھا کہ وہ بے چاری اس کی وجہ سے بھری دنیا میں تنہا رہ گئی ہے اس لیے اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

''ناہید! میرا موبائل اور گاڑی کی چابیاں لا کر دو۔ مجھے باہر جانا ہے۔'' اس نے وہیں سے ہانک لگا کر ناہید کو حکم دیا اور سامنے لگے آئینے میں خود پر ایک نظر ڈالی۔ چند گھنٹے قبل تبدیل کیا گیا لباس معقول تھا اور بال بھی سیٹ ہی تھے۔ اس نے ایک دو بے ترتیب ہو جانے والی لٹوں کو انگلیوں سے درست کیا اور اپنی طرف آنے ولی ناہید کی طرف دیکھا۔

''یہ لیں بی بی گاڑی کی چابیاں اور آپ کا موبائل لیکن موبائل تو ابھی......''

''ممی آئیں تو کہنا میں مہ پارہ کی طرف ہوں۔ واپسی میں شاید تھوڑی دیر ہو جائے۔'' اس نے ناہید کی بات پوری سنی ہی نہیں اور دونوں چیزیں تھام کر باہر کی طرف بڑھ گئی۔ گاڑی میں بیٹھ کر اس نے پہلے مہ پارہ کا نمبر ملایا۔ اس کے خیال کے مطابق روشی اپنے گھر میں تھی جبکہ مہ پارہ اور عروج اسپتال پہنچی ہوئی تھیں اس لیے پہلے انہیں زیبی کے مل جانے کی اطلاع دینی ضروری تھی۔ نمبر ڈائل کرتے ہی ''بیٹری لو'' کا سگنل ملا تو اس نے ایک بار پھر خود کو کوسا۔ اسے سمجھ آ گئی تھی کہ ناہید اس سے کیا کہہ رہی تھی۔ ابھی ابھی چارجنگ پر لگائے جانے کے باعث اس کا موبائل چند فیصد سے زیادہ چارج نہیں ہوا تھا لیکن اس نے گاڑی میں بیٹھنے کے بعد دوبارہ اتر کر اندر جانا مناسب نہیں سمجھا۔ دوستوں کو اطلاع ہی تو دینی تھی اور اس کے لیے چند فیصد چارجنگ بھی کافی تھی۔ ڈائل کے نشان کو چھوتے ہی اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ کان میں اڑسے ہینڈ فری کی مدد سے وہ گاڑی چلاتے ہوئے بھی بات کر سکتی تھی۔ اِدھر اس کے ہارن بجانے پر چوکیدار نے بیرونی گیٹ کھولا اُدھر کان میں پاورڈ آف کا مژدہ گونجا۔ وہ گاڑی باہر نکال کر لے گئی اور بغیر مایوس ہوئے عروج کا نمبر ملایا۔ کال فوراً ہی ریسیو کر لی گئی اور ٹریفک کے بے تحاشا شور کے درمیان اس کی ہیلو سنائی دی۔

''اسپتال جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ زیبی کا پتا چل گیا ہے۔ وہ وہیں جاوید کے اپارٹمنٹ پر ہے تم لوگ بھی وہیں آجاؤ۔'' ٹریفک کے شور سے اس نے اندازہ لگایا کہ ابھی مہ پارہ اور عروج اسپتال نہیں پہنچی ہیں اور ابھی راستے ہی میں ہیں۔

''اوکے۔'' عروج نے صرف یک لفظی جواب دے

کر فون بند کر دیا۔ لبنیٰ کو موبائل کی کم چارجنگ کی فکر تھی اس لیے عروج کی کم گوئی کو غنیمت جانا اور روشی کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ اس کا نمبر مصروف جا رہا تھا۔ اس نے احتیاط سے ایک موڑ کاٹا اور دو تین منٹ کے وقفے سے ری ڈائل کیا لیکن پوری گھنٹی بجنے سے قبل ہی اس کا موبائل بند ہو گیا۔ اس نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کان سے ہینڈ فری نکالا اور موبائل سمیت ڈیش بورڈ پر ڈال دیا۔ امید تھی کہ عروج سے روشی کو بھی اطلاع مل جائے گی۔ باقی کا راستہ سکون سے طے کر کے وہ جاوید کی رہائشی اپارٹمنٹ بلڈنگ کی پارکنگ میں داخل ہوئی اور ایک مناسب جگہ پر گاڑی روک دی۔ ابھی وہ اگنیشن میں سے چابی کھینچ کر گاڑی سے باہر نکلنے ہی لگی تھی کہ ایک سرد آواز نے اسے سن کر دیا۔

”نیچے اترنے کی ضرورت نہیں ہے۔ شرافت سے پسنجر سیٹ پر کھسک جاؤ۔“ اس سے شرافت کا مطالبہ پورا کروانے کے لیے اس شخص کے ہاتھ میں ایک عدد خوفناک گن بھی موجود تھی۔ لبنیٰ کو اس کی بات پر عمل کرنا پڑا۔ اس کے پسنجر سیٹ پر منتقل ہوتے ہی نہ صرف وہ شخص ڈرائیونگ سیٹ پر قابض ہو چکا تھا بلکہ ایک اور شخص بھی پچھلی جانب کا دروازہ کھول کر گاڑی میں گھس گیا تھا۔

”کون ہو تم لوگ......؟“ لبنیٰ نے تھوک نگل کر اپنا خشک ہوتا ہوا گلا تر کیا اور سوال کرنے کی جرأت کی۔ جواب میں اس کے چہرے پر کسی مائع کی پھوار سی پڑی اور وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گئی۔

☆☆☆

مسز مونا یوسف نے ایک نظر اپنے ہاتھ میں موجود تصویر پر ڈالی پھر اپنے سامنے بیٹھے پولیس انسپکٹر کی طرف متوجہ ہو کر سنجیدگی سے بولیں۔

”یہ لڑکی زیب النسا کچھ دنوں سے میرے گھر میں ملازمت کر رہی ہے اور دیکھنے میں بہت سیدھی سادی بچی معلوم ہوتی ہے۔ کیا میں آپ سے پوچھ سکتی ہوں کہ یہ آپ کو کس الزام میں مطلوب ہے؟“ گھریلو ملازمین کے چوری ڈکیتی کے معاملات میں ملوث ہونے کے واقعات عام ہیں اسی لیے جب ایک باوردی پولیس والے نے زیب النسا کی تصویر دکھا کر اس کے بارے میں استفسار کیا تو مسز مونا کے ذہن میں یہی آیا کہ یہ لڑکی شاید کسی واردات میں پولیس کو مطلوب ہے۔

”اس لڑکی پر کوئی الزام نہیں ہے بیگم صاحبہ بلکہ اس کے اغوا کی ایف آئی آر کٹی ہوئی ہے اور ہم سی پی ایل سی کے تعاون سے بہت مشکل سے آپ تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ذرائع بتا رہے ہیں کہ زیب النسا کا فیس بک اکاؤنٹ وقتاً فوقتاً یہاں سے آپریٹ کیا جاتا رہا ہے اور اب آپ نے بھی تصدیق کر دی ہے کہ زیب النسا گھریلو ملازمہ کی حیثیت سے یہاں موجود ہے تو میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ اسے یہاں بلوا دیں تاکہ ہم اسے پولیس کی تحویل میں لے کر باقی کی تفتیش اور کارروائی مکمل کر سکیں۔“ ڈاکٹر ایس یوسف کے خاندان کی ایک ساکھ تھی اس لیے نہایت حساس معاملے کے باوجود انسپکٹر اتنی تہذیب سے پیش آ رہا تھا۔ وہ پولیس موبائل میں اپنی پوری ٹیم کے ساتھ آیا تھا لیکن ملاقات کے لیے اندر آتے ہوئے صرف ایک لیڈی اہلکار کو اپنے ساتھ لایا تھا جو اس کے قریبی صوفے پر بیٹھی ساری گفتگو سن رہی تھی۔

”ناہید......! زیب النسا کو لے کر یہاں آؤ۔“

صورتِ حال پریشان کن تھی اور مسز مونا کو خود بخود ہی ادراک ہو گیا تھا کہ زیبی کو ملازم رکھنے کے لیے لبنیٰ نے نگو کا جو حوالہ دیا تھا، وہ غلط بیانی پر مبنی تھا۔ لبنیٰ سے وہ بعد میں نمٹ لیتیں پہلے پولیس کو نمٹانا ضروری تھا۔ وہ ابھی ابھی تھکی ہاری گھر آئی تھیں اور آتے کے... ساتھ یہ مسئلہ سامنے آ گیا تھا۔

”زیب النسا گھر میں نہیں ہے بیگم صاحب!“ ان کی پکار کے ردِعمل میں ناہید سہمی ہوئی سی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی اور اطلاع دی۔

”کیا مطلب؟ کہاں گئی ہے وہ؟“ انہوں نے رعب سے پوچھا۔ جواب میں ناہید نے اس کے اغوا کی وہ کہانی سنا دی جو اس سے پہلے لبنیٰ کو بھی سنا چکی تھی۔

”یہ بہت نازک معاملہ ہے میڈم! لڑکی کے والد ایس پی صاحب کے استاد رہ چکے ہیں اور ایس پی صاحب کے حکم پر ہی اتنی تیزی سے اور جدید ذرائع کے استعمال کے ساتھ کارروائی ہوئی ہے کہ ہم آپ تک آ پہنچے ہیں۔ لڑکی اتنے دنوں سے آپ کے گھر میں تھی اور اب پولیس کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ وہ اغوا ہو چکی ہے تو یہ بات اتنی آسانی سے ہضم نہیں کی جا سکتی۔ وہ آپ کی ملازمہ تھی تو اس کے اغوا کی رپورٹ آپ کو پولیس کو کرنی چاہیے تھی۔“ ناہید کا جواب سن کر پولیس انسپکٹر کا لہجہ قدرے درشت ہو گیا۔

”میں ایک فزیو تھراپسٹ ہوں انسپکٹر اور ابھی ابھی اسپتال سے واپس آئی ہوں۔ زیب النسا کے اغوا کی خبر بھی مجھے ابھی سننے کو ملی ہے اور ظاہر ہے میں اپنے شوہر سے مشورہ

کر کے اس سلسلے میں لازماً کوئی کارروائی کروں گی۔" مسز مونا نے پولیس انسپکٹر کے سامنے کمزوری کا اظہار نہیں کیا اور سنجیدہ لہجے میں بولیں۔

"تم نے اتنی بڑی واردات کی اطلاع فوری طور پر مالکان کو کیوں نہیں دی؟" اس بار انسپکٹر نے روئے سخن ناہید کی جانب کرلیا اور سخت لہجے میں پوچھا۔

"وہ جی میں نے لبنیٰ بی بی کو بتایا تھا اور انہوں نے کہا تھا کہ وہ خود بیگم صاحبہ کو خبر کردیں گی اس لیے میں چپ رہی۔" گھبرائی ہوئی ناہید نے اپنی صفائی پیش کی۔

"لبنیٰ......؟" انسپکٹر نے سوالیہ نظروں سے مسز مونا کی طرف دیکھا۔

"میری بیٹی ہے۔" انہیں بتانا پڑا۔

"میں مس لبنیٰ سے ملنا چاہوں گا۔" انسپکٹر نے مطالبہ کیا۔

"وہ تو گھر میں نہیں ہیں... کہہ کر گئی تھیں کہ مہ پارہ بی بی کی طرف جارہی ہوں واپسی میں دیر ہوجائے گی۔" مسز مونا کے کوئی جواب دینے سے قبل ناہید بول پڑی۔

"حیرت ہے۔ آپ کی ایک ملازمہ اغوا کرلی گئی اور بجائے اس کے کہ آپ کی صاحب زادی آپ کو اس واقعے کی اطلاع دیتیں وہ آرام سے کسی سے ملاقات کرنے چلی گئیں۔" انسپکٹر کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔

"سوری! وہ ذرا لاابالی طبیعت کی مالک ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اکلوتی اولاد نارمل بچوں سے ذرا ہٹ کر عادت و اطوار کی مالک ہوتی ہے۔" انہوں نے تحمل سے انسپکٹر کے طنز کا جواب دیا لیکن اندر سے وہ بے حد بے چین ہوچکی تھیں۔ زیبی کے اغوا کی واردات کے فوراً بعد لبنیٰ کا مہ پارہ سے ملاقات کے لیے روانہ ہوجانا ان کے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجا رہا تھا۔ وہ اچھی طرح واقف تھیں کہ ان کی صاحب زادی اور اس کی سہیلیاں اپنی افتادِ طبع سے مجبور اب تک کوئی ایڈونچر شروع کرچکی ہوں گی۔

"میں مس لبنیٰ سے فوری طور پر ملنا چاہوں گا۔ آپ میرے سامنے انہیں کال کریں اور ابھی گھر واپس آنے کو کہیں۔" انسپکٹر نے ان سے مطالبہ کیا۔ وہ اتنی معمولی عورت نہیں تھیں کہ ایک پولیس انسپکٹر ان سے اپنے احکامات کی تعمیل کرواتا پھرتا لیکن وہ لبنیٰ کے متعلق جس تشویش میں مبتلا ہوچکی تھیں، اس کے بعد خود بھی اس سے رابطہ کرنا چاہتی تھیں۔ انہیں اس پر تھوڑا سا غصہ بھی آرہا تھا کہ اتنے نازک معاملے میں ماں باپ سے مشورہ لینے کے بجائے خود نہ جانے کیا کرنے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ ان کا یہ حال تھا کہ دن بھر کی مصروفیت کے بعد گھر پہنچ کر فریش ہونے تک کا موقع نہیں مل سکا تھا۔

"اس کا موبائل بند جارہا ہے۔" لبنیٰ کا نمبر ملانے کے بعد انہوں نے مایوسی سے انسپکٹر کو جواب دیا۔

"مس مہ پارہ سے رابطہ کریں۔" انسپکٹر نے مشورہ دیا جس پر انہوں نے فوری عمل کیا لیکن اس کا موبائل بھی آف تھا۔ اس بار انہوں نے انسپکٹر کو کچھ بتائے یا اس سے مشورہ لیے بغیر روشی اور عروج کے نمبروں پر بھی کال کرکے دیکھ لیا۔ سارے موبائل آف جارہے تھے اور یہ انتہائی تشویشناک صورتِ حال تھی۔ لڑکیوں کی طرف سے مایوس ہوکر انہوں نے ان کی ماؤں سے رابطہ شروع کیا۔ یاسمین مرزا نے بتایا کہ عروج اور مہ پارہ شاپنگ کا کہہ کر کئی گھنٹوں سے گھر سے نکلی ہوئی ہیں جبکہ آسیہ عثمان کے مطابق روشی، لبنیٰ سے ملاقات کے لیے نکلی تھی اور حقیقت یہ تھی کہ ان چاروں میں سے ایک بھی اپنی بتائی ہوئی جگہ پر موجود نہیں تھی۔ وہ کہاں تھیں؟ اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کے لیے ان کے موبائلوں سے بھی رابطہ نہیں ہورہا تھا۔ رابطہ ہوتا بھی کیسے کہ ان کے قیمتی موبائل کئی ٹکڑوں میں تقسیم سمندر کی تہ میں جو پڑے ہوئے تھے۔

☆☆☆

اس نیم تاریک اور سیلن زدہ جگہ پر سب سے پہلے مہ پارہ کی آنکھ کھلی اور آنکھ کھلتے کے ساتھ ہی اسے احساس ہوگیا کہ اس کے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے بندھے ہوئے ہیں۔ ہاتھ پشت پر باندھے گئے تھے اور جس بُری طرح سن ہورہے تھے اس سے اندازہ ہورہا تھا کہ بہت دیر سے اور بہت سختی سے بندھے ہوئے ہیں۔ اس نے دو تین گہرے سانس لے کر اپنے حواس کو پوری طرح بحال کرنے کی کوشش کی تو وہاں موجود مچھلی کی مخصوص بُو کو بھی اس کی حسِ شامہ نے شناخت کرلیا اور وہ کچھ بے چین ہوکر اپنے اطراف کا جائزہ لینے لگی۔ فوراً ہی اسے ادراک ہوگیا کہ تین اور وجود بھی اس کے آس پاس موجود ہیں۔ ناکافی روشنی کی وجہ سے کسی کی بھی شکل تو واضح نہیں تھی لیکن اسے یقین سا تھا کہ وہ تینوں عروج، روشی اور لبنیٰ ہی ہوں گی جو اسی کی طرح بے ہوشی کی حالت میں اس جگہ لائی گئی تھیں اور ہنوز بے ہوش تھیں۔ پہلو کے بل اپنی جگہ لیٹے لیٹے وہ سوچنے لگی کہ انہیں آواز دے کر ہوش میں لانے کی کوشش کرے یا انتظار کرے کہ وہ اسی کی طرح خود بخود ہوش میں آجائیں گی۔ اس عجیب سی جگہ پر

اس کی طبیعت اُلجھ رہی تھی۔ نیم تاریکی، سیلن، مچھلی کی بُو اور محسوس ہونے والی بھوک پیاس کے علاوہ بھی کچھ تھا جو انہونا اور عجیب محسوس ہو رہا تھا۔ اپنی جگہ پڑے پڑے وہ اس عجیب بات پر غور کرنے لگی۔ اس کے اس غور و خوض کے دوران اس کی تینوں ساتھی بھی ایک ایک کر کے ہوش میں آتی چلی گئیں۔ وہ سب پریشان تھیں اور ایک دوسرے کا احوال پوچھنے کے ساتھ ساتھ خود پر گزری بھی سنائی جا رہی تھیں۔ چاروں کو ہی ٹریپ کرنے کے بعد بے ہوش کر دیا گیا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ عالم بے ہوشی میں کس جگہ منتقل کر دی گئی ہیں۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی تھیں کہ انہیں ٹریپ ہونے کے بعد بے ہوشی کی حالت میں پڑے کتنی دیر گزر چکی ہے۔ ان کے ساتھ جو کچھ پیش آیا تھا وہ ڈنر ٹائم سے کافی پہلے کی بات تھی۔ اب وہ چاروں ہی پیاس کے ساتھ ساتھ بھوک بھی محسوس کر رہی تھیں اور بھوک کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ یہ صرف ایک وقت کا کھانا چھوٹنے کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ اس نیم تاریک جگہ پر ان کے پاس اپنی بھوک کی شدت کے سوا ایسا کوئی پیمانہ نہیں تھا جس سے وہ گزرتے ہوئے وقت کو ناپ پاتیں۔ بھوک کے علاوہ وہ دوسری شے جو انہیں پریشان کر رہی تھی وہ ٹھنڈک تھی۔ انہوں نے سردی کے موسم کی مناسبت سے قدرے موٹے کپڑے کے لباس تو ضرور پہن رکھے تھے لیکن لباس کے ساتھ سویٹر، جیکٹ یا شال کا استعمال نہیں کیا گیا تھا جس کی وجہ سے غیر متحرک پڑے جسم ٹھنڈک محسوس کر رہے تھے۔

"آخر ہم کس جگہ موجود ہیں؟ کم بختوں نے اغوا کیا تھا تو کسی ڈھنگ کی جگہ پر ہی رکھتے۔ یہاں تو بدبو اور ٹھنڈ نے ہی دماغ خراب کر کے رکھ دیا ہے۔" یہ بیزار کن آواز روشی کی تھی۔

"شاید ہم کسی لانچ یا شپ وغیرہ کے اسٹوریج میں موجود ہیں۔ کیا تم میں سے کسی کو محسوس نہیں ہو رہا کہ ہم جس فرش پر پڑے ہوئے ہیں، اس کے نیچے پانی حرکت کر رہا ہے؟" مہ پارہ اس عجیب محسوس ہونے والی بات کا تجزیہ کر کے نتیجہ اخذ کر چکی تھی اور اب ان پر انکشاف کر رہی تھی۔

"کیا......؟" ان کی تحیر اور خوف سے ملی جلی چیخیں نکلیں اور پھر غور کرنے پر انہیں مہ پارہ کا اندازہ درست محسوس ہونے لگا۔

"کیا ہمیں ملک سے باہر اسمگل کیا جا رہا ہے؟" لبنیٰ کے منہ سے خوف زدہ سرسراتی آواز نکلی۔

"کچھ کہنا مشکل ہے لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ ہم حرکت میں نہیں ہیں۔" مہ پارہ خود کو پُرسکون کر لینے میں کافی حد تک کامیاب ہو چکی تھی اس لیے بہتر انداز سے قائم کر رہی تھی۔

"یہ کس عذاب میں پھنس گئے ہم؟" لبنیٰ روہانسی ہوئی۔

"جس بھی عذاب میں پھنسے ہیں، اس سے نکلنے کے لیے ضروری ہے کہ اپنے حواس کو قابو میں رکھیں اور اعصابی مضبوطی کا مظاہرہ کریں۔" مہ پارہ نے سمجھایا تو دھیرے دھیرے وہ سب اس کی بات سمجھ گئیں اور پھر آپس میں مشاورت کے بعد انہوں نے طے کیا کہ آواز دے کر کسی کو متوجہ کیا جائے۔ کوئی اس جگہ آتا تو صورتِ حال تھوڑی بہت واضح ہوتی اور وہ اپنے آئندہ کا لائحہ عمل طے کر پاتیں۔ چاروں نے بیک وقت بلند آواز میں "کوئی ہے ہمیں یہاں سے نکالو" پکارنا شروع کر دیا۔ ردِعمل جلد ہی ظاہر ہوا اور قدِ آدم سے ذرا کم بلندی پر ایک چوکور خلا سا کھلا۔ اس خلا میں سے کوئی فلیش لائٹ ہاتھ میں تھامے نیچے اترنے لگا۔ لکڑی کے مختصر زینے سے اتر کر نیچے آنے والے کی شکل دیکھ کر انہیں بہت زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ یہ وہی جاوید تھا جس سے وہ اسپتال میں ملی تھیں۔ اس کے ماتھے پر اب بھی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ ہاتھ میں پکڑی فلیش لائٹ کے علاوہ اس نے شانے پر کپڑے کا ایک تھیلا بھی لٹکایا ہوا تھا۔ نیچے پہنچ کر وہ فرش پر بیٹھ گیا اور فلیش لائٹ ایک کونے میں ٹکانے کے بعد شانے سے تھیلا اتار کر اس میں موجود سامان نکالنے لگا۔ یہ پانی کی بوتلیں اور کھانا وغیرہ تھا جس کی خوشبو اُن کے بھوکے معدوں کو بے چین کر گئی تھی۔ تاہم انہوں نے بے صبری کا مظاہرہ نہیں کیا اور جاوید کو کڑے تیوروں سے گھورتی رہیں۔

"تو اس سب کے پیچھے تم ہو؟" آخر مہ پارہ نے سب سے پہلے زبان کھولی۔

"میں نہیں تم لوگ خود۔ تم لوگ اپنی حماقت کی وجہ سے اس جنجال میں پھنسی ہو۔" اس نے بہت تحمل سے اس کی بات کا جواب دیا۔

"مطلب؟"

"زیبی چھوٹے علاقے کی رہنے والی کم عمر اور سیدھی سادی لڑکی ہے۔ اس نے میری بات نہیں سمجھی لیکن تم لوگوں کو سمجھنی چاہیے تھی۔ میرا پیغام پڑھنے کے بعد بجائے یہ کہ اسے سمجھاتی بجھاتیں، تم لوگ ایجنٹ زیرو زیرو سیون بن کر مجھ تک پہنچ گئیں اور میرے، زیبی اور اپنے، سب کے لیے

مشکل کھڑی کردی۔" اب اس کے چہرے پر ہلکی سی ناراضی کے تاثرات تھے۔

"کیا تم ہمیں تفصیل سے کچھ بتاؤ گے؟" واہ رے تجسس...... بندھے ہاتھ پیروں کے ساتھ نیم تاریک اور بدبودار جگہ پر قید ہونے کے باوجود "حقیقت" جان لینے کی تمنا بیدار تھی۔

"تفصیل کچھ خاص نہیں۔ میں کمپیوٹر میں اچھا ہوں۔ لیکن میرے پاس اس فیلڈ میں بہت اوپر تک جانے کے مواقع نہیں تھے۔ سب نوجوانوں کی طرح مجھے بھی اپنا اسٹینس ہائی کرنے کی فکر رہتی تھی۔ اس چکر میں، میرا کچھ ایسے لوگوں سے واسطہ پڑ گیا جو مجھ جیسے لوگوں کی خدمات سے فائدہ اٹھا کر اپنا گینگ چلا رہے ہیں۔ میں ہیکنگ کے ذریعے لوگوں کے اکاؤنٹس سے پیسے اڑانے، بلیک میلنگ اسٹف جمع کرنے اور دوستی کے نام پر لڑکیوں کو ورغلانے جیسے سارے کام گینگ کے لیے کرتا رہا ہوں۔ بدلے میں گینگ مجھے تحفظ اور رقم دونوں فراہم کرتا تھا لیکن......"

"لیکن کیا......؟" اس کے ذرا سے توقف نے لبنیٰ کو بے چینی سے سوال کرنے پر اکسایا۔

"لیکن زیبی والے معاملے کی وجہ سے میں گینگ کے زیر عتاب آ گیا۔ زیبی اپنی خوب صورتی کی وجہ سے نظروں میں آئی تھی۔ میں نے اسے ٹریپ کر لیا تو ان لوگوں نے نیو ائر نائٹ پر اسے ایک شوقین کو پیش کرنے کے لیے ایڈوانس میں سودا بھی کر لیا۔ میں پلان کے مطابق زیبی کو اس کے گھر سے نکلنے کے لیے بھی راضی کر چکا تھا لیکن جب مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ ماسٹر ایوب کی بیٹی ہے تو میں نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ میں غریب اور یتیم تھا اور ماسٹر صاحب کے شہر کے قریب ہی ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ ایک بار وہ گاؤں آئے اور انہیں میرے بارے میں معلوم ہوا کہ میں ایک ذہین طالب علم ہوں لیکن وسائل کی عدم دستیابی میری تعلیم کے لیے رکاوٹ ہے تو انہوں نے میرے تعلیمی اخراجات اپنے سر لے لیے۔ ان ہی کی مہربانی سے میں میٹرک کر سکا اور پھر بہتر مواقع کے لیے کراچی آ کر ہاتھ پیر مارتا رہا۔ یہاں میں نے بہت مشکل زندگی گزاری اور گاؤں سمیت ماسٹر ایوب سے بھی رابطہ ٹوٹ گیا لیکن وہ مجھے کبھی بھولے نہیں اور جب میں نے انہیں زیبی کے والد کے روپ میں دیکھا تو فیصلہ کر لیا کہ اپنے محسن کو ہرگز بھی اتنا بڑا دکھ نہیں پہنچنے دوں گا لیکن قسمت کی خرابی سے میں اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا۔"

"جب ہم اسپتال میں تم سے ملنے آئے تھے تو تم انجان بننے کے بجائے ہمیں اس سلسلے میں کوئی اشارہ دے سکتے تھے لیکن تم نے تو الٹا زیبی کو میرے گھر سے اغوا کروا لیا۔" لبنیٰ اس پر برہم ہوئی۔

"انجان بننا زیبی کو بچانے کی ایک کوشش تھی۔ تم نہیں جانتی تھیں لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ پاگلوں کی طرح زیبی کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ انہیں پتا چل گیا تھا کہ میں نے زیبی کو روکنے کے لیے پیغام بھیجا ہے۔ وہ میری اس جرأت کے لیے مجھے سزا دینا چاہتے تھے۔ میں ان سے بچنے کے چکر میں ہی اپنا ایکسیڈنٹ کروا بیٹھا تھا۔ خوش قسمتی سے ان کے ہاتھ لگنے سے پہلے لوگوں نے مجھے اسپتال پہنچا دیا اور وہ لوگ مجھے بے ہوش پا کر خود زیبی کے حصول کے لیے سرگرم ہو گئے۔ انہیں پتا چل گیا تھا کہ زیبی کا موبائل بند ہے اور اس نے میرا بھیجا جانے والا پیغام ابھی تک نہیں کھولا ہے۔ یہ صرف زیبی کی خوش قسمتی تھی کہ وہ غلط اسٹیشن پر اترنے کی وجہ سے ان کے ہاتھ نہیں لگ سکی۔ بعد میں انہوں نے معلوم کروا لیا کہ وہ اپنے گھر سے نکل چکی ہے۔ لانڈھی اسٹیشن پر انہیں اس کی کوئی فوٹیج بھی مل گئی لیکن سارے شہر میں اسے ڈھونڈنے کے باوجود وہ اس تک نہیں پہنچ سکے۔ پہنچ بھی نہ پاتے اگر تم لوگ مجھے ڈھونڈتی ہوئی پہلے میرے اپارٹمنٹ اور پھر اسپتال نہ پہنچی ہوتیں۔"

"ہم نے کوئی غلط کام نہیں کیا تھا۔ ہم تو زیبی کی مدد کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ ہمارا واسطہ ایک کرمنل سے پڑ گیا ہے۔" بار بار خود کو موردِ الزام ٹھہرائے جانے پر روشی نے خفگی کا اظہار کیا۔

"تم لوگوں کی غلطی میں بعد میں سمجھاتا ہوں۔ پہلے ایسا کرو کہ کھانے پینے کا سلسلہ شروع کر دو۔ تم چاروں سترہ اٹھارہ گھنٹے سے اوپر بے ہوش رہی ہو اور مجھے اندازہ ہے کہ بھوک پیاس تم لوگوں کو پریشان کر رہی ہو گی۔ میں تم میں سے صرف ایک کے ہاتھ کھولوں گا۔ اسے خود بھی کھانا پینا ہو گا اور باقی تین کو بھی کھلانا پلانا ہو گا۔" اس نے چاروں کو تولنے والی نظروں سے دیکھا اور شاید اسے لگا کہ ان سب میں عروج سب سے زیادہ معصوم ہے اس لیے اس کے ہاتھ کھول دیے۔

"یہ کھلانے پلانے کا کون سا طریقہ ہے؟ تمہیں ہم سب کو اپنے ہاتھ سے کھانے کا موقع دینا چاہیے۔ اس طرح ہمیں تھوڑی دیر کے لیے تکلیف سے بھی نجات مل جائے گی۔" لبنیٰ نے اس طریقہ کار پر اعتراض کیا۔

''سوری بے بی! میں تم لوگوں کے ساتھ اس سے زیادہ نرمی نہیں برت سکتا۔'' اس نے بھی فوراً بیگانگی اختیار کرلی۔ مہ پارہ نے لبنیٰ سمیت باقی ساتھیوں کو نظروں نظروں میں اشارہ کیا کہ جیسا چل رہا ہے چلنے دو۔ حقیقتاً انہیں غذا اور پانی کی ضرورت تھی دوسرے وہ انہیں بہت سی معلومات فراہم کررہا تھا۔ اس لیے یہ مناسب نہ ہوتا کہ وہ ناراض ہوکر وہاں سے چلا جاتا۔ انہوں نے مہ پارہ کا مقصد سمجھ لیا اور اپنے اعتراض سے دستبردار ہوگئیں۔

''گڈ! اسی طرح تعاون کرکے تم لوگ اپنے حق میں اچھا کروگی۔ واضح طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ تم چاروں کو کتنی مدت کے لیے یہاں رہنا پڑے گا۔ بھوک پیاس بڑی ظالم شے کا نام ہے خاص طور پر تمہاری کلاس کے لوگ جنہیں ان عذابوں کا عملی تجربہ نہیں ہوتا، اس اذیت کو بالکل نہیں سہہ سکتے۔ تم یوں ہی تعاون کرتی رہیں تو میں اس سہولت کی پابندی سے فراہمی کا ذمہ اپنے سر لیتا ہوں۔''

''تم ہماری فکر چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ ہم نے اسپتال پہنچ کر کیا غلطی کی؟'' غیر معینہ مدت کے لیے اس حالت میں رہنے کا تصور خوفناک تھا لیکن خود کو کمزور ظاہر کرنے کے بجائے مہ پارہ نے اسے گفتگو کا سلسلہ دوبارہ جوڑنے پر راغب کیا۔

''ان لوگوں کا خیال تھا کہ شاید میں نے زیبی کو اپنے اپارٹمنٹ کا پتا بتا رکھا ہو اس لیے اس کی آمد کی امید پر ایک بندہ وہاں نگرانی کررہا تھا۔ تم لوگ میرا معلوم کرتے ہوئے وہاں پہنچیں تو تمہارا تعاقب شروع ہوگیا۔ تم میرے پاس اسپتال آئیں تو یہ بھی پتا چل گیا کہ زیبی تمہارے پاس ہے۔ تم لوگوں کے پیچھے لگ کر انہوں نے زیبی کا ٹھکانا دیکھ لیا اور میرے نام سے فون کال کرکے اسے باہر بلانے اور اغوا کرنے میں کامیاب ہوگئے۔'' اس نے واضح کردیا کہ کس طرح زیبی ان کی وجہ سے پھنس گئی تھی۔

''ٹھیک ہے، یہ تو سمجھ آگئی کہ کیسے زیبی اغوا ہوئی لیکن اس کے بعد ہم لوگوں کو بھی زیبی کے ذریعے کیوں ٹریپ کیا گیا؟'' روشی نے اسے گھورا۔

''آئی ایم سوری لیکن یہ میرا آئیڈیا تھا۔'' اس کے جواب پر وہ چاروں کھانا بھول کر اسے دیکھنے لگیں۔

''مجھے اپنے ایک ذریعے سے پتا چل گیا تھا کہ میری کوشش کے باوجود زیبی پھنس چکی ہے۔ میں نے باس سے رابطہ کیا اور زیادہ مالی فائدے کی یقین دہانی پر اسے اس بات پر راضی کرلیا کہ وہ زیبی کو واپس اس کے گھر جانے دے گا۔'' اس نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ ان چاروں کے حیران چہروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم نے تاوان کے لیے ہمیں ٹریپ کیا ہے؟'' عروج سب سے پہلے نتیجے پر پہنچی۔ گفتگو کے اس موڑ پر وہ ایسی کیفیت میں مبتلا ہوچکی تھیں کہ عروج ان کے منہ میں لقمے ڈالنا اور وہ کھانا فراموش کرچکی تھیں۔

''ہاں، اسپتال میں تم لوگوں سے ملنے کے بعد میں اندازہ لگا چکا تھا کہ تم اپر کلاس کی تھرل اور ایڈونچر پسند لڑکیاں ہو اور تمہیں تمہاری نیچر کے ذریعے ٹریپ کیا جاسکتا ہے۔ پہلی امید تو یہی تھی کہ زیبی کے اغوا کا معلوم ہونے پر تم لوگ سیدھی میرے اپارٹمنٹ یا اسپتال کا رخ کروگی اس لیے دونوں مقامات پر بندے تیار کردیے گئے۔ اسپتال کے باہر پارکنگ سے صرف دو کو ٹریپ کیا جاسکا لیکن ایک کے موبائل سے پتا چلا کہ باقی دو اپارٹمنٹ پہنچنے والی ہیں۔ احتیاطاً زیبی سے بھی ایک فون کال کروادی گئی اور یوں ہمارا کام مکمل ہوگیا۔'' وہ خوش اور مطمئن نظر آرہا تھا۔

''زیبی نے تو بڑی احسان فراموشی کا مظاہرہ کیا۔ ہم نے اس کی اتنی مدد کی اور اس نے ہمیں یہ صلہ دیا۔'' لبنیٰ کو صدمہ ہوا۔

''زیبی نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ وہ سچ مچ بڑی معصوم اور بھولی ہے۔ میں اس سے ملا اور میں نے اسے بہلا پھسلا کر اس سے جو کچھ کرنے کو کہا، وہ کر بیٹھی۔ اسے تو بالکل آخر میں سمجھ آیا کہ اس کی وجہ سے تم لوگ مشکل میں پڑ گئی ہو اور یقین جانو کہ وہ اتنی پریشان ہے کہ مجھ سے بھی ناراض ہوگئی ہے۔'' اس نے ہنس کر بتایا۔

''تم جیسا مکار آدمی ہرگز بھی اس لائق نہیں ہے کہ زیبی جیسی معصوم لڑکی تم سے محبت کرے۔'' زیبی کی احسان فراموشی کا رونا رونے والی لبنیٰ فوراً ہی اس کی طرف دار بن گئی۔

''میری بھی یہی رائے تھی اور اسی لیے میں نے اُسے محفوظ رکھنے کی پوری کوشش بھی کی تھی لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ قدرت کچھ اور چاہتی ہے۔ میں نے بڑی مشکل زندگی گزاری ہے اور ہمیشہ محبتوں سے محروم رہا ہوں تو شاید میری اس محرومی کو دور کرنے کے لیے اللہ نے زیبی کو میرے پاس بھیج دیا ہے۔ ماسٹر صاحب کے لیے تو شاید اب اس کی واپسی قابل قبول نہ ہو تو میں سوچ رہا ہوں کہ اسے اپنے ساتھ لے کر دبئی چلا جاؤں گا۔ میں نے اب تک جو کچھ کمایا ہے، وہ دبئی کے ایک خفیہ اکاؤنٹ میں محفوظ ہے۔ خود کو

نمایاں نہ کرنے کے لیے میں یہاں بہت عام سی اور شریفانہ زندگی گزار رہا تھا اور شروع سے میرا یہ پروگرام تھا کہ مناسب وقت پر دبئی شفٹ ہو جاؤں گا۔ خوب صورت محبت کرنے والی بیوی اور بہت سا پیسا پاس ہوگا تو ساری زندگی کی محرومیوں کا ازالہ ہو جائے گا۔" وہ اپنے طے کردہ پروگرام پر بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ ان چاروں ہی نے اس پر افسوس محسوس کیا۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جس نے شاید کبھی اس بات پر غور نہیں کیا تھا کہ اس کی زندگی میں مشکلات اور محرومیاں تھیں تو اللہ نے ماسٹر ایوب اور نہ جانے اُن جیسی اور کون کون سی آسانیاں بھی ساتھ ساتھ فراہم کی تھیں۔ آج وہ اس لائق ہو چکا تھا کہ شاہانہ نہ سہی باعزت اور آرام دہ زندگی گزار سکتا تھا لیکن اس کے لالچ نے اسے اللہ کی مہربانیاں محسوس کرنے کی صلاحیت سے محروم کر کے تاریک راہوں کا مسافر بنا دیا تھا۔

☆☆☆

اس وقت تین گھروں میں پریشانی نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ ان چاروں کے غیاب کا علم ہوتے ہی ان کی تلاش کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا لیکن تمام تر وسائل بروئے کار لانے کے باوجود صرف ان کی گاڑیوں اور کچھ فوٹیجز کی دستیابی تک ہی بات محدود تھی۔ ان غیر معیاری فوٹیجز میں گھر والوں نے لڑکیوں کو تو کسی نہ کسی طرح شناخت کر لیا تھا لیکن ان کے اغوا کاروں کے چہرے بالکل بھی قابلِ شناخت نہیں تھے۔ جاوید کے اپارٹمنٹ تک البتہ رسائی حاصل کر لی گئی تھی لیکن وہ خود گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب تھا۔ اس کے پڑوسیوں اور کولیگز کی کم بختی آ گئی تھی لیکن وہ بے چارے اس کے بارے میں اس سے زیادہ کوئی بات نہیں بتا سکے تھے کہ وہ ایک شریف لڑکا تھا جس کا دنیا میں کوئی سگا خونی رشتہ موجود نہیں تھا۔

پولیس اپنے طور پر اس کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی تھی۔ موبائل کے ذریعے بھی اسے ٹریس کرنے کی کوشش کامیاب نہیں ہو سکی تھی کہ اس کا موبائل بیچ حادثے میں پہلے ہی ضائع ہو چکا تھا۔ لوگوں سے پوچھ گچھ کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکل رہا تھا۔ پولیس کی خراب شہرت کی وجہ سے لوگ اگر کچھ جانتے بھی ہوں تو تعاون سے گریز کرتے ہیں۔ صرف جاوید کی ایک پڑوسن نے کچھ کارآمد باتیں بتائی تھیں۔ اس نے چاروں لڑکیوں کی تصویریں دیکھ کر تصدیق کر دی تھی کہ ایک دن قبل یہ چاروں لڑکیاں جاوید کے بارے میں معلوم کرتی ہوئی وہاں آئی تھیں۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ کل شام جاوید ایک لڑکی کے ساتھ اپنے اپارٹمنٹ آیا تھا اور تھوڑی دیر بعد ان چاروں میں سے ایک لڑکی (روشی) کو بھی اس نے وہاں آتے ہوئے دیکھا تھا لیکن وہ یہ نہیں بتا سکی تھی کہ روشی واپس گئی تھی یا نہیں۔ البتہ اس نے یہ ضرور بتایا تھا کہ جاوید نے دو آدمیوں کی مدد سے کمبل، لحاف اور گدے سمیت کچھ دوسرا سامان وہاں سے منتقل کیا تھا لیکن وہ اتنی جلدی میں تھا کہ اپنے سر پر بندھی پٹی اور سامان کی منتقلی کے حوالے سے کیے جانے والے پڑوسن کے سوالوں کو ٹال دیا تھا۔ سب کا اندازہ تھا کہ سامان کی آڑ میں روشی کو بے ہوشی کی حالت میں وہاں سے منتقل کیا گیا تھا لیکن کہاں؟ اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ جاوید کے اپارٹمنٹ کی تلاش کا بھی کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا تھا اور اس کا نام سامنے ہونے کے باوجود وہ اس کو تلاش کرنے میں ناکام تھے۔

پوری رات اور آدھا دن گزر جانے کے باوجود ناکامی کسی طرح کامیابی میں بدلنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ ہر سال جوش و خروش سے نئے سال کا استقبال کرنے والے چاروں لڑکیوں کے والدین کو ہوش بھی نہیں تھا کہ چند گھنٹوں کے بعد ایک نیا سال شروع ہونے والا ہے۔ پہاڑ کی طرح کٹنے والے وقت کا ایک ایک منٹ اُن پر بھاری تھا اور مایوسی کی تاریکی پھیلاتا جا رہا تھا۔ اس تاریکی میں تاوان کے سلسلے میں آنے والی پہلی کال ان کے لیے امید کی کرن بن کر چمکی۔ کال ڈاکٹر یوسف کے گھر کے نمبر پر آئی تھی۔ چاروں لڑکیوں کی واپسی کے لیے ایک بہت بڑی رقم کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ کال کرنے والے نے کوئی پابندی نہیں لگائی کہ وہ پولیس یا کسی دوسرے ادارے کو مطلع نہیں کریں گے۔ اس نے دوٹوک الفاظ میں تاوان کا مطالبہ کر کے صرف یہ بتایا تھا کہ ان کے پاس بارہ گھنٹے کی مہلت ہے۔ بارہ گھنٹے بعد وہ صرف ایک کال مزید کر کے انہیں رقم کی منتقلی کا طریقہ بتائے گا۔ اس کے علاوہ نہ کوئی رابطہ ہوگا اور نہ بارگیننگ۔ اگر ان لوگوں نے بتائے ہوئے طریقہ کار کے مطابق رقم منتقل کر دی تو لڑکیاں انہیں مل جائیں گی۔ دوسری صورت میں وہ ان کی لاشیں شہر کے کسی حصے سے خود ڈھونڈ لیں۔

یہ ایک خوفناک صورت حال تھی۔ خفیہ ادارے تک چکرا گئے تھے۔ اغوا کار عموماً یہ رویہ اختیار نہیں کرتے۔ ان کی طرف سے رابطوں، دھمکیوں اور بارگیننگ کا سلسلہ جاری رہتا ہے لیکن یہاں صرف ایک کال آئی تھی جو ٹریس

نہیں ہو سکی تھی۔

کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کال کرنے والا دبئی میں بیٹھا ہے کہ کینیڈا میں...... جدید ٹیکنالوجی کے منفی استعمال کی تباہ کاریاں سب کے سامنے تھیں۔ ایسے میں تینوں فیملیز کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ وہ تاوان کی ادائیگی کے لیے رضامندی ظاہر کر دیں لیکن صورت حال بے حد غیر واضح تھی۔ کال کرنے والے نے ذرا بھی وضاحت نہیں کی تھی کہ ان کی بیٹیاں کب اور کس طرح واپس لوٹائی جائیں گی۔ رقم ادا کرنے کے باوجود لڑکیوں کے نہ ملنے کا احتمال تھا اس حوالے سے مختلف پہلوؤں اور امکانات کا جائزہ لیا جا رہا تھا لیکن خواتین صرف ایک نکتے پر متفق تھیں کہ تاوان ادا کر کے لڑکیوں کی واپسی کو ممکن بنایا جائے۔ مسئلہ مشترکہ تھا اس لیے ڈاکٹر ایس یوسف نے باقی دونوں فیملیز کو بھی اپنے گھر پر ہی اکٹھا کر لیا تھا۔ وہ تین بہترین وسائل رکھنے والے خاندان تھے جن کے ساتھ پولیس اور دیگر ادارے اس حد تک تعاون کر رہے تھے کہ اغوا کی خبر میڈیا تک بھی نہیں پہنچنے دی گئی تھی۔ جنہیں بھنک پڑ چکی تھی انہیں بھی زباں بندی کا حکم تھا۔ سرگرمی سے جاری تلاش کی ساری کوششیں ناکام تھیں۔ ماں باپ کے عہدے پر فائز ان چھ افراد کی سانسیں فون کی اس گھنٹی سے بندھ گئی تھیں جسے بارہ گھنٹے کی مہلت ختم ہونے کے بعد بجنا تھا۔

☆☆☆

''کیا ہم سچ مچ اغوا ہو چکے ہیں؟'' جاوید، عروج کے ہاتھ پیر دوبارہ باندھنے کے بعد واپس جا چکا تھا اور وہ چاروں ایک بار پھر نیم تاریکی میں بے بسی سے ایک دوسرے کے نقوش کھوجنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ایسے میں لبنیٰ کے منہ سے نکلنے والے اس جملے نے مہ پارہ کو بھنا کر رکھ دیا اور غصے سے بولی۔

''بندھی ہوئی حالت میں ایسی اندھیری اور بدبودار جگہ پر پڑی ہوئی ہو پھر بھی تمہیں یقین نہیں آرہا کہ ہم اغوا ہو چکے ہیں؟''

''سب لوگ کتنے پریشان ہوں گے۔ پتا نہیں ان لوگوں نے کتنا تاوان مانگا ہوگا۔ ہمارے والدین تاوان کی رقم ارینج کرنے کے ساتھ ساتھ خوف زدہ بھی ہوں گے کہ پتا نہیں ہمارے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہوگا۔ ان کرمنلز کا کوئی بھروسا تو نہیں ہوتا، یہ تاوان لے کر بھی مغویوں کو قتل کر دیتے ہیں۔'' لبنیٰ عجیب سی کیفیت میں تھی اور اس پر مہ پارہ کی جھاڑ کا کوئی اثر نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ بول بھی ایسے رہی تھی جیسے خود کلامی کر رہی ہو۔

''اتنا آسان نہیں ہے ہمیں قتل کرنا۔ مجھے یقین ہے کہ ہمیں تلاش کرنے کے لیے ڈیڈ اپنے سارے رابطے استعمال کر رہے ہوں گے اور وہ لوگ بہت جلد ہمیں ڈھونڈ نکالیں گے۔'' لبنیٰ کی بات پر ایک جھرجھری سی لے کر عروج نے اسے اور خود کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

''عروج ٹھیک کہہ رہی ہے لبنیٰ! ہمارے ماں باپ اتنے گئے گزرے لوگ نہیں ہیں کہ ہمارے اغوا کی خبر سن کر بے بسی سے بیٹھ جائیں۔ انہوں نے ہماری تلاش میں کئی اداروں کو ہلا کر رکھ دیا ہوگا۔ تم فکر نہ کرو جلد کوئی نہ کوئی ہمیں تلاش کرتا ہوا یہاں پہنچ جائے گا۔'' روشی بھی لبنیٰ کو امید دلا رہی تھی لیکن اس کی آواز کی کپکپاہٹ سے ظاہر تھا کہ اس کے لیے بھی یہ صورت حال خوفناک ہے۔

مہ پارہ نے اپنی ساتھیوں کے احساسات کو پوری طرح محسوس کیا۔ اسے محسوس کرنا ہی تھا کہ وہ خود بھی اسی صورت حال میں پھنسی ہوئی تھی۔ اس کے ذہن میں بھی بہت سے خدشات سنپولیوں کی طرح رینگ رہے تھے لیکن ساتھ ہی اس کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ یوں خوف زدہ ہو کر تن بہ تقدیر ہو بیٹھنا بھی مسئلے کا حل نہیں ہے اور انہیں کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔ کیا......؟ یہ ابھی طے نہیں تھا لیکن یہ طے تھا کہ وہ پرل گروپ کو حوصلہ ہار کر بیٹھنے نہیں دے گی۔ اس عزم کے بعد...... وہ گلا کھنکھار کر ساتھیوں سے مخاطب ہوئی۔

''لسن ہی کیئرفلی گرلز! یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ کیا آپ بھول گئی ہیں کہ ہم پرل ہیں اور پرل کا مطلب ہے سر سر بہتا...... بہتا پانی اپنی راہیں خود بنانا جانتا ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ہمارے پاس اپنی راہ بنانے کے لیے کوئی طریقہ نہیں ہوگا۔ طریقہ ضرور ہوگا...... بس ہمیں اس کے بارے میں سوچنا اور غور کرنا ہے تب ہی ہم کوئی بہتر حکمت عملی تیار کر سکیں گے۔'' اس کے ہمت اور حوصلے سے کہے گئے ان چند جملوں نے ان تینوں کو گویا جھنجوڑ کر جگا دیا اور وہ خوف کی عارضی کیفیت سے نکل کر اس انداز میں سوچنے لگیں جو اُن کے گروپ کا خاصہ تھا۔

''سنو! میرے خیال میں میرے پاس ایک ایسی شے موجود ہے جو ہمیں اس مشکل سے نکالنے میں بہت مدد دے سکتی ہے۔ میں اپنے ساتھ......'' روشی نے اس شے کا نام بتایا جو اس صورت حال میں ان کی مددگار ثابت ہو سکتی تھی۔ سن کر سب کے چہرے خوشی سے چمکنے لگے اور وہ کچھ کر

گزرنے کے لیے پُرجوش نظر آنے لگیں۔

☆☆☆

چھوٹے سے کیبن میں بیٹھی زیبی کے چہرے پر بے چینی اور افسردگی کے تاثرات تھے۔ وہ خود کو مطمئن کرنا چاہ رہی تھی لیکن اسے اپنی اس کوشش میں کامیابی نہیں ہو رہی تھی اور دل و دماغ عجیب جنگ کی سی کیفیت میں تھے۔

”ہیلو سوئٹ ہارٹ کیا سوچ رہی ہو؟“ اچانک ہی جاوید وہاں آ گیا تو وہ اپنی سوچوں سے نکل کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”میری باس سے بات ہو گئی ہے۔ آج نیو ایئر پارٹی میں، میں تمہیں سب کے سامنے انگیج منٹ رنگ پہناؤں گا اور پھر دبئی پہنچ کر ہم شادی کر لیں گے۔ آج کی پارٹی کی شان و شوکت دیکھ کر تم اپنی ساری اداسی بھول جاؤ گی۔ تمہارے جان پہچان والوں میں سے کسی بھی لڑکی کی انگیج منٹ اتنے شاندار طریقے سے نہیں ہوئی ہو گی۔ تمہاری زندگی بدل چکی ہے زیبی اور ابھی مزید بدلے گی۔“ جاوید خاصا خوش نظر آ رہا تھا اور چاہتا تھا کہ زیب النسا بھی خوش نظر آئے۔

”ان چاروں کا کیا ہو گا جاوید! وہ میری محسن ہیں اور میں نہیں چاہتی کہ انہیں کوئی نقصان پہنچے۔“ اپنی زندگی بدلنے کی خوش خبری سے زیادہ وہ ان چاروں کے لیے فکر مند تھی۔

”ڈونٹ وری ڈارلنگ! انہیں کچھ نہیں ہو گا۔ تاوان کی وصولی کے بعد ہم انہیں ان کے گھر بھجوا دیں گے اور وہ پہلے کی طرح ہنسی خوشی رہنے لگیں گی۔ تم خود کو ان فکروں میں مت کھپاؤ اور اپنی آنے والی زندگی کے لیے اچھے اچھے خواب دیکھو۔“ جاوید نے اس کی حسین صورت کو دیکھتے ہوئے تسلی دی۔ وہ اپنی تصویروں سے کہیں بڑھ کر خوب صورت تھی۔ ماسٹر ایوب کے احسانات کا بدلہ چکانے کے علاوہ یہ اس کی خوب صورتی ہی تھی کہ جاوید نے اسے ہمیشہ کے لیے اپنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

”خواب دیکھنا تو چاہتی ہوں پر بار بار ابا اور اماں کی شکلیں سامنے آ جاتی ہیں۔ میں نے ان کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔“ گھر کی دہلیز چپکے سے پار کر لینے والی ہر لڑکی کی طرح اب اس کے دل میں بھی پچھتاووں نے جنم لینا شروع کر دیا تھا۔ جاوید اس صورتِ حال پر بیزار ہوا لیکن اپنی اس بیزاری کو چھپا کر پیار سے بولا۔

”پریشان مت ہو ہنی! ایک بار شادی ہو جائے تو ہم

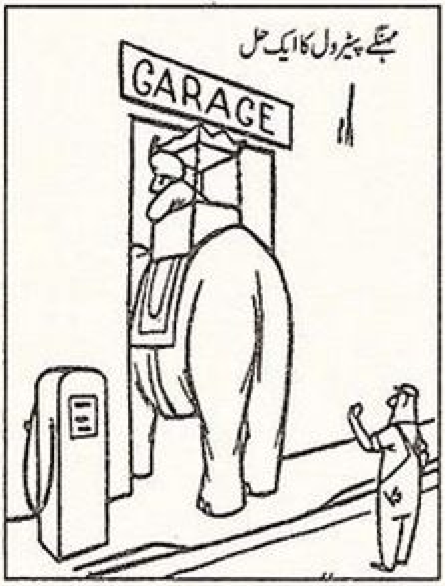
مہنگے پیٹرول کا ایک حل
GARAGE

انہیں منا لیں گے۔ میں خود ماسٹر صاحب کے پاؤں پکڑ کر ان سے معافی مانگوں گا۔ وہ معاف کر دیں گے۔ ماں باپ اپنی اولاد سے زیادہ دن ناراض رہ ہی نہیں سکتے۔“

”اچھا جی۔“ وہ قائل ہوئی یا نہیں لیکن فرمانبرداری کا مظاہرہ کیا۔

”ویری گڈ، اب تم اپنا موڈ ٹھیک کر لو۔ میں نے پارٹی میں پہننے کے لیے تمہارے لیے اسپیشل ڈریس کا آرڈر دیا ہے جو پہنچنے ہی والا ہو گا۔ ہماری ایک ساتھی مس لیتا تمہیں ڈریس کے حساب سے تیار کر دیں گی۔ تم ان کے ساتھ کوآپریٹ کرنا۔ میری تم سے اب پارٹی میں ہی ملاقات ہو گی۔ مجھے بہت سے انتظامات دیکھنے ہیں۔ تم جب تک آرام کرو بلکہ سو جاؤ۔ نیو ایئر نائٹ کا فنکشن پوری رات چلتا ہے اس لیے تمہارے لیے اس وقت تھوڑی نیند لے لینا فائدہ مند رہے گا۔“ اسے بچوں کی طرح بہلاتا اب کچھ عجلت میں نظر آ رہا تھا۔ اپنے آقاؤں کو خوش اور راضی رکھنے کے لیے اسے خود کو بہت فعال اور کارآمد ظاہر کرنا تھا اس لیے پارٹی کے انتظامات کرنے والوں میں اسے سب سے زیادہ پیش پیش رہنے کی ضرورت تھی۔

”اوکے، پھر میں چلتا ہوں تم آرام کرو۔“ وہ زیبی کا رخسار تھپتھپا کر جانے کے لیے مڑا۔

”جاوید۔“ یک دم ہی زیبی نے اسے پکارا تو وہ واپس پلٹا۔

"ان چاروں کا بہت خیال رکھنا۔" اس نے گویا التجا کی۔

"ڈونٹ وری بے بی، میں تمہارے کہے بغیر بھی اُن کا خیال رکھ رہا ہوں۔" اس نے تسلی دی اور باہر نکل گیا۔

☆☆☆

اس نیم تاریک اور سیلن زدہ جگہ پر ان چاروں کی آزادی کے لیے جدوجہد جاری تھی۔ پہلے مرحلے میں انہوں نے ایک دوسرے کی طرف پشت کر کے ہاتھوں کی بندشیں کھولنے کی کوشش کی تھی لیکن بہت دیر کی جدوجہد کے بعد بھی انہیں اس کوشش میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی تھی۔ ایک تو گرہیں تھیں ہی بہت پیچیدہ دوسرے اپنی پشت کی طرف بغیر دیکھے انہیں کھولنا مزید مشکل کام تھا۔ وہ اس مشکل کو سر نہ کر سکیں تو دوسری تدبیر سوچی اور اس تدبیر پر عمل کرتے ہوئے انہیں سخت جدوجہد اور تکلیف کا سامنا تھا۔ وہ اب بندشوں کو کھولنے نہیں بلکہ کاٹنے کی کوشش کر رہی تھیں وہ بھی اپنے دانتوں سے۔ سب سے پہلے روشی کی بندشیں کھولنے کا فیصلہ کیا گیا تھا اور باری باری تینوں اس مقصد کے لیے کوششیں کر رہی تھیں۔ انسانی دانتوں سے نائیلون کی مضبوط رسی کو کاٹنا وہ بھی تاریکی میں اور ایسی صورت میں کہ کاٹنے والیوں کے اپنے ہاتھ پاؤں بندشوں میں جکڑے ہوئے تھے کوئی آسان بات نہیں تھی۔ رسی نے کسی کے مسوڑھے چھیل ڈالے تو کسی کے ہونٹوں سے خون چھلک پڑا لیکن انہوں نے اپنی جدوجہد ترک نہیں کی۔ دوسری طرف روشی بھی بے پناہ صبر و ضبط کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ کلائیوں میں گڑتی رسی خون کی روانی میں مزاحم تھی تو کئی بار اپنی ہی ساتھیوں کے دانت بھی کلائی میں گڑ کر اس کے ضبط کا امتحان لے چکے تھے۔ وہ تینوں اپنی طرف سے احتیاط تو کر رہی تھیں۔ لیکن بندھے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ سینے کے بل اوندھا لیٹ کر دانتوں سے رسی کو کاٹنے کا عمل آسان نہیں تھا۔ روشنی بھی نہ ہونے کے برابر تھی اس لیے بار بار اندازے کی غلطی ہو جانا ایک فطری بات تھی۔ بہرحال اس بار اُن کی جدوجہد رنگ لائی اور طویل، مسلسل اور دانتوں پسینہ لے آنے والی محنت کے بعد، بالآخر روشی کی کلائیاں بندشوں سے آزاد ہو گئیں۔ کچھ دیر تو وہ کلائیوں کو حرکت دے کر خون کی روانی بحال کرنے کی کوشش کرتی رہی پھر مہ پارہ کی بندشیں کھولنے لگی۔

"مجھے یاد نہیں کہ ارتقا کی کڑیوں کو بیان کرتے ہوئے ڈارون نے کسی جگہ چوہوں کا ذکر کیا ہے یا نہیں لیکن تم تینوں نے جس طرح آج اپنے دانت استعمال کیے ہیں اس کے بعد میں قائل ہو گئی ہوں کہ کم از کم تم تینوں کے اندر چوہوں کے کچھ نہ کچھ جینز موجود ہیں۔ میرا ارادہ ہے کہ یہاں سے آزادی پانے کے بعد میں "چوہے بھی انسانوں کے رشتے دار تھے" کے نام سے ایک تحقیقی مقالہ لکھوں گی اور اس مقالے میں تم تینوں کی اس جدوجہد کا خصوصی ذکر کیا جائے گا۔" ہاتھوں کے ساتھ ساتھ اس کی زبان بھی تیزی سے حرکت کر رہی تھی۔

"تم ہمارے ہاتھ آزاد ہو جانے دو پھر ہم تمہاری جو چیر پھاڑ کریں گے، اس کے بعد انشاء اللہ تم ارتقا کی کڑی میں شیر اور چیتوں کو بھی شامل کرنے پر مجبور ہو جاؤ گی۔" اپنے منہ میں گھلتے خون کے نمکین ذائقے کو محسوس کرتے ہوئے عروج نے اندھیرے میں اسے گھورنے کی کوشش کی۔ وہ اس کا گھورنا تو نہیں دیکھ سکی تھی لیکن لہجے کی تپش خوب محسوس کی اور محظوظ ہو کر ہنسنے لگی۔ پہلی کامیابی ملنے پر ان کے حوصلے بلند ہو گئے تھے۔ اب وہ اس قابل ہو چکی تھیں کہ ماحول کا تناؤ کم کرنے کے لیے ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کر سکیں۔ تقریباً بیس پچیس منٹ کی جدوجہد کے بعد وہ مہ پارہ کے ہاتھ کھولنے میں کامیاب ہو گئی۔ ہاتھ کھل جانے کے بعد دونوں نے اپنے اپنے پاؤں آزاد کیے پھر اپنی ساتھیوں کے ہاتھ پاؤں کھولنے لگیں۔ اب انہیں گرہوں کی نوعیت کا اندازہ ہو چکا تھا اس لیے یہ کام نسبتاً آسان ثابت ہوا۔

"لاؤ نکالو اپنا موبائل۔" آزادی ملتے ہی سب سے پہلے لبنیٰ نے روشی سے فرمائش کی۔ روشی نے انہیں بتایا تھا کہ گھر سے نکلتے وقت اس نے دوسری چند چیزوں کے ساتھ اپنا چھوٹا سا پرانا موبائل بھی ساتھ لے لیا تھا اور وہ موبائل آف حالت میں اب بھی اس کے گریبان کے اندر موجود تھا۔ انہیں یہاں قید کرنے سے پہلے ان کی تلاشی تو لی گئی تھی لیکن یہ تلاشی ان کے ہینڈ بیگز، موبائل اور لباس کی جیبوں میں موجود سامان کو نکالنے تک محدود رہی تھی۔ ظاہر ہے تلاشی لینے والوں نے اپنے تئیں عام سی لڑکیوں کی تلاشی لی تھی اور انہیں پہلے سے قطعی آگہی نہیں تھی اس لیے زیادہ "گہرائی" میں نہیں گئے تھے۔ روشی نے "خفیہ تجوری" سے موبائل برآمد کر کے پاور آن کیا تو سب کے چہروں پر امید کی روشنی دوڑ گئی۔ یہ چھوٹا سا کی پیڈ والا موبائل جو اپنے چھوٹے سائز کی وجہ سے بھی روشی کا بہت پسندیدہ رہا تھا لیکن پھر جدید اسمارٹ فونز کی بڑی بڑی اسکرینوں کے آگے مات کھا گیا

تھا، آج ایک بار پھر اہمیت اختیار کر چکا تھا۔ روشی خوش تھی کہ اس نے ''نیا'' آنے پر ''پرانے'' کو بالکل ہی ترک نہیں کر دیا تھا اور کبھی کبھی اسے ''لفٹ'' کروا دیتی تھی۔ ہلکے سے میوزک کے ساتھ روشن ہو جانے والی موبائل کی ننھی سی اسکرین اس کے امید اور جوش سے بھرے چہرے پر بھی روشنی ڈال رہی تھی۔ دفعتاً ان تینوں نے اس کی اسکرین پر جمی آنکھوں کو بجھتے اور چہرے کو زرد ہوتے ہوئے دیکھا۔

☆☆☆

''ہاؤ سوئٹ! کتنا زبردست ڈریس پسند کیا ہے جاوید نے تمہارے لیے۔ مسٹر ٹونی تو دیکھتے ہی لٹو ہو جائیں گے ویسے سنا ہے کہ لٹو تو وہ پہلے ہی ہو چکے ہیں تم پر۔'' مس لینا نے نہایت مشاقی سے اسے تیار کرنے کے بعد اپنے سامنے کھڑا کر کے اس کا جائزہ لیا اور بے ساختہ ہی بول پڑی۔ سنہری اور نقرئی امتزاج کے چمکیلے کپڑے کی میکسی میں زیبی کا سانچے میں ڈھلا جسم نمایاں ہو رہا تھا اور سلیقے سے بنائے گئے ہیئر اسٹائل اور میک اپ نے اس کے حسن کو مزید دو آتشہ کر دیا تھا۔

''کون مسٹر ٹونی......؟'' زیبی جو میکسی کے قدرے کشادہ گلے اور مہین کپڑے کی آستینوں سے جھانکتے اپنے خوب صورت بازوؤں کی وجہ سے اُلجھن کا شکار تھی، مس لینا کی بات سن کر چونکی۔

''جاوید کے قریبی دوست ہیں۔ انہوں نے جاوید سے وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ اس لڑکی سے شادی کرے گا جو انہیں بھی پسند آئے اور تمہیں بھلا کوئی کیسے ناپسند کر سکتا ہے۔'' مس لینا جو کہ اس کے سوال پر اپنے بے ساختگی سے کہے جملے پر ذرا گڑبڑا گئی تھی خوب صورتی سے بات بنا گئی۔

''دوست لڑکی پسند کرے یہ تو پہلی بار سنا ہے جی، ہمارے ہاں تو یہ کام ماں بہنیں کرتی ہیں۔'' زیبی اس کا جواب سن کر حیران ہوئی۔

''جاوید کی ماں بہنیں جو نہیں ہیں۔'' مس لینا نے اسے بتایا تو اسے یاد آیا کہ جاوید نے اسے کورٹ میرج پر راضی کرنے کے لیے بہانہ بنایا تھا کہ اس کی ماں اس کی تینوں بہنوں کی شادی سے پہلے اس کے سر پر سہرا سجانے کے لیے تیار نہیں ہے۔ حالات کی گڑبڑ میں وہ یہ بات بھول گئی تھی لیکن اب جاوید کا یہ جھوٹ یاد آیا تھا تو پہلے سے بے چین دل مزید بے چینی محسوس کرنے لگا تھا۔

''جاوید کہاں ہے؟'' اس نے دریافت کیا۔

''وہ انتظامات میں بزی ہے۔ آؤ میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر چلتی ہوں۔ ساڑھے گیارہ بجنے والے ہیں۔ نئے سال کے آغاز سے پہلے تمہارا مہمانوں سے تعارف ہو جائے تو اچھا ہے۔'' مس لینا نے اس کا ہاتھ تھاما۔

''دوپٹا......'' بغیر دوپٹے کے کسی محفل میں جانے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

''یہ رہا دوپٹا۔'' مس لینا نے ہنستے ہوئے اس کا دوپٹا سیٹ کیا۔ سنہری بارڈر والا نقرئی رنگ کا دوپٹا اتنا مہین تھا کہ زیبی کے حسن کا ایک بھی جلوہ نہیں چھپا سکتا تھا لیکن دوپٹے کی حجت بہرحال پوری ہو گئی تھی۔ اس کی فطرت سے واقف جاوید نے بہت ہوشیاری سے اس کے لیے لباس کا انتخاب کیا تھا۔ وہ لباس روایت کے لوازم بھی پورے کر رہا تھا، جدت اور بے باکی میں بھی زیادہ پیچھے نہیں تھا۔ محدود ماحول میں پلنے بڑھنے والی زیبی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ کوئی بحث کرتی۔ وہ کٹھ پتلی کی طرح ہر بات پر عمل کر رہی تھی۔ اپنے دل کے اضطراب کے باوجود اس کے ذہن میں یہ سوچ تھی کہ اس کے پاس واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے اور اب اسے جاوید کو ہی اپنا سب کچھ ماننا ہوگا۔ اس لیے وہ خود کو اس کی پسند کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''یہ لیجیے مسٹر ٹونی! آ گیا وہ شاہکار تھا جس کا تھا انتظار......'' مس لینا اس کا ہاتھ تھام کر اسے رنگوں، روشنیوں، قہقہوں، خوشبوؤں اور موسیقی کی لہروں میں ڈوبے عرشے پر لے کر پہنچی اور ایک تھری پیس سوٹ میں ملبوس گورے چٹے آدمی کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔ اس آدمی کی نظریں یوں زیبی کے وجود سے چپٹیں کہ اس نے اپنی تمام تر سادگی اور بھولے پن کے باوجود اس کے اُجلے وجود کے پیچھے موجود تاریک روح کو دیکھ لیا اور گھبرا کر جاوید کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ جاوید اسے کہیں دکھائی نہیں دیا۔

''کاش یہاں سے واپسی کا کوئی راستہ ہوتا۔'' اس نے دل میں سوچا اور بے بسی سے دور دور تک پھیلے سمندر پر نظر دوڑا کر رہ گئی۔

☆☆☆

''کیا ہوا؟ تمہاری شکل کیوں اتر گئی؟'' روشی کے چہرے کے تاثرات ایسے تھے کہ وہ چاروں ہی چونک گئیں۔

''موبائل کی چارجنگ بالکل ختم پر ہے۔ اور ابھی ابھی مجھے یاد آیا ہے کہ اس میں بیلنس بھی نہیں ڈلوایا تھا میں نے شاید۔ ایک آدھ ایس ایم ایس کرنے ہی کی گنجائش

ہو۔" اس نے انہیں مسئلے سے آگاہ کیا تو ان کے منہ بھی لٹک گئے۔ روشی کا یہ نمبر پری پیڈ پر ہے یہ تو انہیں بھی معلوم تھا۔

"ایسا کرو اپنے یا ہمارے مما پاپا میں سے کسی کو میسج بھیج دو۔ میسج پڑھ کر وہ خود ہمیں فون کریں گے۔" تھوڑی سی مایوسی کے بعد لبنیٰ نے تجویز پیش کی۔

"نہیں، ابھی میسج کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ایسا کرو کہ موبائل آف کر دو۔ ہمیں اس کی چارجنگ بچانے کی ضرورت ہے۔" مہ پارہ نے صرف مشورہ ہی نہیں دیا بلکہ روشی کے ہاتھ سے موبائل لے کر اسے آف بھی کر دیا۔

"ہمیں جلد از جلد کسی سے رابطہ کرنا چاہیے پارو! ہم پتا نہیں کہاں ہیں اور کن خطرناک لوگوں میں پھنس گئے ہیں۔ یہاں سے نکلنے کے لیے ہمیں لازماً مدد لینی پڑے گی۔" لبنیٰ کو لگا کہ مہ پارہ اب بھی ایڈونچر سے باز نہیں آئی ہے اور اپنے زورِ بازو پر یہاں سے نکلنے کا خواب دیکھ رہی ہے اس لیے اسے سمجھانے لگی۔

"ابھی رابطہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ ہم کہاں ہیں۔ پہلے ہمیں اس بارے میں معلومات حاصل کرنی ہوں گی پھر ہی رابطے کا کوئی فائدہ ہو گا۔ ہمیں بیلنس اور چارجنگ دونوں کی کمی کا سامنا ہے اس لیے اب ہم اس موبائل کو اسی وقت استعمال کریں گے جب اس سے کوئی کارآمد میسج کرنے کے قابل ہوں۔" مہ پارہ نے سنجیدگی سے جواب دیا تو وہ سب اس کی بات سمجھ گئیں۔

"اب کیا کرنا ہو گا؟"

"فی الحال تو ہم صرف جاوید کا انتظار ہی کر سکتے ہیں۔ اس نے کہا تھا کہ وہ ہمیں رات کا کھانا دینے آئے گا۔ بس وہی وقت ہو گا کہ جب ہم کچھ کر گزریں۔" اس کا مشورہ سب کے دل کو بھایا اور وہ جاوید کی آمد کی گھڑیاں گننے لگیں۔ انتظار کی کیفیت میں وقت رینگ رینگ کر گزرنا ایک عام تجربہ ہے۔ اس جگہ پر یہ تجربہ اور بھی تکلیف دہ تھا۔ مرے پر سو دُرّے کے مصداق جاوید بھی ضرورت سے زیادہ تاخیر کا شکار ہو گیا تھا۔

"شاید وہ آ گیا ہے۔" وہ چاروں جو طویل انتظار سے قدرے مایوسی کا شکار تھیں، کھٹکے کی آواز سن کر چونکیں اور فوراً ہی چوکس ہو گئیں۔ پروگرام کے مطابق عروج اور لبنیٰ بالکل سامنے ہی اس زاویے سے لیٹی ہوئی تھیں کہ جاوید کو فوری طور پر یہ محسوس نہ ہو پاتا کہ ان کے ہاتھ پشت پر ہونے کے باوجود آزاد ہیں۔ مہ پارہ اور روشی نے سیڑھی کے دائیں بائیں پشت کی دیوار کے ساتھ اپنی جگہ بنائی ہوئی تھی اور لیٹنے کے بجائے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے پنجوں کے بل بیٹھی ہوئی تھیں۔

ایسی کسی بھی صورتِ حال کی امید نہ رکھنے والا جاوید اپنی ہی دُھن میں سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے آیا تو اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی اور وہ ایسا بوکھلایا کہ اس کے ہاتھ سے فلیش لائٹ ہی چھوٹ گئی۔ فرش پر لیٹی لبنیٰ پھرتی کا مظاہرہ کرتی ہوئی سیڑھی پر چڑھی اور اوپر موجود چوکور خلا کو اس کا ڈھکن نما دروازہ کھینچ کر بند کر دیا۔ اب یہاں ہونے والے ہنگامے کی خبر اوپر والوں کو ہونا مشکل تھی۔

دوسری طرف جاوید خونخوار بلیوں کی طرح خود پر حملے کرتی لڑکیوں سے نبرد آزما تھا۔ وہ لڑائی بھڑائی کے فن سے ناآشنا لڑکیاں نہیں تھیں جو وہ انہیں آسانی سے قابو کر لیتا۔ انہوں نے تو اسے اتنی مہلت بھی نہیں دی تھی کہ وہ اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں موجود پسٹل ہی نکال پاتا۔ نیچی چھت والی اس جگہ پر وہ حرکت کرنے کے لیے بھی زیادہ آزاد نہیں تھا اور مزاحمت کرنے کی کوشش میں اس کا سر چھت سے اتنی زور سے ٹکرایا تھا کہ وہ چکرا کر رہ گیا۔ ان چاروں نے اس موقع سے فائدہ حاصل کیا اور اسے بے بس کر دیا۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ جن رسیوں سے انہیں باندھا گیا تھا انہی سے جاوید جکڑا پڑا تھا اور بلالحاظ گالیاں دیتے ہوئے انہیں سنگین نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا۔

"اگر اب تمہارے منہ سے ایک بھی غلیظ لفظ نکلا تو تمہاری یہ خوب صورت شکل جس کے بل پر تم لڑکیوں کو پھانستے پھرتے ہو بھُرکس بن جائے گی۔" لبنیٰ نے شدید طیش کے عالم میں اس کی ناک پر اپنے جوتے کی ضرب لگائی اور خوفناک لہجے میں دھمکی دی۔ اس کے لہجے میں ایسی کوئی بات تھی جس نے جاوید جیسے شخص کو بھی اپنا منہ بند کر لینے پر مجبور کر دیا۔

"بتاؤ یہ کون سی جگہ ہے اور یہاں کتنے لوگ موجود ہیں؟" لبنیٰ نے اس کے پہلو میں ایک ٹھوکر رسید کرتے ہوئے سوال کیا۔ وہ جو چاروں میں سب سے زیادہ خوف زدہ تھی اب بالکل بپھری ہوئی شیرنی بن چکی تھی۔

"تمہیں اپنی یہ حرکت بہت مہنگی پڑے گی۔ مجھے قابو کر کے یہ مت سوچو کہ تم لوگ یہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاؤ گی۔ یہاں ہمارے بہت سارے لوگ ہیں۔ فرض کیا تم ان لوگوں کو جل دینے میں کامیاب بھی ہو گئیں تو بھاگ کر کہاں جاؤ گی۔ اس وقت ہم سب ایک شپ پر سمندر کے درمیان موجود ہیں۔ شپ کے ڈیک پر

UrduBooks.PK

زبردست نیو ایئر پارٹی چل رہی ہے۔ ٹھیک بارہ بجے یہاں ایسی آتش بازی کی جائے گی کہ آسمان روشنیوں میں نہا جائے گا۔" وہ غصے میں ضرورت سے کچھ زیادہ بول گیا تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ اسے یقین تھا کہ یہ لڑکیاں وقتی طور پر غالب ضرور آگئی ہیں لیکن ان کے پاس جائے فرار بہرحال نہیں ہے۔

"اس شپ کا نام کیا ہے؟" مہ پارہ نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

"شاید تم سمجھ رہی ہو کہ میں تم سے جھوٹ بول رہا ہوں لیکن سچ یہ ہے کہ اس وقت ہم ایک شپ پر ہی موجود ہیں اور اس شپ کا نام......" بڑبولے پن میں جاوید نے فخر سے ایک غیر ملکی جہاز راں کمپنی کے جہاز کا نام لیا۔ ان کے لیے اسی سوال کا جواب سب سے اہم تھا۔ مہ پارہ کے اشارے پر لبنی نے کنپٹیوں پر بھرپور ٹھوکریں لگا کر اس بڑبولے کے خاموش رہنے کا انتظام کیا اور روشی نے جوش کی سی کیفیت میں اپنا موبائل آن کر دیا۔ اس وقت وہ چاروں اتنی خوش تھیں کہ دل چاہ رہا تھا خوشی میں ایک زوردار نعرہ لگائیں لیکن بہرحال وہ ابھی خطرے میں تھیں۔

"ہم چاروں اس وقت ایک شپ...... پر موجود ہیں۔ شپ کے ڈیک سے ٹھیک بارہ بجے آتش بازی کی جائے گی۔ ہماری مدد کیجیے۔ وی لو یو ڈیئرسٹ پیرنٹس۔" روشی نے یہ پیغام ٹائپ کر کے اپنے والد عثمان خان کے موبائل پر سینڈ کیا تو اس کی انگلیاں کپکپا رہی تھیں اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔ جاوید کی لائی فلیش لائٹ گرنے کے باوجود روشن تھی اور اس کی روشنی میں صاف نظر آ رہا تھا کہ ان چاروں کی آنکھیں ہی اس سے ڈبڈبا چکی تھیں۔

"ہو سکتا ہے کوئی اسے تلاش کرتا ہوا یہاں آ جائے اس لیے ہمیں مدد آنے تک یہاں سے نکل کر کہیں اور پناہ لینی ہوگی۔" مہ پارہ نے ایک بار پھر اپنے مضبوط اعصاب کا ثبوت دیا اور اس جذباتی کیفیت سے نکل کر عقلمندانہ رائے دی۔ ابھی اس کا جملہ مکمل ہی ہوا تھا کہ روشی کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ کال عثمان خان کے نمبر سے آ رہی تھی۔ روشی نے کال ریسیو کر لی۔

"روشی...... میری جان۔" اس کے کچھ بولنے سے قبل ہی عثمان خان جذباتی آواز میں پکارے۔ روشی کے گلے میں آنسوؤں کا پھندا سا اٹک گیا لیکن اس نے خود کو سنبھالا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"میرے موبائل کی چارجنگ ختم ہونے والی ہے پاپا! آپ جلدی سے آ جائیں اب شاید دوبارہ ہماری بات نہ ہو سکے۔" وہ اندازہ نہیں کر سکی تھی کہ اس کا جملہ مکمل ہونے سے قبل ہی موبائل بند ہو گیا ہے۔ عروج نے اس کے شانے کو آہستہ سے دبا کر اسے احساس دلایا۔ ایک ڈیڑھ منٹ کے اندر وہ جاوید کے منہ میں اس کی ٹائی اور رومال ٹھونسنے کے بعد اس سیلن زدہ قید خانے سے باہر تھیں۔ جاوید سے حاصل کیا گیا پسٹل مہ پارہ کے ہاتھ میں تھا اور وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتی آگے بڑھتی جا رہی تھیں۔ ایک کوریڈور سے گزرتے ہوئے انہوں نے دور ایک بیرے کو بڑا سا خوان ہاتھوں میں اٹھائے عجلت میں جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھیں اس لیے تیزی سے دوسرے کوریڈور میں مڑ گئیں۔ یہاں ویرانی کا عالم تھا لیکن عرشے پر چلتی بلند موسیقی کی مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔ انہوں نے ایک قطار میں بنے کیبنوں کے دروازے چیک کرنا شروع کیے۔ تیسرے کیبن کا دروازہ غیر مقفل تھا۔ انہوں نے جیسے ہی دروازہ کھول کر اندر قدم رکھے موسیقی کی آوازیں بند ہو گئیں اور چند ثانیوں کے وقفے کے بعد آتش گیر مادہ پھٹنے کی مخصوص آوازیں آنے لگیں۔ زندگی کا ایک اور نیا سال شروع ہو چکا تھا اور وہ چاروں اپنی بقا کی جنگ لڑتی ہوئی باہر کی روشنیوں اور ہنگاموں سے دور ایک تاریک کیبن میں دبکی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

ٹونی، زیبی کے لیے مصیبت بن گیا تھا۔ شراب کے جام پر جام چڑھاتا وہ ہر لمحے آپے سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ زیبی، جاوید کے علاوہ صرف مس لینا سے متعارف تھی اور وہ بھی اس وقت کسی کی بانہوں میں ہوش و خرد سے بیگانی ہوئی جا رہی تھی۔ اس اجنبی اور بیہودہ ماحول میں سراسیمہ سی زیبی کی نظریں شدت سے جاوید کو تلاش رہی تھیں۔ جاوید کی کمی کو کچھ اور لوگوں نے بھی محسوس کیا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو جاوید سے جھوٹے وعدے کر کے زیبی کو ٹونی کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ انہیں اپنے فیصلے پر عمل کے لیے زیادہ تردد کی ضرورت نہیں تھی۔ بس ایک نشہ آور سفوف ملا جام ہی جاوید کو پلانا تھا لیکن جاوید اس جام کو پینے کے لیے محفل میں موجود نہیں تھا۔ ٹھیک بارہ بجے جب آسمان روشنیوں سے جگمگا رہا تھا، دو افراد جاوید کی تلاش میں روانہ ہو گئے۔ ٹھیک اسی وقت مستی میں جھومتے ٹونی نے زیبی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے خود سے قریب کیا اور اس کے پنکھڑیوں سے لبوں کو چوم ڈالا۔ اس کے منہ سے آتی بدبو نے زیبی کا دم ہی نہیں

دماغ بھی الٹ دیا۔ وہ جو اب تک طوعاً و کرہاً برداشت کا مظاہرہ کر رہی تھی، اپنا ضبط کھو بیٹھی اور ایک زوردار تھپڑ ٹونی کے منہ پر دے مارا۔ وہاں بے پناہ شور و ہنگامہ تھا اور جہاز کے بوڑھے کپتان سمیت تقریباً سب ہی نشے میں جھوم رہے تھے اس لیے کسی کو زیبی کی جسارت کا تو علم نہیں ہوا لیکن بہت دیر سے اپنے تئیں اس کے ناز نخرے سہتے ٹونی کی برداشت جواب دے گئی۔

”تجھے تو میں تیری اوقات بتاتا ہوں۔“ وہ کسی درندے کی طرح غرایا اور نازک سی زیبی کو دبوچ کر یوں نیچے کا رخ کیا جیسے کوئی آدم خور درندہ اپنا شکار اپنے بھٹ میں لے جا رہا ہو۔ اس کی وحشت کے سامنے زیبی جیسی ہرنی کی مزاحمت کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔

☆☆☆

تاریک کیبن میں پناہ گزین ان چاروں کے لیے وقت کاٹنا اتنا آسان نہیں تھا۔ وہ سمجھ سکتی تھیں کہ بارسوخ ہونے کے باوجود ان کے والدین کو ان تک پہنچنے میں وقت لگے گا۔ کسی غیر ملکی بحری جہاز پر چار مغوی لڑکیوں کی تلاش کوئی سیدھا معاملہ نہیں تھا چنانچہ وہ بہت شدت سے دعا کر رہی تھیں کہ ان کے لیے کوئی اور راہ نکل آئے۔ دعا کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے اردگرد سے بھی بے حد چوکنی تھیں۔ چنانچہ باہر ابھرنے والی قدموں کی آہٹیں انہوں نے فوراً سن لیں۔ کیبن کا دروازہ کھلا تو مہ پارہ اور روشی اس وقت دائیں بائیں کھڑی آنے والے کے استقبال کے لیے پوری طرح تیار تھیں۔ وہ اندر آیا تو انہیں فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ دہائیاں دیتی اور التجائیں کرتی زیبی کی آواز پہچاننا ان کے لیے قطعی مشکل نہیں تھا۔ آنے والے نے دروازہ ایک دھماکے سے بند کر کے بلب روشن کیا تو تک سک سے تیار زیبی انہیں نظر بھی آ گئی۔ قیمتی لباس، زیور اور میک اپ نے اس کے حسن کو دو آتشہ بنا ڈالا تھا۔ دائیں شانے پر یکجا کیے گئے بالوں کے گچھے اور لمبی صراحی دار گردن کی لمبائی کے مساوی کانوں میں موجود خوب صورت سنہری آویزے اس تیاری میں سب سے زیادہ نمایاں تھے۔ اسے بڑی بڑی مونچھوں اور گھنے بالوں والے جس شخص نے اپنی بانہوں میں جکڑا ہوا تھا دیکھنے میں خاصا وجیہہ تھا خصوصاً اس کے ماتھے پر گری بالوں کی لٹیں اس کو مزید دلکش بنا رہی تھیں لیکن اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں شراب نوشی کے باعث ڈولتے سرخ ڈوروں نے اس کی وجاہت کے سارے تاثر کو زائل کر دیا تھا۔ لائٹ کھلتے ہی اس نے بھی ان لوگوں کو دیکھ لیا۔

”تم...... تم لوگ اور یہاں......؟“ حیرت سے اس کا منہ کھل گیا۔

”زیبی کو چھوڑ دو اور اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لو۔“ اس کی حیرت کو نظرانداز کر کے مہ پارہ نے پسٹل اس کی پشت سے لگاتے ہوئے حکم دیا۔

”یہ سب کر کے تم یہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب نہیں ہو سکو گی۔“ اس نے غراہٹ آمیز لہجے میں کہا۔

”اگر ہم نہیں بچ سکے تو زندہ تم بھی نہیں رہو گے۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ آزاد ہونے میں ناکامی کی صورت میں تمہیں ضرور گولی مار دوں گی۔“ مہ پارہ نے اپنے لہجے کو اس سے بھی زیادہ خوفناک بنا لیا۔ ساتھ ہی شانے پر پسٹل کے دستے سے ایک ضرب بھی لگا دی۔ اس کے انداز نے ٹونی کو باور کروا دیا کہ فی الحال وہ ان لڑکیوں کے رحم و کرم پر ہے۔ ناچار اس نے زیبی کو چھوڑ کر اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لیے۔ زیبی اس سے دور ہٹ گئی اور روشی نے مہارت سے اس کی جامہ تلاشی لینی شروع کر دی۔ اس کی جیب سے برآمد ہونے والا جدید موبائل دیکھ کر وہ کھل اٹھیں۔ اب ان کے پاس باہر کی دنیا سے رابطے کا ایک بہترین ذریعہ موجود تھا۔

☆☆☆

جاوید کی کمی کو محسوس کرنے والوں نے جلد ہی اسے اسٹور تیج میں ڈھونڈ نکالا تھا اور ہوش میں لا کر ساری تفصیل بھی معلوم کر لی تھی۔ تفصیل علم میں آتے ہی ان چاروں کی تلاش شروع ہو گئی۔ جہاز کی وسعت کے باوجود انہوں نے تلاشی کا کام تیزی سے مکمل کیا۔ تلاش کے اس عمل میں براؤن لیدر جیکٹ میں ملبوس، لمبے لمبے بالوں والا ایک شخص سب سے نمایاں تھا۔ وہ ان کا مقامی انچارج ایڈی تھا جو اپنی کانی آنکھ کی وجہ سے رات کو بھی گہرے رنگ کی عینک استعمال کرنے کا عادی تھا۔

”ہمیں مسٹر ٹونی کو اس واقعے کی اطلاع دینی ہو گی۔“ ناکامی پر جھنجلاتے ہوئے ایڈی نے اپنی خوفناک گن کو لہراتے ہوئے اعلان کیا۔

”مسٹر ٹونی! اس لڑکی زیبی کے ساتھ اپنے کیبن میں ہیں۔“ ایک شخص نے دبی زبان میں اطلاع دی جسے سن کر جاوید چونک گیا اور زور سے چیخا۔

”زیبی...... زیبی مسٹر ٹونی کے کیبن میں کیوں ہے؟ میری باس سے ڈیل ہوئی تھی۔“

”تم جیسے دو ٹکے کے آدمی کے لیے باس مسٹر ٹونی

سے اپنی کمٹمنٹ ختم کردے گا، یہ سوچنا تمہاری حماقت تھی۔'' ایڈی نے اس کا مضحکہ اڑایا۔

''دو ٹکے کا آدمی تو ہوگا کانے دجال۔'' طیش میں جاوید اس سے بھڑ گیا لیکن وہ ہاتھ پیر کی لڑائی میں مہارت رکھنے والا آدمی نہیں تھا۔ ایڈی نے بے دریغ اس پر مکے اور لاتیں برسانا شروع کردیں۔ آخری وار اس نے اپنی بھاری گن سے کیا۔ گن کی بھرپور ضرب کھا کر جاوید نیچے گر گیا۔

وہ بے ہوش ہو چکا تھا اور اس کا چہرہ اپنے ہی خون میں تر بتر خاصا بھیانک لگ رہا تھا۔ اس کی طرف دیکھے بغیر ایڈی، ٹونی کے کیبن کی طرف بڑھ گیا اور دروازے پر دستک دی۔ پہلی دستک پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ ایڈی کی دوسری دستک زیادہ بلند تھی۔

''کون ہے دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' اندر سے ٹونی کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

''اہم مسئلہ ہے سر آپ کو باہر آنا ہوگا۔'' ایڈی نے درخواست کی۔

''میں نے کہا نا کہ یہاں سے دفع ہو جاؤ۔'' ٹونی کا جواب اب بھی وہی تھا۔

''پلیز سر میری بات سمجھیں۔ چاروں لڑکیاں غائب ہیں اور آپ کے کیبن کے علاوہ ہم پورا شپ کھنگال چکے ہیں۔'' ایڈی نے اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

''تمہاری وہ مائیں یہاں میرے کیبن میں موجود ہیں اور پسٹل کے زور پر مجھے باندھ کر بے بس کر چکی ہیں۔'' اس بار ٹونی پھٹ پڑا۔

''توڑ دو...... کیبن کا دروازہ توڑ دو۔'' ایڈی اپنے ساتھ موجود افراد سے مخاطب ہو کر زور سے چلّایا۔

''دروازے سے دور رہو۔ اگر دروازہ ٹوٹا تو یاد رکھنا کہ میرے پاس موجود پسٹل میں اتنی گولیاں ہیں کہ ٹونی کے علاوہ تم میں سے مزید چار چھ کو جہنم واصل کر سکتی ہوں۔'' اندر سے مہ پارہ کسی شیرنی کی طرح چنگھاڑی۔

''توڑ دو، دروازے کو توڑ دو۔'' ایڈی اس کی دھمکیوں کو خاطر میں نہ لایا اور حکم صادر کرنے کے ساتھ ہی خود سب سے پہلے وحشت ناک انداز میں شانے سے دروازے پر ضرب لگائی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ عین اس لمحے کوسٹ گارڈز کی مسلح بوٹس شپ کے اطراف میں گھیرا مکمل کر چکی ہیں اور ایک ہیلی کاپٹر فضا میں منڈلا رہا ہے۔

☆☆☆

دروازے پر ضربوں کا سلسلہ شروع ہوا تو ان چاروں سمیت زیبی کا چہرہ بھی فق ہوگیا۔ دروازہ مضبوط تھا اور انہوں نے لاک کرنے کے ساتھ ساتھ کنڈی اور حفاظتی زنجیر بھی چڑھا دی تھی لیکن پھر بھی اس بات کی کم ہی امید تھی کہ شدید ضربوں کے سامنے زیادہ دیر ٹھہر سکے گا۔

''ڈیڈ کو سچویشن بتاؤ روشی۔'' مہ پارہ نے ہونٹ کچلتے ہوئے روشی سے کہا۔ دھمکی دینا الگ بات تھی لیکن اس کے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ اپنی دھمکی پر عمل کرتے ہوئے ٹونی پر گولی چلا دیتی۔

''ہم پہنچ چکے ہیں بیٹا! تم لوگ ہمت مت ہارنا۔'' دوسری طرف سہیل مرزا روشی کی کال کے جواب میں اسے تسلی دے رہے تھے۔ مدد پہنچ جانے کی خوش خبری سن کر ان کے چہرے کھل اٹھے لیکن زیبی کی حالت غیر تھی اور اس نے رو رو کر اپنا خوب صورت میک اپ بہا ڈالا تھا۔ مسلسل لگائی جانے والی ضربوں کی آوازیں اور دروازے کی اکھڑتی چولیں واقعی اعصاب شکن صورتِ حال کو مزید ہولناک بنا رہی تھیں۔

''باتھ روم میں چلو۔'' دروازہ اکھڑ کر گرنے سے ایک لمحہ قبل ہی مہ پارہ کو خیال آیا تو وہ زور سے چیخی۔ یہ بھی ان کی خوش قسمتی تھی کہ چھپنے کے لیے انہیں نائب کپتان ٹونی کا کیبن میسر آیا تھا جہاں ہر سہولت موجود تھی۔ زیبی سمیت باتھ روم میں گھس کر انہوں نے دروازہ بند ہی کیا تھا کہ کیبن کا دروازہ اکھڑ گیا اور ایڈی اپنے دو بندوں سمیت اندر گھس آیا۔ انہیں غائب پا کر اسے اتنا طیش آیا کہ اس نے یونہی برسٹ چلا دیا۔ برسٹ چلنے کی آواز سن کر وہ لوگ باتھ روم کے اندر کپکپا کر رہ گئیں اور تیزی سے خود کو باتھ روم کی دیواروں کے ساتھ چپکا لیا۔ آنے والا اگر وحشت میں دروازے پر فائر مار دیتا تو انہیں یقین نہیں تھا کہ دروازہ گولیوں کے سامنے ڈھال ثابت ہوگا یا نہیں۔

☆☆☆

عرشے پر جاری نیو ایئر پارٹی کے شرکا کو نیچے جاری ہنگامے کی قطعی خبر نہیں تھی۔ ان شرکا میں عملے کے افسران، مسافر اور وہ مہمان شامل تھے جنہیں افسران نے خصوصی اجازت سے مدعو کر رکھا تھا۔ رات بیتتی تو مہمان واپس چلے جاتے اور اگلے دن جہاز بھی اپنے شیڈول کے مطابق روانہ ہو جاتا لیکن یہ سب ہونے سے قبل قدرت کو کچھ مظلوموں کی مدد مطلوب تھی سو دیکھنے والی آنکھوں نے دیکھا کہ پاکستانی کوسٹ گارڈز کے جیالے تیزی سے شپ پر اترتے چلے آرہے ہیں۔ جہاز کا کپتان جسے کچھ دیر قبل ہی سرکاری طور

UrduBooks.pk

پر صورتِ حال سے آگاہ کیا گیا تھا، گُھٹے ہوئے چہرے کے ساتھ یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس وقت اس کا زندگی بھر کا نشہ ہرن ہو چکا تھا اور اسے علم ہو گیا تھا کہ اسے اس کی ذمے داریوں سے غافل کر دینے والا نائب اس کی ناک کے نیچے کون سا کھیل، کھیل رہا تھا۔ ایڈی کی گن نے برسٹ اُگلا تو کوسٹ گارڈ کے چند جوان متعلقہ کوریڈور میں قدم رکھ چکے تھے جبکہ باقی جہاز کے دوسرے حصوں میں پھیل رہے تھے۔

”تم سب ہاتھ اٹھا کر باہر آجاؤ ورنہ گولی ماردی جائے گی۔“ کیبن کے اطراف میں پوزیشنز سنبھال کر جوانوں کے انچارج نے وارننگ دی۔

”لڑکیاں ہماری یرغمال ہیں۔ اگر کسی نے گولی چلانے کی حماقت کی تو لڑکیاں اپنی جان سے جائیں گی۔“ جواب میں ایڈی اندر سے چلّایا تو کوسٹ گارڈ کے جوان کو اندازہ ہوا کہ صورتِ حال ان کے اندازے سے زیادہ نازک ہے۔

☆☆☆

مہ پارہ سمیت ان سب نے ایڈی کی دھمکی سنی لیکن اس بار وہ خوف زدہ نہیں تھیں۔ انہیں علم ہو چکا تھا کہ ان کے ملک کے محافظ ان کی مدد کے لیے پہنچ چکے تھے۔

”جوانوں سے کہیں ڈیڈ ہماری فکر نہ کریں۔ ہم اُن کی مدد کے لیے تیار ہیں۔“ مہ پارہ نے جذباتی لہجے میں سہیل مرزا سے کہا۔

”اللہ تمہاری حفاظت کرے میری بہادر بیٹیو...!“ ان کی آواز بھی جذبات سے لبریز ہو گئی۔ مہ پارہ نے فون روشی کو واپس تھماتے ہوئے آہستہ سے باتھ روم کا دروازہ بس اتنا کھولا کہ اس میں ایک معمولی سی جھری بن گئی۔ اس جھری سے آنکھ لگا کر اس نے باہر کا منظر دیکھا۔ لمبے بالوں والے ایڈی سمیت ان تینوں نے کیبن کے مختلف حصوں میں پوزیشن لے رکھی تھی جبکہ ٹونی ہنوز بندھی ہوئی حالت میں نیچے پڑا تھا۔ کسی کو اتنی فرصت ہی نہیں ملی تھی کہ اسے کھول پاتا۔ حالانکہ وہ مسلسل دہائیاں بھی دے رہا تھا۔ مہ پارہ نے خاموشی سے ان تینوں کی پوزیشنز کا جائزہ لیا۔ یقینی طور پر انہیں ان کی طرف سے کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ اس لیے اپنی ساری توجہ کیبن کے ٹوٹے ہوئے دروازے کے باہر مرکوز کیے ہوئے تھے۔

مہ پارہ نے اللہ کا نام لیا۔ دروازے کی جھری تھوڑی سی مزید کشادہ کی اور جھری سے پسٹل کی نال نکال کر پہلا فائر داغا۔ اسے کسی کو نشانہ نہیں بنانا تھا۔ بس یہ اپنے محافظوں کے لیے اشارہ تھا کہ وہ اپنی کارروائی شروع کر دیں۔ اس پہلے فائر نے ہی وہاں ہنگامہ برپا کر دیا۔ جوان اتنی تیزی سے کارروائی کرتے ہوئے کیبن میں گھسے کہ ایڈی اور اس کے ساتھیوں کو بھرپور مزاحمت کا بھی موقع نہیں مل سکا۔ چند لمحوں کی فائرنگ کے بعد ہی وہاں خاموشی چھا گئی اور کوسٹ گارڈ کے جوانوں نے انہیں اپنے حصار میں لے کر باہر نکالا۔ باہر نکلتے ہی وہ دیکھ چکی تھیں کہ ٹونی جہنم واصل ہو چکا ہے۔ جہاز سے اتارے جانے تک انہیں اس بات کا علم ہو چکا تھا کہ وہاں سے ان کے علاوہ مزید پندرہ لڑکیاں اور بازیاب کی گئی ہیں۔ نائب کپتان تنویر عرف ٹونی، بوڑھے نشئی کپتان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر جانے کب سے لڑکیوں کی اسمگلنگ میں ملوث ایک بین الاقوامی گینگ کی اعانت کر رہا تھا۔ نچلے عملے میں بھی اس کے معاون شامل تھے۔ وہ جب جوانوں کے مضبوط حصار میں جہاز سے ایک کشتی پر اتاری جا رہی تھیں تو انہوں نے زخمی جاوید کو دیکھا۔ ایک جوان گدی سے پکڑے بیدردی سے اسے آگے دھکیل رہا تھا۔ ہوس پرستی نے اسے پستی میں گرا دیا تھا۔

”غور سے دیکھو اس شخص کو۔ کیا اس لائق تھا کہ تم اس کے لیے اپنے عزت والے باپ کی عزت داؤ پر لگا تیں؟“ لبنیٰ نے زیبی کو اس کی طرف متوجہ کیا تو اس نے جاوید پر ایک نفرت بھری نظر ڈالی اور پھر منہ پھیر لیا۔ اس کی آنکھوں میں ندامت کے آنسو تھے۔

”ویلکم بیک میری شیرنیوں۔“ بوٹ پر قدم رکھتے ہی سہیل مرزا نے ان کا والہانہ استقبال کیا۔

”یہاں سے تو ہم بچ گئے ہیں ڈیڈ لیکن آگے ہمیں ہماری اماؤں کے عتاب سے بھی بچا لیجیے گا۔“ عروج نے ان کے سینے سے لگتے ہوئے درخواست کی۔

”اس کی تدبیر تو تمہیں خود کرنی ہوگی بچیو...! اپنی ”ہوم منسٹرز“ کے آگے تو ہم ہوم منسٹری والوں کی بھی کچھ نہیں چلتی۔“ سہیل مرزا نے کچھ ایسی بے چارگی سے کہا کہ وہ چاروں ہنس پڑیں۔ ایک بڑے امتحان سے گزرنے کے باوجود وہ شاداں و فرحاں تھیں کہ ان کی ذات کئی مظلوم لڑکیوں کو بچانے کا وسیلہ بن گئی تھی۔ آگے کے کام وہ لوگ سنبھال لیتے جن کی ذمے داری تھی۔ ان کے لیے تو بس اتنا کافی تھا کہ نئے سال کا سورج ایک نیکی کے ساتھ طلوع ہونے جا رہا تھا۔